عسریسرا

حسنیٰ حسین

’’جنت خدا کے لیے۔‘‘

ڈریسنگ ٹیبل کا سامان بکھر گیا۔دیوار گیر الماری کے شیشے چھماکے سے ٹوٹ گئے۔کانچ کا گل دان جو شدید نفرت اور انتقام سے فرش پر پھینکا گیا تھا،اس کے ٹکڑے یہاں وہاں بکھر گئے تھے۔

’’جنت!!!......جنت ایسے نہ کرو...... جنت نہیں!!جنت میرا بچہ......!!جنت خدا کے لیے۔‘‘

اک تڑپ......اک پکار......اک التجا......

اس نے پلکیں جھپکا کر دیکھا۔منظر ایک لحظے کے لیے دھندلا ہوا تھا۔شاید آنکھوں کی نمی بڑھی تھی۔شاید روشنی ہی مدھم پڑی تھی۔

’’برہان!برہان مجھے بچالیں۔‘‘

دل خراش چیخ کے ساتھ ہی اس کی آنکھ ایک جھٹکے سے کھل گئی تھی۔

بیڈ کراؤن کے ساتھ لگا اپنا سر اٹھاتے ہوئے وہ ہڑبڑا کر سیدھی ہو بیٹھی تھی۔داہنا ہاتھ بے ساختہ مقام قلب پر آن ٹھہرا تھا۔

مقام قلب......مقام ’’الم‘‘ تھا۔مقام الم......مقام ’’ابتلاء‘‘۔

تنفس بھاری،حلق خشک اور خوف کے آہنی شکنجے میں جکڑا دماغ ماؤف!

نائٹ اسٹینڈ کی زرکار روشنی میں،کام دار عروسی جوڑے کے دامن پر نظر پڑتے ہی وہ اپنے خواب کے اثر سے باہر آ گئی۔بے ساختہ سر اٹھا کر اس نے متوحش نگاہوں سے اطراف میں دیکھا۔

سفید اور سیاہ رنگ کی تھیم میں خوب صورت اور نفاست سے سجے،ایک وسیع و عریض بیڈ روم میں وہ جہازی سائز بیڈ پر گولڈن برائیڈل ڈریس میں ملبوس بیٹھی تھی۔

یہ گھر اس کا نہیں تھا۔یہ کمرہ بھی اس کا نہیں تھا۔سیکنڈ کے ہزارویں حصہ میں چند گھنٹے پہلے نکاح اور پھر رخصتی کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا گیا۔

خشک لبوں کو تر کرتے ہوئے عروسی جوڑے کا دامن اپنے ہاتھوں میں سنبھال کر وہ بیڈ سے اتر گئی۔چوڑیاں کھنک اٹھیں،بندیا متحرک ہوئی،سونے کے نفیس آویزے اس کی صراحی نما گردن پر آگے پیچھے جھول جھول گئے۔وہ انسان ہو کر ساکت تھی۔لاکھوں کی جیولری بے جان ہو کر متحرک۔

کپکپاتی انگلیوں سے دروازہ کھول کر وہ کچھ خوف،کچھ گھبراہٹ کے ساتھ باہر آ گئی.ماسٹر بیڈ روم کی دائیں سمت،عین سامنے گول زینہ تھا جو نیچے کی طرف جاتا تھا۔اسی زینے کی ابتدائی سیڑھیوں پر وہ اسے بیٹھا دکھائی دے گیا تھا۔

جنت کی دھڑکن ایک لمحے کے لیے جیسے تھم سی گئی تھی۔

سر گرا ہوا،کندھے جھکے ہوئے،اور مٹھیاں اس سختی سے بھنچی ہوئیں جیسے وہ ضبط کے آخری مراحل سے گزر رہا ہو۔

دوران سفر اس کا موڈ خوش گوار نہیں تھا،وہ جانتی تھی۔نکاح کے وقت بھی اس کے تیور ٹھیک نہیں تھے،وہ یہ بھی جانتی تھی۔

’’بڑے عجیب ہیں یہ فارس بھائی۔‘‘سدرہ نے خاص طور پر نوٹس کیا تھا۔’’نکاح کے پیپر پر ایسے سائن کر رہے تھے جیسے......‘‘ کچھ کہتے کہتے وہ یکا یک خاموش ہو گئی تھی۔

’’جیسے......؟‘‘اس نے گھنیری پلکوں کی جھالر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

’’جیسے......کچھ نہیں۔‘‘لبوں پر مسکراہٹ سجا کر اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔اور وہ ادھوری بات جیسے اب مکمل ہونے کو تھی۔

خود پر طاری اس جمود کو توڑتے ہوئے وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر اس کی طرف مڑا تھا۔اس کی تیکھی گہری آنکھوں میں غیض و غضب کا بڑھتا ہوا تاثر جنت بنت کمال کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑا گیا۔

’’تم نے ابھی تک چینج نہیں کیا؟‘‘ بھاری گمبھیر آواز،پتھریلا سخت لہجہ۔

لہنگے کا فال سنبھالے جنت کی مخروطی انگلیوں کی گرفت اتنی مضبوط ہوئی کہ موتی اور نگینے ہتھیلیوں میں چبھنے لگے۔

’’یہ ایک کاغذی رشتہ ہے جنت کمال!یہ صرف کاغذ تک محدود رہے گا۔‘‘ایک ایک لفظ نفرت سے ادا کرتے ہوئے اس کے اور اپنے مابین چند قدموں کے فاصلے کو اس نے ایک ہی لمحے میں پاٹ لیا تھا۔

’’کاغذی رشتہ......‘‘ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

’’ممی کو ایک بہو چاہیے تھی۔صرف ایک بہو!‘‘ بازو سے پکڑ کر خاصے جارحانہ انداز میں اسے راستے سے ہٹایا گیا۔’’یہاں صرف بہو بن کر رہو!بیوی بن کر میرے سر پر مسلط ہونے کی کوشش بھولے سے بھی مت کرنا!ورنہ بہت برا کروں گا میں۔‘‘

آنکھوں میں سختی سے دیکھتے ہوئے اس نے انگلی اٹھا کر دھمکی دی تھی،پھر اسی سرعت سے وہ کمرے میں چلا گیا تھا۔

صدمے سے ماوف ہوتے دماغ کے ساتھ جنت نے مڑ کر اسے بے یقینی سے دیکھا تھا۔ وہ جو بہت عزت اور مان سے اسے رخصت کر کے اپنے گھر لایا تھا، وہ اب کچھ نفرت اور حقارت سے بیڈ پر بکھری گلاب کی پتیوں کو ہٹا رہا تھا۔ پھول بیلوں کو نوچ کھسوٹ کر پھینک رہا تھا۔ تازہ گلاب کے بکے تو اس نے فرش پر دے مارے تھے۔

وہ مشتعل تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ کمرے کی ایک ایک چیز تہس نہس کر دے۔ آگ لگا دے۔ سب تباہ کر دے۔

جنت کی شہد آنکھوں میں ارمانوں کا خون رچ گیا۔ کپکپاتے لبوں پر سکوت ٹھہر گیا۔ وہ سراپا حزن بنی آنکھوں میں حیرت، صدمہ اور بے یقینی لیے اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

مغربی دیوار پر وکٹورین طرز کا اک آئینہ ایستادہ تھا۔ جو اس کا عکس خود میں سمائے پوشیدہ حقیقت کو اس کے چہرے پر لے آیا تھا۔ حقیقت...... سچائی کا روپ دھارے ایک بد دعا تھی جو اس کے پیچھے پیچھے یہاں تک چلی آئی تھی۔ یہاں تک۔

گھر چھوڑنے سے، شہر بدلنے سے، نئے رشتے بنانے سے اس کا نصیب نہیں بدلا تھا۔ نفرت اور دھتکار اب بھی اس کا مقدر رہی تھی۔ لعنت پھٹکار اب بھی اس کا نصیب ٹھہری تھی۔

”گیٹ لاسٹ۔“ دانت پیس کر، مٹھیاں بھینچ کر اس نے حکم دیا تھا۔ مگر وہ پتھر ہوئی کھڑی تھی۔

ذرا سا ارتعاش بھی اس کے وجود میں پیدا نہیں ہوا تھا۔

”آئی سیڈ گیٹ لاسٹ ڈیم اٹ۔“ اب کی بار وہ حلق کے بل دھاڑا تھا۔

بھاری کامدار لباس کا پھیلا ہوا گھیرا دودھیائی ہتھیلیوں میں سنبھالے وہ بے اختیار پیچھے ہٹ گئی تھی۔ دروازہ عین اس کے منہ پر بند ہوا تھا، کھٹاک کی آواز کے ساتھ مقفل بھی ہوا۔ ایک ایک کر کے خوش گمانی کے تمام دیئے بجھ گئے۔ ایک ایک کر کے ساری امیدیں خاک ہو گئیں۔

”ہمیشہ اچھا سوچنا! سب اچھا ہو گا۔“

اس نے اچھا سوچا تھا مگر اچھا نہ ہوا تھا۔

”ہر ”عسر“ کے ساتھ ”یسرا“ ہے۔“

اور اس کے آگے پیچھے، دائیں بائیں، اوپر نیچے...... ہر طرف عسر ہی عسر تھا۔ مشکل ہی مشکل...... آزمائش ہی آزمائش...... محرومی ہی محرومی...... سزا ہی سزا......

وہ الٹے قدم پیچھے ہوتی گئی یہاں تک کہ دیوار سے جا لگی۔

راہداری کے ایک سرے پر سیڑھیاں تھیں تو دوسرے سرے پر چھوٹا سا لاؤنج۔ جس کی دیوار گیر کھڑکیوں سے پورا چاند نظر آ رہا

تھا۔

”تم نے ماہین کے ساتھ جو کیا ہے جنت! خدا تمہیں اس کی وہ سزا دے گا جو تم ساری عمر یاد رکھو گی۔“

سسکیاں سینے میں مچل گئیں۔ آنسو پلکوں پر لرز گئے۔

”ساری زندگی تم نے امی کو دکھ دیے ہیں۔ ساری عمر تم ان کے لیے عذاب بنی رہی ہو۔“ سینے میں درد اٹھا۔ تنفس بھاری ہونے لگا۔ نگاہ بند دروازے پر ٹھہر گئی۔

”ایسی بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی مر جانا چاہیے۔“ لفظ نشتر تھے، روح گھائل ہوئی تھی۔

بمشکل قدم اٹھاتے اس نے لاؤنج کا رخ کیا تھا۔ پوری تاریخوں کے منور چاند کے سامنے وہ بے نور کرسٹل فانوس کے نیچے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ اب وہ ایک ایک کر کے پنیں نکال رہی تھی۔ شوراب بھی تھا، آوازیں اب بھی گونج رہی تھی۔

وہ سر سے دوپٹہ اتار کر اپنے ہیئر اسٹائل کے بل کھولنے لگی۔ ہیئر اسپرے سے بال اکڑے ہوئے تھے۔ بمشکل سیدھے ہو پائے۔ اس نے پھر کانوں کے آویزے اتارے۔ گلے کو نیکلس کی گرفت سے آزاد کیا۔ بندیا اتار کر میز پر رکھی۔

”نہیں مت اتارو جنت! ابھی جی بھر کر دیکھنے دو مجھے۔“

حلق میں ابھرتی گلٹی کو بمشکل نیچے اتارتے اس نے لب بھینچ کر خیالات کو جھٹکنا چاہا... افکار کو بھٹکانا چاہا مگر ناکام رہی۔ آج کی رات کچھ بھی اس کے ذہن سے محو ہونے والا نہیں تھا۔ رہ رہ کر ایک ایک پل، ایک ایک لمحہ، ایک ایک ساعت یاد آ رہی تھی اسے۔

”خدا تمہیں اس کی وہ سزا دے گا جو تم ساری عمر یاد رکھو گی۔“

”سزا۔“ پلکوں کی دیواروں میں شگاف ڈالتے چند آنسو اس کے گالوں پر لڑھک گئے۔

”یہ بھی برہان کا احسان ہے کہ اس نے تم پر کیس نہیں کیا ورنہ سوچو! وہ کیا نہیں کر سکتا تھا۔“

ہاں تم سوچو!!!

اب تم سوچو!!

آج تم سوچو!!

کمرے کی ہر اک شے آواز بن گئی۔ قلب و جان کو آزار کر گئی۔

بد دعا......! بد دعا......! کھڑکیوں سے سرد ہوائیں سرسرا کر گزری تھیں۔

سزا......! جزا......! لان میں آسٹر اور آرکڈس کے بے شمار پھولوں سے ہوتی ہوئی صدا بیرونی دیواروں کے اس پار، سڑک پر

جھکے املتاس کے درختوں پر ٹھہر گئی تھی۔

حلق میں ابھرتی گلٹی کو بمشکل نیچے اتارے جنت نے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔آج کی رات ایک مشکل رات تھی اس کے لیے۔اور اس کے لیے بھی جو بند کمرے میں اپنا سر تھامے خاموش بیٹھا تھا۔

☆☆☆

دیوار گیر کھڑکیوں سے جھانکتے سورج کی کرنیں اس کے چہرے پر پڑیں تو اس نے کسمسا کر آنکھیں کھول دی تھیں۔آفتاب کا نور۔اس کے اندر نہیں گیا تھا۔غاروں کی طرح کچھ تاریکیاں اس کے وجود کا بھی حصہ تھیں۔

اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس نے شانوں پر آگے پیچھے بکھرے شہد رنگ کے بالوں کو سمیٹ کر داہنے کندھے پر ڈال دیا تھا۔چہرہ ستا ہوا تھا، بےخوابی کا شکار سرخ ومتورم آنکھوں میں نمی ٹھہری تھی۔فرش پر قدم جماتے ہوئے اس نے بے خیالی میں سر اٹھایا تھا اور اگلے ہی لمحے اپنی جگہ تھم کر رہ گئی تھی۔

سیاہ جینز پر آسمانی رنگ کی شرٹ میں ملبوس وہ سنگل صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ جمائے خاصے شاہانہ انداز میں بیٹھا تھا۔دھوپ میں لائٹ براؤن سا شیڈ دیتے گھنے سیاہ بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔رگیں تنی ہوئیں، جبڑے بھینچے ہوئے اور گہری ہیزل آنکھوں میں تو جیسے خون اترا ہوا تھا۔اس نے داہنے ہاتھ میں ایک کتاب اٹھا رکھی تھی۔سرد نگاہوں سے مطالعہ جاری تھا۔

جنت کی ہارٹ بیٹ مس ہوئی، سانس تو پہلے سے رکا ہوا تھا۔اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اس طرح، اتنے سویرے وہ اس کے سامنے بیٹھا ہوگا۔وہ تاخیر سے بیدار ہونے پر از خود شرمندہ ہوگئی۔

’’کل رات جو کچھ ہوا اس کی بھنک ممی کو نہیں پڑنی چاہیے۔‘‘ کتاب بند ہو چکی تھی بالکل دروازے کی طرح......اب وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔بے پروائی سے جیبوں میں ہاتھ ڈالے جانے کے لیے مڑ گیا تھا۔

جنت نے بے ساختہ نگاہ اٹھائی تھی۔

فارس وجدان شیرازی!شیرازی انٹرپرائز کا سی ای او!!

دراز قامت، چوڑے شانے اور ورزشی جسامت کا مالک ایک خوب صورت نوجوان۔جو گول زینہ اترتا اب نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔مگر اس کے قدموں کی آہٹ تھی کہ راہداری میں ہی ٹھہر گئی تھی۔بند دروازے کی آواز بھی وہیں کہیں بھٹک رہی تھی۔

تلخ رویہ، سخت لہجہ اور نکاح کی حیثیت کی وضاحت کرتے بے رحم الفاظ متحرک ہوئے تھے، پلٹ پلٹ کر اس پر وار کرنے لگے تھے۔

اور وہ ساکت وصامت اپنے ٹوٹے بکھرے وجود سے لاپروا کچھ خوف، کچھ بے چارگی اور کچھ الجھن سے نصیب اور قسمت کی ان بھول بھلیوں کو دیکھنے لگی تھی جو ہر بار، ہمیشہ اسے ایک ہی مقام پر لے آتی تھیں۔

وہ مقام جس کا تعین کئی برس پہلے تپتی ہوئی ایک دوپہر میں ہوا تھا۔وہ مقام جو آگ کی طرح تھا۔سلگا سلگا کر راکھ کرتا تھا۔پھر خاک کر دیتا تھا۔

وہ پیروں تلے روندی جانے والی اسی مٹی سے ایک بار پھر جنم لیتی تھی۔ہر بار اس امید کے ساتھ کہ اب کچھ مختلف ہوگا۔ہر بار اس یقین کے ساتھ کہ اب وہ قبولی جائے گی۔مگر ہر بار وہی ہوتا جس کی توقع نہ ہوتی۔ہر بار وہی ملتا جس کی چاہت نہ ہوتی۔

ایک مدھم سی مسکان اس کے سختی سے بھینچے لبوں کو نرم کر گئی۔پھر وہ ہنس دی۔یونہی اچانک... بلاوجہ...... بلاسبب......

وجدان ہاؤس کے در و دیوار میں اس کی ہنسی کی جھنکاریوں گونجی جیسے کوئی ضبط کرتے کرتے اچانک رو پڑا ہو۔

☆☆☆

نکاح اور رخصتی جتنی سادگی سے ہوئی تھی، ولیمہ کی تقریب اتنے ہی شاندار طریقے سے منعقد کی گئی تھی۔

دولہا کے ہمراہ جب وہ اسٹیج پر آئی تو ہر ایک کی نگاہ میں ستائش ٹھہر گئی تھی۔فارس وجدان اگر اپنی وجاہتوں میں بے مثال تھا تو جنت بنت کمال بھی اپنی پراعتماد شخصیت اور پرکشش نقوش کے باعث باکمال نظر آرہی تھی۔اس کی شہد آنکھیں روشن اور کومل چہرہ منور تھا۔گلاب کی نرم پنکھڑیوں جیسے لبوں پر مدھم سا تبسم ٹھہرا تھا۔اس کے تاثرات مصنوعی نہ لگتے تھے۔نہ ہی انداز میں بناوٹ نظر آتی تھی۔یوں لگتا تھا جیسے اسے واقعتاً محبت کرنے والا رفیق حیات مل گیا ہو۔

رفیق حیات بھی ایسا جو اپنی آن بان میں شہزادوں جیسا ہو۔نام کی طرح میدان حیات کا کوئی شہہ سوار نظر آتا ہو!مگر وہ شہہ سوار......شریک حیات بن کر زبان کی دودھاری تلوار سے احساسات اور جذبات کو قتل کرنے والا بھی ہو تو......

اس کا ذہن پھر سے بھٹکا تھا۔سوچ اور خیالات پھر سے منتشر ہوئے تھے۔اور اس نے ایک بار پھر وائٹ کلچ پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے اپنی کیفیت پر قابو پا لیا تھا۔

سفید اور سرخ پھولوں سے ڈیکوریٹ کیے گئے خوب صورت ہال میں یہاں وہاں دیکھتے، پہلو میں بیٹھے فارس وجدان کے بلیک تھری پیس سوٹ سے اٹھتی مردانہ کلون کی خوشبو محسوس کرتے، وہ پلکیں جھپکا جھپکا کر آنکھوں میں ابھرتی نمی کو دبانے کی سعی کر رہی تھی۔

’’تم خوش تو ہو نا جنت۔‘‘ برابر میں بیٹھی سائرہ خالہ نے بہت محبت اور مان سے پوچھا تھا۔جنت نے گردن موڑ کر انہیں دیکھا، وہ جس احساس کے بارے میں استفسار کر رہی تھیں وہ اس کے آس پاس، اس کے اندر، اس کے دل میں کہیں بھی نہ تھا۔مگر وہ اس بار صحیح معنوں میں ان کے لیے مبہم رہنا چاہتی تھی۔راز ہونا چاہتی تھی۔وہ انہیں اور ان کی فیملی کے ایک ایک فرد کو یہ تاثر دینا چاہتی تھی کہ اسے اپنی ’’جنت‘‘ مل چکی، سزائیں ختم ہوئیں، وہ جہنم سے باہر گئی۔

’’بہت۔‘‘اس نے کہا تھا۔اس کی آواز کھوکھلی تھی۔مگر لبوں پر ابھرتی خوب صورت مسکراہٹ ہر اذیت چھپا گئی تھی۔آنکھیں بھی کمال کی اداکاری کرتی تھیں،تکلیف دہ تبسم میں ڈھل کر اس کے چہرے کو پرکشش بنا گئیں۔سائرہ خالہ نے اس کے کندھوں پر بازو ڈالتے ہوئے اپنے قریب کر کے پیشانی کا بوسہ لے ڈالا۔وہ اب بہت خوش اور مطمئن نظر آ رہی تھیں۔شیرازی خاندان کے ساتھ یہ رشتہ ان کی توسط سے سرانجام پایا تھا۔یہ شادی بھی ان کی وجہ سے ممکن ہو پائی تھی۔یہی وجہ تھی کہ جنت انہیں سکون بھری اس کیفیت سے محروم نہیں کرنا چاہتی تھی۔

لب بھینچ کر اور پلکیں جھپکا کر آنسوؤں کو روکتے ہوئے اس نے سر اٹھایا تو نگاہیں مسز شیرازی سے ٹکرا گئیں۔

کامدار میرون ساڑھی میں ملبوس،لائٹ سا میک اپ کیے وہ الیکٹرانک وہیل چیئر پر براجمان تھیں۔چہرہ نکھرا نکھرا سا تر و تازہ لگ رہا تھا۔سیاہ آنکھوں میں خوشی کی چمک لہرا رہی تھی۔لبوں پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ سجی تھی گو کہ ہارٹ پیشنٹ تھیں،فالج کے باعث ٹانگوں سے بھی معذور مگر اپنے بیٹے کی شادی پر وہ بہت صحت مند،ہشاش بشاش اور خوش نظر آ رہی تھیں۔وہ اسے دیکھتے ہوئے مسکرائیں تو جنت بھی مسکرا دی اور کوئی بھی دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ وہ اس عورت کے لیے کتنے دل سے مسکرائی تھی۔

☆☆☆

شام کا اندھیرا دھرتی پر پھیل چکا تھا۔دیوار گیر کھڑکیوں کے پردے ڈوریوں میں بندھے ہوئے تھے۔پندرہویں کا پورا چاند اس کے عقب میں تھا۔

وہ کچھ دیر پہلے مسز شیرازی کے ہمراہ گھر پہنچی تھی اور اب ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی کچھ بے دردی اور جھنجھلاہٹ سے اپنی جیولری اتار رہی تھی۔آنکھوں میں نمی تھی،چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔

ولیمہ ریسپشن کے دوران وہ کتنی پر اعتماد رہی تھی اور اب جب تنہائی میسر ہوئی تھی تو کیسے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی تھی......

’’زندگی پھولوں کی سیج کسی کے لیے بھی نہیں ہوتی جنت۔‘‘مسز شیرازی نے کچھ دیر پہلے اسے اپنے پاس بٹھا کر کہا تھا۔’’نئے ماحول،نئے رشتوں میں ایڈجسٹ ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے۔وہ وقت تحمل مزاجی کی طلب رکھتا ہے۔صبر چاہتا ہے۔‘‘

پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر،محبت سے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

’’دنیا کا سب سے حسین اور شفاف جذبہ محبت کا ہے،اس جذبے میں صلاحیت ہے نفرت کی ہر چٹان کو پاش پاش کر دینے کی۔‘‘

جنت کی آنکھوں میں ایک کرب ٹھہرا تھا۔وہ اس کی مسکراہٹ سے الجھا تھا۔اس کے چہرے پر بکھرا تھا۔گویا مسز شیرازی جانتی تھیں اپنے بیٹے کو......اچھی طرح سے سمجھتی تھیں اسے......

’’تمہاری فارس سے شادی میری وجہ سے نہیں ہوئی ہے،نہ ہی تمہاری خالہ کی وجہ سے......یہ تمہارا نصیب ہے جو تمہیں یہاں لایا ہے۔‘‘

بات گھوم پھر کر ایک بار پھر اس کے نصیب تک آ گئی تھی۔ہر بار یہ لفظ اسے ڈرا دیتا تھا۔ہر بار یہ سچائی اسے تڑپا دیتی تھی۔

اگر اب بھی نصیب ہی یہاں لایا تھا تو......

وحشت کا سانپ گردن سے لپٹا تھا۔ذات کے آئینے پر پتھر برسے تھے۔وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گئی تھی۔

نصیب!!

الجھے منتشر خیالات کے ساتھ اس نے سر اٹھا کر آئینے میں اس جنت کو تلاشا جو دلہن تھی،مگر اس کے سامنے جو کھڑی تھی وہ تو کچھ بھی نہ تھی۔

قدموں کی آہٹ کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھل گیا تھا۔اس کی جھمکے اتارتی انگلیاں ساکت ہوئی تھیں۔بے ساختہ نظر اٹھا کر اس نے آئینے میں فارس کو ہی دیکھا تھا۔

ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا،کوٹ اتار کر اسٹینڈ پر لٹکاتا اب وہ بیڈ پر بیٹھ کر اپنے جوتے اتار رہا تھا۔رسٹ واچ،کف لنکس اس نے سائڈ ٹیبل پر رکھ دیے تھے۔وہ عجلت میں اپنے کام کر رہا تھا اور جنت ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے پتھر ہوئی،اپنے جھمکوں میں ہی اٹکی کھڑی تھی۔وہ فارس وجدان کو دیکھ رہی تھی اور فارس وجدان نے بھولے سے بھی ایک غلط نگاہ اس پر نہیں ڈالی تھی۔

بے ساختہ ہی کوئی منظر ذہن کے پردوں پر لہرایا تھا،یکا یک اس کی اذیت بڑھ گئی تھی۔حال آئینہ بن کر ماضی کا عکس دکھلائے تو اذیت بڑھ ہی جاتی ہے۔

’’یہ احساس کتنا اذیت ناک ہوتا ہے کہ آپ موجود ہوں اور کوئی آپ کو’عدم‘ کر دے۔آپ ماورائی ہو جائیں......نظر ہی نہ آئیں۔‘‘کوئی خیال چوٹ بن کر ذہن میں اترا تھا۔آنکھیں جل اٹھی تھیں۔

کپڑے بدل کر وہ اٹیچڈ باتھ روم سے باہر آ گیا تھا۔سیاہ ٹراؤزر پر سفید رنگ کی ڈھیلی ڈھالی سی شرٹ میں ملبوس وہ اپنے عام سے حلیے میں بہت جاذب نظر آ رہا تھا۔

اپنے اطراف سے یکسر بے نیاز اس نے کمرے کی لائٹس آف کر دی تھیں۔اب صرف نیلگوں بلب ہی تھا جو اندھیرے میں مدھم سی روشنی کا تاثر دے رہا تھا۔

موبائل چارجنگ پر لگائے وہ سونے کے لیے لیٹ چکا تو خود پر طاری اس جمود کو توڑتے ہوئے جنت نے مڑ کر براہ راست اسے دیکھا۔اب آئینے کا سہارا درکار نہ تھا۔

''یہ تمہارا نصیب ہے جو تمہیں یہاں لایا ہے۔''

حلق میں ابھرتی گلٹی کو بمشکل نیچے اتارتے اس نے اٹیچڈ باتھ روم کا رخ کیا۔ کپڑے تبدیل کر کے وہ کافی تاخیر سے باہر آئی تھی۔ صوفے پر بیٹھ کر وہ روئی روئی سی سرخ و متورم آنکھوں کے ساتھ کچھ دیر تک وہ اسے ہی دیکھتی رہی تھی۔

نصیب...... سفید شال خود پر پھیلائے وہ سسکتے ہوئے صوفے پر نیم دراز ہوگئی۔ کچھ تھکاوٹ کا اثر تھا اور کچھ گزشتہ شب کی بے خوابی تھی کہ آنکھیں بند کرتے ہی اسے نیند نے آلیا تھا۔ اور ایک بار پھر وہ اس بے رحم رات کے آہنی شکنجوں میں جکڑی گئی تھی جو باوجود کوشش کے بھی اس کے ذہن سے نکلتی نہیں تھی۔

☆☆☆

گھر میں داخل ہوتے ہی سائرہ نے سر اٹھا کر اپنے بیٹے کو دیکھا جو نڈھال قدم اٹھاتا ان کے سامنے آکر رک گیا تھا۔ آنکھیں سرخ و متورم سی تھیں۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ سدرہ ایک نظر بھائی پر ڈالتی تیز تیز قدم اٹھاتی اندر چلی گئی تھی مگر سائرہ ایسا نہیں کر سکی تھیں۔

''میں سمجھ رہا تھا اسے سزا مل چکی ہے، مگر اس کی سزا تو جیسے اب شروع ہوئی ہے مما۔''

''عمار'' سائرہ کا لہجہ کاٹ دار ہوا تھا۔ آنکھیں غم و غصے سے پھیلی تھیں۔ جنت کا ولیمہ اٹینڈ کر کے ابھی وہ کچھ دیر پہلے ہی لاہور پہنچی تھیں اور ابھی سے عمار کا یہ رویہ اور باتیں انہیں اشتعال دلا گئے تھے۔

''فارس وجدان کی بیوی ہے اب وہ! شیرازی خاندان کی بہو۔'' ان کا لہجہ دوٹوک تھا۔

''اسی فارس وجدان کو سدرہ کا رشتہ کیوں نہیں دیا آپ نے؟''

سدرہ نے بے ساختہ مڑ کر اپنے بھائی کو دیکھا۔ دیوانہ تھا وہ جنت کے لیے۔ اب اس کی دیوانگی نے جیسے ہر حد کراس کر لی تھی۔ اپنے بھی اسے اب دشمن نظر آنے لگے تھے۔

''مسز شیرازی نے فارس کے لیے صرف جنت کا ہاتھ مانگا تھا'' سائرہ نے تحمل سے ایک بار پھر اپنے بیٹے کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھیں، اور وہ تھا کہ کچھ سمجھنے کو تیار ہی نہ تھا۔

''اگر وہ سدرہ کا ہاتھ بھی مانگتیں تو میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ انکار کر دیتیں۔''

سائرہ نے لب بھینچ کر اپنے بیٹے کو دیکھا۔

''شاید آپ بھول رہی ہیں اس کے متعلق کس طرح کی خبریں گردش کرتی رہی ہیں۔''

''وہ صرف افواہیں تھیں۔ فارس ایسا نہیں ہے۔''

عمار ہنس دیا۔ اس کی ہنسی بھی طنزیہ تھی۔ پیشانی مسلتے ہوئے۔ الجھے بکھرے بالوں میں ہاتھ چلاتے ہوئے وہ جیسے ضبط کے مراحل پر تھا۔ ''شیرازی خاندان کو دھوکا دے کر آپ کیسے مطمئن ہیں مما میری سمجھ سے باہر ہے۔''

''عمار'' اب کے انہوں نے سخت پتھریلی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ ''تمہیں میری بھانجی کے معاملے میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ اب شادی شدہ ہے۔ بٹھا لو یہ بات اپنے دماغ میں کہ وہ اب کسی کی عزت ہے۔ اس نے جو کچھ بھی کیا ہے اسے زیر بحث لانے کی ضرورت نہیں ہے، وہ اس کا ماضی تھا، میں اس کی پرسنل لائف مسز شیرازی کے سامنے کھولنے کا کوئی حق نہیں رکھتی تھی اور نہ ہی انہوں نے مجھ سے اس حوالے سے کوئی سوال پوچھا تھا'' انہوں نے ایک لمحے کا توقف کرتے ہوئے دوبارہ اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''میں نے جو بھی فیصلہ کیا ہے، سوچ سمجھ کر کیا ہے، تمہارے دماغ میں یہ جو محبت کا چند روزہ بھوت سوار ہے، یہ اترے گا تو تمہیں سب سمجھ میں آجائے گا۔''

''ہاں! میں تو جیسے بچہ ہوں، پاگل ہوں، ناسمجھ ہوں۔'' زیر لب بڑبڑاتے ہوئے وہ شدید غصے کے عالم میں میز کو ٹھوکر مارتا گھر سے نکل گیا تھا۔

سائرہ بے بسی سے اسے جاتا دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

صبح جتنی روشن، صاف اور چمکدار تھی، اس کے اندر کی دنیا اتنی ہی تاریک، ویران اور سنسان سی تھی۔ سرخ رنگ کا قدرے ہلکے کام والا نفیس جوڑا زیب تن کیے وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی کچھ بے دلی سے اپنے بال بنا رہی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

''کم ان۔'' اس نے ہمت مجتمع کر کے کہا تھا۔

دروازہ کھل گیا۔ ملازمہ سامنے کھڑی تھی۔ ''بیگم صاحبہ آپ کا ناشتے پر انتظار کر رہی ہیں۔''

''میں آرہی ہوں۔'' فریش نظر آنے کے لیے لائٹ سا میک اپ کیے، دوپٹہ سلیقے سے سیٹ کر کے وہ نیچے آگئی تھی۔

ڈائننگ ہال میں مسز شیرازی وہیل چیئر پر فارس وجدان کے ہمراہ موجود تھیں۔ انہوں نے براؤن رنگ کا سادہ سا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ سفید رنگ کی بڑی سی شال کندھوں پر تھی۔ میک اپ اور جیولری سے عاری وہ اس روپ میں بھی بہت اچھی لگ رہی تھیں۔

ان کی آنکھیں بہت نرم سا تاثر دیتی تھیں اور لبوں پر بکھری شفیق اور مہربان سی مسکراہٹ سیدھا دل میں اترتی تھی۔

''السلام وعلیکم۔''

مشتر کہ سلام کر کے وہ بھرپور اعتماد کے ساتھ مسز شیرازی کے پاس آ گئی تھی۔ انہیں سلام کیا تھا، ان سے دعا بھی لی تھی اور جب جھکی تھی تو انہوں نے بہت پیار سے اس کی پیشانی کا بوسہ لیا تھا۔ پھر انہوں نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے برابر میں ہی بٹھا لیا تھا۔

فارس وجدان اس کے عین سامنے جھکے سر کے ساتھ اپنے ٹیبلٹ کی اسکرین پر ہیڈ لائنز دیکھ رہا تھا۔

ناشتا شروع کر دیا گیا۔ دیسی اور بدیسی ناشتے کے لوازمات سے سجی ٹیبل سے مختلف ڈشز اٹھا اٹھا کر مسز شیرازی اس کے سامنے رکھنے لگیں۔

جنت نے نظریں اٹھا کر فارس کو دیکھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ ضرور تھا مگر تاثرات سخت پتھریلے نہ تھے۔ مسز شیرازی جب جب اس سے مخاطب ہوتیں، وہ بہت آرام اور تسلی سے مختصر جواب دے کر اپنی نگاہیں ٹیب پر جما لیتا تھا۔

ناشتا کرتے ہوئے اس کے انداز میں عجلت نمایاں تھی جیسے وہ جلد از جلد یہاں سے اٹھ جانا چاہتا ہو۔ مگر مسز شیرازی اسے ایسا کرنے نہیں دے رہی تھیں۔ وہ اسے باتوں میں الجھا رہی تھیں، خبروں سے اس کا ذہن بھٹکا رہی تھیں۔

''تو پھر ہنی مون کے لیے کیا پلان کیا ہے تم دونوں نے؟'' انہوں نے باتوں کے دوران اتنا اچانک پوچھا کہ ٹوسٹ پر جیم لگاتے فارس کے ہاتھ یک دم رک گئے۔ جنت نے سر اٹھایا تو نگاہیں فارس سے دوچار ہوئیں۔ بس ایک لمحے کے لیے...... پھر وہ نظریں جھکا گئی۔

''ابھی کچھ سوچا نہیں اس بارے میں۔'' توقع کے برعکس اس نے بہت محتاط انداز میں جواب دیا تھا۔

''تو پھر سوچ لو! ایک مہینے کا بریک لو اور......''

فارس نے اپنی ماں کے ہنستے مسکراتے چہرے کو دیکھا۔ اس کی شادی سے وہ کتنی فریش اور صحت مند لگ رہی تھیں۔ جیسے سارے بوجھ ان کے کندھوں سے اتر گئے ہوں۔ جیسے سارے قرض ادا کر دیے گئے ہوں۔

''ہاں کچھ پلان کرتا ہوں۔'' اس نے جواب دے کر انہیں بھی حیران کر دیا۔ اندر ہی اندر شاید وہ یہ توقع کر رہی تھیں کہ وہ ٹال مٹول سے کام لے گا۔

''خوش رہو۔'' انہوں نے دعا دی۔

''اب میں چلتا ہوں، اپنا خیال رکھیے گا۔'' کرسی دھکیل کر اٹھتے ہوئے اس نے مسز شیرازی کی طرف جھک کر ان کی پیشانی کا بوسہ لیا۔

''تم بھی اپنا خیال رکھنا۔''

وہ جانے لگا تو مسز شیرازی کے ساتھ ساتھ جنت کی نگاہوں نے بھی اس کا تعاقب کیا تھا۔

''شادی کے بعد آج اس کا آفس میں پہلا دن ہے، تمہیں اسے سی آف کرنا چاہیے۔''

جنت نے کچھ گھبرا کر ان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے چائے کا کپ اٹھا لیا۔

وہ اٹھ کر باہر آ گئی۔

سامنے ہی وہ سفید پتھروں کی روش پر کھڑا تھا۔ رک کر، مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ نروس ہو کر رک گئی۔ آنکھوں میں اضطراب ٹھہر گیا۔

وہ فارس سے تین چار اسٹیپس کی بلندی پر تھی مگر اس کی آنکھوں کے حقارت آمیز تاثر سے جیسے زمین کی تہوں میں اتر کر رہ گئی۔

نفرت، تحقیر، دھتکار! نظروں کے مفہوم جانتی تھی وہ۔ نفرتوں کی پہچان تھی اسے۔ تب ہی اس کا دل کٹا تھا۔ تب ہی آنکھیں نم ہوئی تھیں۔ وہ ایک ایسے انسان کے سامنے کھڑی تھی جس کی آنکھوں میں انسیت تو دور کی بات اس کے لیے عزت بھی نہ تھی۔

''آنٹی نے کہا تھا کہ......'' انگلیاں مسلتے ہوئے اس نے اپنی موجودگی کی وضاحت دینا چاہی۔

''کہ کیا......؟'' اس نے سوالیہ ابرو اٹھائی، لہجہ حتی الامکان سخت ہی رہا۔ ''کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا بیوی بن کر میرے سر پر مسلط ہونے کی کوشش مت کرنا؟'' وہ پھنکارا۔

وہ چپ رہی۔ اعتراض اور شکوے کا اس کے پاس کوئی حق نہ تھا۔

اسے تندہی سے دیکھتے فارس نے انگلی اٹھائی۔ لفظ ادا کیے بغیر آنکھوں کے تاثر سے ہی وہ اس پر واضح کر گیا تھا کہ آئندہ وہ اسے اپنے پیچھے صدر دروازے میں نظر نہ آئے۔

جنت نچلا لب دانتوں تلے کچلتی، اپنی گیلی آنکھوں کے ساتھ یہاں وہاں دیکھنے لگی۔ اسے بہت رونا آ رہا تھا۔ حالانکہ...... یہ رویہ...... یہ دھتکار اور نفرت...... یہ کچھ نیا تو نہ تھا۔

سیاہ شیڈز آنکھوں پر لگائے وہ اسی وقت جانے کے لیے مڑ گیا تھا۔ ضبط کر کے اس نے آنسو دبا لیے تھے۔

نئی زندگی کا آغاز، بھیانک انجام سے جڑا ہوا تھا، خوف کے آہنی شکنجے میں جکڑی وہ اسے بے بسی سے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

مسز شیرازی اسے وجدان ہاؤس سے متعارف کرواتے ہوئے نچلی منزل پر ہی ہال نما ایک ایسے کمرے میں لے آئیں تھیں جو دیکھنے میں کسی آرٹسٹ کا اسٹوڈیو لگتا تھا۔ واٹر کلر، آئل پینٹ، اکریلک، ہر طرح کی پنسلز، مختلف برشز، کینوس پیپرز، ہیوی کارڈ اسٹاک۔ غرض کے ہر وہ مٹیریل موجود تھا جو ایک آرٹسٹ کو اپنی تخلیق کے لیے درکار ہو سکتا تھا۔ اس نے گھوم کر چاروں طرف دیکھا۔

قدرتی مناظر کی بے پناہ خوب صورت پینٹگز دیواروں پر لگی تھیں اور کچھ پیک شدہ حالت میں دیواروں کے پاس ہی رکھی گئی تھیں۔ بیش قیمت پینٹنگز، آرائشی اشیاء، کرسٹل، لکڑی اور مٹی سے بنی منفرد اور مختلف ڈیکوریشن پیس...... جنت ایک ایک چیز اشتیاق کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔

''جب ہم یہاں شفٹ ہوئے تو میرے منع کرنے کے باوجود فارس شیرازی ہاؤس سے یہ سب لے آیا تھا۔ وہ چاہتا تھا میں اس گھر کو اپنی پینٹنگز سے سجادوں۔''

جنت نے چونک کر ان طرف دیکھا۔ الیکٹرانک وہیل چیئر پر براجمان وہ اس کے پاس آ کر رک گئی تھیں۔ میک اپ سے عاری چہرہ نکھرا نکھرا سا لگ رہا تھا۔

''آپ......آپ آرٹسٹ ہیں؟ یہ سب پینٹنگز......'' وہ حیران ہوئی تھی۔

''بس شوقیہ رنگوں سے کھیل لیا کرتی تھی۔'' ان کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ ٹھہر گئی۔

''شوقیہ اور کھیل؟ یہ کسی پروفیشنل آرٹسٹ کا کام ہے آنٹی۔'' جنت سراہے بنا نہ رہ سکی۔ کمال کی آرٹسٹ تھیں مسز شیرازی...... قدرتی مناظر کو دیکھ کر اصلی تصویروں کا گمان ہو رہا تھا۔

مسز شیرازی نے اس کی آنکھوں میں ابھرتے، حیرت، تجسس اور اشتیاق کے ملے جلے تاثرات کو بہت غور سے دیکھا تھا۔

''ایک وقت تھا جب مجھے لگتا تھا اگر میں پینٹنگ چھوڑ دوں گی تو زندہ نہیں رہوں گی۔''

دیوار پر ہنزہ کی بلند و بالا پہاڑیوں کی تصویر پر متحرک جنت کی انگلیاں ساکت ہو گئیں۔

''میں نے پینٹنگ چھوڑ بھی دی اور زندہ بھی رہی۔'' انہوں نے کہا۔ جنت نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے بائیں ہاتھ کو اب بھی ذرا مشکل سے حرکت دے پاتی تھیں۔

''جن سے متعلق ہم یہ گمان کر لیتے ہیں کہ ہم ان کے بغیر نہیں رہ پائیں گے، تو وقت اپنے طور پر ثابت کر دیتا ہے کہ ان کے بنا بھی رہا جا سکتا ہے۔''

وہ سن ہوئی تھی اپنی جگہ۔ بھالا جیسے دل پر لگا تھا۔ وجود ماضی اور حال کے درمیان پینڈولم کی طرح جھولنے لگا تھا۔ اس نے اذیت بھرے احساس کے ساتھ مسز شیرازی کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں بھی کرب کی نمی تھی مگر لبوں پر ایک زندہ مسکان ٹھہری تھی۔

الیکٹرونک چیئر کو متحرک کرتے ہوئے انہوں نے میز پر رکھا آرائشی قلم اٹھا لیا، پاس ہی پتھر پر نصب گھڑی رکھی تھی، لکڑی کا باکس بھی جس کے تختوں پر انتہائی خوبصورتی اور نفاست سے پھول تراشے گئے تھے۔

''وقت بہترین استاد ہے، ''محرومیوں'' کے ساتھ جینا سکھا دیتا ہے۔''

حلق میں ابھرتی گلٹی کو بمشکل نیچے اتارتے ہوئے اس نے گال پر پھسلتی لٹ کو کان کے پیچھے اڑس کر اطراف میں نگاہ دوڑائی تھی، وہ اپنا ذہن بھٹکانا چاہ رہی تھی مگر ذہن تھا کہ اس ایک لفظ میں الجھ کر رہ گیا تھا۔

پینٹگز کے ساتھ ہی سامان سے بھرے کارٹن پڑے تھے۔ وہ پنجوں کے بل بیٹھ کر کرسٹل کے گل دانوں کو دیکھنے لگی جن کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ پاس ہی ایک اور باکس پڑا تھا۔ ادھ کھلا ہوا۔ وہ جھک کر اس کارڈ کو دیکھنے لگی جس پر تیسری کلاس کے فارس وجدان کی پہلی پوزیشن اسٹارز اور اسٹیکرز کے درمیان جگمگا رہی تھی۔

''یہ فارس کا سامان ہے، بچپن سے اس کی عادت ہے اپنی ہر ایک چیز کو سنبھال سنبھال کر رکھنے کی۔ تم یقین نہیں کرو گی اس کے کھلونے بھی نیچے کہیں پڑے ہوں گے، صحیح اور سلامت۔'' اپنے بیٹے کے لیے مسز شیرازی کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔

جنت نے رزلٹ کارڈ واپس رکھ دیا۔ نیچے ہی پلاسٹک شیٹ میں مرجھائے ہوئے پھولوں کا ڈھیر نظر آ رہا تھا۔ ایک ڈرائنگ پیپر بھی تھا۔ فولڈ کیا ہوا......اس نے کھول کر دیکھا۔

''گیٹ ویل سون۔'' بچے کی لکھائی میں بڑا بڑا لکھا تھا۔

مسز شیرازی نے ڈور کھینچ کر دیوار گیر کھڑکیوں پر سے پردے ہٹا دیئے تھے، کمرہ مزید روشن ہوا تو دیوار کے پاس گول میز پر سیدھی رکھی فریمڈ پینٹنگز اسے اپنی جانب متوجہ کر گئیں۔

''پرفیکٹ۔'' اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ مسز شیرازی نے اسے مسکرا کر دیکھا۔

سب سے آخر میں زرکار فریم والی بڑی پینٹنگ رکھی تھی، بے حد احتیاط سے اسے سیدھا کیے وہ کچھ مبہوت ہو کر دیکھنے لگی تھی۔

وہ قرآن کی ایک آیت تھی جسے سیاہ پینٹنگ پیپر پر، قدرتی مناظر کی جھلکیوں میں انتہائی خوبصورتی اور مہارت سے لکھا گیا تھا۔

''ان مع العسر یسرا۔''

تمام حروف مختلف مناظر خود میں سموئے ہوئے تھے۔

پھول، آسمان، خزاں رسیدہ درخت، خاردار جھاڑیاں اور ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ، وسیع سبزہ زار۔

العسر لفظ میں خزاں کا منظر تھا۔ نوکیلے سیاہ درخت، کانٹے دار خار جھاڑیاں......اور اس سے آگے یسرا......سرسبز پھولوں، ہرے بھرے درختوں اور وسیع سبزہ زار کی جھلک دکھلاتا ہوا۔ مگر یسرا کا الف مختلف تھا......حجم میں بھی۔ لکھائی میں بھی۔

حرف ''الف'' آسمانی رنگ کا، آسمان کی ہی طرف اٹھا، لہلہاتے بادلوں کی خوبصورت جھلک دکھلا رہا تھا۔

پوری آیت ایک ہی لکھائی، ایک ہی انداز میں تھی......آؤٹ لائن بھی ایک ہی رنگ......مگر الف...... جو آسمان کی جھلک دکھلاتا تھا، وہ سب سے الگ، سب سے نمایاں، سب سے منفرد تھا۔

جنت کافی دیر تک ریلسٹک انداز میں بنائے گئے ان مناظر کو، حروف کے اتار چڑھاؤ اور سیاہ بیک گراونڈ پر سنہری روشنی کی طرح ابھرتی اس آیت کو دیکھتی رہی۔

''میں بھی یہی چاہتی تھی کوئی اسے دیکھے، پھر دوبارہ دیکھے، اور تب تک دیکھتا رہے جب تک اس کا راز نہ پالے۔''

''راز!'' اس نے چونک کر مسز شیرازی کو دیکھا تھا۔'' کیا آرٹسٹ بھی اپنی پینٹنگز میں راز چھپاتے ہیں؟''

مسز شیرازی مسکرا دیں۔'' وہ راز میرا نہیں، اس آیت کا ہے! اس آیت میں ہی چھپا ہے۔''

جنت کی آنکھوں میں ایک غیر مفہوم سا تاثر آ کر ٹھہر گیا۔

''قرآن کی ہر آیت ایک ''جواب'' ہے، اس ''سوال'' کا جو انسان کے اندر اٹھتا ہے...... جواب اس وقت تک سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک سوال سمجھ میں نہ آئے۔'' مسز شیرازی کہہ رہی تھیں۔'' اب اس آیت کو دیکھ لو۔ یہ بھی ایک سوال کا جواب ہے۔ وہ سوال جو ایک وقت میرے اندر اٹھا تھا اور جواب کسی وجہ سے تمھارے اندر بھی ہوگا۔ کچھ سوال مختلف ہو سکتے ہیں، مگر ان کا جواب ایک ہی ہوتا ہے۔''

نا سمجھی کے عالم میں مسز شیرازی کو دیکھتے جنت کی مضطرب نگاہیں ''عسر'' پر آ کر ٹھہر گئیں۔ اس کی تمام تر توجہ اب وہیں تھی۔

خزاں سے مرجھائے ہوئے درختوں اور پتوں پر......

''آزمائش کی وادیوں میں بھٹکتے ہر انسان کو اس آیت پر غور کرنا چاہیے، ہر مریض کو، ہر سقیم کو، ہر علیل کو۔'' وہ کہہ رہی تھیں۔

فریم پر جنت کی مخروطی انگلیوں کی گرفت یکا یک مضبوط ہوئی تھی۔

''اس آیت کا صرف وہی مطلب نہیں ہے جو ہم اکثر پڑھ یا سمجھ لیتے ہیں، اس کا ایک اور مطلب اس کے حروف میں کہیں چھپا ہے۔'' ان کا لہجہ پراسراریت میں ڈھلا تھا۔

''دوسرا مطلب؟'' جنت کے لب ہلے۔

مسز شیرازی لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ لیے اسے چند لمحوں تک دیکھتی رہیں۔'' چلو میں تمہیں ایک ہنٹ دیتی ہوں۔ میں نے جان بوجھ کر یسرا کے الف کو نمایاں کیا ہے۔ تاکہ میری طرح کسی کو دقت کا سامنا نہ ہو اور اسے آغاز پکڑنے میں کچھ آسانی ہو۔''

اپنی بات کے اختتام پر دھیرے سے مسکراتے ہوئے انہوں نے الیکٹرانک چیئر کا رخ دروازے کی جانب موڑ دیا تھا۔

اور جنت کمال پینٹنگ ہاتھوں میں لیے اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

''جنت خدا کے لیے!!! جنت...... جنت میرا بچہ......!'' شور ایک دم سے بڑھا تھا۔ آوازیں تیز ہوئی تھیں۔ ایک زناٹے دار

تھپڑ اس کے گال پر پڑا اور وہ لہرا کر کانچ کے ٹکڑوں پر آن گری۔

''امی!'' وہ روتے ہوئے دبی آواز میں چیخی تھی۔'' امی......! امی۔'' یکا یک ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی تھی۔

''امی۔'' لبوں میں ہلکی سی جنبش ہوئی تھی۔ کپکپاتے ہاتھوں میں شال بھینچتے ہوئے اس نے کسی احساس کے تحت سر اٹھایا تھا۔ اگلے ہی لمحے فارس وجدان کی شعلہ بار نگاہوں کی زد میں آتے ہی برف ہوگئی۔ اس کا دل رک گیا۔ آنسو تھم گئے۔ وہ جس طرح سے اسے دیکھ رہا تھا اسے لگا وہ سانس بھی نہ لے پائے گی۔

ایک بار پھر وہ اس کے آرام میں مخل ہوئی تھی۔ ایک بار پھر وہ اس کی آواز سے بیدار ہوا تھا۔ گزشتہ کئی راتوں سے یہی ہو رہا تھا۔ وہ سوتے میں اکثر ڈر جاتی تھی، رو پڑتی تھی، چیخنے لگتی تھی۔

مجرموں کی طرح شرم ساری سے سر جھکا کر اس نے پیشانی پر پھسلتی لٹ کو کان کے پیچھے اڑسا۔ بلینکٹ اور تکیہ اٹھایا اور کمرے سے نکل گئی۔

لاؤنج میں ڈبل صوفے پر بیٹھتے ہی اس کا ضبط ختم ہو گیا۔ آنکھیں چھلک پڑیں۔

سرخ اینٹوں پر پھیلتا خون، کریم ٹائلز پر ڈھیر ہوتا وجود۔ اس کی آنکھیں دھندلانے لگیں، وجود کپکپانے لگا۔ ماضی ایک بار پھر اس کے حواسوں پر سوار ہو چکا تھا۔

''خدا تمہیں اس کی وہ سزا دے گا جو تم ساری عمر یاد رکھو گی۔''

شور ایک بار پھر اٹھا تھا، آواز سماعتوں میں ہتھوڑے کی طرح لگی تھی، پیشانی گھٹنوں پر ٹکائے وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

آہٹ کے ساتھ کمرے کا دروازہ جھٹکے سے کھل گیا تھا۔ عجلت میں آنسو پونچھتے اس نے بے اختیار سر اٹھایا تھا۔

راہداری میں بیڈروم کے دروازے میں کھڑا وہ قہر بار نظروں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''اٹینشن سیکر۔'' اس کی بڑبڑاہٹ واضح تھی۔ ایک نفرت بھری نگاہ جنت پر ڈالتے وہ جھٹکے سے پلٹ گیا تھا۔

ہچکیوں کا گلا گھونٹے، سسکیاں لبوں تلے دبائے وہ اسے گیلی آنکھوں سے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ ذہن کی اسکرین پر اب کوئی منظر نہ تھا، نہ سماعتوں سے کوئی آواز ٹکرا رہی تھی، ایک جامد سناٹا تھا جو ہر طرف چھا گیا تھا۔

نفرت بھری ایک نگاہ ہی کافی تھی اسے دردناک ماضی سے کربناک حال میں پٹخنے کے لیے۔

''یہ تمہارا نصیب ہے جو تمہیں یہاں لایا ہے۔'' تاریکی میں عکس روشن ہوا تھا، آئینے پر دراڑیں پڑ گئی تھیں۔

موازنہ شروع ہو چکا تھا۔ دو چہرے ایک ہو گئے تھے۔ اذیت پھن پھیلائے وجود سے لپٹ گئی تھی۔

"دنیا کا سب سے حسین اور شفاف جذبہ محبت کا ہے، اس جذبے میں صلاحیت ہے نفرت کی ہر چٹان کو پاش پاش کر دینے کی۔"

محبت! بہت بھاری اور مشکل تھا یہ لفظ اس کے لیے۔ جو لبوں سے ادا ہوتا تھا، نہ خوشی کا احساس دلاتا تھا۔ جو امید جگاتا تھا۔ نہ یقین دلاتا تھا۔

محبت!

آئینہ سامنے تھا۔ آئینہ واضح تھا۔ جنت نے آنکھیں میچ لیں۔ لب بھینچ لیے۔ گزشتہ کئی راتوں کی طرح وہ رات بھی اس نے آنکھوں میں ہی کاٹی تھی۔ اور دل ماضی کے اژدھوں سے لپٹا ساری رات روتا رہا تھا۔

☆☆☆

وہ فارس وجدان کے لیے عدم تھی، ماورائی، نہ نظر آنے والی ایک ایسی تخلیق جس کے ہونے نہ ہونے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ فرق پڑتا بھی تو کیوں؟ کیا وہ اس کی مرضی ومنشا سے اس گھر میں لائی گئی تھی؟ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ تو فرق پڑتا بھی تو کیوں؟

کمرے میں تو جیسے تیسے وہ اسے برداشت کر چکا تھا مگر اپنی ذاتیات میں نہ وہ کسی قسم کی مداخلت برداشت کرتا تھا اور نہ ہی اسے اپنی زندگی میں کوئی مقام دینے کو تیار تھا۔ غصے کا انتہائی تیز...... مشتعل...... یہی وجہ تھی کہ وہ خود بھی محتاط ہو گئی تھی اور اس گھر میں اس طرح سے رہنے لگی تھی جیسے وہ چاہتا تھا رہے۔ اجنبیوں کی طرح...... مسافروں کی طرح...... جنہیں چند روز یہاں ٹھہرنا ہے اور پھر چلے جانا ہے۔ مگر وہ مسافر نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اجنبی نہیں رہنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے بس میں تھا ہی کیا؟ وہ خود کو اتنا کمزور۔ اتنا لاچار محسوس کرتی تھی کہ حق کے لیے آواز تک نہ اٹھا سکتی تھی۔

فارس نے حدود کا تعین کیا تھا تو وہ بھی اپنے خول میں بند ہو گئی تھی۔ اس نے خاموشی کو پسند کیا تھا تو وہ بھی صامت (Mute) ہو گئی تھی۔ مگر یہ خاموشی اب اسے اندر ہی اندر مٹانے لگی تھی۔ اس کی الجھن بڑھانے لگی تھی۔

ایک معین مدت تک وہ نکاح کا پابند تھا۔ ایک معین مدت تک ہی وہ اسے اپنے گھر میں رکھے ہوئے تھا۔ جب وہ مدت تمام ہو گی، جب وہ وجہ اختتام ہو گی، اس کے بعد؟ اس کے آگے کیا؟

طلاق کا تصور اس کی روح کھینچنے لگتا تھا۔ کانٹریکٹ کا خیال اذیت بڑھانے لگتا تھا۔ مگر وہ کرتی بھی تو کیا؟ نفرت کی اس دیوار کو ڈھاتی بھی تو کیسے؟ وہ تو خود خالی دامن تھی۔ حالات سے لڑنے کے لیے تو اب اس کے پاس ایک موہوم سی امید بھی نہ رہی تھی۔

☆☆☆

"ایکسکیوز می؟"

پارک سے واپسی پر وجدان ہاؤس کے بیرونی گیٹ سے اندر داخل ہوتے وہ چونک کر رک گئی تھی۔

مڑ کر دیکھا تو سامنے یزدانی ہاؤس کے مین گیٹ پر جینز اور سفید ٹاپ میں ملبوس لڑکی اسے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کر کے عجلت میں قدم اٹھاتی اس کے پاس ہی آ گئی تھی۔

بھنویں سکیڑ کر پہلے اس نے جنت کو دیکھا، سر سے پاؤں تک۔ پھر وجدان ہاؤس پر یوں نظر ڈالی جیسے تسلی چاہ رہی ہو کہ اس کی آنکھوں نے ہرگز دھوکا نہیں کھایا۔ اس کے بعد پیشانی پر بل اور آنکھوں میں شک لیے وہ سینے پر بازو باندھے اس کے قریب ہوئی۔

"آپ کی تعریف؟"

جنت نے بھنویں اچکا کر اس لڑکی کو کچھ حیرت سے دیکھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے؟" اس نے کہا تو لہجے سے ناگواری جھلک رہی تھی۔

"فارس بھائی کے آگے پیچھے پروانوں کی طرح پھرنے والی لڑکیوں میں سے ایک۔" اس نے تمسخر اڑایا۔

"تو کیا تم بھی ان میں سے ہو؟" جنت نے سوال اٹھایا۔

وہ جل سی گئی۔ تپ سی گئی۔ لیکن آگے سے کچھ نہ بولی۔

"کون ہو؟ یہاں کیا کر رہی ہو؟" وہی تفتیشی انداز!

"تم کون ہو؟ اور مجھ سے کیا پوچھ رہی ہو؟" جنت نے اب کے ٹھیک ٹھاک اس کی کلاس لینے کی ٹھانی۔

"آئمہ ظہیر ہوں میں۔ فارس وجدان میرے ڈیڈ کا بزنس پارٹنر ہے، شیرازی خاندان کے ساتھ ہمارے فیملی ٹرمز ہیں۔" گردن اکڑا کر اس نے تعارف کروایا۔ "اور تم۔" رک کر ایک بار پھر سر تا پیر جنت کا جائزہ لیا گیا۔ "تم کون ہو؟"

جنت نے چند لمحوں تک اسے بے تاثر نگاہوں سے دیکھا پھر اندر داخل ہو گئی۔ آئمہ ظہیر چونکی، پھر ٹھٹکی۔ اس طرح وہ پہلی بار نظر انداز ہوئی تھی۔ صدمہ گہرا تھا۔ نکلنے میں چند لمحے لگے۔ پھر وہ سرپٹ اس کے پیچھے بھاگی، سفید روش پر اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔

"آئم انگیجڈ۔" اس نے ہاتھ لہرا کر اپنی انگوٹھی جنت کو دکھائی۔

"گوڈ ٹو نو۔" ایک بار پھر جنت اسے مکمل نظر انداز کرتی مرکزی دروازے کی جانب بڑھی۔ آئمہ ظہیر اس کے برابر قدم اٹھانے لگی۔ کچھ دیر پہلے تک جو خفگی کے تاثرات تھے وہ اب ختم ہو چکے تھے۔ "ویسے کیا چل رہا ہے؟ گھر تک آ گئی ہو۔ کہاں تک بات بنی؟" لہجے میں اشتیاق تھا۔ تجسس تھا۔ ایکسائٹمنٹ تھی۔

جنت اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''ویسے میں تم پر واضح کر دینا چاہتی ہوں، یہ کوششیں ان پر نہیں چلتیں۔'' وہ اس کے برابر قدم اٹھانے لگی۔

''کسی اور سیارے کی فضائی مخلوق ہیں۔لڑکیوں سے یہ دس بیس تیس قدموں کی دوری پر رہتے ہیں۔کھڑے کھڑے منہ پر بے عزتی کر دیتے ہیں۔انتہا کے مغرور۔لیکن میرے ساتھ وہ اچھے ہیں، کیونکہ میں ان کی بہن ہوں۔مطلب اصلی والی نہیں۔لیکن وہ عذیر بھائی کے دوست ہیں، اس لیے وہ میرے بھی بھائیوں جیسے ہی ہیں اور سچ پوچھو تو مجھے بھی بڑا ارمان ہے ان کی شادی کا۔'' وہ جنت کے ساتھ اندر آ گئی تھی۔

''میں نے تو سوچ رکھا ہے کہ ان کی شادی پر خوب ہلا گلا کروں گی، آخر اتنا انتظار کروا رہے ہیں وہ، آنٹی تو بس ان کی نہ نہ سے عاجز آ چکی ہیں، ایک بار میں نے ان سے کہا تھا، یہ ایسے نہیں مانیں گے، گن پوائنٹ پر نکاح کروائیں۔یا جذباتی بلیک میل کریں انہیں۔یا پھر ایجنسی والوں سے بات کر کے پہلے انہیں اغوا کروائیں پھر رہائی کی شرط نکاح رکھیں۔اور آنٹی اتنی معصوم ہیں، وہ میرے مشوروں سے ہی ڈر جاتی ہیں۔''

جنت کے پیچھے وہ امریکن طرز کے شاندار کچن میں آ گئی۔زبان ابھی بھی چل رہی تھی۔''اصل میں وہ خاصے مغرور واقع ہوئے ہیں، انہیں کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آتی۔نہ وہ اپنی پسند بتاتے ہیں۔بس یہی کہتے رہتے ہیں میں نے شادی نہیں کرنی۔بھئی یہ ڈائیلاگ تو ہم لڑکیوں کے ہیں۔فارس بھائی نے چرا لیے۔اب بندہ وجہ پوچھے کیوں نہیں کرنی۔تو کہتے بس۔نہیں کرنی۔یہ لائن بھی ہماری ہی ہے۔''

کیبنٹ کھول کر جنت نے دو گلاس نکالے، پھر ان میں لائم جوس انڈیلا۔پشت آئمہ ظہیر کی طرف تھی۔جو کاؤنٹر ٹیبل کے اس پار کھڑی ہاتھ ہلا ہلا کر کہہ رہی تھی۔''ایسی ایسی لڑکیوں کے رشتے انہوں نے ٹھکرائے ہیں۔ایسی ایسی لڑکیوں کے۔کہ میں کیا بتاؤں۔'' جنت نے اسے لائم جوس کیک اور پیسٹری کے ساتھ پیش کیا۔

''تو......تم یہاں کام کرتی ہو؟'' پوچھتے ہوئے اس نے یہاں وہاں بھی دیکھا کہ شاید وہ ہیڈ سرونٹ ہو۔یا گھر کی منتظمہ۔یا پھر مسز شیرازی کی کوئی اسٹوڈنٹ۔

جنت نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو پھر؟''

''میں جنت کمال ہوں۔فارس وجدان کی بیوی۔''

جوس پیتے ہوئے آئمہ کو زور کا اچھو لگا۔گلاس رکھ کر بری طرح سے کھانستے ہوئے اس نے جنت کو دیکھا۔کچھ حیرت، صدمے اور بے یقینی سے۔پھر ہنسی اور بے ساختہ ہنستی چلی گئی۔''نائس جوک! آئی لائک اٹ۔'' ہنستے ہنستے بے حال ہی ہو گئی۔پھر ہنسی ضبط کر

کے بڑے ہی پروفیشنل انداز میں کاؤنٹر ٹیبل پر کہنیاں جما کر آگے ہوئی۔

''دیکھو اگر تم ان میں انٹرسٹڈ ہو تو میں تمہاری ہیلپ کر سکتی ہوں، فارس بھائی کو اس شادی پر آمادہ کرنے کے لیے باقاعدہ ایک پلاننگ کی ضرورت ہے، ہمیں ایک جال بچھانا ہوگا۔ایسا جال جو ان کے دل کو قابو کر لے۔'' سر جھکائے بڑے ہی پراسرار انداز میں بات کرتی وہ جنت کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر گئی۔

''ارے ارے تم تو ابھی سے شرما رہی ہو۔''

آئمہ کے عقب میں سیڑھیوں پر نظر پڑتے ہی جنت کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔

''فکر نہیں کرو، میں تمہارے ساتھ ہوں، مل کر گیم کھیلتے ہیں فارس بھائی کے ساتھ۔کوئی چال چلتے ہیں۔دیکھنا خود سے ہاں کریں گے وہ شادی کے لیے۔''

سر پر چپت رسید ہوئی تو اسے کیا ایک خطرے کا ادراک ہوا۔لفظ گم ہو گئے، یقیناً وہ اس کی خفیہ گفتگو سن چکا تھا

''اللہ، فارس بھائی! ایک تو آپ بھی نا۔پورے تین ماہ بعد واپس آئی ہوں۔مگر مجال ہے جو آپ میرا کبھی اچھے سے استقبال کر لیں۔''

''کس کے ساتھ گیم کھیلنا ہے۔اور کس کے لیے چال چلنی ہے؟'' اس کے تاثرات سخت نہ تھے۔آنکھوں میں جنت نے پہلی بار نرمی دیکھی۔

''وہ......میں......اصل میں......'' آئمہ ہکلائی۔

''ہاں۔وہ کیا میں......اصل میں......؟'' ذرا سے سخت تاثرات کے ساتھ پوچھا گیا۔

''وہ میں ان سے ایک ناول ڈسکس کر رہی تھی۔'' اس نے جنت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

فارس نے نظر اٹھا کر جنت کو دیکھا۔وہ ہنوز انہی تاثرات کے ساتھ خاموش کھڑی تھی۔مزید کچھ بھی کہے بغیر وہ سر جھٹک کر چلا گیا۔

''ڈڈیوسی دیٹ۔'' آئمہ نے بڑی اماؤں کی طرح فارس کی طرف اشارہ کر کے اپنی پیشانی کو چھوا۔''ایسے ہیں یہ......یہ نہیں کہ بہن تین ماہ بعد آئی ہے تو ٹھیک سے سلام دعا کر لیں۔نہیں! بس ایسے ہی غصے میں ہی رہنا ہے۔'' ایک بار پھر ساری ہمدردیاں سمیٹ کر وہ جنت کی طرف مڑی جو گھونٹ گھونٹ جوس پی رہی تھی۔

''ایک بار پھر سوچ لو، چڑیا سی تو ہو، گزارا کر لوگی اس طوفان کے ساتھ؟''

''آئمہ!'' لاؤنج سے فارس کی آواز آئی تھی۔

''اب کیا کر دیا میں نے؟'' وہ وہیں سے چلائی۔ پھر لائم جوس ایک ہی سانس میں چڑھا کر اسٹول سے اتری۔ ''ابھی چلتی ہوں، پھر آوں گی، پھر مل کر ڈسکس کریں گے کہ اس دیو کو کیسے قابو کرنا ہے، اینڈ پلیز! اگر تم فارس بھائی کی کوئی ایمپلائی ہو تو اس کے رعب میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جسٹ ریلیکس! ٹھیک ہے نا۔ اور مسز شیرازی کہاں ہوں گی؟''

''وہ اس وقت سو رہی ہوں گی۔''

''انہیں بتا دینا آئمہ آئی تھی۔ ان سے پھر ملنے آؤں گی۔''

فلائنگ کس دے کر وہ فارس کے ساتھ مدافعانہ انداز میں لڑتی الجھتی باہر چلی گئی تھی۔ جنت کی خاموش نگاہوں نے گلاس وال کے اس پار فارس کا دور تک تعاقب کیا تھا۔

☆☆☆

''خوش ہو؟'' ہینڈ ریلنگ پکڑ کر سیڑھیاں چڑھتے اس کے قدموں کی حرکت تھم گئی تھی۔ نگاہیں سکرین پر ابھرتے میسج پر یوں ٹھہریں کہ آس پاس سے غافل ہو گئی۔ کچھ دیر پہلے ہی اس کی سائرہ خالہ اور سدرہ کے ساتھ ویڈیو کال ہوئی تھی۔ اور اب عمار کا میسج آ گیا تھا۔ نہ سلام نہ دعا۔ ڈائریکٹ سوال۔ وہ سوال جو سائرہ خالہ نے بھی اس سے نہیں پوچھا تھا۔

''ماما سے تو کافی ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں تم۔'' دوسرا میسج۔

حلق میں ابھرتی گلٹی کو اس نے بمشکل نیچے اتارا۔

''یہ اتنا ہنسنا مسکرانا کب سیکھا تم نے؟'' تیسرا میسج۔ ''ایکٹنگ تو کمال کی ہے، بہت ایمپریس ہوا ہوں میں۔'' ساتھ ہی ہنسی کا اموجی۔

موبائل ہاتھ میں لیے وہ اپنی جگہ تھم کر رہ گئی۔

نہ نکاح میں شرکت کی تھی اس نے نہ ولیمہ اٹینڈ کیا تھا۔ اجنبیت تو نہ تھی کہ خالہ کا بیٹا تھا۔ مگر اس طرح کے چبھتے سوال۔ جو سوال کم جواب زیادہ لگ رہے تھے۔

وہ اس کے لیے بھائیوں جیسا تھا۔ شفیق۔ مہربان۔ احساس کرنے والا۔ ذرا ذرا سی بات پر اس کے لیے آپے سے باہر ہو جانے والا۔ سائرہ خالہ کی فیملی کا ہر ممبر اس کے لیے ایسا ہی تھا۔ مگر اس کے یہ چبھتے سوال! وہ اسے اتنا کیسے جان سکتا ہے؟ اس طرح سے کیسے جان سکتا ہے؟ اس کا ذہن الجھن کا شکار ہوا تھا۔

''کیسے ہو عمار؟''

اس نے سنبھل کر میسج ٹائپ کیا تھا۔

''کیا میں اسے اپنے سوالات کا جواب سمجھوں؟'' جواب آیا۔

وہ کچھ حیرت سے اسکرین کو دیکھ کر رہ گئی۔ اپنے پیچھے ڈھیر سارے سوالات چھوڑے اگلے ہی لمحے وہ آف لائن ہو گیا تھا۔ اور جنت کمال تشویش میں مبتلا اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

''تم دعا نہیں مانگتیں جنت۔''

نماز مغرب کے بعد وہ مسز شیرازی کے برابر میں بیٹھی خاموشی سے قالین کے ریشوں کو چھیڑ رہی تھی جب انہوں نے سوال پوچھ کر اسے چونکا دیا تھا۔

دعا۔

ایک پکار!!

ایک امید!!

ایک یقین!!

ایک صدا!!

''معافی تو مانگتی ہوں۔'' وہ کارپٹ پر انگلی سے لکیر کھینچتی جھکے سر کے ساتھ آہستگی سے بولی تھی۔

''اور دعا؟'' اب کے جنت نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔ کچھ حیرت، کچھ الجھن، کچھ گھبراہٹ سے۔

مسز شیرازی کی معیت میں رہتے ہوئے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ اسے اجنبیت یا کسی خوف کا احساس ہوا ہو۔ وہ ایسی ہی تھیں۔ اتنی ہی شفیق، اتنی ہی مہربان، نرم مزاج، اخلاق حسنہ کی مالک......

مگر اب وہ اس سے ایک ایسے راستے کی بابت استفسار کر رہی تھیں جس کے بارے میں خود وہ بھی ٹھیک سے کچھ جانتی نہ تھی۔ بھول گئی تھی وہ۔ چھوڑ دیا تھا سب اس نے۔

عسر یسرا کی پینٹنگ اب سامنے دیوار پر لگی نظر آ رہی تھی۔ اس کی نگاہیں وہیں کہیں تھیں۔ عسر پر پھسلتی۔ یسرا پر بھٹکتی......مگر ذہن کہیں اور تھا۔ توجہ کہیں اور تھی۔

''جنت۔'' اسے سوچوں میں غلطاں دیکھ کر انہوں نے پکارا تھا۔

''کیا مانگوں؟'' اسے اپنی آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

کتنی ہی دیر تک مسز شیرازی اس کی خالی آنکھوں میں دیکھتی رہیں۔ کوئی امید، کوئی یقین یا پھر زندگی کا ہی کوئی رنگ۔ کچھ تو

نظر آئے۔مگر وہاں کیا تھا۔ایک مہیب تاریکی۔ایک مہیب سناٹا۔

''جو تمہارا دل چاہے۔''انہوں نے نرمی سے کہا تھا۔

''جو میرا دل چاہے۔''کوئی شے پھانس کی طرح اس کے حلق میں اٹکی تھی۔نگاہیں عسر پر جا ٹھہری تھیں۔''اگر جو اللہ نہ چاہے؟''اس کے لب کپکپائے تھے،

''ایسا نہیں ہوتا کہ وہ نہ دے۔''

''کچھ دعائیں قبول نہیں ہوتیں آنٹی۔''شکایت بے ساختہ ہی لبوں پر آئی تھی۔''کچھ چیزیں نہیں ملتیں، کچھ لوگ نہیں ملتے، کچھ خواب ادھورے رہ جاتے ہیں۔کچھ نقصان پورے نہیں ہوتے۔''

دیوار گیر کھڑکیوں کے اس پار شام کا منظر اس کی تاریکیوں سے الجھ گیا تھا۔

''دعائیں رد نہیں ہوتیں جنت! محفوظ کر لی جاتی ہیں، جو آپ مانگ رہے ہوں وہ نہ ملے تب بھی آپ کے ہاتھ خالی نہیں لوٹائے جاتے۔اللہ ہمیشہ بڑھ کر عطا کرتا ہے، وہ آپ کو حیران کر دیتا ہے۔''

آنکھوں میں ابھرتی نمی کو دباتے ہوئے جنت نے سر جھکا لیا۔

کیا مانگے؟ ذہن شاید اب بھی یہیں اٹک جاتا تھا۔جس کی طلب تھی یا چاہ رکھتی تھی۔وہ اسے نہیں مل سکتا تھا۔جو محرومیاں اس کا مقدر ٹھہری تھیں وہ ''عطا''میں نہیں بدل سکتی تھیں۔کچھ کام مستحیل تھے۔ناممکن......اور کچھ معاملات میں وہ بے بس تھی......قطعی بے بس۔

''آپ کی دعائیں قبول ہوتی ہیں؟''یونہی سر اٹھا کر اس نے پوچھا تھا۔آواز رندھی ہوئی تھی۔

''ہاں ہوتی ہیں اور ایک خوب صورت دعا تو حال ہی میں قبول ہوئی ہے۔''وہ مسکرائیں۔

''کون سی دعا؟''وہی اشتیاق، تجسس سا سا ابھرا تھا اس کی آنکھوں میں۔

''یہی کہ مجھے فارس کے لیے ایک اچھی سی نیک سیرت لڑکی مل جائے۔''

جنت کی آنکھوں سے اشتیاق گم ہو گیا۔تجسس کی جگہ اذیت نے لے لی۔سر جھکا کر ایک بار پھر اپنے خول میں بند ہوئی اور قالین پر لکیریں کھینچنے لگی۔

مسز شیرازی گہرا سانس لے کر رہ گئیں۔

''دعا مانگتے رہنا چاہیے، قبول ہو جائے تب بھی، نہ قبول ہو تب بھی، کہ دعائیں رد نہیں ہوتیں۔جواب ضرور آتا ہے۔جھولی خالی نہیں رہتی۔اس میں کچھ نہ کچھ ضرور گرتا ہے۔''

وہ جنت کو دیکھ رہی تھیں اور جنت سر جھکائے بالکل خاموش بیٹھی تھی۔

☆☆☆

افق سے زمین پر اترتی شام کے رنگوں میں آج ستاروں کا راج تھا۔جو امید کا روپ دھارے اس کی آنکھوں میں بھی جگمگا رہے تھے۔

ڈائننگ ٹیبل کو مختلف ڈشز سے سجانے کے بعد جب وہ پانی کا جگ لیے واپس آئی تھی تو تو فارس وجدان صدر کرسی سنبھال چکا تھا۔سیاہ ٹراؤزر پر، سفید شرٹ میں ملبوس وہ عام سے حلیے میں تھا۔فراخ پیشانی پر بال بکھرے تھے۔آنکھوں میں سختی تھی نہ ہی خفگی کا کوئی تاثر۔

مگر وہ جانتی تھی اگلے چند لمحوں میں اس کے چہرے کے تاثرات کیسے ہونے والے تھے۔

وہ کرسی کھینچ کر بیٹھی تو فارس کی بھنویں سکڑ گئیں۔غالباً وہ شام کے کھانے پر اس کی موجودگی کی توقع ہرگز نہیں کر رہا تھا۔

عموماً وہ بھی مسز شیرازی کے ساتھ جلد ہی کھانا کھا لیا کرتی تھی، کیونکہ فارس کچھ تاخیر سے گھر آتا تھا اور اُنہیں وقت پر میڈیسن لینا ہوتی تھی۔مگر آج اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔آج وہ فارس وجدان کی منتظر رہی تھی۔

''ممی کہاں ہیں؟''اپنی پلیٹ میں پلاؤ ڈالتے ہوئے وہ ملازمہ سے پوچھ رہا تھا۔آنکھوں میں اب بے نام سی خفگی لہرا رہی تھی۔

''صاب وہ اپنے کمرے میں ہیں۔''

''کھانا گل خان نے بنایا ہے؟''اس نے پہلے چمچے کے ساتھ ہی اچانک سے پوچھا تھا۔

اس کے انداز، رویے اور لہجے سے کچھ خائف ہو کر جنت نے حلق میں ابھرتی گلٹی کو بمشکل نیچے اتارا تھا۔

ملازمہ نے ایک نظر جنت پر ڈالی تھی پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔''آج کا کھانا جنت میم۔''جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ پلیٹ میں چمچہ پٹخ کر اٹھ گیا تھا۔جنت کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔

''گل خان کہاں ہے؟''اب وہ انتہائی غصے کے عالم میں ملازمہ سے پوچھ رہا تھا۔

''وہ آٹھ بجے اپنے کوارٹر چلا گیا تھا۔''ملازمہ بھی ایک لمحے کے لیے جیسے اس کے غصے سے خائف ہوئی تھی۔

زیر لب کچھ بڑبڑاتے ہوئے وہ پاؤں پٹخ کر باہر نکل گیا۔

اب گل خان کی خیر نہیں۔ملازمہ کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔

جنت کمال اپنی جگہ پتھر ہوئی بیٹھی تھی۔اتنی نفرت!!! اس کا سانس رکا تھا۔نگاہیں میز پر سجی انواع واقسام کی ڈشز پر ٹھہر گئی تھیں۔

نفرت سے لڑنے کے لیے ''محبت''اس کے پاس نہیں تھی۔لیکن ایک کوشش۔کہ شاید رویے سے کام چل جائے۔اخلاق اور

خدمت سے فرق پڑ جائے۔لیکن اس سے فرق نہیں پڑتا تھا۔بالکل فرق نہیں پڑتا تھا۔

کپکپاتی انگلیوں سے گال پر پھسلتی لٹ کو پیچھے ہٹاتے وہ کرسی دھکیل کر اٹھ گئی تھی۔مارے خفت،شرمندگی اور بے عزتی کے احساس کے تحت اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔عجلت میں سیڑھیاں چڑھتی وہ کمرے میں بند ہوگئی۔کچھ وقت اس نے بالکنی میں بتایا تھا، کھلی فضا میں بھی اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔

''یہ ایک کاغذی رشتہ ہے جنت کمال!!یہ صرف کاغذ تک محدود رہے گا۔''

''ممی کو ایک بہو چاہیے تھی۔صرف ایک بہو!یہاں صرف بہو بن کر رہو۔بیوی بن کر میرے سر پر مسلط ہونے کی کوشش بھولے سے بھی مت کرنا ورنہ بہت برا کروں گا میں۔''

واش بیسن پر جھک کر اس نے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے اپنے چہرے پر مارے تھے۔پھر اس نے سر اٹھا کر خود کو آئینے میں دیکھا تھا۔پانی آنسوؤں کی تمیز مٹا رہا تھا۔روئی روئی سی آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں۔

''وہ اس رشتے سے راضی نہیں ہے۔''واش بیسن پر ہاتھ جمائے وہ روتے ہوئے جھک گئی تھی۔''بالکل بھی راضی نہیں ہے۔''

''کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا کہ وہ سرے سے شادی کے لیے تیار نہیں تھا۔''جنت نے بے ساختہ نگاہ اٹھائی تھی۔کچھ حیرت سے اپنا عکس دیکھا تھا۔

''خالہ بھی یہ بات جانتی تھیں۔''اس کے لبوں میں جنبش ہوئی۔''انہوں نے پھر بھی......''

''تم ہر بار یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ اس وقت تمھارے پاس اور کوئی آپشن نہیں تھا تمھارے چچا تمھارا رشتہ زمان سے طے کر رہے تھے،کیا وہ تمہیں منظور تھا؟''کاٹ دار لہجہ اسے چھلنی کر گیا۔وہ کرب سے لب بھینچ کر رہ گئی تھی۔ایک لمحے کے لیے سکوت چھایا تھا۔

''میں اس گھر میں صرف اس کی ماں کی وجہ سے ہوں،آنٹی ہارٹ پیشنٹ ہیں۔خدانخواستہ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو وہ مجھے اس گھر سے نکالنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگائے گا''اس کی آواز غم سے بوجھل ہو رہی تھی۔

''تو اس کی اس سوچ اور فیصلے کو بدلنا تمھارا کام ہے جنت۔''

''کیا سوچ اور فیصلے بدلنا آسان ہے؟''وہ زیر لب بڑبڑائی تھی۔

''محبت ہر کام آسان کر دیتی ہے۔''یہ اس کی آواز تھی جو ماضی کا سفر طے کر آئی تھی۔

''محبت۔''وہ تلخی سے مسکرائی۔''محبت ہی تو سب مشکل کرتی ہے۔''

''تم نے اپنی غلطیوں سے کچھ بھی نہیں سیکھا!تم اب بھی وہیں ہو،اسی مقام پر۔''تضحیک اڑاتا ہوا لہجہ اس کی دھجیاں بکھیر گیا۔

کچھ تکلیف،بے بسی اور ازردگی سے وہ خود کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔

''وہی غلطی۔وہی منزل۔وہی راستہ......''اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے لرزا دیا گیا۔

''تم نہیں سمجھ سکتیں۔''نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ واش بیسن پر جھک کر رونے لگی۔''تم بھی نہیں سمجھ سکتی۔''

''کیا تم نے فارس کو سمجھنے کی کوشش کی ہے؟''

وہ ایک لمحے کے لیے چونکی،ٹھٹکی پھر سسک پڑی۔''بس کرو۔''

''برہان ابھی تک تمہارے حواسوں پر سوار ہے۔''اتنے اچانک سے کہا گیا وہ گنگ ہوگئی۔ساکت ہوگئی،صامت ہوگئی......

''ایسا ایسا نہیں ہے۔''کچھ دیر بعد جب وہ بولنے کے قابل ہوئی تو لفظ بمشکل ادا ہوئے۔

''ایسا ہی ہے۔''

بیڈروم کا دروازہ بند ہوا تھا۔قدموں کی چاپ اٹیچڈ باتھ روم کے دروازے تک آ کر تھم گئی تھی۔

''برہان آج بھی تمھارے حواسوں پر ہے،اور تم اس کی ہی وجہ سے اپنے نئے گھر میں کوئی ایفرٹ نہیں کر رہی ہو!تم ایک بار پھر خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ رہی ہو!پچھلی بار خالہ آئی تھیں اور تمہیں وہاں سے نکال لائی تھیں...اس بار......اس بار کون آئے گا؟اللہ بھی انہی کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد کرنا چاہتے ہیں اور تم؟تم نے ان پندرہ بیس دنوں میں کیا ہی کیا ہے؟''

جنت کا حلق خشک ہونے لگا۔نچلا لب بیدردی سے رگڑتے ہوئے اس نے رونے پر قابو پانے کی سعی کی۔

''وہ اپنا ہر دروازہ بند کر رہا ہے اور تم اسے ایسا کرنے دے رہی ہو؟وہ تمہیں عدم کر رہا ہے اور تم ہو رہی ہو!وہی غلطی......وہی خطا۔''اندر کا شور بڑھ گیا۔شور ہمیشہ بڑھ ہی جایا کرتا تھا۔وہ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے چہرے پر مارنے لگی۔پھر اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔

وہی غلطی!

وہی خطا!!!

آواز بدستور گونج رہی تھی۔

☆☆☆

دوپہر کے وقت دیوار گیر کھڑکیوں کے سامنے صوفے پر نیم دراز میگزین کی ورق گردانی کرتے اس کی آنکھ لگ گئی تھی اور کھلی تب تھی،جب ساعت سے دل دوز چیخ ٹکرائی تھی۔ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے اس کی پہلی نظر آئمہ پر پڑی،جو صدمے سے گال پر ہاتھ رکھے اسے ہی دیکھے جا رہی تھی۔

’’یہ ابھی ابھی میرے کانوں نے کیا سنا ہے،تم واقعی میں۔اوہ گاڈ۔تم واقعی میں ان کی وائف۔اوہ گاڈ۔‘‘اس نے چہرے کے آگے ہاتھ جھلایا گویا سانس لینے میں دشواری ہو رہی ہو۔

جنت گھبراہٹ کے عالم میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔کندھے سے پھسلتے دوپٹے کو واپس جماتے اٹھنے ہی والی تھی کہ آئمہ اس کے برابر میں ٹک گئی۔۔

’’مجھے ابھی ابھی آنٹی نے بتایا۔ بھائی اور بھابھی کو بھی علم تھا لیکن انہوں نے مجھ سے چھپائے رکھا۔کہتے ہیں تمہیں سرپرائز دینا تھا۔یہ سرپرائز ہے یا گولی!سیدھا دل سے گزر گئی۔مجھے اتنا دکھ ہو رہا ہے میں نے ان کی شادی مس کر دی۔‘‘ساتھ ہی اس نے اپنی ہتھیلی مسلی۔’’آئی کانٹ بلیواٹ۔انہوں نے شادی کر لی۔‘‘ گردن موڑ کر اس نے جنت کو دیکھا۔‘‘ آخر سب نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟‘‘ کندھے سے لگ کر اس نے رونا چاہا۔پھر سر اٹھائے اسے ایک بار پھر دیکھا۔’’کیا واقعی تمھاری آنا فانا شادی ہوئی؟ایک ہی دن میں رشتہ طے ہوا،شام میں نکاح اور پھر رخصتی؟کیا واقعی میں ایسا ہی ہوا؟‘‘

جنت نے پزل ہو کر اثبات میں گردن ہلائی۔

آئمہ نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ سینے پر رکھا۔آنکھوں میں بڑوں کی سی شفقت اتر آئی۔’’یعنی تم چند گھنٹے ان کی منگیتر رہیں۔پھر منکوحہ ہوئیں۔پھر بیوی۔‘‘

اب کے جنت چپ رہی۔

’’سچ کہتے ہیں۔اللہ کے فیصلوں کے آگے انسان کی نہیں چلتی۔فارس بھائی جیسے بندے کی شادی ایسے ہی ہو سکتی تھی۔آناً فاناً۔نکاح کی اسنیپس تو ہوں گی۔ذرا وہی دکھا دو مجھے۔‘‘سائڈ ٹیبل سے موبائل اٹھا کر اس نے تصویریں دکھائیں۔

’’اللہ!ماشااللہ!کتنی پیاری لگ رہی ہو،واقعی فارس بھائی کے ساتھ تم ہی جچ سکتی ہو،اور یہ فارس بھائی۔‘‘اب کے فارس کی تصویروں کو زوم ان کر کے دیکھا گیا۔’’یہ ایسے کیوں بیٹھے ہیں جیسے مرچیں چبائے ہوئے ہوں۔ ہیں پورے طوفان ہی۔ذرا سا مسکرا دیتے تو کون سا جان نکل جانی تھی۔‘‘

تصویریں بدل بدل کر وہ تبصرے کر رہی تھی اور جنت اسے خاموش نگاہوں سے تکتی بالکل چپ بیٹھی تھی۔۔

’’جوڑی تو ویسے کمال کی ہے۔‘‘اشتیاق کے عالم میں ایک ایک تصویر کو دیکھتے وہ سراہ رہی تھی۔

’’میں بھائی اور بھابھی سے سخت خفا ہوں،آنٹی سے بھی میری بول چال بند ہے،اور فارس بھائی آج سے میرے بھائی نہیں ہیں۔ایسے کیسے کر سکتے ہیں یہ سب میرے ساتھ۔‘‘اس کا صدمہ،دکھ جا ہی نہیں رہا تھا۔’’مجھے پتا ہوتا وہ میرے دبئ جانے کے بعد شادی کر لیں گے تو میں کبھی نہ جاتی۔‘‘

’’تم کب آئیں؟‘‘ بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بناتے ہوئے جنت نے پوچھا۔

’’ابھی کچھ دیر پہلے!بھائی بھابھی کے ساتھ آئی ہوں۔سب نیچے ہیں۔آنٹی نے مجھے تمہیں بلانے کے لیے بھیجا ہے۔‘‘

’’مہمان آئے ہوئے ہیں۔‘‘جنت کے ہوش اڑے۔وہ بوکھلا کر اٹھی۔

’’ارے کہاں مہمان۔‘‘ آئمہ نے گویا ناک سے مکھی اڑائی۔’’ہمیں تم اپنا ہی سمجھو،ویسے تم صوفے پر کیوں سو رہی تھیں؟‘‘

الماری سے اپنا سوٹ نکالتے جنت چونک کر مڑی۔آئمہ ٹانگ پر ٹانگ جمائے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

’’میگزین پڑھتے پڑھتے آنکھ لگ گئی تھی۔تم جاؤ میں تیار ہو کر آتی ہوں۔‘‘

’’یہ درست ہے فارس بھائی اب میرے بھائی نہیں رہے لیکن تم میری بھابھی ہی ہو،جلدی سے کپڑے بدل کر آؤ تا کہ میں تمھارا اچھا سا میک اپ کر سکوں۔‘‘

جنت نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر سر جھٹک کر اٹیچڈ باتھ روم میں چلی۔مونگیا رنگ کے سنہرے کامدار اے لائن فراک میں ملبوس جب وہ باہر آئی تو آئمہ نے میگزین سے نگاہ ہٹا کر اسے ہی دیکھا۔

’’تمہارے بال بہت پیارے ہیں جنت۔‘‘وہ اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی۔’’اب تم بیٹھو میں تمہارا میک اپ۔‘‘

’’نہیں آئمہ!پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے۔‘‘

مگر اس نے ایک نہ سنی۔اسے زبردستی کرسی پر بٹھا کر ڈریسنگ ٹیبل پر نگاہ دوڑائی مگر وہاں فارس کی کریمز اور پرفیومز کے سوا کچھ نہ تھا۔پھر اس نے عجلت میں دراز کھینچے مگر میک اپ تو کہیں بھی نہ تھا۔

’’وہ۔ابھی میں نے اپنا سامان سیٹ نہیں کیا ہے۔‘‘اپنی شرمندگی پر قابو پاتی وہ تیزی سے اٹھی اور وارڈروب کے نچلے خانے سے میک اپ باکس نکال لائی۔

آئمہ نے پھرتی سے اس کا لائٹ میک اپ کیا۔بال بنائے۔پھر اپنی بھی کچھ نوک پلک سنواری۔

اس کے بعد وہ دونوں نیچے آ گئیں۔

لاؤنج میں تو گویا ایک محفل کا سماں تھا۔آئمہ کے بھائی اور بھابھی اپنے تین بیٹوں کے ہمراہ موجود تھے۔وہ ان سب سے خوش اخلاقی سے ملی۔پھر مسز شیرازی کے ساتھ سنگل صوفے پر بیٹھ گئی۔

’’اصولاً تمہیں فارس بھائی کے ساتھ بیٹھنا چاہیے تھا۔‘‘ آئمہ نے صوفے کے ہتھے پر ٹک کر سرگوشی کی۔اس نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔

آئمہ کی بھابھی آمنہ بہت ہی ملنسار اور خوش اخلاق تھیں۔تین بیٹے تھے۔ایک چھ سال کا تھا،دوسرا چار سال کا۔جب کے

سب سے چھوٹا والا گود میں تھا۔ گھر میں تو یقیناً بچے طوفان اٹھائے رکھتے ہوں گے مگر اس وقت وہ دونوں بہت مودب سے اپنے باپ کے ساتھ بیٹھے تھے۔

بڑا والا ذرا صحت مند تھا۔ سر اٹھائے جنت کو ہی دیکھتا رہا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی نظروں کا زاویہ نہ بدلا۔ جب سلام کرنے آیا تب بھی ذرا شرمایا شرمایا سا لگا۔ جنت نے نام پوچھا تو نام بتا کر اپنی ماما کے پہلو میں منہ چھپا لیا۔

''لو جی۔ اسد کا تو کام ہو گیا۔ عذیر بھائی!! آپ کے بیٹے کو ایک اور لڑکی پسند آ گئی۔'' آئمہ نے باقاعدہ اعلان کیا۔ سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

ڈنر باہر لان میں کیا گیا جہاں باربی کیو کا انتظام کیا گیا تھا۔ رات گئے تک خوب محفل جمی رہی تھی۔

مسز شیرازی اپنی میڈیسن لے کر سو گئی تھیں مگر فارس اور جنت نے مہمانوں کا پورا پورا ساتھ دیا تھا۔

آئمہ کی جنت کے ساتھ ان چند گھنٹوں میں صدیوں پرانی دوست ہو چکی تھیں۔ جاتے وقت دونوں کے درمیان فون نمبرز کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ آمنہ بھابھی نے تو خاص طور پر اسے اپنی طرف آنے کا کہا تھا۔

مہمان جا چکے تو گھر میں ایک بار پھر خاموشیاں راج کرنے لگیں۔ وہ کمرے میں آئی تو فارس کی موجودگی میں بھی تنہائی ایک بار پھر اسے ڈسنے لگی۔

واش روم کے آئینے میں اس نے خود کو دیکھا۔ آئمہ نے اسے بہت اچھے سے تیار کیا تھا۔ مگر جس کے لیے اسے تیار کیا گیا تھا اس نے تو نظر بھر کر بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ جیولری اتارتے، چہرہ دھوتے اس کی آنکھیں پھر سے نم ہونے لگیں۔

دروازے پر دستک ہوئی، قدموں کی آہٹ کے ساتھ ہی ملازمہ کی آواز ابھری۔ ''صاحب! بیگم صاحبہ آپ کو بلا رہی ہیں۔''

فارس کی مدھم آواز کے ساتھ قدموں کی چاپ ابھری۔ وہ واش روم سے باہر آئی تو کمرہ خالی تھا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے، صرف اس خیال کے تحت کہ مسز شیرازی کی طبیعت خراب نہ ہو، وہ عجلت میں قدم اٹھاتی نیچے آ گئی تھی۔

''جو مر چکا ہے، اس کے ساتھ مرنا چاہتی ہیں، جو زندہ ہے، اس کے ساتھ جینا نہیں چاہتیں۔'' بھاری گمبھیر آواز...... کسی پوشیدہ درد کی عکاسی کرتی ہوئی...... مسز شیرازی کے بیڈ روم کے سامنے جنت ٹھٹھک کر رک گئی تھی۔ دستک کے لیے اٹھا ہاتھ فضا میں ہی معلق رہ گیا تھا۔

''وہ تمھارا خون ہے۔'' مسز شیرازی کی آواز آنسوؤں سے بوجھل ہو رہی تھی۔

''وہ میرا کچھ نہیں ہے۔'' فارس کا انداز قطعیت بھرا تھا۔

اس نے ادھ کھلے دروازے سے اندر دیکھا۔ سامنے ہی بیڈ پر وہ مسز شیرازی کے پاس سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''اس کا تو کوئی قصور نہیں ہے فارس۔'' مسز شیرازی نے منت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔

''آپ مجھ سے میری جان کیوں نہیں مانگ لیتیں ممی!'' فارس کے لہجے میں بے بسی تھی۔ آواز میں درد۔

آنکھوں میں نمی لیے مسز شیرازی اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ اگلے کئی لمحوں تک ان کے مابین سکوت حائل رہا۔

''جب تک اس کی نانی زندہ تھیں میں کچھ مطمئن تھی۔'' وہ نم آنکھوں کے ساتھ بولیں...... ''مگر اب......''

فارس خاموش رہا۔

''چھوٹا سا یتیم بچہ ہے وہ! تم اسے آخر کس بات کی سزا دے رہے ہو فارس!! کیا تمہیں رحم نہیں آتا اس پر؟''

فارس نے جن نگاہوں سے انہیں دیکھا وہ اندر تک کٹ کر رہ گئیں۔

''مت کریں میرے ساتھ ایسے...... پلیز!'' وہ بے بسی سے کہہ اٹھا تھا۔ ''آپ نے کہا واپس آ جاؤ میں آ گیا۔ آپ نے کہا شادی کر لو میں نے کر لی۔ مگر یہ نہیں۔ اللہ کے لیے یہ نہیں۔''

''وہ تمہارا بھتیجا ہے فارس! تم اس کے لیگل گارجین ہو۔''

''کچھ نہیں ہے وہ میرا۔'' اس کی آواز یکایک بلند ہو گئی تھی۔

مسز شیرازی کرب سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ اپنا ہاتھ چھڑا کر وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا... جنت عجلت میں دروازے سے ہٹ کر پلر کی اوٹ میں ہو گئی تھی۔

کمرے سے باہر آ کر وہ ایک لمحے کے لیے رکا تھا۔ اس کا تنفس بھاری تھا، آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اپنی پیشانی مسلتے ہوئے وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا تھا۔ اور جنت کمال دم سادھے اگلے کئی لمحوں تک اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔

اپنے بے جان کھلونوں کو سنبھال سنبھال کر رکھنے والا جیتے جاگتے انسانوں کے معاملے میں اتنا بے رحم...... اتنا سفاک!

سگا یتیم بھتیجا جسے وہ اپنی کسٹڈی میں لینے کو تیار نہیں؟

اس نے سر اٹھا کر بند دروازے کو دیکھا۔ مسز شیرازی کا چہرہ آنکھوں میں سما گیا۔ کتنی تکلیف میں لگ رہی تھیں وہ۔

گہرا تنفس لے کر وہ الجھے ذہن کے ساتھ کمرے میں آ گئی تھی۔

فارس بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے موبائل اٹھائے بیٹھا تھا۔ تیزی سے کچھ ٹائپ کرتا ہوا۔ جنت کی آمد سے اس کے اعصاب تناؤ کا شکار ہوئے تھے۔ ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالتی وہ وارڈروب کی طرف بڑھ گئی۔ اپنا بلینکٹ اور تکیہ نکال کر جب سیدھی ہوئی تو موبائل سائڈ ٹیبل پر پٹخ کر وہ سر سے پیر تک لحاف تانے سونے کے لیے لیٹ چکا تھا۔

آنکھوں میں تفکرات کی پرچھائیاں لیے وہ اب اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

فارس کا بھائی! یتیم بھتیجا؟ جسے وہ اپنی کسٹڈی میں لینے کو تیار نہیں؟

مسز شیرازی اپنے پوتے سے ملنا چاہتی تھیں مگر فارس انہیں ملنے نہیں دے رہا تھا۔ وہ اسے اپنے پاس رکھنا چاہتی تھیں مگر فارس انہیں ایسا کرنے نہیں دے رہا تھا۔ ماں سے شدید محبت کے باوجود وہ انہیں کتنی بڑی اذیت سے دوچار کیے ہوئے تھا۔

ایسی بھی کیا بے بسی۔ ایسی بھی کیا بے حسی۔

کیسا انسان ہے یہ؟ دل نام کی چیز اس کے سینے میں ہے بھی یا نہیں؟

''تم بھی اس سے مختلف نہیں ہو جنت۔''

اس کی سوچ کو یک دم ہی بریک لگی تھی۔ خیال جامد ہوئے تھے۔ وہ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی تھی۔

ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اس کا عکس یکا یک ہی اس کی کیفیت پر مسکرانے لگا تھا۔ آواز اندر سے آئی تھی۔ آواز ہمیشہ اندر سے آتی تھی۔ کبھی ماضی کی شہ پر...... کبھی ضمیر کی صدا پر......اور وہ کتنی ہی دیر تک ساکت و جامد کھڑی رہ جاتی تھی۔

☆☆☆

دستک دے کر اس نے ادھ کھلے دروازے کو اندر کی جانب دھکیل دیا تھا۔ مسز شیرازی کھڑکی کے سامنے قرآن ہاتھوں میں لیے بیٹھی تھیں۔ ملازمہ ان کے لیے سیب کاٹ رہی تھی۔ اسے بھیج کر وہ خود ہی ان کے پاس بیٹھ کر سیب کاٹنے لگی۔ گاہے بگاہے ان کی آنکھوں میں بھی دیکھ لیتی۔ گزشتہ شب فارس کے ساتھ ہونے والی تلخ کلامی کا کوئی تاثر ان کے چہرے پر نہیں تھا۔ ناشتے پر بھی دونوں ماں بیٹا معمول کی طرح بات چیت کرتے رہے تھے جیسے ان کے مابین کوئی اختلاف رہا تھا نہ کوئی مسئلہ چل رہا تھا۔

گلاسز اتار کر سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے انہوں نے قرآن بند کر دیا۔ چند لمحوں تک وہ محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتی رہیں۔

''تمہیں راز ملا جنت؟'' کچھ یاد آ جانے پر انہوں نے نرمی سے پوچھا تھا۔

''کون سا راز؟'' بے ساختہ ہی سوال لبوں پر آیا تھا۔

''عسر یسرا کا راز۔''

ایک لمحے کو رک کر اس نے مسز شیرازی کو دیکھا پھر آہستگی سے گردن نفی میں ہلا دی۔

''راز اتنی آسانی سے منکشف نہیں ہوتے آنٹی! ہم جیسے گناہ گاروں پر تو شاید......شاید بالکل بھی نہیں۔''

''اگر راز منکشف نہ ہوتے تو کوئی گناہ گار تائب نہ ہوتا، کافر مسلمان نہ ہوتا، بھٹکے ہوئے راہ نہ پاتے، مومنین کا خطاب نہ پاتے۔''

کافی ٹیبل پر پلیٹ رکھ کر وہ سیدھی ہو بیٹھی تھی۔ گال پر پھسلتی لٹ کو کان کے پیچھے اڑستے ہوئے اس نے مسز شیرازی کو دیکھا۔ لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ سجائے وہ اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

''غور کرنے کے لیے، تدبر پانے کے لیے، چھپے ہوئے معانی کو واضح کرنے کے لیے وقت چاہیے، ہمت چاہیے، یقین چاہیے، طلب چاہیے۔ اپنے اندر کے سوال کو سمجھو جنت! یو وونٹ ریگریٹ اٹ۔''انہوں نے سیب کی قاش اٹھالی تھی۔

جنت خاموش رہی۔ سر جھکا رہا۔ انگلیاں مسلتے ہوئے اب وہ کچھ مضطرب نظر آ رہی تھی۔

''تم نے دعائیں کیوں چھوڑ دیں؟'' کئی لمحوں کی خاموشی کے بعد انہوں نے بہت نرمی سے پوچھا تھا۔

اور جنت نے بھی جواب دینے میں کچھ وقت لیا تھا۔

''میں جو مانگتی رہی ہوں اللہ نے وہ مجھے نہیں دیا۔''اس کی آواز غم سے بوجھل تھی۔

''کب تک مانگتی رہی ہو؟''

جنت کو ان کا سوال سمجھ میں نہ آیا۔ سر اٹھا کر اس نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

''کب تک؟ سال......دو سال......تین سال......چار سال......دس سال......بیس سال؟ سو سال؟''

وہ دم سادھے انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

''زکریا علیہ السلام نے تو ہمت نہیں ہاری تھی جنت! بوڑھے ہو گئے تھے، بیوی بانجھ تھی تب بھی انہوں نے اولاد کی دعا مانگنا ترک نہیں کی تھی۔''

جنت سن ہوئی تھی۔ کون سی بات کہاں آ کر واضح ہوئی تھی۔ کون سا پیغام کہاں آ کر ملا تھا۔

''انبیاء کی ایک خاصیت یہ بھی تھی۔ وہ دعائیں ترک نہیں کرتے تھے، صبر کرتے تھے اور مانگتے رہتے تھے۔''

جنت نے کچھ نہ کہا۔ وہ کچھ کہنے کے قابل بھی نہ رہی تھی۔

''سوال تمہیں اس آیت تک لائے گا جنت! سوال ہی تمہیں اس کے معانی سمجھائے گا۔''

کون کہہ سکتا تھا وہ اس کی ساس تھیں۔ ایک معلّمہ تھیں جو اس کے اندر کی گتھیاں سلجھانے میں جت گئیں تھیں۔

☆☆☆

خواب بھیانک تھا......آوازیں تکلیف دہ......

''امی! امی! امی۔'' وہ چیختے ہوئے ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ سر سے پیر تک پسینے میں شرابور، لرزتا کانپتا وجود......اور بھاری تنفس۔

"یہ روز روز کا کیا تماشا لگا رکھا ہے تم نے۔" اگلے ہی لمحے وہ اس کے سر پر دھاڑا تھا۔ کچھ خواب کی وحشت تھی اور کچھ فارس کی دہشت...... وہ سہم کر رہ گئی۔

جانے وہ اب کیا کہہ رہا تھا۔ کس بات پر چلا رہا تھا۔ اسے پتا نہیں تھا۔ یاد تھا تو بس یہی کہ بازو سے پکڑ کر اس نے اسے کمرے سے نکال باہر کیا تھا۔ ہاں یاد تھی تو دروازہ بند ہونے کی وہ آواز جو کافی دیر تک اس کے کانوں میں گونجتی رہی تھی۔

وہ ابھی تک اپنے خواب کے اثر میں تھی۔ لرز رہی تھی۔ کپکپا رہی تھی۔ وحشت و بے سکونی کی دلدل میں اترتی جا رہی تھی۔

وہ رات! وہ اس کی زندگی سے نکل کیوں نہیں جاتی؟

ننگے پیر، ٹھنڈے فرش پر بیٹھتے ہوئے اس نے اپنے گرد بازو باندھ لیے۔ سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔

"جنت نہیں! جنت پلیز! جنت میرا بچہ۔"

"مجھے بخش دو اللہ کے لیے۔" اپنے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس کی ساری برداشت اسی آواز پر ختم ہو جاتی تھی۔ یہی چیخ...... یہی پکار اس کی دھجیاں بکھیر دیتی تھی۔ جی چاہتا تھا وہ خود کو نوچ کھسوٹ ڈالے، زخمی اور لہولہان کر لے۔

"ساری زندگی تم نے امی کو دکھ دیئے ہیں...... ساری زندگی تم ان کے لیے مصیبت بنی رہی ہو جنت، اور اب یہ......" آوازوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

"امی! امی!!! امی دروازہ کھولیں۔"

وہ حواس باختہ ہو کر دروازہ بجانے لگی۔

"فارس دروازہ کھولو پلیز۔"

راہداری کا ملگجا اندھیرا روشنی میں بدل گیا تھا۔ مارچ کی وہ شب اپنی تمام تاریکیوں کے ساتھ اس کے دماغ میں حلول کر گئی تھی۔

"پلیز دروازہ کھولو فارس!!! خدا کے لیے۔" وہ گڑگڑائی۔

"بی بی جی ماہین بی بی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔" گاڑی کا ہارن کہیں دور سے بجا تھا۔

"فارس۔" اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ وہ دروازے پر زور زور سے ہاتھ مارنے لگی۔ مگر دروازہ نہیں کھلا تھا۔ اس رات بھی نہیں کھلا تھا۔

"ماہین...... برہان واصف کی دوسری بیوی۔"

وہ دروازے سے گھسٹ کر نیچے بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ اپنی چیخوں کا گلا بس وہ ایسے ہی گھونٹ سکتی تھی۔

تمام مناظر فلم کی طرح دماغ کی سکرین پر چلنے لگے۔ وہ ہانپتی، کانپتی، شدت سے روتی سٹڈی روم میں بند ہو گئی۔

ٹھنڈے فرش پر ٹانگوں کو سینے سے لگائے وہ ساری رات ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی رہی تھی۔

☆☆☆

اور بند دروازہ صبح کے سات بجے کھلا تھا۔

ہمیشہ کی طرح نک سک سے تیار وہ آفس ٹیبل کی جانب بڑھا تھا۔ جنت دروازے کی بائیں طرف فرش پر گھٹنے سینے سے لگائے بیٹھی تھی۔ سر اٹھائے سرخ و متورم آنکھوں سے اب اسے دیکھنے لگی تھی۔

"یہ کاغذی رشتہ ہے، کاغذ تک محدود رہے گا۔"

اطراف سے یکسر بے نیازی برتتے ہوئے اس نے لیپ ٹاپ کیس میں لیپ ٹاپ رکھا، اپنی فائل اٹھائی۔ کچھ ضروری ڈاکومنٹس اور پرنٹ آؤٹس کا سرسری سے جائزہ لیا اور پھر اسے مکمل طور پر نظرانداز کرتا اسٹڈی سے چلا گیا۔

"یہ احساس کتنا اذیت ناک ہوتا ہے کہ آپ موجود ہوں اور کوئی آپ کو 'عدم' کر دے۔ آپ ماورائی ہو جائیں، نظر ہی نہ آئیں۔" آنسو بہت پہلے خشک ہو چکے تھے۔ وہ اب رو نہیں رہی تھی۔ عادتاً اپنے داہنے ہاتھ کی کلائی بائیں ہاتھ میں مضبوطی سے تھامے پتھر ہوئی بیٹھی تھی۔

"ٹوٹا ہوا انسان یا تو سانس کی طرح ساکن ہو جاتا ہے یا پھر سمندری لہروں کی طرح سرکش۔"

کس قدر کوشش سے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ الجھے بکھرے بالوں کو سمیٹ کر اسٹڈی سے باہر آ گئی۔ اس کا رخ بیڈ روم کی طرف تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ واش بیسن پر جھکی ہوئی تھی۔ پھر وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنے بال بنا رہی تھی۔ فریش ہو کر نیچے آئی تو ڈائننگ ہال میں مسز شیرازی اور فارس موجود تھے۔

اس کی روئی روئی سی آنکھیں سوجی ہوئی اور متورم لگ رہی تھیں مگر چہرے پر بشاشت تھی... لبوں پر مسکراہٹ۔

ایک ایکٹنگ فارس کر رہا تھا۔ ایک وہ کر رہی تھی۔ دونوں کمال کے اداکار تھے۔

"وہ تمہیں عدم کر رہا ہے، اور تم اسے ایسا کرنے دے رہی ہو!۔"

اس نے فارس کو دیکھا۔ اس کا چہرہ ہر طرح کے تاثر سے عاری تھا۔

کوئی انسان اتنا بے حس، اتنا بے رحم کیسے ہو سکتا ہے؟

"جب کوئی اپنے لیے خود بے رحم اور سفاک ہو جائے تو اسے دوسروں کی سفاکیت پر سوال نہیں اٹھانا چاہیے۔" وہی آواز......

حلق میں ابھرتے آنسوؤں کے پھندے کو نیچے اتارتے ہوئے وہ پلیٹ پر جھک گئی۔ چھری کانٹے کی مدد سے چیز آملیٹ کھاتے ہوئے اس انگلیاں کپکپا رہی تھیں۔ وہ فارس کو دیکھنا نہیں چاہتی تھی مگر نگاہیں تھیں کہ بار بار اس کے پرسکون اور مطمئن سے چہرے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔

وہ اپنے یتیم بھتیجے کو اپنی سرپرستی میں لینے کو تیار نہ تھا۔ وہ اسے اپنی زندگی میں کوئی مقام دینے کو آمادہ نہ تھا۔ ایسے انسان سے محبت تو دور کی بات......رحم کی امید بھی نہیں رکھی جا سکتی تھی اور وہ یہ توقع کر رہی تھی کہ اس کا دل نرم ہو جائے گا؟ وہ اسے صرف اور صرف برداشت کر رہا تھا، اور جنت اس کی برداشت میں گنجائش دیکھ رہی تھی؟

’’پچھلی بار خالہ آئی تھیں، اس بار کوئی نہیں آئے گا۔ اس بار تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔‘‘

اس نے چائے کے گھونٹ کے ساتھ کئی آنسو اپنے اندر اتار لیے تھے۔

ناشتے کے بعد وہ مسز شیرازی کے ساتھ لان میں آ گئی تھی۔ لان چیئرز پر ان کے سامنے وہ دھوپ میں بیٹھی تو وہ اسے بغور سے دیکھنے لگیں۔

’’تم ساری رات روتی رہی ہو؟‘‘ انہوں نے اتنے اچانک سے پوچھا کہ لمحے بھر کے لیے وہ کمزور پڑ گئی۔ آنکھوں کے کنارے نم ہوئے، ہونٹ کپکپا کر رہ گئے، دل چاہا وہ سب کچھ ان کے گوش گزار کر دے مگر۔

’’نہیں اصل میں سر درد کی وجہ سے میں ٹھیک سے سو نہیں پائی! نیند پوری نہ ہو تو میری آنکھیں ایسی ہو جاتی ہیں۔‘‘

مسز شیرازی نے اس کے وضاحتی جواب کو خاموشی سے سنا پھر وہ سامنے املتاس کے ان درختوں کو دیکھنے لگیں، جو بیرونی دیواروں پر جھکے ہوئے تھے۔ معمول کے برعکس وہ کچھ خاموش سی تھیں۔

’’فارس تمہارے ساتھ کیسا ہے؟‘‘

چند روز قبل انہوں نے پوچھا تھا۔ آج دوبارہ پوچھ رہی تھیں۔ چند روز قبل آنکھوں میں جھانک کر پوچھا تھا۔ آج آنکھیں چرا کر پوچھ رہی تھیں۔

’’بہت اچھا ہے۔‘‘ ہمیشہ کی طرح اس کی مسکراہٹ آنکھوں تک نہیں پہنچی تھی۔ اس نے ابھی تک فارس کے جارحانہ رویے کی بھنک انہیں نہیں پڑنے دی تھی۔ وہ ہارٹ پیشنٹ تھیں، بیمار رہتی تھیں۔ اسے احساس تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے سامنے فارس بھی کس قدر محتاط ہو جاتا تھا اور کوئی بھی ایسی حرکت نہیں کرتا تھا جس سے یہ ظاہر ہو کہ ان کا تعلق کس نوعیت کا ہے۔

’’آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟‘‘ جنت کو تشویش ہوئی تھی۔

انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ پھر ہنس دیں...... جانے انہیں ہنسی کس بات پر آئی تھی مگر اس ہنسی میں بھی ایک بے بسی تھی۔

’’ہاں میں ٹھیک ہوں۔‘‘ وہ جنت کے گال پر ہاتھ رکھ کر محبت سے بولیں۔ ’’تمہاری طرح میں بھی ٹھیک سے سو نہیں پائی۔‘‘

جنت نم آنکھوں سے انہیں دیکھ کر رہ گئی۔ دونوں کا اپنا ایک درد تھا، اور دونوں ہی ایک دوسرے سے چھپانا چاہ رہی تھیں۔

جنت نے گہرا سانس لے کر ہیئر مان ہیسے کی کتاب کھول لی تھی۔ خالی الذہنی کی کیفیت میں وہ اب مطلوبہ صفحہ تلاش رہی تھی۔

جو انسان اپنے یتیم بھتیجے کے لیے بے رحم ہو وہ اس کے لیے رحمدل کیسے ہو سکتا ہے؟ جو نکاح جیسے مضبوط رشتے کا مذاق بنا دے۔ اس انسان سے وہ کسی اچھائی کی امید رکھ بھی کیسے سکتی ہے؟ اس نے سر اٹھا کر مسز شیرازی کو دیکھا، وہ کھوئی کھوئی سی بیٹھی تھیں، نگاہیں دور کہیں بھٹک رہی تھیں۔ چہرہ کسی پوشیدہ درد کی عکاسی کر رہا تھا۔

’’تم ایک بار پھر خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ رہی ہو جنت! تم ایک بار پھر وہی غلطی دہرا رہی ہو۔‘‘

کتاب پر اس کی انگلیوں کی گرفت یکا یک مضبوط ہوئی تھی۔

’’ٹوٹا ہوا انسان یا تو سانس کی طرح ساکن ہوتا ہے یا پھر سمندری لہروں کی طرح سرکش۔‘‘ نانا اکثر کہا کرتے تھے۔

مگر جو ساکن ہوتا ہے، اسے سرکش ہونے میں دیر بھی نہیں لگتی۔ یہ بات اب وہ فارس وجدان کو بتانے والی تھی۔

☆☆☆

آفس سے واپسی پر کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹھک کر رکا تھا۔ ایک لمحے کے لیے جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

کھڑکیوں کے پردے، بیڈ شیٹ، دیواروں کی پینٹنگز، ڈیکوریشن پیس حتی کہ وہ صوفہ تک بدل چکا تھا جو اس کے بیڈ روم کی مشرقی دیوار کے ساتھ رکھا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کاسمیٹک کے سامان سے سجی تھی۔ بیڈ سائڈ اور کافی ٹیبلز پر تازہ پھولوں کے گلدان رکھے تھے۔ زندگی سے بھرپور فضا معطر سی تھی۔ مگر یہی معطر فضا اس کے تنفس پر کتنی بھاری پڑ رہی تھی یہ صرف وہی جانتا تھا۔

سامنے ہی جنت وارڈروب کھولے، اس کی کچھ شرٹس ہاتھوں میں لیے اپنے کام میں مگن کھڑی تھی۔

لیپ ٹاپ کیس بیڈ پر پٹختے ہوئے وہ انتہائی غصے کے عالم میں اس کی جانب بڑھا تھا۔ بازو سے پکڑ کر اپنے کپڑے اس کے ہاتھوں سے جھپٹ کر درشتی سے اس کا رخ اپنی طرف موڑا تھا۔

’’یہ کیا کرنے کی کوشش کر رہی ہو تم۔‘‘ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔

’’اپنا کام۔‘‘ فارس وجدان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جب وہ بولی تو اس کے لہجہ ہموار تھا۔

’’میری چیزوں کو ہاتھ لگانے کی تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟‘‘

’’ایسے ہی! سوچا شوہر کو اپنے حقوق و فرائض کا خیال نہیں ہے تو میں ہی کر لوں،‘‘ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا تھا۔

اب وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھی۔

نہ خوف کا تاثر تھا۔نہ وحشت تھی آنکھوں میں اور نہ گھبراہٹ!

''میرے معاملات میں دخل اندازی بند کرو ورنہ......'' فارس نے وارڈروب سلائڈ کر کے زور سے بند کر دی تھی۔

''ورنہ کیا؟'' سوالیہ ابرو اٹھا کر اس نے پوچھا۔

فارس کے چہرے کے تاثرات ایک لمحے کے لیے بدلے تھے۔اس کی آنکھوں میں جھانک کر پورے اعتماد کے ساتھ اپنا سوال دہرانے والی یہ وہ لڑکی تھی جو سر اٹھا کر اس سے بات تک کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی تھی۔

''میں نے تمہارے جوتوں کا سٹاک بھی سیٹ کر دیا ہے۔تمہاری ٹائیز اس ڈرا میں ہیں، تھری پیس سوٹ یہاں لٹکا دیئے ہیں۔کف لنکس اور رسٹ واچ......''

اگلے ہی لمحے اس کی گردن فارس کے آہنی شکنجے میں تھی اور چوڑیوں سے بھری داہنی کلائی اس کے بائیں ہاتھ میں...... جنت کا دماغ بھک سے اڑا۔وہ اس حملے کے لیے ہرگز ہرگز تیار نہیں تھی۔

''ہاں تو کیا کہہ رہی تھیں آپ؟'' اس کی سخت پتھریلی آواز اور آنکھوں کا تاثر جنت کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑا گیا۔

''چھ......چھوڑو...... مجھے......'' اس کا دم گھٹنے لگا۔سانس رکنے لگا۔

''ذرا دوبارہ کہیے میں نے سنا نہیں۔'' فارس کی گرفت بڑھتی گئی۔کلائی پر بھی، گردن پر بھی۔اسے لگا وہ بس مرنے کو ہے۔

''ہو کون تم؟ اوقات کیا ہے تمہاری؟''

جنت کا چہرہ تکلیف کی شدت سے سرخ ہو گیا۔آنکھیں بھر آئیں اور سانس......سانس تو جیسے اسے آ ہی نہیں رہا تھا۔

''آخری بار۔'' اس کی خوف سے پھیلی آنکھوں کو اپنی آنکھوں کے فوکس میں لیتے ہوئے وہ غرایا۔''آخری بار تمہاری اس غلطی کو نظر انداز کر رہا ہوں، اگلی بار تم نے ایسا کچھ بھی کرنے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔''

ایک جھٹکے سے اسے چھوڑتے ہوئے وہ پیچھے ہٹ گیا۔جنت کھانستے ہوئے نیچے گر گئی تھی۔

غصے سے بڑبڑاتے ہوئے اس نے پھولوں کے گلدان فرش پر دے مارے تھے۔پھر وہ اسی طیش کے عالم میں کمرے سے نکل گیا تھا۔جنت کا تنفس پھولا ہوا تھا، داہنا ہاتھ گردن پر ٹھہرا تھا، چہرے کا رنگ اڑا ہوا، آنکھیں وحشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔

کچھ ہی دیر میں ملازمہ اندر آئی تھی، ذرا گھبرائی ہوئی سی عجلت میں صفائی کرنے لگی تھی۔اس نے بھولے سے بھی جنت کی طرف نہیں دیکھا تھا، نہ ہی بات کرنے کی کوشش کی تھی۔آرڈر سخت تھا۔فارس کے ملازم صرف فارس کی ہی سنتے تھے۔

انتہائی کوشش سے اٹھ کر وہ سیدھا ٹیرس پر چلی آئی تھی۔بادلوں بھری شام...... کچھ اداس......کچھ ویران سی تھی۔دور کہیں بجلی

چمکی تھی۔بادل بھی گرجے تھے۔ریلنگ پر جھک کر اس نے خود پر قابو پانے کی سعی کی تھی.. آنکھوں میں ابھرتی نمی کو پلکیں جھپکا جھپکا کر روکا تھا۔

وہ آج رونا نہیں چاہتی تھی۔تنہائی میں بھی نہیں۔اگر وہ پہلی چوٹ پر ہی خود کو زمین بوس ہونے سے نہ بچا پائی تو پھر کبھی اٹھ نہیں پائے گی۔اگر آج بھی وہ خوف میں آ گئی تو کچھ بھی بدل نہیں پائے گی۔

اسے ہمت نہیں ہارنی تھی۔حوصلہ نہیں چھوڑنا تھا۔ایک بار پھر اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے اس نے سرخ پڑتی آنکھوں کو بیدردی سے رگڑ ڈالا تھا۔سسکیوں کو دبا لیا تھا۔اذیت کو چھپا لیا تھا اور تب ہی کسی احساس کے تحت اس نے اپنی چوڑیوں بھری کلائی کو چھوا تھا۔

تیز ہواؤں کے ساتھ بارش کی پہلی بوند اس کی پیشانی پر گری۔اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔

طلوع آفتاب سے پہلے رات کتنی تاریک ہوتی ہے۔

اور طوفان سے پہلے خاموشی کتنی مہیب لگتی ہے۔

''کچھ لوگ اپنی کشتیاں خود جلاتے ہیں۔کچھ کی جلا دی جاتی ہیں۔''

''جن کی جلا دی جائیں انہیں کیا کرنا چاہیے؟''

''انہیں زیادہ ہمت، زیادہ صبر، زیادہ قوت دکھانی چاہیے۔''

بارش شروع ہو چکی تھی۔

زیادہ ہمت۔زیادہ صبر۔زیادہ قوت!

وہ ٹیرس کی سیڑھیاں اتر کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔اپنی اسٹڈی سے باہر نکلتا فارس بھی اسی طرف آ رہا تھا۔

بیڈروم کے سامنے ایک لمحے کے لیے رک کر اس نے فارس کو دیکھا پھر اندر داخل ہوتے ہی دروازہ زور سے بند کر دیا۔عین اس کے منہ پر

فارس کا دماغ بھک سے اڑا۔وہ اس کی جرأت پر شاکڈ رہ گیا تھا۔

شدت سے دھڑکتے دل اور پھولے تنفس کے ساتھ وہ دبے قدم پیچھے ہٹ گئی تھی، مٹھیاں سختی سے بھینچے اب سر اٹھائے کھڑی تھی۔

فارس نے شدید غصے کے عالم میں دروازہ دھڑ دھڑایا، مگر وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہ ہلی تھی۔اب وہ اپنے کسی ملازم پر برس رہا تھا۔

جنت تکیہ اور بلینکٹ اٹھائے صوفے کی جانب بڑھ گئی۔ کچھ ہی دیر میں دروازہ کھل گیا تھا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' آندھی طوفان کی طرح وہ اس کے سر پر پہنچ کر دھاڑا تھا۔

''تم کرو تو حق ہے تمہارا۔ میں کروں تو بدتمیزی۔'' وہ مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ فارس شعلہ بار نگاہیں اس پر جمائے کھڑا رہا۔

بادل کچھ شدت سے گرجے تھے۔ بجلی بھی چمکی تھی۔ دیوار گیر کھڑکیوں پر بارش کے قطرے اب کچھ زیادہ ہی روانی سے گرنے لگے تھے۔

''خیر لگی ہو تم، چابی ہے تمہارے پاس! جن کے پاس نہیں ہوتی انہیں پھر کسی دھتکارے ہوئے انسان کی طرح کسی تاریک کمرے کے ٹھنڈے فرش پر رات گزارنی پڑتی ہے۔''

سر اٹھائے، اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ جس انداز اور لہجے میں اس سے بات کر رہی تھی، وہ کچھ بھی تھا مگر نرم نہیں تھا۔ لفظ جیسے مشتعل تھے۔ آگ پکڑے ہوئے... ضبط کے مراحل سے گزر کر تحمل سے ادا کیے ہوئے۔

''میں تمہیں وارن کر رہا ہوں.....''

''وارن میں تمہیں کر رہی ہوں۔'' انگلی اٹھا کر اس نے فارس کی بات درشتی سے کاٹ دی تھی۔

مٹھیاں سختی سے بھینچے، لب باہم پیوست کیے فارس برداشت کی انتہا پر کھڑا تھا۔

''آخری بار میں تمہاری اس غلطی کو نظر انداز کر رہی ہوں۔ اگلی بار تم نے ایسا کوئی بھی سین کریئیٹ کیا، یا مجھے اپنے معاملات سے دور رکھنے کی کوشش کی تو میں خاموش نہیں رہوں گی۔ میں آنٹی کو سچ سچ میں اس نکاح کی حیثیت سے آگاہ کر دوں گی جو تمہارے نزدیک فقط ایک کانٹریکٹ ہے۔'' اس نے سخت لہجے اور صاف لفظوں میں اس پر اپنے ارادے واضح کر دیئے تھے۔ ''میں انہیں بتا دوں گی تم ان کی موت کا انتظار کر رہے ہو تاکہ مجھ سے جان چھڑا سکو۔''

''جسٹ شٹ اپ۔'' وہ حلق کے بل دھاڑا۔

''کیوں؟ کیا تم ایسا نہیں چاہتے؟ میں اس گھر میں آنٹی کی وجہ سے ہوں، کیا تم نے مجھ سے یہ نہیں کہا؟'' وہ چلائی۔

فارس ضبط کر گیا۔

''کیا تم نے مجھ سے یہ نہیں کہا یہ نکاح صرف کاغذ تک محدود رہے گا؟ ہاں۔''

دوسری طرف خاموشی تھی۔

''یہ آخری وارننگ ہے! میں بتا رہی ہوں میں خاموش نہیں رہوں گی۔''

صوفے پر دراز ہوتے ہوئے اس نے بلینکٹ اپنے وجود پر پھیلا لیا۔ دوبارہ اس نے فارس وجدان کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی

تھی۔

☆☆☆

جنت کمال اپنے ارادوں میں کتنی سنجیدہ ہے اس کا اندازہ فارس وجدان کو اگلے دن ہی ہو گیا تھا جب مسز شیرازی نے اسے جنت کو شاپنگ پر لے جانے کا کہا تھا۔ کتنی ہی دیر تک تو وہ صدمے کی کیفیت میں کھڑا رہا تھا۔

میٹنگ، کاروبار، اور کمپنی سے متعلق حیلے بہانے اس کے کسی کام نہیں آ سکتے تھے کہ آج چھٹی کا دن تھا۔ اور چھٹی کا دن وہ زیادہ تر مسز شیرازی کے ہمراہ گھر پر گزارتا تھا۔

اس نے خونخوار نگاہوں سے جنت کو دیکھا جو رائل بلیو ڈریس میں اس کے ساتھ شاپنگ پر جانے کے لیے مکمل تیار کھڑی تھی۔

مسکراہٹ تو مسز شیرازی کے سامنے وہ ہمیشہ لبوں پر سجائے رکھتی تھی مگر آج فارس وجدان کو اس کے لبوں کا تبسم اپنا مذاق اڑاتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ آنکھوں میں تضحیک نظر آئی۔ انداز طنزیہ لگا۔ مگر وہ ضبط کر گیا۔ اسے اب ضبط ہی کرنا تھا۔ مزید کوئی بدمزگی وہ نہیں چاہتا تھا۔ نہ ہی وہ چاہتا تھا کہ وہ مزید باغیانہ انداز اپنا لے۔

گاڑی کی چابی اور موبائل سنبھالتے ہوئے وہ اٹھا تو جنت بھی مسز شیرازی سے مل کر اس کے پیچھے باہر آ گئی۔

پیسنجر سیٹ پر بیٹھتے ہی اس نے ہینڈ بیگ گود میں رکھ لیا تھا اور اس کے چہرے کے طوفانی تاثرات کو نظر انداز کرتی کھڑکی سے باہر ہی دیکھتی رہی تھی۔ دوڑتے بھاگتے مناظر کے ساتھ وہ بھی کسی دوڑ میں شامل ہو گئی تھی۔

لب بھینچے، دانت پیسے اور اسٹیرنگ وہیل پر خطرناک حد تک گرفت مضبوط کیے وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا ورنہ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ رفتار بڑھائے اور گاڑی کسی ٹرک میں دے مارے... خود بھی مر جائے اور اس جنت کو بھی مار ڈالے۔

پندرہ بیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ شہر کے بہترین مال کی پارکنگ میں گاڑی روک چکا تھا۔ جنت فوراً سے باہر نکل گئی تھی مگر وہ گاڑی میں ہی بیٹھا رہا تھا۔

''میرے خیال سے تم مجھے یہاں شاپنگ کے لیے لائے ہو۔''

اس نے جذبات کی شدت سے سرخ ہوتی آنکھوں سے جنت کو دیکھا... وہ کھڑکی میں کہنیاں جمائے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔

''یا پھر چاہتے ہو کہ میں آنٹی کو فون کر کے کہوں کہ تم میرے ساتھ مال کے اندر جانے کو تیار نہیں ہو؟''

وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ بھی اسے دیکھتی رہی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ مسکرا رہی تھی اور وہ دانت کچکچا رہا تھا۔

''تو یہ تمہارا اصلی رنگ ہے۔''

اور جنت ہنس دی۔ پھر کافی دیر تک ہنستی ہی رہی۔ وہ مٹھیاں بھینچے اسے سرد نظروں سے دیکھتا رہا۔

''تم اپنی ماں کے حوالے سے جانے کتنی بار مجھے اس رشتے کی نوعیت جتا چکے ہو، اور جب میں جتانے پر آئی ہوں تو بات میرے روپ پر آ گئی ہے۔'' وہ ایک بار پھر ہنسی.. جیسے فارس کے سوال نے اسے کافی محظوظ کیا ہو۔

ناچار اسے گاڑی سے باہر آنا پڑا۔ پھر بگڑے تیوروں کے ساتھ وہ لیدر جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے مختلف شاپس میں اس کے پیچھے پیچھے پھرتا رہا۔ وہ اس کا صبر آزما رہی تھی۔ گھوم رہی تھی اور کچھ خرید بھی نہ رہی تھی۔

وہ بار بار کلائی موڑ کر وقت دیکھتا تھا، موبائل نکال کر اسکرولنگ کرتا تھا اور جب سر اٹھا کر اسے دیکھتا تھا تو وہ تب بھی اسے خالی ہاتھ ہی نظر آتی تھی۔ اسے غصہ تو بہت چڑھا ہوا تھا مگر وہ ضبط کیے رہا۔

پارہ تو اس کا اس وقت ہائی ہوا جب وہ بچوں کی شاپ میں داخل ہوگئی تھی۔ اور اب اس کے سامنے چھوٹے چھوٹے بچوں کی منی منی سی اشیا اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگی تھی۔ بچیوں کے پورشن میں کچھ رش تھا۔ وہ بچوں کے پورشن میں کھڑی تھی۔ اور چیزیں پسند کر کے اب ٹرالی میں رکھ رہی تھی۔

فارس کی رگیں پھول گئیں... وہ ضبط کے آخری مراحل سے گزر رہا تھا۔

موزے، کپڑے، فیڈر، کھلونے اور جانے کیا کچھ خرید کر وہ کاونٹر پر آ گئی۔

پے منٹ کے لیے اس نے فارس کو دیکھا جس نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے والٹ سے کریڈٹ کارڈ نکال کر سیلز بوائے کو دیا۔

''بس ہوگئی میری شاپنگ۔'' پے منٹ ادا کر کے جب وہ باہر نکلے تو وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ فارس اس لمحے کیسا نظر آ رہا تھا یہ دیکھنے کی اس نے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

اب وہ تیز تیز قدم اٹھاتا آگے تھا اور وہ اس کے پیچھے، لبوں پر تبسم تھا، آنکھوں میں شرارت۔

اس کی توقع کے عین مطابق وہ سامنے لیڈیز گارمنٹس کی شاپ میں داخل ہو چکا تھا۔ اسٹینڈ پر لٹکے چند ریڈی میڈ برانڈ کے جوڑوں کا آرڈر دے کر اس نے کریڈٹ کارڈ نکالا تھا۔

جنت گلاس وال کے اس پار کھڑی تھی اور اپنے لبوں پر ابھرتی مسکراہٹ کو بار بار دبانے کی سعی کر رہی تھی۔

سیلز بوائے نے ڈریسز پیک کر کے دیئے تو وہ بگڑے تیوروں کے ساتھ باہر آ گیا۔

''پکڑو انہیں۔'' انداز منہ پر مارنے والا تھا، جنت بروقت نہ پکڑتی تو شاپنگ بیگز فرش پر ڈھیر ہو جاتے۔

''اس کی کیا ضرورت تھی فارس!'' اس نے بہت لاڈ سے پوچھا۔

''ضرورت تو تھی۔'' فارس نے دانت کچکچائے۔ (ظاہر ہے گھر پہنچتے ہی اس کی ممی نے شاپنگ سے متعلق پوچھنا تھا اور جنت نے بچوں کے کپڑے دکھانے تھے!)

اور تب ہی۔ ہاں شاید تب ہی جیولری شاپ سے نکلتی جینز اور ٹاپ میں ملبوس ایک سٹائلش سی لڑکی ٹھٹک کر رک گئی تھی۔ شاپنگ بیگ پر اس کی گرفت یک دم مضبوط ہوئی تھی۔ آنکھوں میں بے یقینی کا تاثر ابھر آیا تھا۔

اس نے پہلے فارس کو دیکھا تھا۔ اب وہ جنت کو دیکھ رہی تھی۔

صدمہ۔ حیرت۔ بے یقینی۔ شاک!

فارس جانے کے لیے مڑ گیا تھا۔ لبوں پر شرارتی مسکراہٹ سجائے جنت بھی عجلت میں قدم اٹھاتی اس کے پیچھے لپکی تھی۔ اور تب ہی اسے اپنے وجود پر بے نام سی تپش کا احساس ہوا تھا۔

فارس کے قدموں کے ساتھ قدم ملا کر چلتے ہوئے اس نے یونہی مڑ کر پیچھے دیکھا تھا۔ جینز اور اورنج رنگ کی ٹاپ شرٹ میں ملبوس لڑکی نے فوراً سے رخ بدل لیا تھا۔

سر جھٹک کر جنت فارس کے ہمراہ ایلیویٹر کی جانب بڑھ گئی۔

واپسی کا سفر بہت خاموشی سے کٹا تھا۔ اتنی خاموشی سے کہ جنت کو لگا فارس سانس بھی نہیں لے رہا۔

''ممی کو یہ سب دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' پورچ میں گاڑی کھڑی کرتے ہوئے اس نے خاموشی کا قفل توڑا تھا.. تیور زیادہ بگڑے ہوئے تھے مگر وہ متحمل لگ رہا تھا۔

''اور جب وہ پوچھیں کہ شاپنگ دکھاؤ تب کیا کروں؟'' اس نے بڑی سنجیدگی سے مشورہ مانگا۔

''کچھ بھی دکھا دینا مگر یہ نہیں۔'' فارس نے جیسے وارن کیا تھا۔

کتنی عجیب بات تھی کہ ان کے درمیان جملوں کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ پورے ایک ماہ بعد خاموشی ٹوٹی بھی تھی تو کیسے!!

''کیوں؟ یہ کیوں نہ دکھاؤں؟ میری طرح وہ یہ سب دیکھ کر بہت خوش ہوں گی۔''

''آئی سوئیر اگر تم نے ایسی کوئی بھی حرکت کی تو میں......'' وہ ہتھے سے اکھڑ گیا تھا۔

''اوکے اوکے فائن۔'' جنت نے جیسے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ ''وہی شاپنگ دکھا دوں گی نا جو تم نے اپنی پسند کی کروائی ہے۔'' ایک ادا سے گاڑی کا دروازہ کھول کر وہ باہر تھی اور اندر ٹھنڈا ہوتا فارس مزید شعلوں کی لپیٹ میں آیا تھا۔

''آج شام کا کھانا ہم باہر کھائیں گے۔'' قدم بڑھاتے ہوئے وہ کہنا نہیں بھولی تھی۔

فارس وجدان نے شدید غصے کے عالم میں اپنا داہنا ہاتھ اسٹیئرنگ پر دے مارا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن آفس سے واپسی پر صدر دروازہ کھلتے ہی اسے جو پہلا چہرہ نظر آیا تھا وہ جنت کمال کا چہرہ تھا، نک سک سے تیار، فریش اور نکھرے وجود کے ساتھ وہ اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ فارس کی پیشانی پر بل آ گئے۔

مسز شیرازی لاؤنج میں ہی موجود تھیں تبھی اپنے تاثرات نرم رکھتا وہ دل ہی دل میں کڑھتے ہوئے اندر داخل ہوا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھا تو ملازمہ کو ڈائننگ ہال میں کھانا لگانے کا حکم دیتے ہوئے جنت کمال بھی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔ ضبط کر کے وہ مسز شیرازی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ان سے بات چیت کرنے لگا۔ اس دوران جنت زبردستی ہی گفتگو میں اپنا حصہ ڈالتی رہی۔

ڈائننگ ٹیبل پر تو اس نے انتہا کر دی۔

''فارس یہ فش کباب ٹرائے کرو، میں نے خاص کر تمہارے لیے بنائے ہیں۔'' اس کے برابر میں بیٹھ کر، اس کی پلیٹ میں خود سے کھانا نکالتے ہوئے وہ اس سے یوں مخاطب ہو رہی تھی جیسے ان کے مابین اس طرح بات چیت ہوتی رہتی ہو، فارس کا پارہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ سامنے مسز شیرازی موجود تھیں۔ اب نہ تو وہ غصہ دکھا سکتا تھا، نہ ہی اس کے ہاتھ جھٹک سکتا تھا۔

''بریانی کیسی لگی؟''

چمچے کو سختی سے دباتے ہوئے اس نے دانت پیسے۔ ''ٹھیک ہے۔''

''صرف ٹھیک ہے؟ میں نے اتنی محنت سے بنائی ہے۔''

مسز شیرازی نے مسکرا کر دونوں کو دیکھا۔

''اور یہ پاستا بھی لو نا۔''

''نہیں بس کافی ہے۔'' اس نے ضبط سے جنت کو روکا۔ لیکن وہ نہیں رکی۔ اپنی من پسند ڈشز اس کی پلیٹ میں زبردستی ڈالتی رہی۔

شام کے کھانے کے بعد وہ مشتعل اعصاب کے ساتھ لان میں کافی دیر ٹہلتا رہا تھا۔ گہری سانسیں لیتے ہوئے خود پر، اپنے غصے پر کنٹرول پانے کی ہر کوشش کرتا رہا تھا۔ رات گئے تک جب وہ کچھ حد تک اپنے اعصاب پر قابو پا چکا تو اس نے کمرے کا رخ کیا تھا۔ اور ایک بار پھر اس کا پارہ چڑھ گیا تھا۔

بیڈ پر درمیان میں کشن رکھ کر حد بندی کیے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے جنت کمال آرام سے بیٹھی تھی۔ کمفرٹر ٹانگوں پر پھیلا رکھا تھا۔ موبائل ہاتھوں میں تھا۔

''یہاں کیا کر رہی ہو تم۔'' وہ دبی آواز میں غرا اٹھا۔

جنت نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ مشتعل نظر آ رہا تھا۔ حالانکہ لان میں ٹہلتے وقت اس کے تاثرات اتنے خوفناک تو ہرگز نہ تھے۔

''مجھے صوفے پر ٹھیک سے نیند نہیں آتی۔''

''یہ میرا مسئلہ نہیں۔'' درشتی سے بازو سے پکڑ کر فارس نے اسے بیڈ سے اٹھا دیا تھا۔

پھر انگلی دکھا کر اسے وارن کرتے ہوئے پہلے صوفے کی طرف اشارہ کیا، پھر دروازے کا راستہ دکھا دیا۔

کہ سونا ہے تو وہاں سو جاؤ ورنہ اس کمرے سے دفع ہو جاؤ۔

جنت لب بھینچے اپنی جگہ کھڑی رہی۔

وہ بیڈ سے کشن ہٹا کر یہاں وہاں پھینکنے لگا۔

وہ کچھ دیر تک اندھیرے میں کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے آنکھوں میں ابھرتی نمی کو دباتے ہوئے یوں کندھے اچکائے جیسے کہہ رہی ہو کوئی بات نہیں۔ پھر کشن وغیرہ اٹھائے اپنے صوفے پر جا سوئی۔

☆☆☆

''مجھے تمہارا فون نمبر چاہیے۔'' صبح سویرے وہ ایک اور مطالبے کے ساتھ حاضر تھی۔

کف لنکس لگاتے ہوئے فارس وجدان نے لب بھینچ کر اسے دیکھا۔ سفید پرنٹڈ قمیص پر زرد رنگ کے ٹراؤزر میں ملبوس، وہ نکھری نکھری سی بہت فریش لگ رہی تھی۔ بالوں کا اوپر سے پف بنا کر کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ چہرہ میک اپ سے عاری تھا۔ ہونٹوں پر لپ گلوز کی گلابی چمک۔

نظر ہٹا کر اس نے رخ بدلا اور ٹائی کی ناٹ باندھنے لگا۔ وہ گھوم کر سامنے آ گئی۔ ''کچھ کہا ہے میں نے۔''

وہ سنی ان سنی کیے رسٹ واچ کلائی پر چڑھانے لگا۔

''اب کیا میں آنٹی سے تمہارا فون نمبر مانگتی اچھی لگوں گی؟ کیا سوچیں گی وہ تمہارے بارے میں؟''

فارس کی آنکھوں کی سرخی گہری ہوئی۔ موبائل اس کے ہاتھوں سے کچھ سختی سے جھپٹ کر تیزی سے نمبر ٹائپ کر کے اس نے موبائل بیڈ پر پھینک دیا۔

''شکریہ! ویسے میں پہلی بیوی ہوں جسے اپنے شوہر کا نمبر شادی کے پورے ایک ماہ بعد ملا ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے یوں کہا جیسے یہ بڑے اعزاز کی بات ہو۔

ٹائی کی ناٹ لگاتا وہ بگڑے تیوروں کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

زیرلب مسکراتے ہوئے وہ بھی نیچے آگئی تھی۔ ناشتے کی میز پر وہ مسلسل بولتی رہی۔مسز شیرازی کے سامنے اسے بھی مجبورا جواب دیناپڑرہاتھا۔تاثرات کچھ بہتر تھےمگراس کی آنکھوں میں غصہ تھا،نفرت تھی،حقارت تھی۔

وہ آفس کے لیے اٹھا تو جنت بھی اس کے پیچھے باہر آگئی۔اب کی باروہ سیڑھیوں پرنہیں رکی تھی۔بلکہ اس کی گاڑی کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی تھی۔وہ بیٹھ رہا تھا تو غصہ ناک پر ہی دھرا تھا۔مگر جانے کیوں۔وہ اپنے ان تاثرات کے ساتھ بھی اسے ہرگز برا نہ لگا۔

''اپنا بہت خیال رکھنا۔''اس نے کہا۔سنی ان سنی کیے وہ گاڑی ریورس کرنے لگا۔جنت تب تک وہاں کھڑی رہی جب تک وہ گاڑی نکال کر وہاں سے چلا نہیں گیا تھا۔

اس دن پہلی باراس نے فارس کو واٹس ایپ پر میسج کیا تھا۔

''کیسے ہو؟''

''کیا کررہے ہو؟

''کیا خیال ہے آج شام کا ڈنر کہیں باہر کریں؟''

''تمھاری پسندیدہ ڈش کون سی ہے؟''

''تم کافی زیادہ پسند کرتے ہو یا چائے؟''

''پسندیدہ کلرکون سا ہے تمھارا؟''

''تم اپنی بیوی میں کس طرح کی خوبیاں دیکھنا چاہتے ہو؟''

شام تک وہ فارس وجدان کے واٹس ایپ پر بلاک ہوچکی تھی۔

وہ گھر آیا تو ایک بار پھر وہ اسے اپنے انتظار میں صدر دروازے پر کھڑی ہوئی ملی تھی۔

''اب کیا میں آنٹی کو یہ بتاتی اچھی لگوں گی کہ تم نے مجھے واٹس ایپ پر بلاک کیا ہوا ہے؟''مصنوعی خفگی کے ساتھ اس نے تیوری چڑھا کراس سے پوچھا تھا۔

فارس ایک بازو پر کوٹ ڈالے،دوسرے ہاتھ میں ٹشوز کا پیک پکڑے پیشانی پر بل ڈالے کھڑا تھا،سفید شرٹ شکن لیے ہوئے تھی۔ٹائی کی ناٹ ڈھیلی۔آج اس کی کچھ فارنرز کے ساتھ میٹنگ تھی تبھی وہ تاخیر سے گھر پہنچا تھا۔کچھ تھکا ہوا بھی لگ رہا تھا۔

جنت کو محسوس ہوا جیسے اسے زکام کی شکایت ہورہی ہو تبھی ٹشوز کا پیک بھی ہاتھوں میں ہی تھا۔

وہ اسے کوئی بھی جواب دیے بغیر سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔ڈنر وہ باہر سے ہی کرکے آیا تھا۔وہ کمرے میں آئی تو کپڑے

بدلے وہ بیڈ پر آڑا ترچھا لیٹا ہوا تھا۔چھینکوں سے کچھ عاجز ہوکر کروٹ پر کروٹ بدل رہا تھا۔

پانی کا گلاس اور ٹیبلٹس سائڈ ٹیبل پر دھرے تھے۔

''تم ٹھیک ہو؟''فکرمندی سے پوچھتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر سائڈ ٹیبل سے ٹیبلٹس کی شیشی اٹھانا چاہی مگر فارس نے کہنی کے بل اوپر ہوتے ہوئے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔''اپنے کام سے کام رکھو۔''اس کی آواز نزلہ سے متاثر لگ رہی تھی۔

جنت نے اس کی سرخ پڑتی آنکھوں میں دیکھا جن میں نمی تیر رہی تھی۔پپوٹے بھاری اور سوجے ہوئے لگ رہے تھے۔

''تمہارے لیے چائے یا قہوہ بنالاؤں؟''

''اب مجھے تمہاری آواز نہ آئے۔''اس نے انگلی اٹھا کر متنبہ کیا پھر کمفرٹر کھینچتے ہوئے اپنا سر تکیے میں گاڑ لیا۔

کچھ دیر تک تو وہ چھینکوں سے الجھا رہا۔لیکن پھر اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔وہ پرسکون نیند سو رہا تھا اور ادھر صوفے پر جنت کمال بے سکون بیٹھی تھی۔

اس نے خاموشی کا قفل توڑ دیا تھا۔مگر فارس وجدان کی سردمہری،نفرت اور حقارت تھی کہ کم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔کتنا مشکل تھا وہ۔سمجھ سے قطعی باہر۔نہ نفرت کی وجہ بتلاتا تھا۔نہ اپنا کوئی نرم رخ دکھلاتا تھا۔

گہری سانس لیتے ہوئے اس نے کمبل اور تکیہ اٹھایا اور سیٹنگ ایریا میں جاسوئی۔وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی اس کی وجہ سے آج فارس کی نیند خراب ہو۔

☆☆☆

''آئمہ کی کال تھی،اس کی فرینڈ کی انگیجمنٹ ہے،مجھے بھی انوائٹ کیا ہے۔''اپنی بات کے اختتام پر اس نے فارس کے تاثرات جانچے۔شاید وہ کچھ دیر تک اپنا کام موقوف کرکے اس کی ذات کو اپنی توجہ اور عنایت کے حصار میں لے لے۔شاید وہ انکار کردے تو اور اس کا یہ انکار اس کے خیالات کی نفی کردے۔یا پھر کھلے دل سے اجازت دے کر اپنی زندگی میں اس کی موجودگی کو اہم کردے۔مگر دوسری طرف ایک مکمل خاموشی تھی۔نہ انکار۔نہ اقرار۔اس نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔وہ آفس ٹیبل کے سامنے کھڑی رہی۔منتظر نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔مگر دوسری طرف خاموشی تھی۔خاموشی ہی رہی۔

پھر وہ بھاری دل کے ساتھ اسٹڈی سے باہر آگئی۔مسز شیرازی کو اپنے پروگرام سے آگاہ کرکے آئمہ کو ڈن کا میسج بھیج دیا۔تیاری کرتے وقت بار بار اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ایسا کب تک چلے گا؟آخر کب تک!کب تک وہ اپنی ''عزت'' کو ''ذلت'' کی نگاہ سے دیکھے گا؟

سیاہ اور گولڈن کنٹراسٹ میں نفیس کام والا فینسی ڈریس۔جس کے گھیر،بازو اور گلے پر گولڈن کام ہوا تھا۔میچنگ جیولری۔

سیاہ ہیلز۔ شہد بالوں کی پونی ٹیل بنائی۔ اطراف میں کچھ لٹوں کو نکالا۔ خود کو مضبوط کیے، خیالات جھٹلا کر اس نے مکمل تیاری کی۔ نو بجے اسے آئمہ لینے آ گئی تھی۔ جاتے وقت لمحے بھر کے لیے وہ اس کی اسٹڈی کے سامنے رکی تھی۔ پھر سر جھٹک کر باہر چلی گئی۔

شادی کے بعد وہ پہلی بار کوئی فنکشن اٹینڈ کر رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کچھ نروس تھی۔ نہ تو اس طرح کے آزادانہ ماحول کی عادی تھی اور نہ ہی اس طرح کے ملبوسات پہنے تھے جن میں بیشتر خواتین اس کے سامنے گھوم رہی تھیں۔

یہ جگہ...... ماحول...... اور لوگ سب اس کے لیے نئے تھے۔

آئمہ نے اپنی دوستوں سے اس کا تعارف کرایا تو سب کی آنکھوں میں حیرت اُمڈ آئی۔

''تو یہ تھی وہ لڑکی جس سے فارس نے شادی کی ہے؟'' جنت کو فارس کی وجہ سے گفتگو کا مرکز بننا کچھ زیادہ اچھا نہیں لگا تھا۔

دلہن کی بہن نیشا نے اس کا ہاتھ پکڑا اور آئمہ سے معذرت کرتی اسے تقریباً کھینچتے ہوئے اپنے ساتھ لے گئی۔

سیڑھیاں چڑھ کر وہ اسے ڈریسنگ روم میں لے آئی تھی جہاں دیوار گیر آئینے کے سامنے لڑکیوں کا ٹولا موجود تھا۔ کوئی لائنر لگا رہی تھی تو کسی کو اپنی لپ اسٹک سے مسئلہ تھا۔ کسی کو گہرے گلے نے تنگ کر رکھا تھا تو کوئی اپنے بالوں کو نئے سرے سے سیٹ کر رہی تھی۔

''گیس واٹ یہ میرے ساتھ کون ہے؟'' نیشا نے کھڑے کھڑے اعلان کیا۔ لڑکیوں کی گردنیں گھومیں۔ سب نے سر تا پیر اس کا جائزہ لیا۔ کچھ نروس ہو کر جنت نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

''فارس کی بیوی! جنت!''

وہاں ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ جو جہاں کھڑی تھی، وہی کھڑی رہ گئی۔

ان سب کے چہروں پر ایک سے تاثرات تھے۔ رشک اور حسد کے ملے جلے تاثرات۔ وہ سب کی سب ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کا لباس، زیبائش، اطوار سب مختلف تھا۔ جنت کو یک دم اپنا آپ عجیب لگا۔ وہ ان میں مس فٹ تھی۔

''اوہ۔ تو یہ ہے وہ۔'' سماعت سے کھنکتی ہوئی خوب صورت آواز ٹکرائی۔ جنت نے بے ساختہ سر اٹھایا۔ وہ اس کے دائیں طرف بالکل سامنے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھی تھی۔

سرخ رنگ کا میکسی نما سلیولس لباس، سنہرے براؤن بال ہلکا سا کرل لیے اطراف میں بکھرے، دمکتی ہوئی سفید رنگت، نیلی کانچ سی آنکھیں۔ متناسب سراپا۔ وہ اتنی خوب صورت اور اسٹائلش تھی کہ ایک لمحے کے لیے جنت بھی اس کے چہرے پر سے نگاہ نہ ہٹا سکی۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ تمسخر اڑاتی نگاہوں سے جنت کا جائزہ لیتی آگے بڑھی۔ ''تو اس پینڈو سے شادی کی ہے فارس وجدان

نے۔''

لفظ ''پینڈو'' نے ان ماڈرن لڑکیوں کو بڑا محظوظ کیا۔ مسکراہٹ سب کے ہونٹوں پر رینگ گئی۔

''اور لڑکیوں کو تو ایسے ریجکٹ کرتا تھا جیسے کوئی حور بیاہ لائے گا۔''

دبے دبے قہقہے چہار سو گونج اٹھے۔ گویا اس تبصرے کو بھی خوب انجوائے کیا گیا۔

جنت کی آنکھوں میں اضطراب آ ٹھہرا۔ رنگت سرخ پڑ گئی۔ وہ نروس تھی۔ گھبراہٹ کا شکار بھی ہو گئی۔ فارس کے حوالے سے آج پہلی بار اس کا اعتماد متزلزل ہوا تھا۔ وہ سر اٹھا کر جواب دینے کے بجائے اپنے آپ میں ہی سمٹ گئی تھی۔ کندھے پر اس کا ہاتھ جو نہ تھا۔ پہلو میں وہ اس کے ساتھ جو نہ تھا۔ نہ محبت ہمراہ تھی۔ نہ عزت کا احساس تھا۔ اعتماد آتا بھی تو کیسے۔ وہ مقابلہ کرتی بھی تو کیسے۔

''فائنلی تمہیں بھی دیکھ لیا۔'' سج سج قدم اٹھاتی وہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ''ویسے ابھی بھی یہ سمجھ میں نہیں آ رہا فارس وجدان کو تم میں کیا نظر آیا؟ تم بتا دو گی تو ہمیں آسانی ہو گی۔''

ایک بار پھر سب ہنسے تھے۔ اس پر، اس کے لباس پر، اس کی شکل وصورت پر۔

''وہی جو اسے تم سب میں نظر نہیں آیا۔''

سب کی ہنسی تھم گئی۔ دو ٹوک اور کٹیلے لہجے میں جواب دے کر وہ اسی وقت ان کے چنگل سے نکل کر باہر آ گئی تھی۔ اس دن کے بعد سے اس نے آئمہ ظہیر کے ساتھ کوئی بھی فنکشن اٹینڈ کرنے سے توبہ کر لی تھی۔ وہ فارس کی وجہ سے نظروں میں نہیں رہنا چاہتی تھی۔ جج نہیں ہونا چاہتی تھی۔ نہ اپنی شکل وصورت کے اعتبار سے۔ نہ کلاس اور لباس کے حساب سے۔

☆☆☆

''تم آخر اتنے جتن کس لیے کر رہی ہو؟'' وہ آفس ٹیبل پر کافی کا مگ رکھ کر پلٹ رہی تھی جب فارس نے لیپ ٹاپ کی اسکرین سے نگاہ ہٹا کر کہا تھا۔ وہ رک کر، کچھ حیرت سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

وہ خود سے مخاطب ہو جائے ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا اور ان ڈیڑھ ماہ میں تو شاید دو تین بار ہی ہوا ہو گا۔

''اس رشتے کو قائم رکھنے کے لیے۔'' اس نے بلا کسی تمہید کے، بلا کسی کنفیوژن یا گھبراہٹ کے فارس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''کس رشتے کو قائم کرنے کے لیے؟ جسے میں سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتا؟''

''تسلیم نہ کرتے تو نکاح بھی نہ کرتے۔'' اب کے وہ مسکرائی۔ وہ بھی مسکرایا۔ بخدا اس کی مسکراہٹ۔ اگر طنزیہ نہ ہوتی تو کتنی

خوب صورت ہوتی۔

''تسلیم کرنا کچھ اور ہے......نکاح کرنا کچھ اور۔''

''خدا کی مقرر کردہ حدود کی درجہ بندی کرنے والے تم کون ہوتے ہو؟'' وہ سوالیہ نشان بن گئی۔

کس چیز نے اسے اتنا نڈر اور بہادر بنا دیا تھا؟ فارس بھی سوچتا ہوگا۔ کس چیز نے اسے اتنا قوی کر دیا ہے۔ وہ بھی سوچا کرتی تھی۔

''تم اس گھر میں میری ماں کی وجہ سے ہو۔'' فارس نے یاد دلایا تھا۔

''غلط! میں اس گھر میں تمہاری وجہ سے ہوں، میرا نکاح تم سے ہوا ہے۔''

فارس کی آنکھوں میں شعلوں کی لپک دیکھ کر اسے اندازہ ہوا وہ اس کے خراب موڈ کا ٹریگر دبا چکی ہے۔

''ممی کو بہو چاہیے تھی......وہ اپنی مرضی اور پسند سے تمہیں یہاں لے بھی آئیں......'' ایک لمحے کو رک کر اس نے سر اٹھایا۔

''مجھے لائف پارٹنر چاہیے ہوتا تو میں کم از کم تمہارا انتخاب نہ کرتا۔''

''کیوں مجھ میں کیا کمی ہے؟'' اس نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔

''میں جواب دینے کا پابند نہیں۔'' لیپ ٹاپ بند کر کے وہ فرصت سے اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

''جب تمہیں اچھی طرح سے اندازہ ہو چکا ہے کہ میں اس رشتے میں سیریس ہوں اور نہ ہی کبھی ہو سکتا ہوں تو پھر یہ سب کس لیے؟ کون بے وقوف تمہیں پٹیاں پڑھا رہا ہے کہ تم اس طرح میرے آگے پیچھے پھرو گی تو مجھے تمہاری عادت ہو جائے گی، اس کے بعد میں اس رشتے کو ختم کرنے کا یہ فضول سا آئیڈیا اپنے ذہن سے نکال دوں گا اور ہم دونوں ہنسی خوشی رہنے لگ جائیں گے۔''

وہ اس کی ذات کی دھجیاں بکھیر کر تمسخر اڑاتی نگاہوں سے اب اسے دیکھ رہا تھا اور جنت لبوں پر ہلکا سا تبسم لیے بمشکل ہی اپنے جذبات پر قابو رکھ پائی تھی۔

''ویسے تمہاری یہ ادائیں تمہارے پہلے شوہر کے کام نہیں آئیں؟ میرا مطلب ہے تم اس کے ساتھ پانچ سال رہی ہو۔ پانچ سال کا عرصہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ اس کے باوجود تمہیں طلاق ہوئی۔''

روح پہلے سے گھائل تھی۔ وجود کے پرخچے اب اڑے تھے۔ وہ حیران تھی وہ اس کے سامنے اب تک کیسے کھڑی تھی۔ اپنے قدموں پر......اس استحقاق کے ساتھ......کیسے ڈٹی ہوئی تھی۔ کیسے سن رہی تھی وہ اس کے زہر میں بجھے ان لفظوں کو جو اندر ہی اندر اسے چھلنی کرتے جا رہے تھے۔

''تمہاری ایک مشکل آسان کر دیتا ہوں۔'' میز پر کہنیاں جما کر وہ آگے ہوا، ''جس دن میں تمہیں اس گھر سے باہر کا راستہ

دکھاؤں گا اس دن تمہارے بینک اکاؤنٹ میں اتنی رقم ہوگی کہ تم اگلے دس پندرہ سالوں تک گھر میں بیٹھ کر بھی اڑاؤ گی تو ختم نہیں ہو گی، سو یہ سوچنا چھوڑ دو کہ طلاق کے بعد تمہارا کیا بنے گا! دولت ملے گی تو تم بھول جاؤ گی برہان کون تھا......فارس کون ہے۔''

لفظ تھے یا برچھی۔ اسے کاٹ کر گزر گئے تھے۔

اس کے لب کپکپائے اٹھے، آنکھیں بے اختیار نم ہو گئیں۔ مگر اس نے فارس سے مزید کچھ نہ کہا تھا۔ بے حد خاموشی سے جانے کے لیے اٹھ گئی تھی۔

ایک آسودہ سی مسکراہٹ فارس وجدان کے لبوں پر آ کر ٹھہر گئی۔ یہ احساس ہی تسلی بخش تھا کہ جو لڑکی اس کا سکون برباد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اسے بے سکون کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

☆☆☆

مگر یہ سکون بھی اس کی خوشیوں کی طرح وقتی ہی تھا کہ اگلے روز جب وہ جاگنگ کے لیے اپنے گارڈ کی معیت میں گھر سے نکلا تھا تو ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔

فارس نے مڑ کر اسے تب دیکھا تھا جب گارڈ نے توجہ اس کی طرف دلوائی تھی۔

''سر آپ کی مسز......''

سیاہ ٹراؤزر پر سفید کاٹن کے قمیص پر گلابی رنگ کا لمبا سا سویٹر زیب تن کیے، گلے میں دوپٹے کو مفلر کی طرح بل دے کر ڈالے، بالوں کی اونچی پونی ٹیل بنائے وہ چمکتی ہوئی روشن آنکھوں کے ساتھ اس کے پاس آ کر مسکرائی۔ ''گڈ مارننگ۔''

''واٹ نان سینس۔'' اس نے دبی آواز میں جھاڑا۔

''حیران کر دیا نا میں نے تمہیں؟ کہتے ہیں انسان ناراض بھی صرف ان سے ہوتا ہے جن سے کوئی تعلق ہو......بھلا میں کیوں تمہاری باتوں کو مائنڈ کرنے لگی؟''

وہ لب بھینچے سختی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ گزشتہ شب کی تلخ کلامی کے بعد بھی اس لڑکی میں اتنی سکت تھی کہ وہ اگلے روز ہی یوں مخاطب ہو گی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہ تو یہ توقع کیے ہوئے تھا کہ اگلے چند دنوں تک تو وہ بات بھی نہیں کرے گی اور یہاں......

''نفرت بھی ایک تعلق ہوتا ہے۔ نظر انداز کرنے کے لیے کسی کو محسوس کرنا ضروری ہے۔ میں حیران ہوں تم پچھلے ڈیڑھ ماہ سے مجھے نظر انداز کر رہے ہو! یعنی تم پچھلے ڈیڑھ ماہ سے مجھے محسوس کر رہے ہو۔''

''کسی روز تمہیں تمہاری یہ خوش فہمیاں لے ڈوبیں گی۔'' اس نے دانت پیس کر کہا۔

''میں بہت اچھی تیراک ہوں فارس۔''

"بہترین تیراک بھی شارک کی خوراک بن جایا کرتے ہیں۔"

"شاید اس لیے کہ وہ بروقت ساحل پر نہیں پہنچ پاتے۔"

"تم پہنچ جاؤ گی ساحل پر؟"

"ساحل پر ہی تو کھڑی ہوں میں۔"

ماتھے پر تیوری چڑھائے وہ جاگنگ ٹریک پر تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

"کیا تمہیں اس بات کی فکر ہے کہیں مجھے میری خوش فہمیاں نہ لے ڈوبیں؟" وہ بھی اس کے پیچھے آنے لگی۔

"تمہاری فکر اور مجھے ہوگی؟" سوالیہ ابرو اٹھا کر اس نے جن نگاہوں سے جنت کو دیکھا، وہ کٹ کر رہ گئی۔

"ویسے سیلف ریسپکٹ کیا اپنے ایکس ہزبنڈ کے گھر بیچ کھائی ہے تم نے؟" فارس کے قدموں کے ساتھ قدم ملاتی، اپنا تنفس قابو میں کرتی جنت کے قدموں کی حرکت مدھم پڑ گئی...... نہ چاہتے ہوئے بھی وہ رک گئی تھی۔ وہ بھی رک گیا تھا۔ محض ایک لمحے کے لیے۔

"تمہیں عجیب نہیں لگتا؟ مجھے بہت عجیب لگتا ہے۔ اس طرح اپنی سیلف ریسپکٹ کی بھینٹ چڑھا کر، میری توجہ حاصل کرنے کے لیے میرے آگے پیچھے پھرنا۔"

تمسخر اڑاتا ہوا نرم لہجہ تھا اس کا۔ مگر جنت کے گال پر جیسے کسی نے طمانچہ دے مارا تھا۔ وہ ہل کر رہ گئی تھی۔

"جن کی کشتیاں جلا دی جائیں انہیں زیادہ تحمل، زیادہ صبر کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔" مدھم سی سرسراہٹیں پیدا کرتی خنک ہوائیں اس کے وجود پر کپکپی سی طاری کر گئیں۔

فارس بہت آگے نکل چکا تھا۔ اس نے ایک بار بھی مڑ کر جنت کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

☆☆☆

جاگنگ کے بعد اس نے شاور لیا تھا اور کپڑے بدل کر جب نیچے آیا تھا تو جنت کمال گلاس وال کے اس پار اسے مالی سے الجھتی اور پھولوں کو توڑتی نظر آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ناگواری ابھر آئی۔ ایک معمول سا بنا لیا تھا اس لڑکی نے کہ ہر روز کمرے کو تازہ پھولوں سے معطر کرنا ہے۔

سر جھٹک کر رسٹ واچ پہنتے ہوئے وہ مسز شیرازی کے کمرے میں آ گیا تھا۔

"آپ تیار ہیں ممی؟"

"ہاں بیٹا۔" مکمل تیاری کے ساتھ وہ وہیل چیئر پر تھیں۔ بس ہیڈ اسکارف لے رہی تھیں۔ آج ان کی ڈاکٹر کے یہاں

اپائنمنٹ تھی۔ ویکلی چیک اپ کے لیے جانا تھا انہیں۔ پٹھانی بھی ان کے ساتھ ہی جایا کرتی تھی۔

موبائل پر کسی کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے اس کی نگاہ بے ساختہ ہی دیوار گیر کھڑکیوں کے سامنے رکھی گلاس ٹیبل پر جا پڑی۔ وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔

میز کے کناروں کے ساتھ گول دائرے کی صورت میں ترتیب سے رکھے گلاب کے پھولوں پر اس کی نظریں ٹھہری کہ وہ ہٹا ہی نہ سکا۔ مسلی ہوئی پنکھڑیاں۔ ٹوٹے ہوئے پتوں کی لہر...... اور سلامت پھولوں کا گھیراؤ......

یادداشت کے کسی کونے میں کوئی بھولا بسرا منظر تازہ ہوا تھا۔ کوئی آواز گونجی تھی۔ پردہ لہرایا تھا اور پھر ایک ایک کر کے سفید پھول کھڑکی سے اندر گرتے چلے گئے تھے۔

"گیٹ ویل سون۔" مارکرز سے لکھا پیغام کھڑکی کے شیشے پر ابھر آیا تھا۔

"فارس۔" مسز شیرازی کی آواز پر اس نے چونک کر اپنے خیالات سے سر نکالا پھر مڑ کر انہیں دیکھا۔

"آئم ریڈی بیٹا۔"

سر ہلا کر وہ ان کی جانب بڑھ گیا۔

مگر وہ پھولوں کی اس ترتیب سے، لہروں میں رکھے ان پتوں سے، اور وسط میں رکھی کچھ بکھری، کچھ ٹوٹی، اور کچھ مسلی ہوئی ان پنکھڑیوں سے پیچھا نہ چھڑا سکا جنہوں نے کچھ دیر کے لیے ہی سہی اسے ماضی کے حوالے کر دیا تھا۔

☆☆☆

"ہماری اس کاغذی شادی کو پورے دو ماہ ہونے کو ہیں۔" وہ بیڈ پر نیم دراز لیپ ٹاپ پر کام کر رہا تھا جب ہاتھوں پر لوشن لگاتے ہوئے وہ اس سے مخاطب ہوئی تھی۔ فارس نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ صوفے پر وہ خاصے شاہانہ انداز میں بیٹھی تھی۔ فکر اور اندیشوں سے پرے......

"کیا تمہارا نہیں خیال اب ہمیں دوستی کر لینی چاہیے؟" جاگنگ ٹریک پر ہونے والی گفتگو کے بعد اس نے اب خاموشی کا قفل توڑا تھا یعنی پورے پندرہ گھنٹوں کے بعد۔

"ٹھیک ہے مان لیا یہ کاغذی رشتہ ہے، ایک مخصوص مدت تک رہے گا، اس کے بعد سب ختم ہو جائے گا، لیکن اس مخصوص مدت تک کیا تم آنکھوں سے تیر، نیزے، تلواریں مارنا بند نہیں کر سکتے؟"

وہ اسے نظر انداز کیے اپنا کام کرتا رہا۔

"اگر ہماری دوستی ہو جائے گی تو مجھے ذرا ذرا سی فرمائش کے لیے آنٹی کے پاس نہیں جانا پڑے گا، یعنی کہ میں ڈائریکٹ تم سے

بات کر سکوں گی اور اس طرح بہت سہولت رہے گی مجھے.. اور تمہیں بھی...... کیا خیال ہے؟''

وہ خاموش رہا۔ وہ اب خاموش ہی رہتا تھا۔

''ویسے فارس! کیا تم جانتے ہو ان لڑکیوں کی کہانیوں میں کیا ہوتا ہے جن کے شوہر حضرات تمہارے جیسا رویہ رکھتے ہیں؟''

کچھ دیر تک خاموش رہ کر، کچھ سوچ کر اس نے استفسار کیا تھا۔

وہ نہیں جانتا تھا اور نہ ہی جاننا چاہتا تھا۔ جنت جانتی تھی اور اسے بھی بتانا چاہتی تھی۔

''یعنی کہ شادی کی پہلی رات نئی نویلی دلہن کو کمرے سے باہر نکال دینا۔ پھر اسے دھمکانا۔ اس پر رعب جمانا اور اپنے معاملات سے دور رہنے کی سختی سے تلقین کرنا اور یہ باور بھی کروانا کہ شادی سراسر مرضی کے خلاف کی گئی ہے یا پھر انتقام لینے کے لیے شادی کرنا پڑی ہے۔ وغیرہ وغیرہ! پہلے مجھے لگتا تھا ایسا صرف کہانیوں میں ہوتا ہے۔ اب مجھے لگتا ہے حقیقی زندگی میں بھی ایسا ہو سکتا ہے۔''

ایک لمحے کو رک کر اس نے کچھ سوچا، پھر اپنے ٹریک پر واپس آ گئی۔

''اس کے بعد ہوتا یہ ہے کہ بے چاری سی، معصوم سی روتی سسکتی ہیروئن اپنے سڑے ہوئے کھڑوس شوہر کی خدمت داریوں میں جت جاتی ہے۔ وہ خود کو حالات کے حوالے کر کے اس کی سختیاں جھیلتی رہتی ہے یہاں تک کہ شوہر کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔''

فارس نے اسکرین سے نگاہیں ہٹا کر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

اوہ شکر! وہ سن رہا ہے۔ لبوں پر ابھرتی مسکراہٹ کو جنت نے بمشکل روکا۔

''ہلکا پھلکا سا ایکسیڈنٹ ہوتا ہے فارس! کچھ زیادہ سیریس نہیں۔'' انداز تسلی دینے والا تھا۔

''شوہر چند ایک ہڈیاں تڑوا کر بستر سے لگ جاتا ہے۔ اس کے دوست احباب، سوکھی سڑی گرل فرینڈز وغیرہ وغیرہ۔ سب اسے چھوڑ دیتی ہیں مگر ظلموں کی ماری وہ دکھی، بے چاری اور معصوم سی ہیروئن اسے نہیں چھوڑتی۔ آخر وہ اس کا شوہر ہے بھئی کوئی مذاق تھوڑی ہے۔ حالانکہ ہیروئن کو چاہیے وہ اس بندے کی چند ہڈیاں مزید توڑ دے، کچھ اور نہ سہی ایک عدد تھپڑ ہی جڑ دے مگر نہیں۔ خیر، یہ ہمارا مسئلہ نہیں۔ اب ہماری ہیروئن کرتی یہ ہے کہ اس کی خدمت میں لگ جاتی ہے۔ اس کا خیال رکھتی ہے۔ اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتی ہے۔ شوہر اس کا ظرف دیکھ کر شرمندہ ہو جاتا ہے۔ پچھتاووں میں گھر جاتا ہے۔ افسوس کرتا رہتا ہے کہ اتنی اچھی لڑکی کی وہ اتنا عرصہ بے قدری کرتا رہا...... اسے رلاتا رہا۔'' اس نے رک کر فارس کو دیکھا۔ وہ اب اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ کی بورڈ پر اس کی انگلیاں تیزی سے متحرک تھیں۔

''پچھتاوا انسیت کو جگہ دیتا ہے۔ انسیت رحم دل بناتی ہے۔ اور شاید رحم سے ہی محبت جنم لیتی ہے۔ پھر وہ اپنے رویے کی معافی مانگتا ہے۔ اور ہماری پیاری، دکھی، معصوم اور نرم دل، فرشتہ صفت ہیروئن اسے فوراً سے معاف کر دیتی ہے اور دونوں ہنسی خوشی رہنے

لگتے ہیں......''

فارس نے لیپ ٹاپ زور سے بند کر دیا۔ اس کا غارت شدہ موڈ مزید غارت ہو چکا تھا۔ غالباً اسے یہی اینڈنگ نہیں طلاق چاہیے تھی......

''اب مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہارے دل اور ارادوں کو بدلنے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟ ان ہیروئنز کی طرح تمہاری چند ایک ہڈیاں ٹوٹنے کا انتظار کرنا چاہیے یا پھر مجھے اپنی زندگی کی کہانی کو کسی اور رخ ڈال دینا چاہیے؟ کیونکہ یہ تو کنفرم ہے خدمت داریوں سے تمہارا دل پگھلنے والا نہیں......سو۔'' اس نے پرسوچ نگاہوں سے فارس کو دیکھا۔

''تم کیا مشورہ دو گے مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' خاصی سوچ بچار کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

''زہر کھا کر مر جانا چاہیے۔''

''ہے نا! میں نے بھی یہی سوچا تھا کہ شاید اس طرح تمہارے ارادوں پر کوئی فرق آئے مگر اس طرح ہو گا یہ کہ تمہاری دلی مراد پوری ہو جائے گی اور میں خالی خولی قبر میں اتر جاؤں گی۔ جبکہ مجھے اپنی لائف اسٹوری میں کچھ مختلف چاہیے۔ کچھ ایسا جس سے ہم دونوں کی خواہش پوری ہو جائے۔ یعنی تم مجھے چھوڑنا چاہتے ہو......اور میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں! دونوں کی خواہش۔ ایک ہی وقت میں......ایک ساتھ پوری ہو جائے۔''

فارس نے اچنبھے سے اس لڑکی کو دیکھا۔ ہوش و حواس میں تو تھی وہ!؟ بھلا ایک ہی وقت میں دونوں کی متضاد خواہشات کیسے پوری ہو سکتی تھیں؟

''بتاؤ بھی۔''

''مر جاؤ۔'' اس کی برداشت اب ختم ہو رہی تھی۔

''پھر بدروح بن کر تمہارے آگے پیچھے پھروں یہی؟'' وہ پرجوش سی ہوئی۔

''اب اگر دوبارہ تمہاری آواز آئی تو میں تمہیں کمرے سے نکال دوں گا۔'' اسے وارننگ دے کر وہ لحاف تانے سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔

''جانور کے ساتھ بھی انسان کچھ وقت بتائے تو اس سے انسیت ہو جاتی ہے، میں تو پھر انسان ہوں، میرے ساتھ رہ کر تمہارا دل بھی نرم ہو جائے گا۔''

''بھول ہے تمہاری۔''

''بھول میری نہیں تمہاری ہے فارس وجدان۔''

اس نے اٹھ کر لائٹس آف کر دیں۔مگر جب صوفے پر بیٹھی تو کسی خیال کے تحت اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔وہ آنے والے کل کو سوچ رہی تھی... اور کل اس نے کیا کرنا تھا وہ پروگرام ترتیب دے چکی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن ٹھیک گیارہ بجے وہ شیرازی انٹرپرائزز میں اس کے آفس کے باہر کھڑی تھی۔

شاندار عمارت کی بارھویں منزل تک پہنچنے سے پہلے وہ مختلف فلورز پر، مختلف اسٹاف ممبرز سے اپنا تعارف کرواتی ہوئی آئی تھی۔

وہ جنت بنت کمال تھی۔شیرازی انٹرپرائزز کے نوجوان چیئرمین اور سی ای او کی زوجہ محترمہ!

جو بھی اس سے ملا۔حیران ہو کر ملا۔خاص کر خواتین اسٹاف تو کچھ زیادہ ہی صدمے میں تھیں۔

''آپ نے فارس کو بتایا تو نہیں کہ میں یہاں آئی ہوں۔''اس نے صدیقی صاحب سے کہا تھا۔

''نہیں فی الحال انہیں علم نہیں،اس وقت وہ میٹنگ میں مصروف ہیں۔''فنانس منیجر صدیقی صاحب اسے جانتے تھے،انہوں نے نکاح اور ولیمہ میں شرکت کی تھے۔اس وقت بھی وہی اس کے ہمراہ تھے۔

''اچھی بات ہے، میں انہیں سرپرائز دینا چاہتی ہوں۔''

صدیقی صاحب بدقت مسکرائے۔جانتے تھے ان کے باس کو سرپرائز کتنے برے لگتے تھے۔

چوتھے فلور پر وہ یونہی ٹہلنے لگی... اس نے صدیقی صاحب سے بھی کہہ دیا کہ وہ فارس کے آفس تک خود ہی چلی جائے گی۔

دیوار گیر کھڑکیوں سے شہر کا خوبصورت نظارا کرتی وہ آگے بڑھتی گئی...... پندرہ بیس منٹ تک ٹہلتی رہی اور جب صدیقی صاحب کی طرف سے اسے میٹنگ ختم ہونے کا میسج ملا تو وہ چند لڑکیوں کے ساتھ لفٹ پر سوار ہو گئی۔

''سنا ہے فارس وجدان کی مسز آئی ہوئی ہیں۔''

''میں نے بھی یہی سنا ہے۔''

''کمپنی کی فی میل اسٹاف کے ساتھ ہمارے باس اتنے روڈ ہیں! خدا جانے بیوی کے ساتھ کیسا رویہ ہوگا۔''

''بیوی پر تو جان چھڑکتے ہوں گے۔''دوسری نے لقمہ دیا۔

ان کے عقب میں کھڑی جنت بے ساختہ ہنس دی۔تینوں نے مڑ کر اسے دیکھا۔غلطی کا احساس ہوتے ہی وہ مصروفیت بھرے انداز میں موبائل اسکرین پر جھک گئی۔

کچھ ہی دیر میں وہ بارھویں منزل پر وجدان فارس کے آفس کے سامنے کھڑی تھی۔سیکرٹری نے فون پر اطلاع پہنچا دی تھی اور

اس کی توقع کے برعکس اسے فوراً ہی طلب کر لیا گیا تھا۔

اجازت ملتے ہی وہ دروازہ کھول کر اس کے آفس میں داخل ہوئی اور حیران رہ گئی۔

سفید رنگ کی تھیم میں سجا اس کا آفس انتہائی شاندار تھا۔مگر آفس سے بھی زیادہ شاندار تو اس کے شوہر کا غصہ تھا۔

شرٹس کی آستین کہنیوں تک موڑے، پیشانی پر ڈھیر سارے بل ڈالے وہ غصے میں تھا، آنکھوں میں سرخی تھی، جبڑے بھینچے ہوئے تھے۔تاثرات پتھر کی طرح سخت پتھریلے سے۔

''تم کیا کر رہی ہو یہاں؟''سر پر پہنچ کر وہ دبی آواز میں دھاڑا تھا۔

''اپنے کاغذی شوہر کا آفس دیکھنے آئی تھی، اس میں کوئی گناہ ہے کیا۔''فارس کو جواب دے کر اس نے اشتیاق کے عالم میں چاروں اور نگاہ دوڑائی۔فارس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔

آفس ٹیبل پر دھرے کچھ ڈیکوریشن پیسز کو چھیڑتے ہوئے اس نے نیم پلیٹ کو بغور دیکھا۔وال پر لگی سفید براق گھوڑے کی پینٹنگ کو سراہا۔شیلف میں ترتیب سے رکھی فائلز کا جائزہ لیا۔پھر آرام سے ٹانگ پر ٹانگ جمائے کاؤچ پر بیٹھ گئی۔

''کہتے ہیں سفید رنگ امن اور محبت کی علامت ہوتا ہے۔تمہیں کیا لگتا ہے؟''

وہ سرد نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

''اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو لوگ اس رنگ کو پسند کرتے ہیں ان کے مزاج میں دھیما پن ہوتا ہے، وہ صلح جو اور بردبار ہوتے ہیں۔کیا ایسا ہی ہے؟''

''کیوں آئی ہو یہاں؟''فارس نے اس کے سوالات نظرانداز کر دیئے۔

''چائے یا کافی کا نہیں پوچھو گے تم؟''جنت نے پلکیں جھپکائیں۔

''نہیں۔''

''حالانکہ آنٹی کہہ رہی تھیں تم خاصے مہمان نواز ہو۔''

''ابھی اور اسی وقت دفع ہو جاؤ یہاں سے۔''

''اب دفع تو میں تمہارے ساتھ ہی ہو سکتی ہوں، ڈرائیور مجھے ڈراپ کر کے جا چکا ہے، آنٹی سے میں کہہ آئی ہوں کہ تم نے ہی مجھے اپنے آفس کال کر کے بلایا ہے اور آج ہم دونوں کسی اچھے ریسٹورینٹ میں لنچ کریں گے۔''

فارس نے خود پر بمشکل ضبط کے پہرے بٹھائے تھے۔

''کتنی رقم چاہیے تمہیں؟''آفس کی کرسی پر بیٹھ کر اس نے بے حد تحمل سے پوچھا تھا۔

''کس لیے؟''وہ حیران ہوئی تھی۔
''اس ڈراما کو ختم کرنے کے لیے۔''
''تمہیں لگ رہا ہے میں ایکٹنگ کر رہی ہوں؟''جنت کو برا لگا۔
''تم یہ جو کچھ بھی کر رہی ہو اسے ختم کرنے کے لیے کیا لوگی؟''
''ایک کپ چائے۔اٹالین ریسٹورینٹ میں تمہارے ساتھ لنچ۔''
فارس نے بمشکل خود پر قابو پایا۔
''ویسے تم نے ابھی تک کسی کو بتایا نہیں کہ تم میریڈ ہو؟ سب یوں حیران ہوتے ہیں جیسے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو۔''
فارس نے اپنی کرسی چھوڑ دی تھی۔''اٹھو اب۔''
''مگر میں نے تو ابھی چائے نہیں پی......''وہ سختی سے بازو میں انگلیاں گاڑے، اسے کھینچ کر اٹھاتے ہوئے دروازے پر لے آیا۔
''ہاؤ روڈ۔''جنت نے اپنا آپ چھڑا کر اسے تندہی سے دیکھا۔
''میں بہت مصروف ہوں، تمہاری ان جھوٹ موٹ کی اداکاری اور دو نمبری فرمائشوں کی تکمیل کے لیے وقت نہیں ہے میرے پاس! ڈرائیور کو کال کرو اور یہاں سے چلتی بنو۔''دبی آواز میں جھاڑ کر اس نے دروازہ کھول دیا۔سیکرٹری نے بے اختیار سر اٹھایا تھا۔
''ڈارلنگ۔''سیکرٹری کے سامنے جنت کا رویہ خاصا رومانٹک ہو گیا۔''میں یہیں بیٹھ کر آپ کا انتظار کروں گی، بھلے سے سارا دن بیٹھی رہوں، مجھے کوئی مسئلہ نہیں۔''
اور فارس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ اس لڑکی کو شیرازی انٹر پرائز کی بارھویں منزل سے نیچے پھینک دے۔
لب بھینچ کر اس نے آفس کا دروازہ بند کر دیا تھا......کچھ زیادہ ہی قوت سے۔
''میں دیکھتی ہوں کب تک مجھے باہر بٹھاتا ہے۔''سینے پر بازو باندھے وہ سیکرٹری کے آفس میں بیٹھ گئی تھی۔
اب سیکرٹری اور وہ......دونوں ہی ایک دوسرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔
اور تب ہی کال موصول ہوئی تھی۔کچھ سن کر سیکرٹری نے فارس وجدان سے رابطہ کیا تھا۔
''سر شاہ گروپ کے لائیر برہان لغاری کی کال آئی ہے، ایک گھنٹے بعد آپ کی ان کے ساتھ میٹنگ ہے۔''
جنت کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔اس کی سوچ، اس کے خیال جامد ہوئے۔وہ یہاں کیوں کس لیے آئی ہے سب بھول بھال گئی۔

حلق میں ابھرتی گلٹی کو بمشکل نیچے اتارتے ہوئے اس نے گال پر پھسلتی لٹ کو کان کے پیچھے اڑسا۔سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس کا سکون درہم برہم ہوا تھا۔
''میم! آپ چائے لیں گی یا کافی؟''سیکرٹری اب اس سے پوچھ رہی تھی۔شدت سے دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے اسے دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔
''کچھ نہیں۔''وہ جو شام تک فارس کے آفس میں بیٹھنے کے ارادے سے آئی تھی، بیگ کی اسٹریپس پر ہاتھ جمائے اسی وقت وہاں سے چلی گئی تھی۔

☆☆☆

وہ نام جسے وہ لبوں پر لانے سے گھبراتی تھی، جب ساعت میں پڑا تھا تو کتنی وحشت ہوئی تھی اسے......اور یہی وحشت آج پھر اس کی نیند حرام کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔اول تو اسے نیند آ ہی نہیں رہی تھی اور جب آئی تھی تو حقیقت نے خواب کا روپ دھار کر اسے فوراً سے جگا دیا تھا۔
پسینے سے شرابور وجود کے ساتھ وہ سر تھامے کتنی ہی دیر تک بیٹھی رہی تھی۔
ایسا نہیں تھا کہ وہ خوابوں سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہو گئی تھی مگر جب سے اس نے فارس کے معاملات میں دلچسپی لینا شروع کی تھی۔تب سے خواب کسی حد تک کم ہو گئے تھے۔
مگر آج پھر۔
ہتھیلی کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے بے ساختہ سر اٹھا کر فارس کو دیکھا تھا۔صد شکر کہ وہ گہری نیند میں تھا۔
صد شکر کہ وہ اس کی وجہ سے بے آرام نہیں ہوا تھا۔
گہری سانس لے کر، خود کو کمپوز کر کے وہ نیچے آ گئی تھی۔
پورے گھر میں خاموشی کا راج تھا۔لائٹس آن کر کے وہ نماز والے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔زرکار روشنیوں میں کمرہ خاموشی میں ڈوبا تھا۔آواز اس کے پھولی سانس کی تھی یا اس دھڑکن کی جو اسے کان میں گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔
دن بھر خود کو مضبوط ظاہر کر کے......تنہائی میں وہ ہر نقاب چہرے سے اتار دیا کرتی تھی۔
جو وقت اس آیت کے ساتھ گزرتا تھا، وہ حقیقتاً اسے اندر اور باہر سے ایک ہی کر دیتا تھا۔
وہ اب ذہن کو ماضی سے بھٹکانے کے لیے......اپنا فوکس اس آیت پر جما رہی تھی اور غور کر رہی تھی ان سوالوں پر جو اس کے اندر سر اٹھا رہے تھے۔

پچھلے ایک ماہ سے اس کی یہی روٹین تھی......پچھلے ایک ماہ سے وہ اپنے اندر بڑھتے ہوئے اس شور سے پیچھا چھڑانے کے لیے یہی کر رہی تھی۔ پہلے وہ نصیب، قسمت، زندگی، مصائب، آزمائش اور محرومیوں کی بھول بھلیوں میں گم رہا کرتی تھی۔

اب سکون کی تلاش میں، وہ خود کو ان نشانیوں کے سپرد کرنے لگی تھی جو کچھ دیر کے لیے ہی سہی......اسے دکھ و آلام کا دوسرا رخ دکھانے لگتے تھے۔

وہ راز جو حروف میں چھپا تھا۔ وہ ابھی اس پر عیاں نہیں ہوا تھا۔ وہ معانی جو سمندر کی طرح گہرے تھے۔ ان میں وہ غرق نہ ہوئی تھی۔

سب کچھ مبہم تھا......غیر واضح......چھپا ہوا......

مگر اس رات ایک سوال اس پر عیاں ہوا تھا۔ بغیر جواب کے بھی وہ دن کے اجالے کی طرح یوں واضح ہوا تھا کہ کتنی ہی دیر تک وہ اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی تھی۔

''سوال تمہیں اس آیت تک لائے گا جنت! سوال ہی تمہیں اس کے معانی سمجھائے گا۔''

الف پر نظر جمائے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''آزمائش کی وادیوں میں بھٹکتے ہر انسان کو اس آیت پر غور کرنا چاہیے، ہر مریض کو، ہر سقیم کو، ہر علیل کو، ہر اثیم کو۔''

مسز شیرازی کی آواز جیسے پلٹ پلٹ کر آنے لگی۔

''اس آیت کا صرف وہ مطلب نہیں ہے جو ہم اکثر پڑھتے یا سمجھتے ہیں، اس کا ایک اور مطلب اس کے حروف میں کہیں چھپا ہے۔''

اور وہ حروف پر نظر جمائے کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

''بے شک ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔''

کمرے کی دیوار گیر کھڑکیوں پر سے پردے ہٹا کر اس نے مسز شیرازی کو دیکھا جو سامنے ہی وہیل چیئر پر براجمان کوئی کتاب ہاتھ میں لیے بیٹھی تھیں۔ سر اٹھائے اب وہ جنت کو دیکھنے لگیں جو سنگل صوفہ پر ان کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔

''میں نے کل بہت سوچا اس بارے میں......'' وہ کپ میں چائے انڈیلنے لگی۔ ''اور کل رات ہی میرے ذہن میں خیال آیا حالانکہ میں نے اس آیت کو بارہا سنا ہے۔ بارہا پڑھا ہے اور اس کے ذریعے اپنے ناتواں دل کو بارہا تسلی بھی دی ہے۔ مگر میں کل پہلی بار اس پر حیران ہوئی ہوں۔'' اس نے چائے کا کپ مسز شیرازی کو پیش کیا تھا۔ وہ بہت توجہ اور یکسوئی سے سنتے ہوئے اس کی

آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں۔ جنت کہاں تک پہنچ گئی ہے۔ شاید وہ بھی جاننا چاہتی تھیں۔

''آیت میں مشکل کے لیے لفظ ''عسر'' استعمال ہوا ہے۔ جس کا مطلب ہے ایک مشکل......اس حساب سے دیکھا جائے تو آسانی کے لیے بھی یہاں لفظ ''یسر'' استعمال ہونا چاہیے تھا۔ مگر اللہ نے لفظ ''یسرا'' استعمال کیا ہے! الف کے ساتھ!'' اب وہ اپنے کپ میں چائے نکال رہی تھی۔ ''پہلے مجھے لگا کہ شاید یسرا یسر کی ہی جمع ہوگا۔ مگر جب میں نے اس کے جمع مفردات وغیرہ دیکھے تو معلوم ہوا یہ وہ بھی نہیں ہے۔ یسر......ایک آسانی......یسرین......دو آسانیاں۔ ایسار دو سے زائد آسانیاں۔ تو پھر یسرا کیا ہے؟'' اس نے سر اٹھا کر مسز شیرازی کو دیکھا۔ ''یہ میرا پہلا سوال ہے۔ اگلی بار میں اس سوال کا جواب دوں گی آپ کو۔''

اب کے وہ بھی مسکرائی۔ مسز شیرازی نے محبت سے اس کے گال پر ہاتھ رکھا۔

''مجھے لگا شاید تم کافی وقت لوگی۔''

''مجھے بھی یہی لگا تھا۔ مگر کل رات جب میں بار بار اسے پڑھ رہی تھی۔ بار بار اسے کھوج رہی تھی تو اس وقت مجھے احساس ہوا آیات کے مفہوم بھی جیسے پرتوں میں چھپے ہوتے ہیں۔ گہرا مطلب سمجھنے کے لیے گہرائی میں اترنا پڑتا ہے۔ آپ نے ٹھیک کہا تھا۔ تدبر پانے کے لیے آیات کو ان کا وقت دینا پڑتا ہے۔''

''مجھے یقین ہے تم اس کا جواب بھی پالوگی۔''

''ہاں میں ایسا ضرور کرلوں گی، مگر آپ سے ایک شرط پر ہی شیئر کروں گی۔''

''اور وہ شرط کیا ہے؟'' انہوں نے دلچسپی سے پوچھا۔

کچھ سوچ کر، اس نے مسز شیرازی کی طرف دیکھا۔ نچلا لب دانتوں تلے رگڑتے ہوئے، گہرا سانس لے کر خود کو جیسے آنے والے لمحے کے لیے تیار کیا۔ کچھ ہمت مجتمع کی۔

''میں آپ کے پوتے سے ملنا چاہتی ہوں۔'' اس نے اتنا اچانک کہا کہ مسز شیرازی اپنی جگہ ساکت بیٹھی رہ گئیں۔ انہوں نے جنت کو بے یقینی سے دیکھا۔

''میں نے غلطی سے آپ کی اور فارس کی گفتگو سن لی تھی۔'' جھکی نگاہوں سے اس نے اپنے جرم کا اعتراف کیا۔

''میں منتظر رہی کہ شاید آپ خود اس سلسلے میں مجھ سے بات کریں گی مگر......''

مسز شیرازی خاموش ہوگئیں۔

''میں آپ کے پوتے سے ملنا چاہتی ہوں آنٹی، میں آپ کے لیے......'' انہوں نے سر اٹھا کر جن نگاہوں سے جنت کو دیکھا وہ چپ ہوگئی۔ کتنا درد تھا ان آنکھوں میں۔

''فارس کو برا لگے گا، وہ تم سے ناراض ہو جائے گا۔'' اور جنت انہیں بتا نہ سکی کہ فارس تو روز اول سے خفا ہے۔

''میں اسے خبر نہیں ہونے دوں گی۔'' اس نے یقین دہانی کرائی۔

''اسے پھر بھی خبر ہو جائے گی! وہ یہ بات برداشت نہیں کر پائے گا کہ اس کی بیوی حماد کے بیٹے سے ملے۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا آپ فکر نہ کریں، میں سب سنبھال لوں گی، آپ مجھے ایڈریس بتائیں میں خود......''

''نہیں...... جنت میرے بچے......نہیں۔'' انہوں نے اسے ٹوک دیا ''جانے دو اسے۔'' وہ جیسے اس ٹاپک پر مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ کوئی وضاحت نہیں دینا چاہتی تھیں۔ کچھ بتانا بھی نہیں چاہتی تھیں۔

ایک حکایت ان کی بھی تو تھی۔ فارس کی بھی۔ اس کے بھائی... اور بچے کی بھی......

''آنٹی۔''

''فارس کو بہت برا لگے گا۔ تمہیں اپنے شوہر کے احساسات کا خیال ہونا چاہیے۔''

جنت انہیں ہمدردی سے دیکھ کر رہ گئی۔ آخر کوئی انسان اپنے یتیم بھتیجے کے لیے اتنا سنگدل کیسے ہو سکتا ہے؟

''نہیں وہ سنگدل نہیں ہے......اسے سنگدل مت کہو۔'' مسز شیرازی نے جیسے اس کی سوچ پڑھ لی تھی۔ جنت حیرت سے انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

''بہت حساس تھا وہ...... جب پتھر ہوا تو پوری طرح سے ہوا۔ بے حس ہوا تو ہر کسی کے لیے ہوا۔ اسے الزام مت دو جنت! میں بھی نہیں دیتی۔''

انہوں نے چہرے کا رخ موڑ لیا تھا۔ جنت اپنی جگہ سن بیٹھی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

''میں بلی پالنے کا سوچ رہی ہوں۔''

کف لنکس اتار کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے فارس وجدان نے اسے سرد نظروں سے دیکھا۔ وہ ابھی ابھی ضروری میٹنگ اٹینڈ کر کے گھر لوٹا تھا۔ اور ہمیشہ کی طرح جنت کمال اس کے سر پر سوار ہو چکی تھی۔

''کوئی ضرورت نہیں۔'' جنت نے دیکھا۔ اس کی نم آنکھیں بے تحاشا سرخ ہو رہی تھیں۔

''تمہاری ضرورت کی نہیں اپنی ضرورت کی بات کر رہی ہوں۔''

''اس گھر میں کوئی جانور نہیں آ سکتا۔'' فارس کا لہجہ حتمی تھا۔ انکار پتھر پر لکیر جیسا۔

روز ہی وہ کوئی نہ کوئی فرمائش کرتی تھی۔ روز ہی وہ بے رحمی سے رد کر دیتا تھا۔

''کیوں نہیں آ سکتا؟'' وہ بحث کے موڈ میں آ گئی۔

''کیونکہ میں نہیں چاہتا۔''

''اور تم کیوں نہیں چاہتے؟''

''میں جواب دینے کا پابند نہیں۔''

''میں جواب دینے کا پابند نہیں۔'' جنت نے ہو بہو اس کے انداز میں نقل اتاری۔ فارس وجدان نے رک کر اسے کڑے تیوروں سے گھورا۔ یہ لڑکی اب اپنی حد سے بڑھ رہی تھی۔

''ساری پابندیاں تو صرف میرے لیے ہی ہیں نا۔'' رک کر اس نے تاسف سے سر ہلایا۔ ''مجھے لگتا تھا تم میرے لیے ہی بے رحم ہو، یہاں تو بے چارے جانور بھی تمہاری نفرت سے محفوظ نہیں ہیں۔''

وہ ضبط کیے خاموش رہا۔ جنت کو یہ خاموشی نہیں چاہیے تھی۔

''تو اب میں یہ سمجھوں کہ تم بھی ان دس پرسنٹ لوگوں میں شامل ہو جنہیں بلیاں اچھی نہیں لگتیں؟'' اس نے بات بڑھائی۔

''ہاں! ہوں! کوئی اعتراض؟'' وہ جھنجھلاہٹ کا شکار ہوا تھا۔

''بخدا کوئی اللہ کی اتنی پیاری تخلیق کو ناپسند کیسے کر سکتا ہے؟ یقیناً تم نے بلیوں کو ہاتھ بھی لگایا ہوگا؟ انہیں قریب سے دیکھا بھی نہیں ہوگا؟'' وہ وارڈ روب سے کپڑے نکالے واش روم میں گھس گیا تھا۔ جنت دروازے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ''تم بلیوں کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزار کر تو دیکھو، بہت اچھا محسوس کرو گے۔''

اندر شرٹ اتارتے ہوئے فارس وجدان زیر لب بڑبڑایا۔ ''ہاں! بہت اچھا محسوس کروں گا۔'' انداز میں جلاہٹ نمایاں تھی۔

''میں جانتی ہوں تمہیں میرے احساسات کی کوئی قدر نہیں۔ لیکن بلی والی بات پر مجھے تمہارا اعتراض کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا! ٹھیک ہے یہ گھر تمہارا ہے۔ لیکن میں بھی تو تمہاری بیوی ہی ہوں۔ کاغذی ہی سہی۔ اتنا تو حق رکھتی ہی ہوں کہ......'' وہ رک گئی۔ ''تم سن بھی رہے ہو میں کیا کہہ رہی ہوں۔''

دروازہ کھل گیا تھا۔

سیاہ جینز پر سیاہ شرٹ میں ملبوس وہ باہر آ گیا۔ وارڈ روب کھولے اس نے سفید رنگ کا جمپر نکالا۔

''میں کہہ رہی ہوں کہ ایک چھوٹی سی بلی۔''

''یہ کیا بلی بلی لگا رکھی ہے تم؟ جب منع کر دیا ہے کہ نہیں آ سکتی تو نہیں آ سکتی! اور یہ تمہارا گھر نہیں ہے جہاں تم اپنی مرضی چلا سکو۔'' بگڑے تیوروں کے ساتھ اسے ڈانٹ کر وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔ جنت ضبط کیے کھڑی رہ گئی۔ پھر دماغ نے ٹھوکا دیا تو تن

فن کرتی اس کے پیچھے باہر آ گئی۔

''جب میں تمہاری بیوی ہوں ہی نہیں تو یہ شوہروں والا رعب کیوں دکھاتے ہو مجھے؟''

سیڑھیاں اترتے فارس وجدان کے قدموں کی حرکت تھمی۔ رک کر، سر اٹھا کر اس نے غصیلی نظروں سے جنت کمال کو دیکھا۔

''میرا مطلب ہے۔'' اس کے کڑے تیوروں سے کچھ خائف ہو کر اس نے فوراً بات سنبھالی۔ ''مہمان ہوں میں چند دنوں کی۔ اس وجہ سے ہی لحاظ کر لیا کرو۔'' لہجے میں مٹھاس بھر کر، اس نے پلکیں جھپکائیں۔ ''میرے نانا کے گھر میرے پاس تین بلیاں تھیں۔ بہت وقت گزارا ہے میں نے ان کے ساتھ۔ یقین کرو شور نہیں کرتی ہیں، گند بھی نہیں مچاتیں۔ پیار دیتی بھی ہیں۔ لیتی بھی ہیں۔ بہت اچھا وقت گزرتا ہے ان کے ساتھ۔''

''تم بلیوں کے ساتھ وقت گزارتی ہو؟'' فارس کی آواز میں اب کے ہلکا سا صدمہ تھا۔

''نہیں گزارا تو نہیں ہے۔'' اس نے صفائی سے جھوٹ بولا۔ ''لیکن گزارنا چاہتی ہوں۔ مسز یزدانی کی پرشین کیٹ کے چھوٹے چھوٹے بلونگڑے.....''

''بس۔'' فارس نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ ''آج کے بعد تم مسز یزدانی کے گھر نہیں جاؤ گی۔''

جنت کا منہ صدمے سے کھلا۔ ''مگر کیوں۔'' وہ احتجاجاً چلائی۔

''میں نے کہا نہیں جاؤں گی تو بس نہیں جاؤں گی۔'' اس کا لہجہ کافی سے زیادہ سخت ہوا تھا۔

''تم تو ایسے ری ایکٹ کر رہے ہو جیسے میں بلی تمہارے سر پر لا بٹھاؤں گی۔ اتنا بڑا گھر ہے تمہارا۔ اور دل۔ بخدا تمہارا دل چیونٹی جتنا بھی نہیں ہے۔''

''میں بتا رہا ہوں اگر تم نے گھر میں pet لانے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

''تم سے برا ویسے کوئی ہو بھی نہیں سکتا۔'' اس کے منہ سے نکل گیا۔

قدم اٹھاتے فارس نے وجدان لب بھینچ کر اسے دیکھا۔ وہ ریلنگ پر جھکی ہوئی تھی۔ ''میں بلی کا نام فریسہ رکھوں گی۔ فارس کی مؤنث فریسہ ہوئی نا۔ یا فارسہ؟'' اس کی آنکھوں میں شرارت تھی، لبوں پر مسکراہٹ۔ گویا عزائم واضح تھے، وہ فارس کے حکم کو کسی خاطر میں نہیں لا رہی تھی۔

وہ رک گیا۔ گہری سانس لے کر جیسے اپنے مشتعل اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کی۔ جنت تیزی سے سیڑھیاں اتر کر اس کے پاس آ گئی۔

''میں جان گئی ہوں تم ایسے نہیں مانو گے۔ اب میں آنٹی سے ہی بات کروں گی۔'' اترا کر کہتے ہوئے وہ سیڑھیاں اترنے ہی

لگی تھی کہ فارس نے اسے بازو سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے روکا۔ اس کا پورا وجود ہل کر رہ گیا۔

''کیا چاہتی ہو تم؟'' دانت پیس کر خطرناک تیوروں کے ساتھ، ذرا سا اس کی طرف جھکا۔ ''بلی کے علاوہ''

جنت کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ ''مم......'' اس نے خلا میں یوں نگاہ دوڑائی جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ ''مجھے کیا چاہیے؟ مجھے کیا چاہیے؟'' شہادت کی انگلی ٹھوڑی پر متحرک تھی۔ ''اوہ ہاں۔ میں چاہتی ہوں آج تم مجھے ڈنر پر لے جاؤ۔ خود سے لے جاؤ! مجھے آنٹی سے نہ کہنا پڑے۔''

چند لمحوں تک اسے گھورتے رہنے کے بعد وہ اسے جھٹکے سے چھوڑ کر سیڑھیاں اتر گیا۔

''تو کیا میں اسے ہاں سمجھوں؟'' وہ عقب میں چلائی۔ ''آج کی رات! میں نو بجے تیار رہوں گی فارس۔''

اور فارس عجلت میں قدم اٹھاتا صدر دروازہ عبور کر گیا۔

☆☆☆

سیاہ رنگ کا ہلکے کام والا فراک اس پر کافی جچ رہا تھا۔ شہد بالوں کو جوڑے کی شکل دیئے، لائٹ سا میک اپ کیے، وہ خوشگوار تاثرات کے ساتھ فارس وجدان کے سامنے اٹالین ریسٹورینٹ میں موجود تھی۔ کھانا سرو کیا جا چکا تھا۔

بلیک ٹو پیس سوٹ میں ملبوس وہ پتھریلے تاثرات کے ساتھ ہمیشہ کی طرح خاموش بیٹھا تھا۔ جنت کھانا مزے لے کر کھا بھی رہی تھی اور باتیں بھی کر رہی تھی۔

''آنٹی نے ہنی مون کی بات کی تھی، تم نے کہا تھا تم سوچو گے، کچھ پلان کرو گے، اب جب تک میں یہاں ہوں تب تک کچھ پلان کر لو یار! تھوڑا میں بھی انجوائے کر لوں گی، آؤٹنگ ہو جائے گی میری بھی۔''

فارس کا سر دکھنے لگا۔ کوئی آدھے گھنٹے سے وہ اس کی باتیں سن رہا تھا۔ مجال ہے جو وہ ایک لمحے کے لیے بھی خاموش ہوئی ہو۔

کچھ سوچ کر جنت نے بیگ سے موبائل نکال کر، فارس کے سامنے اسکرین لہرائی۔ ''گیس کرو میں نے تمہارا کانٹیکٹ نمبر کس نام سے سیو کیا ہے؟''

بند مٹھی پر ٹھوڑی جمائے وہ سرد نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ دوسرے ہاتھ کی انگلیاں میز پر متحرک تھیں۔ گویا وہ منتظر تھا کہ کب محترمہ کھانا ختم کریں اور وہ واپسی کی راہ لے۔

''تم نے غلط گیس کیا۔'' خود ہی جواب دے کر جنت نے اسکرین پر کانٹیکٹ لسٹ کھول کر سامنے کی۔

بے شمار نیلے پیلے دلوں کے درمیان لکھا تھا۔ ''مائی کاغذی ہزبینڈ۔''

وہ ہنس دی۔ فارس لب بھینچ کر رہ گیا۔

"تم نے کس نام سے سیو کیا ہے میرا نمبر؟" اب وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

"میں فضول لوگوں کے نمبر سیو نہیں کرتا۔" وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

"میں تو کرتی ہوں۔"

جبڑے بھینچے وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ آسمان پر بادل پھیل رہے تھے۔

"ہر جگہ سے مجھے بلاک کیا ہوا ہے تم نے، فائدہ نمبر دینے کا؟"

نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے وہ بس چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی تھی، پھر بولی۔

"دوستی کرو گے مجھ سے؟ بہت اچھی لڑکی ہوں میں، آخری دم تک ساتھ نبھاؤں گی۔"

فارس نے ایک لمحے کے لیے اسے دیکھا پھر میز پر کہنیاں جماتے ہوئے آگے ہوا۔

"اور یہ دوستی کی آفر تم کتنے لوگوں کو کر چکی ہو؟"

جنت کے لبوں سے مسکراہٹ اڑنچھو ہو گئی۔

"ایسے ہی خیال آیا تو سوچا پوچھ لوں۔" اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "کہیں تمہارے ایکس ہزبینڈ نے اسی وجہ سے تو تمہیں ڈیورس نہیں دے دی؟"

"تم اب اپنی حد کراس کر رہے ہو فارس۔" جنت کا چہرہ جذبات کی شدت سے سرخ ہو چکا تھا۔

"حد کراس نہیں کر رہا، تمہیں حد میں لانے کی کوشش کر رہا ہوں۔" کاٹ دار لہجے میں کہتے ہوئے اس نے جنت کی طرف دیکھا۔

"طلاق اس نے دی تھی یا تم نے لی تھی؟"

جنت کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی گردن پر پاؤں رکھ کر مسلا جا رہا ہو۔ فارس کا ہر سوال ایسا ہی تھا۔ اذیت کی دو دھاری تلوار کی طرح......

"تمہاری چھ بہنیں ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی تمہاری شادی میں شریک نہیں ہوئی۔ جہاں تک مجھے علم ہے، خاصا بڑا خاندان ہے تمہارا... مگر کوئی ایک رشتہ دار بھی تمہاری شادی پر نہیں تھا ماسوائے سائرہ آنٹی کے۔"

مٹھیاں بھینچے، لب باہم پیوست کیے...... وہ ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہی تھی۔ اتنے اچھے موڈ کے ساتھ اسے ڈنر پر لا کر وہ اس طرح کی باتیں کرے گا، اگر اسے علم ہوتا تو یقیناً وہ نہ آتی۔

"میرے کردار پر مت آؤ فارس! میں تمہیں وارن کر رہی ہوں۔" اس نے اسے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔

"ورنہ کیا کرو گی؟" لبوں پر استہزائیہ مسکان لیے اس نے بھنویں اچکا کر اسے للکارا۔

غصہ......غم...... بے بسی...... جنت نے حلق میں ابھرتے آنسوؤں کے پھندے کو بمشکل نیچے اتارا۔ باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔

"تمہاری معلومات نکلوانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، لیکن میں تم میں اتنی سی بھی دلچسپی نہیں رکھتا کہ اپنے آدمیوں کو تمہارے حوالے سے آرڈر دیتا پھروں۔ لیکن جس روز ایسا کروں گا اس روز تم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گی۔ اس لیے آخری وارننگ دے رہا ہوں میں تمہیں! میرے گھر میں رہنا ہے تو اپنی حدود میں رہو! یہ آخری وارننگ ہے۔" ویٹر کو بلا کر، پے منٹ ادا کر کے وہ جانے کے لیے اٹھ گیا تھا اور جنت کمال اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی تھی۔

گال پر پھسلتی لٹ کو کان کے پیچھے اڑستے ہوئے اس نے آنسو پینے کی ناکام کوشش کی تھی۔ وہ فارس کے ساتھ آئی تھی مگر وہ فارس کے ساتھ واپس نہیں گئی تھی۔ وہ ریسٹورینٹ میں اپنی جگہ بالکل خاموش بیٹھی بار بار ٹشو سے آنکھیں پونچھ رہی تھی۔ پیشانی پر بکھرتے بالوں کو سمیٹ رہی تھی۔ خشک لبوں کو کاٹتی اور کھڑکی سے باہر شدت سے برستی بارش کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے وہ یہاں آئی ہی اس لیے تھی...... تن تنہا...... اسی بارش کو انجوائے کرنے...... جو اس پر اب وحشت سی طاری کر رہی تھی۔

بالآخر اپنا ہینڈ بیگ کندھے پر ڈالتے ہوئے وہ ضبط کر کے اٹھ گئی تھی۔ سیڑھیاں اتر کر اس نے مین روڈ کی جانب قدم بڑھا دیے۔

پارکنگ ایریا کی طرف اس نے جانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ جانتی تھی فارس اب تک جا چکا ہوگا۔ اگر نہ بھی گیا ہوتا تو وہ تب بھی اس کے ساتھ جانے کے لیے فی الوقت آمادہ نہیں تھی۔

کوئی آپ کے مشکل سے ٹھیک ہوتے زخموں کو ایک ہی لمحے میں ادھیڑ کر رکھ دے تو آپ یہی کرتے ہیں۔ وہ بھی یہی کر رہی تھی۔

رونا بھی بہت آ رہا تھا اور وہ رونا بھی نہیں چاہتی تھی۔ گھر جانے کی بھی جلدی تھی اور گھر پہنچنا بھی نہ چاہتی تھی۔

وہ فٹ پاتھ پر قدم اٹھاتی آگے بڑھنے لگی۔ موبائل بیگ میں تھا۔ وہ ڈرائیور کو کال کر سکتی تھی۔ مگر ڈرائیور بھی تو فارس کا تھا۔

ہوا ذرا تیز ہوئی تو اس نے بھی رفتار بڑھا لی۔

"اللہ اس کی تمہیں وہ سزا دے گا جنت جو تم تاعمر یاد رکھو گی۔"

سڑک کنارے، اس کے قریب ہی فارس کی گاڑی رک گئی تھی۔ وہ جھکے سر کے ساتھ خاموشی سے قدم اٹھاتی رہی۔

بیچ راستے میں جب فارس نے اسے بازو سے پکڑ کر روکا تو اس نے درشتی سے اپنا آپ چھڑایا تھا۔

"آدھے گھنٹے سے گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں اور تم۔" اس کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔

غصہ، ناراضی، خفگی سب بھلا کر جنت صدمے سے فارس وجدان کو دیکھ کر رہ گئی۔

آدھے گھنٹے سے وہ اس کا "انتظار" کر رہا تھا۔ آدھے گھنٹے سے!!

یہ معجزہ کب، کیسے کیوں کر رونما ہوا؟

"میں نے سوچ لیا تھا کہ اب تم سے طلاق لے کر یہاں سے چلی جاؤں گی۔" کھڑے کھڑے بڑے آرام سے اس نے ہاتھ کی پشت سے آنسو کیے۔ "لیکن اب ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ تم انتظار کر رہے تھے میرا۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے۔ صدیقی انکل نے کہا تھا تم انتظار کسی کا نہیں کرتے۔" ایک استحقاق سے اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ ایک ادا سے بیٹھ بھی گئی۔

فارس کی ساری دھمکیاں دھری کی دھری رہ گئیں۔ وہ ہکا بکا اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔

"کیا ہوا؟ گھر نہیں جانا کیا؟" اب کے گاڑی کا شیشہ نیچے کر کے جنت نے اپنا سر باہر نکالا۔

لب بھینچ کر اس نے جنت کو دیکھا۔

"تمہاری وجہ سے جتنے آنسو میرے ضائع ہوئے ہیں ان کے بدلے ایک آئس کریم تو لازمی بنتی ہے۔" وہ کہہ رہی تھی۔

خود پر ضبط کے پہرے بٹھاتے ہوئے وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ دروازہ قدرے زور سے بند ہوا۔

اپنا بیگ کنگھالتے ہوئے جنت نے یک دم ہی زچ ہو کر اسے دیکھا۔

"بخش دو ان دروازوں کو! اللہ کے لیے۔"

"تم اپنا منہ بند رکھو۔"

"ہاں تو میں نے کچھ کہا؟ آنٹی ہی کہتی ہیں تم بے جان چیزوں کا بہت خیال رکھتے ہو۔ ایک خراش تک نہیں آنے دیتے اپنی گاڑی کو...... مگر یہ دروازہ کیا سوتیلا ہے؟"

وہ لب بھینچے گاڑی ڈرائیو کرنے لگا۔ جنت بھی خاموشی سے باہر دیکھتی رہی تھی۔

☆☆☆

صبح کے سات بجے اس کی آنکھ اپنے موبائل کی آواز پر کھلی تھی جو گلاس ٹیبل پر پڑا مسلسل بج رہا تھا۔ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس نے ایک طائرانہ نگاہ کمرے میں دوڑائی۔ فارس ابھی تک سو رہا تھا۔ غالباً آج اس کا آف تھا۔

اس نے نیم وا آنکھوں سے اسکرین پر جگمگ کرتے نمبر کو دیکھا۔ پھر کال ریسیو کر لی۔

"السلام علیکم جنت! کیسی ہو؟"

"وعلیکم السلام خالہ۔" الجھے بکھرے بالوں کو سمیٹ کر وہ اٹھ بیٹھی۔ آواز نیند سے بھاری تھی۔ "میں ٹھیک ہوں آپ کیسی ہیں۔" صوفے کی پشت سے کمر ٹکا کر اس نے انگڑائی لی۔

"تمہاری آواز کو کیا ہوا ہے، طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟"

"طبیعت کو کچھ نہیں ہوا، ابھی سو کر اٹھی ہوں۔"

"میں ایسے ہی پریشان ہو گئی۔" سائرہ خالہ کو تسلی سی ہوئی۔ "گھر میں سب ٹھیک ہے نا؟ فارس کیسا ہے؟"

"اچھا ہے۔" کن اکھیوں سے فارس کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ "خیریت ہے خالہ اتنی صبح صبح کال کی آپ نے۔"

فارس نے تکیہ اپنے منہ پر رکھ لیا۔

وہ اٹھ کر بالکنی میں آ گئی۔

"اگلے ہفتے سدرہ کی شادی ہے جنت! کیا تم بھول گئیں؟" انہوں نے یاد دلایا۔

جنت منجمد ہوئی۔ خشک لبوں کو تر کرتے ہوئے اس نے حلق میں ابھرتی گلٹی کو بمشکل نیچے اتارا۔

"میرا خیال تھا تم ایک دو ہفتے پہلے ہی آ جاؤ گی مگر یہاں تو مجھے ہی تمہیں یاد دلانا پڑ رہا ہے۔"

"مجھے یاد تھا خالہ۔" داہنا ہاتھ ریلنگ پر ٹھہر گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا خالہ اسے سدرہ کی شادی پر انوائٹ کریں گی۔ اور صرف انوائٹ ہی نہیں کریں گی، بلکہ یہ امید بھی رکھیں گی کہ وہ شرکت بھی کرے گی۔

"تو پھر کب آ رہی ہو تم؟"

جواباً وہ کچھ کہہ نہ سکی...... سائرہ خالہ کے بہت احسان تھے اس پر...... اور اب جب ان کی اکلوتی بیٹی کی خوشی کا موقع تھا تو......

"وہاں وہ سب بھی تو ہوں گے خالہ۔" اس کا رخ اب گلاس ڈور کی طرف تھا۔ وہ اندر نہیں دیکھ سکتی تھی مگر اندر جو موجود تھا وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

بے قراری سے نچلا لب دانتوں تلے دبائے، مضطرب نگاہوں سے یہاں وہاں دیکھتے، بائیں ہاتھ سے سویٹر کے بٹن کو چھیڑتے وہ اس لمحے بہت پریشان لگ رہی تھی۔

"بلاشبہ ہوں گے مگر اس سے تمہیں کیا لینا دینا؟ تم اپنے شوہر کے ساتھ اپنی کزن کی شادی اٹینڈ کرنے آ رہی ہو۔ اکیلی نہیں ہو کہ کوئی......"

کاش وہ سدرہ خالہ کو بتا سکتی کہ وہ اب بھی اکیلی ہی ہے...... وہ ان سب کا سامنا آج بھی نہیں کر سکتی۔

"میرے لیے...... یہ بہت مشکل ہے۔"

''تم آنا نہیں چاہتیں؟'' سدرہ خالہ کے لہجے میں اب خفگی تھی۔

'' آنا چاہتی ہوں خالہ مگر...... آپ تو جانتی ہیں سب......'' اس نے مٹھیاں بھینچ کر جیسے اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کی تھی۔

''میری اکلوتی بیٹی کی شادی میں شرکت نہیں کرو گی تم۔'' سائرہ خالہ مغموم ہوگئیں۔ ''جنت وہ تمہاری شادی میں تمہارا سایہ بنی رہی، تمہارا ہر کام اس نے کیا، اور جب اس کی باری آئی ہے تو تم ... تم منہ موڑ رہی ہو؟''

جنت کی آنکھوں کی نمی کچھ اور گہری ہوئی...... اتنی گہری کہ ہر منظر دھندلا گیا۔

''میں...... میں آؤں گی...... میں فارس سے بات کر کے آپ کو بتاتی ہوں۔''

اس نے بات سمیٹنے کی کوشش کی۔

''ٹھیک ہے۔'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد انہوں نے فون بند کر دیا۔

جنت کتنی ہی دیر تک وہاں کھڑی رہی۔ پلکیں جھپکا کر آنسوؤں کا ہر اثر مٹاتی جب کمرے میں داخل ہوئی تو فارس کو دیکھ کر رک گئی۔

ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، نیند سے بیداری کے مراحل طے کرچکی آنکھوں کے ساتھ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا مگر جس چیز نے جنت کو چونکایا تھا وہ اس کے لبوں پر داہنے گال کی جانب اٹھی ہوئی مسکراہٹ تھی۔

اور اس کی یہ مسکراہٹ جتنی بھی خوبصورت تھی، جنت کمال کو گھبراہٹ میں مبتلا کر گئی۔

ایک اچٹتی نگاہ اس پر ڈالے وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔

اس کی طنزیہ نگاہیں...... اور مسکراہٹ کا کیا مطلب؟

طرح طرح کے سر اٹھاتے اندیشوں کو جھٹلاتے ہوئے وہ خالہ کے بارے میں سوچنے لگی۔

وہ شادی میں شریک بھی نہ ہونا چاہتی تھی اور خالہ کو ناراض بھی نہ کرنا چاہتی تھی۔ بے قراری سے انگلیاں مروڑتے ہوئے وہ ٹہلنے لگی۔ کیا کرے وہ اب؟

اس مسئلے کا ایک حل تھا مگر وہ حل فارس کو چیلنج کرنے کے مترادف تھا۔ گزشتہ شب ہونے والی تلخ کلامی کے بعد اس نے فیصلہ کیا تھا وہ اس کے معاملات میں مداخلت نہیں کرے گی مگر اب......

اس کی دھمکیاں اور چبھتے سوال وہ بھولی نہیں تھی مگر پھر......

☆☆☆

وہ پندرہ دنوں کے لیے کاروباری دورے پر لندن جا رہا تھا۔ کچھ ضروری میٹنگز اٹینڈ کرنی تھی اور اپنی کمپنی کی لندن برانچ کے معاملات کو بھی دیکھنا تھا۔ ٹکٹ کنفرم ہوئی تو اس نے جانے سے دو روز پہلے رات کے کھانے پر مسز شیرازی کو اپنے شیڈول سے آگاہ کیا۔

''اکیلے کیوں جا رہے ہو، جنت کو بھی ساتھ لے جاؤ۔''

انہوں نے اتنا اچانک کہا کہ فارس نے یک دم سر اٹھا کر جنت کو دیکھا۔ وہ اطراف سے یکسر بے نیاز پلیٹ میں چاولوں سے کھیلنے لگی۔

''یہ کیا کرے گی ممی۔'' وہ گڑبڑایا تھا۔

''اس کی بھی آؤٹنگ ہو جائے گی، کام میں تم اتنے مصروف ہو کہ ہنی مون بھی پلان نہیں کر سکے، کیوں جنت! ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں؟''

''جی جی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ......'' اس نے فوراً تائید کی۔

فارس اسے دیکھ کر رہ گیا۔ گزشتہ شب واضح وارننگ کے باوجود اس لڑکی میں اتنی ہمت تھی کہ وہ ایک بار پھر اس کی ماں کے ذریعے اپنا مطلب نکلوا رہی تھی!!! فارس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

''ممی میں وہاں بھی مصروف ہوں گا! فرصت سے پھر کبھی پروگرام بنا لیں گے۔'' اس نے سے مسز شیرازی کو قائل کرنا چاہا، ساتھ ہی اس نے جنت کمال کو خطرناک تیوروں کے ساتھ گھورا تھا۔ آنکھوں میں غیض و غضب کی لہر تھی۔ دھمکی بھی تھی۔

''میرے خیال سے۔'' وہ اس کے تاثرات سے خائف ہو کر بول پڑی۔ ''میرے خیال سے فارس ٹھیک کہہ رہا ہے آنٹی!''

''خاک ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' مسز شیرازی خفگی سے بولیں، ''تم اسے نہیں جانتیں، میں جانتی ہوں، کام کا بہانا یہ بار بار کرے گا، اور ہر بار حیلے بہانوں سے ٹالتا رہے گا۔'' اب کے انہوں نے اپنے بیٹے کو خاصے کڑے تیوروں سے گھورا تھا۔

''جنت تمہارے ساتھ لندن جا رہی ہے اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔''

''آپ کو یہاں اکیلا کیسے چھوڑ جائیں آنٹی۔'' فارس کے تاثرات اب اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑا رہے تھے۔ آج اس کی خیر نہیں!!

''نوکروں کی فوج کے ساتھ میں اکیلی نہیں ہوں۔'' انہوں نے جیسے حتمی فیصلہ سنایا۔ ''جنت! اپنی تیاری کرو، اور تم۔'' انہوں نے فارس کی طرف دیکھا۔ ''جنت کی ٹکٹ بک کرواؤ۔'' لہجہ تحکمانہ تھا۔

فارس نے نہ اثبات میں سر ہلایا نہ نفی میں...... چند نوالے زہر مار کیے اور اٹھ کر چلا گیا۔

اس رات جنت کافی تاخیر سے کمرے میں آئی تھی یہ سوچ کر کہ اب تک وہ سو چکا ہوگا مگر نہ صرف وہ جاگ رہا تھا بلکہ آتش فشاں بنا اس کے انتظار میں ٹہل بھی رہا تھا۔ اب کے وہ صحیح معنوں میں خائف ہوئی تھی۔

''وہ......میں نے نہیں کہا۔ آنٹی نے خود ہی......''

''جھوٹ مت بولو۔'' فارس نے درشتی سے اس کی بات کاٹ دی۔ ''تمہارے ان اوچھے ہتھکنڈوں کو اچھی طرح سے سمجھتا ہوں میں۔ پچھلے دو ماہ سے تم یہی تو کر رہی ہو۔''

جنت چپ ہوگئی۔

''میں نے تمہیں وارن کیا تھا مجھ سے فاصلے پر رہو۔'' وہ زہر خند لہجے میں بولا۔ ''وہ آخری وارننگ تھی جنت کمال! آخری وارننگ۔''

حلق میں ابھرتی گلٹی کو نیچے اتارتے ہوئے جنت نے جیسے خود کو پیش آنے والی ہر سچویشن کے لیے تیار کر لیا۔ زیادہ سے زیادہ کیا کرے گا وہ؟ غصہ دکھائے گا، جھگڑا کرے گا، کمرے سے نکال دے گا؟ طلاق وہ دے نہیں سکتا۔ گھر سے وہ نکال نہیں سکتا۔ اس کے بھاگتے دوڑتے ذہن کو اس لمحے جھٹکا لگا جب فارس نے اس کے سامنے اپنے مینیجر کو فون کر کے اپنی ٹکٹ کینسل کروانے کا کہا۔ دوسری طرف سے غالباً وجہ پوچھی گئی تھی، دلیلیں بھی دی گئی تھیں۔ کیونکہ جس کام کے لیے وہ لندن جا رہا تھا وہ کام بے حد اہم تھا۔

''میری وائف کی کزن کی شادی ہے۔ ہمیں وہ شادی اٹینڈ کرنی ہے۔'' جنت کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے جیسے دھماکہ کیا تھا۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی رہ گئی تھی۔

''تو مس جنت! امید ہے تمہارے ساتھ تمہاری طرح کھیل کر مجھے مزا آئے گا۔''

وہ تلخی سے مسکرایا تھا۔

اور جنت کمال اگلے کئی لمحوں تک پلکیں تک نہ جھپکا سکی تھی۔

☆☆☆

بہترین انتظامات کے ساتھ خوبصورتی سے ڈیکوریٹ کیے گئے شادی ہال کے صدر دروازے پر، مہمانوں کا خوش اخلاقی سے استقبال کرتی سائرہ خالہ کی نظر جنت پر پڑی تو وہ حیران رہ گئیں۔ ایک لمحے کے لیے تو جیسے انہیں یقین ہی نہ آیا، اگلے ہی لمحے انہوں نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا تھا۔

فارس وجدان نے موبائل کی اسکرین سے نگاہ اٹھا کر سائرہ خالہ کو دیکھا۔ لبوں پر داہنے گال کی جانب اٹھتی مدھم مسکان کے

ساتھ وہ جنت کے خالو سے اور ان کے بیٹوں سے ملا۔ عمار کے علاوہ سائرہ خالہ کے تینوں بیٹے خوش اخلاقی سے ملے۔

نیوی بلیو پینٹ کوٹ میں فارس کا دراز قد نمایاں ہو رہا تھا۔ اپنی شخصیت میں شاندار تو وہ تھا ہی مگر وجاہت کے باعث ہر کسی کی نظروں میں بھی آ رہا تھا۔

سفید اور گلابی رنگ کے امتزاج کے کامدار لہنگا چولی میں ملبوس، جنت بنت کمال سب کچھ لگ رہی تھی مگر خوش نہیں۔ زبردستی کی مسکراہٹ بھی اس کے ہونٹوں پر نہیں تھی۔ آنکھیں، سرخ متورم.. جیسے وہ سارا راستہ روتی رہی ہو۔ وہ جتنی اپ سیٹ تھی۔ فارس وجدان اتنا ہی خوش اور مطمئن!

''تم اندر جاؤ میں ضروری کال اٹینڈ کر کے آتا ہوں۔'' جنت نے متوحش نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اب اندر بھی وہ اکیلی جائے؟

پھر اس نے خالہ کو دیکھا جو دوسرے مہمانوں سے مل رہی تھیں۔ عمار قدرے فاصلے پر ہی بگڑے تیوروں کے ساتھ کھڑا تھا۔

''میں......میں تمہارا یہیں انتظار کر لیتی ہوں۔''

''کوئی ضرورت نہیں۔'' آنکھوں میں سختی سے دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ پھر قدرے فاصلے پر، شادی کے ہنگامے، شور شرابے اور میوزک کی تیز آواز سے پرے وہ فون کان سے لگائے کسی سے بات کرنے لگا۔ مٹھیاں بھینچ کر جنت نے جیسے اپنی گھبراہٹ پر قابو پایا پھر ہمت مجتمع کر کے ہال میں داخل ہوگئی۔

شادی کا شور شرابہ، ہنگامہ سب جیسے ختم ہوا تھا۔ یا شاید اس کی سماعت نے ہی کام چھوڑ دیا تھا کہ آہستگی سے قدم اٹھاتے ہوئے اسے یوں لگا تھا جیسے ہر طرف مہیب سناٹا چھا گیا ہو۔ کئی نگاہیں اس کی طرف اٹھی تھیں، کئی لوگوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کیے تھے۔

آتے جاتے لوگوں کی مرکز نگاہ بنی، اذیت کی دو دھاری تلوار پر قدم جمائے وہ شادی ہال کے سب سے الگ تھلگ حصے میں جا کر بیٹھ گئی تھی۔

جن لوگوں کے سامنے وہ مر کر بھی نہیں آنا چاہتی تھی وہ اب نظر بھر کر اسے دیکھ رہے تھے۔ اسے جانچ رہے تھے۔ اسے پرکھ رہے تھے۔

بدنصیبی کا اگر کوئی روپ ہے تو وہ جنت کمال کو دان کر دیا گیا ہے۔ بدبختی اگر کوئی مقام ہے تو وہ جنت کمال کو انعام کر دیا گیا ہے۔

اس کا سر اٹھا ہوا تھا مگر نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ کسی کو دیکھنا نہ چاہتی تھی مگر پھر بھی سب اسے نظر آ رہے تھے بہنوں کو وہ

نظر انداز نہیں کر سکی تھی۔خصوصاً حفصہ آپی کو......وہ انہیں اٹھتے بیٹھتے، آتے جاتے دیکھ رہی تھی اور وہ تھیں کہ اسے مکمل طور پر نظر انداز کیے ہوئے تھیں۔

اس کی بھانجیاں اور بھانجے دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلتے کودتے پھر رہے تھے۔مبشر تو اس کے پاس سے گزر کر گیا تھا۔یقیناً بہنوں نے ہی منع کر رکھا تھا تبھی وہ اس کے پاس نہیں آئے تھے۔

چھوٹے چچا اور پھپھو کی فیملی بھی وہاں موجود تھی۔ہر چہرے پر اسے دیکھتے ہی ناگواری ابھر آئی تھی۔کچھ تو حیران بھی ہو رہے تھے کہ وہ یہاں کیسے آ گئی تھی؟

''تم یہاں کیوں آ گئی ہو؟'' جنت نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔عمار شدید غصے میں لگ رہا تھا۔''اپنا تماشا بنوانے کا بہت شوق ہے تمہیں۔''

جنت اسے دیکھ کر رہ گئی۔زیر لب بڑبڑاتے ہوئے وہ وہاں سے چلا گیا۔وہ جانتی تھی عمار یہ بات کس وجہ سے کہہ کر گیا تھا۔اس کی بھی مجبوری تھی۔وہ کون سا اپنی مرضی سے یہاں آئی تھی۔

فارس کچھ تاخیر سے آیا تھا۔کرسی کھینچ کر اس کے ہمراہ بیٹھا تو ایک بار پھر وہ نظروں میں آ گئی تھی۔

تو یہ تھا جنت بنت کمال کا شوہر!

سب نے آج دیکھا تھا۔سب نے آج جانا تھا۔اپنے حیران ہوئے تھے۔ان کا حیران ہونا بنتا بھی تھا۔

بھلا کوئی جنت جیسی لڑکی سے شادی کے لیے رضامند کیسے ہوا تھا؟اس کے لیے تو زمان جیسے مرد ہی جچتے تھے۔

ناقص!نامکمل!ایسی ہی تصویر تھی اس کی۔کچھ رنگ مفقود کیا ہوئے۔وہ دل سے جو گری سو گری، نظروں میں بھی نہ رہی تھی......

داہنے ہاتھ سے بائیں ہاتھ کی کلائی مضبوطی سے پکڑے، ٹانگ پر ٹانگ رکھے وہ بظاہر مضبوط نظر آ رہی تھی مگر اس کے اندر جو توڑ پھوڑ ہو رہی تھی اس کا عکس اس کی جھلمل کرتی آنکھوں میں لہرا رہا تھا۔

کچھ اگر باقی بھی ہے تو آج ختم ہو جائے گا!!اندر ایک ہنگامہ برپا تھا۔

دلہن دولہا کو اسٹیج پر بٹھایا گیا تو ان کے آس پاس اپنی بہنوں کو دیکھ کر ایک بار پھر دل کو کچھ ہوا۔اتنی محبت و اہتمام سے وہ سدرہ کے آگے پیچھے تھیں،اس کے عروسی جوڑے کا دامن سیٹ کر رہی تھیں۔اور خود وہ اپنی شادی پر کتنی تنہا، کتنی نامکمل تھی ان کے بغیر۔

''میں تمہیں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں اور تم یہاں بیٹھی ہو جنت۔'' جانے کہاں سے خالہ آئیں اور زبردستی اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئیں۔عمار کے چہرے پر ایک بار پھر ناگواری در آئی تھی۔وہ اپنی ماں کو کچھ خفگی سے دیکھ رہا تھا۔

بھاری دل کے ساتھ وہ اسٹیج پر چڑھی تھی۔بہنیں ایک ایک کر کے وہاں سے ہٹ گئیں۔کزنز بھی دور ہو گئیں۔جو موجود تھے وہ

اس کی آمد پر ناگواری کا اظہار کرنے لگے تھے۔

فارس وجدان سینے پر بازو باندھے جنت کے تاثرات سے کافی محظوظ ہو رہا تھا۔

☆☆☆

اسٹیج پر دلہن کے ہمراہ بیٹھی پرکشش نقوش کی حامل اس لڑکی پر ساجدہ بیگم کی نظریں ٹھہری کہ وہ باوجود کوشش کے ہٹا نہ سکیں۔

انہوں نے عینک لگا کر اس کا ہر طرح سے جائزہ لیا پھر دل ہی دل میں اسے اپنے بیٹے کے لیے پسند کر لیا۔

''مجھے اپنے فرحان کے لیے وہ سفید کپڑوں والی لڑکی بڑی پسند آئی ہے۔وہ جو دلہن کے پاس بیٹھی ہے!وہی.....'' انہوں نے اپنی پڑوسن کی بیٹی شائستہ کی توجہ اسٹیج پر بیٹھی لڑکی کی طرف مبذول کروانا چاہی تھی مگر وہ میز کے برابر میں بیٹھے فارس وجدان کو بھی متوجہ کر بیٹھی تھیں جس نے موبائل اسکرین پر سے نگاہ اٹھا کر اسی لڑکی کو دیکھا جو دلہن کے پہلو میں بیٹھی تھی۔

''ارے یہ تو جنت ہے!یہ شادی شدہ ہے بوا!'' شائستہ نے کہا۔

''ہیں.....'' ساجدہ بیگم کو ایک دھچکا سا لگا۔''شادی شدہ؟میں سمجھی کالج کی اسٹوڈنٹ ہوگی۔''

''سنا ہے شوہر سے علیحدگی ہو چکی ہے اس کی۔''

ساجدہ بیگم تو دھک سے رہ گئیں۔اتنی مشکلوں سے انہیں کوئی لڑکی پسند آئی تھی۔جو نہ صرف شادی شدہ تھی بلکہ اب طلاق یافتہ بھی ثابت ہو رہی تھی۔

''علیحدگی کیوں ہو گئی؟'' صدمہ کچھ کم ہوا تو انہوں نے کریدا۔

''شوہر نے دوسری شادی جو کر لی تھی۔''

''انٹرسٹنگ۔'' کرسی کی پشت گاہ سے کمر ٹکاتے ہوئے فارس سیدھا ہو بیٹھا۔نگاہیں جنت پر ٹھہری تھیں۔وہ دلہن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر،اس کے کان میں سرگوشی کرنے لگی تھی۔جواباً دلہن نے نہ جانے اس سے کیا کہا تھا کہ اس کی نگاہ بے اختیار فارس کی طرف اٹھ گئی تھی۔شادی ہال کے جس الگ تھلگ کونے میں وہ بیٹھا تھا یہاں سے ہر طرف نگاہ دوڑانا قدرے آسان تھا۔

''اتنی خوب صورت بیوی کے ہوتے ہوئے بھی دوسری شادی کر لی؟'' ساجدہ بیگم کو یقین نہ آیا۔

''عورت ماں نہ بن سکے تو کہاں کی خوب صورتی!''

فارس اپنی جگہ سن بیٹھا رہ گیا۔

''برہان اس کے بڑے تایا کا جو اکلوتا بیٹا ہے، اس سے شادی ہوئی تھی اس کی، بچپن کی منگنی تھی، شادی محبت کی.....'' ان خواتین میں جو کم عمر تھی وہ بہت کچھ جانتی تھی۔'' جب انکشاف ہوا جنت بانجھ ہے تو ماں کے مجبور کرنے پر چچا کی بیٹی سے دوسری

شادی کرلی۔''

جنت اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ چہرے پر خوف، گھبراہٹ، پریشانی کا تاثر لیے وہ اب اسٹیج سے اتر کر اسی طرف آ رہی تھی۔

''تو پھر اسے طلاق کیوں ہوئی؟''

ساجدہ بیگم ہمہ تن گوش تھیں۔

''ارے خالہ اس نے برہان کی دوسری بیوی کا بچہ ضائع کرنے کی کوشش کی تھی۔''

شادی کا ہنگامہ، شور شرابہ......اور فارس کی ساکت نگاہیں جنت کمال کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔

''خدا کی پناہ شکل سے تو ایسی بالکل بھی نہیں لگتی۔'' ساجدہ بیگم ڈر سی گئیں۔

''خالہ اعمال شکلوں پر تھوڑی نظر آتے ہیں۔'' ہما نے لقمہ دیا تھا۔

''بچپن سے ہی یہ آفت قسم کی لڑکی ہے بوا، خدا معاف کرے نہ چھوٹوں کا تمیز نہ بڑوں کا لحاظ...... بہت بدمزاج اور مغرور سی! اس کی وجہ سے ہی تو اس کی امی کا انتقال ہوا تھا۔''

''پھر تو اس کے ساتھ جو ہوا ٹھیک ہوا۔'' جانے کس نے کہا تھا۔

''صرف اتنا ہی نہیں...... پتا نہیں کہاں کہاں افیئرز چلا رکھے تھے اس نے۔ مجھے اس کی نند نے بتایا تھا۔ سارا دن فون پر کالز آتی رہتی تھیں، کئی بار تو اس نے خود جنت کو چھپ چھپ کر فون پر باتیں کرتے دیکھا تھا......''

''میں نے سنا ہے اس کی حرکتوں کی وجہ سے اس کے خاندان والوں نے اس کی دوسری شادی کے بعد اس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔''

ساجدہ بیگم نے سر اٹھا کر ایک بار پھر اسے دیکھا تھا۔

''خالہ اسے دیکھیں......وہ......''

ہما نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے متوجہ کیا۔ وہ سر اٹھائے اس طرف دیکھنے لگیں جس طرف ہما اشارہ کر رہی تھی۔

''وہ برہان ہے...... جنت کا پہلا شوہر!''

بلیک ٹو پیس سوٹ میں ملبوس ایک ہینڈسم سا نوجوان ہنستے مسکراتے ہوئے کسی لڑکی کے ہمراہ اندر داخل ہو رہا تھا۔

☆☆☆

وہ میز پر واپس آئی تو فارس وہاں کہیں نہیں تھا۔ اس نے فکرمندی سے چاروں اور نگاہ دوڑائی پھر تیز تیز قدم اٹھاتی شادی ہال

سے باہر آ گئی۔ سرسبز لان سے بیرونی دروازے کی طرف جاتے ہوئے وہ مسلسل اس کا نمبر ٹرائی کر رہی تھی۔ موبائل بند بھی نہیں تھا۔ کال ریسیو بھی نہیں ہو رہی تھی۔

پارکنگ ایریا میں اسے گاڑی کے پاس کھڑا دیکھ کر اس کی اٹکی ہوئی سانسیں ایک لمحے میں بحال ہوئی تھیں۔

یہ خیال کہ وہ اسے چھوڑ کر نہیں گیا، کتنا تسلی بخش تھا اور یہی خیال جن اندیشوں کو جنم دے رہا تھا وہ کتنے اذیت ناک تھے۔

وہ خود کو کمپوز کر کے اس کے پاس آ گئی تھی۔

جیبوں میں ہاتھ ڈالے، گاڑی سے ٹیک لگائے نیوی بلیو پینٹ کوٹ میں ملبوس وہ اپنی تمام تر وجاہتوں کے ساتھ اسے تاریک رات کا ہی حصہ لگا۔

''جتنے لوگ ہیں، اتنی ہی کہانیاں ہیں، اور ہر کہانی ایک سے بڑھ کر انٹرسٹنگ ہے۔'' وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا......لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں تضحیک۔ جنت کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔

''تو برہان واصف تمہارے تایا کا بیٹا تھا، محبت کی شادی تھی، جو محض پانچ سال تک رہی.. پھر اس نے تمہیں چھوڑ دیا۔''

وہ اپنی جگہ منجمد اسے پلکیں جھپکائے بنا دیکھے گئی۔

''تم نے اس کے بچے کو مارنے کی کوشش کی۔'' فارس کے لہجے میں صدمہ تھا۔ لیکن بے یقینی ہرگز نہیں تھی۔ ''مجھے حیرت ہے اس نے تم پر پولیس کیس نہیں ہونے دیا! بہت محبت کرتا ہوگا۔ ورنہ کون اس قدر سنگین غلطی کو نظرانداز کرتا ہے؟''

اس کی آنکھوں کی نمی یک دم گہری ہوئی تھی۔ لب کپکپائے تھے۔

''تم جیسی لڑکیوں کے لیے بھلا طلاق بھی کوئی سزا ہوتی ہے؟''

جنت کا سانس جیسے حلق میں اٹکا تھا۔ آنکھوں میں وحشت اتری تھی۔ الفاظ گویا سلگتے ہوئے انگارے تھے۔ سماعت میں پڑتے تھے اور وجود کو راکھ کر دیتے تھے۔

''ویسے طلاق کا سبب تمہارا وہی کارنامہ تھا یا پھر کوئی اور وجہ تھی؟'' جیبوں سے ہاتھ نکالتے ہوئے وہ سیدھا ہوا تھا۔ جنت بمشکل ہی اس کے کندھوں تک پہنچتی تھی۔ اور اب تو جیسے قدموں میں ہی تھی۔ راکھ۔ خاک۔ دھول۔ مٹی۔

آگے کو جھک کر وہ محظوظ ہوتی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

مکمل طور بھیگی ہوئی آنکھیں۔ سرخ چہرہ۔ کپکپاتا وجود۔ نچلا لب بیدردی سے رگڑتے ہوئے وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔

''حیرت ہے! آج تمہاری زبان نہیں چل رہی۔'' اسے تعجب ہوا تھا۔ نہ وضاحت۔ نہ صفائی۔ نہ معافی کی طلب۔ نہ پچھتاوے کا احساس۔

''سنا ہے کافی افیئرز تھے تمہارے! سنا ہے رانگ کالز آتی تھیں! سنا ہے......''

اس نے سر گرا دیا۔ جھکا دیا۔ ہار مان لی۔ مگر وہ ''فارس'' تھا۔ حملے سے باز پھر بھی نہ آیا۔

''جو کچھ سن چکا ہوں وہ سب ممی کو بتاؤں گا تو وہ کیا سوچیں گی؟ ایک ایسی لڑکی کو بہو بنا بیٹھی ہیں جو **infertile** ہے۔ جس نے اپنی سوتن کے بچے کی جان لینے کی کوشش کی ہے۔ جس کے خاندان کے لوگ اسے اچھوت کی طرح ٹریٹ کرتے ہیں۔ اور جو اپنی ماں کی موت کا سبب بنی ہے۔''

سانس روکے، لب بھینچے اس نے سر اٹھا کر فارس کو دیکھا، وہ بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا. سرد پتھریلی نگاہوں سے...... کچھ نفرت۔ کچھ حقارت سے۔ کچھ بے رحمی۔ کچھ بیزاریت سے۔

''جس کے اپنے پیروں تلے زمین نہیں تھی، وہ میرے سر سے آسمان کھینچنے چلی تھی۔''

جنت کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

''اعمال اگر شکلوں پر ثبت ہوتے تو خوب صورت چہرے کتنے بھیانک لگتے۔'' فارس نے چابی نکال کر بٹن دبایا۔ گاڑی کا لاک کھل گیا۔

ہاں بھیانک لگتے۔ بہت بھیانک لگتے۔

''میں کل شام کی فلائٹ سے لندن جا رہا ہوں، ممی کو فون پر کہہ دینا تم یہاں اپنی مرضی سے رک گئی ہو، جب تک میں واپس نہیں آؤں گا تم اپنی خالہ کے پاس ہی رہو گی! اور ہاں۔'' اس نے رک کر تنبیہی نگاہوں سے جنت کو دیکھا پھر انگلی اٹھا کر زہر خند لہجے میں دھمکی دی۔ ''اب اگر تم نے من مانی کی تو مجھ سے برا واقعی میں کوئی نہیں ہوگا۔''

گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ وہاں سے جا چکا تھا۔

اور جنت بنت کمال اپنی جگہ ساکت و صامت کھڑی رہ گئی تھی۔

وہ ناقص تھی...... مکمل ہونا چاہتی تھی......

اور جنہیں تقدیر ناقص کر دے...... وہ مکمل کیسے ہوں؟

''کسی روز تمہیں تمہاری یہ خوش فہمیاں لے ڈوبیں گی۔'' وہ اب پھولے تنفس کے ساتھ اندھیرے میں دیکھ رہی تھی۔

''میں بہت اچھی تیراک ہوں فارس۔'' اسے لگا زمین اب قدموں تلے نہ رہی ہو۔

''بہترین تیراک بھی شارک کی خوراک بن جایا کرتے ہیں۔''

''شاید اس لیے کہ وہ بروقت ساحل پر نہیں پہنچ پاتے۔'' وہ لڑکھڑائی۔

''تم پہنچ جاؤ گی ساحل پر؟''

''ساحل پر ہی تو کھڑی ہوں میں۔''

اور یہ تھا اس کا ساحل' اس کا کنارہ!!

وہ اپنے اس کنارے سے۔ خوش گمانی کے اس ساحل سے دبے قدم پیچھے ہٹی۔

ایسے کنارے سے سمندر بھلا!

ایسی سطح سے اعماق (گہرائیاں) بہتر!

☆☆

دل میں ہے وفا کی طلب، لب پہ سوال بھی نہیں
ہم ہیں حصار درد میں، اس کو خیال ہی نہیں۔
اتنا ہے اس سے رابطہ، چھاؤں سے جتنا دھوپ کا
گر یہ نہیں ہے ہجر تو پھر یہ وصال بھی نہیں
وہ جو انا پرست ہے، میں بھی وفا پرست ہوں
اس کی بھی مثال نہیں، میری مثال بھی نہیں
تم کو زبان دے چکے، دل کا جہان دے چکے
عہد وفا کو توڑ دیں، اپنی مجال بھی نہیں

ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے اس نے اوپن کچن کے سامنے رک کر راہداری میں نگاہ دوڑائی تھی۔ ملگجی سی روشنی تھی جو پورے گھر میں پھیلی تھی۔ عجیب سا سناٹا تھا جو ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ وہ پندرہ دن بعد لندن سے لوٹا تھا اور گھر پر چھائی ہوئی یہ ویرانی اسے عجیب سی کیفیت سے دوچار کر گئی تھی۔

مسز شیرازی کے بیڈروم کا دروازہ بند تھا۔ وہ یقیناً اب تک سو چکی ہوں گی۔ وہ ان کے آرام میں مخل نہیں ہونا چاہتا تھا ورنہ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ بیرون ملک دورے سے واپس آیا ہو اور فی الفور ان سے نہ ملا ہو۔

وہ سیڑھیوں کا رخ کرنے ہی لگا تھا جب نگاہ راہداری کے اختتام پر اسٹوڈیو کے ادھ کھلے دروازے پر پڑ گئی۔ دروازے کی درز سے جھانکتی زرکار روشنی ٹائلز پر بکھری ہوئی تھی۔ آہستہ سے قدم اٹھاتے ہوئے وہ اسٹوڈیو روم میں آ گیا۔۔

تمام بتیاں روشن تھیں۔ دیوار گیر کھڑکیوں کے پردے ڈوریوں میں بندھے ہوئے تھے۔ باہر کا اندھیرا کھڑکیوں سے اندر

جھانک رہا تھا۔ رم جھم بارش کی مدھم سی آواز۔ سرسرا کر گزرتی ٹھنڈی نم ہواؤں کا شور۔ اس نے ایک طائرانہ نگاہ ہال میں دوڑائی پھر آگے بڑھتے ہوئے مشرقی دیوار کے پاس رکھے کارٹن پر جھک گیا۔

مرجھائے ہوئے پھول۔ گیٹ ویل سون کا ڈرائنگ پیپر۔ رزلٹ کارڈز۔ ٹرافیز۔ کھلونے۔ تصاویر کے البم۔ ایک ایک چیز کا سرسری سے انداز میں جائزہ لیتے ہوئے اس کے ہاتھ میں اپنا پرانا والٹ آ گیا۔ والٹ خالی تھا۔ اس میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جو اسے متوجہ کرتی ماسوائے اس کی چین کے جس کے دوسرے سرے پر شاندار سی تلوار لٹک رہی تھی۔ تلوار کے بلیڈ کے وسط میں ایک میگنیٹک چپ تھی جس پر انگلی پھیرتے ہوئے اسے یاد آیا تھا کہ اس کے ساتھ جڑی ہوئی ایک اور تلوار بھی تھی۔

''تم آ گئے بیٹا۔'' مسز شیرازی کی آواز پر اس نے چونک کر عقب میں دیکھا تھا۔

وہیل چیئر پر براجمان۔ سیاہ شال میں اپنا آپ چھپائے وہ منسلک کمرے سے اندر آ گئی تھیں۔

''میں سمجھا، آپ سو رہی ہوں گی۔'' کی چین ہاتھ میں لیے وہ اٹھ کر ان کے پاس آ گیا۔ جھک کر ان کی پیشانی کا بوسہ لیا پھر ہاتھ پکڑ کر ہی ان کے پاس سائڈ ٹیبل پر بیٹھ گیا تھا۔

''طارق کے اکاؤنٹ میں اماؤنٹ ٹرانسفر کر دیا ہے میں نے۔'' وہ جانتا تھا مسز شیرازی اب اس سے کیا پوچھنے والی تھیں۔ مگر سوال سے پہلے ہی وہ انہیں جواب دے چکا تھا۔

مسز شیرازی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ایک کرب سا ان کی آنکھوں میں ٹھہر گیا۔

ہر مہینے کی یکم تاریخ کو وہ کچھ اور ہی سننے کی متمنی رہتیں اور ہر بار فارس وجدان کا یہ جملہ انہیں اذیت میں مبتلا کر دیتا۔ ہر ماہ رقم ٹرانسفر کرنے والا محبت ٹرانسفر نہیں کرتا تھا۔

''تمہیں لگتا ہے، اس ننھے سے یتیم بچے کو تمھارے پیسوں کی ضرورت ہے؟'' محتاط انداز میں انہوں نے کچھ اذیت سے پوچھا تھا۔

کی چین کی تلوار فارس کی انگلیوں میں متحرک تھی۔ سر جھکا ہوا تھا۔ چہرہ ہنوز تاثرات سے عاری۔

''اسے تمھاری ضرورت ہے فارس۔'' انہوں نے جیسے اسے آگاہی دی تھی۔ ایک بار پھر احساس دلانے کی سعی کی تھی۔

وہ خاموش رہا تھا۔ مشتعل نہیں ہوا تھا۔

''اسے سزا مت دو۔ اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔''

''میں کسی کو سزا نہیں دے رہا ہوں۔'' بہت آہستگی سے اس نے کہا۔ ''میں صرف جینے کی کوشش کر رہا ہوں ممی!''

مسز شیرازی نے اس کی آنکھوں میں آگ دیکھی۔ درد دیکھا۔ اذیت دیکھی۔ اور پھر جیسے ان کی ہر ہمت دم توڑ گئی۔ یہ ظلم

ہے۔ انہیں احساس ہوا۔ وہ اس کے ساتھ زیادتی کر رہی ہیں۔۔ ان کا دل بیٹھا۔

شال کے پلو سے اپنے آنسو پونچھے پھر مدھم سی مسکراہٹ لبوں پر بکھیرتے ہوئے انہوں موضوع ہی بدل دیا۔

''ٹور کیسا رہا تمھارا؟ سفر میں کوئی مشکل تو نہیں ہوئی؟! اور جنت کو کب لاؤ گے فارس؟ اس کے بغیر تو اس گھر میں خاموشی سی در آئی ہے۔''

اس نے مسز شیرازی کے تینوں سوال ٹھیک ٹھاک سنے مگر جواب صرف ایک کا دیا۔

''سفر ٹھیک رہا۔ بہت بھوک لگ رہی ہے ممی۔ میں کچھ کھانا چاہتا ہوں۔'' وہ جانے کے لیے اٹھا تھا۔

''مجھے پہلے ہی شک تھا۔'' ان کی آنکھوں میں اب بھی نمی ٹھہری تھی مگر لہجے میں خوشگواریت لوٹ آئی تھی جیسے کچھ دیر پہلے تک ان کے مابین ایسی کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو جس نے انہیں ہزار ہا ٹکڑوں میں منقسم کر دیا ہو۔

''کیسا شک۔'' دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے رک کر پوچھا تھا۔

''یہی کہ تم دونوں کی لڑائی ہوئی ہے۔'' مسز شیرازی نے اطمینان سے آگاہ کیا۔ ''تم اسے لاہور چھوڑ آئے صرف اس لیے کہ وہ تمھارے ساتھ لندن نہ جا سکے۔'' انہوں نے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کریدا۔

''ایسا تو نہیں ہوا تھا۔'' وہ سٹپٹا گیا۔ ''وہ تو اپنی مرضی سے۔''

''اسے شادی اٹینڈ کرنے سے زیادہ تمھارے ساتھ لندن جانے کا شوق تھا۔ ایک دو گھنٹوں میں اس نے میرے ساتھ بیٹھ کر جانے کتنے پروگرام ترتیب دے ڈالے تھے۔ میں مان ہی نہیں سکتی وہ اپنی مرضی سے رک گئی ہو گی۔'' ان کا انداز قطعیت بھرا تھا۔

متحرک وہیل چیئر کے برابر قدم اٹھاتے ہوئے فارس لب بھینچ کر رہ گیا۔

''سچ سچ بتاؤ، لڑائی ہوئی ہے تم دونوں کی؟'' مسز شیرازی اس کے پیچھے کچن میں آ گئی تھیں۔

سنی ان سنی کیے وہ فریزر کھول کر کھانے کے لیے کچھ دیکھنے لگا۔

''میں کچھ پوچھ رہی ہوں فارس!''

''یہ سوال آپ نے اپنی لاڈلی سے پوچھ لیا ہوتا۔'' وہ جیسے جل کر بولا تھا۔ مسز شیرازی نے لبوں پر ابھرتی مسکراہٹ کو بمشکل روکا۔

''اس سے بھی پوچھا تھا۔ کہنے لگی اپنی مرضی سے رک گئی ہوں۔ لیکن اصل مسئلہ تو وہیں کا وہیں ہے۔ جب اس نے تمھارے ساتھ لندن جانا تھا تو پھر شادی اٹینڈ کر کے وہ واپس کیوں نہیں آئی؟''

''اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' مائکروویو اون میں پیزا گرم کرتے ہوئے وہ الجھ کر بولا۔

''س کا مطلب ہے تم دونوں کی لڑائی ہوئی ہے۔'' انہوں نے کچھ سوچ کر کہا۔

''لڑائی؟'' ٹائمر کی آواز کچن میں گونجی تھی۔ ''کیسی لڑائی؟'' فارس کی بھنویں سکڑ گئیں۔ جبڑے بھنچ گئے۔ ''جنت بنت کمال اب بھی باز نہ آئی اپنی حرکتوں سے؟'' اس کا پارہ چڑھا۔

''ہزبینڈ وائف میں کیا لڑائی بھی نہیں ہوسکتی؟''

''ہماری نہیں ہوتی۔'' (اگر جنت سن لیتی تو غش کھا کر گر جاتی)

مسز شیرازی نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

''اب آپ کیا چاہتی ہیں؟'' وہ زچ ہوا تھا۔

''کچھ نہیں۔ تم پیزا کھاؤ۔'' مسز شیرازی نے مسکراہٹ دبائی۔

وہ ان کا حصہ نکالنے لگا تو انہوں نے منع کر دیا۔

میز پر کہنی ٹکائے۔ بند مٹھی پر ٹھوڑی جمائے۔ وہ اسے بہت غور سے اور محبت سے دیکھنے لگیں۔ وہ کچھ تذبذب کا شکار ہوا تھا۔ کہ کھلی کتاب تو نہ تھا وہ مگر مسز شیرازی اسے پڑھ ہی لیا کرتی تھیں۔

''جنت ٹھیک ہی کہتی ہے۔'' چند لمحوں کے بعد انہوں نے کہا۔

اس نے چھری سے پیس کاٹ کر منہ میں ڈالتے ہوئے انہیں دیکھا۔ آنکھوں میں سوال تھا۔ ''یعنی کیا؟ کیا کہتی ہے جنت؟''

''یہی کہ جب تم کنفیوژن کا شکار ہوتے ہو تو زیادہ دلچسپ لگتے ہو۔''

نوالہ فارس کے حلق میں اٹک گیا۔ وہ بے اختیار کھانسنے لگا۔

مسز شیرازی نے فوراً گلاس میں پانی انڈیل کر اسے دیا۔

اس نے چند ایک گھونٹ بھرے۔ تنفس بحال کیا۔ پھر سر اٹھا کر مسز شیرازی کو دیکھا۔

وہ مسکرا رہی تھیں۔ اور ان کی مسکراہٹ زندگی سے بھرپور تھی۔

☆☆☆

لاہور کی صبح بارش کا لبادہ اوڑھ کر اتری تھی۔ آسمان کی اجلی نیلی رنگت پر کچھ دیر پہلے تک سمٹ جانے والے بادل ایک بار پھر پھیل رہے تھے۔

کچھ ایسی ہی گومگو سی کیفیت اس کی بھی ہوئی تھی جب سائرہ خالہ نے اسے جنت کی غیر موجودگی کے بارے میں آگاہ کیا تھا ''یہاں نہیں ہے؟'' نہ لہجے میں فکر تھی۔ نہ گھبراہٹ۔ بس ایک الجھن کہ اب اسے انتظار میں رکنا پڑے گا جب کہ وہ جلد

از جلد واپس اسلام آباد جانا چاہتا تھا۔

''کب تک آئے گی؟''

''جنت نے تمہیں نہیں بتایا؟'' خالہ کچھ متفکر نظر آئیں۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''وہ اپنی آپا کے گھر ہے۔''

''آپ مجھے ایڈریس بتا دیں، میں اسے وہیں سے پک کر لیتا ہوں۔'' موبائل نکالتے ہوئے اس نے بے حد فارمل لہجے میں کہا تھا۔

سائرہ خالہ نے کچھ حیرت اور الجھن سے اسے دیکھا تھا۔ کیا ان پندرہ دنوں میں اس کی ایک بار بھی جنت سے بات نہیں ہوئی ہے؟ یا پھر جنت نے ہی اسے لاعلم رکھا ہے؟

کچھ ہی دیر میں وہ آپا کا ایڈریس لے کر گھر سے نکل گیا تھا۔ لاہور کی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے ہوئے اس نے ایک بار پھر جنت کا نمبر ٹرائی کیا تھا۔ اس کا موبائل آف جا رہا تھا۔

آسمان پر رم جھم برستی بارش نے یک دم ہی شدت اختیار کر لی۔ اس نے وائپر متحرک کر دیے۔

پندرہ بیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ مطلوبہ ایڈریس پر پہنچ چکا تھا۔

ذیلی سڑک سے گاڑی اندر وہ لے تو گیا تھا مگر تنگ گلیوں کی بنا پر اب مزید جانا ممکن نہ تھا۔ چنار کے درخت تلے گاڑی روک کر اس نے سامنے دیکھا۔ سائرہ خالہ نے تیسری گلی میں سیاہ گیٹ کی نشاندہی کی تھی۔ دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے اس نے رین کوٹ کا ہڈ اپنے سر پر چڑھا لیا۔

بادل یک دم شدت سے گرجے تھے۔ آواز ایسی تھی جیسے آسمان ٹوٹ پڑا ہو۔ موسلا دھار بارش میں دائیں موڑ مڑتے ہی وہ گلی میں سیاہ رنگ کے تیسرے گیٹ کے سامنے رک گیا تھا۔ آم کے گھنے درخت کی شاخیں صحن سے باہر گیٹ کے اوپر باہر کی طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ بارش کا پانی پتوں سے رس رس کر نیچے گر رہا تھا۔ اس نے دروازہ بجاتے ہوئے اپنے سیاہ جوتوں کو دیکھا جو کیچڑ سے لت پت ہو چکے تھے۔

تقریباً پانچ منٹ تک تو وہ گیٹ ہی دھڑ دھڑاتا رہا۔ تب کہیں جا کر گیٹ کھلا تھا۔

سادہ سی سفید شلوار قمیص میں ملبوس۔ سیاہ شال اپنے گرد اچھی طرح سے اوڑھے، سر پر چھاتا تانے جنت کمال سامنے کھڑی تھی۔ کچھ ساکت اور متحیر سی۔

رنگت زرد۔ ہونٹ بے رنگ اور خشک۔ آنکھیں سرخ و متورم تھیں۔ داہنے گال کے اوپر۔ آنکھ کے بائیں طرف نیل کا گہرا

نشان۔ کچھ سوجن بھی تھی شاید۔

فارس کی آنکھوں کی سرد مہری یک دم بڑھی۔ چہرے کے تاثرات سرد ہو گئے۔ اپنی یہ حالت بنا کر وہ دنیا کے سامنے کیا ثابت کرنا چاہ رہی تھی؟ یہی کہ اس پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں؟ یہ ڈرامے باز لڑکی اسے زہر لگی تھی اس لمحے۔

جنت کمال کچھ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ پیشانی پر بکھر کر گال پر پھسلتی لٹوں کو آج وہ سمیٹ کر پیچھے نہیں ہٹا رہی تھی۔ رت جگے کی گواہی دیتی آنکھیں بے طرح سے سرخ ضرور تھیں مگر نم نہیں۔ چہرے پر کسی قسم کا تاثر نہیں تھا۔ مگر آنکھوں میں ایک بے نام سی خفگی لہرا رہی تھی، غصہ بھی تھا شاید۔

''لینے آئے ہو؟'' اس نے یوں پوچھا جیسے وہ کسی اور وجہ سے بھی آ سکتا ہو۔ لہجہ بے تاثر مگر آواز کچھ بوجھل سی تھی۔

''مجبوری ہے۔'' دانت پیس کر انتہائی برودت سے جواب دیتے ہوئے فارس نے غصیلی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

اور اسے لگ رہا تھا شاید مجبوری ختم ہو چکی ہے، اب وہ اسے ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنے آیا ہے۔

''وقت نہیں ہے میرے پاس! دو منٹ میں پہنچو۔'' اکھڑ لہجے میں حکم دے کر وہ جانے کے لیے مڑ گیا تھا۔ بڑبڑاہٹ جاری تھی۔ جھنجلاہٹ میں قدم اٹھاتا وہ شدید غصے میں لگ رہا تھا۔

گاڑی کے قریب پہنچ کر اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا تو جنت چھتری کے سائے میں احتیاط سے قدم اٹھاتی نظر آئی۔ بیگ کندھے سے لٹک رہا تھا۔ سر جھکا ہوا تھا، اور شانوں پر بکھرے سیدھے گرتے لمبے بال چہرے کو دونوں اطراف سے گھیرے ہوئے تھے۔ کیچر اب بھی ہاتھ میں ہی تھا جیسے وہ عجلت میں اپنا سب کچھ سمیٹ کر فوراً ہی باہر آ گئی ہو۔

وہ قریب پہنچی تو فارس نے درشتی سے جنت کا بازو پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف موڑا۔ تکلیف دہ تاثر چھپاتے ہوئے جنت نے بازو چھڑانے کی کوشش کی تھی مگر اس سے تکلیف میں اور اضافہ ہی ہوا تھا۔

''اپنی یہ حالت بنا کر۔ آخر کیا ثابت کرنا چاہتی ہو تم؟ تم پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہا ہوں میں؟ جی جان لگا کر ان پندرہ دنوں میں اپنی یہ حالت بنائی ہے تاکہ ممی کے سامنے میرا تماشا بنا سکو؟ اب اس حالت میں تمہیں لے کر جاؤں میں؟ اس حالت میں؟'' وہ دبی آواز میں دھاڑا تھا۔

وہ دم سادھے کچھ صدمے سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر رہ گئی۔ بازو کی تکلیف جیسے ایک لمحے میں غائب ہوئی تھی۔

''چاہتی کیا ہو تم؟'' وہ دبی آواز میں غرایا۔ قہر برساتی آنکھوں میں جیسے خون اترا ہوا تھا۔

جنت کے لب بھنچ گئے۔ آنکھوں میں سرخی پھیلی۔ مگر اس نے جواباً کچھ نہ کہا۔

''پتا نہیں کس گناہ کی پاداش میں تم میرے گلے پڑ گئی ہو۔'' جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑتے ہوئے اس نے اپنی سائیڈ کا دروازہ

کھولا تھا۔

بڑبڑاتے ہوئے کچھ جھنجلا کے عالم میں اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تھی۔ یکا یک ہی اسے اپنی انگلیوں پر چپچپاہٹ کا احساس ہوا تھا۔ یونہی داہنا ہاتھ سامنے کیا تو وہ خون سے سرخ لگا۔ وہ اپنی جگہ ٹھٹک کر رک گیا۔

دروازہ کھول کر جنت برابر میں بیٹھی تو اس نے بے ساختہ گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

چھتری ٹانگوں میں رکھنے کے بعد اب وہ اپنے بالوں کو سمیٹ کر کیچر میں جکڑ رہی تھی۔ بہت احتیاط اور آہستہ سے۔

ایک لمحے کے لیے فارس کی سوچ اور خیال منتشر ہوئے تھے۔ ایک کھٹکے کے لیے کسی بے معنی سے اندیشے نے سر اٹھایا تھا۔

جب وہ اپنے بالوں کو سمیٹ چکی تو اسے لگا شاید وہ اب فرصت سے۔ ہمیشہ کی طرح کوئی وضاحتی جواب دے گی۔ کوئی انوکھا بیان دے گی مگر وہ چپ تھی۔ گویا منہ میں زبان ہی نہ ہو۔ کھڑکی کی طرف منہ موڑے اس نے اپنی صورت بھی گم کر لی تھی۔

فارس کی نگاہ ایک لمحے کے لیے اس کے داہنے بازو کے اس مقام پر رکی تھی جسے اس نے انتہائی سختی سے پکڑا تھا۔ پھر اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔

سفر خاموشی سے کٹنے لگا تھا۔

ونڈ اسکرین پر متحرک وائپرز۔ کہر میں لپٹا روڈ۔ بارش کی آواز۔ شدید سردی۔ اور شال میں اپنا آپ چھپائے۔ کھڑکی کی طرف رخ کیے۔ آنکھیں موندے وہ بیٹھی تھی۔ ذرا دیر کے لیے ہی اس پر غنودگی چھائی تھی۔ پھر اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ بخار کی حدت سے تپتا وجود سردی کی شدت سے کپکپا رہا تھا۔ چہرے کا رخ اب بھی کھڑکی کی طرف تھا۔ وہ بھولے سے بھی نہ رخ بدل رہی تھی۔ اور نہ ہی اسے دیکھنے کی غلطی کر رہی تھی۔ وہ بھی خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ حیرت انگیز طور پر اس نے دوبارہ کوئی بات نہیں کی تھی۔ نہ غصہ دکھایا تھا۔ نہ جھڑکیاں پلائی تھیں۔ نہ ہی ان گناہوں کا حوالہ دیا تھا جن کی پاداش میں وہ اس کے گلے پڑ گئی تھی۔ خشک لبوں کو تر کرتے ہوئے اس نے گہرا سانس لیا۔

فارس نے گاڑی پیٹرول پمپ کے سامنے سڑک کے عین کنارے پر روک دی تھی۔ آگے پیٹرول دلواتی گاڑیوں کا رش تھا۔

وہ رین کوٹ کا ہڈ سر پر چڑھائے گاڑی سے نکل گیا۔ جنت سامنے دیکھنے لگی۔ دھند میں ملفوف درخت بس چند قدموں کے فاصلے تک ہی واضح تھے۔

اس نے پانی کے چند مزید گھونٹ بھرے۔ پھر داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے کنپٹی دبانے لگی۔

☆☆☆

وہ کھانا آرڈر پر پیک کروا کر پلٹ ہی رہا تھا جب اس نے آواز سنی تھی۔ مسلسل بجتا ہارن۔ ٹائر کی چرچراہٹ۔ اور پھر تصادم۔

اس نے پیٹرول پمپ پر موجود لوگوں کو دائیں سمت بھاگتے دیکھا۔ بارش کچھ زیادہ ہی تیز ہو گئی تھی۔ ہر منظر دھندلا تھا۔ مبہم تھا۔ غیر واضح۔

''ایکسیڈنٹ ہو گیا۔'' کوئی کہہ رہا تھا۔ بارش کے شور میں اب لوگوں کی تیز آوازیں بھی شامل ہو گئی تھیں۔

کسی احساس۔ کسی اندیشے۔ کسی خیال کے تحت اس نے عجلت میں قدم اٹھاتے ہوئے وہاں دیکھا جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔

اگلے ہی لمحے۔ اس کا دل رکا۔ سانسیں تھم گئیں۔ پارسل ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ شاید زمین چکرائی تھی۔ یا پھر آسمان سر پر گرا تھا۔ وہ کوئی عام تصادم تو نہ تھا۔

بے قابو ہوتی گاڑی اس کی گاڑی سے ہی آ کر ٹکرائی تھی جس کی وجہ سے اس کی گاڑی گھومتی ہوئی بلندی سے نیچے جا گری تھی۔

''جنت!'' اس کا سانس رکا۔

بے اختیار ہو کر وہ اسی طرف بڑھا جس طرف لوگوں کا ہجوم تھا۔ کنارے پر اس کے پہنچنے سے بھی پہلے گاڑی ایک زوردار دھماکے سے آگ کی لپیٹ میں آ ئی تھی۔

وہ پتھر ہوا تو چند لمحوں تک پتھر ہی رہا۔ ساکت۔ صامت۔ جامد۔

صدمے سے قوت ملی۔ قدم بے ساختہ ہی اس طرف اٹھے۔ بیچ راستے میں ہی کچھ لوگوں نے آگے بڑھنے سے روک لیا۔

حواس شل ہو رہے تھے۔ وہ گہرے صدمے میں تھا۔ اپنا آپ چھڑاتے ہوئے آگے بڑھنا چاہ رہا تھا۔ مگر لوگ اسے آگے بڑھنے نہیں دے رہے تھے۔

''فارس!''

آن کی آن میں یہ کیا ہوا تھا؟ کیوں ہوا تھا؟ اس نے یہ تو نہیں سوچا تھا۔ اس نے یہ تو نہیں چاہا تھا۔

''فارس!'' اب کے آواز بلند تھی۔ کپکپاتی ہوئی اور درشت تھی۔ جیسے کسی نے پوری جان لگا کر اسے پکارا ہو۔

بے جان ہوتی ٹانگوں کے ساتھ اس نے ایک جھٹکے سے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

سر پر چھاتا تانے۔ سردی کی شدت سے کپکپاتی۔ کچھ کمزور اور نڈھال سی جنت آنکھوں میں الجھن لیے اس کے سامنے ہی کھڑی تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر۔

صدمے سے فارس کی نگاہ ڈگمگائی۔ وہ تھم گیا۔ رک گیا۔ ٹھہر گیا۔ لمحے بھر کے لیے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ آ بھی کیسے سکتا تھا؟ وہ مجسم حقیقت بنی اس کے سامنے کیسے کھڑی تھی؟ وہ تو گاڑی میں۔

آنکھوں میں بے یقینی اور الجھن لیے، اپنے آپ کو لوگوں کی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے وہ اس کی جانب بڑھا۔

جنت ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھنے لگی۔۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ سردی اذیت بڑھا رہی تھی۔ مگر فارس کی آنکھیں۔ اس کے تاثرات۔ اس کا خوف اور گھبراہٹ اس پر روشن دن کی طرح عیاں تھا۔

''میرے سر میں درد تھا تو میں۔ ٹیبلٹ لینے کے لیے۔'' اس نے خواہ مخواہ وضاحت دی۔

آسمان پر بجلی چمکی۔ پھر گھن گرج کی آواز ہر سمت گونجی۔

وہ اس پر نگاہ جمائے اپنی جگہ کھڑا رہا۔

اب کے جنت نے اس کے عقب میں دیکھا۔ شاید وہ ایکسیڈنٹ کی نوعیت اور نقصان کے بارے میں جاننا چاہ رہی تھی۔

اگلے ہی پل اس کا حلق خشک ہوا تھا۔ زمین نے قدم جکڑ لیے تھے۔ نگاہیں شعلوں پر جم کر رہ گئیں۔

سیاہ پراڈو جوان کی گاڑی سے ٹکرائی تھی۔ اس گاڑی میں ایک ہی نوجوان تھا۔ زخمی تھا اور اسے گاڑی میں ڈالے چند مقامی لوگ اسی وقت ہاسپٹل کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ لیکن ان کی گاڑی جو بلندی سے گری تھی۔ اس میں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ مگر پھر بھی دونوں کی حالت ایسی تھی جیسے ان کا نقصان ہو گیا ہو۔ جیسے وہ شعلوں کی لپیٹ میں گاڑی کے اندر ہی رہ گئے ہوں۔

اس نے پھر فارس کو دیکھا۔ وہ کمزور اعصاب کا شخص نہیں تھا۔ اور ایسا بھی نہیں کہ گاڑی کا نقصان اسے پریشانی میں مبتلا کر دے۔ تو پھر وہ اتنا متفکر کیوں لگ رہا تھا؟ اتنا بے چین اور بے قرار کیوں دکھ رہا تھا؟ اس کی آنکھوں کی سرخی۔ درد کی عکاسی کیوں کر رہی تھی؟ چہرے کے تاثرات مخمصے میں کیوں ڈال رہے تھے؟

کیا اس لیے کہ وہ بچ گئی تھی؟ کیا اس لیے کہ اس کے غیر ضروری وجود سے جان چھڑانے کا ایک موقع ہاتھ سے نکل گیا تھا؟ اسے صدمہ ہوا۔

ہاں شاید۔ یہی وجہ ہے! یقیناً یہی وجہ ہے۔

لب بھینچ کر وہ سخت تاثرات کے ساتھ اسی وقت جانے کے لیے مڑ گئی تھی۔ سامنے ہی اسٹور کے شیڈ تلے رکتے ہوئے اس نے غصے سے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ فارس وجدان کو دیکھا جو اس کے برابر میں آن کھڑا ہوا تھا۔

اس کے تاثرات اب بھی نارمل نہیں تھے۔

''اندر آ جاؤ صاب!'' تیرہ چودہ برس کا لڑکا اسٹور کے کاؤنٹر سے چلایا تھا۔

ایک لمحے کا توقف کیے بغیر جنت فوراً ہی سیڑھی چڑھ کر اندر چلی گئی۔ کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے اس نے سرنظروں سے فارس کو دیکھا۔ برساتی کا ہڈ اتارتے ہوئے اس نے گردن تک چڑھی ہوئی زپ کھینچ کر سینے پر ٹھہرا لی تھی۔ ایک ہاتھ مسلسل حرکت میں تھا

جیسے اسے گھٹن ہو رہی ہو اور وہ شرٹ کے اوپری بٹن کھول لینا چاہتا ہو۔ سختی سے دانت پر دانت جمائے جنت نے چہرے کا رخ پھیر لیا۔

موت!

بدعا!

بدنصیبی!

سزا!

تنبیہہ!

یا......

اس نے آنکھیں موند لیں۔ وہ اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر یہ آسان نہیں تھا۔ ہرگز آسان نہیں تھا۔

اگر وہ گاڑی میں ہوتی تو اس وقت...... اس کا دم گھٹا۔ اسے لگا اگر اس نے فی الوقت خود کو نہ سنبھالا تو اسے کچھ ہو جائے گا۔

پندرہ دن پہلے بھی اس پر ایسی ہی کیفیت طاری ہوئی تھی۔ لیکن تب اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ اب سنبھالنا کچھ مشکل لگ رہا تھا۔

''پانی دینا۔'' لڑکا بھاگ کر منرل واٹر کی بوتل نکال لیا۔ چند گھونٹ بھر کر اس نے بسکٹ بھی اٹھا لیے تھے۔ جوس بھی لے لیا۔

اپنے ایسوسی ایٹ عدیل احمد سے فون پر بات کرتے فارس کی نظر یکایک اس پر پڑی اور وہ رک گیا۔ کیا کہہ رہا تھا یہ بھی بھول گیا۔

جوس کے ساتھ بسکٹ کھاتے ہوئے وہ چیزیں اٹھا اٹھا کر دیکھ رہی تھی۔ ان کی قیمت پوچھ رہی تھی۔ اپنی رائے عامہ سے بھی آگاہی دے رہی تھی۔ تیرہ چودہ سال کا پٹھان لڑکا بڑھ چڑھ کر اس کی خدمت داریوں میں لگا ہوا تھا۔

فارس کی رگیں تن گئیں۔ جبڑے بھنچ گئے۔ ''کیا اس بے حس لڑکی کو ذرا سا بھی احساس ہے کہ موت اسے قریب سے سلام دعا کر کے گئی ہے؟''

''باجی اور کچھ چاہیے آپ کو؟'' پٹھان لڑکا بہت خوش تھا۔ مستعدی سے اپنا ہر کام سرانجام دے رہا تھا۔

''ہاں ذرا وہ لیز کی چپس بھی لے آو۔ اور یہ چلی ملی یہ نئی آئی ہیں کیا؟ پہلے تو کبھی نہیں دیکھیں۔ اور اس کا فلیور کیسا ہے؟'' اب وہ کچھ اور اٹھا کر پوچھ رہی تھی۔

''یہ بچہ لوگ کھاتا ہے باجی۔ ام کوئی مالوم (معلوم)۔''

''اور یہ کتنے کا ہے۔''

''دس روپے باجی!''

''دس روپے؟ پانچ کی دو گے تو لوں گی۔''

''سر آپ کچھ کہہ رہے تھے۔'' عدیل احمد کی آواز پر وہ سر جھٹک کر فون کی طرف متوجہ ہوا۔

''باجی ابھی تم بولا تمھارا سر میں درد ہے۔ ہمارا اماں بولتا ہے سر درد ہو تو کھٹی چیز نئی کھانی چاہیے۔''

عدیل احمد کو ضروری ہدایات دے کر وہ مڑا تو زرد رنگت اور سرخ پڑتی آنکھوں کے ساتھ جنت کمال تیسرا چپس کا پیکٹ کھول رہی تھی۔

''یہ تمھارا اسٹور ہے خان؟''

''نئی باجی، یہ گل خان کا اسٹورا ے۔ ام پکوڑے بیچتا اے۔'' پکوڑے بیچنے سے ہی اسے کچھ یاد آیا تو فٹ سے بولا۔

''آج تم بھی بچ گیا۔ ام بھی بچ گیا۔''

جنت نے کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا تھا۔

''وہ جہاں تمھارا گاڑی کھڑا تھا نا۔ ام ادھر روز پکوڑے بیچتا اے۔ لیکن آج بارش تھا اس لیے آج ہم نئی بیچا۔ اگر بارش نہ ہوتا تو ام ادھر کھڑا ہوتا۔ اور پھر ہمارا اماں رو رہا ہوتا۔''

سانس روک کے جنت اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''شکر ہے، تمھارا گاڑی بھی خالی تھا۔ شکر اے۔ ام بھی وہاں نہیں تھا۔'' اس نے سر ہلا کر خوشی کا اظہار کیا تھا۔

''تمہیں لگتا ہے، اللہ نے ہمیں بچایا ہے؟'' بہت محتاط ہو کر، اور خاصی سوچ و بچار کے بعد اس نے بظاہر پست آواز میں پوچھا تھا۔ مگر آواز اتنی بھی پست نہ تھی کہ فارس وجدان کی سماعتوں سے نہ ٹکراتی۔

''ہاں۔ اللہ کا بوت بوت شکر باجی!''

''ایسا بھی تو ممکن ہے کہ یہ ایک وارننگ ہو۔ میرے لیے۔ تمھارے لیے۔ یا شاید کسی اور کے لیے۔''

لڑکے نے اچنبھے سے جنت کو دیکھا۔ ''وارننگ...... کیسا وارننگ...... واللہ ام بوت اچھے پکوڑے بناتا اے، صفائی کا بھی بوت خیال رکھتا ہے۔ کسی دن کھا کر دیکو (دیکھو)۔''

فارس وجدان نے عین اس وقت اس کے اور لڑکے کے مابین حائل اس چھوٹی سی میز پر جوس پٹخا تھا۔ ''کتنے کا ہے؟'' دانت پیس کر قیمت پوچھی جا رہی تھی۔

لڑکے نے سر اٹھا کر فارس کو دیکھا۔ اس گاہک کو تو وہ یکسر فراموش ہی کر بیٹھا تھا۔

جنت نے گردن سیدھی کی۔ ناگواری سے اسے دیکھا پھر رخ بدل گئی۔

پٹھان لڑکا اب فارس کی خدمت داریوں میں لگ گیا تھا۔

وہ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے میز پر ہیڈ ڈاؤن کیے بیٹھی تھی۔ نہ نیند آرہی تھی۔ نہ سکون مل رہا تھا۔ سلگتی ہوئی متورم آنکھیں بھی اب تکلیف پہنچانے لگی تھیں۔

پٹھان لڑکا اس کے لیے چائے لے آیا تھا۔ ٹیبلٹ وہ لے چکی تھی مگر اس کی طبیعت تھی کہ کسی بھی صورت سنبھلنے میں نہیں آرہی تھی۔ جسم میں اب مروڑ اٹھ رہے تھے۔ کوئی ایسا انتظام بھی نہ تھا کہ وہ دراز ہو کر سو جاتی۔

''صاب تمارا آدمی کب آئے گا۔'' پٹھان لڑکا صرف ان کی ہی وجہ سے اسٹور بند نہیں کر رہا تھا۔

فارس نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا۔ اس کے اندازے کے مطابق عدیل کو اب تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے موبائل نکالا۔ اور اس سے قبل کہ وہ کال کرتا، سیاہ مرسڈیز اسٹور کے سامنے آرکی تھی۔ ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی گلاس ڈور پر پڑی۔ ہارن بھی بجا۔ اور موبائل پر کال بھی آنے لگی۔

جنت نے بے ساختہ سر اٹھاتے ہوئے باہر دیکھا۔ سامنے دو گاڑیاں تھیں۔ ایک میں عدیل اور دوسری گاڑی میں اس کے گارڈ سوار تھے۔

''از ایوری تھنگ آل رائٹ سر۔'' عدیل اندر آ گیا تھا۔ اسے ایکسیڈنٹ کی تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے وہ دروازے میں ہی کھڑا رہا تھا۔ عدیل ہدایات لے کر پلٹ گیا تو اس نے سرسری نگاہوں سے جنت کو دیکھا جو اپنی جگہ سے اٹھ کر اسی طرف آرہی تھی۔

فارس کے قریب سے گزرتے ہوئے، اسے یک دم اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا، اس سے قبل کہ وہ لڑکھڑا کر گرتی فارس نے بروقت اسے بازو سے پکڑ کر سنبھال لیا۔

فارس کی یہ حرکت اتنی غیر متوقع اور اچانک تھی کہ جنت کو سنبھلنے میں۔ اور پھر سنبھل کر سمجھنے میں چند لمحے لگے۔ اگلے ہی لمحے اس نے شدید غصے کے عالم میں بدک کر اپنا بازو یوں چھڑایا جیسے اسے سانپ نے پکڑ لیا ہو۔

دیوار کا سہارا لے کر۔ اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے اس نے سخت پتھریلی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''میرا ہاتھ کیوں پکڑا تم نے؟'' اب کے اس کا سوال، رویہ اور تاثرات فارس وجدان کے لیے غیر متوقع تھے۔ وہ اس پوزیشن میں ہرگز نہیں تھی کہ اس سے بحث مباحثہ کر سکتی۔ بخار کی شدت سے جسم تپ رہا تھا۔ آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔ سر گھوم رہا تھا۔ اور تب بھی وہ سمجھ رہی تھی کہ اگر کوئی بے وقوف اسے گرنے سے بچا رہا ہے تو اس کے حق میں غلطی کر رہا ہے۔

فارس کے جبڑے بھینچ گئے۔ عدیل احمد اور گارڈز کے سامنے جس طرح وہ اس کے ساتھ پیش آئی تھی، وہ بمشکل ضبط کیے کھڑا تھا ورنہ دل چاہ رہا تھا ایک تھپڑ تو لازمی جڑ دے اسے۔۔

''باجی! یہ لڑائی وڑائی ختم کرو۔ تمارا طبیعت خراب ہے۔ تم گر جائے گا۔'' پٹھان لڑکے نے ہی اسے کام ڈاؤن کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان دو گھنٹوں میں ان کے لیے دیے رویے سے وہ اتنا تو جان ہی چکا تھا کہ کوئی اعلا اور غیر معمولی قسم کی دشمنی ہے جو ان دونوں میں جانے کب سے چلی آرہی ہے۔

''مجھے اب گرنے سے ڈر نہیں لگتا خان۔'' فارس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ درشتی سے بولی۔ ''میں پندرہ دن پہلے پارکنگ ایریا میں گری تھی۔ پھر خود اٹھ کر۔ اور خود چل کر بھی گئی تھی۔ اب بھی گروں گی تو خود اٹھ کر جانے کی ہمت ہے مجھ میں۔''

''میں بھی کوئی مرا نہیں جا رہا تھا تمھارا ہاتھ پکڑنے کے لیے۔'' فارس نے دبی آواز میں جھڑک کر کہا۔

بگڑے تیوروں کے ساتھ جنت نے فٹ سے چھتری کھول دی۔ اگر فارس بروقت اپنا سر پیچھے نہ ہٹاتا تو نوک اس کے سر میں ضرور لگتی۔۔

وہ پھولے تنفس اور بگڑے تیوروں کے ساتھ سنبھل کر قدم اٹھاتی باہر نکل گئی۔ گاڑی تک پہنچنے سے پہلے اس کا پاؤں پھسلا تھا (حالانکہ وہ کتنے احتیاط سے قدم اٹھا رہی تھی)

اور وہ ایک بار پھر نیچے گری تھی۔ بہت بری طرح سے۔ دبی دبی کراہ اس کے حلق سے خارج ہوئی۔ اوپر سے بارش کی بوچھاڑ جس نے چند سیکنڈ میں ہی اسے مکمل بھگو دیا تھا۔ چھتری جانے کہاں غائب ہوئی تھی۔

پٹھان لڑکے نے بے ساختہ پیشانی کو چھوا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے سیڑھیوں پر کھڑا فارس وجدان اب کے اس کی مدد کو نہیں آیا تھا۔ اس کے چہرے پر مکمل اطمینان تھا۔

''کھڑوس سے میری ہمت برداشت نہیں ہوئی۔ نظر لگا دی۔''

وہ اپنی کہنی سہلاتے ہوئے مسلسل رو رہی تھی۔ جانے کیا سوچ کر۔ جانے کیا سمجھ کر۔ اور جانے اور کتنی تکلیفوں پر۔ حالانکہ اسے فارس وجدان کے سامنے نہ کبھی رونا تھا۔ نہ کمزور پڑنا تھا۔ لیکن یہ غم کہ وہ گری۔ آخر وہ فارس وجدان کے سامنے ہی کیوں گری؟ کیوں؟

اور تب ہی اس نے فارس کو زینہ اتر کر اپنی طرف آتے دیکھا۔ لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ جنت کا چہرہ خفت سے سرخ پڑ گیا۔ اس کے سر پر پہنچ کر فارس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ خیرات کی طرح۔۔ کہ لو۔ خود سے پکڑو تاکہ تمھیں اس سچویشن سے نکالا جا سکے۔

وہ بھی جنت کمال تھی۔تنفر سے اس کا ہاتھ جھٹک کر بغیر کسی مدد، بغیر کسی سہارے کے خود سے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

کوئی ہڈی وڈی نہیں ٹوٹی تھی کہ اسے اب بھی کسی سہارے کی ضرورت پڑتی۔ چوٹیں ہی تو آئی تھیں۔اور چوٹیں تو اسے ہمیشہ آتی رہتی تھیں۔اس سے بھی تو مشکل ترین وقت دیکھا ہوا تھا اس نے۔تو پھر ایسے کیسے کمزور پڑ جائے۔

کیچڑ سے لت پت کپڑوں کے ساتھ مکمل طور پر بھیگی ہوئی اب وہ اپنے قدموں پر کھڑی تھی۔دل چاہا اب تو چیخ کر رو پڑے۔ لیکن اس نے صبر کا مظاہرہ کیا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر دھپ سے اندر بیٹھ گئی۔دروازہ اس نے زور سے بند کیا تھا۔

پٹھان لڑکے نے سکھ بھرا سانس لے کر گلاس ڈور بند کیے، شٹر گرایا اور یہ جا وہ جا۔

عقبی نشست کا دروازہ کھول کر فارس اس کے برابر میں بیٹھا تو اس نے دانستہ اپنے چہرے کا رخ کھڑکی کی طرف موڑ لیا۔اس کی شکل ایسی ہو رہی تھی جیسے وہ خوب دل کھول کر رونا چاہتی ہو مگر کسی وجہ سے رو نہ پا رہی ہو۔

''جی سب ٹھیک ہے ممی۔آپ پریشان مت ہوں۔'' فارس نے رک کر فون پر کچھ سنا۔

''کچھ لوگ بارش میں کرتب دکھانا چاہ رہے تھے تو بس وہی دیکھتے دیر ہو گئی۔''

جنت نے ضبط کر کے مٹھیاں بھینچ لیں۔

فارس نے کلائی موڑ کر وقت کا حساب لگایا۔''ہم بس ڈیڑھ دو گھنٹے تک پہنچ جائیں گے۔''

پھر اس نے اللہ حافظ کہتے ہوئے کال کاٹ دی تھی۔

جنت کی رنگت سفید ہو رہی تھی۔ ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔ٹھنڈک کا احساس ہڈیوں میں گھستا محسوس ہو رہا تھا۔لیکن وہ سر اٹھائے یوں بیٹھی تھی جیسے بس شوقیہ ہی کپکپا رہی ہو۔

عدیل احمد نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ مین روڈ پر گاڑی ڈالنے تک سب ٹھیک تھا۔پھر جب گاڑی نے سرعت پکڑی تب بھی وہ گردن اٹھائے شیشوں پر پھسلتی بارش کو بڑے سکون کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔اس کے بعد جانے کیا ہوا اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔سر ڈھلک کر شیشے سے جا لگا۔ہاتھ بے جان ہو کر پہلو میں گرے۔اور اسے اپنے آس پاس کا کوئی ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

پکے صحن کی مضبوط سیڑھیوں کا منظر تھا۔سفید ٹائلز پر ڈھیر ہوتے کسی وجود کی کراہ کی۔صدمہ۔وحشت۔بے یقینی۔اور پھر وہی آواز جو اس کے حواس مختل کر دیا کرتی تھی۔ایک جھماکے سے کانچ ٹوٹا تھا۔شیشے کے ٹکڑے بکھرے تھے۔چیخیں ابھری تھیں۔

''جنت نہیں۔جنت پلیز۔خدا کے لیے۔جنت میرا بچہ!''

اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ بخار کی حدت سے تپتا وجود درد کی لپیٹ میں تھا۔تکلیف کی شدت سے کراہتے

ہوئے اس نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔ پھر زیر لب بڑبڑاتے ہوئے رونے لگی۔ذہن ایک بار پھر غنودگی میں ڈوب گیا تھا۔

دوبارہ جب اسے ہوش آیا تو رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔اسے بھوک کا شدت سے احساس ہوا۔منہ کا ذائقہ زہریلا سا ہو رہا تھا۔ اس نے اطراف میں نگاہ دوڑائی۔

کمرے کی کھڑکیوں پر دبیز پردے گرے ہوئے تھے، لائٹس آف تھیں صرف نیلگوں بلب جل رہا تھا۔ ہیٹر آن تھا تب ہی کمرے میں سردی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ گہرا تنفس لیتے ہوئے وہ کسی قدر کوشش سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔آخری منظر جو ذہن میں محفوظ تھا وہ گاڑی کا تھا۔

مدھم سی نیلگوں روشنی میں فارس اسے سامنے کاؤچ پر نیم دراز دکھائی دیا۔آنکھیں بند تھیں۔تنفس ہموار۔یقیناً گہری نیند میں تھا۔

جنت نے داہنے ہاتھ پر نگاہ دوڑائی۔کینولا موجود تھا۔ڈرپ اتر چکی تھی۔

اس نے بیڈ سائڈ پر رکھی دواؤں کو دیکھا۔پھر الجھے بکھرے بالوں کو سمیٹ کر فرش پر قدم جماتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔لمحے بھر کے لیے لڑکھڑائی پھر سنبھل گئی۔

اس کا رخ واش روم کی طرف تھا۔واش بیسن کے سامنے رک کر اس نے خود کو آئینے میں دیکھا۔ چہرے کی زرد جلد کو چھوا۔ سرخ ڈوروں والی بھیگی ہوئی آنکھوں کو دیکھا۔بے ساختہ کسی خیال کے تحت سفید لبادے کی کھلی ڈھیلی آستین کو اوپر کیا۔

بازو پر موجود زخم کی بینڈیج کی گئی تھی۔اس نے بینڈیج ہٹا کر دیکھا۔چار ٹانکے لگے تھے۔وہ ایک بار پھر اپنے عکس کی طرف متوجہ ہوئی۔ پیشانی پر نیل کا نشان کچھ گہرا لگنے لگا۔اسے فکر ہوئی۔مسز شیرازی سے چھپانا اشد ضروری تھا۔ورنہ وہ دیکھ کر سوال کریں گی۔سوال اذیت سے دوچار کرے گا۔اذیت حکایتوں میں ڈھل کر آنکھوں میں عیاں ہو گی اور پھر اس کا کوئی بھی جھوٹ انہیں مطمئن نہیں کر پائے گا۔

منہ دھو کر وہ کمرے میں واپس آ گئی۔گرم شال کندھوں پر ڈالتی بے حد احتیاط سے باہر نکل گئی۔سیڑھیاں اتر کر اس نے کچن کا رخ کیا تھا۔کچھ ہی دیر میں فریزر کھولے سرخ و متورم آنکھوں سے کھانے کے لیے کچھ دیکھ رہی تھی۔

چکن کڑھائی، فرائیڈ‘ فرائیڈ فش۔اس نے مائیکرو ویو میں کھانا گرم کیا اور ابھی کرسی کھینچ کر کھانے کے لیے بیٹھی ہی تھی کہ قدموں کی آہٹ سماعت سے ٹکرائی۔نوالہ توڑ کر سالن میں ڈبوتے ہوئے وہ دیکھے بنا ہی جان گئی تھی کہ رات کے اس پہر سیڑھیاں اتر کر نیچے کون آ رہا تھا۔

پہلے فریزر کھولا گیا۔دودھ نکالا گیا۔کیبنٹ کھول کر پتی اور چینی کے جار تلاشے گئے۔ برنر جلایا گیا۔

اوراس دوران وہ اطراف سے یکسر بے نیاز خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔

چائے کپ میں ڈالے وہ سیدھا لاؤنج میں جا کر بیٹھ گیا تھا۔اوپن کچن سے وہ بآسانی دیکھ سکتی تھی۔ٹی وی آن کیے۔چینل سرفنگ کرتے وہ گھونٹ گھونٹ چائے اپنے اندر اتار رہا تھا۔

جنت نے بس ایک لمحے کے لیے اس کی پشت کو دیکھا پھر سپاٹ تاثرات کے ساتھ سینک میں استعمال شدہ پلیٹیں رکھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔

بیڈ سائڈ ٹیبل پر دواؤں کے ساتھ اوقات کی نشاندہی کرتے نوٹ چسپاں تھے۔کون سی ٹیبلٹ کس وقت لینی ہے اور دن میں کتنی بار لینی ہے سب درج تھا۔

لب بھینچ کر وہ گلاس میں پانی انڈیلنے لگی۔

دوا لینے کے بعد اس نے اپنا لحاف اور تکیہ اٹھایا اور ایک بار پھر اپنی سابقہ جگہ۔یعنی صوفے پر جا کر لیٹ گئی۔پھر جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

اور کھلی تب تھی جب کسی نے کندھا ہلاتے ہوئے پکارا تھا۔آواز غیر مانوس تھی۔آنکھیں کھول کر اس نے خود پر جھکے چہرے کو دیکھا۔کچھ دھندلا سا تھا۔

’’کیا بات ہے؟‘‘ آواز بھاری تھی۔

’’اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟‘‘

جنت نے اس لڑکی کو دیکھا جو گرم کپڑوں پر سیاہ رنگ کے سویٹر میں ملبوس، دوپٹا سلیقے سے جمائے چمکتی روشن آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

’’کون ہو تم؟‘‘

’’میں......اقصیٰ ہوں جی!‘‘

’’اقصیٰ کون؟‘‘ حواس کچھ بیدار ہوئے تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

’’عبدالغفور کی بیٹی۔‘‘

عبدالغفور ان کے مالی تھے۔خود شہر میں کام کرتے تھے مگر فیملی گاؤں میں رہتی تھی۔

اقصیٰ اب کچھ متفکر نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔’’آپ ٹھیک ہیں جی؟‘‘

’’ہاں۔‘‘ چہرے پر دونوں اطراف سے پھسلتے بالوں کو کان کے پیچھے اڑستے ہوئے اس نے کہا پھر سر اٹھا کر کھڑکیوں کی طرف

دیکھا۔دبیز پردے ڈوریوں میں بندھے ہوئے تھے۔سورج کی تیز روشنی چھن اندر آرہی تھی۔کتنے دنوں بعد سورج نکلا تھا۔

’’آپ کے لیے کچھ کھانے کے لیے لاؤں؟ چکن سوپ بنایا ہے جی، میٹھے میں کھیر بھی بنائی ہے۔‘‘

جنت نے بے ساختہ داہنے ہاتھ کی پشت پر نگاہ دوڑائی۔کینولا اتر چکا تھا۔سنی پلاسٹ لگا تھا۔

’’میں یہاں کب آئی تھی؟‘‘

’’پرسوں شام میں آپ کو صاحب لائے تھے۔‘‘

’’صاحب لائے تھے؟‘‘ پھانس کی طرح کوئی شے جنت کے حلق میں اٹکی۔’’کیسے لائے تھے؟‘‘

’’اٹھا کر لائے تھے جی۔اور کیسے لاتے؟‘‘ وہ حیران ہو کر جنت کو دیکھنے لگی۔جنت کا رنگ اڑا۔

’’آپ کی اتنی طبیعت خراب تھی۔جسم مانو آگ میں جل رہا تھا‘‘ اقصیٰ نے بات جاری رکھی۔’’میں ساری رات بیٹھ کر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں ہی کرتی رہی۔پھر فارس صاحب نے ڈاکٹر کو بلایا۔تب جا کر آپ کا بخار کم ہوا‘‘ بڑے سنسنی خیز انداز میں چہرے کے تاثرات کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ اپنی بات مکمل کر کے اس نے جنت کو دیکھا۔

وہ حیرت سے اقصیٰ کو دیکھ کر رہ گئی۔گزشتہ چوبیس گھنٹوں کا تو اس کے پاس کوئی حساب ہی نہ تھا۔نہ ہی اسے کچھ یاد تھا۔وہ چند لمحوں تک خالی الذہنی کیفیت میں بیٹھی رہی پھر اس نے اٹھ کر شاور لیا۔

کپڑے بدل کر اس نے معمول کی طرح برش سے بالوں کو سلجھا کر کیچر میں جکڑا۔سویٹر پہنا۔شال اوڑھی۔

پھر اقصیٰ کے ہمراہ نیچے آگئی۔

ہمت مجتمع کرتے ہوئے اس نے مسز شیرازی کے کمرے کا رخ کیا تھا۔دستک دے کر دروازہ کھولا تو وہ سامنے ہی بیڈ پر بیٹھی دکھائی دیں۔آنکھوں پر گلاسز لگائے کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں، جنت پر نظر پڑتے ہی انہیں خوشگوار حیرت نے گھیر لیا۔

’’جنت۔بیٹا! باہر کیوں کھڑی ہو، اندر آؤ۔‘‘ لہجے میں کتنا پیار تھا اور آنکھوں میں کتنی فکر تھی۔بھاری قدم اٹھاتی وہ بے حد خاموشی سے ان کی بانہوں میں سما گئی تھی۔

’’جو کچھ سن چکا ہوں وہ سب ممی کو بتاؤں گا تو وہ کیا سوچیں گی؟ ایک ایسی لڑکی کو بہو بنا بیٹھی ہیں جو **infertile** (بانجھ) ہے۔جس نے اپنی سوتن کے بچے کی جان لینے کی کوشش کی ہے۔جس کے خاندان کے لوگ اسے اچھوت کی طرح ٹریٹ کرتے ہیں۔اور جو اپنی ماں کی موت کا سبب بنی ہے۔‘‘

کتنی ہی دیر تک وہ ان کے سینے سے لگی رہی تھی۔اور پھر کتنی ہی دیر تک ان کی آنکھوں سے جھلکتی اس محبت کو بھی دیکھتی رہی جو وقتی انعام اور ادھورے خواب جیسی تھی۔

''اب کیسی طبیعت ہے؟'' انہوں نے اس کا سر، اس کا ماتھا چوما تھا۔

اس نے پلکیں جھپکا جھپکا کر آنکھوں میں ابھرتی نمی کو روک لیا۔ ''بہتر ہے۔''

انہوں نے مزید کچھ نہ پوچھا، کوئی بات نہ کہی، کوئی سوال نہ دہرایا، بس اسے بازو کے حصار میں لیے جانے کیا کچھ پڑھ کر اس پر پھونکتی رہیں۔

''نظر لگ گئی ہوگی۔ اس دن میری بیٹی پیاری بھی تو بہت لگ رہی تھی۔''

''جو بدعاؤں کے زیرِ اثر رہتے ہوں۔ انہیں نظر نہیں لگا کرتی۔'' مگر وہ یہ بات مسز شیرازی کو نہیں بتا سکتی تھی۔

کچھ وقت ان کے پاس خاموشی سے بتا کر وہ آرام کی غرض سے کمرے میں آ گئی تھی۔

ایک بار پھر اس نے پرسکون رہنے کی کوشش کی تھی۔ اور ایک بار پھر بند آنکھوں نے اس کی ہر کوشش ناکام بنا دی تھی۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ وہ مسز شیرازی کو کسی بھی صورت پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ انہیں کسی گہری اذیت یا صدمے سے دوچار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ ان کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت، ناگواری جیسے تاثرات نہیں دیکھ سکتی تھی اور نہ ہی ان کی دعاؤں، محبت اور شفقت کے سائے محروم ہونا چاہتی تھی۔

وہ جانتی تھی فارس نے انہیں کچھ بھی نہیں بتایا ہوگا۔ وہ اپنی ماں سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اور جب یہ طے تھا کہ کسی ڈیل کی طرح طے کیے گئے اس رشتہ نے بھی ختم ہو ہی جانا ہے تو وہ گھر میں خواہ مخواہ کی ٹینشن پیدا نہیں کرنا چاہے گا۔ وہ اب بھی اس پر کوئی دباؤ نہیں ڈالے گا۔ اس پر سختی نہیں کرے گا۔ روزمرہ معمولات کو ویسے ہی چلنے دے گا جیسے وہ پہلے سے چل رہے تھے۔ پچھلے تین ماہ کی روٹین قائم رہے گی۔ سخت ناگواری، ناپسندیدگی اور غصے کے باوجود وہ اب بھی اس پر کوئی رعب نہیں جمائے گا۔ وہ اب بھی اپنی ماں کی خاطر اسے اتنا مارجن دیے رہے گا کہ وہ اس گھر میں اپنی مرضی ومنشا سے ویسے ہی زندگی گزار سکے جیسی وہ پہلے گزار رہی تھی تاکہ ان کے مابین تعلق کی نوعیت کی انہیں خبر نہ ہو۔

مگر کیا اب وہ پہلے کی طرح وجدان ہاؤس میں رہ پائے گی؟ یہ ایک مشکل سوال تھا۔ اس کی ساری کوششیں اس رشتے کو برقرار رکھنے کے لیے تھیں۔ مگر اب اسے یہ ناممکن لگ رہا تھا۔ مستقبل کے حوالے سے اس نے بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ مگر اب اسے اندھیروں کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ ناقص۔ ادھوری۔ نامکمل...... وہ کسی کی زندگی کا حصہ نہیں بن سکتی تھی۔ محبتوں پر اس کا حق نہیں تھا۔ قدرت اس پر مہربان نہیں تھی۔

زندگی گزارنے کے لیے امید چاہیے۔ اور امید کو بھی تو۔ ایک امید چاہیے۔

مگر اس کے پاس اب کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ وہ خالی ہاتھ تہی دامن تھی۔ اب مستقبل کا کوئی منظر، کوئی خواب، کوئی خیال اسے قدم اٹھانے پر مجبور نہیں کر رہا تھا۔ وہ ایک ہی مقام پر رک گئی تھی۔ تھم گئی تھی۔ ٹھہر گئی تھی۔ اور جمود کا یہ احساس اسے اندر ہی اندر سے ختم کرتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب اس کی آنکھ دروازے کی آواز سے کھل گئی تھی۔ کہنی کے بل اوپر ہوتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر لیمپ آن کر دیا تھا۔ جنت کمرے میں نہیں تھی۔ اس نے پھر ٹیبل کلاک پر وقت دیکھا جو رات کے ڈھائی بجا رہی تھی۔ وہ اسی وقت اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ راہداری سے لاؤنج کا جائزہ لینے کے بعد اس نے اسٹڈی روم کا دروازہ کھول دیا۔ پھر سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا۔

ایک بار اطراف کا جائزہ لیتے اس نے کچن کا رخ کیا، لائبریری، اسٹوڈیو۔ ڈائننگ ہال۔ سٹنگ روم۔ اس نے ہر جگہ دیکھ لیا مگر جنت کہیں نہیں تھی۔ جھنجلاہٹ کے عالم میں وہ صدر دروازہ کھولے باہر آ گیا تھا۔

سامنے ہی وہ شدید سردی میں لحاف اوڑھے سیڑھیوں پر بیٹھی دکھائی دے گئی تھی۔

فارس وجدان کے جبڑے بھنچ گئے تھے، آنکھوں میں ناگواری کے ساتھ ساتھ سختی اتر آئی تھی۔ غصے سے قدم اٹھاتے ہوئے وہ اس کے پاس آیا تھا۔ اور پھر اسی غصے اور بے دردی سے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے اندر لے آیا تھا۔

دروازہ بند کر کے وہ اس کی طرف مڑا تو وہ سر جھکائے خالی خالی نظروں سے فرش کو تک رہی تھی۔۔

''اب کیا چاہتی ہو تم؟'' سانپ کی طرح پھنکار کر اس نے پوچھا تھا۔ ''اب کون سا نقصان ہے جو کرنا باقی ہے؟ یہی چاہتی ہو ممی تمھاری وجہ سے بیمار پڑ جائیں؟'' بازو سے پکڑ کر اس نے بے دردی سے جھنجھوڑا تھا۔ جنت کا سر تب بھی جھکا رہا تھا۔ لبوں پر قفل تھا۔ آنکھوں میں ویرانی ہی ویرانی تھی۔

فارس کا بس نہیں چل رہا تھا، وہ اسے تھپڑ لگا دے۔

مسز شیرازی اس کی غیر معمولی خاموشی کو، اس کی آنکھوں کی ویرانی کو، اور چہرے کے مسخ شدہ تاثرات کو طبیعت خرابی پہ محمول کر رہی تھیں۔ لیکن فارس جانتا تھا وہ ٹھیک تھی۔ جان بوجھ کر اور صرف توجہ لینے کے لیے یہ سب کر رہی تھی۔ ڈرامے باز تھی۔ سچویشن کو اپنی مرضی سے استعمال کرنا اسے آتا تھا۔ وہ مسز شیرازی کو اس معاملے میں انوالو کرنا چاہ رہی تھی۔ جانے کیسی لڑکی تھی؟ کیسی سوچ رکھتی تھی؟

''میں اگر خاموش ہوں تو صرف اس لیے کہ میں ممی کو ٹینشن نہیں دینا چاہتا۔'' اس نے شدید غصے کے عالم میں اس پر واضح کیا

تھا۔ ”تمہیں ان کا ذرا سا بھی احساس ہے؟“

وہ خاموش رہی تھی۔

”میری جگہ کوئی اور ہوتا تو ایک لمحے کے لیے بھی تمہیں اس گھر میں برداشت نہ کرتا۔“ اس نے جھٹکے سے بازو چھوڑ کر دبی آواز میں کہا۔

”آخری بار کہہ رہا ہوں، اپنا یہ حلیہ اور رویہ درست کرو ورنہ میں خود ممی کو تمھاری اصلیت بتا کر اس گھر سے فارغ کر دوں گا! کم از کم روز روز کی ٹینشن سے تو جان چھوٹے گی۔“ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا تھا۔ جنت نے سر اٹھا کر اسے جاتا دیکھا۔

آنکھوں میں یک دم نمی تیرنے لگی۔

☆☆☆

فارس کی دھمکی کا اثر تھا یا مسز شیرازی کی فکر۔ اس نے خود سے لڑ کر، خود کو کسی حد تک سنبھال لیا تھا۔ وہ ہشاش بشاش اور کچھ حد تک فریش نظر آنے لگی تھی۔ ویسے ہی انہیں وقت دینے لگی تھی جیسے لاہور جانے سے پہلے وہ گزشتہ تین ماہ سے دیتی آرہی تھی۔ لان میں گھومنا، کتابیں پڑھنا، اکٹھے نماز پڑھنا، آیات کو ڈسکس کرنا، دنیاوی خبروں پر تبصرے کرنا۔ لیکن در پردہ بہت سے کام ایسے بھی تھے جو اس نے چھوڑ دیے تھے۔

اس نے فارس کے معاملات میں مداخلت حتمی طور پر بند کر دی تھی۔ اور اب اس کا سامنا بھی وہ کم سے کم کرنے لگی تھی۔ کمرے میں تب ہی آتی جب وہ سو چکا ہوتا۔ صبح اس کے بیدار ہونے سے پہلے ہی اٹھ جاتی۔ آمنا سامنا صرف ناشتے کی ٹیبل پر یا رات کے کھانے پر ہوتا اور اس دوران وہ بھولے سے بھی نظر اٹھا کر اسے نہ دیکھتی۔ اب فارس کے بیڈروم میں نہ تازہ پھول سجتے تھے نہ معطر خوشبو بکھرتی تھی۔ نہ کمرے کی سیٹنگ بدلتی تھی نہ اس کی اشیا کو ہاتھ لگایا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے ڈریسنگ ٹیبل سے اپنا میک اپ کا سامان بھی ہٹا دیا تھا۔ دیواروں کو بھی پینٹنگز سے محروم کیا تھا۔ بیڈ شیٹس، کھڑکیوں کے پردے بھی اس نے بدلوا دیے تھے۔ ایک ایک کر کے اس نے اپنی ہر نشانی اس کمرے سے مٹائی تھی۔ ایک ایک کر کے اس نے اپنی ہر چیز وہاں سے ہٹائی تھی۔ اب اسے فارس کے کمرے میں اپنی پسند اور مرضی کی کوئی چیز چاہیے بھی نہیں تھی۔

اب جب قدم لہولہان ہوئے تھے تو وہ اپنے ہاتھوں سے ہی ہر زنجیر توڑ کر، خود کو آزاد کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر یہ آزادی۔ آہ یہ آزادی۔

سوچ اور خیالات میں غلطاں۔ وہ کب کیسے چلتی ہوئی نماز والے کمرے میں آ گئی تھی اسے نہیں پتا تھا۔

سر بسجود کتنی ہی دیر تک وہ سسکیاں لے لے کر روتی رہی تھی، اسے اندازہ نہیں تھا۔ اور جب سر اٹھاتے ہوئے سیدھی ہوئی تھی تو نم آنکھوں کے ساتھ اپنی جگہ تھم کر رہ گئی تھی۔ دروازے میں ہی مسز شیرازی موجود تھیں۔ انہوں نے اس کا آنسوؤں سے تر چہرہ دیکھا۔ آنکھوں میں لہراتا کرب دیکھا۔

جنت اپنی جگہ منجمد ہوئی بیٹھی تھی۔ آنسو آنکھوں میں ٹھہرے تھے۔ دل جیسے رکا ہوا تھا۔ شاید وہ اب پوچھ لیں کہ جب سے لاہور سے آئی ہو، اتنی خاموش کیوں ہو؟ زندگی سے خفا کیوں ہو؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کیوں بدل گئی ہو جنت؟ اگر انہوں نے پوچھ لیا تو وہ کیا بتائے گی؟ کیا جواب دے گی؟

”دعا مانگ لی بچے! کافی کی طلب ہو رہی ہے اگر تمھارے ہاتھوں سے بنی مل جائے تو.....“ مسکراتے ہوئے انہوں نے ایک دم سے یوں کہا جیسے انہیں اس کے آنسو نظر ہی نہ آئے ہوں۔ وہ آنسو اللہ کے سامنے بہائے گئے تھے۔ وہ اللہ کے لیے ہی تھے۔

جنت نے خشک لبوں کو تر کرتے ہوئے انہیں دیکھا۔ پھر اثبات میں بمشکل اپنے سر کو جنبش دی۔

حالانکہ اس نے دعا نہیں مانگی تھی۔ اس نے بس پیشانی ٹکائی تھی اور رونا شروع کر دیا تھا۔ بھلا وہ اسے کیا بتاتی جسے سب علم تھا۔ جو اس کی رگ رگ سے واقف تھا۔

”میں کچن میں ہوں۔“ انہوں نے وہیل چیئر کا رخ موڑ دیا تھا۔

آنکھیں آستین سے پونچھتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ نگاہ عسر یسرا کی آیت پر جا ٹھہری۔ بس ایک لمحے کے لیے۔ پھر گالوں پر سے آنسوؤں کا نشان مٹاتی وہ کچن میں آ گئی تھی۔

اس نے مسز شیرازی کو دیکھا۔ گود میں دھری ڈائری انہوں نے کاؤنٹر ٹیبل پر رکھ دی تھی۔ اور ہاتھ بڑھا کر کچھ لکھ رہی تھیں۔

”تمھارا کیا خیال ہے جنت! محرومیوں پر صبر کیسے آتا ہے؟“ کافی بنا کر وہ ان کے پاس آئی تو اپنا مگ اٹھاتے ہوئے انہوں نے قلم رکھ کر پوچھا تھا۔

اس نے انہیں دیکھا۔ فوری طور پر کوئی جواب اس کے ذہن میں نہ آ سکا۔

”کیسے آتا ہے؟“ کچھ دیر کے بعد اس نے گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔ وہ جانتی تھی مسز شیرازی اس ٹاپک پر کچھ لکھ رہی ہوں گی۔ جواب ان کے پاس ہوگا۔ یقیناً ہوگا۔ سوالوں پر غور کرنے والوں کو جواب مل ہی جایا کرتے ہیں۔

”سکون، ’شکر‘ سے آتا ہے، شکر ’صبر‘ سے ہوتا ہے، صبر اللہ کی ’رضا‘ میں راضی ہونے کا نام ہے۔ اور رضا اللہ کی ’حکمت‘ پر بھروسا کرنے سے آتی ہے۔ بھروسا ’ایمان‘ سے اور ایمان ’یقین‘ سے ہوتا ہے۔“

گھونٹ گھونٹ کافی اپنے اندر اتارتے ہوئے وہ انہیں خاموشی سے دیکھنے لگی۔

''ایک محرومی کے ساتھ ڈھیر ساری عطائیں بھی تو ہوتی ہیں، اب مجھے دیکھ لو۔'' وہ مسکرائیں۔ ''اپاہج ہوگئی ہوں لیکن اللہ نے مجھے بولنے سننے اور دیکھنے کی صلاحیتوں سے محروم نہیں رکھا۔ وہ ایک محرومی بہت بھاری ہے۔ مگر اس کے ساتھ بھی اتنی عطائیں ہیں کہ میں شمار نہیں کرسکتی۔'' انہوں نے ایک لمحے کا توقف کیا۔

''جب میں ''عطا'' پر غور کرتی ہوں تو میرے اندر ''شکر'' کا جذبہ سر اٹھاتا ہے۔ یہی جذبہ مجھے میری ''محرومیوں'' پر صبر سکھا دیتا ہے۔ صبر اللہ کی رضا سے جڑا ہے۔ رضاء اللہ کی حکمت پر، اس کی رحمت پر بھروسا کرنا سکھاتی ہے۔ اور میں سوچنے لگتی ہوں کہ یقیناً اس میں میرے لیے بھلائی ہوگی۔ یقیناً اللہ نے مجھے کسی بڑی مصیبت سے بچانے کے لیے اس آزمائش میں ڈالا ہوگا۔ یا مجھے وہ ان حالات سے اسی لیے گزار رہا ہوگا تاکہ وہ بدلے میں مجھے کچھ اچھا اور بہترین عطا کرسکے۔''

مگ پر گرفت مضبوط کیے جنت خاموش بیٹھی تھی۔

''یقین سے ابتدا کرتی ہوں تو ''شکر'' پالیتی ہوں، شکر سے آغاز کرتی ہوں تو یقین مل جاتا ہے۔''

کافی کا خالی مگ کاؤنٹر پر رکھ کر انہوں نے ڈائری اٹھالی۔

جنت بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''آنٹی!'' وہیل چیئر کا رخ موڑتے ہوئے انہوں نے رک کر اسے دیکھا۔

''جی بیٹا!''

''اللہ کی زمین بہت بڑی ہے۔ جو اس کا ہوجائے اس کے لیے کم نہیں پڑتی۔۔ وہ اسے پھر بے گھر نہیں ہونے دیتا، ہے نا؟''

سیڑھیاں اترتے فارس وجدان کے قدموں کی حرکت یک لخت تھمی تھی۔ کچن کاؤنٹر کے اس طرف وہ مسز شیرازی سے مخاطب تھی۔۔

''بے شک۔'' انہوں نے وہیل چیئر کا رخ موڑا پھر کچھ سوچ کر رک گئیں۔

''سجدوں میں گرنے والوں کو اللہ کبھی گرنے نہیں دیتا جنت۔''

جنت کی آنکھوں میں نمی ٹھہر گئی۔ بدقت مسکراتے ہوئے اس نے انہیں دیکھا۔

وہ مسز شیرازی کو کیوں فراموش کر بیٹھی؟

اس نے وعدہ کیا تھا وہ انہیں ان کے پوتے سے ملوائے گی۔ اس نے خود سے عہد کیا تھا وہ ان کا ہر لحاظ سے خیال رکھے گی۔ تو پھر اب کیوں ہمت چھوڑ بیٹھی تھی وہ۔

نکاح۔ ایک کانٹریکٹ...... جب تک وہ ہے۔ ہاں تب تک...... تب تک...... اسے مسز شیرازی کے ساتھ ان کی دعاؤں کے سائے تلے رہنا ہے۔

محبتیں ایسی بھی ہوتی ہیں۔ ایسے بھی ملتی ہیں۔ اللہ کے پیاروں سے۔

وہ سرشاری کے عالم میں سوچ جارہی تھی۔

فارس انہیں کبھی بھی اس کے ماضی سے آگاہ نہیں کرے گا۔ ان کی محبت اس کے لیے دائم وقائم ہی رہے گی۔ آنکھوں میں نفرت کا تاثر نہیں ابھرے گا۔ لب دعا سے خالی نہیں ہوں گے۔ وہ اس کے لیے اللہ سے مانگتی ہوں گی۔ وہ ان کے پوتے کے لیے ان کے ساتھ کھڑی رہے گی۔

عقب میں صدر دروازہ کھول کر فارس وجدان باہر چلا گیا تھا۔ جنت کمال اب بھی مسز شیرازی کو ہی دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس نے سینے پر دھری کتاب کافی ٹیبل پر رکھ دی تھی۔ لاہور سے واپسی کے بعد اکثر ایسا ہونے لگا تھا کہ وہ سٹنگ ایریا میں ہی سوجایا کرتی تھی۔ اور اب جب شدید سردی کا احساس ہوا تھا تو وہ اٹھ کر کمرے میں آگئی تھی۔

کمرے کے اندر داخل ہوتے ہوئے اسے یکا یک ہی غیر معمولی پن کا احساس ہوا تھا۔ زرکار فانوس اور لیمپ روشن تھے۔ بیڈ پر بے ترتیبی سے کشن یہاں وہاں بکھرے تھے۔ اس کی نگاہیں بے اختیار واش روم کی جانب اٹھ گئی تھیں۔ ادھ کھلے دروازے سے وہ فارس کو واش بیسن پر جھکا دیکھ سکتی تھی۔ وہ کھانستے ہوئے الٹی کررہا تھا۔

نچلا لب یونہی بے خیالی میں دانتوں تلے دباتے ہوئے وہ صوفے پر جا بیٹھی۔ کچھ ہی دیر بعد باہر آیا تھا۔ مدھم سی روشنی میں اس کا چہرہ واضح تھا۔ مضمحل وجود نڈھال لگ رہا تھا۔ رنگت اڑی ہوئی۔ ہونٹ خشک بے رنگ۔ نم آنکھیں بے تحاشا سرخ اور کچھ سوجی ہوئی تھیں۔ کپڑے شکن آلود۔ حلیہ بکھرا ہوا سا۔ وہ قدم اٹھا رہا تھا تو اس کی چال میں واضح لڑکھڑاہٹ تھی۔ پھر وہ کھانستے ہوئے بیڈ پر ڈھے گیا تھا۔

ٹانگوں پر کمفرٹر پھیلاتے ہوئے جنت اسے بیڈ پر بے قراری سے کروٹ بدلتے اور بے طرح کھانستا دیکھ کر کچھ بے چین ہوئی۔

پہلا خیال یہی آیا کہ وہ اس کے معاملے میں نہ ہی پڑے تو ہی بہتر ہے۔ جیسا کہ وہ لاہور سے واپسی کے بعد سے ارادہ کیے ہوئے تھی اور دوسرا خیال یہ تھا کہ اسے اٹھ کر اس کی طبیعت سے متعلق استفسار کرنا چاہیے۔ مگر چاہتے ہوئے بھی اس کی ہمت نہیں

ہوئی تھی۔

وہ ایک بار پھر اٹھ کر واش روم میں گیا تھا۔ ایک بار پھر واش بیسن پر جھکا ہوا تھا۔

جنت نے اضطرابی کیفیت میں وال کلاک پر نگاہ دوڑائی۔ کیا ساری رات اس کی یہی حالت رہی ہے؟ وہ باہر آیا تو جنت اس کے سامنے تھی۔ کچھ متفکر اور متامل سی۔

''از ایوری تھنگ آل رائٹ؟'' اس نے ہمت کر کے پوچھا تھا۔

ایک ہاتھ سے دیوار کا سہارا لیتے ہوئے اس نے دروازے کی ناب کو تھامے رکھا۔ بار بار وہ پلکیں یوں جھپک رہا تھا جیسے آنکھوں پر چھائی ہوئی دھند ہٹانے کی کوشش کر رہا ہو۔ منظر کچھ واضح ہوا تو جنت کو درشتی سے ہٹاتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔ اگلے ہی لمحے اس کا توازن بگڑ گیا۔ اس سے قبل کہ جنت اسے سنبھال پاتی، وہ پورے قد سمیت فرش پر آرہا۔

''فارس!'' گھٹی گھٹی چیخ کے ساتھ وہ اس پر جھک گئی۔

گال تھپتھپاتے ہوئے، آوازیں دیتے ہوئے اسے ہوش میں لانے کی سعی کرنے لگی۔ محض چند لمحوں کے لیے پاس آؤٹ ہونے کے بعد اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں۔ اگلے ہی پل اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ اس کے چہرے اور گردن پر سرخ دھبے ابھرے ہوئے تھے۔ سرخ آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔

الرجی ری ایکشن! پریشانی کے عالم میں جنت کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا۔ پھر اس نے تیزی سے اٹھ کر سائڈ ٹیبل پر رکھی ٹیبلٹس کا جائزہ لیا۔ پانی کا آدھا گلاس بھی رکھا تھا۔ گویا وہ الرجی کے لیے میڈیسن لے چکا تھا مگر اسے ابھی تک افاقہ کیوں نہیں ہوا تھا؟ اگر بروقت افاقہ نہیں ہوا تھا تو...... یک دم اس کے اندر خطرے کی گھنٹی بجی۔ سائڈ ٹیبل سے اس نے فارس کا موبائل اٹھا لیا۔ اس کے داہنے ہاتھ کی فنگر پرنٹس سے لاک کھول کر ڈاکٹر بخاری کا نمبر کانٹیکٹس سے نکالا۔

بمشکل سانس لیتے فارس بری طرح سے کھانسے جا رہا تھا۔

وہ اب ڈاکٹر بخاری سے مخاطب تھی۔ انہیں اس کی صورت حال سے آگاہی دے رہی تھی جبکہ متلی کے شدید احساس کے ساتھ ہی فارس کو یک دم سے ابکائی آئی۔

وہ اٹھنا چاہتا تھا مگر بروقت ایسا نہ کر سکا۔ مجبوراً اسے فرش پر ہی جھکنا پڑا۔

ڈاکٹر بخاری سے بات کر کے وہ ایک بار پھر اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ ''اٹس اوکے۔ پریشان مت ہو۔ ریلیکس رہو۔'' وہ اس کی پشت تھپتھپاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''دور رہو۔'' کچھ غصے، کچھ جھنجلاہٹ اور کچھ بے بسی کے عالم میں اس نے بائیں ہاتھ سے جنت کو پرے دھکیلا۔ انداز اور

رویے سے نفرت اور جھلاہٹ نمایاں تھی۔

جنت دکھ اور صدمے سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

بہت کوشش سے وہ دیوار کے قریب ہوا تاکہ سہارا لے کر بیٹھ سکے۔ داہنا ہاتھ گردن پر تھا۔ وہ اپنے سویٹر اور شرٹ کے بٹن کھولنا چاہتا تھا مگر کھول نہیں پا رہا تھا۔

یہ کام بھی جنت نے سرانجام دینا چاہا تھا اور اس نے ایک بار پھر۔ شدید غصے اور چڑچڑے پن سے اسے پرے دھکیلا تھا۔

''سٹے۔ آوے۔ فرام۔ می۔۔''

جنت کا دماغ گھوم گیا۔۔ اگلے ہی لمحے اس نے فارس کے ہاتھ جکڑ کر پکڑے تھے۔

''اس حالت میں بھی تمہیں اپنا ایٹی ٹیوڈ دکھانے کی پڑی ہوئی ہے۔ اس حالت میں بھی؟'' وہ اس پر پھٹ پڑی۔

سرخ پڑتی آنکھوں میں صدمہ لیے فارس وجدان اسے دیکھ کر رہ گیا۔ محض ایک لمحے کے لیے اسے سکتہ ہوا تھا۔ اس کے بعد جو کھانسی کا دورہ پڑا تو وہ حال سے بے حال ہو گیا۔

جنت نے تیزی سے اس کے سویٹر اور شرٹ کے اوپری بٹن کھول دیئے۔ گردن سے نیچے۔ سینے پر بھی سرخ نشان تھے۔

''میں نے ڈاکٹر بخاری سے بات کی ہے۔ وہ ابھی آتے ہوں گے۔'' وہ اس سے کہہ رہی تھی۔ ''کیا تم کوئی اور دوا لیتے ہو، سیویری ایکشن۔''

فارس کا سر جھک گیا، نیم کھلی آنکھوں میں ایک خالی پن تھا۔ چہرہ سفید۔ کھانس کھانس کر اس کی حالت ابتر ہو چکی تھی۔

''فارس؟'' اس کا سر اٹھاتے ہوئے، گال تھپتھپاتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اسے متوجہ کیا تھا۔ مگر وہ متوجہ نہیں ہوا تھا۔ کوئی جواب بھی نہیں دے رہا تھا۔

''فارس! میری طرف دیکھو، میری بات سنو۔''

یکا یک ہی اس کی گردن ڈھلک گئی۔ وجود بے جان سا ہو گیا۔

''ف...... فارس؟'' جنت کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی۔ آنکھوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ داہنا ہاتھ منہ پر جمائے وہ متوحش ہو کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔

فارس سانس نہیں لے رہا تھا۔ اس کے وجود میں اب کوئی حرکت نہیں رہی تھی۔

☆☆

وہ بیڈ سائڈ کے ساتھ پشت ٹکائے فرش پر دوزانو بیٹھی تھی۔ کمرے میں ملگجی سی روشنی کا مدھم سا تاثر تھا جو اس کی آنکھوں کی

ویرانی کو عیاں کر رہا تھا۔

رنگت زرد۔لب باہم پیوست۔اور ایک ہی نقطے پر جمے براؤن عدسے۔ایک آگ تھی۔جس میں سب جل رہا تھا۔خواب بھی......خواہشات بھی......امید بھی یقین بھی۔

پاس ہی موبائل پڑا تھا۔اسکرین روشن تھی۔انجان نمبر سے ارسال کی گئیں فارس اور عدینہ زبیر کی شادی کی تصاویر کھلی پڑی تھیں۔

زندگی سے بھرپور مسکراہٹ،سنجیدہ مگر کچھ نرمی لیے تاثرات،ہشاش بشاش چہرہ۔مگر جنت کمال کی تمام تر توجہ ان ہیزل گرین آنکھوں پر مرکوز رہی تھی جن سے جھلکتے محبت کے حسین رنگ اسے ان پانچ ماہ میں ایک بار بھی نظر نہیں آئے تھے۔جنت کی سنگت میں تو جیسے وہ ادھورا تھا۔مکمل تو وہ عدینہ زبیر کے ساتھ لگ رہا تھا۔جوڑی بھی کمال کی تھی۔پہلی نظر میں خیال آئے تو بس یہی کہ بنے ہی ایک دوسرے کے لیے ہیں۔

''اگر میں اسے ''ہاں'' کہہ دوں۔ذرا سوچو!!تمہاری حیثیت کیا رہ جائے گی؟''

دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔آنکھیں مکمل طور پر نم ہوگئیں۔

''حیثیت......'' ذہن کے پردے پر لمحے بھر کے لیے ایک منظر ابھرا۔پھر دوسرا۔پھر تیسرا۔آنکھوں میں ٹھہرے آنسو گالوں پر لڑھک گئے۔

ماضی مستقبل میں ڈھلنے لگا۔اذیت روپ بدلنے لگی۔چہرے گڈمڈ ہونے لگے۔''ماہین'' کی جگہ ''عدینہ'' آ گئی تھی۔''برھان'' کی جگہ ''فارس'' لے چکا تھا۔

وقت ایک بار پھر وہی حکایت لکھ رہا تھا۔جس کا آغاز بے شک مختلف۔مگر انجام اب بھی ایک سا تھا۔حیثیت جتلا کر،عیب بتلا کر،راستے جدا کر دینا۔اس کے ساتھ ایک بار پھر وہی ہو رہا تھا۔وہ ایک بار پھر اسی تکلیف سے گزرنے والی تھی۔اسی پرخار راستے پر چلنے والی تھی۔کھیل اب بھی نصیب کا تھا۔

فرق صرف اتنا تھا کہ اب کی بار اسے کوئی خواب نہیں دکھایا گیا تھا،امید نہیں دلائی گئی تھی۔نہ اعتبار جتایا گیا تھا،نہ محبت دکھائی گئی تھی۔اب کی بار جذبات میں بناوٹ نہیں تھی،نہ انداز میں حلاوت تھی۔اب کی بار وہ سچا کھرا انسان۔اپنی نفرتوں میں بہت خالص تھا۔اپنے ارادوں کا پختہ،اپنے فیصلوں پر آج بھی قائم تھا۔

بھٹک تو وہ گئی تھی جو یہ سوچ بیٹھی تھی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ٹھیک نہ بھی ہوا تو وہ سنبھل جائے گی۔قسمت جس راستے کا انتخاب کرے گی،وہ چل پڑے گی۔جس منزل کا تعین کرے گی وہ اس تک پہنچ جائے گی۔مگر وہ ساری ہمت،وہ پورا کا پورا حوصلہ۔وہ امید

سے بھرا یقین۔اس کا عزم۔اس کا فیصلہ۔سب لمحے میں فنا ہوا تھا۔وہ بکھر کر سمٹنے کے بجائے مزید ریزہ ریزہ ہونے لگی تھی۔آخر وہ کیوں ہر بار خالی ہاتھ تہی دامن رہ جاتی تھی؟کیوں عدم ہو جایا کرتی تھی؟کیوں نفی کر دی جاتی تھی؟

''ممی کو بہو چاہیے تھی......وہ اپنی مرضی اور پسند سے تمہیں یہاں لے بھی آئیں۔مجھے لائف پارٹنر چاہیے ہوتا تو میں کم از کم تمہارا انتخاب نہ کرتا۔''

اندر کہیں آواز گونجی تھی۔سرد۔خشک۔جلا کر بھسم کر دینے والی آواز۔

''ایک سرپرائز ہے تمہارے لیے۔''

چہرہ ہاتھوں میں چھپائے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

گھٹنوں پر سر رکھے،روتے سسکتے اس نے اپنے گرد بازو باندھ لیے۔وہ اپنے آپ کو،اپنی گرفت میں لے کر جیسے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی مگر وہ سنبھل نہیں رہی تھی۔اس کا دل رو رہا تھا۔اس کی روح تڑپ رہی تھی۔

''پازیٹو سوچو بچے۔''نانا ٹہلتے ہوئے اکثر کہے جاتے تھے۔آج بھی ان کی آواز بازگشت بن کر اس کے اندر گونجی تھی۔

''اس حالت میں بھی؟''وہ ہچکیوں کے بیچ بمشکل بول پائی۔''اس حالت میں بھی بابا؟اس حالت میں بھی؟''

''درد اور تکلیف کی انتہا پر اگر تم پازیٹو نہیں سوچو گی تو پھر کب سوچو گی؟''وہ مسکرائے۔

اس نے آنسوؤں سے تر چہرہ اوپر اٹھایا۔کمرے میں اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

''روشنی میں یہ گمان رکھنا کہ راستہ مل جائے گا،قدرے آسان ہے۔''وہ کھڑکی کے پاس کھڑے باہر دیکھ رہے تھے۔''اصل کمال تو اس کا ہوا جو آزمائش کی تاریکی میں اس سوچ پر قائم رہا۔اس وقت جب کوئی راستہ تھا،نہ روشنی باقی رہی تھی۔''

اب وہ اس کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھے تھے۔اس کا ہاتھ تھامے،اس کے آنسو پونچھ رہے تھے۔اور وہ بے بسی سے روئے جا رہی تھی۔

وہ ہمت کر کے آج نانا سے کہہ دینا چاہتی تھی۔

''جینے کی ہر خواہش ختم۔اب بس موت مل جائے۔ایک نئے امتحان میں پڑنے سے پہلے،ایک نئی آزمائش کو جھیلنے سے پہلے۔وہ بس کسی طرح مٹ جائے۔اب کی بار وہ خاک ہو اور پھر خاک ہی رہے۔اب کی بار جب اس کی موت ہو تو جگہ ''قبر'' ہی بنے۔بس اب اور نہیں۔اب مزید اور نہیں۔''

باہر آسمان پر بادل پھیل رہے تھے۔ہوائیں تیز ہو رہی تھیں۔اپنے گرد بازو باندھے وہ قالین پر سمٹ کر لیٹ گئی تھی۔وہ سونا چاہتی تھی۔اپنے درد سے لاتعلق ہونا چاہتی تھی۔مگر اندر کا شور ہمیشہ کی طرح اس خواہش پر بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

بادلوں کی گھن گرج کے ساتھ ہی ان کی آنکھ کھل گئی تھی۔ گولیوں سے چھلنی وجود۔ خون سے سرخ ہوتی سفید شرٹ۔ چال میں لڑکھڑاہٹ۔ وہیل چیئر پر براجمان آدھے زندہ۔ آدھے بے جان وجود کے سامنے پنجوں کے بل جھکتا وہ۔

انہوں نے پلکیں جھپکائیں۔ سیڑھیوں کی آہنی ریلنگ اب سہارا ہو چکی تھی۔ وہ بمشکل اپنے قدموں پر کھڑی تھیں۔ بمشکل اپنا فوکس اس کے چہرے پر جمائے ہوئے تھیں۔

''جو کھیل آپ نے۔ اپنی طاقت سے شروع کیا تھا، اس کا انجام یہی ہونا تھا۔'' لڑکھڑاتی، رندھی ہوئی، بیک وقت مضبوطی سے کمزوری کی طرف بڑھتی ہوئی آواز۔

''میرا...... میرا...... بیٹا...... کہاں ہے؟'' اب کے وہ متوحش ہو کر آگے بڑھی تھیں۔

منظر بدلا تھا، روشنی اندھیرا ہوئی تھی، مگر احساسات وہی رہے تھے، درد بھی وہی۔ اذیت بھی وہی۔ ماضی بھی وہی۔

وہ تکیے کے سہارے اٹھ بیٹھیں۔ ہاتھ بڑھا کر لیمپ روشن کر دیا۔

ان کا چہرہ مکمل طور پر آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔ وجود پر ایک کپکپی سی طاری تھی۔

دیوار گیر کھڑکیوں کے پردے ڈوریوں میں بندھے ہوئے تھے۔ لان کی لائٹس کی زرکار روشنیوں میں بارش شدت سے برستی نظر آ رہی تھی۔ اندر اور باہر کا موسم ایک ہو رہا تھا۔

''آپ کو کبھی مجھ سے محبت نہیں تھی۔ آپ کو ہمیشہ وہ نظر آیا ہے۔ ہمیشہ اس کی فکر رہی ہے۔''

وہ سسک پڑیں۔

''یتیم بچوں کو صبر آ جاتا ہے کہ وہ جانتے ہیں، ان کے ماں باپ قبروں میں ہیں، اگر جو وہ زندہ ہوتے تو ان کی حالت ایسی نہ ہوتی! لیکن جن بچوں کو معلوم ہو، ان کے ماں باپ زندہ ہیں اور تب بھی ان کی یہ حالت ہے۔ ذرا سوچو انہیں صبر کیسے آتا ہوگا؟''

منظر بدل رہے تھے۔ مگر پنڈولم کی آواز وہی تھی۔ وہ ہر منظر میں، ہر حقیقت میں، ہر خیال میں ایک سی تھی۔

''انسان ان سوالات کا کیا کرے جو نیند اڑا دیں۔ بے قراری میں بہا دیں۔ جن کا کوئی جواب ہو، نہ منطق۔ نہ دلیل۔ بس ایک صراع۔ جیسے جنگ، بے چینی، بے سکونی...... بس درد، اذیت، کرب۔'' وہ ہاسپٹل کے کاریڈور میں کھڑی تھیں۔

''سوال ضمیر اٹھاتا ہے۔ جواب ایمان دلاتا ہے۔''

''ایمان بتلا رہا ہے، میں بھٹک رہی ہوں۔''

''ایمان بتلا رہا ہے، تم اب صحیح راستے پر ہو۔''

انہوں نے اذیت سے لب بھینچ لیے۔ اب وہ بے آواز رو رہی تھیں۔

''میں اگر اسے اڑان کے لیے پر دے رہا ہوں تو مناسب وقت پر لینے کا اختیار بھی رکھتا ہوں، میں جس وقت اسے حدود و قیود سے نکلتا دیکھوں گا اسے واپس اس کی اوقات میں لے آؤں گا، مگر جو تم کر رہی ہو اس پر تم بہت پچھتاؤ گی۔''

انہوں نے گہرا تنفس لے کر اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ذہن کو ماضی کی گرفت سے چھڑانا چاہا۔ مگر ناکام رہیں۔

''میں کیا ہوں ممی؟ میں کہاں ہوں؟'' انہیں لگا وہ ان کے سامنے آن کھڑا ہوا ہے۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھے وہ بے آواز روتی رہیں۔

دیوار گیر کھڑکیوں کے اس پار۔ بارش سے نم ہوتی بوجھل فضا میں کہیں بجلی چمکی تھی۔ دوسری منزل کے بیڈروم میں کارپٹ پر لیٹی، نیند کی گہری وادیوں میں اترتی جنت کمال نے ذرا دیر کے لیے آنکھیں کھول کر بند کر لیں۔

موبائل سائلنٹ پر تھا۔ اندھیرے میں اسکرین روشن ہو رہی تھی۔ اور اسی روشنی میں سائڈ ٹیبل پر رکھے گلدان میں ٹھہرے پھولوں کی پتیاں ٹوٹ کر نیچے آ گری تھیں۔

☆☆☆

سارا دن آسمان بادلوں کی لپیٹ میں رہا تھا۔ موسم طوفانی تھا۔ وقفے وقفے سے بارش بھی دو تین بار برس چکی تھی۔ سیاہ رنگ کی اے لائن قمیص پر ہلکے رنگ کا لمبا اونی سویٹر زیب تن کیے، وہ اس وقت کچن میں خانساماں کے ساتھ رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔

سرخ و متورم آنکھوں میں خاموشی ٹھہری تھی۔ چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ طبیعت نڈھال لگ رہی تھی۔

اس کا ذہن الجھا ہوا سا تھا۔ وہ کیبنٹ کھولتی تو کچھ لمحوں تک سوچتی رہتی کہ کس لیے کھولا ہے۔ فریج کے اندر سے جو چیز نکال کر لاتی، اس کی ضرورت ہرگز نہ ہوتی۔ اور جس کی ضرورت ہوتی وہ چیز باوجود تلاش کے اسے نہ ملتی۔ سارے کام اس سے غلط ہو رہے تھے۔

مسز شیرازی بالکل سامنے گلاس وال کی طرف رخ کیے بیٹھی تھیں۔ شیشے پر پھسلتے قطروں پر نگاہ جمائے کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ کانوں میں ایئر فونز لگا رکھے تھے۔ موبائل پر یقیناً وہ کچھ سن رہی تھیں۔ اور کافی دیر سے سن رہی تھیں۔

ایک نظر ان پر ڈالتے ہوئے وہ آہستہ سے مڑی اور اگلے ہی لمحے اس کا سر چکرا گیا۔ اس نے بے ساختہ کاؤنٹر ٹیبل کو تھام کر خود کو گرنے سے بچایا تھا۔ ملازمہ نے اس کا بازو پکڑ کر اسے سہارا دینے کی کوشش کی۔

''میں...... میں ٹھیک ہوں۔'' بازو چھڑاتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ سے میز کا سہارا لیے رکھا۔ پھر کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

تشویش سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ملازمہ نے تیزی سے گلاس میں پانی ڈال کر دیا تھا۔ چند گھونٹ بھرنے کے بعد وہ پیشانی مسلنے لگی تھی۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔

وہ رات بھر سو نہیں سکی تھی۔ اوپر سے پریشانی کے باعث بھوک بھی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ نہ وہ ٹھیک سے ناشتا کر سکی تھی، نہ دوپہر کا کھانا کھا سکی تھی۔ اور جو کھایا تھا، وہ زیادہ دیر پیٹ میں ٹھہر نہیں سکا تھا۔ شدید ڈپریشن اور انزائٹی میں اس کے ساتھ یہی ہوتا تھا۔

چند لمحوں تک وہ میز پر سر ڈالے بیٹھی رہی تھی۔ پھر کسی احساس کے تحت اس نے سر اٹھا کر مسز شیرازی کو دیکھا تھا۔ صد شکر کہ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھیں۔ ورنہ وہ اس کے لیے کتنا پریشان ہو جاتیں۔

گزشتہ رات جو کچھ ہوا تھا اس کا حوالہ اس نے مسز شیرازی کو نہیں دیا تھا۔ وہ عدینہ زبیر سے متعلق پوچھنے کی ہمت نہیں کر پائی تھی۔ نہ اس بات کا شکوہ کرنے کی سکت رکھتی تھی کہ یہ بات اس سے کیوں چھپائی گئی تھی۔ سائرہ خالہ بھی تو اس کی حقیقت چھپا گئی تھیں۔ اس کا ماضی۔ اس کی پہلی طلاق کی وجہ۔ کچھ بھی تو نہیں بتایا تھا انہوں نے۔ پھر وہ شکوہ کرتی بھی تو کیسے؟

یکا یک مسز شیرازی کا موبائل بج اٹھا۔ فارس کی کال تھی۔ وہ ایئرپورٹ سے گھر کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔ اس سے بات کرنے کے بعد مسز شیرازی ایک بار پھر سابقہ کام میں مصروف ہو گئی تھیں۔ وہ صبح سے جانے کیوں کچھ پریشان اور خاموش سی تھیں۔

باہر گھنٹی بجی تھی۔ انٹر کام پر بات کرنے کے بعد اقصیٰ نے مسز شیرازی کے پاس جا کر انہیں کسی خاتون کی آمد کے بارے میں آگاہی دی۔ مسز شیرازی پہلے حیران ہوئیں پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ خانساماں کو ضروری ہدایات دیتی وہ اٹھ کر لاؤنج کی طرف آنے لگی۔ اسی اثنا میں صدر دروازہ کھل گیا تھا۔ ملازم کے ہمراہ داخل ہوتی خاتون پر نظر پڑتے ہی جنت اپنی جگہ پتھر ہو گئی۔

فائزہ چچی۔ ماہین کی امی۔ وہ یہاں! اس کا دل رک سا گیا۔ سانسیں تھم گئیں۔

گھر میں داخل ہوتے ہی ان کی پہلی نظر جنت پر ہی پڑی تھی۔ وہ ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے اس کی طرف بڑھی تھیں۔ بد دعائیں۔ دہائیاں۔ کوسنے دیتے اس پر چلانے لگی تھیں۔ مسز شیرازی کے سامنے۔ وہ اس کی ایک ایک گناہ، ایک ایک غلطی کی پٹاری کھولے اس کے ذات کے پرخچے اڑا رہی تھیں۔ وہ اس پر جھپٹنا چاہتی تھیں، اسے جان سے مار ڈالنا چاہتی تھیں۔ یہ تو اقصیٰ ہی تھی جو ایک دم سے اس کے آگے آئی تھی۔ وہی انہیں پیچھے ہٹاتے ہوئے اسے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور جنت تو یوں تھی جیسے اس میں جان ہی نہ رہی ہو۔

''میری بچی کی خوشیوں کی قاتل۔ اس نے جادو کروایا۔ اس نے۔''

جنت کا ذہن ماؤف ہونے لگا۔ کان سائیں سائیں کرنے لگے تھے۔

آسمان پر کہیں بجلی چمکی تھی۔ بادل بھی گرجے تھے۔ بارش شدت سے برسنے لگی۔ اور وہ دہشت زدہ سی اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔ اس کی ہمت نہ ہوئی وہ مسز شیرازی کی طرف دیکھ لیتی۔ ساری قوت اور سکت جیسے اس ایک لمحے ختم ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ ان کی آنکھوں میں اپنے لیے حیرت، صدمہ، بے یقینی جیسے تاثرات نہیں دیکھ سکتی تھی۔ واحد ہستی جن کی وہ نفرت نہیں سہ سکتی تھی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی رخ نہیں بدلا۔ ایک لمحے کے لیے بھی ان کا چہرہ نہیں دیکھا۔

آنسوؤں سے نم آنکھوں کے ساتھ روتی سسکتی وہ بے اختیاری کے عالم میں صدر دروازہ دھکیلتی باہر نکل گئی۔

موسم اب بھی طوفانی تھا۔ بارش اب بھی برس رہی تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ کیسے رات کی تاریکی جیسا ہو رہا تھا۔ بیرونی دروازہ عبور کر کے فٹ پاتھ پر عجلت میں قدم رکھتے ہوئے وہ آگے بڑھتی گئی۔

یہی ایک رشتہ تھا۔ یہی ایک اعتبار جسے وہ کھونا نہیں چاہتی تھی۔ یہی ایک بے لوث محبت رہ گئی تھی جس سے وہ محروم نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ اس گھر میں ان کی وجہ سے تھی۔ وہ اس گھر میں ان کی وجہ سے رہنا چاہتی تھی۔ مگر یہ کیا ہو گیا تھا؟ کیوں ہو گیا تھا؟ اس کا دل شدت غم سے پھٹنے لگا۔ وہ بے اختیار ہو کر رونے لگی۔

وہ کہاں جا رہی تھی اسے معلوم نہیں تھا۔ وہ کہاں چلے جانا چاہتی تھی اسے اندازہ نہ تھا۔ دماغ مفلوج ہو رہا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جیسے مفقود ہو کر رہ گئی تھی۔

سڑک کراس کرتے وہ کسی گاڑی کے تلے آتے آتے بچی تھی۔ پارک کے اس گوشے میں۔ مسجد کی عقبی سائڈ پر دیوار کے پاس رکتے ہوئے اس کا جی چاہا اب تو وہ چیخ چیخ کر روئے۔ مگر منہ پر ہاتھ رکھے، اپنی چیخوں کا گلا گھونٹتی وہ نیچے بیٹھ گئی تھی۔

ذہن کی اسکرین پر ماضی کسی فلم کی طرح ابھرنے لگا تھا۔ مناظر واضح ہونے لگے تھے۔ زخم ادھڑنے لگے تھے۔ سانسیں تھم رہی تھیں۔ آواز ڈوبنے کو تھی اور درد تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

وہ ماضی۔ اس کا ماضی۔ اس کی غلطیاں۔ اس کے گناہ۔ اس کا احتساب۔

اب کے بجلی لمحے بھر کے لیے چمکی تو دھرتی پر اندھیرے بڑھا گئی۔ سہ پہر کا سورج مکمل غروب ہو چکا تھا۔ بارش ہنوز برس رہی تھی۔

☆☆☆

اس کی زندگی کی دھندلی تصویروں میں کچھ اجنبی شناسا چہرے تھے۔ شناسا اس لیے کہ خونی رشتے تھے۔ اور اجنبی اس لیے کہ اس کی پہچان نہیں رکھتے تھے۔ امی۔ ابو۔ اور حسنین۔ زندگی ان تین لوگوں سے جڑی تھی۔ مگر ان تینوں سے کٹ کر بھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

حسنین اس کا جڑواں بھائی تھا۔ چھ بہنوں کے بعد اس کے ساتھ پیدا ہونے والا کمال جنید کا اکلوتا بیٹا! جس کی پیدائش سے نفیسہ اور کمال جنید کی زندگی میں بہاریں اتر آئی تھیں۔ ہر وقت طعنے اور کوسنے دینے والی دادی کے رویے میں مٹھاس گھل گئی تھی۔ طرح طرح کی باتیں بنانے والے اپنوں اور غیروں کے منہ بھی بند ہو گئے تھے۔ نفیسہ مطمئن تھیں کہ اب دوسری شادی کا موضوع زیر بحث نہیں لایا جائے گا۔ نہ بیٹیوں کے طعنے دیے جائیں گے۔ نہ کمتر سمجھا جائے گا کہ اب وہ ایک بیٹے کی ماں تھیں۔ اور سات بیٹیوں کے بعد ایک بیٹے کی ماں ہونا کوئی چھوٹی بات ہرگز نہیں تھی۔

انہیں اب صرف حسنین یاد تھا۔ خیال تھا بھی تو صرف اس کا۔ اور جنت وہاں کہاں تھی؟ شاید کہیں بھی نہیں! نفیسہ کو تو یاد بھی نہیں رہا تھا کہ انہوں نے حسنین کے ساتھ ایک بیٹی کو بھی جنم دیا ہے۔

حسنین کا نام تو اسی وقت رکھ دیا گیا تھا مگر وہ اپنے وجود کی طرح کتنے ہی دنوں تک بے نام رہی تھی۔ یہ تو نانا تھے جن کی توجہ اس پر پڑی تھی۔ نام بھی انہوں نے خود رکھا تھا اور جانے کیا سوچ کر۔ کیا سمجھ کر وہ اس کی بڑی بہن حفصہ کو خاص طور پر تاکید کر کے گئے تھے کہ وہ اس کا خیال رکھے۔ سدا کی شکر گزار، صبر کرنے والی خاموش طبع حفصہ نے یہ بات جیسے اپنی گرہ سے باندھ لی۔ وہ جنت کے لیے ''ماں'' ہو گئی۔

دودھ اس نے فیڈر کا ہی پیا تھا کہ نفیسہ نے اپنا دودھ پلانے سے انکار کر دیا تھا۔ حسنین کے بعد نہ انہیں اپنا کوئی ہوش رہا تھا نہ گھر کے کسی فرد کا خیال رہا تھا اور جنت تو پھر ننھی بچی تھی۔ جس کی موجودگی کا احساس بھی اس کے رونے کی آواز سے ہوتا تھا۔

زندگی کے ابتدائی پانچ سال اس نے بے فکری کے عالم میں حفصہ کی سنگت میں گزارے تھے۔ ان پانچ سالوں میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ ماں باپ یا دادی میں سے کسی نے اسے پیار کیا ہو۔ یا بلا کر اپنے پاس بٹھایا ہو۔ کچھ کہا ہو۔ یا پھر سنا ہی دیا ہو۔ گھر کی ان تین ہستیوں کی زندگی تو جیسے حسنین سے شروع ہو کر حسنین پر ہی ختم تھی۔

لیکن وہ حساس تھی۔ بلا کی سمجھ دار بھی۔ حسنین کو ہر وقت ماں کے ساتھ دیکھتی تو اس کا بھی دل چاہتا کہ وہ اسے بھی بلائیں۔ اسے بھی پیار کریں۔ اس کے لیے بھی قیمتی کپڑے خریدیں اور ڈھیر سارے کھلونوں کا انبار لگا دیں۔ بچی تھی۔ ناسمجھ تھی۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ جب یہ خواہشات اس کی دوسری بہنوں کی پوری نہیں ہوئی تھیں تو اس کی کیسے ہو جاتیں؟

احساس کمتری میں گھری کمال جنید کی سب ہی بیٹیاں عدم توجہی کا شکار تھیں۔ ماں ایک عورت ہوتے ہوئے بھی ان کا درد، ان کی اذیت، ان کی شخصیت کے خلا کو پر کرنے سے قاصر! شاید پندرہ سالوں کی ذہنی اذیت نے انہیں بھی نارمل نہیں رہنے دیا تھا۔ شاید لوگوں کی زبانوں نے ان سے ان کا ''احساس'' بھی چھینا تھا۔ وہ بس اب ایک بیٹے کی ماں تھیں۔ ایک بیٹے کی ماں ہی رہنا چاہتی تھیں۔

جب حفصہ کی شادی ہوئی تو اس کی عمر چھ سال تھی۔ ہنسی خوشی نئے کپڑوں میں اس نے ہر تقریب میں دلہن بنی حفصہ کی گود معمول کی طرح سنبھالے رکھی تھی۔ لیکن جب رخصتی کا وقت آیا تو اس پر یکایک ہی انکشاف ہوا کہ وہ اسے چھوڑ کر جا رہی ہیں۔

بہت شور مچایا تھا اس نے۔ بہت روئی اور چلائی تھی وہ۔ دلہن بنی حفصہ کے سینے سے چمٹی اس سے جدا ہونے کو بھی تیار نہ تھی۔ اس کی بہنوں نے ہی اسے بمشکل حفصہ سے الگ کیا تھا۔ اسے جھوٹی تسلیاں دلا سے دیے گئے تھے۔ اسے بتایا گیا تھا وہ ابھی جا رہی ہیں، کل آ جائیں گی لیکن وہ پھر کبھی نہیں آئی تھیں۔

حفصہ کے جانے کے بعد اسے احساس ہوا وہ بھری دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی ہے۔ ان کی جدائی سے پیدا ہونے والے اس خلا نے جنت کی شخصیت میں عجیب سے رنگ بھر دیے تھے۔ اب ایمان اسے اپنی ذمہ داری سمجھ کر سنبھال رہی تھی مگر وہ پھر بھی اس کا اس طرح سے خیال نہیں رکھتی تھی جیسے کہ حفصہ رکھا کرتی تھی۔

اس کے معاملے میں بس یہی ضروری سمجھا جاتا کہ اسے وقت پر کھلا پلا دیا جاتا۔ نہلا دھلا کر کپڑے بدل دیے جاتے۔ ہوم ورک کروا دیا جاتا۔ مگر اسے تو محبت و دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ ایمان تو اسے اپنے ساتھ سلاتی بھی نہیں تھی کہ اس طرح اسے نیند نہیں آتی تھی جبکہ اسے حفصہ کے سینے سے لگ کر سونے کی عادت تھی۔

جب سے حفصہ کی شادی ہوئی تھی، وہ گھر کے ایک ایک فرد میں اسے تلاشتی پھر رہی تھی۔ مگر نہ اس کے جیسا کسی کا رویہ تھا۔ نہ اس کے جیسی کسی کی محبت تھی۔

فون پر اس سے بات ہوتی تو رو رو کر اسے واپس آنے کا کہتی اور وہ ڈھیر سارے کھلونوں کا وعدہ کر کے اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتیں۔ دوسرے شہر میں تھیں۔ جلد آ بھی نہ سکتی تھیں۔ دوسری بہنوں سے، خاص طور پر ماں سے بھی کہتیں، وہ حسنین کی طرح اسے بھی کچھ وقت دیں۔ مگر ہمیشہ کی طرح کوئی بھی اس بات کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

☆☆☆

جنت جتنی گم صم، حساس، معصوم اور شریف تھی، حسنین اتنا ہی شرارتی، بدتمیز اور افلاطون قسم کا بچہ تھا۔ لاڈ پیار سے سر چڑھا اور کچھ حد تک بگڑا ہوا۔

گھر میں کمزور صرف جنت ہی تھی تو اس کا بس بھی صرف اس پر ہی چلتا تھا۔ وہ بلاوجہ اس سے لڑ پڑتا۔ کاپیاں پھاڑ دیتا..... ذرا ذرا سی بات پر شکایت لگوا کر ڈانٹ پڑوا دیتا۔ بال کھینچتا۔ کھلونے بھی توڑ دیتا۔ جواباً وہ اسے کچھ بھی کہہ نہیں سکتی تھی۔ اگر کہہ دیتی تو ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ نفیسہ الٹا اسے ہی ڈانٹنے لگ جاتیں۔

''ایک ہی تو بھائی ہے تمہارا، اگر کچھ کہہ بھی دیا ہے تو کیا ہو گیا۔''

اس کی کسی بھی شکایت کو خاطر میں نہیں لایا جاتا تھا، الٹا حسنین کی ان حرکتوں کو انجوائے کیا جاتا۔ اس کی بدتمیزی ایک معصوم سی حرکت محسوس ہوتی۔ اس کی ہٹ دھرمی پر پیار کیا جاتا۔

جنت کو اپنا جڑواں بھائی اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ پہلے اس سے صرف ڈرتی تھی۔ مگر اب نفرت بھی کرنے لگی تھی۔ اس کی تمام تر کوشش یہی ہوتی کہ وہ کسی طرح حسنین سے دور رہے۔ کم نقصان نہیں تھے جو وہ اس کے کر چکا تھا۔ حفصہ جتنے بھی کھلونے اس کے لیے بھیجتیں، وہ انہیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا...... کھیلنے کی نوبت ہی نہ آتی۔

ماں کے غیر منصفانہ رویے سے وہ دن بدن شیر ہی ہوتا جا رہا تھا...... دوسری طرف ساڑھے چھ سال کی جنت اندر ہی اندر سے گھٹ رہی تھی مگر نہ کسی کو بتا سکتی تھی اور نہ ہی اس کی شکایت لگا سکتی تھی کیونکہ وہ سات بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ نفیسہ اور کمال جنید کا اکلوتا بیٹا۔ اس کی ہر غلطی معاف تھی...... اس کی ہر خطا پر درگزر۔ وہ جو چاہے کر سکتا تھا۔ اسے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ اسی لاڈ پیار نے اسے اتنا بگاڑ دیا تھا کہ وہ غصے میں گھر کی چیزیں بھی توڑ دیتا تھا۔ بہنوں سے الجھ پڑتا۔ خاص طور پر جنت اس کے عتاب کا زیادہ نشانہ بنتی تھی۔

اسے وہ دن آج بھی یاد تھا جب حفصہ آپی پورے چھ ماہ بعد لاہور آئی تھیں۔ اس کے لیے گڑیا اور کپڑے بھی لائی تھیں۔ لائی تو وہ بہت کچھ حسنین کے لیے بھی تھیں مگر حسنین سے تو جیسے اس کی خوشی برداشت ہی نہیں ہوتی تھی۔

سنہرے لمبے بالوں والی باربی ہاتھوں میں لیے اس دن وہ بے انتہا خوش تھی۔ بڑے چھوٹے سب ایک دوسرے سے محو گفتگو تھے۔ باتیں ہو رہی تھیں۔ اور وہ گڑیا ہاتھ میں لیے برآمدے میں آ گئی تھی۔ پھر وہیں سے اس نے سیڑھیوں کا رخ تھا۔ اوپر کمرے میں اس کا ٹرنک پڑا تھا۔ حسنین کے عتاب کا شکار ٹوٹے پھوٹے کھلونوں کو ٹیپ سے جوڑ جوڑ کر اس نے وہاں اکٹھا کر رکھا تھا۔ کوئی ایک کھلونا بھی ایسا نہیں تھا جو سلامت رہا ہو۔ اور کوئی ایک کھلونا بھی ایسا نہ تھا جسے اس نے کچرے میں پھینک دیا ہو۔ جو چیز ٹوٹتی تھی، وہ اس کے دل کے زیادہ قریب ہو جاتی تھی۔

وہ سنہرے بالوں والی اس گڑیا کو بھی اپنے اسی ٹرنک میں رکھ دینا چاہتی تھی۔ وہ خود حسنین سے محفوظ نہیں رہتی تھی مگر اپنی گڑیا کو محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔ جانتی تھی اس کا جنونی بھائی اس گڑیا کو بھی نہیں چھوڑے گا۔ چولہے میں جھونک دے گا۔ یا پھر اس کی گردن الگ کر کے۔ اس کی ٹانگیں توڑ مروڑ کر پھینک دے گا......

وہ زیر لب مسکراتی خوشی خوشی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی اور حسنین اس کے پیچھے پیچھے چپکے سے آ رہا تھا......

کسی احساس کے تحت اس نے رک کر پیچھے دیکھا تھا اور پھر خوف سے وہیں تھم کر رہ گئی تھی۔

''جنت! تم نے مجھے اپنی ڈول دکھائی ہی نہیں۔''

جنت کی آنکھوں میں ہراس پھیل گیا۔ گڑیا پر گرفت بڑھ گئی۔ وہ صحیح معنوں میں اپنے اس جنگلی بھائی سے ڈرتی تھی جس کا بس اس پر۔ اور اس کے معصوم کھلونوں پر چلتا تھا......

اور اس لمحے جب وہ چھت کی سیڑھیوں پر...... خاصی بلندی سے اس کے ہاتھ سے گڑیا چھین رہا تھا تو اس وقت اس نے شاید زندگی میں پہلی بار ہمت دکھاتے ہوئے اپنی گڑیا بچانے کی کوشش کی تھی۔ اسی کھینچا تانی کے دوران حسنین نے اس کی گڑیا کو بالوں سے پکڑ کر اس قوت سے کھینچا تھا کہ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی تھی۔ ایسے جیسے سچ مچ میں حسنین نے اس کے بال کھینچ ڈالے ہوں۔ کچھ ایسی ہی تکلیف تھی جو اس کے اندر اٹھی تھی کہ اب گڑیا کا سر حسنین کے پاس تھا اور دھڑ اس کے ہاتھوں میں۔ اور وہ ہنس رہا تھا اس پر، اس کی بے بسی پر۔ اس کا نقصان کر کے اب ہنس رہا تھا۔ پھر وہ گڑیا کا دھڑ ہتھیانے کے لیے لپکا تھا۔

طیش کے عالم میں۔ کچھ غصے اور بے بسی سے اس نے روتے ہوئے حسنین کو خود سے پرے دھکیلا تھا۔ اور تب ہی وہ لڑکھڑایا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے...... بہت اچانک...... کھیل لمحے کا تھا۔ یا پھر لمحے سے بھی کم مدت کا تھا۔

ڈرائنگ روم سے نکلتی نفیسہ کی آنکھوں کے سامنے حسنین سیڑھیوں پر لڑھکتا کچی اینٹوں کے فرش پر جا گرا۔

اس کا سر پھٹ گیا۔ خون بہنے لگا۔ آنکھیں بند ہوئیں اور جسم ساکت ہو گیا۔ نفیسہ کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اور جنت ٹوٹی ہوئی گڑیا اپنے ہاتھوں میں لیے خوف سے تھر تھر کانپتی کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

حسنین موقع پر ہی دم توڑ گیا تھا۔ نفیسہ نیم پاگل سی ہو گئیں۔ وہ بھول گئیں جنت بھی ان کا خون ہے۔ انہوں نے پہلی بار اس پر ہاتھ اٹھایا۔ اتنا مارا کہ وہ مرنے کے قریب ہو گئی۔

''یہ بدبخت کھا گئی میرے بچے کو۔ مار دیا اس نے میرے حسنین کو...... میرے بیٹے کو مار دیا''

محبت تو شاید وہ پہلے بھی نہیں کرتی تھیں۔ مگر ساڑھے چھ سال کی عمر میں اس نے سگی ماں کی شدید ترین نفرت سہی۔ ان کا دماغی توازن درست نہ رہا تھا۔ رات کو روتی تڑپتی باہر بھاگ جاتیں۔ حسنین کی قبر سے لپٹ جاتیں۔ کہیں اور بس نہ چلتا تو جنت پر پل پڑتیں۔

کمال جنید الگ غم سے نڈھال تھے مگر نفیسہ کی نسبت کچھ متحمل تھے مگر پہلے سے زیادہ خاموش ہو گئے تھے۔

انہوں نے پہلے دن جنت پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ مگر اب تو نظر اٹھا کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھتے تھے۔ بہنیں بھائی کو یاد کر کے الگ روتیں...... اور سوچتیں صرف گڑیا ہی تو تھی...... مگر گڑیا ساڑھے چھ سال کی اس بچی کے لیے بہت اہم تھی۔ جس کی زندگی میں پیار محبت اور رشتوں کی بے انتہا کمی تھی۔

’’یہ پیدا ہی کیوں ہوئی؟ یہ پیدا ہوتے ہی مر کیوں نہیں گئی؟ میں نے اس کا گلا اسی وقت کیوں نہ گھونٹ دیا۔‘‘

اور وہ سہمی سہمی، روئی روئی سی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہتی۔ کمرے میں چھپی رہتی۔ ماں اگر پاگل ہو رہی تھی۔ تو نارمل وہ بھی نہ رہی تھی۔

ایک دن تو انتہا ہو گئی تھی۔ نفیسہ نے گلا دبا کر اسے جان سے مارنے کی کوشش کی تھی۔ اگر ایمان بروقت مداخلت نہ کرتی تو شاید وہ ایسا کر بھی گزرتیں۔

انہی دنوں نانا آئے تھے۔ گھر کے معاملات کی خبر انہیں پہلے بھی تھی مگر جب جنت کی حالت دیکھی تو رہا نہ گیا۔ بیٹی پر برس پڑے...... گم صم داماد کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔ پھر اس کا سامان باندھا اور اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

’’یہاں رہے گی تو حسنین کی طرح یہ بھی مر جائے گی۔‘‘

جاتے وقت انہوں نے ایمان سے کہا تھا۔ وہ آنکھوں میں نمی لیے نظریں چرا گئی۔ بھائی کا غم تازہ تھا۔ صدمہ گہرا تھا...... صبر کسی کو بھی تو نہیں آیا تھا۔ اسے کیسے آ جاتا؟ ہر چند اس نے جنت کے لیے نرم ہونا چاہا مگر نہ ہو پائی۔

لاہور سے کوئٹہ کا سفر بے حد خاموشی سے کٹا تھا۔ وہ بیمار تھی۔ ذہنی طور پر بھی نارمل نہ رہی تھی۔ نانا ڈاکٹر تھے۔ اگلے چند دن وہ ان کے کلینک میں زیرِ علاج رہی تھی۔ طبیعت سنبھلی تو وہ اسے گھر لے آئے۔ وہ اتنی خوف زدہ اور ہراساں تھی کہ ان سے بھی ڈرتی تھی۔ بولنا تو اس نے تقریباً چھوڑ دیا تھا۔ کھانا بمشکل کھاتی تھی۔

سوتے میں چیختے ہوئے اٹھ کر بیٹھ جاتی۔ ان کی گرفت میں چلا چلا کر روتی رہتی۔ ہر بار اسے لگتا اماں اسے مار رہی ہیں۔ ہر بار اسے لگتا حسنین سیڑھیوں سے اس کی وجہ سے گر رہا ہے......

نانا کی آغوش میں وہ کچھ سنبھل جاتی۔ نرم رویہ اور محبت سے وہ کچھ بہل جاتی۔ روتے روتے سو جاتی مگر چہرے پر تکلیف دہ تاثرات نیند کی حالت میں بھی ٹھہرے رہتے۔

’’وہ...... میری گڑیا...... توڑنا چاہتا...... تھا۔‘‘ سینے سے لگ کر۔ ان کی قمیص کو مٹھیوں میں بھینچ کر وہ روتی...... ’’میں نے نہیں گرایا تھا۔ وہ خود گر گیا بابا۔‘‘

نانا اس کی ذہنی حالت کے پیشِ نظر کافی پریشان رہے۔ انہوں نے اس کا چائلڈ سائیکاٹرسٹ سے معائنہ کروایا۔ کچھ عرصے تک سیشن ہوتے رہے۔ علاج چلتا رہا۔ رفتہ رفتہ وہ نارمل ہونے لگی۔ مگر راتوں میں اب بھی روتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ جاتی تھی اس کا ذہن بھٹکانے کے لیے، اور زندگی میں اسے مصروف کرنے کے لیے انہوں نے اس کا سکول میں ایڈمیشن کروا دیا تھا۔ کافی حد تک نہ سہی۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ وہ کچھ حد تک ضرور سنبھل گئی تھی۔

☆☆☆

حسنین کی وفات کے دس ماہ بعد کار ایکسیڈنٹ میں کمال جنید کا انتقال ہو گیا تھا۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا نانا اسے اپنے ساتھ لاہور لے کر نہیں گئے تھے۔ وہ سارا وقت ان کے ملازم نور الدین کی بیوی کے ساتھ گھر میں رہی تھی...... وہ بچی تھی۔ نقصان کی اتنی سمجھ نہ تھی۔

کمال جنید نے نہ اس سے محبت کی تھی اور نہ ہی اس کی بہنوں سے...... ہمیشہ غصے سے جھنجلائے ہوئے رہا کرتے تھے۔ جب حسنین پیدا ہوا تھا، تب ہی ان کے چہرے کے تاثرات بدلے تھے اور وہ کچھ نرم ہوئے تھے۔ مگر یہ نرمی۔ خوش اخلاقی۔ اور محبت بھرا رویہ بھی صرف حسنین کے لیے ہی تھا...... وہ سات بیٹیوں کے باپ تھے۔ مگر ان کو خوشی حسنین کا باپ بن کر ہوئی تھی...... جب تک وہ ان کے ساتھ گھر میں رہی تھی۔ اسے یاد نہیں تھا انہوں نے کبھی اس سے پیار کیا ہو یا نام سے پکارا ہو۔ اسے شک تھا شاید انہیں اس کا نام بھی معلوم نہ ہو...... ایسا باپ جب دنیا سے رخصت ہوا تھا تو بس ذرا دیر کے لیے اس نے محسوس کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس نے زندگی میں ایک اہم رشتہ کھو دیا ہے...... یہ احساس تکلیف دہ تھا۔ آنکھوں میں نمی بھی آئی تھی۔ صدمہ بھی پہنچا تھا مگر وہ رو نہیں سکی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ ان کے قریب نہیں رہی تھی۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ ساڑھے سات سال کی ایک کم عمر بچی تھی جسے ابھی ان معاملات کی ٹھیک سے سمجھ نہ تھی یا پھر یہ خیال تسلی بخش تھا کہ اس نے اپنے والد کو سیڑھیوں سے نہیں گرایا تھا۔ والد اس کی وجہ سے نہیں مرے تھے...... مگر باپ کی موت بھی اس کے کھاتے میں لکھ دی گئی تھی۔

وہ حسنین کی موت کی ذمہ دار سمجھی جاتی تھی، اب وہ اپنے باپ کی موت کی بھی ذمہ دار ٹھہرا دی گئی تھی۔

وہ منحوس، بدبخت اس کی ہی وجہ سے اس گھر کی رونقیں قبریں تلے جا سوئی تھیں۔ ساری خطائیں اس کے کھاتے میں تھیں۔ سارے حساب اس کی طرف کھلتے تھے۔

نانا اسے ساتھ لے کر نہیں گئے تھے۔ انہوں نے ان دس ماہ میں اسے اس قدر مشکل سے سنبھالا تھا کہ اب وہ نہیں چاہتے تھے جنت واپس اسی گھر، اسی ماحول میں جائے۔ تب تک نہیں جب تک نفیسہ کا دل جنت کے لیے نرم نہیں ہو جاتا۔ یا وہ اس کے ناکردہ گناہوں کو معاف نہیں کر دیتیں۔

وہ ماں تھیں۔ بیٹے کے قاتل کو معاف نہیں کر سکتی تھیں۔ بیٹا بھی ایسا جو اکلوتا ہو۔ پندرہ سالوں کے طویل انتظار کے بعد زندگی میں آیا ہو...... پھر شوہر کی حادثاتی موت۔ ان کے لیے یہ بڑے گہرے صدمے تھے۔ ابھی تک تو انہیں حسنین کا صبر نہیں آیا تھا تو اس حادثے پر کیسے سنبھل جاتیں؟

نانا کی امی سے فون پر بات ہوا کرتی تھی۔ وہ اب بھی لاہور جایا کرتے تھے۔ اتنا وہ جانتی تھی اس کی ماں پہلے سے بہتر تھی اور

یہ بھی کہ وہ اسے قبولنے کے لیے ہرگز ہرگز تیار نہیں تھیں۔ بہنوں کا خیال تھا، وہ بمشکل سنبھلی ہیں۔ جنت کو دیکھیں گی تو انہیں حسنین یاد آئے گا۔ اور حسنین جسے نفیسہ نہیں بھولتیں۔ اس کا چہرہ یوں جنت کے روپ میں سامنے آئے گا تو وہ حواس کھو بیٹھیں گی۔

نانا کو بھی یہی لگتا تھا...... کہ یہ صورت حال صرف ان کی بیٹی کی نہ تھی۔ نواسی کی بھی تھی۔ جنت اسی طرح کے حالات سے دوچار تھی...... آج بھی وہ سوتے میں اٹھ کر بیٹھ جاتی تھی۔ ڈر جاتی تھی اور انہیں بھی ڈرا دیتی تھی۔

''اپنی ماں کو سمجھایا کرو، جنت کو بد دعا نہ دیا کرے، اولاد ہے اس کی۔ اتنی بری باتیں...... کوئی سگی اولاد کے لیے بھی ایسے سخت الفاظ استعمال کرتا ہے؟''

نانا سمجھتے وہ سو رہی ہے مگر وہ سن رہی ہوتی۔

کبھی وہ اس کی ماں کو ہی سمجھا رہے ہوتے۔ ''تمہاری بیٹی ہے، تمہارا خون۔ تم نے جنم دیا ہے اسے۔ ایسا کب تک چلے گا بیٹا؟ چھوٹی سی بچی ہے وہ۔ کچھ تو رحم کھاؤ اس پر، بچوں کی لڑائی تھی۔ حسنین غلطی سے گر گیا۔ اتنی ہی زندگی تھی اس کی۔'' پھر رک جاتے۔

''غلطی تمہاری بھی ہے۔ تم نے حسنین کو بہت سر چڑھا رکھا تھا۔''

جانے آگے وہ روتے ہوئے کیا کہتیں کہ وہ یک دم چپ ہو جاتے۔ کافی دیر تک چپ ہی رہتے۔ پھر فون بند کر دیتے۔ وہ بھی آنکھیں بند کر لیتی......

تپتی ہوئی دوپہر۔ اماں کی چیخیں۔ مار دھاڑ۔ شور۔ کہرام...... اور حسنین۔ اس کی پیشانی سے پھوٹتا خون...... اور گڑیا کا ٹوٹا ہوا سر۔ کمبل ہاتھوں میں بھینچ کر وہ آنکھیں کھول دیتی۔

''کیا ہوا میرے بچے کو؟'' نانا اسے بانہوں میں بھر لیتے۔

''اسے میں نے نہیں مارا تھا۔'' سینے میں سر دیے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی۔ ''پہلے اس نے مجھے مارا۔ میرے بال کھینچے۔ میری گڑیا کو توڑا۔ میں نے نہیں مارا اسے۔ میں نے نہیں مارا۔''

''جانتا ہوں۔'' نانا تسلی دیتے۔ ''وہ سب غلطی سے ہوا تھا۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔'' وہ ہر بار کہتے...... اس کے ننھے ذہن کی گرہیں سلجھانے کی کوشش کرتے اور یقین دلاتے، وہ صرف ایک حادثہ تھا، جنت کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں...... اور وہ یقین کر لیتی۔ وہ یقین کرنا چاہتی تھی...... مگر اس ''یقین'' سے رشتہ داروں کی اس سے متعلق رائے کبھی نہیں بدلی تھی۔

وہ آئینے میں خود کو دیکھتی، اسے حسنین ہی نظر آتا۔ آنکھیں، چہرے کے خدوخال، شہد رنگ بال۔ جنت کے روپ میں وہ بھی تھا۔ بچپن کا صدمہ ٹراما کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اک خوف۔ وحشت بھرا احساس...... اک پچھتاوا...... وہ اس کے ساتھ تاعمر رہنے والا تھا۔

☆☆☆

نانا کی سنگت میں اس نے بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی کی دہلیز پر قدم جمائے تھے۔ انہوں نے ماضی سے آزاد کر کے اسے سنبھالا دیا تھا۔ آنے والے وقت سے متعلق ممکنہ مسائل اور پریشانیوں کے پیش نظر وہ اسے پہلے سے ہی تیار کرتے رہے تھے۔ جب تک وہ ان کے ساتھ رہی تھی وہ اپنے بچپن کے ماضی کو کس حد تک اپنی زندگی سے نکالنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ وہ اسے یقین دلاتے رہے تھے کہ یہ ایک حادثہ تھا اور وہ اس بات پر یقین رکھ چکی تھی۔

اس عرصے میں اس کی دو بہنوں کی شادیاں ہوئی تھیں مگر وہ کسی ایک کی شادی میں بھی شریک نہ ہو سکی تھی۔

جب طیبہ کی شادی طے ہوئی تو اس کی عمر پندرہ سال تھی۔ پورے نو سال بعد وہ نانا کے ہمراہ شادی میں شرکت کرنے کے لیے آئی تھی۔ لیکن یوں کہ وہ براہ راست اپنی ماں سے نہیں ملی تھی اور نہ ہی انہوں نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ نانا کی وجہ سے ہی وہ کچھ خاموش تھیں۔ یا شاید وقت نے انہیں صبر کی ردا اڑھا دی تھی مگر سب کہتے تھے وہ بہت خاموش رہتی تھیں۔ کسی سے زیادہ بات چیت نہیں کرتی تھیں۔ زندہ ہوتے ہوئے بھی ہوئی زندگی سے کیسے دور ہوتا ہے نفیسہ اس کی زندہ جاوید مثال تھیں۔

بھرے پرے خاندان میں جنت ایک ''اجنبی'' تھی۔ اس کے اپنے تو صرف ''نانا'' ہی تھے۔ اور اسے صرف نانا ہی کافی تھے۔

بظاہر کوئی اسے کچھ کہہ نہیں رہا تھا مگر کھوجتی نگاہوں میں عجیب سا تاثر ضرور جھلکتا تھا۔ اسے شادی کے دوران محسوس ہوتا رہا تھا کہ ماں اسے دیکھتی رہی ہیں۔ اس کے چہرے کے خدوخال میں اپنے حسنین کو کھوجتی رہی ہیں۔ اگر آج حسنین زندہ ہوتا تو وہ بھی اس کی طرح ایک خوب صورت ٹین ایجر ہوتا۔ اور شاید یہی خیال ہی ان کی طبیعت خرابی کا موجب بنا تھا۔

نئے گھر میں، رشتہ داروں سے مل کر، بہنوں سے باتیں کر کے، ان کے ساتھ شادی کی شاپنگ میں مصروف ہو کر اسے بہت اچھا لگا تھا۔ مایوں مہندی کے فنکشن اس نے بہت خاموشی اور دلچسپی سے اٹینڈ کیے تھے۔ یہ نانا ہی کی وجہ سے ممکن ہو پایا تھا کہ اس گھر میں اب بھولے سے بھی ماضی کا قصہ کم از کم کھلے عام نہیں چھیڑا جا رہا تھا...... بہنوں کا رویہ اس کے ساتھ قدرے بہتر تھا۔ تایا، چچا اور پھپھو کی فیملی کا اخلاق بھی کچھ برا نہ تھا۔

خاموشی تھی تو صرف ماں کی طرف سے تھی۔ فاصلے تھے بھی تو صرف ماں کی طرف سے۔ نانا نے منع کیا تھا تب ہی وہ چپکے چپکے سے، دور دور سے ہی انہیں دیکھ لیا کرتی تھی مگر ان کے سامنے آنے سے گریز کرتی تھی۔ نفیسہ کی آنکھوں سے جو نفرت جھلکتی تھی اس کی پہچان اسے بہت اچھی طرح تھی۔

☆☆☆

بارات والے دن وہ سیاہ اور سنہری کامدار فراک میں اس قدر حسین لگ رہی تھی کہ دیگر کئی چچا زاد، تایا زاد اور پھپھو زاد بھی

اچانک سے حاضر ہو جانے والی اس کزن پر فدا ہوئے تھے۔

مگر وہ تو جیسے برھان کی تھی۔ برھان کے لیے ہی بنائی گئی تھی۔

برھان جنید! اس کے بڑے تایا کا اکلوتا بیٹا تھا...... پانچ سال بڑا تھا اس سے۔ خاندان بھر کا لاڈلا اور ہونہار سپوت۔

آتے جاتے، وہ کہیں نہ کہیں اسے روک لیتا۔ کوئی نہ کوئی سوال جھاڑ کر، اس کے سخت ردعمل کو انجوائے کرتا...... وہ لفٹ نہیں کروا رہی تھی۔ نہ اسے۔ نہ اپنے خاندان کے کسی بھی کزن کو...... مگر دل ہی دل میں وہ برھان کی شخصیت اور وجاہت سے متاثر ضرور ہوئی تھی۔

جب وہ ایف ایس سی کے ایگزامز سے فارغ ہوئی تو تایا نے برھان کے لیے اس کا رشتہ مانگ لیا تھا۔ گو کہ تائی اس رشتے سے ہرگز خوش نہیں تھیں مگر بیٹے کی پسند کے آگے مجبور ہو گئی تھیں۔ نانا کو بظاہر سب ٹھیک لگا۔ برھان خوش شکل اور پڑھا لکھا تھا۔ اپنی یونیورسٹی کا ٹاپر تھا۔ اس کا برائٹ فیوچر تھا۔ ادب آداب، تمیز و تہذیب۔ انہوں نے سوچ و بچار کے لیے زیادہ وقت نہ لیا اور ہاں کر دی۔ سادگی سے نکاح کر دیا گیا مگر رخصتی جنت کی پڑھائی ختم ہونے تک کے لیے ملتوی کر دی گئی۔

ان ہی دنوں اسے برھان کو جاننے کا موقع ملا تھا۔ فون پر بات چیت ہوئی۔ تو وہ بھی اس سے محبت کرنے لگی۔ نانا کے بعد اس کی زندگی میں آنے والا وہ دوسرا مرد تھا جس سے اس نے خالص محبت کی تھی۔ نانا کے بعد اب وہی اس کا سب کچھ تھا۔

زندگی میں بظاہر سب ٹھیک ہی چل رہا تھا کہ نانا ہارٹ اٹیک کے بعد اچانک ہی دنیا سے چل بسے تھے۔ وہ یونیورسٹی کے فرسٹ ایئر سمسٹر سے فارغ ہوئی تھی کہ اتنا بڑا دھچکا لگا۔ اس کی دنیا تو جیسے ویران ہو گئی...... پڑھائی کو خیرباد کہہ کر اسے فوراً ہی لاہور سائرہ خالہ کے پاس جانا پڑا۔ نانا انہیں وصیت کر کے گئے تھے سو انہوں نے اسے اپنی ذمہ داری سمجھ لیا تھا۔

جنت کو اس صدمے سے نکل کر سنبھلنے میں کچھ وقت لگا تھا۔ دو ماہ بعد ہی تایا نے رخصتی پر زور دینا شروع کر دیا تھا۔ نانا اس کی شادی کی وصیت کر گئے تھے مگر وہ فی الوقت اس کے لیے تیار نہ تھی۔ اس سے بڑی دو بہنیں گھر بیٹھی تھیں مگر نفیسہ کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ بھی جیسے یہی چاہتی تھیں کہ وہ جلد از جلد اپنے گھر کی ہو جائے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ رخصت ہو کر برھان کے گھر چلی گئی تھی۔

زندگی نئی ڈگر پر چلنے لگی تو نئے گھر میں نئے رشتوں کو اس نے اپنا بنا لیا گو کہ تائی کے ساتھ ساتھ برھان کی بہنوں کا رویہ بھی اس کے ساتھ خوش گوار نہیں تھا مگر اس نے جیسے برھان کی محبت کو ہی اپنا سب کچھ مان لیا تھا۔ نانا صبر اور عزم کا سبق پڑھا کر گئے تھے اسے۔ تبھی وہ ان کے رویوں سے دل برداشتہ نہیں ہوئی تھی۔

وہ پڑھائی مکمل کرنا چاہتی تھی۔ برھان نے اسے نہ روکا۔ نانا کی جدائی کا زخم کبھی مندمل نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر زندگی نے خوشیوں

بھرے لمحات دیے تو وہ بھی جینے کی کوشش کرنے لگی۔

اور یہیں سے ایک کڑی آزمائش کا آغاز ہوا تھا۔

☆☆☆

شادی کے تین سال گزر جانے کے باوجود وہ ماں نہیں بن سکی تھی۔ اس کے بانجھ پن کی وجہ ڈاکٹرز کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ مرض لاعلاج ہو تو جواب دے دیا جاتا ہے۔ اسے بھی جواب دے دیا گیا تھا۔

اس رات وہ گھر آ کر بہت روئی تھی۔ برھان کتنی دیر تک اسے سمجھاتا بجھاتا رہا تھا، تسلی دلاسے دیتا رہا تھا۔ وہ اسے شہر کی بہترین گائناکالوجسٹ کے پاس لے جانے کی بات کر رہا تھا۔ وہ اسے علاج کی یقین دہانی کرا رہا تھا۔

''تم نے سنا نہیں، وہ ڈاکٹر کیا کہہ رہی تھی! وہ میرے لیے کوئی علاج تجویز نہیں کر سکتی۔'' رو رو کر اس نے اپنی حالت خراب کر لی تھی۔

''سوچو جنت! آج کون سی ایسی بیماری ہے جس کا علاج سائنس دریافت نہیں کر سکی؟''

''بانجھ ہونا ایک بیماری نہیں ہے...... بانجھ ہونا ایک حقیقت ہے۔''

وہ مایوسی کے اندھیروں میں اتنا غرق ہو چکی تھی کہ اسے اللہ کی ذات نظر آ رہی تھی، نہ اپنی تخلیق کی حقیقت سمجھ آ رہی تھی۔ ذہن خالی سا ہو گیا تھا۔ برھان کی کوئی دلیل، کوئی حجت اس کا غم ہلکا نہ کر سکی۔ اسے امید نہیں دلا سکی۔ یقین نہ سکھا سکی۔

یکے بعد دیگر شہر کے کئی بڑے ہاسپٹلز سے اس کے ٹیسٹ ہوئے۔ ہر ٹیسٹ کی ایک ہی رپورٹ تھی۔ ایک ہی حقیقت تھی جس کا احاطہ مختلف ڈاکٹرز نے اپنے مخصوص انداز میں کیا تھا۔

''میں ہی کیوں؟ میرے ساتھ ہی کیوں؟'' وہ اپنی پوری زندگی میں کبھی اتنا نہیں روئی تھی جتنا کہ اس رات روئی تھی۔ اس کے آنسو تھم ہی نہ رہے تھے، دل سنبھل ہی نہ رہا تھا۔ یہ محرومی اس کے لیے کیوں؟

اٹھتے بیٹھتے آتے جاتے اب اسے اپنی سسرال میں ساس اور نندوں سے طعنے سننے کو ملنے لگے تھے۔ نقص اس میں تھا تو عتاب کا نشانہ بھی وہی بن رہی تھیں۔ دوسری شادی کا ذکر بھی بار بار اس کے سامنے ہی چھیڑا جا رہا تھا۔ برھان اکلوتا بیٹا تھا اور تائی اپنے پوتے پوتیوں کو گود میں کھلانے کا خواب آنکھوں میں بسائے مزید انتظار کے حق میں نہیں تھی۔ وہ بس اب جلد از جلد برھان کی دوسری شادی کر دینا چاہتی تھیں۔ مگر برھان تھا کہ مان ہی نہ رہا تھا۔ وہ کسی طور بھی دوسری شادی کا سوچ ہی نہ رہا تھا۔ اسے اولاد کی کوئی جلدی نہ تھی۔ نہ پریشانی تھی نہ کوئی فکر۔ پروا تھی تو صرف جنت کی۔ قدر تھی تو صرف اس کے احساسات کی۔

''اگر میرے نصیب میں اولاد لکھی ہے تو وہ مجھے جنت سے بھی ہو سکتی ہے۔'' وہ اکثر کہہ دیتا۔

''بانجھ ہے وہ بانجھ...... ماں نہیں بن سکتی۔'' تائی دن میں ہزار بار دہرایا جانے والا جملہ اس کے سامنے بھی دہرا دیتیں۔

وہ چپ ہو جاتا۔ کبھی غصہ کرتا۔ کبھی جھنجھلا کر اٹھ جاتا۔ وہ ان سے کوئی بحث نہیں کر سکتا تھا۔ رپورٹس دکھا کر ان کی رائے نہیں بدل سکتا تھا۔

تائی نے دل کی بیماری سینے سے لگائی اور بستر پر پڑ گئیں۔ رو رو کر اپنا حشر الگ خراب کیا۔ برہان کو اپنی زندگی موت کے واسطے دیے۔ جذباتی بلیک میل کیا مگر وہ پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ کوئی بھی ایسا کام کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا جس سے جنت کے جذبات مجروح ہوتے ہوں۔

اس کی محبت دیکھ کر جنت ایک لمحے کے لیے خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکیوں میں شمار کرتی اور پھر اپنی محرومی کو سوچ کر بدقسمت ترین میں شامل ہو جاتی۔ وہ خود ''ناقص'' تھی۔ وہ برہان کو ''کامل'' کیسے کرتی؟ وہ خود ''محروم'' تھی۔ وہ اس کی ''عطا'' کیسے بنتی؟

گھر میں ٹینشن بڑھنے لگی۔ تائی امی کا رویہ اس کے ساتھ ہتک آمیز ہو گیا۔ اب اس کا، ماضی زیر بحث لایا جانے لگا۔ اس کے باپ اور بھائی کا ذکر چھیڑے جانے لگا۔ اس کی بدنصیبی اور بدبختی کے سائے اس گھر کی خوشیوں پر محسوس کیے جانے لگے۔

بہت مجبور اور بے بس ہو کر برہان نے بالآخر گھر والوں کے آگے سر جھکایا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ کر لوں گا دوسری شادی مگر ابھی نہیں۔ آپ کچھ انتظار کر لیں، جنت بہت اپ سیٹ ہے، میں اسے مزید دکھ نہیں دینا چاہتا۔''

جنت کی آنکھیں کرب سے نم ہو گئیں۔ گویا وہ ارادہ کر چکا تھا مگر اسے کچھ وقت درکار تھا۔

کیا وہ وقت جنت کے زخم کا مداوا کر سکتا تھا؟ کیا وہ وقت جنت کے نقص کو پورا کر سکتا تھا؟ برہان کو وقت کیوں چاہیے تھا؟ جب ارادہ کر ہی لیا ہے تو پھر یہ انتظار کیوں؟ یہ انتظار کس لیے؟

''اے ہے اور کتنا انتظار کروں؟ پانچ سال کا انتظار کم ہے کیا؟'' فضیلہ تائی کا پارہ ہی چڑھ گیا۔ ''میرا بھی جی چاہتا ہے اپنے پوتے کو گود میں لوں۔ اسے اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں، جانے کتنے دن باقی ہیں زندگی کے......''

وہ جانے اور کیا کہہ رہی تھیں، اس نے نہیں سنا، برہان کو ذہنی طور پر تیار کرنے کے لیے وہ اسے مزید کیا حجتیں اور دلیلیں دے رہی تھیں، اس نے نہیں جانا...... جان بھی لیتی تو کیا کر لیتی؟

☆☆☆

اس رات برہان کافی تاخیر سے کمرے میں آیا تھا۔ وہ بیڈ پر گھٹنوں کو سینے سے لگائے، ان کے گرد بازو باندھے کسی مجسمے کی

طرح خاموش اور ساکت بیٹھی تھی۔ اس کی دودھیا رنگت کملا کر رہ گئی تھی۔ روشن چمکتی آنکھوں کے دیے بجھ گئے تھے، ان کے نیچے حلقوں کے اندھیرے تھے۔

وہ اس کے برابر میں بیٹھ گیا تھا۔

''جنت۔'' اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر، اس نے پکارا تھا۔ وہ ایک بار پھر سسک پڑی۔

''یہ تم نے اپنی کیا حالت کر لی ہے یار!''

جانتی تھی وہ اس سے شدید محبت کرتا تھا، وہ اسے کسی بھی صورت اس حالت میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایک محبت اس کی بھی تھی۔ جو شراکت داری برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ تو برہان کی فیمیل کولیگز سے بھی جیلس ہو جایا کرتی تھی کجا کہ اس کی دوسری بیوی۔ جس نے برہان کی زندگی میں آنا تھا...... اس کا نام لینا تھا۔ اس کے بچے کی ماں بھی بننا تھا۔ اس کی ہمت وہ کہاں سے لائے؟ اس کا حوصلہ وہ کہاں سے لائے؟ یہ اذیت زیادہ بڑی تھی۔ یہ زخم زیادہ گہرا تھا۔

''میری ایک بات غور سے سنو جنت۔'' محبت بھرے لہجے میں ایک عزم تھا۔ ایک عہد۔ ایک یقین۔ ''میری زندگی میں جو تمہاری جگہ ہے، اسے کوئی اور نہیں لے سکتا۔''

کمرے میں جلتے واحد بلب کی روشنی تیز ہوئی تھی۔

''محبت میں نے صرف تم سے کی ہے، اور صرف تم سے ہی کرتا رہوں گا۔'' وہ اس کے ہاتھ پر گرفت مضبوط کیے بہت مان سے کہہ رہا تھا۔

''ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔ ہمارے درمیان کبھی کوئی فاصلہ نہیں آئے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔'' وہ یقین دہانی کراتے ہوئے اسے آئندہ کل کے لیے تیار کر رہا تھا۔

''میں کل بھی تمہارا تھا، آج بھی تمہارا ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔''

اور جنت بنت کمال...... اپنی محرومی پر اس کی محبت کی ردا چڑھائے...... اس کے ایک ایک لفظ پر ایمان لے آئی تھی۔ لڑکپن سے لے کر آج تک اس نے یہی تو کیا تھا۔ اسے اب بھی یہی کرنا تھا۔

وہ تائی کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بہت خواب تھے۔ امیدیں تھیں گھر بھر کے لوگوں کی اس کے لیے۔ اس کے بچوں کے لیے۔ وہ یہ ظلم اس پر نہیں ہونے دے سکتی تھی۔ جس سے محبت ہو، اس کی خوشیاں اپنی ذات سے بڑھ کر عزیز ہوتی ہیں۔ اسے بھی وہ بہت عزیز تھا۔ تب ہی نصیب کے آگے سر جھکاتے ہوئے اس نے دل پر بھاری پتھر رکھ لیا تھا۔ تب ہی اس کے وعدوں پر بھروسا کر کے دوسری شادی کے لیے راضی ہو گئی۔

☆☆☆

جس روز برہان کا نکاح تھا اس روز اس کی تمام تر ہمت جواب دے گئی تھی۔ وہ کمرے میں تیار ہو رہا تھا اور اس نے روتے سسکتے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

''مت جاؤ برہان! میں مر جاؤں گی۔''

اس کے ہاتھ تھام کر، اسے بیڈ پر بٹھاتے ہوئے وہ اس قدموں میں بیٹھ کر اسے ایک بار پھر سمجھا رہا تھا۔ اور وہ سمجھ نہیں رہی تھی۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے جا رہی تھی۔

کیا اس نے اپنی پوری زندگی میں کبھی اس وقت کو بھی سوچا تھا؟ اذیت پر مشتمل ان لمحوں کا گمان کیا تھا؟ برہان کی زندگی میں کوئی اور آئے گی اور وہ اسے آنے دے گی؟ کچھ کر ہی نہ سکے گی؟ وہ گھڑی جب محبت کا واسطہ بھی کام نہیں آئے گا؟

''تم تیاری کرو میں تمہیں حفصہ آپی کے گھر ڈراپ کر دیتا ہوں، واپسی پر پک کر لوں گا۔''

''نہیں، مجھے کہیں نہیں جانا۔ یہیں بیٹھ کر تمہارا انتظار کرنا ہے۔''

''جنت ضد مت کرو!''

''میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔'' وہ حواسوں میں نہیں لگ رہی تھی۔ ناچار اسے حفصہ آپی کو فون کرنا پڑا تھا۔ اس کی نہ نہ کے باوجود وہ اسے زبردستی اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔

شدت سے روتے ہوئے کچھ بے قابو ہو کر وہ اس رات امی کے گھر چلی آئی تھی۔ وہ ان سے ملنا چاہتی تھی۔ ان کے گلے لگنا چاہتی تھی۔ ان کے قدموں میں گرنا چاہتی تھی۔ مگر ہانیہ نے اسے ڈرائنگ روم سے آگے ان کے کمرے تک جانے نہیں دیا تھا۔

''وہ تم سے نہیں ملیں گی۔''

''صرف ایک بار۔ صرف ایک بار۔ مجھے ان سے بات کرنی ہے۔''

کھٹاک کی آواز کے ساتھ نفیسہ کے کمرے کا دروازہ مقفل ہو گیا تھا۔ ایسا پہلے بھی ہو چکا تھا۔ کئی بار ہو چکا تھا۔ وہ جب بھی آتی تھی، یہی ہوتا تھا۔ نفیسہ اس کی شکل تک نہ دیکھنا چاہتی تھیں۔ وہ خود کو کمرے میں بند کر لیتی تھیں۔

ہانیہ کو راستے سے ہٹا کر وہ ان کے بند کمرے کا دروازہ زور زور سے بجانے لگی تھی۔ ہمیشہ کی طرح۔ کچھ اذیت...... کچھ دکھ...... کچھ کرب اور بے بسی کے ساتھ۔

''مجھے دعا دے دیں امی! مجھے ایک دعا دے دیں۔ صرف ایک بار میرے لیے ہاتھ اٹھا لیں۔ صرف ایک بار۔ امی...... امی......!'' وہ روتے ہوئے ان کی منتیں کر رہی تھی۔ گڑگڑا رہی تھی۔ ''مجھے مار لیں۔ میرا منہ نوچ لیں۔ میری جان نکال لیں۔ لیکن

یہ نہ کریں۔ پلیز یہ نہ کریں۔''

مگر دوسری طرف ہمیشہ کی طرح خاموشی چھائی رہی تھی۔

''اللہ کے لیے دروازہ کھول دیں امی۔ مجھے آپ کی ضرورت ہے...... بہت ضرورت ہے۔'' روتے بلکتے وہ گھٹنوں کے بل گر سی گئی۔

''ان کی طبیعت خراب ہو جائے گی جنت۔ اب جاؤ یہاں سے۔'' ہانیہ نے اسے کندھوں سے پکڑ کر وہاں سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس نے ہاتھ جھٹک دیے تھے۔ دروازے کو پکڑ لیا تھا۔

''آج اس کا نکاح ہے۔ امی!'' سسکیوں کے بیچ وہ بمشکل کہہ پائی۔ ''میں ابھی تک ماں نہیں بن سکی تو اس لیے۔ وہ دوسری شادی کر رہا ہے۔''

لب بھینچ کر، آنکھیں رگڑ کر اس نے دروازے پر دستک دی۔ ''امی! آپ سن رہی ہیں مجھے؟''

بہت پیار، بہت محبت اور لجاجت سے وہ دروازے سے لگ گئی تھی۔ ''امی میں اس وقت صرف چھ سال کی تھی۔'' اس کا گلا بیٹھا ہوا تھا۔ گلوگیر آواز کمزور سی تھی۔ ''صرف چھ سال کی تھی امی!'' جسم لرز رہا تھا۔ دل تڑپ رہا تھا۔ آنکھیں بار بار بھیگ رہی تھیں۔ وہ کسی ننھے معصوم بچے کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر اپنی صفائی دے رہی تھی۔ ''میں نے اسے نہیں مارا تھا۔ میرا یقین کریں۔ میں نے اسے۔'' اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ''مجھے معاف کر دیں۔ اللہ کے لیے۔ مجھے معاف کر دیں۔ مجھے دعا دے دیں۔ دیکھیں نانا بھی نہیں رہے۔ برہان بھی نہیں رہے گا۔ میں اکیلی رہ جاؤں گی۔ امی اللہ کے لیے۔ صرف ایک دعا۔ میرے لیے صرف ایک دعا۔''

لیکن دعا نہیں ملی۔ دروازہ بھی نہ کھلا۔ ہمیشہ کی طرح اس رات بھی حفصہ آپی اسے زبردستی وہاں سے اٹھا کر لے گئی تھیں۔

برہان بار بار فون کر رہا تھا۔ اس کی خیریت معلوم کرنا چاہ رہا تھا۔ مگر اس نے فون پر اس سے بات نہیں کی تھی۔ نیند کی گولی لے کر آرام کرنا چاہا مگر اس کی بے چینی اور بے قراری میں کسی صورت افاقہ نہیں ہوا تھا۔

اگر جو یہ نقص اس کی زندگی میں نہ ہوتا؟ اگر جو یہ محرومی اس کا مقدر نہ ہوتی؟ اس نے لاکھ کوشش کی واپس گھر جانے کی مگر حفصہ آپی نے اسے جانے نہ دیا۔

یہ بھی برہان کی ہی خواہش تھی کہ وہ کچھ روز ان کے یہاں ہی ٹھہرے۔ فضیلہ تائی گھر کو سجا رہی تھیں۔ نئی دلہن کا کمرہ سیٹ ہو رہا تھا، دیگر رسمیں ادا ہو رہی تھیں، اس صورت میں وہ جنت کو وہاں نہیں لانا چاہتا تھا۔ البتہ آفس سے واپسی پر وہ روز ہی اس کے پاس آتا تھا، محبت کا یقین دلاتا تھا، اس کا خوف، اس کے خدشات کو ختم کرنے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ جب تک وہ پاس ہوتا وہ ہر ایک بات پر یقین کرتے ہوئے ہلکی پھلکی سی ہو جاتی۔ صرف یہ احساس کہ برہان صرف میرا ہے، اسے تمام خدشات سے مبرا کر دیتا۔

ہمت جگا دیتا۔ حوصلہ بڑھا دیتا۔ اور جوں ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوتا تنہائی اسے سانپ کی طرح ڈسنے لگتی۔ محرومیاں نئے سرے سے سر اٹھاتیں اور وہ خود اذیتی کی دلدل میں دھنستی چلی جاتی۔

یہ اذیت، یہ دکھ، یہ کرب، یہ محرومی میری زندگی میں کیوں؟ وہ سوچتی اور رو دیتی۔

☆☆☆

برھان کی شادی دھوم دھام سے سر انجام پا گئی تھی۔ ولیمہ کے بعد ہی وہ اسے اگلے روز ہی لینے آ گیا تھا۔ حفصہ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھائے کافی دیر تک کچھ کہتی رہی تھیں اور وہ انہیں تسلی دیتا رہا تھا۔ وہ ان کی بہن کو جان سے بھی بڑھ کر چاہتا تھا۔ اسے تکلیف دینے کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ ہر طرح سے اس کا خیال رکھنے کی یقین دہانی کروا رہا تھا۔

تیار ہو کر جب وہ نیچے آئی تو برھان اسے بہت فریش اور نکھرا نکھرا سا لگا۔ جینز پر سفید شرٹ میں ملبوس، بال سلیقے سے جمے ہوئے، کلائی پر قیمتی گھڑی۔ وہ اپنی مکمل تیاری میں ہمیشہ کی طرح بہت اچھا لگ رہا تھا۔ جنت پر نظر پڑتے ہی اس کے آنکھوں کی چمک بڑھی تھی۔ وہ اٹھ کھڑا تھا۔ حفصہ آپی نے انہیں دعاؤں کے سائے تلے رخصت کیا تھا۔

ڈرائیونگ کے دوران وہ اس سے ہلکی پھلکی باتیں کرتا رہا۔ معمول کے مطابق۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ جیسے کوئی تیسرا فرد ان کی زندگی میں آیا ہی نہیں۔

یہاں سے وہ سیدھا اسے ریسٹورنٹ لے کر گیا تھا۔ اس کی من پسند ڈشز کا آرڈر دے کر وہ میز پر اس کی طرف جھکا تھا۔

''کیا خیال ہے لنچ کے بعد شاپنگ پر چلیں؟'' وہ شاید اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتا تھا۔

جنت اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کا برھان تھا۔ وہ ذرہ بھر نہیں بدلا تھا۔ اس کی زندگی میں جنت کی وہی اہمیت تھی۔ وہی مقام تھا۔ وہ اس سے آج بھی اتنی ہی محبت کرتا تھا۔

''تم نے میرے لیے بہت بڑی قربانی دی ہے جنت! میں تمہارا یہ احسان کبھی چکا نہیں پاؤں گا۔'' لنچ کے بعد جب وہ گاڑی کی طرف جا رہے تھے تو اس نے کہا تھا۔ اللہ نے اگر مجھے اولاد سے نوازا تو ان پر تمہارا بھی اتنا ہی حق ہو گا جتنا میرا یا ماہین کا۔''

وہ خاموش ہو گئی تھی۔ اولاد کا ذکر ایسے ہی اس پر جمود طاری کر دیتا تھا۔

شاپنگ بیگز ہاتھوں میں پکڑے جس لمحے وہ برھان کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی، نگاہ سیدھی ماہین پر گئی۔

سرخ کامدار جوڑے میں ملبوس، نک سک سے تیار نئی نویلی دلہن اس سے بہت خوش اخلاقی سے ملی تھی۔ البتہ فضیلہ تائی کے تیور کچھ بگڑے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ انہیں برھان کا شادی کے دوسرے روز ہی جنت کو وقت دینا بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

جنت معذرت چاہتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف گئی تو برھان بھی اس کے پیچھے چلا گیا تھا۔

لاؤنج میں سامنے بیٹھی ماہین کے چہرے پر ایک تاریکی سی چھا گئی۔ سرتاج نے تو نظر بھر کر اسے دیکھا تک نہ تھا۔ حالانکہ وہ اپنی ساس کے کہنے پر اس کے لیے کتنے شوق سے تیار ہو کر بیٹھی تھی۔

فضیلہ تائی بھی سارا وقت اندر ہی اندر جلتی کڑھتی رہی تھیں۔ انہوں نے تو ماہین سے بھی کہہ دیا تھا۔

''صبر سے کام لینا بیٹی! غلام ہے یہ جنت کا، وقت لگے گا پر وہ تمہارا بھی ہو جائے گا، آخر تم اسے بچہ دو گی۔'' اپنی بہو کا اڑتا رنگ انہوں نے بھانپ لیا تھا۔ ماہین بدقت مسکرا دی تھی۔ مگر اس کی آنکھوں میں کچھ تھا۔ کوئی ایسا تاثر جو شعلہ بن کر لہرا رہا تھا۔

☆☆☆

شادی کے بعد برھان اپنے حقوق و فرائض کا اسی طرح سے خیال رکھ رہا تھا جیسے وہ شادی سے قبل رکھا کرتا تھا۔ مجبوری تلے دبی جنت کے لیے صورت حال کچھ ایسی تھی کہ اسے بھی سمجھوتہ کرنا پڑا تھا۔ وہ ماہین کو پسند نہیں کرتی تھی، نہ ہی کر سکتی تھی مگر پھر بھی وہ اس کے کسی بھی معاملے میں دخل اندازی نہیں کرتی تھی۔ وہ اسے اس گھر میں مکمل طور پر اس طرح سے نظر انداز کرتی تھی جیسے وہاں اس کا وجود ہے ہی نہیں۔ جس ذہنی اذیت سے وہ روز گزرتی تھی اس لحاظ سے یہ خیال اس کے لیے بہتر بھی تھا۔

شروع کے دو ماہ سب ٹھیک رہا تھا۔ نہ برھان کے رویے میں تبدیلی آئی تھی۔ نہ محبت میں کمی واقع ہوئی تھی۔ وہ آج بھی اسے شدتوں سے چاہتا تھا۔ اور اس وقت۔ تہی دامن جنت کے لیے برھان کی محبت آب حیات سے کم نہ تھی......لیکن جب ماہین امید سے ہوئی تو جہاں اس کی سوئی ہوئی اذیتیں جاگ اٹھیں وہاں برھان کا دل بھی بدل گیا۔ ماہین پہلے اس کی صرف بیوی تھی۔ اب وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اس کا اسٹیٹس اونچا ہو رہا تھا۔ وہ اس کے دل میں اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہو رہی تھی۔ وہ زیادہ وقت ماہین کو دینے لگا تھا۔ اس کی پسند ناپسند کا خیال رکھنے لگا تھا۔

پہلے احساسات میں فرق آیا پھر ترجیحات بدلنے لگیں۔ شادی کے پانچ سال اس نے صرف جنت کے نام کیے تھے۔ اب وہ کچھ وقت خالص اپنے بچے کی ماں کے لیے بھی نکالنا چاہتا تھا۔ اور یہیں سے فاصلے بڑھے تھے۔ دوریوں کا آغاز ہوا تھا۔ یہیں سے بدگمانیاں اٹھی تھیں اور شکووں کا آغاز ہوا تھا......

اور پھر رفتہ رفتہ سب بدل گیا تھا۔ جذبات، احساسات اور ترجیحات بھی۔ جانے کیسے وہ نظروں میں رہ کر بھی نظروں سے اوجھل ہوئی۔ جانے کیسے برھان کی محبت جب آزمائش کی بھٹی سے گزر کر نکلی تو پھر۔ محبت نہ رہی۔

☆☆☆

وہ سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ کندھے مایوسی کے بوجھ تلے جھکے ہوئے تھے۔ آنکھیں بے بسی کے احساس سے نم ہو رہی تھیں۔ اس کا رخ کچن کی طرف تھا اور کچن سے برھان واصف کی آواز آ رہی تھی۔

”کیسی باتیں کرتی ہو ماہی! تم نے تو مجھے مکمل کر دیا ہے۔“

وہ جو پانی پینے کی غرض سے کچن کے اندر جا رہی تھی، اس کا یہ جملہ سن کر دروازے میں ہی رک گئی تھی۔ کاؤنٹر ٹیبل کے اس طرف۔ ماہین کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ مسکراتا ہوا پرکشش چہرہ......اور براؤن آنکھوں کی چمک۔ کتنا خوش لگ رہا تھا وہ......کتنا مکمل لگ رہا تھا ماہین کے ساتھ۔

”آئندہ ایسی باتیں مت کرنا! بہت اہم ہو تم میرے لیے۔“

”صرف اہم ہوں؟ پیار نہیں کرتے آپ مجھ سے؟“ وہ جنت کو دروازے میں دیکھ چکی تھی۔ اور بڑی لگاوٹ سے پوچھ رہی تھی۔

”اہم وہی ہوتے ہیں جن سے محبت ہوتی ہے۔“

اسے پتھر نہیں ہونا تھا مگر وہ ہو گئی تھی۔

محبت کا اعتراف! ہاں یہ محبت کا اعتراف ہی تھا۔ ماہین سے شادی کے پورے چھ ماہ بعد۔ یہ محبت کا اعتراف تھا۔ وہ جس کی پہلی اور آخری محبت ”جنت“ تھی، اب اس کی کل ”محبت“ اس کے بچے کی ماں ہو گئی تھی۔

”ہاں میں جانتی ہوں، آپ کی محبت ہی تو میرا سہارا ہے۔“ خوش دلی سے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھری تھی۔

ماہین کو اپنے بازو کے حصار میں لیتے ہوئے اس نے آہستہ سے رخ بدلا تھا اور تب اس کی نگاہ جنت پر پڑی، ایک لمحے کے لیے وہ رک سا گیا......ماہین کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹا تھا۔ یونہی غیر ارادی طور پر......

اس کی یہ حرکت......ماہین کو تاؤ دلا گئی۔

”ارے جنت! تم کب آئیں، ہمیں پتا ہی نہ چلا۔“ اپنے تاثرات کو نرمی میں ڈھالتے ہوئے اس نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔ برھان کے سامنے اس کا لہجہ ہمیشہ مٹھاس لیے ہوئے ہوتا تھا۔

وہ جو یہاں پانی پینے آئی تھی، غم پر ہی اکتفا کر کے پلٹ گئی۔

تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر جب وہ کمرے میں آئی تو اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔

اس نے دروازہ بند کر دیا مگر لاک نہیں لگایا۔ وہ چاہتی تھی جب برھان اس کے پیچھے آئے تو اسے دروازہ بند نہ ملے۔

اب وہ بھاری دل کے ساتھ بیڈ پر بیٹھی تھی۔ بے قراری سے انگلیاں چٹخا رہی تھی۔ آنسو تھے کہ بہے جا رہے تھے، دل تھا کہ رکا جا رہا تھا۔۔

نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی؟ محض چند ماہ کے اندر اندر؟ وہ بے یقین سی ہوئی۔ نفی میں سر ہلا کر اس نے آنکھیں رگڑ کر صاف کیں، پھر خود کو سنبھالتے ہوئے نگاہیں دروازے پر مرکوز کر لیں۔

ابھی وہ بھاگا بھاگا آئے گا اور کہے گا۔ ”میری جنت! تمہیں سننے میں غلطی ہوئی ہے۔“

”ہاتھ پکڑے گا، آنسو پونچھے گا، پھر اس کی آنکھوں میں جھانک کر اپنا عہد دہرائے گا۔ بھلا مجھے بھی تمہارے سوا کسی اور سے محبت ہو سکتی ہے؟“

پھر اس کی آنکھوں میں نمی آئے گی اور لبوں پر محبت نام کی تسبیح......”تم میری پہلی اور آخری محبت ہو! تمہاری جگہ میرے دل میں اور کوئی نہیں لے سکتا۔“

اور وہ فوراً مان جائے گی۔ کوئی نخرہ نہیں دکھائے گی۔ کوئی اعتراض نہیں اٹھائے گی۔

مگر وہ ہم سفر، ہم نوا، مجازی خدا! وہ یہ سب کہنے آیا ہی نہیں......بار بار آنکھیں مسلتے، گال رگڑتے وہ منتظر سی بیٹھی رہی......مگر برھان واصف! وہ آیا ہی نہیں۔

مٹیالی شام کے اندھیروں میں غرق......اس کے انتظار میں بے قرار......وہ ایک بار پھر بھول رہی تھی کہ پچھلے تین ماہ سے برھان ایک بار بھی تو اسے یہ سب کہنے نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

”تم بانجھ ہو جنت! اور بانجھ عورت مرد پر ایک بوجھ کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔“

بانجھ اور بوجھ؟ محرومی کا احساس شدید تر ہوا۔ بے بسی کا احساس قوی تر۔

اس نے گال پر پھسلتی لٹ کو کان کے پیچھے اڑس کر ماہین کی طرف دیکھا۔ کامدار کاٹن سوٹ میں ملبوس، لائٹ سا میک اپ کیے، سفید دوپٹا اپنے وجود پر پھیلائے وہ ہمیشہ کی طرح نکھری نکھری سی بہت فریش لگ رہی تھی۔ اس نے دانستہ اپنے داہنا ہاتھ میز پر سامنے رکھا ہوا تھا جس میں آج گولڈ کی ایک نئی رنگ چمک رہی تھی۔ جنت نے خاموشی سے ریفریجریٹر کھول کر پانی کی بوتل نکالی، ریک سے کانچ کا گلاس اٹھایا اور ٹھنڈا پانی انڈیلنے لگی۔

اس کا بغور جائزہ لیتے ہوئے ماہین نے چائے کا سپ لیا۔

”بہت محبت کرتا ہے وہ مجھ سے، بہت خیال رکھتا ہے وہ میرا۔ اور کیوں نہ رکھے؟ آخر میں اسے ایک بچہ دے رہی ہوں۔“

لہجے میں تکبر بھرا تھا۔ آواز میں رعونت تھی۔ آنکھوں سے غرور جھلکتا تھا۔ جیسے سارا کمال صرف اس کا تھا، جیسے عطا صرف اس کے ہاتھ میں تھی۔ جیسے قضا کے فیصلے اس کی مرضی، اس کی منشا سے ہوتے تھے۔

"جتنی طوفانی محبت وہ تم سے کرتا تھا اور شادی کے بعد بھی جس طرح وہ تمہارا خیال رکھتا تھا، میں تو یہ سمجھی تھی کہ وہ میری طرف دیکھے گا بھی نہیں۔"

جنت کی زرد رنگت میں اک کرب سا ٹھہر گیا۔ سرخ و متورم آنکھوں کی نمی کچھ اور بڑھ گئی۔

"اور اب دیکھو، اتنی محبت، اتنا پیار۔ آخر کیوں نہ کرے، میں اس کے ہونے والے بچے کی ماں جو ہوں۔" اترا کر کہتے ہوئے اس نے اپنی گردن اونچی کی تھی۔ سر یوں اٹھایا تھا جیسے وہ کسی سلطنت کی ملکہ ہو۔

بھلا وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جنہیں اللہ بغیر کسی تڑپ، بغیر کسی دعا بغیر کسی انتظار کے سب عطا کر دیتا ہے؟ اس نے خالی گلاس میز پر رکھ دیا تھا۔

"سچ پوچھو تو میں بھی اس سے محبت کرتی ہوں......شراکت داری اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔" ماہین نے ایک اور وار کیا تھا۔ اور اس کا ہر وار ٹھیک نشانے بیٹھتا تھا۔

"جب میں نے شراکت برداشت کر لی تو تمہیں کیا مسئلہ ہے؟" اس نے متحمل ہو کر پوچھا تھا۔

"تمہاری تو مجبوری ہے، میری ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے، میں برہان کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ میں اسے ایک بچہ دے رہی ہوں جنت......تم اسے کیا دے رہی ہو؟ پچھلے پانچ سالوں میں تم نے اسے دیا ہی کیا ہے؟" تمسخر اڑاتا ہوا لہجہ۔ جنت کا وجود چھلنی ہوا۔ جواباً وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ ماہین برہان کے ہونے والے بچے کی ماں تھی۔ اس کا پلڑا بھاری تھا......وہ اس سے کوئی بحث نہیں کر سکتی تھی۔

اب یہی مناسب تھا وہ ناشتے کا ارادہ ترک کر دے اور بھوکی پیاسی یہاں سے چلی جائے۔

"تم اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟"

جنت کے قدموں کی حرکت تھمی۔ کچھ متوحش ہو کر اس نے ماہین کو دیکھا۔ وہ سینے پر بازو باندھے اس کے سامنے کھڑی تھی......

"تم ہوش میں تو ہو۔"

"ہاں ہوش میں ہوں، اور دیکھنا چاہتی ہوں ایک بانجھ لڑکی کہاں تک لڑ سکتی ہے۔" استہزائیہ انداز میں کہتے ہوئے وہ کچن سے چلی گئی اور جنت صدمے سے گنگ اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔

بانجھ وہ ایک لفظ نہیں خنجر تھا۔ دل میں اترتا تھا اور لہولہان کر دیتا تھا۔

بانجھ!! وہ محرومی کا احساس نہیں، جلتا ہوا انگارہ تھا وجود پر گرتا تھا اور بھسم کیے جاتا تھا۔

☆☆☆

شام کے پانچ بج رہے تھے۔ سہ پہر کا سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ اپنے کپڑے استری کر رہی تھی۔ معاً کسی خیال کے ذہن میں آتے ہی اس نے استری رکھ کر موبائل اٹھا لیا تھا۔ اب وہ برہان کا نمبر ڈائل کر رہی تھی۔ پھر خاموشی سے اگلے کئی لمحوں تک گھنٹی گنتی رہی تھی۔ موبائل شاید سائلنٹ پر تھا۔ برہان نے خاصی تاخیر سے کال ریسیو کی تھی۔

"ہاں بولو۔" اس کی محبت، عنایت اور الفت کی طرح، اس کے لفظ بھی کم پڑ گئے تھے۔

فقط دو لفظوں کا مستحق جانا گیا تھا اسے......جنت کو اپنا آپ بے حد ارزاں محسوس ہوا جیسے وہ خاک ہے۔ پیروں تلے روندی جا رہی ہے......

"تم نے تو مجھے مکمل کر دیا ہے۔" اس نے ذہن میں ابھرتی اس آواز کو جھٹک دیا اور ڈھیٹ بن گئی، بے حس ہو گئی۔

"السلام و علیکم، کیسے ہو؟"

گھر میں تو بات کرنے کے موقعے کم ہی میسر تھے۔ کمرے میں آنا بھی تقریباً چھوڑ دیا تھا اس نے تمام تر محبت، توجہ اور عنایتیں دوسری بیوی کے لیے رہ گئی تھیں۔

"ہوں! ٹھیک ہوں! لیکن مصروف ہوں۔" وہ اکثر سوچتی تھی۔ آج پھر سوچنے لگی تھی، کیا یہ وہی برہان ہے جو اپنی دوسری شادی سے اپ سیٹ تھا؟ جو اس کے احساسات کی اتنی قدر کرتا تھا کہ بمشکل دوسری شادی کے لیے راضی ہوا تھا؟ جسے جذبات کی اتنی فکر تھی کہ گھر کو برقی قمقموں سے سجانے نہ دیا تھا۔ وہ جو صرف اس کا تھا جو صرف اسے چاہتا تھا؟

اب تو ان کے مابین بدگمانیوں کی اتنی دیواریں کھڑی ہو چکی تھیں کہ وہ کچھ کہنا بھی چاہتی تو کہہ نہیں سکتی تھی مگر آج اسے کچھ کہنا تھا، فاصلے کی اس دیوار کو توڑنے کے لیے۔ ایک کوشش اسے ضرور کرنی تھی۔

"میں سوچ رہی تھی اگر آج تم اور میں، حفصہ آپی کی طرف چلے جائیں؟" کیا کبھی اس نے سوچا تھا کہ اسے اس قدر محتاط انداز میں ڈر ڈر کر برہان سے بات کرنا ہو گی؟

"اور ماہین کو گھر میں اکیلا چھوڑ جائیں؟" وہ اس کے مطالبے پر بدک ہی تو گیا تھا۔ "جانتی بھی ہو اس کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ آج شام ڈاکٹر کے پاس اپائنٹمنٹ بھی ہے۔"

"اصل میں حفصہ آپی نے فون کیا تھا۔ آج شام کھانے پر۔"

"ان سے معذرت کر لو! پھر کبھی چلے جائیں گے۔" اس نے فوراً سے کال کاٹ دی۔ جنت موبائل کان سے لگائے کھڑی رہ گئی۔ خشک لبوں کو تر کرتے ہوئے اس نے موبائل رکھ دیا۔

ایک بار پھر اپنی تمام تر توجہ آئرن اسٹینڈ کی جانب مرکوز کی اور اپنا وہ جوڑا پریس کرنے لگی جس کا رنگ برہان کا پسندیدہ رنگ تھا اور جسے آج وہ اس کے لیے پہننا چاہتی تھی، اس کے لیے تیار ہونا چاہتی تھی۔

آنسو ٹپ ٹپ آنکھوں سے گرنے لگے اور یہی برہان کہا کرتا تھا۔ مرجائے گا مگر دوسری شادی نہیں کرے گا۔

کپڑے پریس کر کے، الماری میں ہینگ کر کے وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر اس نے حفصہ سے فون پر بات کر کے ان سے معذرت کر لی کہ آج رات وہ ان کی طرف کھانے پر نہیں آسکے گی کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

اس کا دل تنگ سا ہونے لگا۔ وہ ہوا خوری کے لیے باہر لان میں آگئی۔ سامنے ہی ماہین فون کان پر لگائے ٹہل رہی تھی۔

''نہیں برہان مجھے وہ بلیک والا ہی چاہیے، آپ کو ہر حال میں مجھے وہیں دلانا ہوگا۔'' دوسری طرف سے جانے کیا کہا گیا تھا کہ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ ایک نظر جنت پر ڈالی پھر ایک ادا سے ہٹا کر رک گئی۔

''ارے ہاں بے بی کا نام تو ابھی تک ہم نے سوچا ہی نہیں ہے۔''

جنت کو دیکھ کر ہی اسے اپنے ہونے والے بچے کا خیال آیا کرتا تھا۔

''ہوں! ٹھیک ہوں! لیکن مصروف ہوں۔''

جنت نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ اندر کی گھٹن سے تنگ ہو کر باہر آئی تھی مگر باہر کا حبس شدید تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔

میرے لیے اب اس کے پاس چند لمحے بھی نہیں رہے؟ یہی برہان تھا جسے پوری دنیا میں سوائے جنت کے اور کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا اور اب سب نظر آتا تھا ما سوائے اس کے۔

حلق میں آنسوؤں کا پھندا سا اٹک گیا۔

ماہین ٹھیک ہی کہتی تھی۔ زندگی میں تو وہ اسے رکھے ہوئے تھا مگر دل سے تو کب کا نکال چکا تھا ورنہ وہ کچھ تو احساس کرتا، کچھ تو خیال کرتا، وہ تھکے ہارے انداز میں واپس پلٹ گئی۔ ملازمہ کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس نے خود کو کمرے میں مقید کر لیا۔

پھر اس نے گاڑی کی آواز سنی اور اٹھ کر کھڑکی میں آگئی۔ ماہین خاص طور پر برہان کے لیے تیار ہوئی تھی۔ اس کا پسندیدہ رنگ زیب تن کیے۔ کسی پھول کی طرح کھلی کھلی لگ رہی تھی۔ تیاری سے واضح تھا وہ صرف ہاسپٹل نہیں جائیں گے...... آج رات کا کھانا بھی کہیں باہر تناول فرمایا جائے گا۔ آج رات بھی وہ تاخیر سے لوٹیں گے۔

ملازمہ نے دستک دے کر اس سے شام کے کھانے سے متعلق پوچھا تو اس نے منع کر دیا۔ آج رات پھر اسے بھوکا ہی سونا تھا۔

☆☆☆

دروازہ کھلنے کی آواز سماعت سے ٹکرائی تو اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ گھٹنوں سے سر اٹھاتے ہوئے اس نے بے اختیار سامنے دیکھا۔ برہان سرد نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے دروازے میں کھڑا تھا۔ چہرے کے تاثرات سرد تھے۔

''تم آگئے برہان! میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔''

برہان کے تاثرات ہنوز سخت ہی تھے۔ وہ اس کی خاموشی سے کچھ پریشان ہوئی۔ ''کیا بات ہے، سب ٹھیک تو ہے؟''

''ماہین کے ساتھ تم کس طرح کی باتیں کرتی رہتی ہو؟''

''جی؟'' وہ خاک نہ سمجھی۔

''ہم ہنی مون پر کہاں گئے۔ کہاں گھومتے پھرتے رہے۔ میں نے تمہیں کیا گفٹ دیئے۔ ہم نے وقت کیسے گزارا۔ یہ سب...... یہ سب اسے بتانے کی کیا ضرورت ہے؟ کیوں دل جلاتی ہو اس کا جنت! وہ اپ سیٹ ہو جاتی ہے۔''

وہ ہق دق اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اس نے یہ نہیں پوچھا جنت تم نے کچھ کھایا یا نہیں۔ میں تمہیں روز اکیلا چھوڑ کر چلا جاتا ہوں تمہیں ڈر تو نہیں لگتا؟ تم خفا تو نہیں ہوتیں؟ تمہیں وقت نہیں دیتا۔ تم سے بات نہیں کرتا۔ تمہیں کہیں برا تو نہیں لگتا؟ کہا بھی تو کیا؟ ڈانٹا بھی تو کس بات پر؟ فکر ہوئی بھی تو کس امر کی؟

''جنت آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ کیوں اپنی اور میری زندگی مشکل بنا رہی ہو یار!'' وہ زچ ہو رہا تھا۔

اور جنت اپنی جگہ ساکت بیٹھی تھی۔ ماہین کچھ بھی کہتی ہے اور وہ یقین کر لیتا ہے؟ کچھ بھی بتاتی ہے اور وہ مان لیتا ہے؟

اس نے کچھ کہنے کے لیے لبوں کو حرکت دی مگر آواز نے ساتھ نہ دیا۔ آواز باغی ہوئی، آواز کرب میں معدوم ہوئی۔

''میں سمجھ سکتا ہوں محرومی کا احساس برا ہوتا ہے مگر اس محرومی میں دوسروں کو اذیت پہنچانا، انہیں نیچا دکھانا...... کم از کم اس کی توقع نہیں کر رہا تھا میں تم سے......'' جنت کے اندر چھناکے سے کچھ ٹوٹا تھا۔ وہ سر تا پیر لہولہان ہوگئی۔

صرف ''محرومی'' ہی ہے اس کے اندر؟ اور کچھ نہیں؟ جذبات، احساسات، خواب، خواہشات۔ اور کچھ بھی نہیں؟

''مجھے اپنے بچے کی بہت فکر ہے اور ماہین کے ساتھ تمہارا یہ رویہ میری برداشت سے باہر ہو رہا ہے۔''

وہ کہہ کر چلا گیا...... اور جنت سن ہوتے وجود کے ساتھ بیٹھی رہ گئی تھی۔

اس برس جو خزاں اتری تھی وہ صرف دھرتی پر ہی نہیں اس کے وجود پر بھی اتری تھی۔ وہ اسے بھی بے رنگ کر رہی تھی۔ اس کے حصوں کو بھی جھاڑ رہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا دھرتی کی خزاں گزر جانے والی تھی۔ مگر اس کے اندر کی خزاں اس کے اندر ہی رہنے والی تھی۔

☆☆☆

''جی آپا بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔'' وہ کچن میں کھانا بنا رہی تھی جب فون کان سے لگائے نورین آپا سے بات کرتی ماہین کچن میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔

''کتنی تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔ایسے تو نہیں اللہ نے ماں کے قدموں تلے جنت رکھی۔''

تیزی سے پیاز کاٹتے اس نے سکینہ کے ذمے دوسرے کام لگائے اور خود مرغی کے لیے مسالا بھوننے لگی۔

''مگر جن کی اولاد نہ ہو انہیں بھلا کیا اندازہ۔''

جنت نے بمشکل خود کو سنبھالا۔وہ کام نہ کر رہی ہوتی تو یقیناً ادھر ادھر ہو جاتی۔

''خیال تو بہت رکھتی ہوں آپا پر پھر بھی دھڑکا سا لگا رہتا ہے۔'' جنت کو کن اکھیوں سے دیکھتے ہوئے اس نے ایک اور تیر چھوڑا تھا۔''ارے نہیں، یہ بات نہیں......نہیں آپا! جنت بہت اچھی ہے۔میری چھوٹی بہنوں جیسی ہے۔بہت خیال رکھتی ہے میرا۔''

ایک لمحے کو رک کر اس نے کچھ سنا، پھر مسکرائی، سر اٹھا کر جنت کو دیکھا۔''ان شاءاللہ بیٹا ہی ہوگا۔میں برھان کو بیٹا ہی دوں گی۔''

جنت کٹنگ بورڈ پر ٹماٹر کاٹنے لگی تھی۔

''امی کے بارے میں بتائیں وہ کراچی سے کب آ رہی ہیں؟'' اب وہ اپنی ساس سے متعلق پوچھ رہی تھی جو پچھلے کچھ دنوں سے اپنی چھوٹی بیٹی کی طرف گئی ہوئی تھیں......دوسری طرف جانے کیا بتایا گیا کہ وہ بے اختیار چونک اٹھی تھی۔ جنت نے اس کے لہجے کا بدلاؤ خاص طور پر محسوس کیا تھا۔

''اچھا! میں سمجھی وہ ایک دو ہفتے وہیں رہیں گی۔ چلیں اچھا ہے وہ آ جائیں۔ مجھے ویسے بھی ان کی بہت ضرورت ہے۔میری ماں جیسی ہیں وہ۔'' لگاوٹ سے کہہ کر کچھ دیر تک سنتی رہی پھر فون بند کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی......

شام کا کھانا تیار کر کے، سکینہ کو ہدایات دے کر جنت اپنے کمرے میں آ گئی۔

الماری کے پٹ کھولے وہ کپڑوں کو ترتیب سے رکھ رہی تھی جب بیرونی گیٹ پر برھان کی گاڑی کا ہارن گونجا تھا۔

اس نے سر ضرور اٹھایا مگر اٹھ کر کھڑکی تک نہ گئی۔

''بی بی جی!'' عین اسی لمحے سکینہ ہانپتی کانپتی اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

''وہ ماہین بی بی......ان کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔درد سے چیخے جا رہی ہیں۔''

برھان کی شرٹ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے جا گری۔وہ پریشانی کے عالم میں تیزی سے کمرے سے باہر نکلی۔

سیڑھیاں اتر کر جس لمحے وہ بالائی منزل پر ماہین کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی، اسی لمحے گاڑی پارک کر کے برھان لیپ

ٹاپ کیس سنبھالے صدر دروازے کا رخ کر چکا تھا۔

وہ دروازہ کھول رہا تھا اور جنت کے آنے کے بعد۔ماہین اپنے کمرے کا دروازہ بند کر رہی تھی۔

اسے صحیح سلامت دیکھ کر وہ الجھ گئی۔

''کیا مذاق ہے ماہین، سکینہ کہہ رہی تھی تمہاری طبیعت خراب ہوگئی ہے۔'' اس افراتفری میں وہ اس کی دروازہ لاک کرنے والی حرکت کو نوٹس کر ہی نہ پائی۔

''ہاں طبیعت تو میری خراب ہے۔'' عجیب سے انداز میں کہتے ہوئے وہ پیچھے ہٹی، اور اس سے قبل کہ جنت کچھ سمجھ پاتی، اس نے ایک جھٹکے سے ڈریسنگ ٹیبل کا سامان بکھیر دیا۔گلدان توڑ دیا۔کانچ کا گلاس الماری کے شیشے پر دے مارا۔

جنت حیران و ششدر اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔اگلے ہی لمحے اس نے پیٹ پر ہاتھ رکھا اور بلند آواز میں چیخنے لگی۔

''جنت...... جنت نہیں...... جنت میرا بچہ!''

جنت کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

روتے چیختے چلاتے ہوئے اس نے کانچ کے ٹکڑے سے اپنا ہاتھ بھی زخمی کر لیا۔

بند دروازے کے اس پار برھان اس کا شور سن کر پاگل ہو رہا تھا۔

اندر وہ پتھر کا مجسمہ بنی ماہین کے سامنے کھڑی تھی۔اسے روتا تڑپتا چیختا دیکھ رہی تھی۔اپنی منتیں کرتا سن رہی تھی۔

''دروازہ کھولو جنت! جنت دروازہ کھولو۔'' برھان اپنے کندھے کے زور سے دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا، چیخ رہا تھا، چلا رہا تھا۔

ماہین نے خود کو فرش پر گرا لیا۔اب وہ یوں تنفس لے رہی تھی جیسے بس مرنے کو ہو۔

سکینہ دوسری چابی لے آئی تھی۔دروازہ جھٹکے سے کھل گیا تھا۔

برھان کی پہلی نظر اپنی بے حال ہوتی بیوی پر پڑی تھی۔دوسری نظر بے جان مجسمے کی طرح کھڑی جنت پر......جو ساکت تھی۔صامت تھی۔متوحش تھی۔

''یہ...... یہ...... جھوٹ...... بول رہی ہے......'' اور ہر ٹوٹی ہوئی شے کی طرح۔اس کے ٹوٹے ہوئے لفظ بے اثر رہے۔غیر اہم رہے۔

برھان کا داہنا ہاتھ اٹھا، ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر پڑا......ایک مضبوط و توانا مرد اور پھر جس قوت سے وہ تھپڑ پڑا تھا، جنت توازن برقرار نہ رکھ سکی۔لڑکھڑا کر شیشے کے ٹکڑوں پر جا گری......وقت جیسے رک سا گیا، تھم سا گیا۔آوازیں معدوم ہوگئیں۔

عجیب بات تھی اس کے حلق سے سسکاری تک نہ نکلی...... یاد رہا تو بس وہ تھپڑ...... تکلیف ہوئی بھی تو بس اس تھپڑ کی......

’’میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، ابھی اور اسی وقت دفع ہو جاؤ میرے گھر سے۔‘‘

روتی، تڑپتی، حال سے بے حال ماہین کو بازوؤں میں اٹھائے برہان ہاسپٹل کے لیے نکل گیا تھا۔

وہ صدمے سے گنگ ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی تھی۔ آن کی آن میں یہ کیا ہوا تھا؟ کیوں ہوا تھا؟

کیا یہ برہان تھا؟ کیا یہ اس کا برہان تھا؟ یہ کیسا چہرہ تھا؟ یہ کیسا رویہ تھا؟ یہ اس کے ساتھ کیا ہو گیا تھا؟

طلاق؟ اس نے یہ لفظ کیسے ادا کر دیا؟ اس کا دل پھٹنے کو تھا۔ روح فنا ہو رہی تھی۔ دماغ ماؤف۔

وہ ایک لفظ جب ادا ہوا تو ہر رشتہ بدل گیا۔ پناہ چھن گئی۔ گھر ٹوٹ گیا۔ گھر بکھر گیا۔

اس رات وہ گھر آئی تو کمرے سے باہر نکلتی نفیسہ کی پہلی نظر اس پر پڑی۔

گال پر تھپڑ کا نشان۔ آنکھ کے نیچے نیل۔ سفید قمیص کی آستین پر خون۔ کانچ کا ٹکڑا وہیں کہیں کھبا رہ گیا تھا۔ الجھا بکھرا ہوا سا حلیہ۔

وہ اپنی جگہ منجمد ہو گئیں۔

’’یہ کیا کر دیا تم نے جنت!! کیوں کیا تم نے ایسا۔‘‘ ایمان اس پر چلائی تھی۔ ایک شور سا اٹھا تھا۔ روحینہ چچی، زیبا چچی، فریدہ پھپھو۔ گھر کے چھوٹے بڑوں کا ایک جمگھٹا سا اکٹھا ہوا تھا مگر اس کی نگاہیں اپنی ماں پر جمی رہ گئی تھیں۔

سکتہ ٹوٹ گیا۔ وہ سب کو ہٹا کر، اپنی ہر اذیت سے لاپروا ہو کر ان کی طرف بھاگی، ان کے قدموں میں گرتے ان کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

’’میں نے کچھ نہیں کیا...... میں نے کچھ نہیں کیا امی...... میرا یقین کریں۔‘‘ وہ رونے لگی۔

جنت کو ساکت نگاہوں سے دیکھتے، ان کا داہنا ہاتھ بے ساختہ دل پر آن ٹھہرا تھا۔ ایک لمحے کو وہ لڑکھڑائی تھیں۔ اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے فرش پر ڈھیر ہو گئیں۔

’’امی......!‘‘ گھر کے سناٹے میں اس کی چیخ گونجی تھی۔ ’’امی! نہیں...... امی! میری بات سنیں...... امی! میں نے کچھ نہیں کیا...... میں نے کچھ نہیں کیا۔‘‘

ایمان نے روتے ہوئے اسے بے دردی سے کھینچ کر پیچھے ہٹایا تھا۔ ہانیہ اس پر چیخ رہی تھی۔ کوئی گاڑی نکالنے کو بھاگا تھا۔ کسی نے ایمبولنس کو کال کرنا چاہی تھی۔ اس شور اور افراتفری میں وہ تھر تھر کانپتی اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

ہاسپٹل سے اس رات نفیسہ کی میت آئی تھی۔ بہنوں نے اسے ان کی چارپائی کے قریب تک آنے نہیں دیا۔ جب زندہ تھیں تب نہیں۔ تو جب وہ نہیں رہیں۔ تب کیوں؟

وہ روتی تڑپتی رہ گئی۔ کسے بتاتی اس کا کوئی قصور نہیں۔ کون یقین کرتا وہ گناہ گار نہیں۔ دوسروں کے برعکس حفصہ خاموش تھیں۔ نہ ہاتھ اٹھایا، نہ شکوہ کیا۔ نہ اس پر روئیں۔ نہ اس پر چلائیں۔ آخری وقت تک وہ نفیسہ کے ساتھ رہی تھیں۔ ماں کا چہرہ جیسے آنکھوں میں ٹھہرا تھا۔ لمس بھی جیسے ہاتھوں میں ہی رہ گیا تھا۔

نفیسہ کا وجود مٹی تلے جا سویا تو وہ بھی جیسے زندہ لاش ہو گئی۔ اس کی بھوک مٹ گئی۔ نیند اڑ گئی۔ چین مٹ گیا۔ بے سکونی وجود کے انگ انگ میں اتر گئی۔

وہ یوں خاموش ہوئی جیسے قوت گویائی سے محروم کر دی گئی ہو۔ ساری وضاحتیں، صفائیاں دلیلیں جیسے اس ایک ماں کے لیے تھیں۔ ان کے جانے کے بعد اس نے لب سی لیے۔

بہنوں کو اس کی شکل تک سے نفرت ہو گئی۔ چچا، تایا اور پھوپھیوں میں سے کوئی اسے اپنے پاس رکھنے کو تیار نہ تھا۔

وہ اپنے بھائی، اپنے باپ، اور اب اپنی ماں کی بھی مجرم تھی۔ وہ اس گھر پر نازل ہونے والی ہر بربادی کا ’’سبب‘‘ تھی۔ اس پر کوئی ترس کھاتا بھی تو کیوں؟ کوئی ہمدردی جتاتا بھی تو کیسے؟ سب کو لگتا تھا ’’طلاق‘‘ ایک سزا تھی۔ اسے ٹھیک وقت پر بالکل ٹھیک ملی۔ اس کے ساتھ جو ہوا، بالکل صحیح ہوا۔ ابھی تو آغاز تھا۔ ابھی تو اسے در در کی ٹھوکریں کھانی تھیں۔ ذلیل و خوار ہونا تھا۔

عدت اس نے اسی گھر میں گزاری جو اس کا کبھی نہیں تھا۔ چھت کا ایک کمرہ جس میں وہ مستقل ٹھہرے رہنا چاہتی تھی۔ کمرہ روحینہ چچی کے ٹیرس کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ منڈیر ایک ہی تھی۔ عدت کے بعد بڑے چچا نے آناً فاناً اس کا رشتہ اپنے بڑے بیٹے زمان سے طے کر دیا۔ وہ جنت سے پورے پندرہ برس بڑا تھا۔ بیوی روز روز کی مار دھاڑ سے تنگ آ کر خلع لے چکی تھی۔ تین بچے بھی تھے جو ماں کے ساتھ رہتے تھے۔

کسی نے اس سے رائے پوچھی، نہ مرضی جاننے کی کوشش کی۔ فیصلہ ایک سزا کی طرح بس سنا دیا گیا۔ نکاح اور رخصتی کی تاریخ طے کر دی گئی۔

ایک جہنم سے نکال کر دوسرے جہنم کا بندوبست کیا جانے لگا۔ نکاح سے ایک ہفتہ پہلے خالہ آئیں۔ بہانے بہانے سے چچا سے اجازت لے کر اسے اپنے ساتھ گھر لے گئیں۔ وہ ان کے گھر صرف دو دن رہی۔ تیسرے دن اس کا بہت اچانک اور ہنگامی طور پر فارس وجدان کے ساتھ نکاح ہو گیا۔ سائرہ خالہ سب ہی معاملات پہلے سے طے کر چکی تھیں۔ اسے تو عین موقع پر چچا کے گھر سے نکال لائی تھیں۔

”میں نے ابو سے تمہارا ہر طرح سے خیال رکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ زمان کے ساتھ میں تمہاری زندگی مزید برباد نہیں ہونے دے سکتی۔“ انہوں نے بس اتنا کہا تھا اور وہ نم آنکھوں کے ساتھ ان کے حکم کے آگے سر جھکا گئی تھی۔

ایک نئی زندگی کی آس لیے۔ سکون کی متلاشی۔ وہ رخصت ہو کر اسلام آباد آ گئی تھی مگر شادی کی پہلی رات فارس وجدان کے رویے نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ اس کی سزا کبھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ صرف شہر ہی تو بدلا تھا۔ زندگی وہی تھی۔ نصیب بھی وہی۔ قسمت بھی وہی۔ اور محرومی بھی وہی۔

☆☆☆

آسمان پر چمکتی بجلی زمین کے کسی نامعلوم گوشے میں بار بار گم ہو رہی تھی۔ ہوائیں تیز تھیں۔ مگر اتنی نہیں کہ اس کی ہر اذیت اڑا لے جائیں۔ بارش ہنوز برس تھی۔

وہ پنجوں کے بل خود میں سمٹ کر بیٹھی جلتی ہوئی ویران آنکھوں سے سامنے دیکھ رہی تھی۔ وجود مکمل طور پر بھیگا ہوا تھا۔ آنکھوں میں سرخی اتری تھی۔ چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ اور آنسو مسلسل بہتے جا رہے تھے۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ وہ اپنے آنسو نہیں پونچھ رہی تھی۔ نہ خود کو دلاسا دے رہی تھی۔ نہ سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

پارک کی آہنی باڑ کے اس پار، سبزے کے بیچ و بیچ اسے ٹریفک نظر آ رہی تھی۔ وقت رکا نہیں تھا۔ دنیا اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھی۔

دیوار کا سہارا لے کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی، پھر اسی موسم میں۔ اپنی تمام تر وحشتوں کے ساتھ وہ فٹ پاتھ پر قدم دھرتی آگے بڑھنے لگی۔ اس کا توازن درست نہ تھا۔ چال میں واضح لڑکھڑاہٹ تھی۔ ارتکاز کسی ایک جگہ نہ تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جیسے مفقود ہو کر رہ گئی تھی۔

موت! زندگی کا انجام۔

اذیت کا اختتام!

ایک آزادی!

ہاں، وہ راستہ ایسا ہی تھا۔ اسی رنگ میں، اسی روپ میں نظر آتا تھا۔ پہلے بھی نظر آتا رہا تھا، تب وہ خودکشی کی سوچ سے پیچھا چھڑا لیا کرتی تھی۔ جینے کی کوئی نہ کوئی وجہ۔ کوئی نہ کوئی مقصد تلاش کر لیا کرتی تھی۔ مگر اب کی بار وہ ایسا نہیں کر پا رہی تھی۔ اب کی بار جو اندھیرے اکٹھے ہوئے تھے وہ اسے مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں اتار رہے تھے۔ اور وہ چاہ کر بھی کچھ کر نہیں پا رہی تھی۔

”خودکشی بذات خود ایک مسئلہ ہے۔ کسی مسئلے کا حل ہر گز نہیں۔“

منظر لمحے بھر کے لیے بدلا تھا۔ اس کے سامنے سبزہ بچھ گیا تھا، ہاتھوں میں پھول آ گئے تھے۔ نانا برابر میں تھے۔ اس کے قدموں کے ساتھ قدم ملا کر چلتے ہوئے۔ اسے سمجھاتے، اسے کچھ بتلاتے ہوئے۔

”سانسوں کی ڈور خود سے ٹوٹے تو ٹوٹے، تم توڑنے کی کوشش کبھی مت کرنا۔“

اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ آنکھیں رگڑ کر صاف کرتے اس نے ایک بار پھر قدم بڑھائے۔ وہ ماضی میں تھی۔ نہ حال میں۔ وہ جیسے ایک خلا میں تھی۔

”جس وقت منفی سوچ جڑ پکڑے اور مایوسی انتہا کی گہری ہو جائے تو سمجھ جاؤ۔ یہ شیطان کا آخری وار ہے۔ ٹھیک اس وقت پڑ رہا ہے جب وہ تمہارے ”انعام“ سے واقف ہو چکا ہے۔“

لمحے بھر کے لیے وہ لڑکھڑا کر سنبھل گئی تھی۔ آہنی باڑھ کا سہارا لے کر، ایک بار پھر قدم اٹھانے لگی تھی۔

”ہر صابر کے حصے میں بشارت آتی ہے۔ اور اس بشارت سے ذرا دیر پہلے۔ شیطان اندھیرے بڑھا دیتا ہے۔ یہ کام وہ ہر اس مومن کے ساتھ کرتا ہے جو اپنی آزمائش میں صامد (ڈٹا ہوا) رہا ہو۔“

وہ سسک پڑی۔ نانا کے الفاظ ایک طرف۔ اس کا درد، اس کا غم، اس کی محرومی دوسری طرف۔

”طلوع آفتاب سے پہلے رات بہت تاریک ہوتی ہے جنت! بہت زیادہ تاریک ہوتی ہے۔“

وہ سڑک کنارے رک گئی تھی۔ اس کے لب کپکپا رہے تھے، پلکیں لرز رہی تھیں۔ سردی کی شدت سے ٹھٹھرتا وجود نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ اپنا حل تلاش رہی تھی۔ اور اسے اپنا حل کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ راستہ ایک ہی بچا تھا۔ موت کا راستہ۔ تباہی کا راستہ۔ دائمی عقوبت کا راستہ۔

”اگر ماضی درد کا حصہ ہو، اور مستقبل اندھیرے میں ڈوبا ہو تو سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھ لینا چاہیے۔“

اس کا ضبط ختم ہو گیا۔ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے وہ زمین پر جھک گئی۔

بعض دفعہ چھپی ہوئی با معنی دعا اور کوئی نہیں ہوتی۔ محض چند لمحوں کا توقف تھا۔ اور چند لمحوں کی ہی گفتگو تھی۔ اور اس نے بے حد خاموشی سے سڑک کی جانب قدم بڑھا دیے تھے۔

☆☆☆

کبھی تمنا کے راستوں پر نکل پڑو تو خیال رکھنا
ہوائیں، بادل، فضائیں، موسم، خیال
چہرے بدل بدل کر تمہیں ملیں گے

تو لمحہ لمحہ بدلتے رنگوں کے شوخ دھوکے میں آ نہ جانا
کبھی جو چاروں طرف تمہارے
کرن کرن اپنا خواب سا بدن نکھارے
زمیں پہ اترے
تو دھندلکوں میں سما نہ جانا
کبھی جو آنکھوں میں چاند ہنس ہنس کے
چاندنی کا خمار بھر دے
تو اپنی آنکھیں کہیں خلا میں گنوا نہ آنا
کہ یہ نہ ہو پھر جو خواب ٹوٹے
دھنک دھنک کا سراب ٹوٹے
کہ جسم و جاں پر عذاب ٹوٹے
اور تم بمشکل لرزتے ہاتھوں سے
کرچی کرچی بدن سنبھالے
کہیں بلندی پہ چڑھ کے
رستی ہوئی نگاہوں سے
واپسی کے نشان ڈھونڈو
اجڑ گیا جو جہان ڈھونڈو
کبھی تمنا کے راستوں پر نکل پڑو تو خیال رکھنا
کہیں سے خالی پلٹ کے آنا بہت کٹھن ہے۔
بہت کٹھن ہے
بہت کٹھن ہے
بہت کٹھن ہے

☆☆

''اف......فارس!؟'' جنت کے حلق کے گھٹی گھٹی چیخ نکلی۔آنکھوں میں خوف وہراس پھیل گیا۔داہنا ہاتھ منہ پر جمائے وہ متوحش ہو کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔

وہ سانس نہیں لے رہا تھا۔اس کے وجود میں اب کوئی حرکت نہیں رہی تھی۔

وہ رو دینے والی ہو گئی۔ڈاکٹر بخاری ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔اس کی کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اب کیا کرے۔

''جنت!!'' اسے یوں لگا جیسے نانا نے کندھے پر ہاتھ رکھا ہو۔ہمت بندھائی ہو۔حوصلہ دیا ہو۔ایک ساتھ کئی منظر اس کی آنکھوں میں لہرائے تھے۔

خود پر طاری جمود کو توڑتے ہوئے وہ یک دم حرکت میں آئی۔فارس کو سیدھا لٹاتے ہوئے اس نے نبض چیک کی پھر اسے سی پی آر دینا شروع کیا۔

بہتی ہوئی آنکھوں اور لرزتے دل کے ساتھ وہ اسے تب تک سی پی آر دیتی رہی جب تک ڈاکٹر بخاری نہیں آ گئے تھے۔اس کی حالت کے پیش نظر اسے فوری ہسپتال لے جانا پڑا۔ایمرجنسی روم تک وہ اس کے ساتھ ساتھ تھی۔لیکن اس کے بعد......ٹھنڈے سرد کاریڈور میں کھڑی وہ تنہا ہی ڈاکٹرز کے عملے میں افراتفری دیکھنے لگی۔

وقت بدل گیا تھا......لیکن خوف اسی انداز میں......اسی راستے سے آ لپٹا تھا۔احساسات یوں ہوئے تھے جیسے وہی اذیت ایک بار پھر اپنا آپ دہرا رہی ہو۔

آخری بار اس طرح کی ایمرجنسی سچویشن میں وہ اپنے نانا کے ساتھ آئی تھی......انہیں ہارٹ اٹیک ہوا جو جان لیوا ثابت ہوا تھا۔اسے یاد تھا وہ ان کے چہرے سے سفید چادر ہٹا کر ڈاکٹرز کی منتیں کرتی رہی تھی کہ وہ انہیں زندگی کی طرف واپس لے آئیں......
اس دن جب اس نے نانا کا ہاتھ پکڑا تھا تو وہ سرد تھا۔فارس کا ہاتھ بھی تو کتنا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

اس نے ڈاکٹر بخاری کو آئی سی یو سے باہر نکلتے دیکھا تو اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ خود اٹھ کر ان کے پاس جاتی۔

''فکر کی کوئی بات نہیں ہے، وہ خطرے سے باہر ہے۔'' انہوں نے قریب آ کر کہا تو اسے لگا جیسے کافی دیر بعد اسے سانس آیا ہو۔

''اگر آپ اسے سی پی آر نہ دیتیں تو ہم اسے نہ بچا پاتے۔ایک لمحے کی تاخیر بھی اسے موت کے گھاٹ اتار سکتی تھی۔''

''اسے کیا ہوا تھا؟''

''کیٹ الرجی......اس بار ری ایکشن زیادہ شدید ہوا ہو گیا تھا۔''

''کیٹ الرجی؟'' جنت کی آنکھیں پھیلیں۔

وہ اب براہ راست اس کے ساتھ فارس کی کنڈیشن ڈسکس کر رہے تھے ساتھ ساتھ تسلی اور دلاسا بھی دے رہے تھے۔

''میں اس کے لیے آٹو انجکٹر لکھ کر دوں گا۔اس طرح کی ایمرجنسی سچویشن میں فائدہ مند ثابت ہوگا۔طبیعت اس حد تک نہیں بگڑے گی۔اس لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

ڈاکٹر بخاری جا چکے تھے۔مگر وہ اپنی جگہ پریشان کھڑی رہ گئی تھی۔

اگر وہ کمرے میں نہ جاتی، بروقت دماغ کام نہ کرتا اور وہ اسے سی پی آر بھی نہ دیتی تو شاید......اس سے آگے جنت سے کچھ بھی سوچا نہ گیا۔

اس نے مسز شیرازی سے فون پر بات کی جو فارس کے لیے حد درجہ فکر مند نظر آرہی تھیں۔ان کا بس نہیں چل رہا تھا، وہ ابھی اٹھ کر اس کے پاس ہاسپٹل آجائیں۔

''وہ اب خطرے سے باہر ہے آنٹی!اسے جیسے ہی ہوش آئے گا، میں آپ کی بات کروادوں گی، اور آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔میں ہوں نا اس کے ساتھ......''اس نے کہا تھا۔اور اس کا یہ کہنا ہی مسز شیرازی کو مطمئن کر گیا تھا۔ان سے بات کرنے کے بعد وہ کافی دیر تک بے قراری سے کاریڈور میں ہی ٹہلتی رہی تھی۔

☆☆☆

اسے جب مکمل طور پر ہوش آیا تھا تو دھرتی پر اندھیرے پھیل چکے تھے۔کمرے میں نیلگوں بلب جل رہا تھا۔جس کی مدھم سی روشنی میں اسے ادراک ہوا تھا کہ وہ ہاسپٹل میں ہے۔آکسیجن ماسک اتار کر گردن پر ٹھہراتے ہوئے اس کی نگاہ بے ساختہ جنت کمال کی طرف گئی تھی۔

دائیں طرف کرسی پر بیٹھے بستر کے کنارے سر ٹکائے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

اپنا داہنا ہاتھ اس نے غیر محسوس انداز میں پیچھے ہٹالیا تھا جو اس کے بالوں کو چھو رہا تھا۔

یکا یک اسے سینے میں درد کی لہر اٹھتی محسوس ہوئی۔آنکھیں موندے وہ اگلے کئی لمحوں تک گہری سانسیں لیتا رہا مگر باوجود کوشش کے بھی اپنی کراہ نہ دبا سکا۔

جنت نے ہڑبڑا کر سر اٹھایا۔پھر فوراً اٹھ کر اس کے طرف متوجہ ہوئی۔

اس کے تھکن زدہ، نڈھال چہرے کی رنگت زرد تھی۔آنکھوں کے بھاری پپوٹے سوجے ہوئے لگ رہے تھے۔لیکن گردن اور سینے پر اب ریشز نہیں تھے۔

''اب کیسی طبیعت ہے!؟''وہ پوچھ رہی تھی۔

''ممی......کیسی......ہیں؟''آواز بھاری اور کچھ حد تک بدلی ہوئی تھی۔

جنت اسے کچھ حیرت سے دیکھ کر رہ گئی۔نیم غنودگی کے عالم میں اسے یاد تھی بھی تو اس کی ماں......فکر ہو بھی رہی تھی تو صرف ان کی۔

''وہ بالکل ٹھیک ہیں......''جھک کر اس نے مدھم آواز میں تسلی دی تھی۔''تمہیں کچھ چاہیے؟''

''پانی......!''اس نے بھاری تنفس کے بیچ کہا۔

مستعدی سے گلاس میں پانی انڈیل کر اس نے فارس کی گردن کو سہارا دے کر گلاس لبوں سے لگا دیا۔اس نے چند گھونٹ لینے کے بعد تکلیف سے چہرے کے زاویے بگاڑتے ہوئے گلاس دور ہٹا دیا۔گلے کی سوزش اذیت کا باعث بن رہی تھی۔

چند لمحوں تک خالی نظروں سے کسی غیر مرئی نقطے کو دیکھتے رہنے کے بعد اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

دوبارہ اسے ہوش دن کے اجالے میں اس وقت آیا تھا جب مشرقی دیوار کی تمام کھڑکیوں پر سے جنت کمال نے پردے کھینچ کر ہٹا دیے تھے۔دھوپ کی سنہری کرنیں اس کے چہرے پر پڑنے لگیں تو سوتی جاگتی کیفیت میں اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

کھڑکی سے باہر سر نکال کر جانے کسے زور و شور سے ہاتھ ہلا کر وہ ہنستے مسکراتے چہرے کے ساتھ سیدھی ہوئی تو فارس وجدان پر نظر پڑتے ہی اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔وہ پھول جنہیں وہ ہاتھ میں پکڑے تھی، ان کی ڈنڈیاں بھی ڈھلک سی گئی تھیں۔

فارس نے بٹن دبا کر بستر کو سٹنگ پوزیشن میں ایڈجسٹ کیا۔وہ اپنی جگہ کھڑی یکا یک اجنبی ہوگئی۔خاموش ہوگئی۔سپاٹ ہو گئی۔کچھ دیر پہلے تک اس کے چہرے پر جتنے بھی رنگ بکھرے تھے، وہ اب آنکھوں میں بھی نہ رہے تھے۔

شان بے نیازی سے اس نے اپنا رخ بدلا۔گلدان میں پھول ڈالے اور باہر نکل گئی۔دوبارہ اس کی آمد ڈاکٹر بخاری کے ہمراہ ہوئی تھی۔مگر وہ خود اندر نہیں گئی تھی۔

''میں اب ٹھیک ہوں، گھر جانا چاہتا ہوں......!''چیک اپ کے بعد وہ ڈاکٹر بخاری سے مخاطب تھا۔اور وہ ناخن کے ساتھ کھیلتی دروازے کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔

''اس پر ہم کل بات کریں گے، فی الحال تم صرف ریسٹ کرو۔''ڈاکٹر بخاری کہہ رہے تھے۔

''آپ سمجھ نہیں رہے۔مجھے کل میٹنگ......''

''فارس!''انہوں نے کچھ سختی سے اس کے بات کاٹی تھی۔''میرے خیال سے اس وقت تمہیں اپنے لیے تھوڑی سی سنجیدگی دکھانی چاہیے۔تمہیں اندازہ نہیں ہے کل تمہیں کس حالت میں ہاسپٹل لایا گیا ہے۔''

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

''تمہاری بیوی بہت بہادر ہے، ایسی سچویشن میں تو فیملی ممبرز حوصلہ چھوڑ دیتے ہیں پر اس نے ہمت نہیں ہاری۔'' دروازے پر کھڑی جنت کمال نے اپنا داہنا ہاتھ پیشانی پر مارا...... یہ ڈاکٹر بخاری۔ اف! کریڈٹ دینا ضروری تھا کیا؟

''ایمبولینس کے آنے تک اس نے تمہیں سی پی آر دیا......'' وہ تفصیلات میں جا رہے تھے۔ کچھ گھبرا کر وہ ان کی بات قطع کرنے کو تیزی سے اندر آ گئی۔ دونوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

ڈاکٹر بخاری مسکرائے۔ وہ اپنی اڑی ہوئی رنگت کے ساتھ مسکرا تک نہ سکی۔ اس نے فارس کی طرف دیکھے بغیر مسز شیرازی کا نمبر ملا کر موبائل اس کی طرف بڑھا دیا۔

''آنٹی سے بات کر لو۔'' پھر اسی سرعت سے وہ کمرے سے نکل گئی تھی۔

☆☆☆

ہاسپٹل کے وی آئی پی روم میں وہ کاؤچ پر بیٹھی سیب کاٹ رہی تھی جب اچانک ہی اسے اپنے چہرے پر نگاہوں کی تپش کا احساس ہوا تھا۔ بے ساختہ سر اٹھایا تو نگاہیں فارس سے ٹکرا گئیں جو سپاٹ چہرے کے ساتھ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے نظروں کا زاویہ بدلنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ جنت نے الجھ کر نظریں ہٹا لیں۔

ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے یوں اسے اپنی نظروں کے حصار میں لیا ہو۔ چند لمحوں کے بعد اس نے پھر سر اٹھایا۔ وہ اب بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ چہرہ بے تاثر تھا مگر آنکھوں کا تاثر غیر واضح۔ نہ غصہ تھا۔ نہ نرمی۔ نہ سختی۔ نہ عداوت...... پر سوچ نگاہوں میں کچھ اور تھا...... جنت پر عجیب سی گھبراہٹ طاری ہو گئی...... کہیں وہ اس تھپڑ کو یاد کر کے انتقام کا تو نہیں سوچ رہا......! اس کے چہرے کا رنگ فق ہوا۔ یہ بات تو وہ بھول ہی گئی تھی۔

''اب؟'' وہ فکروں میں پڑ گئی۔ ''میں اسے ظاہر نہیں ہونے دوں گی کہ ایسا کچھ ہوا ہے۔'' اس نے سوچا۔ ''صاف مکر جاؤں گی۔ بولوں گی تمہارا وہم ہے۔ تمہیں اپنا ہوش نہیں تھا تو یہ تھپڑ کا ہوش کہاں سے آ گیا؟''

ہمت مجتمع کر کے اس نے فارس کی طرف دوبارہ دیکھا۔ اس بار صحیح معنوں میں فارس کی نگاہوں کا تاثر اس پر واضح ہوا تھا۔ شاید تضحیک کا تاثر تھا۔ استہزائیہ نگاہیں تھیں۔ کچھ تو تھا۔ کچھ تو تھا آگ اور برف جیسا...... منجمد کرتا۔ جلا کر راکھ کرتا ہوا۔

جنت کے لب بھنچ گئے۔ بھنویں سکڑ گئیں۔

لاہور سے واپسی کے بعد خود سے کیے جانے والے سارے وعدے اسے ایک ہی لمحے میں یاد آ گئے۔ ان حدود و قیود اور فیصلوں کا بھی ادراک ہوا جن کی پاداش میں اس نے وجدان ہاؤس میں اپنی نقل و حرکت کو کم کر دیا تھا۔ اسے یاد آیا۔ چوبیس گھنٹے پہلے تک وہ فارس وجدان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتی بھی نہیں تھی اور یہ بھی کہ اس نے خود کو اس کے گھر میں اجنبی مسافر کر لیا تھا۔ اپنے

تعلق کو جیسے مسز شیرازی سے شروع کر کے مسز شیرازی تک ہی محدود کر لیا تھا۔ مگر اب؟

اب وہ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے اس کے ساتھ ہاسپٹل میں موجود تھی اور فارس وجدان کی مسز ہونے کے ناتے کچھ کام وہ بھی سرانجام دے رہی تھی۔ یعنی کہ اس کے ساتھ ساتھ رہنا۔ یہ سیب کاٹنا۔ اور اس پر بھی فارس کی نظریں......

وہ جانتی تھی، فارس وجدان کبھی بھی اس کے بارے میں مثبت نہیں سوچے گا۔ وہ ہر بار اور ہمیشہ کی طرح اس کے اٹھائے گئے ہر اقدام کے پیچھے کوئی غرض ڈھونڈے گا۔ اس سے قبل کہ وہ اب بھی ایسا ہی کرے، اسے اس کے نظروں میں گرائے، توہین کرے یا پھر اس کے عزت نفس پر چوٹ کرے، بہتر ہے، وہ کچھ باتیں خود ہی اس پر عیاں کر دے۔

''یہ مت سمجھنا کہ تمہیں ایمپریس کرنے کے لیے سیب کاٹ کر دے رہی ہوں، ڈاکٹر بخاری کا حکم ہے۔'' سخت لہجہ تھا۔ غصہ تھا۔ خفگی تھی۔ کہ اب میں تمہارے دل میں اپنی جگہ بنانے کی کوئی کوشش نہیں کر رہی ہوں، اس لیے تم مجھے تضحیک آمیز نگاہوں سے مت دیکھو۔

بستر پر آرام دہ حالت میں نیم دراز وہ اسے خاموشی سے دیکھے گیا۔

اس نے دوسرا سیب اٹھا لیا۔ اسے لب بھینچ کر نفاست سے کاٹنے لگی۔ جیسے سزا کاٹی جاتی ہے بالکل ویسے ہی۔

''میں نے تمھاری جان نہیں بچائی...... خود کو بیوہ ہونے سے بچایا ہے...... اپنا بھلا سوچا ہے۔ ورنہ جس طرح تمہیں میری کوئی پرواہ نہیں ہے بالکل اسی طرح مجھے بھی تمھاری رتی برابر پرواہ نہیں ہے۔'' سر اٹھا کر سرد نظروں سے فارس وجدان کو دیکھنا چاہا۔ موبائل اسکرین پر نگاہ جمائے اس کا متبسم چہرہ...... جنت ساکت ہو گئی۔

وہ مسکرا رہا ہے؟ بخدا وہ مسکرا رہا ہے؟ کس لیے؟ کوئی لطیفہ سنایا ہے اس نے؟

''اور یہ بھی مت سوچنا کہ......''

''میں کچھ نہیں سوچ رہا۔''

اپنی بات ادھوری رہ جانے پر...... اور بروقت اس کا رسپانس مل جانے پر وہ چپ ہوئی تھی۔

وہ اپنے موبائل کی طرف متوجہ تھا۔ کچھ ٹائپ کر رہا تھا یقیناً۔ انداز اب مصروفیت لیے ہوئے تھا۔ کچھ دیر پہلے تک۔ جو ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر تبسم بکھرا تھا اب اس کے جگہ ازلی سرد مہری نے لی تھی۔

وہ مضطرب ہوئی...... پھر سیب کی پلیٹ اس کے بستر پر رکھ کر پلٹنے ہی لگی تھی کہ اس کا داہنا ہاتھ فارس کی گرفت میں آ گیا۔ جنت کا دماغ جیسے بھک سے اڑا...... جھٹکے سے مڑ کر اس نے حیرت و بے یقینی سے اسے دیکھا۔

''اسی ہاتھ سے تھپڑ مارا تھا؟''

جنت کے ہوش اڑ گئے۔آنکھوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔اوپر سے اس کی گہری آنکھوں کا تاثر......برف اور آگ کا مشترکہ تاثر......جنت کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی......وہ جو سوچے ہوئے تھی کہ فوراً سے مکر جائے گی۔ڈٹ جائے گی۔یا لاجواب کردے گی تو......تو......

''میرا ہاتھ چھوڑو!'' کچھ متوحش ہو کر اس نے اپنا ہاتھ کھینچا۔اس حالت میں بھی فارس کی گرفت کسی آہنی شکنجے جیسی تھی۔ حالانکہ ڈاکٹر بخاری اسے صرف اس لیے ڈسچارج نہیں کر رہے تھے کہ اسے بہت کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔

''پہلے جواب دو!''

''میں جواب دینے کی پابند نہیں!'' ذرا سا رعب دکھانا چاہا، نتیجتاً گرفت سخت ہو گئی۔

''نہیں، وہ یہ والا ہاتھ نہیں تھا!'' بے بسی سے چلائی......(حالانکہ مجرم ہاتھ یہی تھا)

''ٹھیک ہے، دوسرا ہاتھ دو۔''

''پہلے تم یہ چھوڑو۔'' اپنا کلائی گھما کر کھینچتے ہوئے وہ بہت خوف زدہ لگ رہی تھی۔

''پہلے تم دوسرا ہاتھ دو۔'' گرفت کے ساتھ ساتھ فارس کا لہجہ بھی سخت ہوا تھا۔

جنت نے پورا زور لگا دیا۔مگر فارس نے ہاتھ نہیں چھوڑا۔

ایک لمحے کے لیے جیسے کوئی منظر آنکھ کے پردوں پر لہرایا۔سدرہ کی شادی۔ پارکنگ ایریا۔رات کی تاریکی اور زمان صفدر۔وہ چہرہ زمان کا چہرہ تھا۔اور گرفت بھی جیسے اس کی ہی تھی۔ایک لمحے کے لیے اسے لگا اگر اس نے ہاتھ نہ چھڑایا تو مر جائے گی۔اور اس نے چھڑانے کی کوشش بھی کی تھی۔

اس رات بھی ایک تماشا بنا تھا۔اس رات بھی ایک کہانی اس کی ذات سے منسوب ہوئی تھی۔زمان کو ٹھکرائے جانے کا احساس بمع اس تھپڑ کے مشتعل کیے ہوئے تھا جو روحینہ چچی کے گھر ان کے ٹیرس پر اس وقت پڑا تھا جب بغیر اجازت وہ اس کے کمرے میں آ گیا تھا۔یہ ان دنوں کی بات تھی جب اس کا رشتہ زمان سے تقریباً طے ہو چکا تھا۔مگر فارس سے شادی کے بعد سے وہ جیسے موقع کے انتظار میں تھا کہ کب وہ جنت کمال سے اپنی توہین، بے عزتی اور تھپڑ کا بدلہ لے سکے۔اور یہ موقع اسے کب ملا تھا؟ کچھ دیر پہلے تک وہ جو مضبوط نظر آ رہی تھی تو اسی سرعت سے مٹی کے ڈھیر کی طرح بھر بھرا بھی گئی۔

''پلیز......چھوڑ دو......پلیز!'' وہ چھوٹے بچے کی طرح یک دم پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اس کی آنکھوں کی نمی......خوف......وحشت......اور ہاتھ چھڑانے کی دیوانہ وار جستجو۔

فارس کی گرفت یک دم ڈھیلی پڑ گئی۔روتی سسکتی آنکھوں کے ساتھ اپنا ہاتھ چھڑا کر وہ اسی وقت کمرے سے نکل گئی تھی۔

☆☆☆

اس کے بعد وہ اندر نہیں آئی تھی۔ڈاکٹر بخاری کے علاوہ چند ایک دوست بھی اس سے ملنے آ چکے تھے۔عدیل احمد بھی کمپنی کے کچھ معاملات ڈسکس کرنے آیا تھا۔مسز شیرازی سے بھی اس کی بات ہوئی تھی مگر جنت کمال دوبارہ کمرے میں نہیں آئی تھی۔

مغرب سے پہلے ہی نرس نے اسے ڈرپ لگائی تھی۔کچھ ادویات کا اثر تھا اور کچھ اس محلول کا بھی جو اس کی نسوں میں سرایت کر رہا تھا کہ وہ سو گیا تھا۔

اور پھر رات کے جانے کس پہر جنت کے مسلسل بجتے موبائل کی آواز سے ہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔دواؤں کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے اسے ارتکاز پکڑنے میں کچھ دقت ہوئی تھی۔وجود بھاری ہو رہا تھا۔بمشکل کہنیوں کے بل اوپر ہوتے ہوئے اس نے اطراف میں نگاہ دوڑائی۔

جنت کمرے میں نہیں تھی......

انگلیوں سے آنکھیں مسلتے ہوئے کسی قدر کوشش سے وہ اٹھ بیٹھا تھا۔

اگر اس کا ہینڈ بیگ اور موبائل گلاس ٹیبل پر نہ پڑے ہوتے تو وہ یہی سمجھتا کہ وہ گھر چلی گئی ہو گی۔تاہم وہ ہاسپٹل میں ہی موجود تھی۔مگر یہاں نہیں آ رہی تھی۔

ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں کے سامنے جنت روتا سسکتا چہرہ لہرا گیا۔گھر کی طرح اب بھی وہ ہاسپٹل کے کسی کونے میں روتی پائی گئی تو؟

لب بھینچ کر اس نے بے اختیار اپنی پیشانی کو مسلا......کچھ سوچ کر وہ باہر آ گیا۔چند قدم اٹھانے سے ہی اس کا تنفس پھول گیا تھا۔پیشانی عرق آلود ہونے لگی تھی۔

وارڈ میں وہ نہیں تھی۔یقیناً وہ نیچے ہو گی۔یا پھر باہر لان میں۔اسے غصہ آنے لگا۔

سیڑھیاں اتر کر اس نے ویٹنگ ایریا کا رخ کیا تھا۔اور تب ہی وہ اسے سامنے بیٹھی دکھائی دے گئی تھی۔

اطراف سے یکسر بے نیاز، لبوں پر مسکراہٹ سجائے وہ تین چار ماہ کے ننھے سے بچے کو بانہوں میں لیے فیڈر سے دودھ پلا رہی تھی۔بچہ اس کی گود میں پرسکون تھا۔وہ ہر تھوڑی دیر بعد اس کا ننھا سا ہاتھ، اس کا ماتھا، اس کا گال چومنے لگتی تھی۔

اطراف میں بکھری سفید روشنیوں میں وہ اس پر نگاہ جمائے کھڑا رہ گیا۔وہ منظر کسی خواب۔کسی خیال کا سا تھا۔

''آئم رئیلی سوری میں نے آپ کو زحمت دی!'' سیاہ پینٹ شرٹ میں ملبوس چھبیس ستائیس برس کا نوجوان چہرے پر تھکن اور پریشانی کے تاثرات لیے روم سے نکل کر جنت کے پاس آ گیا تھا۔

"آپ اپنے بچے کو زحمت کہہ رہے ہیں؟" جنت نے سر اٹھا کر ذرا سی خفگی دکھائی۔ جواباً وہ مسکرا دیا۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے وہ انجان لڑکی اس کا بچہ سنبھال رہی تھی۔ وہ اس کا بے حد شکر گزار تھا۔

"میری مدر ابھی آتی ہی ہوں گی۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"اٹس او کے، آپ پریشان مت ہوں، اگر کوئی نہیں بھی آتا تو میں اسے سنبھال لوں گی۔" جنت نے نیلگوں کمبل سوئے ہوئے بچے پر ڈالا۔ "اب آپ کی وائف کی طبیعت کیسی ہے!؟"

"بہتر ہے۔" وہ ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا تھا۔

"اسے آپ مجھے دے دیں، آپ تھک گئی ہوں گی۔" اس نے بچے کو لینا چاہا۔ جنت انکار کرنے ہی والی تھی کہ نگاہ فارس وجدان پر پڑ گئی۔ کچھ دیر پہلے جب وہ کمرے میں گئی تھی تو وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ اور اب......

کچھ حیرت...... کچھ بے یقینی سے اس نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا۔ بچے کو اس کے باپ کے حوالے کر کے فوراً سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر اسی سرعت سے قدم اٹھاتی اس کے پاس آ گئی۔ چہرے پر صبح کے واقعے کا اب کوئی تاثر نہیں تھا۔ بس وہی خفگی تھی...... غصہ تھا...... اجنبیت تھی جو لاہور سے واپسی کے بعد سے اس کا خاصہ رہی تھی۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس نے دبی آواز میں جھاڑ کر پوچھا تھا۔

وہ خاموش تھا...... وہ خاموش ہی رہا......

"تمہارا ہاسپٹل سے ڈسچارج ہونے کا ارادہ ہے بھی یا نہیں؟"

وہ تب بھی کھڑا رہا۔

اس کی خاموشی اور نگاہوں کے غیر معمولی تاثر کو دیکھ کر جنت الجھن میں پڑ گئی۔ شاید وہ اب بھی نیند میں ہی تھا۔ ورنہ وہ اٹھ کر باہر کیوں آتا؟ بت بن کر کھڑا کیوں رہتا؟ اور اسے بھی ایسے کیوں دیکھتا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو؟

گہرا تنفس لے کر خدا کی پناہوں میں آتے ہوئے اس نے کچھ محتاط ہو کر فارس کے بازو پر گرفت جمائی اور اپنے ساتھ لے جانے لگی۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے وہ بہت آہستگی سے قدم اٹھا رہا تھا۔ جیسے بمشکل اٹھانے پڑ رہے ہوں۔ آدھے سے زیادہ قوت تو خود جنت کو لگانی پڑ رہی تھی۔

بیڈ پر بٹھاتے ہوئے جنت نے بلب جلا دیا۔ پھر لحاف بھی ہٹا دیا۔

"تم صبح سے باہر کیا کر رہی ہو؟" آواز بوجھل تھی۔ مگر سوال پورے ہوش و حواس میں ہی پوچھا گیا تھا۔

جنت نے ڈر کر یوں جھٹکا کھایا جیسے رات کے سناٹے میں کسی بھوت نے مخاطب کر لیا ہو، پھر اسی سرعت سے ایسے پیچھے ہٹی

جیسے پہلے والا فارس کوئی اور ہو، اب والا فارس کوئی اور ہو گیا ہو۔

"تم ایکٹنگ کر رہے تھے؟" آواز صدمے سے پھٹ گئی تھی۔

"کس بات کی؟"

جنت نے لب بھینچ کر مٹھیاں بند کر کے اسے انتہائی غصے سے دیکھا۔

"ابھی تم ایسے ظاہر کر رہے تھے جیسے تمہیں اپنا کوئی ہوش نہیں۔" سرد لہجے میں جرم کی نشان دہی کی گئی۔

"ریئلی؟ یہ کب کی بات ہے؟" بیڈ پر لیٹتے ہوئے اس نے کچھ حیرت سے پوچھا۔

جنت کو جیسے آگ لگ گئی۔ اچھا مذاق بن رہا تھا اس کا۔ یہی کمی رہ گئی تھی کہ اب توہین کے ساتھ ساتھ اسے بے وقوف بھی بنایا جائے گا۔

مٹھیاں بھینچ کر ضبط کرتی وہ اسی وقت کمرے سے چلی گئی۔ دوبارہ اس کی واپسی نرس کے ساتھ ہوئی تھی۔ خوب شکایات لگا کر لائی تھی وہ اسے کہ مریض وارڈ کے چکر لگاتا پھر رہا ہے اور آرام کرنے کے بجائے باتیں بنائے جا رہا ہے مگر نرس نے دیکھا۔ کیسے وہ مریض گہری نیند سو رہا تھا۔ اور کیسے اس کی بیوی خواہ مخواہ اس پر الزام لگائے جا رہی تھی۔

ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہونے والے بیشتر شوہر صابر ہوتے ہیں۔ اور بیویاں ظالم۔

وہ چلی گئی تو جنت نے لب بھینچ کر فارس کو دیکھا۔

وہ کروٹ کے بل آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ اس نے سر نہیں اٹھایا تھا۔ مزید کوئی بات بھی نہیں کی تھی۔

وہ خفگی کے عالم میں جھٹکے سے مڑ کر صوفے پر جا بیٹھی تھی۔

☆☆☆

سیاہ جینز کے ساتھ آف وائٹ شرٹ پر، سرمئی راؤنڈ نیک سویٹر میں ملبوس وہ اپنے سیاہ سنیکرز کے تسمے باندھ کر جب سیدھا ہوا تو نگاہ جنت کمال پر جا ٹھہری رہی جو ڈاکٹر بخاری سے کافی بے دلی سے انسٹرکشنز لے رہی تھی۔ آج اسے ہاسپٹل سے ڈسچارج کیا جا رہا تھا اور جنت اس فیصلے سے قطعی خوش نہیں لگ رہی تھی۔

عجیب الجھا ہوا سا انداز تھا اس کا۔ کوفت زدہ سی ہو رہی تھی وہ۔ کچھ کچھ پریشان بھی تھی۔ جیسے ایک محفوظ آشیانہ چھوٹ رہا ہو۔

گاڑی میں بھی وہ دروازے کی طرف کافی سمٹ کر بیٹھی تھی۔ بازو سینے پر باندھ رکھے تھے۔ ہاتھ چھپا رکھے تھے۔ شال اچھی طرح سے اوڑھ رکھی تھی۔ دوران سفر ان کے مابین کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ گھر پہنچ کر بھی خاموشی حائل رہی تھی۔ کھانے کی میز پر، مسز شیرازی کے کمرے میں، شام کی چائے پر اس کا انداز الجھا ہوا سا تھا۔ جیسے وہ موجود ہے اور نہیں بھی۔ اس کی تمام تر کوشش یہی

تھی کہ وہ بس کسی طرح ادھر ادھر کے کاموں میں الجھی رہے۔

جب وہ آرام کی غرض سے اپنے کمرے میں گیا تھا تو وہ جان بوجھ کر ہی نیچے لاؤنج میں بیٹھی رہی تھی حالانکہ تھکاوٹ اسے بھی تھی۔ ہاسپٹل میں بے آرام وہ بھی تو ہوئی تھی۔ مگر اسے فی الحال کمرے میں نہیں جانا تھا۔ جانے کیوں ایک ان جانا سا خوف دماغ پر سوار ہو گیا تھا۔

چینل پر چینل بدلتے ہوئے اس نے اقصیٰ کو بھی اپنے پاس ہی بٹھائے رکھا۔ ڈرائی فروٹس کی پلیٹ سامنے ہی دھری تھی۔ میگزین کے صفحے کھلے پڑے تھے۔ کسی آرٹیکل کو یکسوئی سے پڑھا جا رہا تھا۔

وہ صوفے پر تھی اور اقصیٰ فلور کشن پر۔

''اقصیٰ!'' کچھ سوچ کر اس نے بڑے ہی رازدارانہ انداز میں اسے مخاطب کیا تھا۔

''جی جنت آپی!'' (جنت نے ہی اسے منع کر رکھا تھا کہ وہ اسے بی بی نہ کہے)

''تمہیں کیا لگتا ہے، مرد اس بات کو کتنا سیریس لیتا ہے اگر کوئی عورت اسے تھپڑ مار دے۔''

اقصیٰ کا تیزی سے چلتا منہ رک گیا۔ ٹی وی اسکرین سے نظریں ہٹا کر اس نے جنت کو دیکھا۔

کیچر میں جکڑے شہد رنگ بال۔ جن کی کچھ لٹیں متفکر سے مومی چہرے پر بکھری ہوئی تھیں۔

''یہ جو مرد ہوتے ہیں نا آپی۔ بڑے ہی عجیب ہوتے ہیں قسم سے۔ کسی عورت سے پڑنے والے تھپڑ کو اپنی انا اور عزت کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ اور سوچ لیتے ہیں کہ بس اب ہر صورت انتقام ہی لینا ہے۔'' اقصیٰ نے اپنے مخصوص انداز میں بات کر کے سسپنس کی انتہا کر دی۔

''کیسا انتقام؟'' جنت کے لب ہلے۔ وہ اتنی کمزور اور بے بس کبھی نہیں ہوئی تھی جتنی کہ اب ہو رہی تھی۔ گویا اسے فارس وجدان سے کسی بھی اچھائی کی کوئی توقع نہیں تھی۔

''امیر زادے سیریل کلر ہائیر کرتے ہیں، کچھ اغوا بھی کروا لیتے ہیں، کچھ ساری عمر کے لیے قیدی بنا لیتے ہیں اور کچھ......''

جواب فارس وجدان نے دیا تھا۔ اور اتنے اچانک سے دیا تھا کہ وہ مارے بوکھلاہٹ کے صوفے سے اچھل کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور پھر اسی سرعت سے اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا تھا۔

سرمئی ٹراؤزرز پر ہلکے آسمانی رنگ کے سویٹر میں ملبوس، لاپرواہ سے حلیے میں......وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا......سرد نگاہیں جنت کے چہرے پر جمی تھیں۔

کندھے سے پھسلتی شال کو ٹھیک سے اوڑھتے ہوئے جنت نے حلق سے گلٹی کو بمشکل نیچے اتارا۔ اقصیٰ کا لحاظ کر کے اپنی

گھبراہٹ پر قابو پایا۔ خوف کو بھگا کر سر اٹھایا۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو!؟'' سوال اقصیٰ سے پوچھا گیا تھا۔ اور ذرا سی سختی کے ساتھ پوچھا گیا تھا۔

''جنت آپی نے کہا کہ انہیں نیند نہیں آ رہی تو......''

''تو تم نے سوچا، بیٹھ کر لوری سنا دیتی ہوں شاید اس طرح آ جائے۔''

اقصیٰ نے گڑبڑا کر فارس کو دیکھا پھر سر جھکا لیا۔

''جاؤ!'' حکم ملتے ہی وہ پیروں میں چپل اڑستی، اپنے میگزین سنبھالتی فوراً روپوش ہو گئی۔

اب لاؤنج میں جنت کھڑی تھی اور سامنے فارس۔

وہ اپنی کیفیت سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ خوف کس بات کا تھا آخر؟ وہ اس سے ڈر کیوں رہی تھی؟

ایک تھپڑ ہی تو تھا؟ جو کہ ناگزیر تھا۔ بے دردی اور نفرت کے ساتھ دو بار دھکیلا تھا اس نے۔ جیسے وہ کوئی اچھوت ہو۔ جس کے قریب آنے سے اس کی موت واقع ہو جانی ہو۔ ایسی صورت میں اگر اس نے غصے میں تھپڑ مار بھی دیا تو کیا ہوا؟ وہ بھی تو سختی دکھاتا رہا ہے؟ کمرے سے نکالتا رہا ہے؟ وہ بھی تو اسے پارکنگ ایریا میں چھوڑ کر آیا تھا۔

تیزی سے بھاگتا دوڑتا ذہن رک گیا۔ سوکھے پتے کی طرح لرزتا دل تھم گیا۔

ہمت مجتمع کر کے اس نے سر اٹھایا......لب بھینچ کر، فارس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں تاکہ اسے یہ تاثر دے سکے کہ وہ ہرگز ہرگز اس سے خائف نہیں۔

فارس اگلے چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہا۔ وہ بھی ڈٹ کر کھڑی رہی۔

''تھپڑ کی سزا ڈائریکٹ مجھ سے پوچھ لو۔'' بالآخر اس نے خاموشی کا قفل توڑا۔

''سزائیں غلطیوں کی ہوتی ہیں اور میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔''

''یعنی تمہیں کوئی پچھتاوا، کوئی احساس نہیں؟''

جنت نے آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھا۔ یہ پچھتاوے اور احساس کی بات کون کر رہا ہے؟

''کس بات کا پچھتاوا؟'' لہجے میں قہر بھر کر پوچھا۔ ''شاید تمہیں یاد نہیں۔ دو بار دھکیلا تھا تم نے مجھے، دو بار۔'' انگلیاں کھڑی کر کے دکھائیں۔

''تو پھر تم دور کیوں نہ ہوئیں۔ اوہ ہاں یاد آیا۔ تمہیں ڈر تھا، کہیں تم بیوہ نہ ہو جاؤ۔'' فارس کا لہجہ استہزائیہ ہوا۔

جنت کا چہرہ مارے خفت کے سرخ ہو گیا۔ کاش وقت اسے پیچھے لے جائے اور وہ ہاسپٹل میں سیب کاٹتے ہوئے خود کو ایک

عدد تھپڑ سے نواز سکے۔اے کاش......اے کاش......

''ہاں، مجھے اپنی فکر تھی۔اور بہت زیادہ فکر تھی۔تمہیں اس سے کیا؟'' ڈٹ کر، جم کر، ایک بار پھر سر اٹھا کر غرائی۔

جیبوں میں ہاتھ ڈالے، ذرا سا سر جھکا کر وہ بمشکل کندھوں تک پہنچتی جنت کمال کو اگلے چند لمحوں تک دیکھتا رہا۔پھر سر جھٹک کر جانے کے لیے مڑ گیا۔اس کا رخ آفس روم کی طرف تھا۔گویا وہ اپنے کسی کام سے ہی نیچے آیا تھا۔

ایک سرد نظر اس پر ڈالتی وہ زینہ طے کرتی کمرے میں چلی گئی۔اس نے تکیہ اور کمبل اٹھایا پھر تن فن کرتی سٹنگ ایریا میں صوفہ کم بیڈ پر جا سوئی۔تیور بگڑے ہوئے تھے۔جبڑے بھینچے ہوئے۔اور آنکھوں میں غصے کے ساتھ ساتھ بے نام سی خفگی لہرا رہی تھی۔

☆☆☆

اسٹڈی روم میں وہ پچھلے ایک گھنٹے سے موجود تھا۔فائلز دیکھتے، سائن کرتے، ضروری رپورٹس کا سرسری سا جائزہ لیتے اسے کافی کی طلب ہوئی تھی تو وہ اٹھ کر باہر آ گیا تھا۔سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کی سماعت سے جنت کی آواز ٹکرائی تو رفتار خود ہی مدھم ہو گئی۔پہلے اس کا خیال تھا وہ، ممی سے ہی بات کر رہی ہو گی مگر وہ تو اس وقت تک سو جاتی تھیں۔

کچن کی طرف دیکھتے ہوئے وہ سیڑھیوں کے پاس ہی رک گیا تھا۔یوں کہ اب وہ اوپن کچن ایریا کو عقبی حصے سے با آسانی دیکھ سکتا تھا۔

''اب دیکھیں مجھے۔میں کہیں سے آپ کو پریشان یا اپ سیٹ لگ رہی ہوں۔''

موبائل کچن کاؤنٹر ٹیبل پر اسٹینڈ پوزیشن پر رکھ کر وہ الٹے قدم پیچھے ہوتے ہوئے مسکرائی تھی۔اسکرین پر سائرہ خالہ کا چہرہ واضح تھا۔ان کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ ابھری تھی مگر آنکھوں میں فکر ٹھہری رہی تھی۔

کاؤنٹر ٹیبل کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے وہ اب براہ راست انہیں دیکھنے لگی تھی۔پورے ایک ہفتے بعد جنت نے ان کی کال ریسیو کی تھی۔پورے ایک ہفتے بعد خود سے رابطہ کیا تھا۔

''تم نے فارس سے بات کی؟''

''کس بارے میں؟'' وہ ان جان ہو گئی۔

''جو کچھ......اس رات ہوا۔'' خالہ محتاط ہو کر پوچھ رہی تھیں۔

جھکے سر کے ساتھ جنت نے نفی میں سر ہلایا۔

''کیوں؟''

''میں نے ضروری نہیں سمجھا۔'' آہستگی سے مڑ کر برنر بند کر دیا۔چائے کی کیتلی سے کپ میں انڈیلنے لگی۔

''اب دیکھیں، غلطی تو میری ہی ہے نا! فارس نے تو کہا تھا کہ ساتھ ہی چلو۔میں نے ہی ضد کی کہ سدرہ کا ولیمہ اٹینڈ کر کے ہی جاؤں گی۔''

پلر کے پیچھے سیڑھیوں کے پاس جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے کھڑا رہا تھا۔

''تمہارے خالو صفدر بھائی سے ملے تھے۔بات بھی کی تھی۔سمجھایا بھی تھا۔لیکن تم تو جانتی ہو زمان کس نیچر کا ہے۔مجھے فکر ہو رہی تھی کہ کہیں وہ......''

''کہیں وہ مجھے نقصان نہ پہنچا دے؟'' اس نے مڑ کر اچھنبے سے سائرہ خالہ کو دیکھا پھر ہنس دی۔اس کی ہنسی کھوکھلی تھی۔اس کی آنکھیں جھوٹی تھیں۔اس کے تاثرات مصنوعی تھے۔اس کی بہادری دھوکا تھی۔

''میں سوچ رہی تھی اگر میں فارس کو اعتماد میں لے کر بات کروں......ہو سکتا ہے وہ اس مسئلے کا کوئی حل......''

''آپ یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں خالہ!'' جنت نے فوراً انہیں ٹوک دیا۔

''جنت! میں جانتی ہوں کہ......''

''آپ نے پہلے بھی اسے دھوکا دیا۔آپ اب بھی اسے دھوکا دیں گی؟'' اس کا رویہ بدلا تھا۔اس کی ہمت بکھری تھی۔اس کا حوصلہ ٹوٹا تھا۔سائرہ خالہ صدمے سے گنگ اسے دیکھ کر رہ گئیں۔''جنت!''

اور پھر لفظ گویا ختم ہو گئے۔وہ مزید کچھ کہہ ہی نہ سکیں۔

''وعدہ کریں، آپ ایسی کوئی بھی بات اس سے نہیں کریں گی، کبھی بھی نہیں......'' اس نے دوٹوک لہجے میں کہہ دیا تھا۔سائرہ خالہ اسے بے بسی سے دیکھ کر رہ گئیں۔

''میری زندگی میں سب نارمل ہے، میں نہیں چاہتی پھر سے کوئی طوفان اٹھے اور میرا تماشا بنے۔''

''لیکن زمان چپ نہیں بیٹھے گا۔'' سائرہ خالہ کو بس یہی فکر تھی۔

جنت نے آگے سے کوئی جواب نہیں دیا۔نہ پریشان ہوئی......نہ خوف کا اظہار کیا......ایسے جیسے وہ مسئلہ کوئی مسئلہ رہا ہی نہ تھا۔

''مجھے تمہیں شادی اٹینڈ کرنے کے لیے فورس نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' کافی دیر تک جب وہ کچھ نہ بولی تو انہوں نے کہا۔

''آپ نے فورس نہیں کیا تھا۔میں اپنی مرضی سے آئی تھی۔'' پورے اعتماد کے ساتھ اس نے جھوٹ بولا۔پھر ایک لمحے کا توقف کیا......'' آپ میرے لیے اس طرح فکر مند ہوتی ہیں تو مجھے اچھا نہیں لگتا خالہ! ٹھیک ہے بڑے بابا نے آپ کو وصیت کی تھی میرے بارے میں۔لیکن آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ میری شادی ہو چکی ہے اور اب میں اپنے گھر میں بہت خوش ہوں۔یہاں سب

میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ آنٹی مجھے بہت چاہتی ہیں۔''

چائے کا گھونٹ بھر کر اس نے پھر انہیں دیکھا۔ وہ خاموش تھیں۔

''اگر فیصل بھائی کہہ رہے ہیں تو کینیڈا شفٹ ہو جانے میں حرج ہی کیا ہے؟ اب تو سدرہ کی بھی شادی ہو گئی ہے۔ میں بھی اپنے گھر کی ہو گئی ہوں۔ اب تو آپ کو مکمل سکون سے چلے جانا چاہیے۔''

سائرہ خالہ نے پوری بات خاموشی سے سنی پھر کچھ یاد آ جانے پر انہوں نے فارس سے متعلق پوچھا......انہیں غالباً مسز شیرازی نے ہی بتایا تھا کہ وہ دو دن ہاسپٹل میں ایڈمٹ رہا ہے۔ اور باتوں کے دوران انہیں پوچھنا یاد ہی نہ رہا۔

جنت کے تاثرات یک دم بدل گئے۔ بھنویں غیر محسوس انداز میں سکڑ گئیں۔ ''گیس واٹ! اسے کیٹ الرجی ہے؟ کیا آپ یقین کر سکتی ہیں میرے شوہر کو کیٹ الرجی ہے؟''

اور اس تمام عرصے میں سائرہ خالہ کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ بکھری تھی اور پھر وہ ہنس پڑیں۔ جنت بلیوں کے لیے کتنی دیوانی تھی، ان سے بہتر اور کوئی نہیں جان سکتا تھا۔

''میں نے سوچا تھا یہاں سیٹ ہو جاؤں گی تو پھر بلی پالوں گی۔ میں نے مسز درانی سے بات تک کر لی تھی کہ ان کی ایرانی کیٹ کا ایک بچہ میں لوں گی۔ اور اب۔'' گہرا تنفس لے کر اس نے بے بسی سے ہاتھ اٹھا کر ڈھیلے چھوڑ دیے۔

''آپ کو کم از کم رشتہ طے کرنے سے پہلے یہ تو معلوم کروا لینا چاہیے تھا کہ لڑکے کو بلیاں پسند ہیں بھی یا نہیں؟'' وہ اب ان پر خفا ہو رہی تھی۔

''اتنا سیریس مسئلہ تو نہیں ہو گا جنت۔'' وہ ہنستے ہوئے بولیں۔

''وہ دو دن ہاسپٹل میں رہا ہے خالہ! اب آپ خود سمجھ جائیں، یہ اس کے لیے کتنا سیریس مسئلہ ہے۔''

''تو ٹھیک ہے دور دور سے بلیوں کو ہیلو ہائے کر لیا کرو۔ اب شوہر کے لیے اتنا تو کرنا پڑے گا۔''

خالی کپ سنک میں دھوتے ہوئے جنت نے ذرا سی خفگی کے ساتھ انہیں دیکھا۔

''آپ کو میرا غم......غم نہیں لگ رہا ہے۔''

''نہیں بچے......میں آپ کے غم میں برابر کی شریک ہوں۔'' وہ ہنس دیں۔

''اچھا یہ بات کسی سے بھی شیئر مت کیجیے گا۔'' دوپٹے کے ساتھ ہاتھ خشک کرتی وہ موبائل سکرین کی طرف جھکی۔

''کون سی بات؟''

''یہی کہ فارس کو بلیوں سے الرجی ہے! مجھے لگتا ہے گھر میں ملازموں کو بھی نہیں معلوم، ایک طرح سے یہ ٹھیک بھی ہے۔ اگر یہ

بات باہر نکلے اور کسی کو پتا چل جائے فارس کا ری ایکشن کتنا شدید ہوتا ہے تو یقیناً اس کے دشمن اس بات کا فائدہ اٹھانا چاہیں گے۔ ہے نا؟''

خالہ اس کی سوچ پر انگشت بہ دنداں رہ گئیں۔

''یہ بڑے بڑے کاروباری لوگوں کے دشمن بھی تو بڑے بڑے ہوتے ہوں گے۔''

خالہ اس کے سوچ پر حیران ہو رہی تھیں۔ یہ خیال ان کے ذہن میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں آیا تھا۔

''اقصی۔ بھی سارا وقت میرے ساتھ رہی لیکن میں نے اسے بھی بھنک نہیں پڑنے دی کہ وہ ہاسپٹل میں کس وجہ سے ہے۔'' بہت محتاط انداز میں۔ سنجیدگی اور سمجھداری سے وہ ان سے بات کر رہی تھی۔ انداز پر اسراریت لیے ہوئے تھا۔

''ہاں۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو!'' انہوں نے اعتراف کیا۔

اور تب ہی قدموں کی آہٹ پر اس نے بے ساختہ سر اٹھایا۔ پھر گھوم کر کاؤنٹر ٹیبل کی طرف آئی۔ اور وہیں سے اس نے بہت آگے تک دیکھا۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

''اچھا خالہ! آپ سے پھر بات ہو گی۔'' ان کو الوداع کر کے اس نے کچن کی لائٹس آف کر دیں۔ سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے اس کی نظر بے ساختہ ہی آفس روم کی طرف اٹھ گئی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اور فارس وجدان ریک سے کچھ فائلز نکالتا نظر آ رہا تھا۔

سر جھٹک کر وہ سیڑھیاں چڑھ گئی۔

''مجھے گرنے سے ڈر نہیں لگتا خان! میں پندرہ دن پہلے پارکنگ ایریا میں گری تھی۔ اور پھر خود اٹھ کر گئی تھی۔ اب بھی اگر گروں گی تو اٹھنے کی ہمت ہے مجھ میں۔''

آفس چیئر پر بیٹھتے ہوئے اس نے فائل ٹیبل پر رکھ دی تھی۔ جیب سے موبائل نکال کر نمبر ملاتے ہوئے وہ مسلسل اپنی پیشانی مسل رہا تھا۔ اور پھر تاریخ کے ساتھ ساتھ شادی ہال کی تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے اس نے عدیل احمد سے دس سے بارہ بجے کے درمیان پارکنگ ایریا کی سی سی ٹی وی فوٹیج طلب کر لی تھی۔

☆☆☆

اس نے سارا دن خود کو مسز شیرازی کے ساتھ مصروف رکھا۔ کافی عرصے بعد اس کے اصرار پر وہ قدرتی مناظر کی ایک پینٹنگ بنا رہی تھیں۔ ان کے اسٹوڈیو میں چھوٹے سائز کارپٹ پر بیٹھ کر وہ بھی کنوینس پر ایسے ہی رنگ بکھیرنے لگی تھی۔

سبز، سنہرا، سیاہ، سرخ، گلابی......رنگوں سے کھیلتے اس کی توجہ ایک بار پھر فارس وجدان کے باکس کی طرف چلی گئی۔

ہاتھ بڑھا کر اس نے باکس اپنی جانب گھسیٹ لیا۔ ایک بار پھر کھول کر وہ اشیاء کا جائزہ لینے لگی۔ نیچے، بہت نیچے تصویروں کا ایک البم بھی تھا۔ رخ بدل کر اس نے مسز شیرازی کی طرف دیکھا۔ گو کہ وہ جانتی تھی اگر انہوں نے دیکھ بھی لیا تب بھی انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا مگر پھر بھی۔ جانے کیوں وہ کچھ محتاط سی ہو رہی تھی۔ اس نے البم کھول دیا۔ پہلی تصویر سامنے تھی۔

سنہری آنکھوں میں بلا کی معصومیت لیے وہ چار پانچ سال کا ایک خوب صورت بچہ تھا۔ دھوپ میں اس کی رنگت گلابی ہو رہی تھی۔ شہد رنگ کی آمیزش لیے چاکلیٹی رنگ کے نرم و ملائم بال قدرے لمبے تھے۔ اس کی پیشانی پر بکھرے۔ گردن تک آئے ہوئے۔

آنکھوں میں اشتیاق اور تجسس لیے وہ صفحے پلٹتی گئی۔

بیڈ پر، الماری کے سامنے، درخت کے نیچے، سرسبز میدان کے وسط میں...... رزلٹ کارڈ لیتے ہوئے، ٹرافی جیتتے ہوئے، کھیل کے میدان میں، گھوڑے کی پشت پر...... چھ سے سولہ سال تک کے فارس وجدان کی تصاویر اس کے سامنے تھیں۔ مگر کہیں بھی وہ مسکرا نہیں رہا تھا۔ ہر تصویر میں وہ اکیلا تھا۔ ہر تصویر میں اس کے تاثرات بھی ایک سے تھے۔ فیملی کا کوئی ایک فرد بھی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ حتیٰ کہ مسز شیرازی کے ساتھ بھی اس کی کوئی تصویر نہ تھی۔

البم کے آخر میں ایک تصویر تھی۔

سرسبز باغ کا منظر تھا۔ وہ شاہ بلوط کے سائے میں لکڑی کی باڑھ کے پاس کھڑا تھا۔ لڑھکتا ہوا فٹ بال اس کی طرف آ رہا تھا۔ اور جس طرف سے آ رہا تھا اس طرف پانچ چھ سال کی بچی کھڑی تھی۔ اس کی پشت کیمرے کی طرف تھی۔ اپنا سر اونچا کیے اس نے جوش سے ہاتھ اوپر اٹھا رکھے تھے۔ اس کی سفید فراک پر جگہ جگہ دھبے لگے تھے، سفید جرابیں تو مکمل طور پر مٹی سے اٹی ہوئی تھیں۔

پورے البم میں صرف ایک یہی تصویر ایسی تھی جس میں ایک ٹین ایجر فارس کے لبوں پر مسکراہٹ نظر آ رہی تھی۔ زندگی سے بھرپور ایک خوب صورت مسکراہٹ!

ایسے لگتا تھا جیسے یہ تصویر اس کی بے خبری میں لی گئی ہو۔

یکا یک کسی نے اس کے ہاتھوں سے البم لے لیا۔ اس نے چونک کر جھٹکے سے سر اٹھایا۔ سانس رک سا گیا۔

اسے ناگواری سے دیکھتے ہوئے فارس نے باکس میں البم پھینکا، جھٹ سے بند کیا اور اسے اٹھا کر الماری کے اوپری خانے میں رکھ دیا۔ اب کم از کم وہ اقصیٰ کی مدد کے بغیر اس باکس تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

فارس مسز شیرازی کے پاس چلا گیا۔ ان کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے جھکا تو مسز شیرازی نے محبت سے اس کے گال پر

ہاتھ رکھا۔ ''تم کب آئے؟''

''ابھی ابھی۔'' اسٹول کھینچ کر وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اب وہ کونیس پر سفید پھول کو دیکھ رہا تھا جس میں مسز شیرازی سرخ لکیروں کا اضافہ کر رہی تھیں۔ اس نے اپنی ماں کے پر اشتیاق چہرے کو دیکھا۔ پھر رنگ سے اٹے اس برش کو۔

''بالآخر آپ نے برش اٹھا ہی لیا۔'' وہ مسکرایا۔

''یہ جنت کی وجہ سے ممکن ہوا، سب کچھ سیٹ کر کے مجھے بٹھا دیا کہ کچھ بنا کر دیں، اسے بیڈروم میں لگانا ہے......''

فارس کی نگاہیں بے ساختہ جنت تک گئیں۔ سر جھکائے وہ ایک بار پھر بلا وجہ کے رنگ پھیلانے لگی تھی۔

''گویا مجھ سے زیادہ اہم آپ کی بہو ہے۔'' اس نے شکوہ کیا۔ جنت کے کان کھڑے ہو گئے۔

مسز شیرازی ہنس دیں۔ ''جیلس ہو رہے ہو؟''

''تو کیا نہیں ہونا چاہیے؟''

''ہونا تو چاہیے، میں اپنی بیٹی کی کوئی بات ٹال نہیں سکتی۔''

''اگر جو میں آپ کو آپ کی بیٹی کے ''کرتوتوں'' سے آگاہی دوں تو کیا آپ تب بھی اس کی کوئی بات نہیں ٹالیں گی؟''

جنت کے چہرے کا رنگ فق ہوا۔ آنکھوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔

''ہاں تب بھی نہیں، بائے داوے تمہیں اس سے مسئلہ کیا ہے؟''

''عبدالغفور شکایت کر رہا تھا۔ گلاب کی پتیاں کھانے کا بہت شوق ہے آپ کی لاڈلی کو۔''

مسز شیرازی نے ذرا حیران ہو کر جنت کو دیکھا۔ وہ متوحش سی اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی تھی۔ حالانکہ بات تو کچھ ایسی نہ تھی مگر اس کے تاثرات۔

وہ ہنس دیں۔ ''رئیلی جنت؟ مجھے بھی ٹرائی کرنا چاہیے۔'' ساتھ ہی فارس کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔

فارس اپنی ماں کو دیکھ کر رہ گیا۔ ''آپ کی عادتیں خراب ہو رہی ہیں ممی!''

ان کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

''میں...... میں کھانے کا انتظام دیکھ لوں۔'' وہ معذرت چاہتے ہوئے اسی وقت اٹھ کر چلی گئی تھی۔

فارس نے مسز شیرازی سے یہ کیا کہا تھا؟ وہ شدت سے دھڑکتے دل کے ساتھ اگلے کئی لمحوں تک راہداری میں ہی کھڑی رہی تھی۔

☆☆☆

فارس وجدان کی نگاہوں کا تاثر بدل گیا تھا۔آنکھوں میں نرمی اگر نہیں تھی تو سختی بھی نہ رہی تھی لیکن جنت کمال کے لیے وہ آنکھیں اب بھی عذاب بنی ہوئی تھیں۔مگر جانے کیا بات تھی کہ اٹھتے بیٹھتے،آتے جاتے وہ اس کی نگاہوں کا حصار اب خود پر محسوس کرنے لگی تھی اور ایسا ان تین ماہ میں پہلی بار ہوا تھا۔بجائے خوش یا مطمئن ہونے کے وہ الجھنوں میں پڑ گئی تھی۔رہ رہ کر یا تو خیال تھپڑ کا آتا تھا یا پھر اس ماضی کا جو فارس وجدان پر منکشف ہوا تھا۔اور جس پر اس نے کھل کر اپنے ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔

اس نے کن اکھیوں سے فارس کو دیکھا۔

بیڈ پر تکیوں کے سہارے نیم دراز،لیپ ٹاپ کی اسکرین پر مصروفیت بھرے انداز میں کچھ دیکھتا،کچھ ٹائپ کرتا ہوا۔

یکا یک ہی پارکنگ ایریا کا منظر جنت کی آنکھوں میں لہرا گیا،چہرے کے تاثرات بدل گئے،غصہ نئے سرے سے عود کر آیا۔صوفے پر ٹانگوں کے گرد بازو باندھتے ہوئے اس نے تنفر سے اسے ایک نظر دیکھا پھر رخ پھیرے دیواروں کو گھورنے لگی۔

ایسے بے حس انسان کو آخر اس نے سوچا بھی تو کیوں؟

فارس نے ذرا سی نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔کچھ دیر پہلے تک چہرہ الجھنوں کی حکایت سنا رہا تھا،اب غصے کی جھلک نظر آ رہی تھی۔پل پل اس کا رنگ،اس کے تاثرات بدلتے تھے۔

”ویسے میں کچھ سوچ رہا تھا۔“لیپ ٹاپ ایک طرف رکھے وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

”تم ممی کا بہت خیال رکھتی ہو،بدلے میں تمہیں کچھ تو چاہیے ہوگا؟“

اور جنت کو لگا،دسمبر کی سرد راتوں میں کسی نے ٹھنڈے پانی کی بوچھاڑ کر کے اسے ہلا کر رکھ دیا ہو۔

”آج کے دور میں سب اپنا فائدہ دیکھتے ہیں۔بغیر کسی مقصد۔بغیر کسی غرض کے کوئی نہ کسی کی اتنی کیئر کرتا ہے اور نہ اتنی سختی اور توہین برداشت کرتا ہے......کچھ نہ کچھ تو تم نے بھی سوچ رکھا ہوگا۔کچھ نہ کچھ تو تمہیں بھی چاہیے ہوگا......“

آنکھوں میں دکھ،صدمہ،بے یقینی لیے وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”اس لیے تم بلا جھجک کچھ بھی مانگ سکتی ہو۔“بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے،ٹانگ پر ٹانگ رکھے وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔تاثرات صلح جو تھے۔جیسے کوئی لین دین متوقع ہو۔نہ سختی تھی۔نہ غصہ تھا۔اس کے لیے یہ گفتگو بہت عام نوعیت کی تھی مگر جنت پر جیسے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔وہ فنا ہو رہی تھی۔

کیا سمجھتا تھا وہ اسے؟اندر ہی اندر غصے سے بل کھاتے ہوئے اس نے لب بھینچ کر سر اٹھایا۔

”تمہیں لگتا ہے،میں آنٹی کا خیال تمہاری وجہ سے رکھتی ہوں؟اگر تمہیں ایسا لگتا ہے تو تم اپنی غلط فہمی دور کر لو۔“

”ہاں،جانتا ہوں،ان کا خیال رکھنا،انہیں وقت دینا تمہاری مجبوری ہے۔لیکن میں مجبوریوں سے فائدے نہیں

اٹھاتا۔میرے گھر میں بغیر معاوضے کے کوئی کام نہیں کرتا!سب کو پے منٹ ادا کرتا ہوں میں۔“

جنت کا پارہ چڑھ گیا۔

”میرے خیال سے تم بھول رہے ہو،میں تمہاری کوئی ملازمہ نہیں ہوں اور نہ ہی تمہارے اشارے پر کام کرتی ہوں۔آنٹی کے ساتھ میرا اپنا رشتہ ہے۔“

”اور یہ رشتہ کب تک ہے؟“فارس کا لہجہ طنزیہ ہوا۔سکوت میں ڈھل کر وہ دم سادھے اسے دیکھ کر رہ گئی۔وہ ایک دم سے اسے بہت غیر،بہت اجنبی سا لگا۔حالانکہ وہ اس کا تھا بھی نہیں۔پھر بھی اسے دکھ ہوا۔پھر بھی اسے برا لگا۔

”کیا چاہتے ہو تم؟“وہ مزید کوئی سوال۔کوئی استفسار نہیں چاہتی تھی۔

”اپنے سوال کا جواب۔“

جنت کے لیے وہاں بیٹھے رہنا مشکل ہو گیا۔”تمہارے سوال کا جواب میں تمہیں دے چکی ہوں۔اب تم یقین نہیں کرنا چاہتے تو میں کچھ نہیں کر سکتی۔“

اتنا کہہ کر وہ کمرے سے نکل آئی تھی۔

”ملازموں کو پے منٹ ادا کرتا ہوں۔“ فارس کی نقل اتارتی وہ شدید غصے کے عالم میں سٹنگ روم میں جا بیٹھی۔آنکھیں بار بار بھیگ رہی تھیں۔”نکاح کر کے ملازمت دے رکھی ہے مجھے،جاب کر رہی ہوں میں اس کے گھر،سمجھتا کیا ہے یہ خود کو!“آنکھیں رگڑ کر صاف کیں۔گال،ناک سرخ ہونے لگی۔

فارس کا چہرہ دروازے کے فریم میں نمودار ہوا۔اس کی روتی بسورتی شکل کو بہت غور سے ملاحظہ فرمایا گیا۔جنت نے سر اٹھا کر اسے قہر بار نظروں سے دیکھا۔

وہ چوکھٹ کے ساتھ پشت ٹکائے کھڑا ہو گیا۔دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں تھے۔چہرہ متبسم تھا۔آنکھوں میں وہی چمک جو جنت کمال کو ذلیل کر کے کچھ اور بڑھ جاتی تھی۔

”ایک بار پھر سوچ لو،دبئی میں فلیٹ بھی دلوا سکتا ہوں۔“

”تم مجھے ذلیل کیے بغیر سکون سے طلاق دے دینا۔تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔“اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے۔

”لیکن میں تمہیں مراعات دینے کی بات کر رہا ہوں،اب اتنا کٹھور بھی نہیں ہوں کہ طلاق دے کر بس فارغ کر دوں،بینک بیلنس،زمین،گھر کچھ تو ہو......“

”اگر تم اس طرح میرے سر پر مسلط رہے تو میں آنٹی کو سب کچھ بتا دوں گی۔“اس کی برداشت اب ختم ہو رہی تھی۔

''شوق سے جاؤ! میں بھی تمہارے پول ان کے سامنے کھول دوں گا، حساب برابر۔''

جنت صدمے سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ کیا بول گئی تھی، اس کا ادراک اسے اب ہوا تھا، فارس کیا کہہ گیا تھا، اس کا احساس بھی جیسے اب ہوا تھا۔

''تم ایسا نہیں کرو گے!'' اس کے لب ہلے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''کر سکتا ہوں۔ میں تو اب ان سے یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ میری بیوی بانجھ ہے، میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ اپنی جگہ تھم کر رہ گئی۔ جانتی تھی، اگر وہ سوچ رہا ہے تو کر کے بھی دکھا سکتا ہے۔ اس کے پاس بہت سے آپشن تھے۔ محدود تو جنت رہ گئی تھی۔ وہ عین اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اگلے کئی پل خاموشی کی نذر ہوئے۔

''میں اب بھی سوچوں تو حیران ہوتا ہوں، آخر تم میں اتنی ہمت کیسے آ گئی تھی ایک بچے کی جان لینے کی کوشش! تمہیں ڈر نہیں لگا تھا؟'' پہلے وہ اس کی ذات کی دھجیاں بکھیرتا تھا، اب وہ اس کے زخم ادھیڑ رہا تھا۔

''تمہاری ناراضی تو یقیناً اس کے باپ سے ہوگی۔ اس میں بچے کا کیا قصور؟''

مٹھیاں بھینچے وہ خاموش رہی۔

''یہ رانگ کالز کا کیا معاملہ تھا؟'' سینے پر بازو باندھے فارس اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی جیسے وہ اس کے کیفیت سے محظوظ ہو رہا ہو۔

وہ جھٹکے سے مڑی، گلاس ڈور سلائڈ کر کے باہر نکلی۔ کھینچ کر بند کرتی کونے میں جا کھڑی ہوئی۔

اب جب تک وہ اندر تھا۔ جنت کمال باہر ہی رہنا چاہتی تھی۔ اس تکلیف سے بچنے کا صرف یہی ایک راستہ تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ وہاں سے جا چکا تھا۔ مگر جنت رات گئے تک بالکنی میں ہی کھڑی رہی تھی۔

☆☆☆

''ایک کپ چائے۔ میرے لیے بھی۔''

شدید غصے اور جھنجلاہٹ کے عالم میں وہ اپنے لیے چائے بنا رہی تھی جب عقب میں فارس وجدان کی آواز اچانک سے گونجی تھی۔ جنت نے مڑ کر اچنبھے سے اسے دیکھا۔ کیا اسے جنت نظر نہیں آئی تھی؟ یا پھر اس نے جنت کو ہی میڈ سمجھ لیا تھا؟

''مجھ سے کہہ رہے ہو؟'' انگلی سے اپنی جانب اشارہ کر کے پوچھا۔ حیرت سے۔ بے یقینی سے۔

''تمہارے علاوہ بھی کوئی یہاں ہے؟'' کاؤنٹر ٹیبل کے ساتھ پشت ٹکائے، سینے پر بازو باندھے وہ سنجیدگی سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''میرے ہاتھوں کی چائے پینے سے تم مر نہیں جاؤ گے؟''

''ممکن ہے زندہ رہ جاؤں۔''

جنت نے لب بھینچ کر اسے دیکھا۔ پہلے وہ خاموش رہ کر اسے بے عزت کرتا تھا۔ اب بات کر کے اسے بے وقعت کر رہا تھا۔

''یہ جو نوکروں کی فوج ہے تمہاری، ان سے بنوا لو اپنی چائے۔'' بگڑے تیوروں کے ساتھ خاصے جارحانہ انداز میں جواب دے کر اس نے مگ کاؤنٹر پر پٹخ دیا۔

''پہلے تو خود بنا بنا کر پیش کرتی رہی ہو تم۔''

''اس وقت میں حواسوں میں نہیں تھی۔''

''اب تم حواسوں میں ہو؟''

جنت نے بمشکل خود پر ضبط کے پہرے بٹھا کر اس کے متبسم چہرے کو دیکھا پھر گہری سانس لے کر جیسے اپنے اعصاب کو پرسکون کرنے کی کوشش کی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے برنر بند کر دیا مگ میں چائے انڈیل کر وہ جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ فارس راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

''کیا چاہتے ہو تم؟'' وہ زچ ہوئی تھی۔

''تمہیں کیا لگتا ہے؟''

''سوری، میں تمہیں اپنی چائے نہیں دے سکتی۔'' مگ پر گرفت جما کر اسے آنکھیں دکھائیں۔

وہ خاموش کھڑا رہا۔ اس نے پھر دائیں طرف سے گزر جانا چاہا تو فارس نے بازو پھیلا کر روک لیا۔ کوفت سے اس نے بائیں سمت کا رخ کیا تو اس نے پھر وہی کیا...... جنت کا پارہ چڑھ گیا۔

''ہٹو میرے راستے سے۔''

''سوری! میں تمہیں راستہ نہیں دے سکتا۔'' وہ بھی اتنا ہی سنجیدہ تھا جتنی کہ وہ تھی۔

''میں پھر بھی اپنی چائے تمہیں نہیں دوں گی۔'' گھونٹ بھر کر جتایا بھی گیا...... کہ لو...... اب یہ چائے تمہارے کسی کام کی نہیں۔

پھر کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ کہ اب یہاں سے جانے کا میرا کوئی ارادہ بھی نہیں۔

پھر کرسی کی بیک سائڈ پر بازو ٹکا کر شان بے نیازی سے فارس کو دیکھتے ہوئے تاثر دیا کہ میں جیتی تم ہارے۔

اور اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھ پاتی، فارس نے ایک ہی جست میں ہاتھ بڑھا کر مگ اٹھا لیا۔

جنت کا دماغ بھک سے اڑا۔

گھونٹ لیتے ہوئے اس نے جتاتی نگاہوں سے جنت کو دیکھا......کہ لو......اب یہ چائے تمہارے بھی کسی کام کی نہیں......پھر کرسی کھینچ کر شاہانہ انداز میں بیٹھ گیا کہ یہاں سے جانے کا میرا ابھی کوئی ارادہ نہیں۔

اس کے بعد کرسی کی بیک سائڈ کے ساتھ پشت ٹکاتے ہوئے تیسرا گھونٹ لے کر آنکھوں سے جتایا کہ میں جیتا تم ہاری۔

اور وہ ہکا بکا اسے دیکھ کر رہ گئی۔ کہاں وہ اس کے ہاتھ کا کھانا دیکھ کر ڈائننگ ٹیبل چھوڑ دیتا تھا۔ کہاں وہ اس کے ہاتھوں سے چائے لے کر پی گیا تھا؟ یہ وقت بھی آنا تھا؟ یہ انہونی بھی ہونی تھی؟

کہیں تھپڑ سے اس کا دماغ تو نہیں ہل گیا؟ کہیں ڈاکٹر بخاری نے اسے غلط ادویات تو نہیں دے دیں؟ اسے صحیح معنوں میں تشویش ہوئی تھی۔

چائے کا خالی مگ اس کے سامنے رکھ کر وہ جا چکا تھا۔ اور وہ کتنی ہی دیر تک حیران و ششدر بیٹھی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

ٹھنڈی سرد ہوائیں پتوں کو ایک ایک کر کے سرسبز احاطے پر گراتی جا رہی تھیں۔ بھیگی ہوئی سڑکوں پر خاموشی تھی۔ پارک میں بھی اکا دکا لوگ ہی نظر آ رہے تھے۔

سیاہ رنگ کے ڈیزائنر ٹریک سوٹ میں ملبوس۔ سر پر ہوڈی چڑھائے، کانوں میں وائرلیس ائیر فونز لگائے وہ جاگنگ ٹریک پر تھا۔ چہرے پر بھاگنے کی وجہ سے سرخی تھی۔ تنفس پھولا ہوا تھا۔

اسے ڈاکٹر بخاری کی کال موصول ہوئی تو وہ رک گیا تھا۔ حال احوال پوچھتے ہی وہ سیدھا مدعے پر آ گئے۔

''جنت نے فون کیا تھا!''

''اچھا!'' اسے حیرت ہوئی۔

''وہ ان میڈیسنز کے سائڈ ایفیکٹس کے بارے میں معلومات لینا چاہ رہی تھی جو تم استعمال کر رہے ہو!''

فارس کی بھنویں غیر محسوس انداز میں سکڑ گئیں۔

''اسے لگتا ہے، دواوں کا اثر تمھارے دماغ پر ہو رہا ہے۔''

''واٹ؟'' سامنے ہی سنگی بنچ پر بیٹھے ایک ادھیڑ عمر صاحب نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''اور آپ نے کیا کہا؟'' داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے اب وہ اپنی پیشانی مسل رہا تھا۔

''یہی کہ غنودگی کے علاوہ اور تو کوئی سائڈ ایفیکٹس نہیں مگر وہ مصر تھی کہ تم میں Dizziness کے علاوہ بھی سائڈ ایفیکٹس ظاہر ہو رہے ہیں۔'' فارس نے بے ساختہ اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

بمشکل انہیں اپنی طبیعت کے حوالے سے ہر طرح کی تسلی دینے کے بعد وہ مزید جاگنگ کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اسی وقت گھر آ گیا۔ جنت اسے لائبریری میں ملی تھی۔ کتابوں میں الجھی ہوئی۔

''یہ ڈاکٹر بخاری سے کیا کہا ہے تم نے!'' سانس چڑھا ہوا......رگیں پھولی ہوئیں......چہرے پر سرخی......آنکھوں میں غصہ۔

جنت نے کتاب آگے کر لی۔ اسے صبح سویرے فارس وجدان کے منہ نہیں لگنا تھا۔

''کچھ پوچھا ہے میں نے؟'' فارس نے کتاب جھپٹ کر میز پر پٹخ دی۔

''انہوں نے پوچھا، تم کیسے ہو؟ میں نے بتا دیا تم ٹھیک نہیں ہو!'' کمال بے نیازی سے جواب دیتی دوسری کتاب کھول کر ورق گردانی کرنے لگی۔

''کیوں مجھے کیا ہوا ہے؟'' تیوری چڑھا کر پوچھا۔

جنت نے جواب نہیں دیا۔

اب کے فارس نے دوسری کتاب بھی کھینچ کر ہٹا دی۔

''میرے خیال سے میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔'' وہ میز پر ہاتھ جماتے ہوئے جھکا۔

''میرے خیال سے میں بھی جواب دے چکی ہوں۔'' جنت نے سر اٹھا کر اس کے آنکھوں میں دیکھا۔

اسی لمحے اقصیٰ کتابوں کا ایک ڈھیر بانہوں میں بھرے اندر داخل ہوئی۔ ''جنت آپی!''

اور اس کے آپی پلس مالکن کے میاں نے جن قہربار نظروں سے اسے دیکھا۔ کتابیں تو بمشکل ہی اس سے گرتے گرتے بچیں۔ گڑبڑا کر وہ بہت ادب سے سر جھکا گئی۔ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے فارس اسی وقت لائبریری سے نکل گیا تھا۔

☆☆☆

''فارس بھائی اتنے بھی برے نہیں ہیں جتنا کہ وہ خود کو ظاہر کرتے ہیں!'' مال میں شاپنگ کے دوران سٹینڈ پر لٹکے کپڑوں کو ادھر ادھر کرتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر آئمہ ظہیر کو دیکھا۔

''ادھر میں نے کہا، جنت! چلو شاپنگ پر چلتے ہیں، ادھر فارس بھائی نے والٹ سے کریڈٹ کارڈ نکال کر تمہارے سامنے رکھ دیا۔ مطلب کہاں سے ملتے ہیں ایسے شوہر۔ جو کہے بنا ہی بیوی کے دل کا حال جان لیں!''

لیکن جنت یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ اس کا ''حال دل'' کریڈٹ کارڈ کے گرد تو ہرگز نہیں گھومتا تھا۔ وہ تو آئمہ کے ساتھ شاپنگ پر آج آنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ صوفے کے پیچھے کھڑے ہو کر اس نے مسز شیرازی کو اشارے کنائیوں میں سمجھانے کے کتنے جتن کیے تھے کہ وہ کسی طرح سے کوئی بھی بہانا تراش کر کہہ دیں، جنت آج نہیں جا سکتی۔ مگر بھلا ہو فارس وجدان کا جس نے اوپن کچن سے

باہر نکلتے ہوئے اسے ایسا کرتے دیکھ لیا تھا۔

''ہاں ہاں شیور! تم لے جاؤ اسے، کوئی مسئلہ نہیں!'' لاؤنج میں صوفے پر بیٹھتے ہی اس نے کریڈٹ کارڈ سامنے ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ اجازت تو وہ ایسے دے رہا تھا جیسے وہ اس کے حکم کی ہی منتظر ہو۔ جنت سلگ کر رہ گئی تھی۔

آئمہ ظہیر کے مجبور کرنے پر وہ اس کے ساتھ آ تو گئی تھی مگر فارس کی اس حرکت پر جو غصہ اسے چڑھا تھا، وہ کسی صورت کم نہیں ہو پا رہا تھا۔

پہلے اس کا رویہ سمجھ سے باہر ہوا تھا، اب ہر معاملے میں اس کی مداخلت جنت کو پریشان کر رہی تھی۔

''ویسے جنت۔ ایک سوال پوچھوں تم سے؟''

''ہوں!'' وہ کپڑوں کا جائزہ لیتی بس وقت ہی گزار رہی تھی۔

''فارس بھائی نے کبھی تم سے محبت کا اعتراف کیا؟'' ایک لمبا سا چکر کاٹ کر، چند ایک شرٹس پسند کیے وہ دبے دبے جوش کے ساتھ پوچھ رہی تھی۔

جنت نے پلکیں جھپکا کر اسے دیکھا۔ ''محبت کا اعتراف؟''

''ہاں!''

''کیسے بھلا؟'' اس نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔

آئمہ نے بھنویں اچکا کر اسے دیکھا۔ کیا اس کا سوال اتنا مشکل تھا کہ جنت کی سمجھ میں نہ آئے؟

''مطلب جیسے شوہر کہتے ہیں۔ تم میری زندگی ہو، سانس ہو، دل گردہ ہو، فلاں۔ فلاں۔ فلاں! یا پھر سمپل۔ آئی لو یو؟''

ایسا کوئی جملہ تو جنت کمال کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ محبت اور فارس کو ہو گی؟؟ وہ بھی جنت کمال سے!!! سابع المستحیلات!! (دنیا کے سات ناممکنات میں سے ایک!)

''کیا زندگی گزارنے کے لیے یہ اعتراف ضروری ہوتا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں ضروری ہوتا ہے۔ انفیکٹ ضروری ہونا چاہیے۔''

''محبت اعمال سے جھلکتی ہو تو اعتراف کی ضرورت نہیں پڑتی!'' وہ بے ساختہ کہہ گئی۔ ایسی مشکل باتیں آئمہ کے سر پر سے گزرتی تھیں۔ اس نے جنت کو کچھ خفگی سے دیکھا۔ ''یہ فلسفی باتیں میرے ساتھ مت کیا کرو۔''

''یہ کلر کیسا رہے گا آئمہ؟'' اس نے موضوع بدلنا چاہا۔

''تم مجھے ٹھیک سے کچھ بتا کیوں نہیں رہی ہو؟'' آئمہ چڑ گئی۔

وہ ٹھیک سے کچھ بتائے بھی تو کیسے!؟ جب کچھ بھی سرے سے ٹھیک ہی نہ ہو۔؟

''آخر تم مجھ سے سننا کیا چاہتی ہو؟'' اس نے اکتا کر کہا۔

''مطلب فارس بھائی کو دیکھ کر لگتا تو نہیں ہے کہ وہ ذرا سے بھی رومانٹک ہوں گے۔ لیکن......''

''میری پیاری آئمہ! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم کچھ دیر کے لیے فارس نامہ بند کر دیں!'' بات کرتے ہوئے اس کی نظر آئمہ کے عقب میں ایک اجنبی شناسا سا چہرے پر پڑی۔ سہج سہج قدم اٹھاتی ایک اسٹائلش سی لڑکی ان کے پاس آ کر رک گئی تھی۔

''ہائے!'' دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ اس نے اپنا داہنا ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔ جنت کی نگاہوں کے تعاقب میں آئمہ نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ آنکھوں میں حیرت کا تاثر ابھرا، لبوں کی مسکراہٹ سمٹی، چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

''پہچانا مجھے؟ غالباً ہماری میشال کی منگنی پر ملاقات ہوئی تھی!'' جینز پر سفید فل نیک شرٹ میں ملبوس، بالوں کا میسی بن بنائے، بغیر کسی میک اپ کے وہ عام سے حلیے میں بھی غضب ڈھا رہی تھی۔ حسین تو وہ اتنی تھی کہ آس پاس گزرتے لوگ مڑ مڑ کر اسے دیکھتے تھے۔

''جی! بہت اچھی طرح سے!!'' اس کا رویہ، لہجہ اور تلخ جملے جنت بھولی نہیں تھی۔ تب ہی اس نے ہاتھ نہیں ملایا تھا۔

''اوہ ہائے آئمہ۔ کیسی ہو؟'' اپنا ہاتھ نیچے کر کے، اب کے وہ آئمہ ظہیر سے مخاطب ہوئی تھی جو کاٹو تو لہو نہیں کی عملی تصویر بنی کھڑی تھی۔ ''تم ہی تعارف کروا دو۔ غالباً یہ تو مجھے جانتی ہی نہیں ہے۔''

''چلیں جنت!'' آئمہ نے اس کا بازو پکڑا اور اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے مڑ گئی۔ اس کے انگلیوں کی لرزش جنت کو اپنے بازو پر واضح محسوس ہوئی تھی۔

''تم جانتی ہو، اس لڑکی کو؟ کون تھی؟'' مال سے نکل کر پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

''ہے کوئی۔'' آئمہ کا انداز سرسری تھا مگر چہرے کے تاثرات کچھ اور ہی حکایت سنا رہے تھے۔

''میشال کی منگنی پر یہ تم سے ملی تھی؟'' چند لمحوں کے بعد اس نے تفتیشی انداز میں پوچھا تھا۔

''ہاں!''

آئمہ کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔

''کیا۔ کیا کہہ رہی تھی؟'' اس نے سنبھل کر پوچھا۔

''کچھ خاص نہیں۔'' اس نے کندھے اچکائے۔ مگر حقیقت تو یہ تھی کہ اسے میشال کی منگنی پر ہونے والی وہ تلخ ملاقات کسی صورت بھولتی نہیں تھی۔

"دوبارہ کبھی تم سے بات کرنے کی کوشش کرے تو مت کرنا۔ اچھی لڑکی نہیں ہے یہ!" مختصر کہہ کر آئمہ نے اپنی طرف کا دروازہ کھول دیا تھا۔ جنت کمال آنکھوں میں ناسمجھی لیے اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

عدیل احمد نے ویڈیو ای میل کر دی تھی۔ نوٹیفکیشن موصول ہوتے ہی فارس نے ویڈیو پلے کر دی۔ اسکرین پر منظر واضح ہو چکا تھا۔

اس کی گاڑی پارکنگ ایریا میں اس مقام پر کھڑی تھی جہاں آمدورفت کم تھی۔ عقب میں مین روڈ تھا جس پر اکا دکا گاڑیاں ہی گزرتی دکھائی دے جاتی تھی ورنہ روڈ سنسان ہی تھا۔

جس وقت وہ گاڑی سے ٹیک لگائے جنت سے بات کر رہا تھا، اس وقت دوسری رو میں سفید کرولا گاڑی کے پیچھے کوئی موجود تھا۔

جب وہ گاڑی نکال کر وہاں سے جا چکا تو اس سے کچھ ہی دیر بعد موبائل پر فون کرتی جنت کے عقب سے وہ نمودار ہوا تھا۔ پھر اس نے جنت کے قریب آ کر کچھ کہا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے گھومی تھی۔ خوف اور پریشانی کے عالم میں وہ اسی سرعت سے جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ اس کے داہنی کلائی اس شخص کی گرفت میں آ گئی۔ چوڑیاں چرمرا کر ٹوٹی تھیں۔

بے ساختہ ہی فارس وجدان کی آنکھوں میں خون اترا تھا۔ مٹھیاں بھینچ گئی تھیں۔

جنت نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی سعی کی تھی۔ اس کے انداز سے واضح تھا، وہ مدد کے لیے چلا رہی تھی۔ غیر آباد حصہ تھا۔ اس طرف کوئی تھا بھی نہیں جو اس کی مدد کو آ جاتا۔

وہ اسے کھینچتے ہوئے لے جانے لگا۔ ساتھ ہی کچھ کہہ بھی رہا تھا۔ اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے یک دم ہی جنت نے اس کا منہ نوچ لینا چاہا۔ ناخن کے نشان گال اور گردن پر پڑے۔ اور اگلے ہی لمحے اس نے جنت کے گال پر تھپڑ جڑ دیا۔ وہ نیچے جا گری۔ عین اسی لمحے سائرہ خالہ کا بیٹا فیصل آ گیا تھا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے چند اور لوگوں کا مجمع بھی اکٹھا ہو گیا۔

اس نے جنت کمال کو اپنے داہنے ہاتھ کی کلائی تھام کر اٹھتے دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر ویڈیو روک دی۔ کتنے لمحے بیت گئے۔ اسے پتا ہی نہ چلا۔

پھر وہ کرسی چھوڑ کر اٹھا تھا۔ راہداری میں بھاری قدم اٹھاتے ہوئے، سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے کا رخ کرتے وقت اس کی کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔ جیسے کوئی ثقیل شے اس کے سینے پر آن پڑی ہو۔ جیسے اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی ہو۔

کمرے کا دروازہ دھکیل کر وہ اندر آیا تو وہ سامنے بیٹھی تھی۔

سر تک لحاف تانے صوفے پر سمٹ کر بیٹھی لیپ ٹاپ پر کوئی فلم دیکھ رہی تھی۔ پاپ کارن کا پیکٹ ہاتھوں میں تھا۔ ڈرائے فروٹس کی پلیٹ۔ چاکلٹس۔ چائے کا کپ۔ کافی ٹیبل پر رکھے تھے۔ انہاک سے کوئی سین دیکھتے آنکھوں میں اشتیاق تھا اور لبوں پر تبسم۔ ایزی ہو کر بیٹھی تھی وہ۔ لاپروائی لیے ہوئے انداز تھا اس کا۔ جیسے کچھ دیر پہلے تک ان کے مابین کوئی تلخ کلامی نہیں ہوئی تھی۔ جیسے بیس پچیس روز پہلے کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تھا۔ جیسے اس کے چوڑیاں نہیں ٹوٹی تھیں۔ زخم نہیں آیا تھا۔ جیسے لاوارث سمجھ کر اس کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔

"تم نے فارس کو بتایا نہیں؟"

"میں نے ضروری نہیں سمجھا۔"

وہ ساکت صامت اسے دیکھ رہا تھا اور وہ اطراف سے یکسر بے نیاز کسی سین پر بے ساختہ مسکرا رہی تھی۔

"مجھے گرنے سے ڈر نہیں لگتا خان! میں پندرہ دن پہلے پارکنگ ایریا میں گری تھی۔ اور پھر خود اٹھ کر بھی گئی تھی۔ اب بھی اگر گروں گی تو اٹھنے کی ہمت ہے مجھ میں۔"

اور تب ہی نگاہوں کی تپش کا احساس کرتے ہی جنت نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ اس کے تاثرات سے لمحے بھر کے لیے وہ چونک سی گئی۔

"غلطی تو میری ہی ہے نا! فارس نے تو کہا تھا کہ ساتھ ہی چلو، میں نے ہی ضد کی کہ سدرہ کا ولیمہ اٹینڈ کر کے ہی جاؤں گی۔"

لیکن اگلے ہی پل آنکھوں میں خفگی لیے اس نے بھنویں سکیڑ کر چہرے کا رخ بدلا اور لیپ ٹاپ اسکرین پر نگاہیں جما لیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ کمرے سے چلا گیا تھا۔

جنت کمال کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ جو میسج اور وائس ریکارڈنگ اس نے پچیس روز قبل پارکنگ ایریا میں فارس وجدان کو روتے ہوئے بھیجی تھیں وہ آج "سین" کر لی گئی تھیں۔

☆☆☆

ناشتے کی ٹیبل پر مسز شیرازی نے فارس وجدان کی خاموشی کو کچھ زیادہ ہی محسوس کیا تھا۔ ایک تو وہ خاصی تاخیر سے آیا تھا، اوپر سے تھا بھی عام حلیے میں۔ گویا آج اس کا آفس جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

ٹوسٹ پر جیم لگاتے ہوئے جنت نے بیساختہ نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ رتجگے کی گواہی دیتی آنکھوں میں تکان اتری تھی۔ معمول کے مطابق نہ وہ اپنے ٹیب پر ہیڈ لائنز دیکھ رہا تھا نہ ہی مسز شیرازی سے کوئی بات کر رہا تھا۔ نیلی جینز پر سیاہ جرسی نما شرٹ میں ملبوس۔ سرخ مفلر کو گردن کے گرد ڈھیلے انداز میں ڈالے وہ زچ کرنے کو اسے بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔

''فارس!''

''میں ٹھیک ہوں ممی!''اس نے چائے کا کپ اٹھالیا۔

''آج آفس نہیں جاؤ گے؟''مسز شیرازی نے پوچھا۔

نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس نے گھونٹ بھرا۔''مجھے کام سے کہیں جانا ہے۔''

مسز شیرازی نے سمجھ کر سر ہلا دیا۔مگر اس کے تاثرات کی وجہ سے ان کی تسلی اب بھی نہ ہوئی۔لیکن انہوں نے مزید سوال نہیں پوچھے۔

''میڈیسن تو لے رہے ہو نا!کوئی پرابلم تو نہیں ہے۔''

اب کے فارس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔''بالکل کوئی پرابلم نہیں ہے۔''

چائے کا خالی کپ رکھ کر وہ چلا گیا تھا۔ناشتہ بھی ٹھیک سے نہیں کیا تھا۔

مسز شیرازی نے فکر مندی سے اسے سیڑھیوں کی طرف جاتے دیکھا۔دل نہ جانے کیوں اندیشوں میں گھر گیا تھا۔وہ کچھ اور سوچ رہی تھیں۔جنت کچھ اور۔فارس کچھ اور۔

''وہ ساری رات جاگ کر آفس کے کام نمٹاتا رہا ہے!''انہیں پریشان دیکھ کر جنت نے فوراً سے بات سنبھالی۔

مسز شیرازی نے چونک کر اسے دیکھا۔لمحے بھر کے لیے ان کی آنکھوں سے تشویش غائب ہوئی۔یقیناً وہ کچھ اور سوچ کر پریشان ہو رہی تھیں۔جنت نے ان کے داہنے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔وہ سمجھ گئی تھی۔مسز شیرازی کی پریشانی حماد کے بیٹے سے متعلق تھی۔پس پردہ کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور تھی جو ان ماں بیٹے کے درمیان بے نام سی خاموشی حائل کر دیتی تھی۔

ناشتے کے بعد وہ انہیں معمول کی طرح لان میں لے آئی تھی۔اور تب ہی اس نے فارس وجدان کو صدر دروازے سے باہر نکلتے دیکھا تھا۔وہ سرعت سے قدم اٹھاتا پورچ کی طرف جا رہا تھا۔انداز میں عجلت نمایاں تھی۔ریموٹ۔کی سے گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے اس نے رک کر سرسری سے انداز میں موبائل اسکرین پر کچھ دیکھا پھر گاڑی میں سوار ہو گیا۔

جنت سر جھٹک کر مسز شیرازی کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔جو اب بھی آنکھوں میں فکر اور الجھن لیے فارس کو ہی دیکھ رہی تھیں۔

☆☆☆

اس رات وہ کافی تاخیر سے گھر آیا تھا۔جنت جو اس کی آمد سے پہلے تک مسز شیرازی کے نمبر سے مسلسل اس کا نمبر ٹرائی کر رہی تھی یک دم لاتعلق ہو گئی۔وہ سیدھا ان کے کمرے میں چلا گیا تھا جو بروقت فون پر رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے کافی فکر مند نظر آ رہی تھیں۔جنت دروازے میں ہی کھڑی تھی جب وہ ان کے پاس بیٹھ کر مدھم آواز میں انہیں بتا رہا تھا کہ اسے ضروری کام کے

سلسلے میں دوسرے شہر جانا پڑ گیا تھا۔

آنکھیں اب بھی گلابی تھیں۔تھکاوٹ انگ انگ سے عیاں۔کھانا وہ باہر سے کھا کر ہی آیا تھا سو آرام کی غرض سے وہ معذرت چاہتے ہوئے فوراً ہی اٹھ گیا تھا۔جنت کمرے میں آئی تو وہ کپڑے بدل کر لائٹس آف کیے بیڈ پر نیم دراز تھا۔گویا اس وقت اسے مکمل خاموشی اور سکون کی خواہش تھی۔اپنا موبائل اٹھائے جنت احتیاط سے دروازہ بند کرتی باہر آ گئی تھی۔عین اسی لمحے اس کا موبائل بج اٹھا۔سائرہ خالہ کی کال تھی۔اس نے کال ریسیو کر لی۔

''السلام وعلیکم خالہ۔کیسی ہیں آپ؟''اس کا رخ ٹیرس کی طرف تھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں جنت!تم کیسی ہو؟سو تو نہیں گئی تھیں؟''

''نہیں،ابھی وقت ہی کتنا ہوا ہے۔''سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ شال اپنے گرد ٹھیک سے اوڑھنے لگی۔

''آپ سنائیں،سب خیر ہے نا؟''

''خیر تو ہے لیکن وہ زمان ہاسپٹل میں ہے۔''گو کہ اسے زمان نامی شخص میں سرے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر پھر بھی جس طرح خالہ نے خبر سنائی تھی وہ چونکی ضرور تھی۔

''ہاسپٹل میں۔مگر کیوں؟''

''کسی نے اسے بہت بری طرح سے مارا پیٹا ہے۔ٹانگ۔ہاتھ اور بازو ٹوٹ گئے ہیں۔''

جنت کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''میں ابھی ہاسپٹل سے آ رہی ہوں۔اللہ نے کرم کیا،بچت ہو گئی ورنہ جس حالت کو وہ پہنچا ہوا ہے۔بس۔''

آنکھوں میں تعجب لیے وہ ٹیرس کی طرف جانے کا ارادہ ترک کیے سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

''مگر یہ سب ہوا کیسے؟کچھ بتایا اس نے؟''

''آفس سے واپسی پر دو گاڑیوں نے اس کا راستہ روک لیا تھا۔چار پانچ لوگ تھے۔انہوں نے اس پر تشدد کیا ہے۔لیکن وہ کون لوگ تھے،زمان کچھ بتا نہیں رہا۔پولیس میں رپورٹ درج بھی نہیں کروانے دی۔''

واقعہ افسوس ناک تھا مگر اندر ہی اندر اسے بے انتہا خوشی محسوس ہوئی تھی۔اور اس خوشی کا اظہار وہ چاہ کر بھی سائرہ خالہ کے سامنے نہیں کر سکی تھی۔

☆☆☆

صبح کا اجالا ہر سو پھیل چکا تھا۔اپنے شاندار بیڈروم کی دیوار گیر کھڑکیوں پر سے اس نے پردے کھینچ کر ہٹا دیے تھے۔گلاس

ڈور سلائڈ کر کے، بالکنی پر جھک کر اس نے وسیع رقبے پر پھیلے سرسبز لان کو دیکھا۔ نگاہیں پھولوں کی کیاریوں اور جگہ جگہ پر بنے فواروں سے ہوتی ہوئی بیرونی دیواروں پر جھکے املتاس کے درختوں پر ٹھہر گئیں۔ دھوپ چہار سو بکھری تھی۔ موسم اچھا ہو رہا تھا۔

کھلی فضا میں گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے جھک کر نیچے دیکھا۔ نظر جنت کمال پر جا ٹھہری۔ وہ مسز شیرازی کے ساتھ لان میں موجود تھی۔ ہشاش بشاش اور ہنستے مسکراتے چہرے کے ساتھ وہ ان کے سامنے لان چیئر پر سر اٹھائے بیٹھی تھی۔

مسز شیرازی کے آگے ایزل پر سفید کنونیس موجود تھا۔ سائڈ ٹیبل پر بے شمار آئل پینٹنگ ٹیوبز پڑی تھیں۔

پیلٹ اور ایک برش ان کے ہاتھوں میں تھا اور بقیہ برشز کے ڈھیر سامنے پڑے تھے۔

اس نے پہلے اپنی ماں کو اور پھر ان رنگوں کو دیکھا جو کبھی ان کی زندگی کا ایک اہم حصہ رہے تھے۔ اور اس کنونیس کو دیکھا جس پر وہ پروفیشنل انداز میں رنگ بکھیرنے لگی تھیں۔ ساتھ ہی وہ جنت کو بھی دیکھتے ہوئے ہنس رہی تھیں جو ہاتھ ہلا ہلا کر مسلسل بولے جا رہی تھی۔ سامنے بیٹھنے کے انداز سے ہی واضح تھا کہ وہ اسے ہی کنونیس پر اتارا جا رہا ہے۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بے انتہا خوش لگ رہی تھی۔

کتنی ہی دیر تک وہ ان پر نظر جمائے اپنی جگہ کھڑا رہا تھا۔

''آپ کو کتنا وقت لگے گا مجھے پینٹ کرنے میں؟'' اور نیچے۔ بہت نیچے چہرے پر مسرت کے رنگ لیے جنت نے مسز شیرازی سے پوچھا تھا۔

''اس ہاتھ کے ساتھ تو میں کچھ کہہ نہیں سکتی!'' انہوں نے سرخ اور سفید رنگ کو پیلٹ پر مہارت سے مکس کرتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں ہر پانچ منٹ کے بعد اٹھ کر دیکھ لیا کروں کہ آپ نے کتنا بنا لیا ہے؟''

''نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔'' مسز شیرازی نے منع کر دیا۔

بے صبری جنت کا وہ وقت بڑی مشکل سے گزرا، آدھے گھنٹے کے بعد جب وہ مکمل بنا چکیں تو انہوں نے ایزل کا رخ اس کی طرف موڑ دیا۔

مسز شیرازی نے اسے حیران کر دیا تھا۔ انہوں نے گلاب پینٹ کیا تھا۔ جس کے رنگوں کا امتزاج ایسا ہی تھا جیسے برف نے آگ پکڑ لی ہو۔

''میں چہرے پینٹ نہیں کرتی جنت!! لیکن یہاں میں نے تمہیں ہی پینٹ کیا ہے!!''

گیلی آنکھوں کے ساتھ وہ کافی دیر تک گلاب کو دیکھتی رہی۔ برف کو پکڑتی آگ۔ یا آگ میں ہی ضم ہوتی برف۔

پھر سر اٹھا کر اس نے مسز شیرازی کو دیکھا۔ ''یہ میں ہی ہوں؟ ہے نا؟''

''جنت ہو! پھولوں جیسی ہی نظر آتی ہو۔'' انہوں نے محبت پاش نظروں سے اسے دیکھا۔

''میرے نانا میرا نام وردہ یعنی گلاب کا پھول رکھنا چاہتے تھے۔'' کچھ یاد کر کے وہ انہیں بتانے لگی۔ ''کیونکہ میری پیدائش سے چند روز پہلے انہوں نے خواب دیکھا تھا کہ ایک سرسبز باغ ہے، جس میں بے شمار پھول ہیں۔ اور دو پرندے ہیں۔ جن میں سے ایک ان کی جھولی میں آ گرتا ہے۔" اس نے رک کر کچھ سوچا، "نانا کا ایک دوست تھا۔ جس نے انہیں جنت نام بتایا اور تب نانا کو لگا کہ جنت میں تو جیسے ہر طرح کے پھول سما جاتے ہیں۔ انہیں یہ نام میرے لیے بہت اچھا لگا اور انہوں نے میرا نام جنت رکھ دیا!'' مسز شیرازی مسکراتے ہوئے اسے خاموشی سے سنتی رہیں۔

''اب آپ اور کیا پینٹ کریں گی؟'' اس نے پوچھا۔

''شاید۔ اسے.....'' انہوں نے جنت کے عقب میں آنکھوں سے اشارہ کیا۔ اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ فارس وجدان فون پر بات کرتے ہوئے پورچ کی طرف جا رہا تھا۔ وہ سیدھی ہو بیٹھی۔ فارس کو ذہن میں رکھ کر مسز شیرازی کیا پینٹ کریں گی؟ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ آگ، شعلے؟ آندھی، طوفان؟ برفیلے پہاڑ؟ ہاں وہ جنت کے لیے ایسا ہی تھا۔ اس کی شخصیت کو ایسے ہی کسی مناظر میں سمویا جا سکتا تھا۔

''چلیں اب آپ کچھ ریسٹ کر لیں!'' اس نے میز سے کتاب اٹھا لی۔ اور پھر وہیں سے پڑھنا شروع کر دیا جہاں سے اس نے چھوڑا تھا۔

☆☆☆

وہ آتشدان کے سامنے ایزی صوفہ پر ٹانگیں سینے سے لگائے بیٹھی تھی۔ شال سے کچھ نظر آ رہا تھا تو اس کی آنکھیں۔ شہد جیسی۔ گہری۔ پرکشش آنکھیں۔ جن کی پلکوں پر نمی ٹھہری تھی۔

گلاس ٹیبل پر ڈائری، کتاب، قلم اور شیٹس بھی رکھی تھیں۔ موبائل بھی پاس ہی پڑا تھا۔ مسز شیرازی کا دیا ہوا ٹاسک جیسے مکمل ہونے کو تھا۔ وہ بہت قریب تھی جواب سے۔ تقریباً پا ہی چکی تھی۔ لکھ کر نوٹس بھی بنا لیے تھے۔ اپنی سوچ اور سمجھ کے مطابق زندگی کے بہت سے معاملات کو بھی اس آیت کی نگاہ سے دیکھ کر جان چکی تھی۔ لیکن پھر بھی۔ ''یسرا'' وہیں تھا۔ وہ ابھی تک اس کی گہرائیوں میں اتر نہیں پائی تھی۔ حروف کے راز معانی سمیت ابھی تک سمجھ نہیں پائی تھی۔

سب سے اوپر جو صفحہ رکھا تھا اس پر کچھ آیات کے پرنٹ آوٹس تھے۔ جیسے کہ حضرت زکریا علیہ السلام، اور زوجہ ابراہیم علیہ السلام کی آیات تھیں۔ وہ پہلے بھی انہیں کافی دیر تک دیکھتی رہی تھی۔ اب بھی اپنی نگاہیں ان آیات پر جمائے بیٹھی تھی۔

موضوع ایک ہی تھا۔ سقم۔ عقیم۔ بانجھ ہونا۔ وہ سمجھنا چاہتی تھی، آیات بانجھ جیسے نقص کو کیسے واضح کرتی ہیں۔ پھر اس نقص کو رد کر کے اسے مکمل کیسے کرتی ہے۔

وہ یہاں سوچوں میں گھری بیٹھی تھی اور نیچے اقصیٰ کافی کے دو مگ اٹھائے دھپ دھپ سیڑھیاں چڑھتی اوپر آ رہی تھی۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' فارس وجدان نے اسے راہداری میں ہی روک دیا تھا۔ وہ کام نمٹا کر اسٹڈی روم سے ابھی باہر آیا تھا۔

''وہ جنت آپی نے کہا کہ وہ بور ہو رہی ہیں تو۔''

''تو تم نے سوچا کہ کچھ کرتب دکھا دیتی ہوں تا کہ وہ انٹرٹین ہو سکے!''

اقصیٰ نے گڑبڑا کر اسے دیکھا پھر اسی سرعت سے سر ہلا کر جھکا گئی۔ یہ فارس صاحب بھی نا۔ اب میں کوئی کرتب دکھانے والی لگتی ہوں؟ حالانکہ اس کے ابا کہتے تھے کہ ان کے صاحب بڑے سلجھے ہوئے، سوبر اور ڈیسنٹ ہیں۔

ذرا سا سر اٹھایا۔ ''میں جاؤں صاحب! کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔''

''ادھر لاؤ۔''

''جی!'' وہ ہونق پن سے دیکھ کر رہ گئی۔

فارس نے ہاتھ بڑھا کر مگ لے لیا۔

''اب جاؤ!'' گھونٹ بھرتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

اقصیٰ دیکھ کر رہ گئی۔ ''یہ جنت آپی کو دینی تھی۔'' اس کا اشارہ دوسرے مگ کی طرف تھا۔ فارس نے وہ بھی لے لیا۔

چاروناچار اقصیٰ کو فوراً مڑ کر جانا پڑا۔

وہ سٹنگ روم میں داخل ہوا تو جنت نے کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا۔ کافی کا مگ اس کے سامنے ٹیبل پر رکھ کر وہ سامنے سنگل صوفے پر براجمان ہو گیا۔ یونہی بیٹھے بیٹھے میز پر بکھرے کاغذات پر سرسری سی نگاہ دوڑانا چاہی مگر جنت نے کسی چیل کی طرح اپنی ساری چیزیں جھپٹ کر اٹھا لیں۔ آنکھوں میں ''خبردار'' کا نوٹس لہرانے لگا۔ وہ ایزی ہو کر گھونٹ گھونٹ کافی اپنے اندر اتارتا رہا۔ نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز رہیں۔

''ڈائیورس کے بعد تمہارے کیا پلانز ہیں؟'' انداز سرسری سا تھا۔

جنت نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ شدید حیرت اور بے یقینی سے۔

''اور سوال پوچھنے والے تم کون ہوتے ہو؟'' پھر سنبھل کر، ابرو چڑھا کر پوچھا۔

''وہی جس کے مرنے سے تم بیوہ ہو سکتی ہو۔''

جنت نے سٹپٹا کر اسے دیکھا پھر زیر لب بڑبڑا کر رہ گئی۔ اب اس بات کو یہ کبھی بھولے گا بھی یا نہیں؟ اس نے جھنجھلا کر مگ ٹیبل پر رکھ دیا۔

وہ صوفے کی پشت سے کمر ٹکائے ٹانگ پر ٹانگ رکھے شاہانہ انداز میں بیٹھا تھا۔ فل نیک سویٹر کی زپ سینے تک کھینچی ہوئی تھی۔

''میں یہ سوال صرف ممی کی وجہ سے پوچھ رہا ہوں۔'' اسے گہری جانچتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس نے گھونٹ لیا۔ ''تم بہت خاص ہو ان کے لیے۔ اس لیے۔''

''ہاں ان کے لیے ہوں! تمہارے لیے تو نہیں! سو تم اس طرح کا سوال پوچھنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ تمہارے لیے بس یہی بات اہم ہونی چاہیے کہ تم نے مجھے کھائی سے دھکا دینا ہے۔ اب نیچے گرتے ہوئے میں پتھروں سے ٹکرا کر مرتی ہوں، یا نہر میں ڈوب کر۔ یا پھر زندہ بچ کر جاتی ہوں۔ اٹ از نن آف یور کنسرن!''

''اٹ از مائی کنسرن!'' وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ ''اگر تم زندہ بچ کر گئیں تو؟''

جنت اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اگلے ہی لمحے اس کے لب بھینچ گئے۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اس عرصے میں پہلی بار اسے احساس ہوا کہ یہ اس کی زبان ہی ہے جو ہر بار فارس وجدان کے سامنے اس کا تماشا بنا دیتی ہے۔

''اللہ کے فضل سے بہت سے بیک اپ پلانز ہیں میرے اور سب ہی مثبت ہیں۔ نہ میرا سر پھٹے گا۔ نہ میں ڈوب کر مروں گی۔''

''میں نے کب کہا تمہارے ساتھ ایسا ہونا چاہیے؟'' وہ سوالیہ نشان بن گیا۔

''دیکھو!'' جنت نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بے حد تحمل سے مزید کچھ بھی کہنے سے باز رکھا۔ ورنہ دل تو چاہ رہا تھا کہ کوئی چیز اٹھا کر اس کے سر پر دے مارے۔ لیکن......!

''یہ نکاح ایک کانٹریکٹ ہے، یہ کانٹریکٹ ہی رہے گا، میں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے, کیا اب تم دیکھ نہیں رہے میں، اب اپنی لمٹس میں ہوں۔''

''تمہیں اپنی لمٹس میں آنے میں تین ماہ لگ گئے، میں تین دن میں سب بھول جاؤں؟''

جنت اپنی جگہ تھم کر رہ گئی۔

''تم کیا چاہتے ہو، میں تمہیں لکھ کر دوں؟ تب جا کر تمہیں یقین آئے گا؟'' وہ زچ ہوئی تھی۔

''ہاں! تمہارا کیا بھروسا بعد میں صاف مکر جاؤ۔''

''میں ایسی نہیں ہوں۔'' ضبط کر کے کہا۔

''یہ بات مجھ سے بہتر کون جانتا ہوگا؟'' لہجے میں تمسخر گھل گیا۔

جنت اسے دیکھ کر رہ گئی۔ کیسے لفظوں میں الجھا کر وہ اس کی درگت بنا دیتا تھا اور وہ کیسے پاگلوں کی طرح ہر بار اس کے جال میں پھنس جاتی تھی۔ یکا یک ہی اسے شدید قسم کا غصہ چڑھا۔ وہ اس پر پھٹ پڑی۔ ''تم خود کو سمجھتے کیا ہو؟ ہاں؟''

''وہی جس کے مرنے سے۔''

جنت نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ ''میں کچھ نہیں سن رہی! مجھے کوئی آواز نہیں آ رہی!! لالالالالالالالالالا......'' ساتھ ہی اس نے اتنا شور مچایا تا کہ فارس کی آواز اس تک نہ پہنچے۔ پھر غصے سے جھنجھلاتی اپنے کاغذات سمیٹتی سٹنگ روم سے ہی نکل گئی۔ کافی تو اس کی ویسے بھی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ مزید کی طلب بھی نہ رہی تھی۔

فارس نے ہاتھ بڑھا کر وہ صفحہ اٹھا لیا جسے وہ جلد بازی میں چھوڑ کر گئی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ پڑھ پاتا۔ جنت نے پیچھے سے جھپٹ لیا۔

''اپنے کام سے کام رکھو!''

''یہ بات کہہ کون رہا ہے؟'' مذاق اڑاتا ہوا لہجہ۔ وہ مزید سلگتی وہاں سے واک آؤٹ کر گئی۔

☆☆☆

اس نے وارڈ روب کھول کر اپنے تمام فینسی رنگ برنگے ملبوسات کا جائزہ لیا۔ پھر نچلا خانہ کھول کر جیولری باکس نکالے۔ نکاح نامہ اور حق مہر کا چیک بھی نیچے ہی موجود تھا۔ فرش پر دو زانو ہو کر بیٹھی وہ نکاح نامے کو کافی دیر تک دیکھتی رہی۔ پھر اس نے ایک ایک کر کے وہ جیولری باکس نکالے جو مسز شیرازی نے اسے دیے تھے۔ وہ زیورات جو شیرازی خاندان کی بہوؤں کا مقدر ٹھہرتے تھے۔

کچھ دیر وہ خیالات میں غرق اپنی تمام چیزوں کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ فارس وجدان کے سامنے اپنی حالیہ پوزیشن، اپنے حالیہ مقاصد واضح کر لینے کا فیصلہ۔

ایک بات تو طے تھی۔ اب ان کے مابین کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو سکتا تھا۔ نہ وہ اسے اپنانے کو تیار تھا اور نہ ہی جنت کمال اب ایسا کچھ چاہتی تھی۔

وہ جان گئی تھی اس کا گھر کبھی نہیں بسے گا۔ طلاق ہر بار مقدر ٹھہرے گی۔ بددعائیں تیر کی طرح تھیں۔ ٹھیک نشانے پر ہی آ کر لگتی تھیں۔ اور اسے اچھی طرح سے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس جیسی لڑکی کسی گھر کی زینت، کسی مرد کی عزت نہیں بن سکتی۔ وہ ایک "مجبوری" تھی۔ اسے برہان نے بھی اس کے ساتھ اسی طرح کا رویہ رکھا تھا۔ فارس بھی اب یہی کر رہا تھا۔ سو ایسے میں موجودہ

صورت حال سے سمجھوتا ضرور کیا جا سکتا تھا مگر وہ خود کو ایک بار پھر حالات کے دھارے پر نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ ایک فیصلہ وہ خود بھی کرنا چاہتی تھی۔ ایک راستہ وہ اپنے لیے بھی رکھنا چاہتی تھی۔

اسٹڈی روم کے دروازے پر مدھم سی دستک دے کر اس نے دروازہ کھول دیا تھا۔ لیپ ٹاپ کی پر متحرک فارس کی انگلیاں یک دم ساکت ہوئی تھیں۔ بے ساختہ سر اٹھا کر اس نے دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ یہ جاننے کے لیے کہ اس وقت کون مخل ہوا ہے۔ لیکن اگلے ہی لمحے جنت کمال پر نظر پڑتے ہی وہ رک سا گیا۔

وہ کسی ملازم کی آمد کی توقع ضرور کر رہا تھا مگر جنت کی نہیں۔

آنکھوں میں خفگی۔ رگیں تنی ہوئی۔ لب بھنچے ہوئے۔ سر اٹھا ہوا۔ لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے فارس نے بڑی فرصت سے اس کا انداز ملاحظہ فرمایا تھا۔

اس کے ہاتھوں میں کچھ جیولری باکس تھے جو اس نے آفس ٹیبل پر رکھ دیے۔

فارس نے ایک نظر ان باکس کو دیکھا۔ پھر اسے۔ لب باہم پیوست تھے مگر آنکھوں میں سوال تھا۔ کہ یہ کیا ہے؟ یہ کس لیے ہے؟

''آنٹی نے مجھے نکاح پر جیولری دی تھی۔'' اس نے سارے جیولری باکس کھول کر سونے کے زیورات اسے دکھائے۔

''اور یہ حق مہر۔'' اس نے دس لاکھ کا چیک اس کے سامنے رکھ دیا۔ بند مٹھی پر ٹھوڑی جمائے وہ اب بھی بے تاثر نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''مجھے کیوں دے رہی ہو؟''

''رکھوں بھی تو کس لیے؟'' اس نے الٹا سوال کیا، ''یہ نہ ہو، بعد میں تم حساب کتاب کے لیے سائرہ خالہ کے پاس پہنچ جاؤ۔ اس لیے سارے معاملات ابھی سے کلیئر کر رہی ہوں۔'' گویا اسے اپنے کاغذی شوہر سے اچھائی کی کوئی امید نہیں تھی۔

''حق مہر کے پانچ لاکھ میرے بنتے ہیں لیکن میں تمہیں پورے دس واپس کر رہی ہوں۔ اب یہ میں اس لیے نہیں کر رہی ہوں کہ تمہاری نظر میں کوئی دیوی شیوی بن سکوں، بھئی، جب شادی ہوئی ہی نہیں ہے تو۔'' وہ وضاحت دینا چاہ رہی تھی۔ اور یہ وضاحت الٹا اس کے گلے پڑ رہی تھی۔

فارس نے بند مٹھی ہونٹوں پر ٹھہرا لی تھی۔ جنت کو جانے کیوں لگا، اس نے مسکراہٹ ضبط کی ہو۔ لیکن وہ مسکرائے گا کیوں؟ ایک لمحے کے لیے وہ الجھی تھی۔ اب انسان اپنی فتح پر نہیں مسکرائے گا تو کیا روئے گا؟ دماغ نے ٹوکا۔

وہ مسکرائے۔ روئے۔ ہنسے۔ بھاڑ میں جائے۔ اس نے خیالات کو جھٹک کر اپنی بات مکمل کی۔

عسریسرا۔ حسنیٰ حسین

''اگر ہماری واقعی میں شادی ہوئی ہوتی اور ہم نے اس رشتے کو نبھایا بھی ہوتا تو میں ہرگز ہرگز معاف نہ کرتی۔ لیکن اب سچویشن کچھ اور ہے اس لیے مجھے یہی مناسب لگ رہا ہے۔ اس کے علاوہ جو تم ہر ماہ میرے بینک اکاؤنٹ میں نان ونفقہ کے طور پر رقم ٹرانسفر کر دیتے ہو، وہ میں نے ان تین ماہ میں ایک بار بھی استعمال نہیں کی ہے۔ یہ نہ ہو کہ بعد میں تم کہتے پھرو کہ میں تمھارے لاکھوں روپے اڑاتی رہی۔''

ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے فارس کو دیکھا۔ اس کی ذہین آنکھوں کے تاثر سے وہ کچھ نروس سی ہوئی۔ وہ اس پر نگاہیں جمائے بیٹھا تھا۔ خاموشی اور یکسوئی سے سن بھی رہا تھا۔ ایسا بھی ہونا تھا؟

''خیر!'' اس نے اس لٹ کو کان کے پیچھے اڑسا جو اس کے گال پر پھسل نہیں رہی تھی۔

''مجھے طلاق فوری چاہیے ہوگی۔ تمہیں ابھی سے ڈاکومنٹس کا انتظام کر لینا چاہیے تاکہ مناسب وقت پر بنا کسی تاخیر کے سائن کر کے ایک دوسرے سے جان خلاصی کی جا سکے۔ لیکن اگر کچھ وجوہات کی بنا پر۔ مجھے قبل از وقت یہ گھر چھوڑنا پڑ جاتا ہے۔ اور اس دوران میرا تم سے فی الفور رابطہ بھی ممکن نہیں ہو پاتا تو میں ایک ماہ تک کی مدت کو ذہن میں رکھوں گی اور اس کے بعد سمجھ جاؤں گی کہ مجھے طلاق ہو چکی ہے۔ سو تمہیں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ مجھے اس ایک ماہ کے اندر اندر طلاق ہو جانی چاہیے۔''

ایک لمحے کو رک کر اس نے یہاں وہاں نگاہ دوڑاتے کچھ سوچا۔ کہ کہیں کچھ رہ تو نہیں گیا؟

''لمبی چوڑی تمہید باندھ کر اور اس طرح جیولری اور حق مہر کی رقم واپس کر کے تم کیا یہ ثابت کرنا چاہ رہی ہو کہ تمہارے لیے پیسے اہم نہیں ہیں؟ رئیلی؟ یو وانٹ می ٹو بلیو ان دس ربش؟''

جنت ہکا بکا اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''خود کو بہت اچھا ثابت کرنے کے لیے ایک اور ڈرامہ۔ کہ دیکھو مجھے تمہاری دولت کی کوئی چاہت نہیں ہے۔ نہ نام اور سٹیٹس کی۔ میرے لیے بس تم ہی کافی ہو۔ اور دیکھو، میں کتنی اچھی ہوں کہ سب کچھ واپس کر رہی ہوں۔ بھلا مجھ جیسی فرشتہ صفت لڑکی تمہیں اور کہاں ملے گی۔''

ٹھیک ٹھاک بے عزتی تھی۔ جنت کا چہرہ مارے خفت کے سرخ پڑ گیا۔

''تمہیں کیا لگ رہا تھا کہ اس طرح میں بہت امپریس ہو جاؤں گا!!! اور مجھے لگے گا کہ یہی ہے وہ محبت کرنے والی وفا شعار لڑکی جسے میری دولت، وجاہت، اسٹیٹس سے قطعاً کوئی غرض نہیں ہے اور۔''

جنت کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ساری برداشت ختم ہو گئی۔ جیولری باکس اٹھا کر اس کے سر پر مارتے مارتے وہ یک دم رک گئی۔

وہ دلچسپ نظروں سے دیکھتا اپنی جگہ بیٹھا رہا۔

''یو نو واٹ! مجھے اپنا حق مہر چاہیے۔ پورے پانچ لاکھ۔'' زہرخند لہجے میں کہتے ہوئے اس نے چیک جھپٹ کر اٹھا لیا۔

فارس کے لبوں پر مبہم سا تبسم ابھرا۔ ''میرے لیے یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ چاہو تو پورے دس لاکھ رکھ لو۔ آئی رئیلی ڈونٹ کیئر!''

''کیوں رکھ لوں؟ بھکاری سمجھ رکھا ہے؟ پانچ لاکھ سے ایک روپیہ کم یا زیادہ نہیں لوں گی۔ سارے پیسے نکلوا کر انہیں آگ لگا دوں گی مگر تمہیں معاف نہیں کروں گی۔ اور یہ جیولری۔'' شدید غصے کے عالم میں باکس اٹھا کر فارس کی پہنچ سے دور کیے گئے۔ ''آنٹی نے دیے تھے۔ آنٹی کو ہی واپس کروں گی۔ تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ......''

فارس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ جنت فق چہرے کے ساتھ اپنی جگہ پتھر ہوئی کھڑی رہ گئی۔ وہ ہنس رہا تھا؟ وہ اس پر ہنس رہا تھا۔ اس کی بے بسی پر؟ اس کا مذاق اڑا کر؟ تماشا بنا کر اب وہ ہنس رہا تھا؟

اگلے ہی لمحے آگاہی کا وہ لمحہ اس پر پہاڑ بن کر ٹوٹا۔ اور اسے احساس ہوا۔ فارس وہ حکایت ہی تو اسے پڑھ کر سنا رہا تھا جسے وہ پچھلے تین ماہ سے لکھتی رہی ہے۔ وہ بھی تو وہی کر رہا تھا جو وہ خود کرتی رہی ہے۔ اس نے بھی تو زچ کیا تھا اسے۔ زبردستی کسی مصیبت کی طرح مسلط رہی تھی۔ اور پھر وہ کیسے بھول سکتا ہے کہ وہ مسز شیرازی کے توسط سے ہی اپنی مرضی ومنشاء سے اس گھر میں رہتی رہی ہے۔ اسے یکا یک ہی ادراک ہوا، وہ اپنا بویا کاٹ رہی ہے۔ اسے سزا ملنی ہی تھی۔ فارس کی خاموشی نے کبھی تو آواز میں ڈھلنا ہی تھا۔ وہ اس کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتی رہی ہے تو وہ اس کی کمزوری کا حظ کیوں نہیں اٹھائے گا؟

وہ اس پر نگاہ جمائے کئی لمحوں تک ساکت کھڑی رہی۔ اس نے پہلے کیوں نہیں سمجھا؟ پہلے کیوں نہیں جانا؟

''تمہیں اب یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' کافی دیر بعد وہ کچھ کہنے کے قابل ہوئی تو اس کا لہجہ کافی سے زیادہ سختی لیے ہوئے تھا۔

''ہمارا نکاح ایک کانٹریکٹ ہے۔ اور یہ کانٹریکٹ ہی رہے گا۔ میں اس حقیقت کو بدلنے کی کوشش اب کبھی نہیں کروں گی۔'' پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ اس نے اپنے ارادے فارس وجدان پر واضح کر دیے تھے۔

''جس طرح تم آنٹی کے لیے خوش گوار شادی ہونے کا ناٹک کر رہے ہو نا۔ اسی طرح میں بھی صرف ان کی وجہ سے یہاں رکی ہوئی ہوں۔ اور یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ جب جانے کا وقت آئے گا میں خاموشی سے چلی جاؤں گی۔ اس لیے تمہیں یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' دوٹوک انداز میں تنفر سے کہہ کر وہ اسی وقت آفس سے نکل گئی تھی۔

تیزی سے کرسی چھوڑ کر فارس عجلت میں قدم اٹھاتا اس کے پیچھے آیا تھا۔ بیچ راہداری میں ہی اس نے کندھوں سے پکڑ کر جنت کا رخ موڑا۔ وہ اس کی اس حرکت پر حیران ہوئے بنا نہ رہ سکی۔ پھر یاد آیا یہاں غصہ کرنا بنتا ہے۔

''اب کیا مسئلہ ہے؟'' کندھے جھٹک کر پھنکاری۔

''مسئلے کا حل ہے۔ اب تم حق مہر کی پوری رقم اپنے پاس رکھ سکو گی!''

چھناکے سے جنت کے اندر کچھ ٹوٹا۔ کرچیاں آنکھوں میں سما گئیں۔

''مگر کانٹریکٹ کی حقیقت کبھی نہیں بدلے گی۔'' وہ کہہ کر جا چکا تھا اور جنت کمال جیولری باکس اور حق مہر کی رقم لیے اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

اوائل جنوری کی دھند آلود شب تھی۔ ہر طرف سناٹوں کا راج تھا۔ وہ سٹنگ روم میں فلور کشن پر ٹانگیں سمیٹے خاموش بیٹھی تھی۔ اطراف میں زرکار روشنی کا ہلکا سا تاثر پھیلا تھا۔ سامنے گلاس وال پر ابھرتی اس کی شبیہہ ادھوری تھی۔ آدھا چہرہ عیاں تھا تو آدھا تاریکی سے الجھتا ہوا۔

اس نے ذلالت کے کئی روپ دیکھے تھے۔ مگر یہ نہیں دیکھا تھا۔ لہجوں کے کئی نشتر سہے تھے مگر یہ نہیں سہا تھا۔ دھتکار تو ویسے بھی اس کا مقدر تھی مگر عزت نفس پر چوٹ سب پر بھاری تھی۔

ماں کی بدعاؤں میں ایک بدعاء موت کی بھی تو تھی۔ یہ واحد دعا تھی ان کی جو پوری نہ ہوئی تھی۔ باقی بربادی کا ہر چہرہ اس نے دیکھ لیا تھا۔ ہر اذیت چکھ لی تھی۔ ہر دھتکار سہہ لی تھی۔ بس یہ موت ہی رہ گئی تھی۔ بس یہی۔

سر جھکائے وہ نم آنکھوں سے اپنی خالی ہتھیلیوں کو دیکھنے لگی تھی۔ نگاہیں لکیروں سے الجھی تھیں۔ نصیب تلخی سے مسکرایا تھا۔

''زندگی کتنے ہی مشکل ادوار سے کیوں نہ گزر رہی ہو، اور کتنی ہی آسانیوں کا مرکز کیوں نہ بن چکی ہو، دعا کسی بھی صورت، کسی بھی حالت میں نہیں چھوڑنی چاہیے۔'' مسز شیرازی نے آج صبح اسے نصیحت کی تھی۔

''میری دعائیں قبولیت میں بہت وقت لیتی ہیں۔'' وہ کہے بنا نہ رہ سکی۔

''جو ''تاخیر'' رب کی طرف سے ہو، وہ ہمیشہ ''خیر'' لاتی ہے!'' مسز شیرازی کہہ کر مصروف ہو گئی تھیں مگر وہ کتنی ہی دیر تک اپنی جگہ بیٹھی رہی تھی۔

ہر تاخیر میں ایک خیر! اس نے خود کو کچھ سمجھانا چاہا۔

''کچھ محرومیاں عطا کا ایک روپ ہوتی ہیں جنت! اللہ کی ''کن'' کی منتظر۔ اپنا روپ بدلنے کو ہر لمحہ مستعد، اصل امتحان تو اس مدت کا ہے۔ جو اس محرومی میں گزاری جاتی ہے۔''

گلاس وال پر اس کی دھندلی ادھوری شبیہہ اب کچھ واضح ہوئی تھی۔

''اس دوران ہمارے صبر کو جانچا جاتا ہے۔ ہمارے شکر کو پرکھا جاتا ہے۔ پھر ایمان کا درجہ متعین ہوتا ہے۔''

اس نے آنکھیں رگڑ کر صاف کیں۔

''مانگتی رہو اور دیکھتی جاؤ اللہ کی مرضی سے تمھاری جھولی میں کیا گرتا ہے، جو گرے اسے بخوشی اپنا لو، خواہ وہ نقطے جتنی خوشی یا ذرے جتنی برکت ہی کیوں نہ ہو۔''

مثبت سوچ نے جڑ پکڑی۔ آنسو پلکوں پر ٹھہر گئے۔ اندر کا شور تھم سا گیا۔ اپنے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بناتی وہ اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔

گھڑی رات کے دس بجا رہی تھی۔ فارس ابھی تک نہیں آیا تھا۔ صوفے پر نیم دراز ہو کر فلور لیمپ کی روشنی میں میگزین کی ورق گردانی کرتے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

نیند کی گہری وادیوں میں اترتے اسے کسی خواب، کسی خیال کی طرح یاد تھا تو بس یہی کہ میگزین ہٹا کر ایک طرف رکھتے ہوئے کسی نے اسے لحاف اوڑھا دیا تھا۔

☆☆☆

پارک میں اقصیٰ کے ہمراہ ٹہلتے ہوئے اس کی نظر سیاہ ٹریک سوٹ میں ملبوس شخص پر پڑی تو وہ چونک کر وہیں رک گئی۔ اس کی گردن کے گرد مفلر اچھی طرح سے ہونٹوں تک لپٹا ہوا تھا جس کی وجہ سے آدھا چہرہ مکمل پوشیدہ تھا۔

اقصیٰ کا بازو پکڑ کر فوراً رخ بدلتی، وہ عجلت میں مخالف سمت قدم اٹھانے لگی۔

''کیا ہوا؟'' اقصیٰ اپنی مالکن کے بدلتے تاثرات سے پریشان ہو جاتی تھی۔

''یہ جو ہمارے پیچھے آ رہا ہے، یہ فارس ہی ہے نا'' اس نے اقصیٰ سے تصدیق چاہی۔

اقصیٰ نے پوری گردن موڑ کر پیچھے دیکھا، پھر زور و شور سے سر ہلایا'' جی جی یہ اپنے فارس صاحب ہی ہیں۔''

جنت کے لب بھنچ گئے۔ ''دیکھو اقصیٰ، پاس پاس رہنا۔''

اقصیٰ سمجھ نہ سکی، مالکن نے ایسا کیوں کہا ہے۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد جب پیچھے بار بار مڑ کر دیکھنے پر فارس وجدان نے اسے ادھر ادھر ہو جانے کا اشارہ دیا تو وہ بے چاری کنفیوز ہو گئی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ کس کی مانے؟ فارس کی۔ یا پھر جنت کی؟

مگر اس کی کالج فیس تو صاحب ہی دیتے تھے۔ اپنی مصلحتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ اپنی رفتار مدھم کرتی واقعی میں ادھر ادھر ہو گئی۔

جنت کو اس کی غیر موجودگی کا احساس اس وقت ہوا جب فارس تیز تیز قدم اٹھاتا اس کے برابر میں چلنے لگا تھا۔

عسریسرا۔ حسنیٰ حسین

زیر لب بڑبڑاتے ہوئے اس نے اپنی رفتار بڑھالی۔ مگر وہ اس سے پھر بھی آگے نہ نکل سکی۔ دونوں برابر تھے۔ جنت کے قدموں میں عجلت نمایاں تھی جبکہ فارس کا انداز سکون لیے ہوئے تھا۔ پھر اس نے بھاگنا شروع کر دیا۔ وہ تب بھی ایک لمحے کے لیے نہ آگے نکلا۔ نہ پیچھے ہوا۔

جنت نے دور تک جاگنگ ٹریک کو دیکھا پھر تھک ہار کر پھولے تنفس کے ساتھ رک گئی۔ گھٹنوں پر ہاتھ رکھے جھک کر سانسیں ہموار کرنے لگی۔ وہ بھی رک گیا۔ اگلے چند لمحے خاموشی کی نذر ہوئے۔

”پندرہ جنوری کی ٹکٹ کنفرم ہوئی ہے۔“ ہونٹوں پر سے مفلر ہٹا کر گردن پر ٹھہراتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے کہا۔

جنت نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ٹھیک ہے بھلے سے اس کے ”جنت“ کی ٹکٹ کنفرم ہو یا ”جہنم“ کی۔ وہ اسے کیوں بتا رہا ہے۔ آنکھوں میں نا سمجھی کا تاثر لیے سوال ٹھہر گیا۔

”تم میرے ساتھ لندن جا رہی ہو۔“

جنت ساکت ہوئی۔ آنکھیں حیرت و بے یقینی سے پھیلیں۔ سماعت پر یقین نہ آیا۔ اب وہ کیا کر رہا ہے؟ اب وہ کیا چاہ رہا ہے؟

”تمہیں لگتا ہے تم مجھے اپنی مرضی سے کہیں بھی لے جا سکتے ہو؟“ وہ مشتعل ہوئی۔

”لاہور لے جا چکا ہوں۔ لندن بھی لے جا سکتا ہوں۔“ اس کا لہجہ نارمل تھا۔ جیسے غیر ضروری گفتگو میں وہ یونہی حصہ لے رہا ہو۔

”لاہور میں چلی گئی تھی۔ لندن میں نہیں جاؤں گی۔“

فارس نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔

”تمہارا کیا بھروسا مجھے پارکنگ ایریا یا روڈ پر چھوڑ کر چلے جاؤ۔ پھر دس پندرہ دن بعد آنٹی کے مجبور کرنے پر لینے آجاؤ۔ سوری میں یہ رسک نہیں لے سکتی۔ بالکل بھی نہیں۔“

اس نے صاف انکار کر دیا۔ وہ اب فارس کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ بس نفی میں سر ہلاتے ہوئے اپنے تجزیوں پر قانع ہو رہی تھی۔

لاہور وہ اسے بطور ”سزا“ لے کر گیا تھا۔ بطور سزا چھوڑ کر بھی آیا تھا۔ وہ اسے اپنی بیوی، اپنی عزت نہیں سمجھتا تھا۔ جس شخص کی وہ ”بیوی“ تھی نہ ”عزت“۔ اس شخص پر اب وہ کوئی بھروسا نہیں کر سکتی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ چند لمحوں کے توقف کے بعد فارس نے کہا۔ آواز گمبھیر تھی۔ تاثرات سنجیدہ۔ مگر کہیں سختی نہیں تھی۔ نرمی بھی نہیں۔ یوں جیسے انکار سے اسے کوئی خاص فرق نہ پڑا ہو۔ یوں جیسے وہ ایسے ہی کسی جواب کا متمنی رہا ہو۔ پل پل اس کے تاثرات،

اس کے ارادے اور احساسات بدلتے تھے۔

”ممی کے حکم پر ٹکٹ بک کروائی ہے۔ انکار بھی تم انہیں کرو۔“

اس کے لبوں پر ابھرتی فاتحانہ مسکراہٹ جنت کو اندر تک سلگا گئی۔ مسز شیرازی کو فارس وجدان انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی کیا مجال تھی۔ کڑھ کر، تپ کر، اس نے سر اٹھا کر فارس کو دیکھا۔

”میں اچھی طرح سے جانتی ہوں تم مجھے لندن کیوں لے جانا چاہتے ہو۔“

”کیوں لے جانا چاہتا ہوں؟“

”تم جو مرضی منصوبے بنالو مسٹر شیرازی! خودکشی میں نہیں کروں گی۔ نہ لندن کی برج سے۔ نہ کسی اور جگہ سے۔“

جاگنگ ٹریک پر پاؤں پٹختی وہ جانے کے لیے مڑ گئی تھی۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے فارس وجدان متبسم چہرے کے ساتھ اپنی جگہ کھڑا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

بیڈ پر تکیوں کے سہارے وہ نیم دراز کوئی کتاب ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔ موبائل پاس ہی پڑا تھا۔ ہر تھوڑی دیر بعد موصول ہوتے میسج کے نوٹیفکیشن کو مسلسل نظر انداز کیے وہ بظاہر پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کے تمام تر توجہ اس اٹھا پٹخ کی طرف تھی جو جنت کمال کی وجہ سے ہو رہی تھی۔ درازیں کھینچی جا رہی تھیں۔ چیزوں کو ادھر ادھر کیا جا رہا تھا۔ جس چیز کی تلاش تھی، وہ اسے پورا کمرہ الٹ پلٹ کرنے کے باوجود نہیں ملی تھی۔

تھک ہار کر وہ وارڈ روب کی طرف مڑی جو تمام کی تمام کھلی ہوئی تھیں۔ سفری بیگ قالین پر دھرا تھا۔ ہینگر سے کپڑے نکال کر تہہ کرتی اب وہ شدید غصے میں لگ رہی تھی۔

چار دن بعد ان کی لندن کی فلائٹ تھی۔ سامان ابھی سے پیک کیا جا رہا تھا۔ اور کچھ غصے اور جھنجھلاہٹ کے عالم میں کیا جا رہا تھا۔

”تم ایسے ری ایکٹ کر رہی ہو جیسے میں تمہیں زبردستی لندن لے جا رہا ہوں۔“ بالآخر فارس نے خاموشی کا قفل توڑا۔

”ہاں تو کیا ایسا نہیں ہے؟“ وہ پلٹ کر غرائی۔ ”تمہاری ہر چال اب مجھے بہت اچھی طرح سمجھ میں آرہی ہے۔“

”کیسی چال؟“ لبوں پر ابھرتی مسکراہٹ دبائے وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ ”میرے ساتھ لندن جانے کی خواہش تو ہمیشہ سے تمہاری ہی تھی۔“

ہینگر سے گلابی سویٹر نکالتی جنت کمال مشتعل ہو کر اس کے طرف مڑی۔ ”یہ تم نے خود کہہ دیا تھا!! یعنی فعل ماضی۔ پاسٹ

ٹینس! اب میری ایسی کوئی خواہش نہیں رہی۔''

''اچھا مذاق ہے یہ۔'' وہ ہنسا۔

''مذاق نہیں حقیقت ہے یہ!!'' جنت جل بھن گئی۔

''تمہاری حقیقتیں بھی تمہاری طرح کچھ عجیب سی نہیں ہیں؟'' اس کا لہجہ مذاق اڑانے والا تھا۔

جنت نے پلٹ کر اسے سرد نظروں سے گھورا۔

''کوئی خوش فہمی ہے تو دور کر لو۔ میں صرف ممی کی وجہ سے تمہیں "مجبوراً" ساتھ لے جا رہا ہوں۔''

''میں بھی صرف ان کی وجہ سے جا رہی ہوں۔ ورنہ تمہارے ساتھ تو میں گلی کے نکڑ تک بھی نہ جاؤں۔''

''بہت خوب۔'' وہ محظوظ ہوا۔ جنت کو تپ چڑھی۔ اس سے قبل کہ وہ کوئی جوابی حملہ کرتی فارس کا موبائل بج اٹھا۔ سکرین پر ابھرتے نام پر نظر پڑتے ہی وہ کال ریسیو کرتا اسی وقت اٹھ کر کمرے سے چلا گیا تھا۔

وہ جو اپنے کپڑے ہاتھ میں لیے کھڑی تھی، اس کی اس حرکت پر ٹھٹھک سی گئی۔ فارس کی بیشتر کالز کاروباری نوعیت کی ہوتی تھیں جنہیں وہ ہمیشہ اس کے سامنے ہی اٹینڈ کرتا تھا۔ دوست احباب سے بات چیت بھی اس کے سامنے ہو جایا کرتی تھی۔ مگر پچھلے کئی دنوں سے ایک مخصوص نمبر سے آنے والی کال اٹینڈ کرنے کے لیے وہ اٹھ کر باہر چلا جاتا تھا۔ ہر بار اس کے تاثرات بدلتے تھے اور آنکھوں کی چمک کچھ بڑھ سی جاتی تھی۔

پہلے تو اس نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا مگر اب اسے شک ہونے لگا تھا۔

کچھ سوچ کر وہ بے آواز قدموں کے ساتھ باہر آ گئی تھی۔ اس نے پھر وہیں سے سٹنگ ایریا کی طرف دیکھا۔

''میں بھلا تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں؟'' سامنے وکٹورین طرز کے آئینے میں فارس کا سائڈ پوز واضح نظر آ رہا تھا۔

''ممی سے میں نے فی الحال بات نہیں کی ہے، میں انہیں سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔'' اس نے رک کر کچھ سنا، پھر مسکرایا۔ ''تم کہہ سکتی ہو۔''

خاموشی ایک بار پھر چھائی تھی۔ وہ بہت توجہ اور یکسوئی سے مخاطب کی بات سن رہا تھا۔ اور اس دوران کئی بار اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھری تھی۔ ''کون؟ میری بیوی؟ اس کی تم فکر مت کرو، میں سب سنبھال لوں گا۔''

کیا سنبھالے گا وہ؟ جنت کا ماتھا ٹھنکا۔ مخاطب یقیناً ایک لڑکی تھی۔ اس کا شک یقین میں بدل چکا تھا۔

مگر یہ لڑکی تھی کون؟ یہ سوال اب وہ ڈائرکٹ فارس وجدان سے نہیں پوچھ سکتی تھی۔ پوچھنے کا کوئی حق بھی نہیں رکھتی تھی۔ حق رکھتی بھی ہوتی تو پوچھنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے یہی ظاہر کرنا تھا کہ ایسی کسی بات سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔

سر جھٹک کر وہ کچھ ہی دیر میں کمرے کے اندر تھی۔

ہاں، اسے ہرگز ہرگز فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ اس نے اپنے گال تھپتھپا کر خود کو سمجھایا۔ پھر اپنے کام میں جت گئی۔

''کون ہو سکتی ہے؟'' کچھ ہی دیر بعد اپنا بکھیڑا سمیٹتے ہوئے وہ ایک بار پھر سوچنے بیٹھ گئی تھی۔

☆☆☆

''آپ بہت پیاری ہیں۔''

کچن میں داخل ہوتے ہی یہ پہلا جملہ تھا جو فارس وجدان کی سماعت سے ٹکرایا تھا۔ اسٹول کھینچ کر بیٹھتے ہوئے اس نے گپلو سے اس صحت مند بچے کو دیکھا جو کاؤنٹر ٹیبل کے دوسرے کونے میں اپنے کپڑوں میں بمشکل سمایا ہوا بیٹھا تھا۔ کھلی ڈھالی شرٹ لارج سائز کی تھی اور تب بھی اسے تنگ ہو رہی تھی۔ فارس کو بہت غور کرنے اور ذہن پر زور دینے کے بعد یاد آیا کہ وہ مسز یزدانی کا نواسا تھا۔ مسز یزدانی وہی جوان کے پڑوس میں رہتی تھیں اور جو جانوروں سے محبت کے معاملے میں کافی مشہور بھی تھیں۔

''یہ اس لیے کہ آپ خود بہت پیارے ہو۔'' فارس کی آمد سے قطعی بے خبر وہ ٹرے میں کیک پیسٹریز اور جانے کیا کیا سجانے میں لگی ہوئی تھی۔

''کیا۔ کیا آپ مجھ سے شادی کریں گی؟'' اپنی ننھی سی سرخ کار کو ٹیبل پر یہاں وہاں دوڑاتے بچے نے ذرا سا جھجکتے ہوئے جنت سے پوچھا۔

''شی از میریڈ!'' جواب فارس نے دیا تھا۔ گلاس میں اسٹرابری جوس انڈیلتے جنت کے ہاتھوں کی حرکت لمحے بھر کے لیے تھمی۔ یہ کب آیا؟

بچے نے گردن موڑ کر ایک نظر فارس وجدان کو ایسے دیکھا جیسے اس کی یہ مداخلت اسے ہرگز ہرگز پسند نہ آئی ہو۔

''سو واٹ! وہ اپنے ہزبینڈ کو چھوڑ بھی تو سکتی ہیں۔'' اسے لاجواب کر کے اس نے اپنی پیشانی پر بکھرے بالوں کو دونوں ہاتھوں کی مدد سے پیچھے ہٹایا۔

''آر یو میریڈ جنت جانی؟'' کچھ سوچ کر اس نے جنت سے پوچھا۔

''جنت جانی؟'' فارس نے اچھنبے سے اسے دوبارہ دیکھا۔

''نو آئم سنگل!'' لوازمات سے سجی ٹرے اپنے ننھے مہمان کے سامنے رکھتے ہوئے جنت نے سنایا کسی اور کو۔

بچے نے فارس کو یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ دیکھا! شی از مائن! شی ول بی مائن۔

فارس نے رخ بدل کر اورنج جوس کا گلاس لبوں سے لگا لیا۔ یہ جنت سنگل کب سے ہوئی؟

''تو پھر میں اپنی ممی کو کب لاؤں؟ ایک بار ہماری بات طے ہو جائے تو۔''

''از ہی سیریس۔'' فارس سے رہا نہیں گیا۔ مشکل سے سات سال کا ہوگا۔ آگے کے دو دانت بھی موصوف کے غائب تھے۔

''تمہیں کیا مسئلہ ہے مجھے سات سال کا بچہ پرپوز کرے یا ستر سال کا بوڑھا؟'' جنت کو پتنگے لگ گئے۔

''آئم ناٹ آ بچہ'' بچے کو پہلی بار اپنی ہونے والی ''منگیتر'' سے اختلاف ہوا۔

''دیکھا، وہ خود مان رہا ہے وہ بچہ نہیں ہے۔''

''تمہیں کیا مسئلہ!'' اب تو جنت کو بھی فارس کی مداخلت پسند نہیں آ رہی تھی۔ فارس محض کندھے اچکا کر رہ گیا۔ کہ بھلا اسے کیا مسئلہ ہو سکتا ہے؟

''میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا۔ میں آپ کو پوری دنیا کی سیر بھی کرواؤں گا۔ ہم دونوں اکٹھے ڈزنی لینڈ بھی جائیں گے۔'' وہ جنت کو اپنے فیوچر پلان سے آگاہ کرنے لگا۔

''جب تک تم جہاز اڑانے کے قابل ہو گے، تب تک یہ پچاس برس کی ایک آنٹی میں بدل چکی ہو گی۔''

جنت نے جل کر فارس کو دیکھا۔ ''ایج ڈزنٹ میٹرز! لو میٹرز!''

''واٹ ایور!'' اس نے خالی گلاس کاؤنٹر ٹیبل پر رکھا۔

''زیدہنی! آپ کا جب دل چاہے اپ اپنی ممی کو لے آؤ۔'' بہت مسکرا کر اس نے بچے کا گال کھینچا۔

''سوزی کو بھی ساتھ لے آؤں؟''

''اب یہ سوزی کون ہے؟'' فارس نے ایک بار پھر ان کے درمیان ٹانگ اڑائی تھی۔

''میری بلی ہے۔'' شان بے نیازی سے بتایا گیا۔ فارس کے تاثرات بدلے۔

''نہیں، سوزی کو لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس سے ملنے آپ کے گھر آؤں گی۔'' جنت نے ٹالنا چاہا۔

''سوزی بہت اسٹرونگ ہے۔ اس کے اندر سپر پاورز ہیں! وہ میرے دشمنوں کو جب دیکھتی ہے تو وہ اسی وقت گر جاتے ہیں۔'' وہ در پردہ کس بات پر چوٹ کر رہا تھا، فارس پہلو بدل کر رہ گیا۔

''آپ گرے تھے نا اس دن؟'' پھر وہ فارس کی طرف مڑا۔ کمال کی یادداشت تھی اس بچے کی۔ ڈیڑھ سال ہونے کو تھا مگر ابھی بھی اسے وہ واقعہ جزئیات سمیت یاد تھا۔

''آپ گرے تھے نا سیڑھیوں سے۔ سوزی بہت پاورفل ہے۔ جنت جانی کل میں سوزی کو بھی لاؤں گا۔''

فارس نے بھنویں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ ''میں تمھاری اس سوزی کی وجہ سے نہیں گرا تھا۔

''سب معلوم ہے مجھے۔'' بچے نے گردن سیدھی کی۔ ''آپ کی آئیز ریڈ ہو گئی تھیں۔ آپ کو سنیزنگ ہو رہی تھی۔ آپ بہت ڈر گئے تھے میری بلی سے۔ مجھے سب یاد ہے۔ میری بلی بہت پاورفل ہے۔''

خالی گلاس میز پر رکھتے ہوئے فارس اسی وقت اٹھ کر چلا گیا۔

''یہ بہت ڈرتے ہیں میری سوزی سے!!'' اس نے پھر پراسرار انداز میں جنت کی معلومات میں اضافہ کرنا چاہا۔ لبوں پر ابھرتی مسکراہٹ کو بمشکل دباتے ہوئے جنت نے فارس کی طرف دیکھا۔ وہ لاؤنج کے صوفے پر نیم دراز اب چینل سرفنگ کر رہا تھا۔

''اچھا!'' اس نے بھی آگے سے شدید حیرت کا اظہار کیا۔

''آپ میری سوزی کو اپنے پاس رکھ لیں۔ فار یور اون سیفٹی!'' بچے نے سرگوشی میں کہا۔ جنت بے ساختہ ہنستی چلی گئی۔ جھنجھلا کر ریموٹ پٹختے ہوئے فارس اسی وقت اٹھ کر چلا گیا تھا۔

☆☆☆

مسز شیرازی کے بیڈروم میں وہ گلاس وال کے قریب فلور کشن پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ لیپ ٹاپ گلاس ٹیبل پر دھرا تھا جس پر وہ ان کا آرٹیکل ٹائپ کر رہی تھی۔

مسز شیرازی پاس ہی وہیل چیئر پر براجمان تھیں۔ وہ باہر لان کے سبزے پر چمکتی اس دھوپ کا نظارا کر رہی تھیں جو براہ راست اب ان پر بھی پڑ رہی تھی۔

دروازہ ہلکی سی دستک کے ساتھ کھلا تو جنت نے بے ساختہ نظر اٹھائی۔ بلیک تھری پیس سوٹ میں ملبوس، کوٹ لاپروائی سے بازو پر ڈالے، دوسرے ہاتھ میں موبائل پکڑے فارس وجدان اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کی تیاری مکمل تھی۔ وہ دوپہر تین بجے کی فلائٹ سے ضروری میٹنگ کے لیے کراچی جا رہا تھا۔ کل شام تک اس کی واپسی متوقع تھی۔ اور پھر پرسوں انہیں لندن کے لیے روانہ ہونا تھا۔

آنکھوں میں خفگی بسائے وہ خود کو مصروف ظاہر کرتی تیزی سے ٹائپنگ کرتی رہی۔

ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالتا وہ صوفے پر جا بیٹھا تھا۔ مسز شیرازی کی موجودگی میں وہ ہمیشہ اپنی شخصیت کا الٹ نظر آتا۔ نرمی صرف اس کی باتوں سے ہی نہیں، چہرے اور آنکھوں سے بھی جھلکنے لگتی تھی۔

''آپ کو کسی سے ملوانا چاہتا ہوں ممی!'' جانے سے پہلے اس نے کچھ یاد آ جانے پر مسز شیرازی سے کہا۔

جنت کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے سر اٹھا کر فارس وجدان کو دیکھا۔ اس کی پشت جنت کی طرف تھی۔ وہ اس کا چہرہ

پڑھنے سے مکمل قاصر تھی۔

''اچھا۔ وہ کس سے؟'' مسز شیرازی نے پر اشتیاق لہجے میں پوچھا تھا۔

''کسی خاص الخاص سے! آپ کو اس سے مل کر بہت خوشی ہوگی۔''

جنت کے لب بھینچ گئے۔ غصہ نئے سرے سے عود کر آیا۔ آج اسے آئمہ ظہیر کی کلاس لینی ہوگی۔ وہی کہتی تھی، اس کے فارس بھائی لڑکیوں سے دس فٹ، بیس فٹ کی دوری پر رہتے ہیں۔ اب پتا نہیں یہ کون تھی جسے وہ آنٹی سے ملوانا چاہتا تھا۔

اس کے چہرے پر ڈوبتی ابھرتی شکی حکایتوں کو پڑھتے فارس وجدان نے سامنے ہاتھ لہرایا۔ وہ چونکی۔ پھر گڑبڑا کر اٹھ گئی۔ اب اپنے مجازی خدا کو دروازے پر چھوڑنے بھی تو جانا تھا۔ مسز شیرازی کے کمرے سے نکلتے ہی اس نے چہرے کا رخ مشرق کی سمت کیا اور فرش پر پاؤں پٹخ کریوں چلنے لگی جیسے سارا قصور ہی ان ٹائلز کا تھا جو اس کے پیروں تلے بچھی ہوئی تھیں۔

''اپنی پیکنگ تو بڑے جوش و خروش سے کر رہی ہو، ہو سکے تو میرا سامان بھی پیک کر دینا!'' قدرے فاصلے سے ہی ریموٹ کی سے گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے وہ بولا تو اس کا لہجہ معمول کے برعکس خوش گوار تھا۔

''تمہیں نہ پیک کر دوں میں؟'' وہ بھنائی۔

''کر سکتی ہو تو کر دو۔'' وہ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پہلے گردن جھکائی پھر اس کا ہاتھ پکڑا۔

''تم۔'' اس نے بدک کر ہاتھ چھڑانا چاہا۔ لبوں پر مسکراہٹ سجائے وہ ذرا سا اس کی طرف جھکا۔ ''ممی ہمیں ہی دیکھ رہی ہیں۔''

جنت کی ہاتھ چھڑانے کی جستجو دم توڑ گئی۔ ذرا سا رخ بدل کر زبردستی مسکرائی۔ تاکہ مسز شیرازی جان لیں، وہ ان کے بیٹے کو کتنی محبت سے الوداع کر رہی ہے۔ اور یہ بھی کہ وہ کتنی خوش گوار زندگی بسر کر رہے ہیں۔ (ماشاءاللہ!)

''ہاں اب ٹھیک ہے۔'' فارس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ اس نے ہاتھ چھڑا کر گاڑی کا دروازہ کھولا۔

''اب جاؤ بھی۔'' ساتھ ہی جھڑک کر آنکھیں دکھائیں۔

''تمہارے ڈر سے نہیں جا رہا ہوں، وقت بہت کم رہ گیا ہے۔'' رسٹ واچ پر ٹائم دیکھتا وہ گاڑی میں بیٹھا تو جنت کمال نے بے اختیار سکھ بھرا سانس لیا۔ مگر اس کے یہ سکون بھری کیفیت فارس وجدان سے کیونکر برداشت ہو سکتی تھی؟ شیشہ نیچے کرتے ہوئے اس نے ذرا سا سر باہر کیا۔

''میرے پاس ایک سرپرائز ہے تمہارے لیے۔''

وہ پوچھنا چاہتی تھی کیسا سرپرائز، یا سرپرائز کی آڑ میں چھپی کیسی سزا! کیسا بدلہ؟ کیسا انتقام؟ مگر لب بھینچے، سینے پر بازو باندھے

خفگی سے اسے چپ چاپ دیکھتی رہی۔

''کراچی سے جب واپس آؤں گا تب۔'' اگنیشن میں چابی گھماتے ہوئے اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

جنت دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ آنکھوں پر سیاہ گلاسز لگائے وہ گاڑی ریورس کرنے لگا۔ چوکیدار نے گیٹ کھول دیے تھے۔

اب وہ سیاہ گاڑی کو آہنی گیٹ سے باہر نکلتا دیکھ رہی تھی۔ سرپرائز؟ جانے کیوں اس کا دل کسی ناگہانی احساس کے تحت دھڑک اٹھا تھا۔

☆☆☆

مسز یزدانی نے اسے اپنے پوتے کی سالگرہ پر انوائٹ کیا تھا۔ فارس کراچی گیا ہوا تھا۔ آئمہ مری گھوم رہی تھی۔ اور وہ اکیلے نہ پہلے کوئی فنکشن اٹینڈ کر سکی تھی۔ نہ اب کرنا چاہتی تھی۔ دل بوجھل اداس سا تھا۔ لیکن مسز شیرازی چاہتی تھیں وہ ضرور جائے۔

''وہ بہت پیار سے بلا رہی ہیں جنت!''

وہ آج کل اس کی ضرورت سے زیادہ خاموشی کو حد سے زیادہ محسوس کر رہی تھیں۔

''میرا دل نہیں چاہ رہا۔'' سر جھکا کر وہ ایک بار پھر ٹائپنگ کرنے لگی تھی۔ مسز شیرازی نے اسے بغور دیکھا۔ گزشتہ کئی دنوں سے وہ ایسی ہی تھی۔ اداس۔ خاموش۔ پریشان......

''وہ کیا سوچیں گی؟''

''میں کہہ دوں گی، فارس کراچی گیا ہوا ہے اس لیے نہیں آ سکتی۔'' کھٹ کھٹ کی بورڈ پر اس کے انگلیاں تیزی سے متحرک تھیں۔

''مسز یزدانی کا یہ انویٹیشن خاص تمہارے لیے ہے جنت! فارس تو ایسے فنکشن اور گیدرنگز بہت کم ہی اٹینڈ کرتا ہے۔''

اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ''آپ حکم دے رہی ہیں؟''

''یہی سمجھ لو۔ کتنے دن ہو گئے، میں نے تمہیں تیار ہوتے نہیں دیکھا، میک اپ جیولری۔ کچھ بھی نہیں۔ ذرا یاد کرو، لاہور جانے سے پہلے تم کتنا تیار رہتی تھیں۔ جیسے پھول کھلا رہتا ہے بالکل ایسے ہی لگتی تھیں تم مجھے!''

نم آنکھوں کے ساتھ وہ پھیکا سا مسکرا دی۔

''چلو اٹھو شاباش! جا کر تیاری کرو، مسز یزدانی تمہیں اپنے ساتھ ہی اپنے فارم ہاؤس لے کر جائیں گی۔ میں ان سے بات کر لیتی ہوں۔''

''آنٹی پلیز!''

''جنت نو آر گونمنٹ۔فریش ہو جاؤ گی بیٹا!''

گہرا تنفس لے کر وہ اسی وقت اٹھ گئی تھی۔تیاری کرتے ہوئے اس کا ذہن مسلسل الجھا ہوا تھا۔عجیب بے سکونی تھی جو وجود میں پھیلی ہوئی تھی۔

تیاری مکمل کرنے کے بعد اس نے سر درد کی گولیوں کی تلاش میں بیڈ سائڈ ٹیبل کی دراز کھینچی۔اندر رکھی اشیاء کو الٹ پلٹ کرتے اس کے ہاتھوں سے سیاہ مخملیں ڈبیہ ٹکرائی۔وہ کچھ دیر تک کسی مجسمے کی طرح ساکت سی بیٹھی رہ گئی۔پھر اس نے مخملی ڈبیہ کھول کر دیکھی۔نفیس سی ایمرالڈ ڈائمنڈ رنگ چمک رہی تھی۔

کچھ دیر تک وہ سانس روکے اس بیش قیمت تحفے کو دیکھتی رہی پھر بھاری دل کے ساتھ اسے رکھ کر اٹھ گئی۔

جانے کیوں اس کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔اک ان جانا سا خوف از سر نو سر اٹھانے لگا تھا۔

ہر طرح کے خیالات کو جھٹکتی وہ شال اچھی طرح سے اوڑھ کر کلچ سنبھالتی کمرے سے نکل گئی تھی۔مگر جو بے سکونی اس ڈبیہ کو دیکھ کر اس کے وجود میں اتری تھی اس سے باوجود کوشش کے بھی وہ پیچھا نہ چھڑا سکی تھی۔

☆☆☆

ریسٹ روم میں دیوار سائز آئینے کے سامنے رک کر اس نے اپنے سراپے کا از سر نو جائزہ لیا۔پھر کھلے بالوں کو سمیٹ کر ان کا جوڑا بنانے لگی۔ہیل کی ٹک ٹک کے ساتھ ہی دیوار گیر آئینوں میں کسی کا عکس ابھرا۔اس نے چونک کر بے ساختہ نگاہ اٹھائی۔

سیاہ رنگ کی باریک ساڑھی میں ملبوس اک نزاکت اور ادا سے سج سج قدم اٹھاتی وہ اس کے برابر میں آن کھڑی ہوئی تھی۔سنہرے براؤن بال جوڑے میں مقید تھے۔کچھ گھنگھریالی لٹیں دودھیا چہرے کے اطراف میں تھیں۔

کاجل سے لبریز بڑی بڑی آنکھوں میں جنت کمال کو دیکھتے ہی تعجب ابھرا تھا۔سرخ لبوں پر ایک دل فریب سی مسکراہٹ سج گئی تھی۔

''واٹ اے سرپرائز!'' کچھ حیران ہو کر اس نے جنت کا سر تا پیر جائزہ لیا۔

''غالباً یہ ہماری تیسری ملاقات ہے۔اور ابھی تک ہمارا ٹھیک سے انٹروڈکشن ہوا ہی نہیں!'' ساڑھی کا پلو ہاتھ میں پکڑے وہ ایک ادا سے مسکرائی۔اس کی مسکراہٹ بھی عجیب طنزیہ سی ہوتی تھی۔

جنت نے سر جھٹک کر خاموشی سے رخ بدلا،کلچ میں چھوٹے سائز کی میک اپ کٹ رکھی۔آئمہ کی تنبیہ اپنی جگہ مگر اس لڑکی سے اسے کچھ اچھی وائبز نہیں آتی تھیں۔

''آئم عدینہ زبیر!'' اپنا نام بتاتے ہوئے اس نے جنت کے تاثرات جانچے۔جنت کسی عدینہ زبیر کو نہیں جانتی تھی۔یہ اس

کے چہرے پر صاف صاف لکھا تھا۔

''فارس وجدان کی پہلی بیوی!''

جنت نے جھٹکا کھا کر اسے دیکھا۔نقرئی کلچ ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گرا۔لائنر،لپ گلوز اور مسکارا یہاں وہاں بکھر گئے۔

''یو آر سرپرائزڈ!'' وہ اس کے تاثرات سے کچھ حیران ہوتے ہوئے ہنس پڑی۔''غالباً شیرازی خاندان کے کسی فرد نے تمہیں ابھی تک فارس کی پہلی شادی کے بارے میں نہیں بتایا!!''

''فارس کی پہلی شادی؟'' آنکھوں میں صدمہ لیے جنت اپنی جگہ ساکت کھڑی تھی۔

''تو کیسی لائف گزر رہی ہے تمہاری میرے ایکس ہزبنڈ کے ساتھ؟'' عدینہ کی طنزیہ نگاہیں اس کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔

''کیا اس نے تمہیں بتایا نہیں، وہ مجھ سے کتنی محبت کرتا ہے؟ علیحدگی کے بعد بھی وہ میرے لیے کتنا دیوانہ رہا ہے؟ میری ہی وجہ سے اس نے کتنی لڑکیاں ریجیکٹ کی ہیں؟ کتنے رشتوں سے انکار کیا ہے؟!''

جنت کا دماغ ماؤف ہوا تھا۔حواس شل ہو رہے تھے۔وہ یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں پتھرائی ہوئی نگاہوں سے عدینہ زبیر کو دیکھے جا رہی تھی۔

''مسز لغاری کی بیٹی ثمرہ کے ساتھ تو اس کی بات تقریباً طے ہو چکی تھی لیکن عین نکاح کے وقت اس نے انکار کر دیا۔کین یو ایمیجن! عین نکاح کے وقت......ایسی محبت ہے اس کی۔بھولا نہیں ہے وہ مجھے۔نہ ہی بھول سکتا ہے وہ کبھی۔آج بھی میں اس کے دل میں آباد ہوں۔میری جگہ نہ اس نے کبھی کسی کو دی ہے، نہ ہی وہ دے سکتا ہے!''

جنت کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔منظر دھندلا سا گیا۔تو یہ وجہ تھی فارس وجدان کی نفرت، دھتکار اور بے اعتنائی کی۔نکاح جیسے مقدس رشتے کو ایک معین مدت تک قائم رکھنے کی۔

''وہ آج بھی مجھے اپنانے کا منتظر ہے،انکار تو میری طرف سے ہے۔فیصلہ تو میں نہیں بدل رہی۔لیکن سوچو جنت! اگر میں اسے ''ہاں'' کہہ دوں۔ذرا سوچو!! تمہاری حیثیت کیا رہ جائے گی؟''

وہ سوال نہیں گویا پہاڑ تھا جو جنت کے سر پر ٹوٹا تھا۔خود سے کیا گیا ہر ایک عہد ایک لمحے میں فنا ہوا تھا۔وہ جو اپنا ''گھر'' چھوڑنے کا فیصلہ بہت پہلے کر چکی تھی۔اب گھر اجڑتا دیکھ کر سکتے میں آ گئی تھی۔

''نائس ٹو میٹ یو جنت!'' عدینہ زبیر کے لبوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔''امید ہے ہماری اگلی ملاقات وجدان ہاؤس میں بہت جلد ہو گی۔''

وہ جا چکی تھی اور جنت کمال واش بیسن پر گرفت جمائے ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ بمشکل اپنے قدموں پر کھڑی تھی۔

''میں آپ کو کسی سے ملوانا چاہتا ہوں ممی!''

''بہت خاص الخاص ہے وہ!''

''ایک سرپرائز ہے تمہارے لیے!''

اس نے سانس لینے کی کوشش کی مگر اسے سانس نہیں آ رہا تھا۔ سینے پر ہاتھ رکھے وہ نیچے بیٹھ گئی تھی۔

فون کالز۔

خوش گوار رویہ۔

سائڈ ٹیبل سے برآمد ہونے والا رنگ کیس۔

''کر سکتا ہوں۔ میں تو اب ممی سے یہ بھی کہہ سکتا ہوں، میری بیوی بانجھ ہے، میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

جنت کمال نے اذیت سے آنکھیں میچ لی تھیں۔

☆☆

وہ اس عورت کو نہیں جانتا تھا جو اسے گھر کے بیرونی گیٹ سے باہر نکلتی ہوئی نظر آئی تھی۔ اسے حیرت ہوئی۔ اس طرح کوئی بھی اجنبی اتنی آسانی سے اس گھر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ آنکھوں میں الجھن لیے وہ اندر داخل ہوا تو اسے وجدان ہاؤس میں ایک غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔

اقصیٰ پریشانی کے عالم میں بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی تھی۔ وہ روتے ہوئے اب کچھ کہہ رہی تھی۔ کچھ بتا رہی تھی۔

فارس نے شاک کے عالم میں سر اٹھا کر مسز شیرازی کی طرف دیکھا۔ حیرت اور صدمہ بھرے تاثرات لیے وہ اپنی جگہ ساکت بیٹھی تھیں۔ مگر ان کی نگاہیں کسی ایک جگہ پر ٹھہر نہیں رہی تھیں۔ لبوں کو جنبش دیتے انہوں نے فارس سے کچھ کہا۔ اقصیٰ نے بوکھلا کر مسز شیرازی کو دیکھا۔ اور اسی لمحے فارس وجدان دروازہ کھول کر عجلت میں قدم اٹھاتا تیزی سے باہر بھاگا تھا۔

بیرونی گیٹ سے باہر۔ سڑک پر پہنچتے ہی وہ سر تا پیر مکمل طور پر بارش میں بھیگ چکا تھا۔

''اسے ڈھونڈو فارس! ایسا نہ ہو وہ کچھ کر بیٹھے۔''

آگے بڑھتے ہوئے وہ چاروں طرف دیکھ رہا تھا مگر جنت بنت کمال اسے کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

بھاری تنفس کے ساتھ ایک موہوم سی امید لیے اس نے مسز یزدانی کو کال کی۔ جنت ان کے گھر نہیں گئی تھی۔ آئمہ کا موبائل آف جا رہا تھا۔ وہ ویسے بھی اسلام آباد میں موجود نہیں تھی۔ اگر ہوتی بھی تو جنت اتنی جلدی اتنی کم مدت میں اس تک نہیں پہنچ سکتی

تھی۔

یقیناً وہ ابھی تک یہیں۔ آس پاس ہی کہیں تھی۔ وہ اسے تلاشتے ہوئے پارک کا رخ کر چکا تھا۔ موسم کی خرابی کے باعث وہاں اکا دکا ہی لوگ تھے۔ آگے مسجد تھی۔ اور مسجد کی دوسری طرف مرکزی شاہراہ تھی۔

اور اسی مرکزی شاہراہ پر قدم دھرتے ہی ٹریفک کا شور یکا یک اس کے لیے صامت ہوا تھا۔ زندگی سے بھرپور فضا ایک خلا میں بدل گئی تھی۔

زمین نے قدم جکڑے، وجود بھاری پتھر ہو گیا۔ اسے لگا وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکے گا۔ ذرا سا ہلے گا تو پاش پاش ہو جائے گا۔

''تمہیں لگتا ہے، اللہ نے ہمیں بچایا ہے؟''

''ہاں۔ اللہ کا بوت بوت شکر باجی!''

''ایسا بھی تو ممکن ہے کہ یہ ایک وارننگ ہو۔ میرے لیے۔ تمہارے لیے۔ یا شاید کسی اور کے لیے۔''

چھتری کھل گئی تھی۔ گاڑی کے قریب وہ پھسل کر گری تھی۔ اس کا ہاتھ جھٹک کر اپنے سہارے اٹھ رہی تھی۔

''جو کچھ سن چکا ہوں، وہ سب ممی کو بتاؤں گا تو وہ کیا سوچیں گی؟ ایک ایسی لڑکی کو بہو بنا بیٹھی ہیں جو **infertile** (بانجھ) ہے۔ جس نے اپنی سوتن کے بچے کی جان لینے کی کوشش کی ہے۔ جس کے خاندان کے لوگ اسے اچھوت کی طرح ٹریٹ کرتے ہیں۔ اور جو اپنی ماں کی موت کا سبب بنی ہے۔''

پارکنگ ایریا میں گاڑی اسٹارٹ کرتا وہ آنکھوں میں ڈھیر ساری نمی لیے، کچھ بے بسی اور آزردگی سے اسے دیکھتی جنت کمال۔

چہار سو تاریکی چھائی اور منظر بدل گیا۔

''اگر تم اس طرح میرے سر پر مسلط رہے تو میں آنٹی کو سب کچھ بتا دوں گی۔''

''شوق سے جاؤ! میں بھی تمہارے پول ان کے سامنے کھول دوں گا، حساب برابر۔''

''تم ایسا نہیں کرو گے۔'' لہجے میں خوف تھا۔ آنکھوں میں وحشت۔

''کر سکتا ہوں۔ میں تو اب ان سے یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ میری بیوی بانجھ ہے، میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے چاندی کی اس مورت کو ہزار ہا ٹکڑوں میں بکھرتا دیکھا۔

''فارس پلیز......دروازہ کھولو پلیز۔'' بلک بلک کر روتے وہ اس کے کمرے کا دروازہ بجائے جا رہی تھی۔

''ایک بچے کی جان لینے کی کوشش۔ آخر تم میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی تھی؟''

اور پھر اس نے سلائڈ ڈور پوری قوت سے بند ہوتے دیکھی۔اب وہ کمرے سے باہر۔دسمبر کی سرد ترین راتوں میں بالکنی میں کھڑی تھی۔

''اللہ کے فضل سے بہت سے بیک اپ پلان ہیں میرے،اور سب ہی سروائیول بیسڈ ہیں،نہ میرا سر پھٹے گا۔نہ میں ڈوب کر مروں گی۔''

جتاتی نگاہیں۔مضبوط لہجہ۔شجاعت لیے انوکھا انداز۔جیسے وہ دنیا کے ہر طوفان سے بھڑ جانے کی،ہر چٹان سے لڑ جانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔اس کے لیے نہ''فارس'' کچھ ہے۔نہ''طلاق'' کچھ ہے۔

''مجھے طلاق فوری چاہیے ہوگی۔تمہیں ابھی سے ڈاکومنٹس کا انتظام کرلینا چاہیے تاکہ مناسب وقت پر بنا کسی تاخیر کے سائن کر کے ایک دوسرے سے جان خلاصی کی جاسکی۔''

خود پر طاری اس بھیانک جمود کو توڑتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔سڑک کے کنارے غیر متوازن قدم اٹھاتا وہ وہاں جارہا تھا جہاں کچھ دیر پہلے ایک حادثہ پیش آیا تھا۔چلتی ہوئی تیز رفتار گاڑی کے سامنے اچانک ہی کوئی لڑکی آگئی تھی۔

ایمبولنس کا سائرن۔لوگوں کا ہجوم۔اور شدت سے برستی بارش میں موت کو اتنے قریب سے۔اس انداز اور اس حالت میں دیکھتا فارس وجدان اپنے حواسوں میں ہرگز نہیں لگ رہا تھا۔

''لیکن اگر کچھ وجوہات کی بنا پر۔مجھے قبل از وقت یہ گھر چھوڑنا پڑجاتا ہے۔اور اس دوران میرا تم سے فی الفور رابطہ بھی ممکن نہیں ہو پاتا تو میں ایک ماہ تک کی مدت کو ذہن میں رکھوں گی۔''

مدت مختصر تھی۔مختصر سے مزید مختصر کردی گئی تھی۔مہینہ آن کی آن میں ہفتوں اور پھر دنوں میں بدل کر لمحوں پر محیط ہوا تھا۔

''اور یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔جب جانے کا وقت آئے گا،میں خاموشی سے چلی جاؤں گی۔''

اور جنت کمال وعدہ خلافی نہیں کرتی تھی۔

یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں دکھ اور صدمے سے نڈھال اس نے اپنے راستے میں آنے والوں کو ہٹاتے ہوئے اسٹریچر پر رکھی اس لاش تک پہنچنا چاہا۔خون سے سرخ ہوتی نم چادر اس کی مٹھی میں آئی۔چہرے سے چادر سرکی۔بال۔پیشانی۔پھر ویران آنکھیں واضح ہوئیں۔اس کی ساری ہمت،سکت اس ایک لمحے میں فنا ہوئی۔

''تم جتنے مرضی منصوبے بنالو مسٹر شیرازی!خودکشی میں نہیں کروں گی۔نہ لندن کے برج سے۔نہ کسی اور جگہ سے۔''

چادر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

وہ بال۔چہرہ اور آنکھیں۔وہ جنت کمال کی ہرگز نہیں تھیں۔

☆☆☆

کمرے میں تاریکی تھی۔کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ہوا سے پردے لہرا رہے تھے۔باہر موسم خوش گوار تھا مگر ان کے اندر کی اداسی ہر گزرتے لمحے بڑھتی جارہی تھی۔موبائل ہاتھ میں تھا۔وہ اب تک نہ جانے کتنی بار فارس وجدان کو کال کر چکی تھیں۔کتنی ہر بار میسج بھیج چکی تھیں۔مگر وہ کوئی جواب نہیں دے رہا تھا۔جنت کا موبائل ہنوز آف تھا۔وہ ابھی تک نہ اس سے بات کرسکی تھیں اور نہ ہی انہیں اس کی خیریت کی اطلاع ملی تھی۔

کل صبح سے ہی انہوں نے خود کو کمرے میں بند کر رکھا تھا۔نہ کھانا کھا رہی تھیں،نہ کسی سے کوئی بات کر رہی تھیں۔

دستک دے کر عمار نے دروازہ کھولا تو وہ ایک دم سے تڑپ کر اٹھیں اور تیزی سے قدم اٹھاتیں اس کے پاس آئیں۔

''کچھ پتا چلا؟''

عمار نے نفی میں سر ہلایا۔''صابرہ خاتون کے گھر تالا لگا ہے،پڑوسی کہہ رہے ہیں وہ دو ماہ سے کہیں گئی ہوئی ہیں۔کہاں؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔ان کا فون نمبر بھی بند جارہا ہے۔''

سائرہ اپنا سر ہتھیلیوں پر گرائے صوفے پر بیٹھ گئیں۔خوف اور اندیشوں میں گھرا ان کا دل شدت سے دھڑکے جارہا تھا۔آنکھیں نم تھیں۔لب کپکپا رہے تھے۔

''فارس اسے ڈھونڈ رہا ہے۔وہ مل جائے گی۔ہاں مل جائے گی۔''

عمار دکھ اور صدمے سے اپنی ماں کو دیکھ کر رہ گیا۔

''آپ ابھی بھی اس شخص پر بھروسا کررہی ہیں مما؟''اس کے لہجے میں شاک تھا۔''جس انسان نے اپنے باپ اور بھائی کو نہیں چھوڑا۔وہ جنت کے لیے رحم دل ہوگا؟''

''عمار۔''ان کی آواز کپکپا کر رہ گئی۔

''میں نے کہا تھا آپ سے،وہ اچھا انسان نہیں ہے۔میں نے روکا تھا آپ کو۔مگر آپ نے میری ایک نہیں سنی۔''سرد لہجے میں وہ کچھ متوحش ہوکر بات کررہا تھا۔''آپ صرف اتنا چاہتی تھیں کہ کسی طرح وہ ہم سب کی نظروں سے دور ہوجائے۔''

سائرہ آنکھوں میں صدمہ لیے عمار کو دیکھ کر رہ گئیں۔اتنے سخت لفظوں کی توقع انہیں اپنے بیٹے سے ہرگز نہیں تھی۔وہ بھی اس وقت جب وہ جنت کے لیے اس قدر پریشان ہورہی تھیں۔

''چار بیٹے ہیں آپ کے اس گھر میں۔کسی کے ساتھ بھی آپ جنت کی شادی کرواسکتی تھیں۔فیصل بھائی،عذیر بھائی،احمد بھائی اور میں۔میں نے خود ریکویسٹ کی تھی آپ سے کہ مجھے کوئی پرابلم نہیں ہے،آپ خاموشی سے میرا نکاح پڑھادیں۔اس طرح

دربدر کی ٹھوکریں کھانے سے بہتر ہے، اسے اپنوں میں ایک مستقل ٹھکانا ملے۔ مگر نہیں۔ آپ بھلا ایک بانجھ لڑکی کو اپنی بہو کیسے بنا سکتی تھیں؟ آپ تو بس اس سے جان چھڑانا چاہتی تھیں۔ اور مبارک ہو مما! آپ اپنی اس کوشش میں بہت کامیاب رہیں۔''

سائرہ اپنی جگہ پتھرائی ہوئی بیٹھی تھیں۔ یہ کیسا چہرہ تھا جو عمار انہیں دکھا رہا تھا۔ یہ کیسی حقیقت تھی، جو وہ انہیں بتا رہا تھا۔

''میں نے سوچ سمجھ کر اس کا رشتہ طے کیا تھا عمار! میں اسے زمان سے بچانا چاہتی تھی۔''

انہوں نے کمزور آواز میں اپنی پوزیشن کلیئر کرنا چاہی۔ ان کی نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ وہ جنت کا بھلا ہی چاہتی تھیں۔ فارس بہترین انتخاب تھا۔ وہ اس پر یقین قائم رکھنا چاہتی تھیں۔ وہ اپنے فیصلے کا دفاع کرنا چاہتی تھیں۔ مگر عمار ان کی ہر کوشش ناکام بنا گیا تھا۔

''آپ پریشان کیوں ہو رہی ہیں؟ وہ مر جائے گی مگر ایک ''ذمہ داری'' اور ''بوجھ'' کے روپ میں آپ کے گھر کبھی نہیں آئے گی۔''

اپنی بات پوری کر کے وہ جا چکا تھا۔ اور دل پر بھاری بوجھ لیے سائرہ اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

پلک جھپکتے مناظر بدلے تھے۔ اندھیرا چھٹ گیا تھا۔ کھڑکیوں کے پردے سمٹ گئے تھے۔ سورج کی روشنی چھن کر ٹائلز پر اتر آئی تھی۔ کئی ہفتے پہلے کا قصہ جھلکیوں میں اپنا آپ دہرانے لگا تھا۔

انہوں نے جنت کو دیکھا۔ اس نے صفحے گلاس ٹیبل پر پھیلا دیے تھے۔ خود وہ ان کے سامنے کارپٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

''قرآن میں بانجھ پن کے لیے دو لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ ایک ہے ''عاقر'' اور دوسرا ہے ''عقیم'' جب سورۃ مریم میں زکریا علیہ السلام کی زوجہ کا ذکر آتا ہے تو وہ اللہ سے دعا کرتے ہوئے کہتے ہیں میری بیوی ''عاقر'' ہے۔ لیکن جب زوجہ ابراہیم کو فرشتے اولاد کی بشارت دیتے ہیں تو وہ کہتی ہیں میں بڑھیا ''عقیم'' ہوں۔''

وہ اپنے اسی مخصوص انداز میں مخاطب تھی اور صفحے پلٹ کر مطلوبہ آیات انہیں ترجمے سمیت دکھا رہی تھی۔

''یہ سورہ الشوریٰ کی آیت ہے۔'' انگلی رکھ کر وہ کہہ رہی تھی۔

''آسمانوں اور زمین میں اللہ ہی کی بادشاہی ہے، جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکیاں عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے لڑکے بخشتا ہے۔ یا لڑکے اور لڑکیاں ملا کر دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے بانجھ (عقیم) کر دیتا ہے، بے شک وہ خبردار قدرت والا ہے۔''

پھر رک کر سر اٹھائے وہ ان کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

''آپ نے دیکھا یہاں ''عقیم'' لکھا گیا ہے۔ عاقر نہیں۔''

انہوں نے پرسوچ انداز میں اثبات میں سر ہلایا تھا۔ سورج کی روشنی جنت کے شہد رنگ بالوں پر پڑ رہی تھی۔

''اور یہاں سورۃ انبیاء کی یہ آیت زکریا علیہ السلام سے متعلق ہے۔'' اس نے انگلی رکھ کر پڑھنا شروع کیا۔ ''پھر ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے یحییٰ عطا کیا اور اس کے لیے اس کی بیوی کو درست کر دیا، بے شک یہ لوگ نیک کاموں میں دوڑ پڑتے تھے اور ہمیں امید اور ڈر سے پکارا کرتے تھے، اور ہمارے سامنے عاجزی کرنے والے تھے......'' ختم ہوتی آیت غور فکر کے کئی دروازے وا کر گئی تھی۔

"اب اس میں آیت کا یہ حصہ غور طلب ہے۔ ہم نے ان کی بیوی کو درست کر دیا۔ یعنی ان کی اصلاح کر دی......اب سوال یہ ہے یہاں کس ''اصلاح'' کی بات کی گئی ہے؟ جہاں تک مجھے علم ہے زوجہ زکریا ایک نیک اور عبادت گزار خاتون تھیں۔ ایسا نہیں تھا کہ نعوذ باللہ ان کے مابین کوئی شر یا فساد تھا جسے اصلاح کی ضرورت پڑتی۔''

ایک لمحے کا توقف کر کے وہ براہ راست ان کی آنکھوں میں دیکھنے لگی تھی۔

''آپ کا کیا خیال ہے؟''

''میں تم سے سننا چاہتی ہوں۔'' وہ بے ساختہ کہہ گئی تھیں۔

وہ ذرا سا جھجکی، پھر مسکراتے ہوئے گویا ہوئی۔

''مجھے لگتا ہے یہ اس بیماری کی، اس نقص کی اصلاح تھی۔ اس بانجھ پن کی جو انہیں اولاد سے محروم رکھے ہوئے تھا۔''

ان کی خاموش نگاہوں میں یکا یک حیرت کا تاثر ابھرا تھا۔ اندر کے سوالات کے جواب تلاشتی جنت کمال انہیں بہت مطمئن نظر آئی تھی۔ اس کا لہجہ کمزور نہ تھا۔ اس کے لفظوں میں مایوسی نہ تھی۔ وہ یقین اور بے یقینی کے درمیان بھٹک نہیں رہی تھی۔ اس نے کنارہ چن لیا تھا۔ ساحل پر قدم جما لیے تھے۔

''جہاں تک میں اپنی تحقیق سے سمجھ پائی ہوں۔ بانجھ پن کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ عورت یا مرد میں سرے سے باپ یا ماں بننے کی صلاحیت پیدائشی طور پر موجود نہیں ہوتی اور اسے ''عقیم'' کہتے ہیں جو کہ زوجہ ابراہیم علیہ السلام تھیں۔ اسی ''عقیم'' کا ذکر سورہ شوریٰ کی آیت پچاس میں ہے۔

اور دوسرا بانجھ پن وہ ہے جو کسی نہ کسی نقص یا بیماری کی وجہ سے ہے۔ اور جس کا علاج یا اصلاح ممکن ہے۔''

مسز شیرازی نے گہرا تنفس لے کر پلکیں جھپکائیں۔ منظر وہی تھا۔ کمرہ بھی وہی۔ صفحے بھی وہیں۔ مگر جنت کمال کہیں نہیں تھی۔

''عاقر کسی سبب سے بھی ہو سکتا ہے۔ اور بغیر کسی سبب کے بھی۔ کچھ لوگوں کو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا پر تب بھی ان کی اولاد نہیں

ہوتی۔اور کچھ لوگوں میں کوئی نقص ہوتا ہے،اس کے باوجود ان کے یہاں اولاد ہو جاتی ہے۔''

سبز روشنائی سے کسی آیت کو انڈر لائن کرتی۔کسی اور نقطے کی وضاحت کرتی وہ ایک بار پھر انہیں متوجہ کر چکی تھی۔

''قرآن نے ایک 'عقیم' بوڑھی عورت کو ماں بنتے دکھایا ہے۔ایک بوڑھی عاقر کو بھی۔زکریا علیہ السلام کی بیوی میں جو نقص تھا وہ دعا سے،امید سے،یقین سے ٹھیک ہو گیا۔اور زوجہ ابراہیم جن میں سرے سے ماں بننے کی صلاحیت موجود نہیں تھی،انہیں بھی اللہ نے اپنی 'قدرت' سے ماں کے رتبے پر سرفراز کر دیا۔''

کھڑکیوں پر پردے پھیل گئے تھے۔سورج کی کرنیں سمٹ گئی تھیں۔ان کے بیڈ روم میں جنت کمال اب کھڑکیوں کے پاس کھڑی نظر آ رہی تھی۔

''بلاشبہ یہ ایک محرومی ہے،اور یہ محرومی بھی اللہ کے چنے ہوئے کتنے خاص بندوں کے حصے میں آئی۔یہ بات میں بھول رہی تھی۔''

لہجے میں دبا دبا سا جوش اور آنکھوں میں ایک چمک لہرائی تھی۔''اسی ''محرومی'' کو اللہ نے ''عطا'' میں بدلتے دکھایا۔جو ناممکن تھا اسے ''ممکن'' کر کے دکھایا۔ایک عاقر۔ایک عقیم۔دو عظیم عورتیں!اور دونوں انبیاء کی مائیں ٹھہریں۔''

کمرے میں اب صرف زرکار لیمپ روشن تھا۔اس کی روشنی میں وہ انہیں اپنے برابر میں لیٹی ہوئی دکھائی دی۔سینے پر سر رکھے۔ایک ماں میں۔اپنی ماں تلاشتی۔مایوسی میں امید کا دیا جلاتی۔

''انتظار ہمیشہ ان ہی لوگوں کے حصے میں آتا ہے آنٹی!جنہیں کچھ عظیم عطا کرنا مقصود ہو۔''

منظر بدل گیا تھا۔جنت ان کے کمرے میں اب کہیں نہیں تھی۔نہ وہ پردوں کو ڈوریوں میں باندھ رہی تھی،نہ ان کا لکھا ہوا کوئی آرٹیکل ٹائپ کر رہی تھی۔اور نہ ہی ان سے اب کوئی آیت ڈسکس کر رہی تھی۔ان کے کمرے میں اب مکمل خاموشی تھی۔ایسی خاموشی جو ان کے اندر ایک شور سا برپا کیے جا رہی تھی۔

''بلاشبہ انبیاء کے لیے معجزات ہوا کرتے ہیں۔مگر وہ معجزے ان کے لیے بھی بغیر صبر،دعا،اور عاجزی کے نہیں ہوئے۔یہ پوائنٹ میں مس کر رہی تھی۔''

وہ اس کی ہر بات کا مطلب جیسے اب سمجھ رہی تھیں۔ہر سوال کے پیچھے چھپا ہوا درد جیسے اب محسوس کر رہی تھیں۔انہیں کبھی پتا ہی نہ چل سکا کہ وہ ریسرچ اس کے اپنے لیے تھی۔وہ محنت،وہ الجھن اور بحث۔وہ سب اس کے اپنے لیے تھی۔

''ایک وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں صرف باہر کی دنیا سے لڑنا پڑتا ہے۔یہ ایک جنگ ہے اور قدرے آسان ہے۔لیکن باہر کی دنیا کے ساتھ ساتھ جو جنگ اپنے اندر،اپنے آپ سے لڑنی پڑتی ہے۔یقین کریں وہ بہت مشکل ہوتی ہے۔''

وقت صفحوں کی طرح پلٹ رہا تھا۔وہ انہیں پیچھے۔اور بہت پیچھے لیے جا رہا تھا۔جنت کی آنسوؤں سے بھری آنکھیں انہیں چاروں طرف نظر آ رہی تھیں۔

''آپ بار بار مرتے ہیں۔اور بار بار زندہ کر دیے جاتے ہیں۔اسی ایک ہی اذیت سے بار بار گزرنے کے لیے۔جہنم بھی اسی لیے جہنم ہے کہ سب بار بار ہوتا رہے گا۔ہے نا؟''

انہیں یوں لگا جیسے وہ جائے نماز پر بیٹھی آدھی ادھوری باتیں ایک بار پھر کرنے لگی ہے مگر وہ باتیں اب آدھی ادھوری نہیں رہی تھیں۔وہ ان کے لیے مکمل ہوتی جا رہی تھیں۔

''وہ لوگ بھی تو ہوتے ہیں جنہیں بغیر کسی انتظار،دعا اور تڑپ کے سب مل جاتا ہے۔ان میں ہم کیوں نہیں ہو سکتے؟ہمیں کیوں رونا پڑتا ہے؟ہمیں کیوں ایک ایک خواہش کے لیے تڑپنا پڑتا ہے؟''

گھڑی کی سوئیاں متحرک تھیں۔پنڈولم کی آواز اب مبہم نہ رہی تھی۔

وجدان ہاؤس میں پہلے دن سے اب تک جنت کے ساتھ ہونے والی ہر گفتگو انہیں یاد آ رہی تھی۔امید اور مایوسی سے الجھتی اس کی آنکھیں۔مضبوطی سے کمزور پڑتی اس کی آواز۔ڈرا ڈرا سا لہجہ،سہما سہما سا انداز۔اور آنسوؤں کی آمیزش لیے لبوں پر اچانک سے ابھرتی زندگی سے بھرپور مسکان۔

''ماں کی بددعا میں بھی بہت اثر ہوتا ہے۔ہے نا!بلکہ سب سے زیادہ اثر ہی اسی 'بددعا' میں ہوتا ہے؟''ان کی تسبیح سمیٹتی انگلیاں کپکپانے لگیں۔''اگر کوئی ماں اپنی اولاد سے نفرت کرتے کرتے مر جائے۔تو کیا ماں کی نفرت بھی مر جاتی ہے؟''

''کبھی کبھی آپ کو ایسے جرم کی سزا ملتی ہے جو آپ سے سرزد نہیں ہوتا۔ایسی سزا کو جھیلنے کا حوصلہ انسان کہاں سے لائے؟''

بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے وہ نیم تاریکی میں کھڑکیوں سے باہر کہیں دیکھنے لگیں۔باہر لان لائٹس کی روشنیاں سوئمنگ پول کی سطح پر چمک رہی تھیں۔

''آپ جاگ گئیں۔''

اقصیٰ برابر میں ہی کرسی پر بیٹھی تھی۔اٹھ کر ان کی طرف متوجہ ہوئی۔لہجے میں تشویش نمایاں تھی۔آنکھوں میں فکر ٹھہری تھی۔مسز شیرازی کی طبیعت گزشتہ کئی دنوں سے خراب تھی۔میڈیسن لینے کے باوجود وہ ٹھیک سے سو نہیں پاتی تھیں۔آج پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ایک بار پھر خلا میں کہیں دیکھتے کھو سی گئی تھیں۔

''فارس آ گیا ہے؟''چند لمحوں کے بعد انہوں نے پوچھا۔

''نہیں۔''

مسز شیرازی کا دل بھاری ہوا۔ایک بے نام سی اذیت رگ رگ میں اتر گئی۔خشک لبوں کو تر کرتے ہوئے انہوں نے آنکھیں موند لیں۔

وہ صحیح معنوں میں اب سونا چاہتی تھیں مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔اور سکون تو جیسے اس سے بھی دور۔ایک بے کل سا احساس ان کی آنکھیں نم کر گیا۔وہ چہرے کا رخ بدل گئیں۔

اقصیٰ پریشانی سے انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

اس کے بال پیشانی پر بے ترتیبی سے بکھرے تھے،ٹائی کی ناٹ ڈھیلی تھی۔ویسٹ کوٹ کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔بارش کی نمی کہیں کہیں کندھوں پر، بالوں پر ٹھہری تھی۔نڈھال قدم اٹھاتے ہوئے اس نے شرٹ کے اوپری بٹن بھی کھول دیے تھے۔رخ سیڑھیوں کی طرف تھا۔

جنت کو گھر چھوڑے پوری سات راتیں آج تمام ہونے والی تھیں اور ابھی تک اس کا سراغ نہیں مل سکا تھا۔وہ اپنی خالہ کے گھر نہیں گئی تھی۔اس نے اپنے خاندان کے کسی فرد سے رابطہ نہیں کیا تھا۔اس کی کوئی ایسی دوست نہ تھی جس کے پاس وہ جا سکتی۔کوئی رشتہ دار جس کے یہاں پناہ لے سکتی۔وہ اسے اپنے تئیں ہر جگہ تلاش کر چکا تھا۔مگر وہ نہیں تھی۔وہ کہیں بھی نہیں تھی۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو گزشتہ کئی راتوں کی طرح اس رات بھی اس نے لائٹس آن نہیں کیں۔اپنے آس پاس،اپنے چاروں طرف اسے اندھیرا درکار تھا۔مگر اندھیرا بھی جیسے روشنی ہونے لگا تھا۔وہ اس پر سب عیاں کرنے لگا تھا۔

جنت کمال کی جو چیز جہاں رکھی تھی وہیں موجود تھی۔اس کا کمبل،تکیہ، لیپ ٹاپ، چارم بریسلٹ جسے وہ سونے سے پہلے اتار کر ٹیبل پر رکھ دیا کرتی تھی۔

واش روم میں اس کی ہیئر پنز، رنگ برنگے کیچر، ہیئر کلپس ہر جگہ بکھرے پڑے تھے۔ڈریسنگ ٹیبل پر کاسمیٹک کی چند اشیاء دھری تھیں۔اس کمرے میں اس کی نشانی جیسے ہر جگہ تھی۔

پہلے وہ تھی۔تو زندگی سے خفا نظریں کہیں ٹھہرتی نہیں تھیں۔اور اب جب وہ نہیں تھی۔تو وہ اسے اپنی ہر ایک چیز میں بار بار نظر آ رہی تھی۔

ایک بار پھر وہ اس کا موبائل اٹھا چکا تھا۔ایک بار پھر وہ ان تصاویر کو دیکھ رہا تھا جو آٹھ دن پہلے اسے رات کے بارہ بجے کسی غیر معروف نمبر سے ارسال کی گئی تھیں۔چند میسجز جنہیں پڑھا نہیں گیا تھا، کچھ کالز جو مس کر دی گئی تھیں۔

اس نے موبائل رکھ دیا۔اب وہ وارڈ روب کھولے کھڑا تھا۔ایک ایک کر کے ہر شے نکالتا کارپٹ پر ڈھیر کیے جا رہا

تھا۔لندن کی ٹکٹس، پاسپورٹ۔سفری بیگ۔پیکنگ کے لیے منتخب کی جانے والی ضروری اشیاء۔اور جیسا وہ اس سے کہہ کر گیا تھا۔وہ اس کا سامان پیک کر چکی تھی۔اور اس کے لیے اس نے یقیناً مسز شیرازی کی مدد لی تھی۔تب ہی اس کے وہی کپڑے بیگ میں رکھے گئے تھے جو وہ اکثر بیرون ملک دورے پر لے جاتا تھا۔

وارڈ روب کے نچلے خانے میں ہینڈ بیگز کے ساتھ ہی جیولری باکس رکھے تھے،حق مہر کا چیک بھی موجود تھا،قیمتی تحائف بھی محفوظ رکھے تھے۔

جنت کمال اپنے ساتھ کچھ بھی لے کر نہیں گئی تھی۔قبر میں اترتی کسی لاش کی طرح۔وہ اپنا سب کچھ پیچھے چھوڑ کر گئی تھی۔

وہ کپڑوں کو ادھر ادھر کرتا،اس کی چیزوں کو نکال نکال کر کچھ تلاشتا عجیب سی کیفیت سے دوچار لگ رہا تھا۔

اوپری خانے میں رکھا ایک سیاہ بیگ کھینچنے پر اس کے برابر میں پڑا لکڑی کا باکس اس کے قدموں میں گرتے ہی کھل گیا تھا۔چند خطوط، کچھ تصاویر اور اشیاء اس کے قدموں میں بکھر گئی تھیں۔

وہ بے اختیار رک گیا تھا۔

باکس کے ایک کونے پر حرف ”F“ کی کیلی گرافی تھی۔آپس میں ٹکراتی دو تلواروں کا نشان واضح تھا۔آگ پکڑتی ایک تصویر دھندلی تھی تو دوسری تصور کی دیوار پر واضح ہو رہی تھی۔

اس نے بے ساختہ قدم اٹھایا۔کانچ کا ٹکڑا پیر کے تلوے میں کہیں چبھا۔

”اتنی سی چوٹ لگنے سے کوئی نہیں مرتا۔“

”میں تو مر جاتی ہوں۔“

وہ ٹھہر گیا۔رک گیا۔جم گیا۔

جلتی ہوئی لکڑیوں میں ایک اور صفحے کا اضافہ ہوا۔ساکت پانیوں میں کنکر پھینکا گیا۔پتے توڑ کر فضا میں اچھال دیے گئے۔

آن کی آن میں براؤن لکڑی کا فرش آئینہ ہوا۔ایک ہی دراڑ سے جنم لیتی بے شمار دراڑیں اسے ہزار ہا حصوں میں منقسم کر گئیں۔وہ پنجوں کے بل جھکا تو اسے لگا وہ اب کبھی اٹھ نہیں پائے گا۔سانس لینا چاہے گا تو اسے سانس نہیں آئے گا۔

کیا کوئی اتنا بے خبر ہو سکتا ہے جتنا کہ وہ تھا؟ کوئی اتنا سفاک بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ وہ خود اپنے لیے تھا؟ یہ کیسی بے حسی تھی جو اپنی ذات سے مربوط (جڑی) تھی؟ یہ کیسی خود غرضی تھی جو اذیت مشروط تھی؟

وہ سفر طویل دشوار تھا جسے طے کر کے وہ یہاں تک پہنچا تھا۔اس حد تک سنبھلا تھا۔اس حد تک بدل گیا تھا۔یہ اس کا وہم۔یہ اس کا خیال تھا۔ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وہ اپنے آپ سے بے خبر رہا تھا۔ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وہ خود کو سمجھ نہیں سکا تھا۔پر کھ

نہیں سکا تھا۔

وقت گزر گیا تھا۔ زندگی بدل گئی تھی۔ مگر اس کے اندر کی حکایتیں۔ آج بھی اس کے لیے۔

کچھ مبہم۔

کچھ ادھوری۔

اور بے نام ہی رہی تھیں۔

☆☆☆

شیرازی مینشن کے وسیع و عریض لاؤنج میں موت بھری خاموشی چھائی تھی۔ موجودہ نفوس پر سکتہ طاری تھا۔ نہ ساعت میں یقین اترتا تھا نہ آنکھوں سے ایقان جھلکتا تھا۔ حالانکہ ہارون شیرازی ایک مجسم حقیقت کے ساتھ ان کے سامنے ہی تو کھڑا تھا۔ اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے۔ پشیمانی کا اظہار کرتے اور سر جھکا کر معافی کی درخواست کرتے اس نے ایک لمحے کے لیے بھی جمیلہ داؤد کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ دیکھ لیتا تو پتھر ہو جاتا۔ پتھر ہوتا تو کچھ کہہ نہ پاتا۔ جبکہ اسے بہت کچھ کہنا تھا۔

''میرا وارث۔ میرا خون۔ صرف حماد ہے ہارون! یہ تمہاری عیاشیوں کا نتیجہ۔ ایک آوارہ اور بدچلن عورت کے بطن سے جنم لینے والا، اسے ابھی اور اسی وقت لے جاؤ یہاں سے۔''

خاموشی اعظم شیرازی نے توڑی تھی۔ اور کسی بپھرے ہوئے شیر کی طرح چنگھاڑتے ہوئے توڑی تھی۔ ان کی بلند آواز سے بچے پر ہیبت طاری ہوئی تھی۔ ان کے سخت پتھریلے تاثرات سے وہ بہت خائف ہوا تھا۔

''آرزو نے طلاق لے لی ہے، یہ اب میرے ساتھ ہی رہے گا۔'' جھکے سر کے ساتھ نظریں چرا کر کہا گیا۔

جمیلہ داؤد نے ڈگمگاتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اس کی اذیت بڑھ گئی۔ آن کی آن میں محبت، وفا اور قربانیوں کا تماشا بنا تھا۔ وہ پاش پاش ہو گئی تھی۔

''تمہیں اندازہ بھی ہے، تم اس وقت کیا کہہ رہے ہو؟'' اعظم شیرازی انتہائی غصے کے عالم میں پھنکارے تھے۔ ''جمیلہ کے خاندان کو تمہاری دوسری شادی کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ تمہارا کیا حشر کریں گے، کچھ اندازہ بھی ہے تمہیں؟''

جمیلہ داؤد کے ذکر پر ہارون شیرازی نے اب کے سر اٹھا کر اسے ہی دیکھا تھا۔ بس ایک لمحے کے لیے۔ پھر اس نے نظریں ہٹا لیں۔

''بابا۔''

''میرے صبر کا مزید امتحان مت لو۔'' اعظم شیرازی نے انگلی اٹھا کر اسے روکا۔ ''ابھی اور اسی وقت اسے یہاں سے لے

جاؤ۔'' آرزو کے بیٹے کے لیے ان کی آنکھوں میں نفرت تھی۔ بے زاریت تھی۔ غصہ تھا۔ سرد مہری تھی۔۔

''بیٹا ہے یہ میرا......''

''میرا اور تمہارا وارث صرف حماد ہے، میں اس طوائف کے بچے کو مزید ایک لمحے کے لیے بھی اس گھر میں برداشت نہیں کر سکتا۔'' حکم سنا کر وہ اسی لمحے اٹھ کر چلے گئے تھے۔

شیرازی مینشن کے وسیع و عریض لاؤنج میں ہارون اپنے بچے کے ہمراہ تنہا کھڑا رہ گیا۔ وہ صدمے سے گنگ تھا۔ کچھ حیران اور بے یقین بھی۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اعظم شیرازی اس کے بچے کو قبولنے سے انکار کر دیں گے۔

جمیلہ کی آنکھوں میں اب حیرت نہ تھی۔ صدمہ بھی نہ تھا۔ اس نے جیسے اذیت کے عالم میں یقین کی تمام منازل طے کر لی تھیں۔ ہارون اپنی دوسری بیوی کے بچے کے ساتھ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ خواب تھا۔ نہ خدشہ۔ نہ خیال۔ یہ ایک حقیقت تھی۔ تلخ حقیقت۔ جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔

محبت و احترام سے جڑے شادی شدہ زندگی کے آٹھ سال ایک دھوکا تھے، دکھاوا تھے، فریب تھے۔ در پردہ ہارون پچھلے آٹھ سالوں سے اپنی اسی محبت کے ساتھ تعلق میں رہا تھا جس سے اعظم شیرازی نے اس کی شادی نہیں ہونے دی تھی۔

وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔

ہارون اب بھی نیچے تھا۔ وہ ایک بار پھر اپنے باپ کی اسٹڈی کے سامنے کھڑا تھا۔ ان کی منت کر رہا تھا۔ ان سے معافی مانگ رہا تھا۔ مگر اعظم شیرازی کسی بھی صورت ''آرزو جہانگیر'' کے بچے کو قبولنے کے لیے تیار نہ تھے۔

یہ سچویشن ایک جنگ کی سی تھی۔ جیسے ملک کی نامور کاروباری ہستیوں کے درمیان جو معاہدہ طے تھا اس کے ٹوٹنے کا خطرہ ہو۔ جیسے اپنی کمزوری کسی دوسرے فریق کو تھما دینے کا خدشہ۔

''وہ میرا بیٹا ہے بابا! میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' اگلے دن وہ پھر ان سے کہہ رہا تھا۔

اعظم شیرازی اپنے شان دار بیڈ روم کی دیوار گیر کھڑکیوں کے سامنے پشت پر ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ ان کے جبڑے بھینچے ہوئے تھے۔ قہر برساتی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ وہ۔ ملک کے ایک نامور بزنس ٹائیکون تھے۔ اپنے انداز اور شخصیت میں کسی حاکم جیسا رعب رکھتے تھے۔ اصول و روایات کے پابند، کچھ مغرور اور متکبر جو اپنے اعلا حسب و نسب اور تعلیمی قابلیت پر فخر کرتے تھے۔ انہیں یہ بچہ کسی صورت قبول نہ تھا۔

''آرزو کے پاس چھوڑ آؤ اسے۔''

''وہ اسے اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتی۔''

''یہ میرا دردِ سر نہیں۔''

''بابا پلیز!'' وہ گڑگڑایا۔ ''یہ بھی آپ کا پوتا ہے۔''

''میرا پوتا صرف حماد ہے، جس کی ماں خاندانی ہے۔'' وہ پلٹ کر دھاڑے تھے۔ ''یہ اس آوارہ اور......''

ہارون شیرازی کرب سے لب بھینچ کر رہ گیا۔

''آپ اسے میرے ساتھ رہنے دیں۔''

''وہ یہاں رہے گا تو سب کو معلوم ہو جائے گا۔'' اصل مسئلہ جیسے اب لبوں پر آیا تھا۔ وہ بچہ ان کے لیے ذلت، توہین اور بے عزتی کی علامت تھا۔ وہ ان کے لیے ایک غلطی۔ ایک گناہ جیسا تھا۔ جسے چھپانا مقصود، مٹانا ضروری ہو گیا تھا۔

''بابا۔ پلیز، مجھے معاف کر دیں۔ میں مانتا ہوں یہ میری غلطی ہے۔ آپ جو بھی سزا دیں میں بھگتنے کے لیے تیار ہوں، اس طرح مت کیجیے۔''

کمرے میں یک دم ہی گہری خاموشی چھا گئی۔ اعظم شیرازی سخت پتھریلی نگاہوں سے اب ہارون کو دیکھ رہے تھے۔

جمیلہ داؤد ادھ کھلے دروازے کے اس پار رک گئی تھی۔

''ایک شرط پر میں تمہاری اس غلطی کو نظر انداز کر سکتا ہوں۔'' لہجے میں وہی عناد اور سختی تھی۔

جمیلہ نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اب وہ کیا کہہ رہے تھے؟

''اسے میرے حوالے کر دو اور بھول جاؤ کہ حماد کے علاوہ تمہارا اور کوئی بیٹا بھی ہے۔''

ہارون کے پیروں تلے سے زمین نکلی تھی۔ سر پر آسمان ٹوٹا تھا۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے وہ اپنے باپ کو دیکھ کر رہ گیا۔ صدمے کے عالم میں جمیلہ داؤد بھی اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔

اعظم شیرازی کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ان کی بات تو جیسے اب شروع ہوئی تھی۔

''اسے تمہارا نام نہیں ملے گا، وراثت میں حصہ بھی نہیں اور نہ ہی وہ ہمارے خاندان کا کبھی حصہ بنے گا۔''

انداز دو ٹوک تھا۔ لہجہ قطعیت بھرا۔ فیصلہ غیر متزلزل۔ ہر لفظ پتھر پر لکیر۔

ہارون شیرازی کے چہرے پر وحشت پھیل گئی۔ ہر شے کا حساب رکھا تھا اس نے مگر اس کا نہیں۔

''وہ اسی نام اور پہچان کے ساتھ رہے گا جو میں اسے دوں گا۔ کیئر ٹیکر کا انتظام ہو جائے گا، پڑھائی کے اخراجات۔ سب میں مینج کروں گا لیکن تمہیں ہر صورت، ہر حال میں اس سے دور رہنا ہو گا۔'' انگلی اٹھا کر ایک بار پھر اپنے ارادے واضح کیے گئے۔

''کیونکہ نہ تو میں اس بدنام زمانہ لڑکی کے ساتھ تمہارا کوئی اسکینڈل افورڈ کر سکتا ہوں اور نہ ہی جمیلہ کے خاندان سے دشمنی مول لے

سکتا ہوں۔''

ہارون شیرازی کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں انتہائی سرد مہری سے دیکھتے ہوئے انہوں نے حتمی فیصلہ سنایا تھا۔

''اور اگر تمہیں میرے اس فیصلے سے اختلاف ہے تو تم اسے یہاں سے لے جا سکتے ہو، لیکن یاد رکھو، جس وقت تم اس گھر کی دہلیز پار کرو گے، میں بھول جاؤں گا میرا ہارون نام کا کوئی بیٹا بھی ہے۔''

ہارون شیرازی کا سانس رکا ہوا تھا۔ دھڑکنیں تھمی ہوئی تھیں۔ وہ اب بھی اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا۔ حیرت، بے یقینی اور صدمے سے۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔

کوئی اپنے پوتے کے ساتھ ایسا بھی کر سکتا ہے؟ وہ سوچ رہا تھا۔ مگر وہ غلط سوچ رہا تھا۔ اعظم شیرازی نے سرے سے اس بچے کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ وہ اس کے لیے رحم دل ہوتے بھی تو کیسے؟ احساس کرتے بھی تو کیوں؟ وہ تو اپنے کپڑوں پر ہلکا سا داغ تک نہ برداشت کرتے تھے تو اب ایسے داغ کو کیسے رہنے دیتے جس کی پاداش میں مستقبل میں کوئی اسکینڈل بننے کا خدشہ ہوتا۔

مزید کچھ بھی سنے بغیر جمیلہ داؤد وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ روئی روئی سی سرخ و متورم آنکھوں کے ساتھ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تو دل بے وفائی کے غم سے پھٹنے لگا۔

یہ حقیقت تھی کہ شیرازی اور لاشاری خاندان کے مابین جڑنے والا یہ رشتہ ایک بزنس ڈیل کی طرح تھا۔ خاندان کے بڑوں نے اپنے کاروباری اور سیاسی مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان دونوں کو ایک کیا تھا۔ مگر جمیلہ نے کبھی بھی اس رشتے کو مصلحت کی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہارون سے محبت کرتی تھی۔ بدلے میں وہ بھی اسے محبت ہی دکھاتا رہا تھا۔ مگر وہ محبت ایک دکھاوا تھی اس کا انکشاف کل رات ہوا تھا۔ یہ انکشاف اسے راکھ کر گیا تھا۔ یہ انکشاف اس کی محبت، وفا اور اعتماد کا تماشا بنا گیا تھا۔

سلگتی آنکھوں کو بے دردی سے رگڑتی وہ کھڑکیوں کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔ اور تب ہی اس نے ہارون کو سیڑھیاں اترتے دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب تھا اور آنکھیں بے تحاشہ سرخ ہو رہی تھیں۔

اعظم شیرازی اپنے فیصلے سے پیچھے ہٹنے والے نہیں تھے تو کیا ہارون گھر چھوڑ کر جا رہا ہے؟

بھاری دل کے ساتھ اس نے ہارون شیرازی کو صدر دروازے کی جانب بڑھتے دیکھا۔

''جس وقت تم اس گھر کی دہلیز پار کرو گے، میں بھول جاؤں گا میرا ہارون نام کا کوئی بیٹا بھی ہے۔''

اور وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ خالی ویران آنکھوں سے اسے صدر دروازے سے باہر نکلتا دیکھ رہی تھی۔

ہارون شیرازی نے گھر کی دہلیز پار کر لی تھی۔ وہ اپنے بچے کو ساتھ لے کر نہیں گیا تھا۔

☆☆☆

اعظم شیرازی ہارون کو لندن بھیج کر اپنے روزمرہ معمولات میں ایسے مصروف ہو گئے تھے جیسے چند روز قبل کچھ نہیں ہوا تھا۔ جیسے ان کی زندگیوں میں آرزو جہانگیر کا گزر ہوا تھا نہ اس کے بچے کی آمد ہوئی تھی۔ جیسے ہارون شیرازی سے کوئی غلطی، کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا تھا۔

جمیلہ داؤد بھی ایسے ہی کرنا چاہتی تھی۔ بے حس ہونا چاہتی تھی۔ بے پروا رہنا چاہتی تھی۔ مگر وہ ایسا کر نہیں پا رہی تھی۔ اس کے زخم مندمل نہیں ہو رہے تھے۔ اسے سکون مل نہیں رہا تھا۔

شیرازی مینشن اور سرونٹ کوارٹرز کے مابین راہداری میں جو پہلا کمرہ تھا اور جو کسی حد تک شیرازی ہاؤس سے بھی منسلک تھا وہ کمرہ اب اس بچے کا تھا۔ مدحت ہیڈ سرونٹ آغا علی کی بیٹی تھی جو اب اس کی کیئر ٹیکر بھی تھی۔ جس نے چوبیس گھنٹے نہ صرف اس کے ساتھ رہنا تھا بلکہ اعظم شیرازی کے قائم کردہ اصولوں کی پاس داری بھی کرنی تھی۔

آرزو جہانگیر کے اس بیٹے کو اعظم شیرازی کے عالی شان بنگلے میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ وہ گھر کے مکینوں کے ساتھ میز پر بیٹھ کر کھانا نہیں کھا سکتا تھا...... وہ فنکشن، گیدرنگ اور خاندانی پارٹیز میں شرکت نہیں کر سکتا تھا۔ باہر سے آنے والے مہمان، دوست احباب اور رشتہ داروں کے سامنے نہیں جا سکتا تھا۔ یہ سارے اصول و قوانین اعظم شیرازی نے بنائے تھے اور ایسا ممکن ہی نہ تھا کہ وہ کوئی حکم جاری کریں اور ان کی سلطنت میں اس کا نفاذ نہ ہو۔

لیکن ان تمام اصول و قوانین سے جمیلہ کی اذیت کم نہیں ہوئی تھی۔ وحشت و بے سکونی کی دلدل اسے ہر بار ''آرزو جہانگیر'' کے بچے تک پہنچا دیتی تھی۔ وہ عورت ہارون کی زندگی میں اب کہیں نہیں تھی۔ مگر اس کا بچہ تھا۔ شیرازی مینشن میں نہ ہوتے ہوئے بھی وہ تھا۔ وہ ہے۔ وہ رہے گا۔ اس حقیقت کو وہ جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ یہی حقیقت سرد پڑتی آگ بھڑکاتی تھی۔ رگ و پے میں محشر سا بپا کرتی تھی۔ پچھلی کئی راتوں کی طرح اس رات بھی وہ ٹھیک سے سو نہیں پا رہی تھی۔

اک درد تھا۔ کرب تھا۔ بے وفائی کا احساس۔ بے حسی کا تدارک۔ ایک الجھن۔ ایک وحشت۔

سر جھٹک کر، خیالات کو بھٹکا کر، واہموں کو جھٹلا کر وہ نیچے آ گئی تھی۔

کچن میں فریج کھول کر اس نے دودھ نکالا تھا۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ اپنے لیے چائے بنانا چاہ رہی تھی۔

چھوٹی سوئی بارہ کے ہندسے پر آ کر ٹھہری تو یکا یک کچن کی دائیں طرف سرونٹ کوارٹرز کی طرف جاتی راہداری سے آواز بلند ہوئی تھی۔

کھولتے پانی میں پتی ڈالتے ہوئے وہ یک دم چونکی تھی۔ پھر چولہا بند کر کے وہ اسی وقت کچن سے راہداری میں آ گئی تھی۔

لائٹس آف تھیں۔ فانوس جل رہے تھے۔ نیلگوں روشنی کا مدھم تاثر چہار سو پھیلا تھا۔

اس نے ہیڈ سرونٹ آغا علی کی بیٹی مدحت کو دیکھا۔

وہ متفکر سی کمروں کے دروازے کھول کھول کر جیسے فکرمندی کے عالم میں کسی کو ڈھونڈ رہی تھی۔

''یہ شور کیسا تھا؟''

کندھے سے پھسلتے دوپٹے کو واپس جماتے ہوئے بوکھلاہٹ کا شکار مدحت نے اپنی مالکن کو دیکھا۔

''وہ۔ جی......'' اس کی ہوائیاں اڑ گئی تھیں۔

''تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''وہ...... میں......'' مدحت بوکھلا گئی۔ سمجھ میں نہ آیا کیا جواب دے۔ اور تب ہی اسٹور روم سے کھٹ پٹ کی آواز آئی تھی۔

جمیلہ نے بے ساختہ ہی سر اٹھا کر سی طرف دیکھا تھا۔ لائٹس آف تھیں۔ دروازہ کھلا ہوا۔ اندر کوئی تھا۔ یقیناً کوئی تھا۔

مگر مدحت کی زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ جانے وہ اعظم شیرازی سے خائف تھی یا پھر اسے بتانے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔

اب کے جمیلہ نے اس سے پوچھنے کے بجائے اسٹور روم کا رخ کیا تھا۔ ادھ کھلے دروازے کو اندر کی جانب دھکیل کر اس نے لائٹ آن کر دی۔ زرکار روشنی چہار سو پھیلی۔

بے شمار کارٹنز، فرنیچر کا سامان، غیر ضروری اشیاء۔

اس نے بے ساختہ قدم اٹھائے تھے۔ مدحت اس کے پیچھے تھی۔ وہ اب کچھ کہہ رہی تھی۔ کچھ بتا رہی تھی۔ معافی بھی مانگ رہی تھی۔ پریشان بھی ہو رہی تھی۔

یہ اس کی غلطی تھی کہ وہ ''سرونٹ کوارٹر'' سے یہاں آ گیا تھا۔ یہ اس کی بے توجہی تھی کہ گھر کے مکینوں کے سامنے آ گیا تھا۔

وہ یہاں تھا۔ مگر سامنے نہیں تھا۔ وہ اسٹور روم میں فرنیچر کے سامان میں ہی کہیں چھپ گیا تھا۔

لیکن اس کی سسکیوں اور ہچکیوں کی آواز۔ لب بھینچے جمیلہ داؤد اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔

مدحت تیزی سے آگے بڑھی تھی۔ وہ اب اسے آوازیں دیتی ہال نما اسٹور روم میں اسے تلاش کر رہی تھی۔

اس نے گم ہو جانے کے لیے ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں مدحت نہیں پہنچ سکتی تھی۔ دیوار رخ کھڑی الماری کے اندر نچلے خانے میں جانے وہ کیسے گھس گیا تھا۔ مگر یہ طے تھا کسی مرد کی مدد کے بغیر مدحت نہ تو الماری کو ہلا سکتی تھی اور نہ ہی اسے نکال سکتی تھی۔

پریشان اور حواس باختہ سی وہ ایک بار پھر جمیلہ سے معذرت کرنے لگی۔

''میں ابھی ابا کو بلا لاتی ہوں، اسے لے جاؤں گی، دوبارہ کبھی ایسا نہیں ہوگا'' تیز تیز قدم اٹھاتی وہ وہاں سے چلی گئی تھی مگر جمیلہ داؤد اپنی جگہ سے ایک انچ نہ ہل سکی تھی۔

دھیمی دھیمی سسکیوں کی آواز بہت واضح تھی۔

اس کے قدم بے ساختہ اٹھے تھے۔ وہ گھوم کر دیوار کی طرف آ کر رک گئی تھی۔ اور اب کانچ کے ان ٹکڑوں کو دیکھ رہی تھی جو دیوار کے پاس ہی ٹوٹے بکھرے پڑے تھے۔ اسے یاد آیا، نچلے خانے کے تمام شیشے توڑ پھوڑ کا شکار ہوئے تھے۔

پنجوں کے بل بیٹھتے ہوئے اس نے اندر جھانکا تھا۔

تھر تھر کانپتا وجود، لرزتے ہونٹ، آنسوؤں سے بھری ہوئی سرخ و متورم آنکھیں۔ وہ ساڑھے پانچ سال کا بچہ خوف زدہ اور متوحش سا اپنے آپ میں سمٹ کر بیٹھا تھا۔

جمیلہ کا سانس رکا۔ دھڑکنیں تھمیں۔ اس ایک لمحے میں اسے کچھ ہوا اور اس نے بے ساختہ ہی درز سے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اسے باہر نکالنے کے لیے۔

بے شمار اجنبی چہروں میں ایک اور چہرے کا اضافہ ہوا تو بچے نے روتے ہوئے اس کی پہنچ سے بھی دور ہونا چاہا۔ اسے اپنا باپ چاہیے تھا۔ ماں چاہیے تھی۔ وہ اب بھی روتے ہوئے۔ چیختے ہوئے آوازیں دیے جا رہا تھا۔

جمیلہ کا ہاتھ پتھر ہوا۔ دل کانپ کر رہ گیا۔ اس سے بچے کی حالت بالکل دیکھی نہ گئی۔

مدحت آغا علی کو لیے حاضر ہوئی تو اپنی مالکن کو وہیں بیٹھا دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اعظم شیرازی کا سخت حکم تھا کہ وہ گھر کے مکینوں کے سامنے کبھی نہ آئے۔ غلطی سے بھی نہیں۔

ہیڈ سرونٹ آغا علی نے پورا زور لگا کر اتنی جگہ ضرور بنالی تھی کہ اسے باہر نکالا جا سکتا تھا۔ مگر اس کی فلک شگاف چیخیں۔ اور پہنچ سے دور ہو جانے کی دیوانہ وار جستجو۔

اس سے پہلے کہ آغا علی آگے بڑھتا، اس سے پہلے کہ مدحت ہی اسے نکالنے کی سعی کرتی، جمیلہ داؤد نے۔ ایک ہی جست میں۔ اسے بازو سے پکڑ کر، اس کی تمام تر مزاحمت اور چیخ و پکار کے باوجود باہر نکال لیا تھا۔

اگلے ہی لمحے وہ اس کی بانہوں میں تھا۔

وہ رو رہا تھا۔ وہ تڑپ رہا تھا۔ وہ اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر وہ اسے چھوڑ نہیں رہی تھی۔ اس کا حصار مضبوط تھا۔ مضبوط ہی رہا تھا۔

اپنی گرفت ہر لحاظ سے پختہ کیے وہ اسے سینے سے لگا چکی تھی۔

اگلے چند لمحوں میں بچے کی ہر مزاحمت دم توڑ گئی۔ روتے کرلاتے ہوئے وہ بے دم ہو گیا۔ جیسے اس میں مزید ہمت نہ رہی ہو۔ جیسے وہ تھک گیا ہو۔ ہار گیا ہو۔ مر گیا ہو۔ اسے سینے سے لگائے جمیلہ داؤد اپنی جگہ سن بیٹھی رہ گئی تھی۔

کپکپاتا ننھا وجود۔ اور اس کا شدت سے دھڑکتا دل جیسے ابھی سینہ چیر کر باہر آ جائے گا۔

''یہ زخم......'' مدحت نے گھبرا کر اس کی سرخ پڑتی آستین اوپر کی تھی۔ غالباً الماری کے اندر جگہ بناتے وقت اس کا بازو کیل سے رگڑا گیا تھا تب ہی جلد ادھڑ گئی تھی۔

''ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے'' کافی دیر بعد جمیلہ کچھ کہنے کے قابل ہوئی تھی۔ پھر وہ اسے بانہوں میں لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ مدحت بھی اس کے ساتھ تھی۔ کچھ حیران۔ کچھ پریشان اور خائف بھی۔

شیرازی مینشن سے ہاسپٹل کافی دوری پر تھا۔ تب ہی جمیلہ داؤد کے حکم پر ڈرائیور نے گاڑی کا رخ ڈاکٹر مصطفیٰ کے کلینک کی طرف موڑ دیا تھا جو ان کے فیملی ڈاکٹر بھی تھے۔ وہ ڈیوٹی پر موجود تھے۔ فیملی تعلقات کے باعث فارس کو بھی انہوں نے اٹینڈ کیا تھا۔ گھنٹے بعد ہی اسے اندر آنے کی اجازت ملی تھی۔

زخم پر تین اسٹیچز لگے تھے، ڈرپ، خواب آور انجکشن کے بعد وہ پرسکون نیند سو رہا تھا۔

''پریشان مت ہو، ہی از اسٹیبل ناؤ'' وہ اس سے کہہ رہے تھے۔ قدرے فاصلے سے ہی وہ بت بنی اسے دیکھ رہی تھی۔ آنکھیں نم تھیں اور ہاتھ دوپٹے سے الجھ رہے تھے۔

لحاف اچھی طرح سے اڑھا کر جب نرس جا چکی تو ڈاکٹر مصطفیٰ اس کے پاس آ گئے۔

جمیلہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ اس کے معلم تھے۔ مہربان استاد۔ ایک بہترین ناصح۔

''آپ ٹھیک ہیں بیٹا؟''

''انسان ان سوالات کا کیا کرے جو نیند اڑا دیں۔ بے قراری میں بہا دیں۔ جن کا کوئی جواب ہو، نہ منطق۔ نہ دلیل۔ جیسے جنگ۔ بے چینی۔ بے سکونی۔ بس درد۔ اذیت۔ کرب۔'' اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار وہ اپنی کیفیت کو سمجھنے میں ناکام ہو رہی تھی۔

''سوال ''ضمیر'' اٹھاتا ہے۔ جواب ''ایمان'' دلاتا ہے۔'' وہ کہہ رہے تھے۔

''ایمان بتلا رہا ہے، میں بھٹک رہی ہوں'' اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

''ایمان بتلا رہا ہے، تم اب صحیح راستے پر ہو'' بہت نرمی اور متانت سے کہہ کر وہ چلے گئے تھے۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی

انہوں نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ اس کے معاملات کی گہرائی میں اترنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ صرف سنتے تھے اور جواب دے دیا کرتے تھے۔

اس نے ہمت کر کے اپنا رخ بدلا۔ ایک بار پھر پرسکون نیند سوتے اس بچے کو دیکھا جس کی وجہ سے وہ گزشتہ کئی راتوں سے سو نہیں پا رہی تھی۔

زرکار روشنی میں اس کا چہرہ واضح تھا۔ وہ اپنی ماں کی شکل تھا۔ ہو بہو اس کی کاپی۔ بس اس کے بال ہی ہارون شیرازی کی طرح سیدھے تھے۔ قدرے لمبے۔ پیشانی پر بکھرے۔ گردن کو چھوتے ہوئے۔

رنگت دودھیائی تھی۔ اور آنکھیں۔

جمیلہ نے سرخ و متورم سی بند آنکھوں کو دیکھا۔ پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ سرخ گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں ٹھہری تھیں۔ ایسے جیسے وہ روتے روتے یکا یک پرسکون ہو گیا ہو۔ اور ایسی ہی ایک سکون بھری کیفیت جمیلہ داؤد نے بھی اپنے اندر محسوس کی تھی۔

☆☆☆

''پریشانی کی اب کوئی بات نہیں ہے۔ ہی از آل فائن ناؤ! یہ کچھ میڈیسنز ہیں جو میں لکھ کر دے رہا ہوں، اسے دیجیے۔ اور اس کے کھانے پینے کا بہت خیال رکھیں۔''

اگلے دن چیک اپ کے بعد ڈاکٹر مصطفیٰ جمیلہ سے کہہ رہے تھے اور جمیلہ اسے ہی دیکھ رہی تھی جو ابھی تک اپنی نیند کے اثر سے مکمل طور پر باہر نہیں آیا تھا۔

مدحت اس کے لیے کھیر بنا کر لائی تھی۔ جمیلہ کے اشارے پر ہی اس نے تیزی سے پیالے میں نکالی۔ جب تک اس نے بہت احتیاط سے بچے کو اٹھا کر بٹھایا، تب تک وہ پیالہ آگے کر چکی تھی۔ ایک بازو سے اسے اپنے حصار میں لیے دوسرے ہاتھ سے چمچ بھر کر وہ اس کے لبوں کے قریب لائی تو اس نے انکار نہیں کیا۔ بہت آرام سے پہلا چمچ لے لیا۔

وہ سوتی جاگتی کیفیت میں تھا۔ ہوش میں تھا بھی اور نہیں بھی۔ لیکن وہ کوئی بھی مزاحمت نہیں کر رہا تھا۔

مدحت حیران تھی۔ نہ وہ رویا تھا۔ نہ چیخا تھا۔ نہ اس نے کوئی واویلا کیا تھا نہ بھاگنے کی کوشش۔ حالانکہ خود اسے ایک چمچ کے لیے کتنی کوشش کرنا پڑتی تھی۔

بہت آرام اور تسلی سے جمیلہ نے اسے کھیر کھلائی تھی۔ نیم گرم دودھ بھی پلایا تھا پھر میڈیسن بھی دی تھی جو مدحت کلینک کی فارمیسی سے لے آئی تھی۔ اس دوران وہ مکمل طور پر پرسکون رہا تھا۔ یقیناً وہ انجکشن کے زیر اثر ہی تھا۔ یا پھر وہ تھک چکا تھا اور اب کوئی بھی مزاحمت نہیں کرنا چاہتا تھا۔

دس بجے اسے ڈسچارج کر دیا گیا اور وہ اسے گھر لے آئے تھے۔

اس کے بعد وہ دوپہر میں اسے دیکھنے آئی تھی تب وہ سو رہا تھا۔ پھر شام میں جب وہ گئی تھی تو وہ کھڑکی کی چوکھٹ پر کہنیاں ٹکائے شیشے کے ساتھ گال مس کیے باہر ان روشنیوں کو دیکھ رہا تھا جو وسیع و عریض سبزہ زار پر جگہ جگہ جل رہی تھیں۔

اعظم شیرازی کے یہاں آج کچھ سیاسی نامور شخصیات کی دعوت تھی۔ کھانے کا انتظام باہر لان میں کیا گیا تھا۔

''اب کیسا ہے؟'' اس نے مدھم آواز میں مدحت سے پوچھا تھا۔

''پہلے سے بہت بہتر ہے جی! آج اس نے مجھے بالکل بھی تنگ نہیں کیا۔'' مدحت نے خوش گوار حیرت کے ساتھ آگاہی دی تھی مگر جمیلہ کو اس آگاہی نے عجیب سی وحشت میں مبتلا کر دیا۔

جب تک امید تھی۔ تب تک مزاحمت تھی۔

جب امید ٹوٹی۔ تو مزاحمت بھی دم توڑ گئی۔

وہ کچھ دیر تک دروازے میں کھڑی رہی تھی۔ پھر وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔ بازو کھڑکی کی چوکھٹ پر ٹکائے اسے دیکھنے لگی۔ کچھ محبت۔ کچھ انسیت۔ کچھ ترحم سے۔ بچے نے اس کی موجودگی کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔

جمیلہ ان آنکھوں کو دیکھنے لگی جن میں تین بہترین رنگوں کی آمیزش تھی۔ سبز، ہلکا براؤن اور سنہرا رنگ! یہ آنکھیں آرزو جہانگیر کی آنکھیں تھیں۔

اگلے کئی لمحوں تک ایک خاموشی سی حائل رہی۔ بچہ ابھی بھی اسے مکمل نظر انداز کیے ہوئے تھے۔

''ہیلو۔'' مجبوراً اسے ہی مخاطب کرنا پڑا، بچے نے ذرا سی نظریں اٹھا کر جمیلہ کو دیکھا۔ مگر جواب نہیں دیا۔

''میرا نام جمیلہ ہے اور تمہارا نام؟'' یہ تعارفی مرحلہ تھا۔ اسے کچھ مشکل لگا۔ وہ ان بچوں میں سے یقیناً نہیں تھا جو با آسانی گھل مل جائیں ورنہ وہ مدحت کو اتنا ٹف ٹائم کیوں دیتا؟

دم سادھے وہ خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ لب باہم پیوست رہے۔

''لیٹ می گیس! کہیں تمہارا نام شہریار تو نہیں؟ ارسلان!'' ایک لمحے کو رک کر کچھ سوچا۔ ''یا پھر......''

''فارس ہارون شیرازی۔'' اپنے نام سے متعلق وہ یقیناً بہت پکّا تھا۔ فارس تھا تو پھر فارس ہی تھا۔ ہارون کا بیٹا۔ شیرازی خاندان کا سپوت۔ اور کوئی نام۔ اور کوئی مقام۔ اور کوئی پہچان اسے قبول نہ تھی۔

کیا اعظم شیرازی اس کی پہچان کی طرح اب اس کی یادداشت سے اس کا مکمل نام بھی ہٹا پائیں گے؟

''نام تو بہت پیارا ہے آپ کا! ویسے فارس کا مطلب کیا ہے؟'' نرمی سے اپنی کم علمی کا اعتراف کرتی وہ ذرا سا آگے جھکی تھی۔

گھنے سیاہ بالوں کی کچھ لٹیں اس کے چہرے پر بکھریں۔سونے کی چوڑیاں بھی کھنک اٹھیں۔

وہ لب بھینچے اس کی آنکھوں میں اجنبی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

''مجھے سوچنے دو، شاید مجھے یاد آجائے۔''ایک لمحے کا توقف کیا، پھر یوں ظاہر کیا جیسے اسے اچانک یاد آگیا ہو۔

''فارس کا مطلب ہے شہ سوار۔ آ ہارس رائڈر۔ وہ جو گھوڑے پر بیٹھتا ہے اور تلوار پکڑ کر فائٹ بھی کرتا ہے۔''

نہ تو وہ گھوڑے پر بیٹھتا تھا۔نہ تلوار پکڑ کر فائٹ کرتا تھا۔اس نے چہرے کا رخ موڑا اور ایک بار پھر باہر دیکھنے لگا۔

جمیلہ داؤد چند لمحوں تک اسے دیکھتی رہی۔پھر اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔''یہاں آؤ۔''

اس نے ایک بار پھر جمیلہ کو دیکھا تھا۔اب کے ذرا سی خفگی سے۔یقیناً جمیلہ کی مداخلت اسے پسند نہیں آرہی تھی۔

''میرے پاس آؤ۔''

مگر وہ نہیں آیا تھا۔

''پاپا کے پاس جانا ہے؟''

اس کے چہرے کے تاثرات یکا یک بدلے۔آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔لب بھینچ گئے۔

''آؤ۔''اب کے جمیلہ نے ہاتھ بڑھا کر اپنی طرف بلایا تو وہ فوراً ہی اٹھ گیا۔پکڑ کر اپنے قریب کیا تو اس کی بانہوں میں سما گیا۔اور پھر وہ رونے لگا۔

جمیلہ کی دھڑکنیں تھم گئیں۔اپنے سینے سے لگائے اس کی پشت سہلاتے ہوئے وہ خود بھی عجیب سی کیفیت سے دوچار ہو گئی۔

فارس کو اپنا باپ، اپنی ماں چاہیے تھی۔وہ ان کے لیے تڑپ رہا تھا۔

کچھ سوچ کر وہ اسی وقت فارس کو ساتھ لیے شیرازی مینشن میں آگئی۔اسٹڈی روم میں صوفے پر بیٹھ کر اس نے ہارون کا نمبر ملانے کے بعد ریسیور فارس کے کان کے ساتھ لگا دیا۔کچھ ہی دیر میں کال ریسیو کر لی گئی تھی۔

''ہیلو۔''باپ کی آواز سماعت سے ٹکراتے ہی اس کی آنکھیں بھر گئیں۔''ہیلو پاپا۔''

دوسری طرف سے ایک دم سناٹا چھا گیا......موت بھرا، وحشت بھرا سناٹا۔اگلے ہی لمحے کال ڈسکنیکٹ ہو گئی لیکن فارس بات کر رہا تھا۔وہ اپنے باپ کو آوازیں دیے جا رہا تھا۔

اس نے بے اختیار ریسیور لے کر کریڈل پر رکھ دیا۔

''اسے لے جاؤ مدحت!''

اور خود وہ اسی وقت اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی تھی۔اسے سنبھلنے میں کچھ وقت لگا پھر اس نے ہارون شیرازی کو فون کیا۔

''آپ نے اپنے بیٹے سے بات کیوں نہیں کی؟''لہجہ درشت تھا۔اس کا بس نہیں چل رہا تھا ہارون اس کے سامنے ہو اور وہ اسے جھنجھوڑ کر ہلا دے......لرزا دے۔

''تم بابا کے فیصلے کو بھول گئی ہو؟''

وہ تھم کر رہ گئی۔یہ کیسا جواب تھا جو اس نے دیا تھا؟ یہ کیسا عذر تھا جو اس نے پیش کیا تھا؟ وہ ہارون میں فارس کا ''باپ'' ڈھونڈ رہی تھی اور بدلے میں اسے کیا ملا تھا؟ اعظم شیرازی کا بیٹا!

''آپ کا بیٹا آپ کے ہی گھر میں سرونٹ کوارٹر میں رہ رہا ہے ہارون۔''

اور ہارون نے فون بند کر دیا۔ریسیور ہاتھ میں لیے وہ اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔

''کل تم فارس کو یہاں لائی تھیں؟''اگلے دن اعظم کی عدالت میں اس کی پیشی ہو گئی تھی......وہ انتہائی غصے میں تھے مگر تحمل سے پوچھ رہے تھے۔

''جی۔''

''کس لیے؟''

''میں ہارون سے اس کی بات کروانا چاہتی تھی۔''

اعظم شیرازی نے مٹھیاں بھینچ کر خود پر قابو پا لیا تھا۔

''تو کیا بات کی اس نے؟''

''نہیں۔''

ان کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے ہو گئے۔لبوں پر جاندار مسکراہٹ پھیل گئی۔

''میں جانتا تھا، وہ یہی کرے گا۔''

جمیلہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔وہ بہت مطمئن اور پرسکون دکھائی دے رہے تھے۔

''ویسے تم فارس کے معاملے میں اتنی دلچسپی کیوں لینے لگی ہو؟ حالانکہ اس کے ساتھ نہ تمہارا کوئی رشتہ ہے نا کوئی تعلق۔''

''آپ کو اس پر رحم نہیں آتا؟''اس نے الٹا سوال کر لیا۔

''رحم؟''وہ استہزائیہ انداز میں ہنسے۔''مجھے نہیں لگتا اس کے ساتھ کوئی ظلم ہو رہا ہے۔وہ اچھا کھاتا ہے، اچھا پہنتا ہے۔اب شہر کے بہترین اسکول میں بھی جائے گا۔ورنہ تم سوچو میں اس کے ساتھ کیا نہیں کر سکتا تھا۔''

''اس سے بڑھ کر اور بڑا ظلم کیا ہو گا کہ آپ نے اپنے پوتے سے۔اس کی شناخت اور پہچان چھین لی ہے، باپ سے بھی دور

کر دیا ہے۔"

"ہمارے خاندان کی نسلیں خاندانی شریف عورتوں سے چلتی ہیں جمیلہ!"

اعظم شیرازی کی آنکھوں میں غیض وغضب کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ "میں نے ہارون کی دوسری شادی کو تسلیم کیا ہے نہ اس بدچلن عورت کو اپنی بہو مانا ہے......"

کاٹ دار لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے سخت پتھریلی نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

"اب تم جا سکتی ہو۔" انہوں نے دروازے کی طرف اشارہ کر دیا۔ "آئندہ میں نہ سنوں کہ تم اس نیچ عورت کے بچے کو اس گھر میں لائی ہو، یہ نہ ہو کہ میں کوئی سخت قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاؤں۔"

اس نے سر اٹھا کر اعظم شیرازی کو دیکھا۔ وہ دھمکی نہیں دے رہے تھے، اپنے ارادوں سے آگاہ کر رہے تھے۔ جو کہتے تھے، اسے کر دکھانے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے۔

مزید کچھ بھی کہے بنا وہ بھاری دل کے ساتھ مڑ گئی تھی۔

کوئی فرق نہیں تھا اس کے اپنے باپ بھائیوں میں اور سسر اور شوہر میں، سب ہی ایک سے تھے۔ طاقت کے نشے میں چور، دولت کے گھمنڈ میں جابر اور متکبر۔

☆☆☆

اعظم شیرازی کی تنبیہ کے باوجود وہ اگلے دن خود جا کر فارس کے لیے بے شمار کھلونے اور کپڑے خرید لائی تھی۔ نئے فرنیچر کے ساتھ اس نے پورے کمرے کو بھی اپنی نگرانی میں سیٹ کروایا تھا۔ اس دوران وہ سامنے کونے میں کھڑا ٹکر ٹکر اسے دیکھتا رہا تھا۔

کھلونوں کا ایک ڈھیر تھا جو اس کے سامنے رکھا تھا۔ نئے کپڑے۔ اسکول بیگ۔ کلرنگ بکس، اسٹوری بکس۔ بے شمار پنسلیں، کلرز۔ ایک رائٹنگ ٹیبل جسے اسٹیکرز سے جمیلہ خود ہی سجانے میں لگی ہوئی تھی۔

کمرے میں حقیقی رنگ تو بکھر ہی گئے تھے مگر اس کی آنکھوں میں زندگی کا کوئی رنگ ابھی بھی نہیں ابھرا تھا۔ وہ اب بھی کھنچا کھنچا سا۔ اجنبی نگاہوں سے کبھی جمیلہ اور کبھی ملازموں کو تکتا الماری کے ساتھ کونے میں ہی سمٹ کر بیٹھا رہا تھا۔ اجنبی چہرے اسے وحشت میں مبتلا کرتے تھے۔ ان جانا سا خوف بڑھتا تھا تو اس کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا تھا۔

"کھانا لگا دوں جی؟" مدحت نے جمیلہ سے مدد چاہی تھی۔ چھوٹے سے ریکس میں کتابیں سیٹ کرتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

اس دن فارس نے دوسری بار اس کے ہاتھ سے بہت سکون اور تسلی سے کھانا کھایا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ کئی بار سر اٹھا کر

اسے دیکھ چکا تھا۔ جمیلہ مسکرا دیتی مگر اس کے چہرے پر مسکراہٹ کا کوئی ایک رنگ بھی نہ کھلتا۔

اگلے دن وہ اس کے اسکول بھی گئی۔ پرنسپل کے ساتھ ساتھ کلاس ٹیچر سے بھی ملی۔ کلاس روم کا بھی جائزہ لیا۔ پھر اس نے فارس کی حالت کے پیش نظر اس کے لیے جگہ کا انتخاب خود کیا۔ اتنے سارے بچوں میں اس نے ایک گپلو اور بہت زیادہ باتونی بچے کو اس کے برابر بٹھایا۔ وہ فرینڈلی قسم کا تھا۔ لمحوں میں دوست بنا کر باتیں کرنے لگتا تھا۔ کھڑے کھڑے اس نے جمیلہ سے بھی دوستی کر لی تھی اور چاکلیٹ لے کر ہی ٹلا تھا۔

"یور ممی از سو پریٹی!" چاکلیٹ کا ریپر اتارتے ہوئے اس نے فارس کو بتایا تھا۔ جواب جمیلہ کو دیکھ رہا تھا۔

جانے سے پہلے ہاتھ ہلا کر وہ ایک بار پھر مسکرائی تھی۔ شاید اب وہ بھی مسکرائے۔ شاید اب کے وہ اپنے احساسات کا اظہار کرے۔ مگر فارس کے لب باہم پیوست ہی رہے تھے۔ چہرہ ہر تاثر سے عاری تھا۔

مسکرانا، ہنسنا، باتیں کرنا تو وہ جیسے بھول ہی گیا تھا۔ کچھ وقت درکار تھا اسے سب کچھ نئے سرے سے، نئے انداز میں اور نئے لوگوں سے سیکھنے کے لیے۔

☆☆☆

باپ اور بیٹے کی اس جنگ میں نقصان فارس کا ہو رہا تھا۔ چھ سال کا وہ بچہ ان چند ہفتوں میں کملا کر رہ گیا تھا۔ نفسیاتی طور پر اتنا ڈسٹرب تھا کہ اس نے بولنا بھی بند کر دیا تھا۔ کھانا وہ بمشکل کھاتا تھا اور اسکول میں بھی کوئی خاطر خواہ کارکردگی نہیں دکھا رہا تھا۔

تھک ہار کر جمیلہ نے آرزو جہانگیر کو ڈھونڈا تھا۔ بہت مشکلوں سے ملی تھی وہ۔ بہت صعوبتوں سے ملاقات ہو پائی تھی۔

"میں شادی کر رہی ہوں۔"

فارس سے متعلق ساری بات سن لینے کے بعد آرزو جہانگیر نے کہا بھی تو بس یہی۔

کوئی فکر۔ پریشانی۔ اندیشہ۔ ایسا کوئی بھی تو تاثر نہیں تھا اس کے چہرے پر۔ جمیلہ کو دکھ ہوا۔ کیا وہ "ماں" تھی۔ کیا وہ واقعی میں "فارس" کی ماں تھی؟

گھنگھریالے سنہرے بالوں کو کیچر میں جکڑے۔ جینز پر مونگیا رنگ کی اسٹائلش شرٹ میں ملبوس وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے، ہیل میں مقید داہنے پیر کو جنبش دیتی بہت مطمئن اور پرسکون بیٹھی لائم جوس سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

"میں تم سے تمہارے بیٹے کی بات کر رہی ہوں۔" اس نے کہا۔

"کیا وہ صرف وہ میرا بیٹا ہے۔" اپنی دودھیائی کہنیاں میز پر ٹکائے وہ کچھ آگے ہوئی تھی۔

"ویسے تم کیوں میرے بیٹے کے غم میں اتنا ہلکان ہو رہی ہو؟ تمہارے بیٹے کی جگہ نہ لے لے اس لیے؟"

''پہلے مسٹر شیرازی تمہارے بیٹے کو قبول تو کر لیں۔'' انتہائی برودت سے جمیلہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

''اوہ کم آن۔'' وہ ہنس دی۔ ''سب جانتا ہے وہ بلڈی اولڈ مین!'' غصے اور حقارت سے اعظم شیرازی کا نام لیتے ہوئے اس نے پھر جمیلہ کو دیکھا۔ ''میں تمہاری ان باتوں پر یقین کرنے والی نہیں ہوں۔ اور اگر یہ حقیقت ہے بھی، تب بھی یہ میرا درد سر نہیں ہے۔ ہارون نے سپریشن کے وقت اسے اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ سو پلیز اگر کوئی بات تمہیں کرنا بھی ہے تو ڈائریکٹ ہارون سے کرو! مجھے اس سب میں مت گھسیٹو!''

اپنا ہینڈ بیگ شولڈر پر ڈالتے ہوئے وہ جانے کے لیے اٹھ گئی تھی۔ اور جمیلہ کتنی ہی دیر تک اپنی جگہ بیٹھی رہی تھی۔

پہلے ہارون کے رویے نے اسے مخمصے میں ڈالا تھا۔ اب آرزو جہانگیر کا رویہ اسے ورطہ حیرت میں ڈال رہا تھا۔ اس کا خیال تھا فارس کے بارے میں جاننے کے بعد آرزو اسے یہاں سے لے جائے گی مگر وہ تو جیسے جمیلہ پر اپنا موقف واضح کرنے آئی تھی۔

آرزو سے ملاقات کے بعد اگلے کئی دنوں تک اس کا ذہن الجھا رہا۔

ایک دو بار اس نے اعظم شیرازی کا دل فارس کے لیے نرم کرنے کی کوشش بھی کی مگر ہر بار وہ نام سن کر ہی یوں بھڑک اٹھتے جیسے جمیلہ نے ان کے پوتے کا نہیں کسی دشمن کا نام لے لیا ہو۔ دوسری طرف ہارون یوں خاموش ہو جاتا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

اور تب ہی اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔

اگر وہ شیرازی مینشن میں نہیں بھی رہتا، تب بھی وہ اتنا بھی دور نہیں کہ جمیلہ کی محبت، توجہ اور اپنائیت سے محروم رہ سکے۔ مسئلہ ان باپ بیٹے کے درمیان ہے۔ اس کے اور فارس کے درمیان تو نہیں۔ سارے وعدے، قاعدے ہارون سے جڑے ہیں۔ اس کے ساتھ تو ہرگز نہیں۔

☆☆☆

مدحت اس کی کیئر ٹیکر تھی۔ مگر جمیلہ داود ''کیئر'' سے آگے کا سوچتی تھی۔ محبت۔ اور تربیت۔

''فارس کو اپنی ڈیوٹی نہیں، اپنی ذمہ داری سمجھ کر ٹریٹ کیا کرو مدحت! میں جانتی ہوں بابا تمہیں تمہارے کام کی سیلری دیتے ہیں۔ مگر کچھ کام ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہمیں خلوص دل سے اجر کی نیت سے کرنا چاہئیں۔''

مدحت کچھ حیرت سے اپنی مالکن کو دیکھنے لگی۔ جمیلہ، فارس وجدان کا شیڈول ترتیب دے رہی تھی۔ وہ اسکول لنچ میں کیا لے کر جائے گا، دوپہر میں کیا کھائے گا۔ شام میں وہ کیا لے گا۔ یہ سارے معاملات اب وہ خود طے کر رہی تھی۔

''کھانا میں گھر سے ہی دوں گی! جو کچھ حماد کے لیے بناؤں گی اس کا ایک حصہ فارس کے لیے بھی ہو گا۔''

''مگر بڑے صاحب۔''

جمیلہ نے سر اٹھا کر تنبیہی نگاہوں سے مدحت کو دیکھا۔ وہ مؤدب ہو کر سر جھکا گئی۔

''کیا شیرازی مینشن سے سرونٹ کوارٹرز میں پہلے کھانا نہیں جاتا؟''

''جاتا ہے جی۔'' مدحت کا سر جھکا رہا۔

''ضروری نہیں تم ہر خبر اپنے ابا کو دیا کرو، جانتی تو ہو وہ ہر بات تمہارے بڑے صاحب تک پہنچا دیتے ہیں، راز رکھنا سیکھو۔ ہر بات بتانے والی نہیں ہوتی۔''

''جی! بہت بہتر۔'' مدحت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اس سے پیار اور نرمی سے بات کیا کرو، سختی سے مت پکڑا کرو مدحت!''

''جی!۔''

بہت سی تنبیہات اور نصیحتوں کے ساتھ اس نے باقاعدگی سے مدحت کو ٹرینڈ کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ خود بھی اب فارس کو وقت دینے لگی تھی۔

''میں نہیں چاہتی، وہ زندگی گزارے، میں چاہتی ہوں وہ زندگی جیے۔'' وہ اکثر مدحت سے کہتی۔

وسیع وعریض رقبے پر پھیلے سرسبز لان پر وہ ہر شام اس کی انگلی تھام کر چلتی جاتی۔ چلتی جاتی۔ اور وہاں جا کر رک جاتی جہاں اعظم شیرازی کے گھوڑوں کا اصطبل تھا۔ اعلانسل کے عربی گھوڑوں کو دیکھتے ہوئے فارس کی آنکھوں میں ہر بار تعجب اور اشتیاق سا ابھرتا۔ ہر بار وہ انہیں ایسے دیکھتا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کا یہ رنگ جمیلہ کو بھلا لگتا۔ وہ مسکرا دیتی۔ وہ اس کی مسکراہٹ کو دیکھتا۔ پھر اطراف میں دیکھتے ہوئے۔ بے دھیانی میں ہی جمیلہ کی انگلی پر اپنی گرفت مضبوط کر لیتا۔ اور جمیلہ کو اس کی اس حرکت پر ٹوٹ کر پیار آتا۔

ایک رات جب وہ فارس کو کمرے تک چھوڑ کر گھر آئی تھی تو اعظم شیرازی لاؤنج میں اس کے انتظار میں ٹہل رہے تھے۔ پچھلے ایک ماہ سے جمیلہ کیا کر رہی تھی انہیں سب معلوم تھا۔ اسے فارس کے معاملات سے باز رکھنے کی اپنی سی کوشش کر کے بھی وہ دیکھ چکے تھے مگر اب جیسے ان کی برداشت ختم ہو رہی تھی۔

''میں اگر اسے اڑان کے لیے پر دے رہا ہوں تو مناسب وقت پر لینے کا پورے اختیار بھی رکھتا ہوں، میں جس وقت اسے حدود وقیود سے نکلتا دیکھوں گا اسے واپس اس کی اوقات میں لے آؤں گا، مگر جو تم کر رہی ہو جمیلہ! اس پر تم بہت پچھتاؤ گی۔''

''جو کام اجر کی نیت سے کیا جائے اس پر پچھتاوے نہیں ملا کرتے۔''

''تو تم اجر کما رہی ہو؟'' اعظم شیرازی کا لہجہ استہزائیہ ہوا۔

''ایک ماں ہونے کا حق ادا کر رہی ہوں بابا۔''

''مجھے حیرت ہے یہ تم کہہ رہی ہو۔''

''سوتیلی ہوں۔ بے رحم نہیں ہوں۔''

اعظم شیرازی آنکھوں میں غضب لیے کھڑے رہے۔

''ویسے بھی یہاں سب فارس کو آپ کے ایک جاں نثار ملازم کے یتیم بیٹے کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ آپ بھی یہی سمجھ لیں کہ میں ایک یتیم بچے کے سر پر ہاتھ رکھے ہوئے ہوں۔''

صدر دروازے سے اندر داخل ہوتا ہارون اپنی جگہ منجمد ہوا تھا۔

''یتیم......'' اس کا سانس رکا تھا۔ ''یتیم......'' اس کی دھڑکن تھمی تھی۔

اعظم شیرازی اگلے کئی لمحوں تک سخت نگاہوں سے جمیلہ کو دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے ہنکارا بھرا۔

''حماد اگلے ہفتے واپس آ رہا ہے، میں نہیں چاہتا تم اسے اس سب میں انوالو کرو۔''

''آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟'' اس نے اچنبھے سے انہیں دیکھا۔

''فارس میرے ملازم کا بیٹا ہے، حماد کے علم میں بھی یہی بات آنی چاہیے۔'' انہوں نے انتہائی ٹھنڈے لہجے میں بھاری گمبھیر آواز میں کسی حاکم کی طرح حکم سنایا تھا۔ آنکھوں کا تاثر بتاتا تھا کہ اب کے جمیلہ نے اپنی من مانی کی تو نتائج اچھے نہ ہوں گے۔

''ایٹ لیسٹ آپ نے یہ تو مانا کہ حماد کا فارس کے ساتھ کوئی رشتہ ہے جسے چھپانے کی ضرورت ہے۔''

اعظم شیرازی مٹھیاں بھینچ کر رہ گئے۔ جمیلہ مزید کچھ بھی کہے بنا وہاں سے چلی گئی تھی۔

ہارون کمرے میں آیا تو وہ وارڈروب کھولے کھڑی تھی۔

گھڑی اور کف لنکس اتار کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے جمیلہ کو دیکھا۔ نائٹ گاؤن ہاتھ میں پکڑے وہ سیاہ آنکھوں میں غصہ لیے اس کی طرف مڑ گئی تھی۔

''یتیم بچوں کو صبر آ جاتا ہے کہ وہ جانتے ہیں ان کے ماں باپ قبروں میں ہیں، اگر جو وہ زندہ ہوتے تو ان کی حالت ایسی نہ ہوتی! لیکن جن بچوں کو معلوم ہو ان کے ماں باپ زندہ ہیں اور تب بھی ان کی یہ حالت ہے۔ ذرا سوچیں انہیں صبر کیسے آتا ہوگا؟''

''بس کر دو جمیلہ۔''

''میں بس کر دوں؟'' وہ ہارون پر چلا اٹھی۔ ''آپ بس کیوں نہیں کرتے؟''

''بابا کا فیصلہ۔''

''بھاڑ میں گیا ان کا فیصلہ۔'' وہ ضبط کھو بیٹھی تھی۔

ہارون شیرازی نے آج سے قبل اسے اتنے شدید غصے میں نہیں دیکھا تھا۔

''اپنے آپ کو میرے سامنے مظلوم اور بے بس بنا کر پیش مت کریں ہارون! ظالم کی معاونت کرنے والا بھی ظالم ہوتا ہے۔''

ہارون کرب کے عالم میں جمیلہ کو دیکھ کر رہ گیا۔

''میں یہ سب فارس کے لیے ہی کر رہا ہوں۔''

''غلط۔ آپ صرف اپنے لیے کر رہے ہیں۔'' انگلی اٹھا کر اس نے کہا۔ ''صرف اور صرف اپنے لیے۔ ورنہ کوئی بھی باپ اس طرح اپنی اولاد کا سودا نہیں کرتا۔''

''تم سمجھ کیوں نہیں رہیں جمیلہ!''

''میں نہیں سمجھ رہی؟ آپ اپنے بیٹے کی کیفیت سمجھ رہے ہیں؟ وہ کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہے کہ چند دنوں میں کسی اور کی گود میں رہے گا تو ماں باپ کا لمس بھول جائے گا۔ اسے آپ یاد ہیں۔ اسے آرزو یاد ہے۔ اور یہ 'یاد' اس کے لیے کتنی بڑی اذیت بنتے جا رہی ہے کچھ اندازہ ہے آپ کو؟''

ہارون کرب کے عالم میں لب بھینچ گیا۔ ''تم یقین کرو یا نہ کرو۔ لیکن میں یہ سب فارس کے بھلے کے لیے کر رہا ہوں۔''

''اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں ہارون! کہیں ایسا نہ ہو یہ بھلائی آپ کے بیٹے کو بربادی کی طرف دھکیل دے۔''

پاؤں پٹختے ہوئے وہ واش روم میں چلی گئی۔ دروازہ اس نے قدرے زور سے بند کیا تھا۔

ہارون شیرازی بے بسی سے اپنی جگہ کھڑا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

اسکول سے واپسی پر سبزہ زار پر قدم اٹھاتے ہوئے وہ سرونٹ کوارٹر کی طرف جا رہا تھا جب اسے ڈرائیو وے پر بیرونی گیٹ کے عین سامنے ایک گاڑی رکتی ہوئی نظر آئی تھی۔

سیاہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس ہارون شیرازی اپنے دوستوں کے ہمراہ گاڑی سے نکل رہا تھا۔

فارس اپنی جگہ رک گیا۔ اس نے پورے تین ماہ بعد اپنے باپ کو دیکھا تھا۔ کتنی خوش نصیبی کی بات تھی کہ اس لمحے وہاں مدحت یا آغا علی نہیں تھے جو اسے ہارون کے پاس جانے سے روک لیتے۔

وہ تقریباً بھاگتے ہوئے آیا تھا اور باپ کے دوستوں کے سامنے ہی اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔

ہارون ایک لمحے کے لیے جامد ہوا تھا......ساکت۔صامت۔اگلے ہی لمحے وہ سنبھل گیا......

''یہ پیارا سا بچہ کون ہے؟'' اس کے دوست کی بیوی نے کچھ اشتیاق سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ہارون کے ہاتھ متحرک ہوئے تھے،اس نے فارس کو خود سے الگ کیا......

''ہمارے ملازم کا بیٹا ہے۔فارس وجدان۔''

اس کے نرم و ملائم بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے آگے بڑھنا چاہا تھا مگر فارس اس کی تمام تر کوشش ناکام بناتے ہوئے ایک بار پھر اس سے لپٹا تھا۔اور عین اسی لمحے مدحت جانے کہاں سے بھاگتی ہوئی آئی تھی۔فارس کی تمام تر مزاحمت اور چیخ پکار کے باوجود وہ اسے اٹھا کر ساتھ لے گئی تھی۔

''یتیم بچہ ہے۔اس گھر کے سب ہی مالکان اس سے بہت پیار کرتے ہیں تو۔اس لیے۔'' آغا علی نے فوراً وضاحت دیتے ہوئے ہارون شیرازی کو اس سچویشن سے نکالنے کی اپنی سی کوشش کی تھی۔دوست ہارون کے اخلاق سے متاثر نظر آتے شیرازی مینشن میں جا چکے تھے اور مدحت اسے کمرے میں واپس لے آئی تھی۔

رو رو کر وہ اپنی حالت ابتر کر چکا تھا۔نہ کچھ کھا رہا تھا،نہ کچھ پی رہا تھا۔ہر کام سکون اور تسلی سے کرنے والا بچہ یکا یک ہذیانی ہو گیا تھا۔دروازہ بند کیے اسے سنبھالنے کی اپنی سی کوشش کرتے مدحت خود بھی رونے بیٹھ گئی۔

وہ اپنے بابا کا بیٹا تھا۔اور بابا اسے کسی ''ملازم'' کا بیٹا کہہ کر گئے تھے۔یہ بات اپنی تمام تر تلخیوں کے ساتھ اسے اس عمر میں سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔وہ ''ہارون'' سے ''وجدان'' کر دیا گیا تھا اس حقیقت کا ادراک بھی اس کی مزاحمت توڑنے کے لیے ناکافی تھا۔

اس دن وہ جمیلہ داؤد کی وجہ سے کچھ حد تک سنبھل گیا تھا مگر اس نے ہارون تک پہنچنے کی کوشش ترک نہیں کی تھی۔ہر بار مدحت اور آغا علی اس کے سامنے آ جاتے تھے۔ہر بار کوئی نہ کوئی اس کی دیوار بن جایا کرتا تھا۔

وہ کچھ بڑا ہوا تو پابندیوں کے ساتھ تلخ حقیقتوں کا ادراک اسے بہت اچھے سے ہونے لگا۔رویے بہتر انداز میں سمجھ میں آئے تو وہ جان گیا مدحت اور آغا علی کبھی بھی اس کی دیوار نہیں تھے۔دیوار تو سرے سے تھی ہی نہیں۔فقط ایک دروازہ تھا۔اور یہ دروازہ اس کا باپ اپنی مرضی و منشا سے اس پر بند کر چکا تھا۔

☆☆☆

مدحت کی بہن جانے کہاں سے بلی لائی تھی اور چونکہ اس کی فارس کے ساتھ اچھی خاصی دوستی ہو چکی تھی تو وہ بانہوں میں بھرے تقریباً بھاگتی ہوئی اس کے پاس آ گئی تھی۔کچھ دیر تک وہ دونوں ہی بلی کے ساتھ کھیلتے رہے تھے۔اس کے بعد جب وہ

کمرے میں واپس آیا تھا تو اس کی طبیعت اچانک ہی بگڑ گئی تھی۔نم آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ناک بہنے لگی،چھینکیں،کھانسی کے ساتھ ساتھ اس کا سانس بھی بھاری ہونے لگا۔اس کے بازو،سینے اور گردن کے پچھلے حصے پر سرخ ریشز بھی ابھر آئے تھے۔مدحت نے دیکھا تو بری طرح سے گھبرا گئی،جمیلہ اس روز گھر پر موجود تھی،اسے ہاسپٹل بھی وہی لے کر گئی تھی۔

''ہی از الرجک ٹو کیٹس۔'' ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد آگاہی دی تھی۔

اگلے کئی لمحوں تک وہ ڈاکٹر کے ساتھ اس کی کنڈیشن ڈسکس کرتی رہی تھی اور وہ کچھ احتیاطی تدابیر سے متعلق جانکاری دیتے رہے۔

شام کے سات بجے جب وہ گھر آئی تو اسے سر کی آمد کی اطلاع پہنچا دی گئی۔مدحت،فارس کو ساتھ لیے سرونٹ کوارٹر چلی گئی تھی اور اس نے لاؤنج کا رخ کیا تھا۔وہ خود کو سوال جواب کے لیے تیار کر کے ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔

''مجھے یاد نہیں پڑتا،میں نے فارس کی ذمہ داری تمہیں سونپی ہو۔'' وہ فارس کے معاملات میں جمیلہ کی جا بجا مداخلت سے تنگ آ چکے تھے۔

''اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی،ایمرجنسی میں لے جانا پڑا۔''

''یہ کام مدحت اور آغا علی بھی کر سکتے تھے۔''

''میں فارغ تھی،سوچا میں ہی کر دوں۔ویسے آپ پوچھیں گے نہیں اس کی طبیعت کیوں خراب ہوئی؟۔''

''آئم ناٹ انٹرسٹڈ۔''

''یو شڈ بی انٹرسٹڈ!اسے بھی آپ کی طرح بلیوں سے الرجی ہے۔'' اپنی بات کے اختتام پر وہ مڑ گئی تھی..سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے ایک مرتبہ بھی اعظم شیرازی کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

☆☆☆

وہ باغ میں مصنوعی آبشار کا نظارا کر کے عقبی دروازے سے شیرازی مینشن کے احاطے میں داخل ہوا تھا تو نگاہ گھوڑے پر سواری کرتے حماد شیرازی پر ٹھہر گئی۔برجیز میں ملبوس وہ اپنے انسٹرکٹر کے ہمراہ تھا۔

حماد شیرازی۔اس کا بڑا بھائی......ایک خاندانی،عزت دار خاندان سے تعلق رکھنے والی عورت کا بیٹا......جمیلہ کا بیٹا!

اپنے ننھیال کی بدولت،ماں کے مضبوط بیگ گراؤنڈ اور دونوں خاندانوں کے بیچ ہونے والی بزنس ڈیلز کی وجہ سے وہ ایک ''ٹرافی چائلڈ'' تھا......

پرکشش،ذہین اور پھر اس گھر میں وہ اپنے دادا کا لاڈلا تھا......ماں کا چہیتا......اور باپ کے لیے تو وہ ویسے بھی اہم تھا......

فارس کی زندگی اسکول سے فقط اس کمرے تک ہی محدود تھی اور حماد تو اس عمر میں دنیا گھوم رہا تھا......وہ اپنے باپ کے سائے میں پل بڑھ رہا تھا.. نہ اس نے کوئی محرومی دیکھی تھی......نہ اپنوں کی جدائی سہی تھی......دونوں کا تو کسی صورت کوئی موازنہ نہ تھا......

اعظم شیرازی کی صحبت کا اثر تھا کہ حماد نے ان کے جیسی شخصیت اور مغرورانہ انداز اپنا رکھا تھا۔ گھر بھر کا لاڈلا تھا تو انداز اور طور طریقے بھی ایسے ہی تھے جیسے وہ کسی مملکت کا شہزادہ ہو۔ آج اس کا برتھ ڈے تھا اور اسی مناسبت سے شیرازی مینشن کو ڈیکوریٹ کیا جا رہا تھا۔ اس کی ہر خوشی اور کامیابی کو ہمیشہ ایسے ہی شاندار انداز میں سیلبریٹ کیا جاتا تھا۔

اس نے اپنے باپ کو دیکھا۔ ہارون شیرازی جینز پر وائٹ شرٹ میں ملبوس۔ آنکھوں سے گلاسز اتار کر جیب میں اٹکاتے ہوئے ایونٹ پلانر سے بات کر رہا تھا۔

اس نے بس ایک لمحے کے لیے اسے دیکھا پھر رخ بدل کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

کمرے کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ سماعت سے ہارون شیرازی اور حماد کی آواز ٹکرانے لگی۔

زندگی سے بھرپور قہقہے تھے۔ خوشیاں تھیں۔ اور مسرت کے رنگ جوان کی آنکھوں سے جھلکتے تھے۔

اسے شیرازی مینشن میں رہتے ہوئے ڈیڑھ سال ہونے کو تھا مگر وہ ابھی تک ان رویوں کا عادی نہیں ہو پایا تھا۔ ہمیشہ کی طرح وہ آج بھی بری طرح سے ڈسٹرب ہو گیا تھا۔

کھڑکیاں دروازے بند کر کے وہ اپنے بیڈ میں گھس کر کہانیوں کی کتاب پڑھنے لگا۔ پھر اس نے ڈرائنگ بک نکال لی۔ کچھ دیر تک رنگ بھرتا رہا۔ پھر اس نے اسٹیکرز اٹھا لیے اور اپنی نوٹ بک پر جگہ جگہ لگانے لگا۔ اس سے بھی اکتا کر اس نے نوٹ بک کے تمام صفحے پھاڑ ڈالے۔ انہیں نوچ کھسوٹ کر۔ پرزے پرزے کر کے ڈسٹ بن میں پھینکا اور ایک بار پھر کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

سفید اور نیوی بلیو رنگ کی تھیم میں اسٹیج ڈیکوریٹ کیا جا چکا تھا۔ کرسیاں اور گول میزیں اب ترتیب سے رکھی جا رہی تھیں۔

یکا یک ہی اسے نیلا رنگ بہت برا لگا۔ سفید رنگ سے اسے یک دم نفرت ہوئی۔

اور تب ہی اس کی نظر جمیلہ داؤد پر پڑی۔ وہ انتظامات کا از سر نو جائزہ لے رہی تھی۔ مصروفیت کی بنا پر آج وہ اس سے ملنے نہیں آ سکی تھی۔ اور چونکہ آج چھٹی کا دن تھا تو معمول کے مطابق پچھلے چار گھنٹوں سے اس کا ہی انتظار کر رہا تھا۔

جمیلہ آج نہیں آئے گی۔ وہ جانتا تھا۔ وہ شیرازی ہاؤس میں منعقد کیے جانے والی ہر تقریب میں ایسے ہی نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ باقی سب نظر انداز کر دیں۔ وہ قبول کر لیتا تھا۔ جمیلہ سے وہ نظر انداز ہو جائے تو اس کی جان پر بن جاتی تھی۔

اور چونکہ شیرازی مینشن میں خاندان بھر کے لوگ اکٹھے ہوتے تھے اس لیے ہر فنکشن، گیدرنگ اور تقریب پر فارس کے لیے

ایک ہی اصول ہوتا تھا۔ شام کے پانچ بجے کے بعد اسے کسی طور پر بھی اپنے کمرے سے باہر آنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ اور مدحت اس بات کا خاص خیال رکھتی تھی کہ وہ جلدی سو جائے۔ مگر کیا اسے نیند آ جایا کرتی تھی؟ شاید نہیں، یقیناً نہیں۔

آج بھی ایک پابندی عائد ہو گی۔ آج کی تقریب بھی اس کے لیے ایک سزا کی طرح ہو گی۔

اور پھر جیسے ذہن میں کوئی خیال ابھرا اور وہ بیگ میں ضرورت کی چند اشیاء۔ اسٹوری بکس، ڈرائنگ پیپرز، کلرز اور چاکلیٹ وغیرہ رکھ کر باہر نکل گیا۔

جانے سے پہلے وہ مدحت کے لیے پیغام چھوڑ کر گیا تھا کہ وہ کل تک گھر واپس آ جائے گا۔ لیکن وہ جا کہاں رہا ہے یہ اس نے نہیں بتایا۔

شیرازی مینشن کے عقبی دروازے سے باہر نکل کر باغ میں چلتے ہوئے اس نے صدق دل سے دعا کی کہ آج بارش ہو جائے۔ ایسی موسلا دھار بارش کہ اسٹیج اڑ جائے۔ کرسیاں میزیں ٹوٹ جائیں۔ سفید رنگ ملگجا سا ہو اور آسمانی رنگ پر دھبے پڑ جائیں۔

وہ اب ڈاکٹر مصطفیٰ کی طرف جا رہا تھا۔ مین روڈ پر دو منزلہ مکان سے منسلک ان کا ذاتی کلینک تھا۔ جس کی مخالف سمت روڈ کی دوسری طرف وسیع و عریض رقبے پر پھیلا سبزہ زار، کھیت کھلیان اور باغات تھے۔ شیرازی مینشن ان باغات کے عقب میں بلندی پر واقع تھا۔ فارس باغ کے راستے اکثر اوقات ان کے پاس چلا جایا کرتا تھا۔ کبھی وہ اسے کلینک کے اندر اپنے آفس میں بٹھا کر فارغ اوقات میں باتیں کرتے رہتے اور کبھی اپنے ساتھ گھر لے جاتے۔

اس دن ان کا آف تھا۔ وہ اسے گھر میں ہی ملے تھے۔ اور کچھ حیران ہو کر اسے دیکھ رہے تھے۔

بھنویں سکڑی ہوئیں، تیور بگڑے ہوئے۔ اور چہرے پر سرخی سی پھیلی تھی جیسے وہ خود پر ضبط کیے ہوئے ہو۔

ڈاکٹر مصطفیٰ نے اپنے ننھے مہمان کو اندر آنے کا راستہ دیا۔ اور اس سے قبل کہ وہ خود سے کچھ دریافت کرتے اس نے سر اٹھا کر پوچھا۔

''کین آئی اسٹے ہیئر ٹونائٹ؟'' (کیا میں آج رات آپ کے پاس رک سکتا ہوں؟'')

ڈاکٹر مصطفیٰ نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ پھر اپنے بھورے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گئے۔

''ہاں! کیوں نہیں۔ کیا تمہاری کیئر ٹیکر جانتی ہیں کہ آج تم یہاں رہو گے۔'' ایک لمحے کے لیے اس نے ڈاکٹر مصطفیٰ کو دیکھا۔ اس کے حلق میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی پھر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ڈاکٹر مصطفیٰ مسکرا دیے۔ اس کے نرم ملائم بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اٹھ کر کچن میں چلے گئے۔ وہ بھی اپنا بیگ اتار کر ان کے پاس آ گیا۔

اپنے ساڑھے سات سالہ ننھے مہمان کی خاطر مدارت کرتے ہوئے وہ آج کچھ زیادہ ہی پرجوش اور خوش دکھائی دیے۔

''میری سب سے بڑی بیٹی کے یہاں کل پورے پندرہ برس بعد بیٹا ہوا ہے۔''

پلیٹ سے رول اٹھاتے ہوئے فارس نے انہیں دیکھا۔

''اصل میں وہ ٹوئنز ہیں۔ایک بیٹی ہے۔اور ایک بیٹا!'' وہ مسکراتے ہوئے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے تھے۔''بہت بہادر ہے میری نواسی۔بھائی کو ساتھ ہی لائی ہے۔'' جانے کیا سوچ کر وہ مسکرائے۔پھر انہوں نے تصویر نکال کر اسے دکھائی۔

''اس میں لڑکی کون ہے اور لڑکا کون ہے؟'' ایک جیسے بچوں نے فارس کو الجھا دیا۔دونوں کے کپڑے بھی ایک ہی جیسے سفید رنگ کے تھے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ نے تصویر پکڑ کر دیکھی۔پھر دوبارہ دیکھی۔''اللہ جانے!'' بڑبڑا کر اٹھ گئے۔

اب وہ اس کے لیے فروٹ ٹرائفل بنا رہے تھے۔

فارس نے تصویر اٹھالی۔ننھے منے سے بچے گہری نیند میں تھے۔وہ کافی دیر تک دلچسپی سے انہیں دیکھتا رہا۔غالباً اتنے چھوٹے بچوں کو دیکھنے کا اتفاق اسے پہلی بار ہوا تھا۔

''اپنی ساری نواسیوں کے نام میں نے ہی رکھے ہیں۔اب میری بڑی نواسہ حفصہ چاہ رہی ہے کہ اس کا نام بھی میں ہی رکھوں۔'' انہوں نے ایک لمحے کے لیے رک کر کچن کی کھڑکی سے باہر لان کی کیاریوں میں پھولوں کو دیکھا۔پھر کچھ سوچا۔''وردہ کیسا رہے گا!؟'' اب وہ اپنے مہمان سے پوچھ رہے تھے جو پلیٹ سے دوسرا رول اٹھا رہا تھا۔

''وردہ۔یعنی پھول۔بہار کے موسم میں آئی ہے وہ۔ہے بھی پھولوں جیسی۔'' ایک بار پھر تصویر پکڑ کر وہ اپنی نواسی کو کھوجنے لگے۔''یا پھر کوئی اور نام......''

''میں بتاؤں؟'' اپنا رول کھاتے ہوئے فارس نے کہا۔ڈاکٹر مصطفیٰ اس کے ''بیسٹ فرینڈ'' تھے۔ان کی مشکل آسان کرنا اس کا فرض تھا۔

''ہاں کیوں نہیں۔'' وہ خوش ہوئے۔

''آپ جنت رکھ دیں۔''

ڈاکٹر مصطفیٰ نے چونک کر سر اٹھایا۔''جنت؟''

''مس ہادیہ نے اپنی بیٹی کا نام جنت رکھا ہے۔پیارا نام ہے نا؟'' وہ کہہ رہا تھا۔ڈاکٹر مصطفیٰ اس پر نگاہ جمائے بیٹھے رہ گئے تھے۔ان کی توجہ کسی ایک پھول پر تھی۔مگر فارس انہیں لاعلمی میں کتنی بڑی تصویر دکھا گیا تھا۔

وردہ۔ایک پھول......اور جنت میں تو جیسے ہر طرح کے پھول سما جاتے ہیں۔انہوں نے سوچا۔

''واقعی بہت پیارا نام ہے،بس آج سے میری نواسی کا نام جنت ہے۔'' وہ فارس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے مسکراتے ہوئے اٹھ گئے۔

اس نے فروٹ ٹرائفل کھایا۔ڈاکٹر مصطفیٰ کے ساتھ سبز چائے بھی پی۔لان کے پھولوں کو پانی بھی دیا۔آسٹریلین طوطوں کو چوری بھی کھلائی۔ڈرائنگ بک میں رنگ بھی بھرے اور بارش کی دعا بھی کی۔

اور ٹھیک ایک گھنٹے بعد سہ پہر کے غروب ہوتے سورج پر کالی گھٹا چھا گئی۔ہوائیں تیز ہوئیں تو دور سے مٹی اور دھول اٹھتی ہوئی نظر آئی۔اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف دھند چھا گئی۔بارش کا پہلا قطرہ اس کے گال پر ہی گرا تھا۔اس نے خوش گوار حیرت سے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔پھر ہاتھ پھیلائے سیڑھیاں اتر کر لان میں آ گیا۔

بادلوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ آسمان پر کہیں بجلی چمکی تھی۔وہ رات کی بارشوں سے جتنا خائف ہوتا تھا،دن کی بارشیں اسے اتنا ہی محظوظ کرتی تھیں۔ڈاکٹر مصطفیٰ بھی اس کے ساتھ ہی رم جھم بارش انجوائے کرتے رہے اور جیسے ہی بارش نے زور پکڑا،وہ اسے ساتھ لیے اندر آ گئے۔۔

کافی عرصے بعد انہوں نے فارس کو بے انتہا خوش دیکھا۔جو تصور ہی تصور میں نیلی سفید تھیم سے سجی کرسیوں کو فضا میں ٹوٹتا بکھرتا دیکھ رہا تھا۔

''میں نے اللہ سے دعا کی تھی بارش ہو جائے۔'' اس نے اشتیاق کے عالم میں ڈاکٹر مصطفیٰ کو بتایا تھا۔

''میں نے اللہ سے کہا بہت زور کی آندھی آئے۔'' اس نے ہاتھ بھی پھیلائے۔اچھل کر بھی دکھایا۔پیشانی پر بکھرے بال آنکھوں پر گرے۔ڈاکٹر مصطفیٰ نے اس کی آنکھوں میں عجیب سی خوشی دیکھی۔وہ مسکرائے۔

''تاکہ حماد کے بھی سارے کھلونے ٹوٹ جائیں،اس کی پارٹی بھی خراب ہو جائے۔''

ڈاکٹر مصطفیٰ کی مسکراہٹ یک لخت تھم گئی۔انہیں سکتہ ہوا۔وہ تعجب سے فارس وجدان کو دیکھ کر رہ گئے۔

حماد شیرازی۔بزنس ٹائیکون اعظم شیرازی کا پوتا!

''اچھے بچے کسی کا برا نہیں چاہتے۔'' انہوں نے ٹوکا۔

''میں اچھا ہوں ہی نہیں۔'' فارس نے بڑے آرام سے اعتراف کر لیا۔

وہ اسے دیکھ کر رہ گئے۔

''میں نے برا نہیں چاہا۔میں نے بس یہ کہا کہ بارش ہو جائے اور آندھی بھی آئے۔'' اب کے اس نے ذرا سی خفگی کے ساتھ

عسریسرا۔ حسنیٰ حسین

انہیں وضاحت دی تھی۔

ڈاکٹر مصطفیٰ اپنی مسکراہٹ ضبط کر گئے۔

''تم حماد کو ناپسند کرتے ہو؟'' کچھ سوچ کر انہوں نے پوچھا۔

''وہ مجھ ناپسند کرتا ہے۔''

''تمہیں ایسا کیوں لگا؟''

''جب بھی اس کی ممی میرے پاس آتی ہیں تو اسے برا لگتا ہے، جب بھی وہ میرے لیے کچھ لیتی ہیں تو وہ مائنڈ کرتا ہے۔''

ڈاکٹر مصطفیٰ اس کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھ گئے۔ وہ براہ راست اب فارس کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔

''کچھ دن پہلے وہ میرے کمرے میں آیا تھا اور اس نے میری وہ ساری کاریں توڑ دیں جو بالکل اس کے جیسی تھیں۔ اسے اچھا نہیں لگتا نا کہ اس کی جیسی چیز کسی اور کے پاس ہو'' سر جھکائے اب وہ شرٹ کے کناروں کو چھیڑ رہا تھا۔ ''مجھے بھی اچھا نہیں لگتا کہ میرا سب کچھ کسی اور کے پاس ہو۔ مگر میں تو کچھ نہیں کہتا۔''

ڈاکٹر مصطفیٰ جیسے اپنی جگہ منجمد ہوئے تھے۔

''ہے تو حیرت کی بات! حماد بابو اس طرح کسی ملازم کے بیٹے کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔'' کام والی ماسی وہاں سے گزر رہی تھی، سنتے ہی بول پڑی۔

''میں ملازم کا بیٹا نہیں ہوں۔'' پوری قوت سے وہ اس عورت پر چیخ پڑا تھا۔ جہاں کام والی ماسی سکتے میں آئی تھی تو وہاں ڈاکٹر مصطفیٰ بھی اس کے رویے سے صدمے میں چلے گئے تھے۔

آنکھوں میں، غصہ، نمی، بے بسی لیے وہ اس طوفانی موسم میں گھر چھوڑ کر جانے لگا۔ یہ تو ڈاکٹر مصطفیٰ ہی اسے زبردستی پکڑ کر واپس لائے۔ کام والی ماسی سے معذرت بھی کروائی اور اسے کھانے کے لیے بھی رضامند کیا۔

اور اس کے بعد وہ ایک بار پھر اس کے سامنے بیٹھے تھے۔ وہ شیرازی خاندان کے فیملی ڈاکٹر تھے اور آج سے قبل انہوں نے کبھی بھی ان کے خاندانی معاملات کی جانچ پڑتال نہیں کی تھی اور نہ ہی وہ ایسا کرنا پسند کرتے تھے۔ مگر آج نہ جانے کیوں وہ فارس وجدان کے بارے میں اچنبھے کا شکار ہوئے تھے۔

ڈیڑھ سال پہلے یہ بچہ اچانک سامنے آیا تھا۔ وہ اسے کئی بار اٹینڈ کر چکے تھے۔ کئی بار وہ ان کے کلینک میں ایڈمٹ ہو چکا تھا۔ جمیلہ داؤد اس بچے کا بہت خیال رکھتی تھی وہ یہ بھی جانتے تھے۔ شیرازی مینشن میں ایک بار فارس کی بابت دریافت کرنے پر اعظم شیرازی نے اس کا تعارف اپنے ملازم کے یتیم بیٹے کے طور پر کروایا تھا مگر اب۔

''تم کس کے بیٹے ہو؟'' وہ اب پوچھ رہے تھے۔

''کسی کا بھی نہیں۔'' وہ ہنوز ناراض تھا۔

''ایسا نہیں ہوتا کہ آپ کسی کے بھی بیٹے نہ ہوں۔''

''ایسا ہی ہے کہ میں کسی کا بھی بیٹا نہیں ہوں۔''

ڈاکٹر مصطفیٰ اسے دیکھ کر رہ گئے۔ پھر جیسے انہیں مذاق سوجھا۔ ''یعنی تم سیدھا آسمان سے گرے تھے، درخت پر اگے تھے؟''

اس نے بھنویں سکیڑ کر انہیں گھورا۔ وہ مذاق کے موڈ میں ہرگز نہیں تھا۔

اور تب کسی خیال کے تحت ڈاکٹر مصطفیٰ کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔

''کیا تم واقعی گھر میں سب کو بتا کر آئے ہو؟''

''مجھے نیند آرہی ہے، میں سونا چاہتا ہوں۔'' وہ سر جھکائے اپنے بیگ کی زپ بند کرنے لگا۔

ڈاکٹر مصطفیٰ نے اس کا بیگ گود سے ہٹا کر نیچے رکھا۔ ''جواب دو فارس!''

اس نے جواب نہیں دیا۔ لب بھینچے انہیں دیکھتا رہا۔ بادل گرجے۔ بجلی کڑکی۔ پل بھر کے لیے براق روشنی نے کھڑکیوں سے جھانک کر اسے ڈرایا مگر فارس نے جواب نہیں دیا۔

اور ڈاکٹر مصطفیٰ کو جیسے ان کے ہر سوال کا جواب مل گیا۔

''اس موسم میں تم گھر سے باہر ہو، بخدا اس وقت ان سب پر کیا بیت رہی ہوگی۔''

مگر فارس بتا نہیں سکا کہ اس وقت ان سب پر کچھ بھی نہیں بیت رہی ہوگی۔ کیونکہ وہ سب تو اس وقت گھر کے اندر اپنی خوشی منا رہے ہوں گے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ تیزی سے اٹھ کر فون کی طرف لپکے تھے۔ مگر موسم خرابی کی وجہ سے سگنلز کا مسئلہ تھا۔ کال نہ ہو سکی۔ ریسیور ہاتھ میں لیے انہوں نے خفگی سے فارس کو دیکھا۔

''میں آج گھر نہیں جانا چاہتا۔'' اس کی آواز آنسوؤں سے رندھی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر مصطفیٰ گہرا تنفس لے کر رہ گئے تھے۔

☆☆☆

وہ رات جو اس کے لیے آسان سی تھی۔ وہ جمیلہ داؤد کے لیے کسی قیامت سے کم نہیں تھی۔ اعظم شیرازی کے گارڈ اس خطرناک موسم میں اسے کہاں کہاں نہیں ڈھونڈ رہے تھے۔

حماد کا پارہ چڑھ گیا تھا۔ پہلے بارش اور آندھی نے اس کا موڈ خراب کیا تھا اور اب کسی ملازم کے بیٹے کے لیے اس کے ماں

باپ کی فکرمندی نے اسے شدید غصے میں مبتلا کر دیا تھا۔ کیک کاٹا جا چکا تھا۔ گفٹس لیے جا چکے تھے۔ مہمان اس وقت ڈائننگ ہال میں کھانا کھا رہے تھے اور اس کی ماں متفکر سی لاؤنج میں چکراتی پھر رہی تھی۔ اور اس کے پاپا تو اسی وقت گھر سے نکل گئے تھے جب انہیں فارس کی عدم موجودگی کی اطلاع ملی تھی۔ جبکہ اعظم شیرازی نے اس خبر کا کچھ خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔ وہ مہمانوں کو چھوڑ کر بھی نہیں اٹھے تھے۔

اگلے دن صبح سویرے ہی ڈاکٹر مصطفیٰ نے فون پر فارس کی اطلاع پہنچائی تھی۔ اور جمیلہ اسی وقت ڈرائیور کے ساتھ ان کے گھر آ گئی تھی۔

کمرے کا دروازہ کھول کر جب وہ اندر داخل ہوئی تو فارس سامنے ہی اپنے بیگ میں کتاب رکھتا دکھائی دیا۔ آہٹ پر رک کر اس نے جمیلہ کو دیکھا اور پھر اپنی جگہ رک سا گیا۔

جمیلہ کی آنکھیں سرخ تھیں۔ چہرہ زرد تھا۔ فکر، خوف اور پریشانی انگ انگ سے عیاں۔

ڈاکٹر مصطفیٰ نے دیکھا۔ وہ تڑپ، وہ خوف اور پریشانی ایسی ہی تھی جیسے کسی سگی ماں کی اپنے بچے کے لیے ہوتی ہے۔

اس نے فارس کو بازو سے پکڑ کر پہلے تو خوب ڈانٹا۔ پھر رونے لگی۔ اور روتے ہوئے اسے بھینچ کر گلے سے لگا لیا۔

''کیوں کیا اس طرح؟ تمہیں معلوم تھا، میں پریشان ہو جاؤں گی پھر بھی؟''

''آئم سوری۔'' اس نے لبوں کو جنبش دی۔ وہ بمشکل اپنے رونے پر قابو پائے ہوئے تھا۔

''وعدہ کرو، تم آئندہ کبھی بھی اس طرح نہیں کرو گے۔'' چہرہ ہاتھوں میں لے کر اس نے کہا۔ ''بتائے بغیر کہیں نہیں جاؤ گے، کبھی گھر نہیں چھوڑو گے۔''

''وعدہ!'' وہ کہہ رہا تھا۔ اس نے جمیلہ کو پہلی بار روتے دیکھا تھا۔ وہ اس کی وجہ سے روئی تھی اس خیال سے اسے دکھ پہنچا تھا۔

''آپ بھی نہیں جائیں گی؟'' اس عرصے میں پہلی بار وہ اپنا کوئی خدشہ لبوں پر لایا تھا۔

''ہاں، میں بھی نہیں جاؤں گی۔'' جمیلہ نے یقین دہانی کرائی تھی۔

ڈاکٹر مصطفیٰ اپنی جگہ خاموش کھڑے تھے۔ انہوں نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

''میں اپنے شوہر اور سسر کی طرح بے رخی نہیں دکھا پائی، میرے دل پر میرا اختیار نہیں ہے۔'' وہ چائے کے لیے ان کے پاس رک گئی تھی۔ اور ساری بات بتانے کے بعد سر جھکائے کہہ رہی تھی۔

''محبت بھی رزق کی طرح ہوتی ہے، جس کی جو جگہ۔ جس دل میں لکھی ہو مل کر رہتی ہے۔ یہ اس بچے کا رزق ہے جمیلہ! وہ تم سے وہی حصہ لے رہا ہے جو اس کے لیے آسمان پر طے کر دیا گیا تھا۔'' وہ کہہ رہے تھے۔

وہ نم آنکھوں سے انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

جو وعدہ اس نے کیا تھا وہ اس وعدے پر قائم رہا تھا۔ مگر جو وعدہ جمیلہ کا تھا وہ اسے ایفا نہ کر سکی تھی۔ ٹھیک تین سال بعد جب حماد کا ایڈمیشن امریکا کے ایک بہترین اسکول میں ہوا تو آناً فاناً اعظم شیرازی نے جمیلہ کو امریکا شفٹ ہو جانے کا عندیہ دے دیا۔ ہارون پہلے سے وہاں موجود تھا۔ شیرازی انٹرپرائزز کی امریکا کی فرم کو آج کل وہ ہی سنبھال رہا تھا۔

گیارہ سال کی عمر میں وہ خبر فارس کے لیے کسی صدمے سے کم نہیں تھی۔ جمیلہ کے بغیر اس کی زندگی کا تو کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ وہ اس کے لیے ''ماں'' تھی۔ اور وہ اس ماں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

جمیلہ کے لیے بھی یہ سب مشکل تھا۔ مگر وہ مجبور تھی۔ حماد کے لیے اس کا امریکا میں ہونا بے حد ضروری تھا۔

''میں جلد واپس آ جاؤں گی۔''

جانے سے قبل وہ اس سے ملنے آئی تھی تو اس نے کہا تھا۔ اور وہ چپ چاپ کھڑا رہا تھا۔

جمیلہ نے آگے بڑھ کر اس کا ماتھا، اس کا گال چوما تھا۔ اسے گلے سے لگا کر اسے بہت پیار کیا تھا۔ اور وہ خاموشی سے یوں کھڑا رہا تھا جیسے وہ چند دنوں کے لیے دوسرے شہر تک ہی جا رہی ہو۔ اور اس کے جانے سے اسے کوئی فرق ہی نہ پڑ رہا ہو۔

اس کا رویہ جہاں مدحت کو پریشانی میں مبتلا کر گیا تھا وہاں جمیلہ داؤد کے اندر بہت سے اندیشے جگا رہا تھا۔ وہ نارمل حالات میں پلا بڑھا بچہ نہیں تھا کہ کسی بھی سچویشن کو نارمل انداز میں ہینڈل کر سکتا۔ ہر چوٹ اس کے لیے گہری۔۔ ہر غم اس کے لیے بڑا۔ اور ہر جدائی اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔

جمیلہ اس قدر محنت سے اسے اس مقام تک لائی تھی اور اب جب بکھرتا دیکھا تو دل کرچی کرچی ہو گیا۔ سارا راستہ وہ بھی روتی رہی تھی اور باغ میں درختوں کے جھنڈ میں چھپ کر فارس وجدان بھی۔

اس دن وہ مدحت کو بہت دیر تک ڈھونڈنے کے بعد باغ میں ملا تھا۔ اور کسی بھی صورت گھر واپس جانے کو رضامند نہیں ہو رہا تھا۔ وہ سدا کا ضدی ہمیشہ جمیلہ کے ہی قابو میں آیا کرتا تھا۔ مگر اس دن جمیلہ نہیں تھی تو ڈاکٹر مصطفیٰ ہی اس کے پاس آئے تھے۔

وہ ایک گھنے پیڑ کے نیچے دنیا جہاں سے رخ موڑے پنجوں کے بل بیٹھا تھا۔ ہاتھ میں چاقو تھا۔ درخت کے تنے پر کئی لکیریں کھینچی گئی تھیں۔ کئی سوراخ کھودے گئے تھے۔

''تم جانتے ہو، وہ تم سے بہت پیار کرتی ہیں۔'' انہوں نے قریب پہنچ کر کہا تھا۔ ''اور یہ بھی جانتے ہو کہ وہ اپنی مرضی سے تمہیں چھوڑ کر نہیں گئی ہیں۔''

فارس کا سر ہنوز جھکا رہا تھا۔ وہ درخت کے تنے پر اسی دستی چاقو سے کھرچتا رہا تھا۔ گھٹنوں پر، جوتوں پر جگہ جگہ مٹی لگی تھی۔

انہوں نے آگے بڑھ کر اسے کندھوں سے پکڑا تو وہ رک گیا۔ رخ موڑا تو وہ اپنا سر مزید جھکا گیا۔ مگر وہ دیکھ چکے تھے۔ وہ آنسوؤں سے بھری ہوئی اس کی سرخ و متورم آنکھیں دیکھ چکے تھے۔ اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔ اس کے ساکت لبوں پر شکوے دھرے تھے۔ اس کی خاموشی چیخ چیخ کر ایک اور ظلم پر احتجاج کر رہی تھی۔ انہوں نے اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

انگلیوں پر جا بجا چھوٹے چھوٹے کٹ لگے تھے۔ اور درخت کے تنے کا جو حشر تھا۔ وہ تو ان کے سامنے ہی تھا۔

''ایسے ہتھیار کو کسی صورت ہاتھوں میں نہیں لینا چاہیے جو خود آپ کو بھی زخمی کر دے۔''

انہوں نے چاقو لے لیا۔ اسے برابر میں اپنے گھٹنے پر بٹھا لیا۔

مدحت قدرے فاصلے پر بلندی سے انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے ہاتھ ہلا کر اسے جانے کا اشارہ کر دیا تو وہ ان کی موجودگی سے کچھ مطمئن ہو کر چلی گئی۔

''اس سے درخت نہیں کٹ سکتا۔''

''میں درخت کاٹ نہیں رہا تھا۔''

''تو کیا کر رہے تھے؟''

وہ چپ رہا۔ نظریں جھکی رہیں۔ آنسوؤں کی لکیریں پھر سے نمایاں ہوئیں۔ مگر اس کا ضبط کمال کا تھا۔ وہ رو رہا تھا مگر ظاہر کرنا چاہتا تھا، وہ نہیں رو رہا۔ اسے جمیلہ داؤد کے جانے کا کوئی غم نہیں۔ اسے سرے سے کوئی فکر۔ کوئی پرواہ ہی نہیں۔ مگر اس کا چہرہ۔ اس کے تاثرات۔ اس کی آنکھیں۔

بھلا وہ غم بھی چھپائے جا سکتے ہیں جو آنکھوں میں بس جاتے ہوں؟

''تم تو اتنے پیارے۔ اتنی ہمت والے۔ اتنے صبر والے بچے ہو۔''

انہوں نے اسے بانہوں میں بھر کر خود سے لگا لیا۔ وہ انہیں بتانا چاہتا تھا وہ بہت برا ہے۔ تب ہی تو اس کے ساتھ ''اتنا'' برا ہو رہا ہے۔ مگر وہ کہہ نہ سکا۔ ضبط ٹوٹا تو سسکیاں ہچکیوں میں بدل گئیں۔ وہ ان کے کندھے سے لگ کر رویا تو پھر چپ نہ ہوا۔ کتنی ہی دیر تک وہ اسی گھنے سایہ دار شجر کے نیچے بیٹھے اس کی پشت سہلاتے رہے۔ اسے تسلی اور دلاسے دیتے رہے۔ اسے یقین دہانی کرواتے رہے کہ وہ اسے ''چھوڑ'' کر نہیں گئی ہیں۔ وہ جلد آ جائیں گی۔

مگر فارس وجدان کو لگتا تھا۔ اس کے پاپا، اس کی مما کی طرح جمیلہ داؤد بھی کبھی واپس نہیں آئیں گی۔

☆☆

دھرتی پر خزاں اتری ہوئی تھی۔ درختوں کے پتے جھڑ رہے تھے۔ سبزہ گہرا خشک لگ رہا تھا۔ ہر شے رنگ بدل رہی تھی۔ ایک رنگ اس کا بھی تھا۔ سفیدی میں گھلتا۔ سیاہی میں بدلتا۔ نفرت سے الجھتا۔ رشتوں میں بھٹکتا۔ اس کا اپنا رنگ۔

رشتہ خون کا تھا۔ مگر خون سے زیادہ اہم دادا کے لیے ''عزت'' اور ''وقار'' تھا۔ دولت اور اسٹیٹس تھا۔ شہرت اور نیک نامی تھی۔ وہ ہر کام باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت کرتے تھے۔ ہر فیصلے اور چال میں اپنی مصلحت کو مقدم رکھتے تھے۔

جمیلہ داؤد کے جانے کے تیسرے دن انہوں نے اس کا داخلہ بورڈنگ سکول میں کروا دیا تھا۔ معاملات پہلے سے طے تھے، سرانجام اب دیے جا رہے تھے۔

جمیلہ کی جدائی۔ پھر اجنبی جگہ پر، اجنبی ماحول میں ایڈجسٹ ہونا اس کے لیے ہرگز آسان نہ تھا۔ وہ نفسیاتی طور پر بہت ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ پڑھائی میں اس کی کارکردگی صفر ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ اپنے کلاس فیلوز سے بات نہیں کرتا تھا۔ اپنے ٹیچرز کو جواب نہیں دیتا تھا۔ کئی بار ہیڈ آفس میں اس کی حاضری ہو چکی تھی۔ کئی بار اس کے گھر رابطہ کیا جا چکا تھا۔

پرنسپل یقیناً اعظم شیرازی کے جاننے والے تھے۔ وہ اس کے سامنے ہی کال کرتے، بات کرتے، مسئلہ بتاتے کچھ سنتے، کچھ سمجھتے اور فون بند کرتے ہی اسے جانے کا اشارہ کر دیتے۔ اور پھر وہی روٹین۔ وہی اذیت۔ وہی گھٹن۔ وہی خوف اور وحشت بھرا احساس۔

وہ سنبھل جائے گا۔ یہ سب کا خیال تھا، وہ سنبھل نہیں رہا تھا۔ یہ ایک حقیقت تھی۔ اور اس حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کوئی نہیں کر رہا تھا۔

اندر ہی اندر گھٹتے مرتے ہوئے اس نے فیصلہ کر لیا، وہ شیرازی مینشن اب کبھی نہیں جائے گا۔ چھٹیوں میں بھی نہیں۔ زندگی ایسی ہے تو پھر ایسی ہی سہی۔ وہ بھی جیسے ضد پر اتر آیا تھا۔

اتوار کی ایک صبح آغا علی آیا تو اس کے ساتھ ڈاکٹر مصطفیٰ بھی تھے۔ پورے تین ہفتوں کے بعد وہ انہیں دیکھ رہا تھا۔ معمول کے برعکس اس نے کوئی گرم جوشی نہیں دکھائی تھی۔ نہ ہاتھ ملایا، نہ اٹھ کر ان سے گلے لگا۔ ایک فاصلہ قائم رکھے وہ فاصلے پر ہی کھڑا رہا تھا۔

وہ سرسبز لان میں بنچ پر بیٹھ گئے تھے۔ سامنے اسکول کی عمارت اور ہرے بھرے درختوں سے گھرے کھیل کے میدان تھے۔ بچے کھیلتے کودتے پھر رہے تھے۔

''آپ یہاں کیوں آئے؟'' وہی لیا دیا سا انداز...... کہ میں تو آپ کو جانتا ہی نہیں۔

"کیا میں نہیں آ سکتا؟" انہوں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"نہیں۔" اپنے سویٹر کی جیبوں میں اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔

لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ لیے وہ جھک کر اسے بغور دیکھنے لگے۔ وہ پہلے سے بہت سے زیادہ کمزور لگ رہا تھا۔ رنگت زرد تھی۔ ہونٹ خشک اور بے رنگ تھے۔ یقیناً وہ کئی دنوں تک بیمار رہا تھا۔

"ہم دونوں بیسٹ فرینڈز ہیں فارس۔" انہوں نے یاد دلایا۔

"ہماری دوستی اب ختم!"

"دوستی ختم؟" ڈاکٹر مصطفیٰ کو صدمہ پہنچا۔ "ہم نے تو اتنے وعدے کیے تھے یار۔ فرینڈز فار ایور، ہیں ہم!"

بھنویں سکیڑے وہ ذرا سی خفگی کے ساتھ کہیں اور دیکھنے لگا۔ گویا دوستی بغیر کسی وجہ کے ختم کی جا رہی تھی۔ مگر "وجہ" تھی۔ ڈاکٹر مصطفیٰ سمجھ چکے تھے وجہ کیا تھی۔ وہ کیوں اس انداز سے بات کر رہا تھا۔ کیوں ایک فاصلہ سا برقرار رکھے ہوئے تھا۔ وہ اس خوف کو محسوس کر سکتے تھے جو کم عمری میں اس کے اندر جڑ پکڑ رہا تھا۔ کھو دینے کا احساس، تنہا رہ جانے کا خدشہ۔ بچھڑ جانے کا غم۔

انہیں دکھ ہوا۔

وہ کافی دیر تک اس کے پاس بیٹھے رہے۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے اسے الجھاتے رہے۔ کسی بات پر خود ہنس پڑتے، کسی بات پر ہنسانے کی کوشش کرتے۔ مگر وہ سدا کا ضدی۔ رخ موڑے بس انہیں خفگی ہی دکھاتا رہا۔

"اگلے ہفتے ملاقات ہو گی؟" جانے سے پہلے انہوں نے کہا۔

"میں گھر نہیں آؤں گا۔" اس نے بھی واضح کر دیا۔

"تم نہ آؤ بھئی۔ ہم تو آتے رہیں گے۔"

وہ کہہ کر گئے اور اپنی بات پر قائم بھی رہے۔ ہر ویک اینڈ پر وہ آغا علی کے ہمراہ اس سے ملنے آ جاتے۔ پندرہ بیس منٹ وہ بحث کرتے ہوئے اسے غصہ دلاتے رہتے کہ جو دوستی اس نے ساڑھے چھ سال کی عمر میں ایک ساٹھ سالہ بوڑھے سے کی تھی وہ کسی بھی صورت ختم نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد وہ بولتے رہتے اور وہ سنتا رہتا، کبھی لڑ پڑتا، کبھی رونے لگتا۔ کبھی غصہ دکھاتا اور کبھی ان کے بازوؤں میں سمٹ جاتا۔

"مجھے وہ بہت یاد آتی ہیں۔" اس کی آنکھیں آنسوؤں سے مکمل بھر جاتیں۔ ناک، گال سرخ ہونے لگتے۔

"وہ بھی تمہیں بہت یاد کرتی ہوں گی۔"

"نہیں۔" وہ نفی میں سر ہلاتا۔ "وہ مجھے بھول چکی ہیں۔"

"جو پیار کرتے ہیں، وہ کبھی نہیں بھولتے۔"

"انہیں مجھ سے پیار نہیں تھا، اس لیے وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔"

"تمہیں ان کی مجبوری کو سمجھنا چاہیے بیٹا!"

"وہ حماد کی ممی ہیں، صرف اور صرف حماد کی ممی ہیں۔" ذہن میں صرف ایک ہی بات رہ گئی تھی کہ اگر وہ اس کی ممی ہوتیں تو اس کے پاس ہوتیں۔

ڈاکٹر مصطفیٰ گہری سانس لے کر رہ جاتے۔ انہوں نے بارہا کوشش کی کہ کسی طرح جمیلہ داؤد سے رابطہ ممکن ہو سکے مگر وہ ناکام رہے تھے۔

وقت کے ساتھ ساتھ کچھ حد تک وہ سمجھ گیا، سنبھل بھی گیا۔ مگر جمیلہ داؤد کے جانے سے جو خلا اس کی زندگی میں پیدا ہوا وہ کسی صورت پورا نہ ہو سکا۔

ذہن بھٹکانے کے لیے ایک مصروفیت درکار تھی اور اس نے خود کو تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف کر لیا۔ وہ پڑھائی میں پہلے صرف اچھا تھا مگر اب ٹاپ کرنے لگا۔ ہر مقابلے میں اس کی پہلی پوزیشن ہوتی تھی۔ گھڑ سواری، سوئمنگ، ہاکی، والی بال، ٹینس۔ غرض وہ ہر طرح کے کھیلوں میں حصہ لینے لگا تھا۔

وہ زندگی کو محسوس کرتا تھا یا نہیں۔ مگر وہ زندگی کی طرف واپس ضرور پلٹ گیا تھا اور ان تمام تر مثبت تبدیلیوں کا سہرا ڈاکٹر مصطفیٰ کے سر جاتا تھا۔ اگر وہ نہ ہوتے تو وہ ایسا نہ ہوتا۔ اس کی شخصیت میں اتنا ٹھہراؤ، اتنی لگن اور محنت کے رنگ نہ ہوتے۔ وہ خود ترسی کا شکار ہو کر کب کا اپنے ٹریک سے بھٹک چکا ہوتا۔

اس کی ہر کامیابی پر ڈاکٹر مصطفیٰ بے انتہا خوشی محسوس کیا کرتے تھے۔ وہ اس کی ٹرافیز کو چھو کر دیکھتے، اسنادی سرٹیفکیٹس ہاتھوں میں لے کر محسوس کرتے، البم کے صفحے پلٹتے جاتے، جو نئی تصاویر کھینچی گئی ہوتیں، ان میں سے کوئی ایک اپنے پاس رکھ لیتے۔

اپنی چھوٹی بڑی ہر بات ان سے شیئر کرنے والا فارس وجدان کبھی بھی انہیں اپنی کامیابیوں سے ملنے والی اذیت سے آگاہی نہیں دے سکا تھا۔ وہ انہیں کبھی نہیں بتا سکا تھا۔ اسے ٹرافیز سلگتے ہوئے انگاروں جیسی لگتی ہیں اور جب وہ انہیں ہاتھوں میں لیتا ہے تو اس کے ہاتھ جل جاتے ہیں۔ جب اسکول کی انتظامیہ اس پر فخر کرتے ہوئے اسناد سے نوازتی ہے تو اس پر لکھا آدھا ادھورا نام اسے گال پر تھپڑ کی طرح لگتا ہے۔ جب اسے ایک "یتیم" کے طور پر پیش کر کے اس کی محنت اور لگن کو سراہا جاتا ہے تو وہ ڈھول مٹی خاک ہو کر "شیرازی" خاندان کے قدموں میں کیسے بکھر جاتا ہے۔

وہ انہیں کبھی نہیں بتا سکا تھا...... کبھی نہیں۔

ایک جنگ خود اپنی ذات سے تھی تو دوسری جنگ اسے اعظم شیرازی سے لڑنی پڑ رہی تھی۔ وہ ہنوز اپنے فیصلوں پر متمکن تھے، کبھی کبھار ملنے آجاتے تو اتنے سخت لفظوں میں اور اس قدر حقارت سے بات کرتے کہ وہ زمین کی تہوں میں اتر کر رہ جاتا۔ اسے ہر عنایت ایک ''خیرات'' اور ہر مہربانی ایک ''بھیک'' کی طرح لگتی۔

''آرزو جہانگیر'' کا ذکر ہر ملاقات کی بنیاد ہوتا۔ وہ اس کے حالیہ دور کے اسکینڈل انگلیوں پر گنواتے، اس کے کارنامے ایک ایک کر کے سنائے جاتے۔ کبھی کسی سیاست دان کے ساتھ افیئر ہے تو کبھی کسی بڑی کاروباری شخصیت کے ساتھ کوئی چکر ہے۔ آج کل وہ تیسری شادی کی تیاریوں میں تھی۔ کئی بار اس کے یورپ، اٹلی اور فرانس میں مختصر مغربی کپڑوں میں گھومنے پھرنے کی تصاویر دکھاتے ہوئے وہ اسے جتا چکے تھے کہ یہ عورت اس کی ''ماں'' ہے۔ اور اس جیسی عورت کا بیٹا ہونا ہی اس کا سب سے بڑا ''گناہ'' ہے۔

اور ایسا کرتے ہوئے وہ ایک بار بھی اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھتے تھے، اس کے تاثرات کو نہیں جانچتے تھے۔ وہ ان کی ہر بات خاموشی سے سن کر اٹھ جاتا تھا۔ بند کمرے میں اس کی نظریں کافی دیر تک جھکی رہتیں، لب بھنچے رہتے، اور آنکھوں میں ٹھہری ہوئی نمی گال پر پھسلنے لگتی۔

اعظم شیرازی اسے اپنے رعب میں رکھنا چاہتے تھے۔ وہ اتنا کمزور ہو کہ شیرازی خاندان کے سامنے سر اٹھا کر بات نہ کر سکے۔ اسے اپنا آپ کمتر لگے' اسے اپنی پہچان سے نفرت ہو۔ مگر وہ ان کے خوف یا رعب میں آنے کے بجائے نفرت اور انتقام کے شعلوں میں لپٹ جاتا تھا۔ وہ انہیں ویسی ہی تکلیف دینا چاہتا تھا جیسی وہ اسے دیتے تھے۔ وہ بھی انہیں توڑنا چاہتا تھا، ان کا غرور۔ ان کا تکبر۔ ان کا گھمنڈ۔ وہ بھی ان سے ''رشتے'' چھیننا چاہتا تھا۔ ان کو ''تنہا'' کرنا چاہتا تھا۔

''جس دن تم نے میرے پوتے سے ٹکر لینے کی کوشش کی تو یاد رکھنا۔ وہ دن تمھاری زندگی کا آخری دن ہوگا۔''

تاریخ پانچ نومبر تھی۔ اس کی چودھویں سالگرہ کا دن۔ یہ دن اسے کوئی خوشی نہیں دیتا تھا۔ مگر اس دن اعظم شیرازی کے یہ الفاظ اسے بہت بڑا غم دے گئے تھے۔ کتنی ہی دیر تک وہ ساکت سا اپنی جگہ کھڑا رہا تھا۔ حیرت دھمکی کی نہیں تھی۔ حیرت اس امر کی تھی کہ وہ اسے ''زندہ'' سمجھتے تھے۔ کیا وہ اتنا ''زندہ'' تھا کہ اسے یہ دھمکی دی جاتی؟

''پہلے آپ کنفرم کر لیں، آپ کس سے ملنے آتے ہیں؟ فارس ہارون سے یا فارس وجدان سے؟'' ضبط کر کے اس نے شدید غصے کے عالم میں پوچھا تھا۔

ہوا کے زور سے پردے لہرا اٹھے، کھڑکیوں کے پٹ ہلے، باہر کہیں آہٹ بھی ہوئی۔ بچوں کا شور معدوم ہونے لگا۔ آغا علی اور گارڈز بھی عدم ہو گئے۔ تاریکی میں روشنی یا تو اس پر تھی یا پھر اعظم شیرازی کے وجود پر۔ جو ایک شان سے صوفے پر بیٹھے تھے۔ لیکن

وہ شان اور تمکنت، رعب اور دبدبہ، وہ آنکھوں کی سختی اور پتھریلے تاثرات اس ایک سوال سے ہوا ہوئے تھے۔

وہ سوال نہیں، سلگتا ہوا ایک انگارہ تھا جو کئی حقیقتیں آشکار کرتا جلا کر راکھ کر گیا تھا۔

اعظم شیرازی کی پتھریلی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی رہیں۔ اور وہ مٹھیاں بھینچے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔

''میرا صرف ایک ہی پوتا ہے۔ حماد شیرازی۔ میں کسی ''فارس ہارون'' کو نہیں جانتا۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ والٹ سے کچھ رقم نکال کر میز پر اچھالی اور شال درست کرتے اپنے گارڈز کے ہمراہ باہر نکل گئے۔

اور وہ آنکھوں میں کرب لیے کتنی ہی دیر تک فرش پر بکھرے نوٹوں کو دیکھتا رہا۔

یہ اس کی اوقات تھی۔ وہ اسے یہی اوقات دکھانے آتے تھے۔ وہ دھول، خاک، مٹی تھا۔ اس کی جگہ قدموں میں تھی۔ یا شاید قدموں سے بھی نیچے۔ پیسے اٹھانے کے لیے ''جھکنا'' ضروری تھا۔ اور وہ ہمیشہ اسے جھکائے رکھنا چاہتے تھے۔

آغا علی بے بسی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا۔ تسلی کے دو بول ہی سہی۔ مگر وہ خود ملازم تھا۔ زیادہ سے زیادہ کیا کہہ سکتا تھا؟ کس بات کی تسلی دے سکتا تھا؟ سر جھکائے وہ خاموشی سے چلا گیا۔ اس کے جانے تک فارس سپاٹ چہرے کے ساتھ کھڑا رہا تھا۔ جیسے ہی دروازہ بند ہوا، اس کے منجمد وجود پر دراڑیں پڑنے لگیں۔

پہلے آنکھیں نم ہوئیں۔ پھر گال تر ہوئے۔ وہ سسکتے ہوئے گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ روتے ہوئے اپنے آپ میں سمٹ کر بکھر گیا۔

نفرت کیا ہوتی ہے؟ وہ پہلے نہیں جانتا تھا۔ نفرت کیسی ہوتی ہے؟ وہ اب جان گیا تھا۔ جمیلہ داؤد کی محبت ایک ''ڈھال'' تھی۔ اعظم شیرازی کی نفرت ایک آگ۔ جب تک ڈھال تھی، وہ آگ سے محفوظ رہا تھا۔ اور جب ڈھال نہیں رہی تھی تو وہ راکھ ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

مطلع ابر آلود تھا۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ رم جھم برستی بارش کا نظارہ کرتا وہ کھڑکی کے سامنے اسٹول پر بیٹھا تھا۔

اس کی دو ماہ کی چھٹیاں ہو رہی تھیں۔ آغا علی اسے لینے آیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح جواب انکار میں ہی تھا مگر وہ اسے ساتھ لے جانے پر مصر تھا۔

''بڑے صاحب کا حکم ہے۔'' سر جھکا کر مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے آغا علی نے اس پر واضح کر دیا کہ اب انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کا خیال تھا فارس مزید بحث کرے گا یا پھر پچھلی بار کی طرح ہاسٹل کی بلڈنگ میں کہیں چھپ جانا چاہے گا۔ مگر وہ اسٹول

سے اتر کر الماری تک گیا۔اور بہت خاموشی سے بیگ میں کپڑے رکھنے لگا۔آغا علی حیرت سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

بارش ایک بار پھر شروع ہو چکی تھی۔

سامان پیک کر کے وہ اسی خاموشی کے ساتھ آغا علی کے ہمراہ باہر آ گیا۔چھتری کے سائے میں وہ سیاہ جیپ کی طرف جا ہی رہا تھا جب سرخ رنگ کی کار سڑک کے اس پار رک گئی تھی۔

گاڑی ڈاکٹر مصطفیٰ کی تھی،وہ دروازہ کھول کر باہر نکلے تو اس نے آغا علی سے بیگ پیک لے لیا۔

''میں ان کے ساتھ جاؤں گا۔'' آواز دھیمی تھی۔مگر لہجہ سخت تھا۔گہرا سانس لے کر آغا علی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ ڈاکٹر مصطفیٰ کے پاس پہنچا تو وہ اسے تشویش سے دیکھ کر رہ گئے۔اس کا چہرہ زرد تھا،اور آنکھیں بے تحاشہ سرخ ہو رہی تھیں جیسے وہ کئی راتوں کا جاگا ہوا ہو۔ہاتھ بھی گرم تھے۔

وہ سوال کرتے کرتے رہ گئے۔اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔وہ سمجھ گئے تھے۔وہ ان کے ساتھ گھر جانا چاہتا ہے وہ یہ بھی جان گئے تھے۔

''چلیں۔''انہوں نے کہا۔

پسینجر سیٹ کا دروازہ کھولتے کھولتے وہ رک گیا۔دو پونیوں والا سر کسی کتاب پر جھکا ہوا تھا۔یکسوئی سے کچھ لکھا جا رہا تھا۔وہ مڑ کر پچھلی نشست کی طرف گیا۔دروازہ کھول کر بیٹھتے ہی دھڑام سے بند کیا۔بیگ پیک قدموں میں رکھ کر نشست پر نیم دراز ہو گیا۔سیاہ رنگ کی ہوڈی ٹھوڑی تک کھینچ کر اس نے چہرہ بھی پوشیدہ کر لیا۔

ڈاکٹر مصطفیٰ نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا تو دو پونیوں والی کو خیال آیا کہ بابا اگر یہ ہیں تو پھر پیچھے کون ہے؟

ڈرائنگ بک،پنسل کلرز اور زرد رنگ کی ٹوپی چھوڑ چھاڑ وہ گھٹنوں کے بل نشست کی بیک سائڈ کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔

کوئی لڑکا دنیا جہان سے خفا پشت گاہ کی طرف رخ کیے لیٹا ہوا تھا۔اس کا اسٹفڈ زرافہ جسے وہ نیا نیا خرید کر لائی تھی۔وہ اس کے سر کے نیچے تکیے کے فرائض سر انجام دے رہا تھا۔

''تمہیں سردی تو نہیں لگ رہی فارس؟'' گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔مین روڈ پر ڈالتے ہوئے ڈاکٹر مصطفیٰ نے پوچھا۔وہ خاموش پڑا رہا۔انہوں نے گاڑی روک کر لحاف نکال کر اس پر ڈالا۔تب بھی اس کے وجود میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔نشست کے ساتھ لگی وہ کبھی حیرت سے اپنے نانا کو دیکھتی تھی اور کبھی اسے۔

گاڑی اپنے سفر پر گامزن ہوئی تو فارس کو نیند آ گئی۔تاہم وہ سوتی جاگتی کیفیت میں تھا۔کبھی آوازیں اس کے لیے واضح ہو جاتیں۔اور کبھی مبہم ہو کر بالکل معدوم۔

''یہ کب اٹھے گا بابا؟''بار بار گردن موڑ کر پیچھے دیکھتے رہنے کے بعد دو پونیوں والی نے تھک کر پوچھا تھا۔

''شش......آہستہ۔''انہوں نے نرمی سے ٹوکا تھا۔

''کب سے سوئے جا رہا ہے!سوئے جا رہا ہے۔''اس کی سرگوشی بھی خاصی بلند تھی۔ایک بار پھر پوری کی پوری گردن موڑ کر اس نے اپنے اس زرافہ کو دیکھا جس سے کھیلنے کا اسے موقع تک نہیں ملا تھا۔کیسے بے چارہ اس کے سر کے نیچے پھنسا ہوا تھا۔

ایک لمبی سانس لے کر وہ ڈاکٹر مصطفیٰ کی طرف مڑی۔

''کائی (Kai) اس کے سر کے نیچے ہے بابا!''

''کون کائی؟''

''میرا زرافہ۔''وہ بہت فکر مند نظر آ رہی تھی۔

''گڑیا ابھی ہم گھر پہنچ جائیں گے۔بس دو گھنٹے کا تو سفر ہے۔''

''کائی کو سانس نہیں آ رہا ہوگا۔''وہ بڑی اماؤں کی طرح پریشان ہو رہی تھی۔

وہ جانتے تھے جب تک اس کا مسئلہ حل نہیں ہوگا وہ بولتی رہے گی۔سو مڑ کر پیچھے دیکھا تو ''کائی'' کو بچانے کے امکان دور دور تک نظر نہ آئے۔ذرا سی حرکت فارس کی نیند خراب کر سکتی تھی۔

''کائی از آل فائن!آپ بس اپنی ڈرائنگ کریں شاباش۔''انہوں نے اس کا ذہن بھٹکانا چاہا۔

''نو ہی از ناٹ!ہی نیڈز مائی ہیلپ۔''وہ ڈٹ گئی۔

''وہ باہر دیکھو۔بارش ہو رہی ہے۔''فوراً سے سیدھا ہو کر اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔رم جھم برستی بارش یکا یک تیز ہو گئی۔وہ آنکھوں میں اشتیاق لیے کھڑکی کے ٹھنڈے شیشے سے لگ گئی۔اب کوئی نظم تھی جو گنگنائی جا رہی تھی۔

یکا یک اسے کائی کے ساتھ ساتھ اپنے ننھے ڈائنوسار کا خیال آیا تو مڑ کر پیچھے دیکھتے اسے تلاشنا چاہا۔

پیلے رنگ کا ڈائنا سار تو اس کے قدموں کے نیچے تھا۔ننھے دل پر ایک گھونسا آن پڑا۔

''بابا!''

''کیا ہوا میری شہزادی کو؟''ان کی آواز مدھم تھی۔

''بابا وہ ٹارزن......''وہ ایک بار پھر شروع ہو چکی تھی۔ڈاکٹر مصطفیٰ گہرا سانس لے کر رہ گئے۔

سارا راستہ وہ ان کا سر کھاتی رہی۔کبھی کون سا کھلونا یاد آ جاتا۔کبھی کون سا۔اور کھلونوں کے نام اتنے عجیب اور مشکل کہ وہ خود حیران ہوتے،اسے کیسے یاد ہیں؟

وہ حتیٰ الامکان کوشش کر کے اسے ادھر ادھر کی باتوں میں الجھاتے رہے اور اطراف سے یکسر بے نیاز فارس وجدان نیند کی وادیوں میں کھویا رہا۔

☆☆☆

پردوں کی درز سے جھانکتی سورج کی تیز روشنی چہرے پر پڑی تو اس نے کسمسا کر آنکھیں کھول دی تھیں۔ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس نے طائرانہ نگاہ کمرے میں دوڑائی۔ وہ ڈاکٹر مصطفیٰ کے گیسٹ روم میں موجود تھا۔ وال کلاک صبح کے آٹھ بجا رہی تھی۔ گہرا سانس لے کر اس نے اپنی پیشانی کو چھوا۔ بخار اب نہیں تھا، طبیعت بھی پہلے سے کافی حد تک بہتر تھی۔

وہ اٹھ کر واش روم میں گیا۔ منہ ہاتھ دھوتے ہوئے اس نے خود کو آئینے میں دیکھا۔ ہونٹ خشک بے رنگ اور آنکھوں کے کنارے سرخ ہو رہے تھے۔

وہ کمرے میں واپس آ گیا۔ اسے بیڈ پر بیٹھے تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ڈاکٹر مصطفیٰ آ گئے۔ انہوں نے لائٹ آن کر دی۔ کھڑکی سے پردے بھی ہٹا دیے۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟"

اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ "بہتر ہے۔"

انہوں نے اس کا معائنہ کیا۔ اور معائنے کے بعد اسے ڈانٹ بھی پلائی کہ آخر وہ اپنی صحت کے حوالے سے اس قدر لاپروا کیوں ہو جاتا ہے۔ وہ چپ چاپ سنتا رہا۔ انہوں نے پڑھائی سے متعلق پوچھا تو ہوں ہاں میں مختصر جواب دیتا۔ وہ سائڈ ٹیبل لیمپ کو ہی آن آف کرتا رہا۔

پندرہ سالہ سلیم ٹرے میں ناشتے کے لوازمات سجائے اندر آیا تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"تم ناشتا کر لو پھر میڈیسن بھی لینی ہے۔" اس کے بالوں میں محبت سے ہاتھ پھیرتے وہ سلیم کے ساتھ باہر چلے گئے۔

کچھ دیر تک وہ بے مقصد نگاہیں یہاں وہاں دوڑاتا رہا پھر ناشتا کرنے لگا۔ ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وسوسے ایک بار پھر سر اٹھانے لگے تھے۔ اسے اعظم شیرازی کی آواز اطراف میں گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔

"میرا صرف ایک ہی پوتا ہے۔ حماد شیرازی۔ میں کسی "فارس ہارون" کو نہیں جانتا۔"

پہلے ایک دستک ہوئی۔ پھر دوسری۔ پھر تیسری۔ چوتھی بار دستک کم اور ٹھک ٹھک زیادہ تھی۔ اس نے سوپ پیتے ہوئے بے ساختہ سر اٹھا کر آواز کی سمت دیکھا۔ کھڑکی کے شیشے پر ننھا سا ہاتھ بج رہا تھا۔ پھر چہرہ قریب ہوا۔ یقیناً اس کے متوجہ ہونے کی تصدیق کی جا رہی تھی۔

پھر کھڑکی کے شیشے پر لفظ ابھرنے لگے۔

"گیٹ......ویل......سون۔"

پیالہ ہاتھ میں لیے وہ اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا۔ چند لمحوں کے بعد کھڑکی کا شیشہ ایک طرف سلائڈ ہوا۔ دو پونیوں والا سر اندر ہوا، ڈھیر سارا تجسس لیے شہد رنگ آنکھیں نمایاں ہوئیں۔ پھر گلاب کی پنکھڑی جیسے لب کچھ حیرت اور اشتیاق سے وا ہوئے۔

اب وہ اسے دیکھ رہا تھا کچھ حیرت سے۔ اور وہ اسے دیکھ رہی تھی کچھ تجسس سے۔ چوکھٹ پر اپنی پوزیشن مضبوط کرتے ہوئے۔ اس نے ایک ایک کر کے سارے سفید پھول اندر فرش پر پھینک دیے کہ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو پھولوں کے کچومر کے ساتھ ہی نازل ہوتی۔ دوسرے ہی لمحے وہ سرخ فراک سمیت کھڑکی پھلانگ کر اندر تھی۔

فوراً پھول سمیٹے گئے۔ اور ایک استحقاق کے ساتھ سائڈ ٹیبل پر رکھے خالی گلدان میں ڈالے گئے۔ پھر سفید کوٹ کی جیب سے فولڈ کیا ہوا پیپر نکالا گیا۔ پھر اس پیپر کو ننھی منی ہتھیلیوں میں رکھ کر اس کے سامنے پیش کیا گیا۔

ایک ہاتھ میں چمچ لیے۔ دوسرے ہاتھ میں سوپ کا پیالہ تھامے چودہ سالہ فارس اپنی جگہ پتھر کا پتھر۔ اسے ابھی تک اس رونما ہونے والی سچویشن سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

قدموں کی آہٹ راہداری میں گونجی تو بچی حواس باختہ سی اپنے گلابی لبوں پر انگلی رکھ کر "شش" کرتی بیڈ کے نیچے چھپ گئی۔

"میں ابھی کلینک جا رہا ہوں پھر ملاقات ہوتی ہے۔"

ڈاکٹر مصطفیٰ بات کرتے کرتے ٹھٹھک کر رک گئے۔ ادھ کھلی کھڑکی سے ہوتی ہوئی ان کی نگاہ سائڈ ٹیبل تک گئی اور وہ جیسے پوری حکایت سمجھ گئے۔

"جنہ......" وہیں کھڑے کھڑے انہوں نے کچھ خفگی سے آواز دی۔

اور جنہ نامی وہ مخلوق۔ جو بیڈ کے نیچے دوزانو بیٹھی تھی، جھٹ سے بول پڑی۔ "جی بابا!" دوسرے ہی لمحے اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی اس نے دونوں ہاتھ لبوں پر جما لیے۔

"کہاں ہیں آپ؟" یہاں وہاں دیکھتے اب وہ پوچھ رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں وہ باہر تھی۔

"میں آپ کے فرینڈ کو "گیٹ ویل سون" کہنے آئی تھی۔" انداز ایسا تھا جیسے یہ بہت ضروری کام ہو۔

"آپ باہر چلیں۔" کھڑکی بند کر کے فارس سے معذرت چاہتے وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر باہر لے گئے۔ فارس کی نظر اس تہہ کیے ہوئے صفحے پر جا ٹھہری جو فرش پر گر گیا تھا۔ سوپ کا پیالہ رکھ کر اس نے پیپر اٹھا لیا۔

آسمان۔ گھر۔ درخت۔ دو پرندے۔ اور نیچے لکھا تھا گیٹ ویل سون!

''یہ بچی کون ہے؟'' سلیم برتن اٹھانے آیا تو اس نے پوچھا۔

''کون......؟ جنت......وہ ڈاکٹر صاب کی نواسی ہے جی۔''

جنت؟ ذہن کے پردوں پر ایک منظر لہرایا۔ جڑواں بہن بھائی۔ ایک جنت اور دوسرا شاید حسن۔ حسین یا حسنین تھا۔ ڈاکٹر مصطفیٰ بارہا ذکر کرتے رہتے تھے۔ اسے کچھ یاد آیا۔

خیالات جھٹک کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی طبیعت پہلے سے بہتر تھی سو اس نے شیرازی مینشن جانے کا ارادہ کرلیا۔ سویٹر کوٹ پہن کر باہر آیا تو ڈاکٹر مصطفیٰ کی نواسی صوفے پر اوندھی پڑی تھی۔ رونے کا شغل فرمایا جارہا تھا۔ سلیم پورے گھر کی صفائی کے بعد ہلکان سا سامنے بیٹھا تھا۔ صابرہ بوا کچن میں کام کررہی تھیں۔ معلوم ہوا فارس کی وجہ سے ڈاکٹر مصطفی نے جنت کی بلی سلیم کو دے دی تھی۔ کہ جب تک فارس یہاں ہے تو بلی اس گھر میں نہیں رہے گی۔ اور جنت کمال تو اپنی بلی کے بغیر رہ ہی نہیں سکتی تھی۔ تو بس اس ظلم پر احتجاج ہو رہا تھا۔

وہ چپکے سے گھر سے نکل گیا۔

بیک پیک (backpack) کندھے سے لٹکائے جب وہ باغ کے راستے بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوا تو مالی کو ہدایات دیتی مدحت کی نظر اچانک اس پر پڑی اور وہ اپنی جگہ رک گئی۔ نگاہیں ایک ہی مقام پر ٹھہر گئیں۔ بے یقینی کا تاثر حیرت میں اور حیرت کا تاثر خوشی میں بدل گیا۔

عجلت میں قدم اٹھاتی وہ اس کے پاس آئی۔ اس کے ہاتھ اور پھر اسے کندھوں سے پکڑ کر اس نے دیکھا۔ اس کے سامنے دس گیارہ سال کا چھوٹا سا بچہ نہیں تھا، چودہ پندرہ برس کا ایک ہینڈسم سا ٹین ایجر تھا۔

جدید اسٹائل سے تراشے ہوئے بال آج بھی قدرے لمبے تھے۔ ہلکا سا خم لیے سیدھا پیشانی پر گرتے تھے اور نیک کالر کو چھوتے تھے۔ دھوپ میں بال سنہری لگ رہے تھے۔ ہیزل آنکھوں میں کچھ اور رنگوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ پورے تین سال بعد اس نے شیرازی مینشن میں قدم رکھا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھی۔

''کیسی ہیں آپ؟'' اس نے پوچھا۔ مدحت نم آنکھوں سے مسکرائی۔

''میں تو ٹھیک ہوں، مجھے یقین نہیں آرہا تم آگئے، طبیعت کیسی ہے اب؟''

''ٹھیک ہے، ہلکا سا بخار تھا بس۔'' مدھم سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھر کر معدوم ہوگئی۔ وہ اسے ساتھ لیے سرونٹ کوارٹر کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا کمرہ ہمیشہ کی طرح صاف ستھرا اور سلیقے سے سیٹ تھا۔ البتہ فرنیچر اور کمرے کی سیٹنگ کچھ حد تک بدل دی گئی تھی۔

بیڈ، وارڈروب، رائٹنگ ٹیبل، کمپیوٹر کے ساتھ آرائشی قیمتی اشیا سجی تھیں۔ مشرقی دیوار گیر الماری میں اس کا پرانا سامان حتیٰ کہ کھلونے کتابیں، ڈائریز تک محفوظ تھیں۔

ایک طائرانہ نگاہ اطراف میں دوڑاتے وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ بیڈ پر جا بیٹھا۔

مدحت اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ اور کچھ کچھ فکرمند بھی تھی۔

''میں تمھارے لیے کچھ کھانے کا انتظام کرتی ہوں۔''

''میں ناشتا کر چکا ہوں، صرف آرام کرنا چاہتا ہوں۔'' جوتے اتارے وہ بیڈ پر دراز ہو چکا تھا۔ مدحت نے چند لمحوں تک اسے دیکھا پھر اثبات میں سر ہلاتی چلی گئی۔

دروازہ بند ہوا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کروٹ بدل کر پشت کے بل لیٹتے وہ چھت کو دیکھنے لگا۔

اس کمرے کے ساتھ جمیلہ داؤد کی بہت سی یادیں جڑی ہوئی تھیں۔ آنکھوں کے کنارے نم ہوئے تو اس نے لحاف سر تک تان لیا۔ اسے نیند نہیں آرہی تھی مگر وہ سونا چاہتا تھا۔ اور بہت دیر تک سویا رہنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

آج فرینڈ شپ ڈے تھا۔ اب پتا نہیں سچ مچ کا فرینڈ شپ ڈے تھا یا جنت کا خود ساختہ تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے۔ بس وہ انہیں یہ سمجھانے آئی تھی کہ دوستوں کو وش کارڈ ضرور دینا چاہیے۔ اور ان کے اتنے سارے دوستوں میں اسے صرف فارس وجدان کا ہی خیال آیا تھا۔ کہ باقی سب تو سفید داڑھیوں والے، کچھ گنجے، کچھ بڑی عمر کے انکل اور کچھ عمر رسیدہ ڈاکٹر آنٹیاں تھیں۔ لیکن فارس ان سب سے مختلف تھا۔ سو......

مگر نانا مصروف تھے۔ انہوں نے اس کے سوالات کے ہوں ہاں میں جواب دے کر باہر بھیج دیا۔

اور اس نے سوچا نانا کی ہر چیز اس کی تھی۔ تو پھر نانا کا بیسٹ فرینڈ بھی تو اس کا اپنا ہوا نا؟

جھٹ سے کمرے میں گئی۔ محنت سے کارڈ بنائے۔ لان سے پھول توڑے۔ بیگ پیک میں گفٹ رکھا اور باغ کے راستے پہنچ گئی شیرازی مینشن۔

عقبی بیرونی دیوار میں ایک آہنی دروازہ تھا جو کبھی کبھار کھلا رہتا تھا۔ ایک گارڈ وہاں ہر وقت متعین رہتا تھا۔ اندر داخل ہونے کے لیے ڈاکٹر مصطفیٰ کا حوالہ ہی کافی تھا۔ ملازم اسے فارس کے کمرے کے دروازے تک چھوڑ کر آیا۔

اس نے دروازے پر دستک دی۔ کچھ ہی دیر میں دروازہ کھل گیا۔

نیلی جینز پر سفید رنگ کی اونی شرٹ میں ملبوس فارس وجدان سامنے کھڑا تھا۔ اور اب کچھ حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

استنے سویرے اوراس قدر ٹھنڈ میں وہ گلابی فراک پر لمبا کوٹ زیب تن کیے۔ ٹویٹی بیگ کندھے سے لٹکائے، اونی مفلر، کیپ اور دستانے پہنے سامنے کھڑی تھی۔

کیا ڈاکٹر مصطفیٰ بھی ساتھ آئے تھے؟ اس نے یہاں وہاں نگاہ دوڑائی۔ مگر وہ کہیں نہیں تھے۔

''یہ تمھارے لیے ہے۔'' جنت نے دونوں ہاتھ آگے کر دیے۔

''یہ کیا ہے؟''

''کارڈ ہیں، بابا نے بھیجے ہیں۔'' کچھ استحقاق اور بے تحاشا اشتیاق سے اندر جھانکتے اس نے کہا تھا۔

ایک الجھن بھری نظر جنت پر ڈالتے اس نے کارڈ لے کر کھولے۔

نیلی نیلی روشنی کمرے میں بند ہے۔

میں کیا کروں مجھے فارس پسند ہے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ۔

پیپل کے پتے گرتے رہیں گے۔

ہم تم کو خط لکھتے رہیں گے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ۔

بچکانہ سی لکھائی تھی اور اتنے اعتماد کے ساتھ ہر شعر کے نیچے ڈاکٹر مصطفیٰ لکھا ہوا تھا جیسے اس طرح کے شعر ڈاکٹر مصطفیٰ کے علاوہ اور کوئی لکھ ہی نہیں سکتا۔

''ڈبے میں ڈبہ۔ ڈبے میں کیک۔

میرا دوست فارس۔ لاکھوں میں ایک!

ڈاکٹر مصطفیٰ۔

وہ سنجیدہ تھا۔ بے تحاشہ سنجیدہ۔ مگر نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

''یہ ڈاکٹر مصطفیٰ نے لکھا ہے؟'' اس نے تصدیق چاہی۔

''ہاں۔''

''مگر یہ رائٹنگ کتنی خراب ہے۔''

جنت کو برا لگا۔ اس نے بھنویں سکیڑ کر اپنے نانا کے بیسٹ فرینڈ کو خفگی سے دیکھا۔ آخر یہ اس کی رائٹنگ تھی۔ کوئی مذاق تھوڑی

تھا؟

''کیسی ہے رائٹنگ؟'' وہ اسے بیان بدلنے کا موقع دے رہی تھی۔

''بچوں جیسی۔''

''ڈاکٹر ایسے ہی لکھتے ہیں۔'' سمجھداری سے بتایا گیا۔

''اوہ!'' فارس کے لب گول ہوئے۔ ''سوری مجھے نہیں پتا تھا۔''

''اٹس اوکے۔'' شان بے نیازی سے کہتے اس نے ایک بار پھر اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ وہ چاہ رہی تھی فارس اسے اندر آنے دے۔ تاکہ وہ اس کا وسیع و عریض کمرہ دیکھ سکے۔ مگر وہ دیوار بنا کھڑا تھا۔ سارا انٹرویو یہیں دروازے پر کھڑے کھڑے لینا چاہتا تھا۔

تنگ آ کر اس نے بیگ قدموں میں رکھا، بیٹھ کر کھولا، پھر اس کے اندر سے ٹوٹے پھوٹے طریقے سے پیک کیا ہوا پیکٹ نکالا۔ اٹھ کر اسے پھر فارس کی طرف بڑھایا۔

''اب یہ کیا ہے؟''

''گفٹ ہے۔''

''گفٹ؟'' ناسمجھی کے عالم میں اس نے پیکٹ لے کر کھولا۔ تین چاکلیٹ بار، رنگ برنگی کینڈیز، چیونگم۔ چپس کے پیکٹ۔ چلی ملی اور جانے کیا کچھ ظاہر ہو گیا۔ بڑے کھلے دل کی مالک تھی ڈاکٹر مصطفیٰ کی نواسی۔ جس عمر میں بچے اپنا بخار کسی کو نہ دیں۔ وہ چاکلیٹ کینڈیز دیتی پھر رہی تھی۔ وہ خاصا متاثر ہوا۔

''کیا تم مجھے اندر نہیں آنے دو گے؟'' اکتا کر اس نے پوچھا تو فارس نے دروازہ وا کرتے ہوئے اسے اندر آنے دیا۔

بیگ اتار کر فرش پر رکھتی وہ تجسس اور ایکسائٹمنٹ کے ساتھ اندر آ گئی۔ گھوم کر چاروں طرف دیکھا۔ کتنا بڑا اور کتنا پیارا کمرہ تھا اس کھڑوس کا۔

مدحت سامنے ہی کارپٹ پر بیٹھی شرٹ پر بٹن لگا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مسکرائی۔

''ارے یہ ننھی پری کہاں سے آئی؟''

جنت کے گال لال ٹماٹر ہوئے۔ وہ بتانا چاہتی تھی پریاں تو ہمیشہ اڑ کر آتی ہیں مگر وہ چل کر آئی تھی۔ بڑے ادب سے وہ اس کے پاس گئی۔ سلام کیا۔ چند لمحوں کے لیے ٹک کر بیٹھی رہی۔ آخر یہ بھی تو بتانا مقصود تھا کہ وہ مہذب مہمان ہے۔ تاکہ اس کے آنے جانے پر ہرگز پابندی نہ لگے۔

ایک نظر نانا کے دوست کو دیکھا جو سامنے رائٹنگ ٹیبل کی آرام دہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ اور اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

کیا اب اس کی مہمان نوازی نہیں ہوگی؟ اس نے آنکھیں مٹکا کر یہاں وہاں دیکھا۔ ایک جگہ ٹک کر بیٹھنا کتنا مشکل کام تھا۔ یہ کوئی ننھی پری سے پوچھتا۔

''مجھے مینگو جوس پسند ہے۔'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے فارس کو بتایا۔

سوئی سے ٹانکا لگاتی مدحت ہنس دی۔ فارس نے سر اٹھا کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ مدحت نے اشارہ کیا تو وہ بیٹھے بیٹھے اس کی دائیں طرف جھکا۔

''ان ڈائریکٹلی وہ تم سے کہہ رہی ہے میری مہمان نوازی کرو۔'' مدحت نے دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ سرگوشی میں بتایا تو اس کی بھنویں سکڑ گئیں۔

''کیا سب ہی بچے ایسے ہوتے ہیں؟''

''کیسے؟'' مدحت نے بھی اس کا انداز اپنایا۔

''جیسی یہ ہے۔''

''یہ کیسی ہے؟'' مدحت کی آنکھوں میں شرارت چمکی۔

''اتنی فرینڈلی کیوں ہو رہی ہے مجھ سے؟'' اس نے الٹا سوال کیا۔

''ہو سکتا ہے، وہ تم سے دوستی کرنا چاہتی ہو۔''

فارس کی آنکھوں میں حیرت اتری۔ ''مجھ سے دوستی؟''

ان کی کھسر پھسر کے دوران کب جنت کمال اٹھ کر ریک تک گئی۔ کب اس نے گلابی رنگ کا جرنل کلرنگ بک سمجھ کر باہر نکالا، اور کب اس پر کتابیں گریں کچھ پتا نہ چلا۔ یہ تو جب وہ سر پکڑ کر ہلکا سا چیخی تو فارس کو ہوش آیا۔ اٹھ کر تیزی سے اس کی طرف بھاگا۔

''یہ کیا کر دیا۔'' وہ غصہ دکھانا بھی چاہتا تھا، اور ڈاکٹر مصطفیٰ کی وجہ سے دکھا بھی نہیں پا رہا تھا۔

''یہ خود ہی گر گئیں۔'' وضاحتی انداز بھی کمال کا تھا۔

''خود سے کیسے گر گئیں؟'' وہ بھڑکا۔

''میں نے تو یہ پنک والا نکالا تھا۔'' یعنی گلابی جرنل نکالنے پر جو باقی ساری کتابیں گریں، وہ اپنی مرضی اور اپنے شوق سے گریں۔ جنت کمال کا کوئی عمل دخل نہیں۔

''آرام سے وہاں جا کر بیٹھو۔'' اس نے جرنل لے کر سامنے فلور کشن کی طرف اشارہ کیا۔ اور وہ واقعی میں وہاں جا کر بیٹھ گئی۔ ساری کتابیں سمیٹ کر مڑا، تو وہ فلور کشن پر گھٹنوں کے بل کھڑی میز پر رکھے گاڑیوں اور گھوڑوں کے مجسموں کو چھیڑ رہی تھی۔

''ہاتھ مت لگاؤ اسے۔'' فوراً سے لپک کر جنت کمال کو وہاں سے دور ہٹایا گیا۔ وہ بڑا حیران ہوئی۔ کہ ہاتھ لگانے سے کیا ہو گا؟

اب وہ گلاس الماری کے ساتھ لگی کھڑی تھی اور اس میں نفاست سے رکھی ٹرافیز کو دیکھ رہی تھی۔ نانا ٹھیک کہتے تھے۔ اس کے پاس کتنی اچھی چیزیں تھیں۔ بہت مختلف۔ حیران کن۔ اور خوب صورت۔ اسے لگا اس کمرے میں دنیا کی ہر شئے موجود ہے۔

کرسی پر چڑھ کر کھڑکی سے باہر شیرازی مینشن کو دیکھتے اس کی معصوم آنکھیں پھیلیں۔

''کتنا بڑا گھر ہے تمھارا۔''

مدحت نے بے ساختہ فارس کو دیکھا۔ وہ بے دھیانی میں اس کے دیئے گئے پھولوں کو گلدان میں رکھتا جا رہا تھا۔ اس نے کچھ سنا یا نہیں۔ مگر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔

''کیا یہ تمھاری مما ہیں۔'' اب وہ مدحت کے بارے میں اس سے پوچھ رہی تھی۔

''میں اس کے لیے کچھ لے کر آتی ہوں۔'' اس سے پہلے کہ جنت کے سوال کوئی بدمزگی پیدا کریں مدحت اس کی شرٹ رکھ کر اٹھ گئی۔

''آپ اسے بھی ساتھ ہی لے جائیں۔'' وہ کافی سے زیادہ جھنجھلایا ہوا لگ رہا تھا۔ مدحت ہنس دی۔ ''لے جاتی۔ اگر وہ میری مہمان ہوتی تب۔''

مدحت چلی گئی تو وہ بھنویں سکیڑے جنت کی طرف مڑا۔ وہ سر اٹھائے اس بات کا جائزہ لے رہی تھی کہ اس کے نانا کا دوست کتنا لمبا تھا۔ اور وہ اس سے قد میں کتنی چھوٹی تھی۔

''کیا تمھارے پاس کلرز نہیں ہیں؟'' کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''کلرنگ بکس؟''

''نہیں۔''

''کھلونے بھی نہیں ہیں؟'' وہ بہت مایوس نظر آئی۔

وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اس پر جھکا۔ ''میں لڑکا ہوں، میں ڈولز سے نہیں کھیلتا۔''

''میں بھی ڈولز سے نہیں کھیلتی، مجھے کاریں اچھی لگتی ہیں۔ میرے پاس ایک بہت بڑی ٹویٹی بھی ہے۔ اور ٹام بھی ہے میرے پاس۔ جیری والا۔ تمھارے پاس نہیں ہے؟''

گہرا سانس لیتا وہ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ پتا نہیں مدحت اتنی دیر کیوں لگا رہی تھی۔ ایک گلاس مینگو جوس اور کیک۔ اس میں کون سا سال لگ جانے تھے؟

''نہیں! میرے پاس ایسا کچھ نہیں ہے۔''

''اوہ!۔'' ننھی پری کو افسوس ہوا۔ ''تو میں ٹام تمھیں دے دوں گی۔''

''مجھے ٹام نہیں چاہیے۔'' اس نے تحمل سے سمجھایا۔

''جیری تو میرے پاس ہے ہی نہیں۔''

''مجھے جیری بھی نہیں چاہیے۔'' وہ جھنجھلایا۔

''تو کیا چاہیے؟''

''کچھ نہیں چاہیے مجھے۔ میں کھلونوں سے نہیں کھیلتا اب۔''

اگلے چند لمحوں تک وہ پلکیں جھپکائے بنا اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ پھر اس نے عقب میں اشارہ کیا۔

''تو میں پھر تمھاری وہ کار لے لوں۔ جو وہاں رکھی ہے۔ ریڈ کلر والی۔'' فارس نے مڑ کر سرخ رنگ کی اس ننھی ماڈل کار کو دیکھا جس میں اس کی جان اٹکی تھی۔ اور یہ کوئی کھلونا کار نہیں تھی۔

''نہیں، ہرگز نہیں۔''

''اوکے۔'' اس کے کندھے جھک گئے۔ نانا کا دوست۔ نانا جیسا نہیں تھا۔

''تم یہاں آرام سے بیٹھو۔'' بازو سے پکڑ کر اسے ایک بار پھر فلور کشن پر بٹھایا گیا۔ ''یہاں سے ہلنا نہیں ہے، اور کسی چیز کو مت چھیڑنا! میں ابھی آتا ہوں۔''

''اوکے۔'' اس نے حامی بھر لی۔ لیکن عمل نہیں کیا۔ کچھ ہی دیر بعد ٹرے ہاتھوں میں لیے وہ اندر آیا تو وہ کھڑکی کی چوکھٹ پر چڑھی دیوار پر لگا کوئی اسٹیکر اتار رہی تھی۔

''میں نے منع کیا تھا تمھیں۔'' ٹرے کارپٹ پر رکھتا وہ ایک بار پھر اس کے سر پر تھا۔

''بس تھوڑا سا رہ گیا ہے، ابھی اتر جائے گا۔'' وہ سنی ان سنی کرتا اسے بازوؤں سے پکڑ کر زبردستی نیچے اتار چکا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ مینگو جوس ہاتھوں میں تھا۔ ایک گھونٹ بھرتی تھی، دس باتیں کرتی تھی، پھر تھوڑا سا کیک کترتی

تھی، اس کے بعد پھر باتیں کرتی تھی۔

اس کے سامنے آلتی پالتی مارے وہ صبر کی کڑی آزمائش سے گزر رہا تھا۔

''باتیں بعد میں کرنا۔ پہلے اسے ختم کرو۔'' وہ اس مصیبت کو جلد از جلد ڈاکٹر مصطفیٰ کے پاس چھوڑ آنا چاہتا تھا۔

''بابا کہتے ہیں، آرام سے کھانا چاہیے۔'' وہ الٹا اسے سمجھانے لگ گئی۔ اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتا وہ کارپٹ پر ڈھے گیا۔ گویا ہار مان لی کہ بھلے سے دو تین گھنٹوں میں ختم کرو لیکن خاموشی سے کرو مگر نہیں۔

اس نے کسی مریم عرف مونی کے پھسل کر گرنے سے لے کر کسی کاکا کی سائیکل ٹوٹنے اور کسی نیلو آپا کی مرغی چوری ہونے تک کے تمام واقعات سنا دیے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ جب سیاہ رنگ کی اتنی بڑی بڑی گاڑیاں اس کے گھر میں آتی ہیں تو وہ سڑک پر کھڑے ہو کر ہاتھ بھی ہلاتی ہے۔ ایک بار کسی صاحب نے گاڑی کا شیشہ نیچے کر کے اسے ٹافی بھی دی تھی۔

اور ایک وہ کوئی علیزے شیرازی۔ وہ مہینہ بھر اس کے اتنے سارے بڑے گھر میں رہ کر گئی تھی۔ اور یہاں وہاں ہر وقت گھومتی رہتی تھی۔ بستی سے گاؤں، کھیتوں اور بازار میں بھی۔ اور اس کے گلے میں ایک کیمرہ تھا۔ وہ ہر کسی کی تصویریں کھینچتی رہتی تھی اور اسے تو وہ ذرا سا بھی اچھی نہیں لگی تھی۔ چیونٹی جتنی بھی نہیں!

کسی علیزے شیرازی کا ذکر کرتے اس نے منہ کے زاویے کئی بار بگاڑے۔ وہ کیسے چلتی تھی، اور کیسے بولتی تھی، اور کیسے دیکھتی تھی۔ اور کیسے وہ ایک بار ڈھلوان راستے سے اترتے پھسل گئی تھی۔ اور پھر اس نے، اور مونی، کاکا اور شاکا وغیرہ سب نے وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اور انہیں کتنا مزا آیا تھا۔ اور وہ کتنا خوش ہوئے تھے۔

فارس اپنا سر پکڑے بیٹھا تھا۔

اور ایک بار ایک لمبا سا کوئی لڑکا بھی آیا تھا۔ وہ فارس سے بھی لمبا تھا۔ اور جب وہ آیا تھا تو اس کے آگے پیچھے بہت سی کاریں تھیں۔ اور پھر اس کے اتنے بڑے گھر میں رات کو روشنیاں ہی روشنیاں تھیں اور دعوت پر اس کے بابا بھی گئے تھے۔ اور۔ اور۔

نہ باتیں ختم ہو رہی تھیں، نہ جوس اور کیک۔

''یہ میں پی لوں؟'' تنگ آ کر اس نے پوچھا۔

اور جنت تو تھی ہی کھلے دل والی۔ جھٹ سے گلاس آگے کر دیا۔ ایک ہی سانس میں گلاس خالی کرتا، کیک کے ٹکڑے منہ میں ڈالتا، اسے بازو سے پکڑ کر اٹھاتا، دوسرے ہاتھ میں اس کا بیگ لیتا کچھ ہی دیر میں وہ باہر تھا۔

''چلو، تمھارے گھر چلیں۔''

جنت جو اپنے آدھے جوس اور پورے کیک کے غم سے ابھی باہر نہیں نکلی تھی۔ اس بات پر کھل اٹھی۔

''ہاں ہاں چلو۔'' وہ بڑی خوشی سے بھاگی۔ حالانکہ فارس کا کمرہ اسے بہت اچھے سے دیکھنا تھا۔ کہ ایسی رنگ برنگی منفرد چیزیں بھی کیا روز دیکھنے کو ملتی ہیں۔ (چلو پھر کبھی سہی!)

اپنے بازو پھیلائے وہ چڑیا کی طرح چہکتی سرسبز باغ کے راستے، گھاس کے اندر سے بھاگتی جارہی تھی۔ اور اس کا ٹوٹی بیگ ہاتھ میں لیے ذرا سی خفگی کے ساتھ فارس وجدان اس کے پیچھے تھا۔

جس طرح وہ بھاگ رہی تھی۔ بازو پھیلا کر گول گول گھومتی ہوئی۔ تو اسے لگا وہ گرے گی۔ اور وہی ہوا۔ کسی پتھر سے اٹک کر وہ اس قدر مزاحیہ انداز میں اچھل کر گری کہ اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔

مدحت جو اس کا اونی مفلر اور لانگ کوٹ ہاتھ میں لیے اس کے پیچھے آئی تھی ٹھٹھک کر رک گئی۔

فارس ہنس رہا تھا؟ وہ ساکت سی اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔ اس نے فارس وجدان کو اس طرح ہنستے ہوئے پہلی بار دیکھا تھا۔ پہلی بار۔

جنت نے اسے ہنستے دیکھا تو سر نیچے کیے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''اوہ آئم سوسوری۔'' اسے یکا یک احساس ہوا تو بمشکل ہنسی ضبط کرتا تیزی سے اس کے پاس آیا۔ بازو سے پکڑ کر اسے اٹھانا چاہا تو بدک کر اپنا بازو چھڑاتی وہ اور زور سے رونے لگی۔

''کیا بہت زور سے چوٹ آئی ہے؟'' ہنسی ضبط کر کے بہت مشکل سے پوچھا۔

دونوں ہاتھ پاؤں پر رکھے وہ چلائی۔ ''تم مجھ پر ہنسے۔'' اصل غم یہ تھا۔ ''تم......تم مجھ پہ ہنسے۔''

''میں تم پر نہیں ہنسا......وہ...... اصل میں......'' بار بار وہ منظر آنکھوں میں آرہا تھا۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آئے جارہی تھی۔

شہد رنگ آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسو لیے وہ یوں روئی تھی جیسے اس پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے ہوں۔

''اچھا آئم سوری۔ مجھے ہنسنا نہیں چاہیے تھا'' اس نے فوراً ہی غلطی کا اعتراف کرلیا۔

''مگر تم......تم ہنسے۔ میں بابا کو بتاؤں گی، تم ہنسے۔''

فارس اس افتاد پر بری طرح سے گھبرا گیا۔

''میں سوری کر تو رہا ہوں۔''

وہ نفی میں سر ہلاتی گئی۔ یعنی سوری سے کام نہیں چلے گا۔

کچھ سوچ کر فارس نے جیب سے والٹ نکالا، چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے اس کی دیوانگی تو وہ اپنے کمرے میں دیکھ ہی چکا

تھا۔ والٹ کے ساتھ لٹکتی دو تلواروں میں سے ایک تلوار اس نے الگ کر کے جنت کی طرف بڑھائی۔

وہ جو بڑی دل جمعی سے رونے کا شغل فرما رہی تھی، رک گئی۔ آنکھوں میں ڈھیر ساری نمی لیے گھٹنے سے ہاتھ ہٹا کر ذرا آگے ہوئی۔ سارے درد بھلائے اس ننھی سی تلوار کو بغور دیکھنے لگی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر اٹھا لیا۔

''یہ اب میری ہے؟''

''ہاں!''

''پکا میری ہے؟''

''پکا تمھاری ہے۔''

''تم کاکا کی طرح واپس تو نہیں لوگے؟''

''نہیں، میں کاکا کی طرح واپس نہیں لوں گا۔''

''پکا نہیں لوگے؟''

''پکا نہیں لوں گا۔''

''اور اگر لیا تو؟''

''نہیں لوں گا بھئی۔'' اس نے تحمل سے کہا۔ ورنہ جی چاہ رہا تھا، اپنے بال نوچ لے۔

اور وہ اٹھ گئی۔ تلوار کو مٹھی میں دبائے۔ آنکھوں میں ڈھیر سارا اشتیاق لیے۔

''تمہیں چوٹ تو نہیں آئی۔'' اس نے پوچھا۔

''نہیں تو۔'' وہ آنکھیں رگڑ کر صاف کرتے ہوئے بولی۔

''اور یہ اتنا رونا دھونا صرف اس لیے تھا کہ وہ ہنسا؟'' کڑھ کر اس کا ہاتھ تھامے وہ اسے سڑک کی طرف لے آیا۔ کنارے پر آہستگی سے قدم اٹھاتے وہ بس ذرا سا ہی آگے چلے تھے کہ سڑک کے اس پار بچوں کا ایک ٹولہ گزر رہا تھا۔ جنت کو دیکھتے ہی ہاتھ ہلاتے شور مچانے لگے۔

''ٹیپو، کاکا، مونی۔ میرے فرینڈز۔'' اپنا ہاتھ چھڑا کر زور سے چلاتے اس نے فارس کو بتایا۔

''گھر چلو۔'' وہ اسے بازو سے پکڑے کھینچتے ہوئے ساتھ لے جانے لگا۔ اور وہ وہیں سے چلاتی اپنے دوستوں کو جانے کیا کچھ بتاتی رہی۔

وہ گھر پہنچے تو ڈاکٹر مصطفیٰ لان میں پریشان کھڑے تھے، سلیم اسے یہاں وہاں تلاش کرنے کے بعد تھکا ہارا ابھی لوٹا تھا، انہیں

دیکھتے ہی چلا اٹھا۔ ''ڈاکٹر صاب! یہ رہی جنت۔''

''یہ کہاں تھی؟'' وہ حیران ہوئے تھے۔

''کہاں ہو سکتی تھی؟'' فارس نے بھنویں سکیڑیں۔

ان کا منہ حیرت سے کھلا، وہ تن تنہا شیرازی مینشن پہنچ گئی تھی؟ گو کہ باغ کا راستہ محفوظ تھا اور شیرازی مینشن بھی کچھ زیادہ دوری پر نہیں تھا مگر پھر بھی جنت کا یہ کارنامہ انہیں حیران اور فکرمند کر گیا تھا۔

''میں نے آپ سے پوچھا تو تھا۔'' ڈاکٹر مصطفیٰ اس پر خفا ہوئے تو وہ بتانے لگی۔

''میں نے کہا تھا، ہاں جائیں گے، یہ نہیں کہا تھا آپ اکیلی چلی جائیں۔''

''میں بالکل خاموشی سے گئی تھی، آرام آرام سے۔ روڈ پر تو بالکل نہیں گئی۔ باغ سے گئی تھی بابا۔ وہ جو بہت لمبے انکل ہیں نا۔ جن کی اتنی بڑی بڑی مونچھیں ہیں۔ وہ جو دروازے پر کھڑے ہوتے ہیں ہر وقت۔'' وہ چاہ رہی تھی، ڈاکٹر مصطفیٰ تائید میں سر ہلائیں تاکہ وہ بات آگے بڑھائے۔ مگر وہ پیشانی مسلے جا رہے تھے۔ ''ہاں! ہاں۔''

''وہ بہت اچھے ہیں۔ میں نے ان سے کہا۔ میں ڈاکٹر مصطفیٰ کی بیٹی ہوں۔ انہوں نے مجھے اندر جانے دیا۔ میں نے تین بار دروازہ ناک کیا تھا۔ تین بار بابا۔'' بڑی سمجھداری سے ہاتھ ہلا ہلا کر وضاحتیں دیتی وہ انتہا کی معصوم اور کیوٹ لگی۔

''تمہیں تنگ تو نہیں کیا اس نے۔'' ڈاکٹر مصطفیٰ نے پھر اس سے پوچھا۔

وہ کہنا چاہتا تھا 'ہاں بہت' مگر چونکہ وہ ڈاکٹر مصطفیٰ کی نواسی تھی سو از راہ مروت نفی میں سر ہلا دیا۔

''شکر ہے۔'' وہ اسے بازو سے پکڑے اندر لے آئے۔ ''شام کا کھانا ہمارے ساتھ! اب یہاں سکون سے بیٹھو۔'' انہوں نے فیصلہ سنا دیا۔ مگر مجال ہے جو ان کی نواسی نے ایک گھڑی بھی اسے سکون سے بیٹھنے دیا ہو۔

وہ دھپ دھپ سیڑھیاں چڑھتی اوپر جاتی تھی، اور جتنے کھلونے بازوؤں میں سما سکتے تھے انہیں لا کر کراس کے سامنے ڈھیر کر دیتی تھی۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی مہمان نوازی ایسی ہوتی ہے۔ چیزیں ایسے دکھائی جاتی ہیں۔ وہ ڈاکٹر مصطفیٰ کو بے بسی سے دیکھتا تو وہ ہنس دیتے۔

''آپ تو بہت انجوائے کر رہے ہیں۔''

''ہاں بہت۔'' وہ اس کے تاثرات سے کافی محظوظ ہوتے تھے۔ کبھی الجھتا، کبھی اکتاہٹ کا مظاہرہ کرتا۔ اور کبھی جنت کی کسی بات پر ہوں ہاں میں سر ہلاتا وہ انہیں اچھا لگ رہا تھا۔ وہ زیر لب مسکراتے اسے دیکھے جا رہے تھے۔

رنگ بھرنے والی کتابیں، کہانیاں، اسٹیکرز اور جانے کیا کیا وہ اسے اٹھا اٹھا کر دکھا رہی تھی۔ سلیم گزرتے ہوئے ٹھنڈی آہیں

بھرتا کہ پھر سارا بکھیڑا اسے ہی تو سمیٹنا تھا۔

صابرہ بوا کو کھانے کی ہدایات دیتے ڈاکٹر مصطفیٰ ضروری کال اٹینڈ کرتے اوپر چلے گئے۔ واپس آئے تو سلیم سمیت فارس وجدان بھی بلاکس جوڑ جوڑ کر جنت کے لیے ڈول ہاؤس کی تیاری میں نظر آئے۔ مینول پیج کھول کر اندازہ لگاتے۔ ایک دیوار کو دوسری دیوار سے جوڑتے۔ اور جنت کو حتی الامکان عمارت کی بنیاد سے دور رکھنے کی کوشش کرتے وہ کسی محاذ کا حصہ لگے۔

''مجھے بھی ہیلپ کرنی ہے۔'' وہ شور مچا رہی تھی۔

''تم توڑ دو گی۔'' دونوں نے اسے گھور کر پرے ہٹایا تھا۔

''یہ میرا ہاؤس ہے۔'' کمر پر ہاتھ ٹکائے جتانے لگی۔ کوئی رسپانس نہ ملا تو گھوم کر دوسری طرف آئی۔ ''یہ سب میرے بلاکس ہیں! یہ میرے بابا کا گھر ہے۔''

اس کی سنی ان سنی کیے وہ دونوں بڑی یکسوئی سے جتے رہے۔

''میں بول رہی ہوں۔'' دوبارہ شور مچایا۔ ''میں بابا کو تمہاری شکایت لگاؤں گی۔'' اس نے فارس کو دھمکایا۔

''یہ شروع سے ایسی ہے؟'' اکتا کر اس نے سلیم سے پوچھا۔ اس کا خیال تھا وہ ڈاکٹر مصطفیٰ کے لاڈ پیار سے ہی بگڑ گئی ہو گی۔

''نہ کرو جی۔ ان کی تو آواز بھی نہیں نکلتی تھی۔ اب تو۔'' سلیم نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگایا۔ پھر ہنسا۔ ''رونق لگی رہتی ہے جی۔ ڈاکٹر صاب تو بڑا بور کرتے ہیں۔ ہی ہی۔''

خوب صورت ڈول ہاؤس کی تعمیر شام کے چھ بجے تک مکمل ہوئی تو اسے اٹھا کر اوپر اس کے کمرے میں رکھنے گئے۔ اور ایک بار پھر جنت نے اسے اپنی ایک ایک چیز دکھائی۔ اور اس بار فارس وجدان کے انداز میں جھلاہٹ نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے سن رہا تھا، اور اس کی دی گئی اشیا کو کھول کر دیکھ بھی رہا تھا۔ انداز میں اب کے تجسس نہیں تھا، مگر اکتاہٹ بھی نہیں رہی تھی۔

شام کا کھانا کھانے کے بعد وہ آتش دان کے سامنے لاؤنج میں بیٹھ گئے تھے۔ ڈبل صوفے پر لحاف میں دبکی، اپنے نانا کے سینے سے لپٹی جنت کمال تو وہیں سو گئی تھی مگر وہ رات گئے تک باتیں کرتے جاگتے رہے تھے۔

☆☆☆

وہ صبح کے سات بجے گھر سے نکلتا تھا اور باغ کے راستے ٹہلتا ہوا بہت دور نکل جاتا تھا۔ یہ اس کی روزمرہ کی روٹین تھی۔ ابتدائی کچھ دنوں تک تو جنت اسے کھڑکی سے ہی جاتا دیکھتی رہی تھی۔ چوتھے دن وہ اپنے نانا کی اجازت سے مین گیٹ پر موجود تھی۔ اور پھر جیسے یہ روز کا معمول بن گیا تھا۔

وہ صبح سویرے جیسے ہی اسے باغ کے راستے نظر آتا تھا، وہ اپنا وہی ٹوئیٹی بیگ پہنے بھاگی چلی آتی تھی۔

کبھی وہ اکیلی ہوتی، کبھی راستے میں اس کے نمونے دوست بھی ساتھ ہوتے۔ ٹیپو، مونی کا کا، شاکا۔ ایک تو نام انوکھے، اوپر سے حرکتیں بھی عجیب سی تھیں۔ بھاگ بھاگ کر درختوں پر چڑھتے، شاخوں سے لٹکتے۔ اور مریم عرف مونی تو سارا وقت بڑی اماؤں کی طرح اپنے سر پر دوپٹہ ہی جماتی رہتی۔ جنت ان کی لیڈر تھی۔ چیختے ہوئے جس رخ اشارہ کرتی، وہ سب ہی اسی طرف دوڑ پڑتے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں، اور فضول سے لطیفے ان کے لیے اتنے مضحکہ خیز ہوتے کہ وہ ہنس ہنس کے گھاس پر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ اور وہ حیرت سے انہیں دیکھتے ہوئے سوچتا رہ جاتا، ہنسنے والی بات کیا تھی؟

کبھی کسی شرارت پر بستی کے لوگ ڈانٹنے کو لپکتے تو وہ سارے اسے ڈھال بناتے پیچھے چھپ جاتے۔ اور لوگ اسے اعظم شیرازی کا کوئی غیر ملکی مہمان سمجھ کر لحاظ کر جاتے۔ ان کے جانے کے بعد جو جھڑکیاں وہ انہیں پلاتا، اگلے پانچ منٹ تک تو کسی کی آواز بھی نہ نکلتی۔ اس کے بعد وہی بھاگ دوڑ، شور شرابا۔

اور وہ انہیں کبھی الجھن۔ اور کبھی اکتاہٹ سے دیکھ کر رہ جاتا۔ اتنے شور اور ہلے گلے کا وہ عادی نہیں تھا۔ مگر مسئلہ صرف عادت کا نہیں تھا۔ انہیں ہنستا مسکراتا دیکھ کر اسے عجیب وحشت ہوتی تھی۔

وہ ان کی سنگت میں سات سالہ فارس ہو جایا کرتا تھا۔ ان کی ننھی ننھی خوشیوں اور قہقہوں سے الجھنے لگتا تھا۔ ساری محرومیاں، تلخیاں ایک ساتھ یاد آتیں تو اس کے احساسات عجیب ہو جاتے۔ اور موازنہ شروع ہو جاتا۔

کتنے خوش قسمت تھے یہ بچے۔ ہر غم، پریشانی اور خوف سے مبرا۔ رشتوں میں گھرے، محبتوں سے جڑے۔ انہیں حق تھا اس طرح قہقہہ لگا کر ہنسنے کا۔ اس طرح مسکرانے اور ڈھیر ساری شرارتیں کرنے کا۔ نہ کسی کے باپ نے اسے چھوڑا تھا، نہ کسی کی ماں نے اسے ٹھکرایا تھا۔

وہ دنیا کے خوش قسمت ترین بچے تھے جو اپنا بچپن ویسا ہی جی رہے تھے جیسا انہیں جینا چاہیے تھا۔ ان کے کندھوں پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ اور ذہنوں میں کوئی سوال نہیں تھے۔ وہ شفاف تھے۔ ان پر ان کے والدین کوئی دھند نہیں جمنے دے رہے تھے۔ اور ایک وہ تھا۔ جسے اس کے اپنے والدین نے محبت سے لکھ کر نفرت سے مٹا دیا تھا۔

اس دن وہ واپس آیا تو کافی سے زیادہ اداس تھا، سارا دن وہ ڈاکٹر مصطفیٰ کے گھر رہا، سلیم اور جنت اس سے بات چیت کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر وہ چپ رہا۔ ڈاکٹر مصطفیٰ آئے تو اس کا رویہ محسوس کر گئے۔ کھانے کے بعد کچھ دیر تک سوال جواب کرتے رہے مگر وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔

اب وہ انہیں یہ بتائے کہ وہ ان کی سات سالہ نواسی اور اس کے دوستوں سے جیلس ہو رہا ہے؟ اس لیے کہ وہ اتنا ہنستے اور مسکراتے ہیں؟

وہ چھوٹے بچوں کا ذکر کر کے ان کے سامنے چھوٹا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ بے سکونی کا سامنا کر کے اس بار خالی نہیں ہونا چاہتا تھا۔ سارے غم، الجھنیں اور محرومیاں سمیٹے وہ گھر چلا گیا۔ اس دن پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اس نے ڈاکٹر مصطفیٰ سے اپنی بات شیئر نہیں کی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن وہ باغ میں گیا تو بچوں نے اسے ایک بار پھر گھیر لیا۔ تنگ آ کر اس نے کسی تنہا ویران گوشے میں اوجھل ہو جانے کی کوشش کی، خیال تھا جب وہ انہیں نہیں ملے گا تو وہ اپنے کھیل میں مگن ہو کر اس کا پیچھا چھوڑ دیں گے مگر وہ بچے بھی گویا بوتل کا جن تھے۔ دائیں بائیں آگے پیچھے سے چیختے ہوئے یوں نمودار ہوئے جیسے وہ ان کے ساتھ چھپن چھپائی کھیل رہا تھا۔ یعنی کہ حد ہے!

تپ کر، جھڑک کر، اور انہیں اچھا خاصا ڈانٹ کر وہ گھر چلا گیا۔ اگلے دو دن اس نے باغ کا رخ نہیں کیا۔ تیسرے دن پوری فوج اس کے دروازے پر تھی۔

''کا کا نے مچھلیاں پکڑی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی سی ہیں۔ تم دیکھو گے؟''

اور کا کا کی تو شان ہی الگ تھی۔ اسٹیل کے ایک برتن کو فوراً ہی آگے کر دیا۔ اس نے سرسری سی نگاہ دوڑائی۔

''یہ ٹیڈپول ہیں۔'' بمشکل ضبط کر کے کہا۔

''ہاں ہمیں پتا ہے۔ یہ مچھلیاں ہیں۔'' یہ جنت تھی۔

''یہ مچھلیاں نہیں ہیں۔'' اس نے تحمل سے کہا۔ ''یہ بڑے ہو کر مینڈک بنیں گے۔''

''نہیں! یہ بڑے ہو کر بڑی مچھلی بنیں گے۔'' جنت ڈٹ گئی۔ اس نے ہار مان لی۔ ان کی مچھلیاں۔ ان کی مرضی۔ بڑے ہو کر ڈاکٹر، انجینئر، مینڈک، زرافہ، ہاتھی، شارک کچھ بھی بنائیں۔ اس کی بلا سے۔

''ٹیپو کو بلی کا بچہ ملا ہے، بلیک کلر کا ہے، اتنا کیوٹ ہے وہ، ٹیپو گھر سے لائے گا تو ہم سب اس کے ساتھ کھیلیں گے۔'' ایک اور اطلاع بہم پہنچائی گئی۔ اور بڑے ہی رازدارانہ انداز میں پہنچائی گئی۔ چونکہ جنت کی بلی سلیم کو دے دی گئی تھی سو وہ بہت محتاط ہو کر بات کر رہی تھی تا کہ اس کے نانا کو بالکل پتا نہ چلے کہ ایک اور بلی کا انتظام ہو چکا ہے۔

وہ بیزار سا انہیں خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔

وسیع وعریض سبزہ زار پر اعظم شیرازی باہر بیٹھے تھے۔ لان چیئر کا رخ اسی طرف تھا۔ بظاہر وہ کافی پیتے ہوئے آغا علی کی بات سن رہے تھے مگر وہ دیکھ اسے ہی رہے تھے۔

فارس کی ان پر نظر پڑی تو آنکھوں میں یکا یک سختی اتر آئی۔ رخ بدل کر اپنے کمرے میں گیا۔ کوٹ اور اسنیکرز پہن کر باہر آیا

تو ایک واویلا سا مچا ہوا تھا۔ کا کا سے بھاگتے ہوئے برتن گر گیا تھا۔ ان کی ''ٹیڈ پول'' جنہوں نے بڑے ہو کر ''مچھلیاں'' بننا تھا، وہ گھاس میں کہیں گم ہو گئے تھے۔ اور وہ سب کے سب انہیں ڈھونڈ رہے تھے۔

''پانی کے بغیر تو وہ مر گئی ہوں گی۔'' یہ خیال جنت اور اس کی جینئس فوج کو پورے دس منٹ کی تلاش بسیار کے بعد آیا تھا۔

''کوئی بات نہیں! میں ابا کے ساتھ دوبارہ جاؤں گا تو بہت ساری ڈھونڈ لاؤں گا۔'' کا کا نے تسلی دی۔

فارس انہیں ساتھ لیے باغ کی طرف چلا گیا۔

بچے اس کے ساتھ بہت خوش تھے اور یہ خوشی دونوں فریقین کے لیے بس وقتی ہی تھی کہ جب ٹیپو اپنی بلی کے ساتھ باغ میں نمودار ہوا تو اسے تب سمجھ میں آیا پوری فوج اسے لینے کیوں آئی تھی۔

''وہیں رکو۔ میں کہہ رہا ہوں، وہیں رکو۔'' وہ قدرے فاصلے پر کھڑا ہاتھ کے اشارے سے کہہ رہا تھا اور جنت بلی اٹھائے اس کے پاس آ رہی تھی۔

''بہت پیاری ہے، بالکل بھی نہیں کاٹتی۔ تم ہاتھ لگاؤ۔''

اس کا خیال تھا۔ فارس کو بلیاں اچھی نہیں لگتی تھیں تب ہی نانا نے اس کی بلی کو در بدر کر دیا تھا مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ تھا۔ اس کے نانا کے دوست کے چہرے پر ناپسندیدگی کم اور خوف زیادہ تھا۔ حالانکہ وہ تو امن کی علم بردار بن کر آئی تھی تا کہ فارس اور بلیوں کے درمیان کوئی مفاہمت کروا سکے مگر۔

''ڈرو نہیں۔ یہ بہت اچھی ہوتی ہیں، کچھ نہیں کہتیں۔'' وہ پیار اور منت بھرے لہجے میں سمجھا رہی تھی۔ اور وہ ایک ہاتھ سے اسے دور رہنے کا اشارہ کرتا الٹے قدم پیچھے ہٹ رہا تھا۔

''جنت! وہیں رکو۔ آگے مت آؤ۔ میں کہہ رہا ہوں آگے مت آؤ۔''

اور وہ سنی ان سنی کرتی آگے آ رہی تھی۔

''اتنی چھوٹی بلی سے بھی کوئی ڈرتا ہے؟'' خفگی بھرے پیار سے پوچھا۔

''میری طبیعت خراب ہو جائے گی۔ اسے پیچھے کرو۔'' اس نے جھڑکا۔

''نہیں، طبیعت خراب نہیں ہوتی۔ دیکھو، مجھے کچھ ہوا؟'' اس نے بلی کو سینے سے لگا کر بھینچا۔ ''یہ بالکل نہیں کاٹتی۔ بالکل تنگ نہیں کرتی۔ بہت پیار کرتی ہے۔''

''ہاں، یہ بالکل نہیں کاٹتی، بالکل تنگ نہیں کرتی، اور بہت پیاری۔ بہت اچھی ہے۔ لیکن مجھ سے اسے دور رکھو۔'' آخری جملہ اس قدر غصے اور سختی سے اس نے کہا کہ وہ ڈر کر وہیں رک گئی۔ اگلے کئی لمحے لب بھینچ کر اسے دیکھتی رہی۔ پھر شدید غصے کے عالم میں

''کٹی'' کہہ کر اپنے سپاہیوں سمیت مڑ گئی۔

''کٹی؟'' وہ اپنی جگہ ہکا بکا کھڑا تھا۔ بھلا ان کی دوستی کب ہوئی تھی؟ وہ بھنویں سکیڑے اس نمونی کو جاتا دیکھتا رہا۔ جو سر جھکائے بہت غصے سے اپنے گھر جا رہی تھی۔

☆☆☆

''آج جنت نہیں آئی۔'' کھانے کے لوازمات میز پر سجاتی مدحت نے پوچھا تو گلاس میں پانی انڈیلتے اس نے رک کر دیکھا۔

صبح والا واقعہ یاد آیا تو مسکراہٹ داہنے گال کی جانب اٹھ گئی۔

''وہ اب نہیں آئے گی۔ کٹی کر کے گئی ہے۔'' ساتھ ہی اس نے پورا قصہ سنایا تو مدحت ہنس دی۔ ''بہت پیاری بچی ہے، اتنی پیاری باتیں کرتی ہے، حالانکہ شروع میں جب ڈاکٹر مصطفیٰ اسے لائے تھے تو بہت ڈری سہمی سی رہتی تھی۔ بات تو دور کی بات ہے، کسی کے پاس آتی تک نہیں تھی۔''

پلاؤ کا چمچ منہ تک لے جاتے اس کے داہنے ہاتھ کی حرکت تھمی۔ سر اٹھا کر مدحت کو دیکھا۔ ''کیوں؟''

مدحت گلاس میں پانی انڈیل رہی تھی، چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''تمہیں ڈاکٹر مصطفیٰ نے کچھ نہیں بتایا؟''

''کیا نہیں بتایا؟'' فارس نے چمچ رکھ دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بتاتی۔ دروازے پر دستک ہونے لگی۔

''آپ کو آغا علی بلا رہے ہیں۔'' دروازہ پر ملازم لڑکا تھا۔

''تم کھانا کھاؤ۔ میں ابا کی بات سن کر آتی ہوں۔''

مگر وہ نہیں آئی تھی۔ غالباً اس کے ذمے کوئی کام لگا دیا گیا تھا۔ وہ کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر تک لان میں ٹہلتا رہا پھر کچھ سوچ کر ڈاکٹر مصطفیٰ کے گھر چلا گیا۔

دروازہ سلیم نے کھولا تھا۔ اسے اندر داخل ہوتا دیکھ کر جنت وہیں سے چلائی۔

''بابا! فارس آیا ہے۔'' وہ جو اس خیال میں تھا کہ محترمہ اپنی ''کٹی'' نبھائیں گی تو اس پر تپاک استقبال پر گڑبڑا کر رہ گیا۔ وہ ہاتھ سے پکڑ کر اسے اندر لائی۔ جھٹ سے اپنے کھلونے اور بھالو وغیرہ ہٹا کر صوفے پر اس کی جگہ بنائی۔ ''یہاں بیٹھو۔''

میز پر ہمیشہ کی طرح اس نے پھولوں کی پنکھڑیاں الگ کر کے گول دائرہ بنا رکھا تھا۔

مسلی ہوئی پنکھڑیوں کے گرد پتوں کی لہر اور سلامت پھولوں کا گھیرا تھا۔

''کہاں گم ہو لڑکے۔ صبح سے نظر ہی نہیں آئے۔'' ڈاکٹر مصطفیٰ نے پوچھا تو اس نے جنت کی پوری کارستانی انہیں سنا دی اور وہ

کچھ شاک اور حیرت سے اپنی نواسی کو دیکھ کر رہ گئے۔ نواسی جو اپنا غصہ، ناراضی بھلائے اپنی کوئی ڈرائنگ فارس کو دکھا رہی تھی یکا یک خفا ہوگئی۔

’’کٹی۔‘‘

یہ ایک دن میں دوسری بار دوستی ختم ہو رہی تھی۔ بھنویں سکیڑے وہ خفا خفا سی آتش دان کے قریب کونے میں جا بیٹھی۔ چہرے کا رخ دیوار کی طرف تھا تاکہ سلیم، صابرہ بوا، توتے، پرندے، چڑیوں اور چیونٹیوں کو بھی پتا چل جائے وہ کتنی ناراض ہے۔

’’تمہیں نہیں لگتا، اب تمہیں میری نواسی کو منانا چاہیے؟‘‘ ڈاکٹر مصطفیٰ نے پوچھا۔

’’نہیں! وہ ایسے ہی اچھی لگ رہی ہے۔‘‘ اس کی آنکھوں میں شرارت چمکی۔

ڈاکٹر مصطفیٰ نے گھور کر دیکھا۔

’’آپ کی نواسی صبح میری جان لینے والی تھی۔ مت بھولیے۔‘‘ اس نے کہا۔ نگاہیں مسلسل جنت پر تھیں۔ سلیم اس کے پاس جا بیٹھا تھا۔ اب منت سماجت کرتا، اسے کہانیوں کے بہلاوے دے رہا تھا۔

’’اللہ کے لیے بیٹا! شہزادیوں کی کہانی مت سنانے بیٹھ جانا۔ ایسا نہ ہو، رات کو سونے سے پہلے دوبارہ ضد کرے کہ گدے کے نیچے ایک مٹر رکھا جائے تاکہ یہ کنفرم ہو سکے کہ وہ اصلی شہزادی ہے یا نہیں۔‘‘

’’یہ بھی ہو چکا ہے؟‘‘ فارس ہنسا۔

جنت کا چہرہ مزید دیوار کی طرف گھوم گیا۔ وہ پہلے فارس کو غصہ دکھا رہی تھی۔ اب اپنے نانا سے بھی ناراض ہو چکی تھی۔

’’ہاں، یہ پچھلے ہفتے ہوا۔‘‘

’’تو پھر کیا پتا چلا؟‘‘

’’ہماری جنت اتنے سکون سے سوئی کہ بس۔‘‘ جواب سلیم نے دیا۔ جنت کو غصہ آ گیا۔

’’یہ اس لیے کہ سلیم نے سات گدے نہیں رکھے تھے۔‘‘ ناراضی کے باوجود گردن موڑ کر وضاحت ضروری سمجھی۔ سارا قصور سلیم کا تھا۔ اگر وہ سات گدے رکھتا تو جنت کنفرم شہزادی ٹھہرتی۔

’’تو میں کہاں سے لاتا سات گدے؟‘‘ سلیم نے احتجاج کیا۔ ’’اور گدے چھوڑیں۔ ہمیں تو وہ مٹر بھی نہیں ملا جو نیچے رکھا تھا۔‘‘

’’ہو سکتا ہے دانتوں کی پریاں مٹر کو دانت سمجھ کر لے گئی ہوں۔‘‘ ڈاکٹر مصطفیٰ نے کہا۔ جنت چونکی پھر عادت سے مجبور سب بھول بھال کر ان کے پاس آئی۔

’’ایسا بھی ہوتا ہے بابا؟‘‘ وہ آنکھوں میں حیرت سموئے پوچھنے لگی۔

’’ہاں! پریاں آتی ہیں! یاد ہے فارس۔ جب تمھارا دانت ٹوٹا تھا اور ہم نے اسے تکیے کے نیچے رکھا تھا اور۔‘‘

’’آپ مجھے کیوں بیچ میں لا رہے ہیں؟‘‘ وہ بے ساختہ چڑ گیا۔

’’اچھا۔‘‘ وہ ہنسے۔ ’’یعنی ہم باقی سب کی باتیں کریں۔ تمھاری نہ کریں؟‘‘

وہ چہرے کا رخ بدل گیا۔

’’بابا! بتائیں نا۔ پھر کیا ہوا تھا؟‘‘

’’پھر پری آئی تھی۔ فارس کا دانت لے گئی، پیسے رکھ کر چلی گئی۔ ہے نا فارس؟‘‘ وہ فارس کے تاثرات سے محظوظ ہو رہے تھے۔ پلیٹ سے فرنچ فرائز کھاتے ہوئے وہ یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا۔

جنت کی آنکھیں اشتیاق سے پھیلیں۔ لیکن اسے پھر افسوس بھی ہوا کہ جب اس کا پہلا دانت ٹوٹا تھا تو پتا نہیں کب کیسے اور کہاں گرا تھا کہ دوبارہ ملا ہی نہیں۔ ورنہ مونی نے تو کہا تھا تکیے کے نیچے رکھنا۔ پری آئے گی۔

رات کافی دیر تک محفل جمی رہی۔ باتیں ہوتی رہیں۔ وہ سونے کے لیے گیسٹ روم میں گیا تو کچھ ہی دیر بعد جنت آ گئی۔ وہ بیڈ پر کوئی کتاب کھولے بیٹھا تھا۔ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔

’’بابا نے کہا ہے، تمہیں بلیاں بری نہیں لگتیں۔ اور۔ اور تمہیں ڈر بھی نہیں لگتا۔‘‘

’’ہاں۔‘‘ اس نے تائید میں سر ہلایا۔

’’بابا کہتے ہیں اگر تم بلی کے ساتھ کھیلو گے تو تمھاری طبیعت بہت زیادہ خراب ہو جائے گی۔ بہت زیادہ۔‘‘

’’وہ ٹھیک کہتے ہیں۔‘‘

’’تو تم اب کبھی بلی کے ساتھ مت کھیلنا۔ پیار بھی نہیں کرنا۔‘‘ اس نے تنبیہ کی۔ مسکراہٹ ضبط کر کے اس نے سر ہلایا۔ ’’ٹھیک ہے۔‘‘

’’ورنہ تم بیمار ہو جاؤ گے۔ پھر اسکول بھی نہیں جا سکو گے۔ پھر ٹیچر تمہیں ماریں گی۔‘‘ غالباً ڈاکٹر مصطفیٰ نے بہت تفصیل سے اسے سمجھایا تھا۔

’’ہاں، میں جانتا ہوں۔‘‘

’’گڈ نائٹ۔‘‘ وہ سمجھا بجھا کر چلی گئی۔ وہ متبسم چہرے کے ساتھ اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا۔

☆☆☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب رونے کی آواز سن کر اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ آواز جنت کی تھی۔ وہ تیزی سے اٹھ کر باہر آیا تھا۔ سامنے ہی ڈاکٹر مصطفیٰ اسے بانہوں میں بھرے سیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔

''وہ زور سے گرا۔ اوپر سے۔ اس کا سر پھٹا۔ اتنا خون بہہ رہا تھا بابا۔'' ہچکیوں کے بیچ۔ بمشکل لفظ ادا کرتی۔ شدت سے روتی جنت اس کے عین سامنے تھی۔ دم سادھے وہ اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔

''گڑیا! وہ صرف ایک حادثہ تھا۔ غلطی سے ہوا۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔'' ڈاکٹر مصطفیٰ اس کی پشت سہلاتے ہوئے اسے سمجھا رہے تھے۔

''امی ماریں گی۔ بابا!'' خوف اور وحشت انگ انگ سے عیاں تھی۔ وہ باقاعدہ کپکپا رہی تھی۔ ''بابا حسنین مر گیا۔''

انہوں نے بھینچ کر اسے خود سے لگا لیا۔

''شش...... کچھ نہیں ہوا۔ آپ نے کچھ نہیں کیا۔ یہ صرف خواب تھا بیٹا۔''

بات کرتے کرتے ان کی نظر نیم تاریکی میں فارس پر پڑی۔

''نہیں بابا! امی آئی تھیں۔ امی مار رہی تھیں۔'' وہ بلک بلک کر روئے جا رہی تھی۔

''ہم صبح مونی کے گھر جائیں گے۔ نیلم سے ملنے۔ پارک بھی جائیں گے۔ کھلونے بھی خریدیں گے۔ ابھی آپ سو جائیں۔''

اس کی پشت تھپتھپاتے وہ اسے بہلا رہے تھے۔ اور جانے کیا کچھ پڑھ کر اس پر پھونک رہے تھے۔

شدت سے روتے، بولتے، سسکتے وہ یکایک پرسکون ہونے لگی تھی۔

فارس دروازے میں ہی کھڑا انہیں خاموشی سے دیکھتا رہا۔

جب وہ پرسکون ہو کر سو چکی تو اسے کمرے میں سلا کر وہ نیچے آ گئے تھے۔ وہ راہداری میں کھڑا تھا۔ انہیں کچن میں جاتا دیکھ کر ان کے پیچھے چلا آیا۔

''سب خیریت ہے؟'' اس کی سمجھ میں نہیں آیا بات کیسے شروع کرے۔

''ہاں۔'' پانی پینے کے بعد انہوں نے خالی گلاس میز پر رکھتے ہوئے گہرا سانس لیا۔

''جنت ٹھیک ہے؟'' اسے جانے کیوں فکر ہو رہی تھی۔

''ہاں، وہ ٹھیک ہے، بس نیند میں ڈر گئی تھی۔''

اگلے کئی لمحوں تک تیز ہواؤں کا شور ہی ان کے مابین خاموشی میں مخل ہوتا رہا۔ پھر انہوں نے مختصر لفظوں میں اسے سب بتا دیا۔ وہ جنت کو کب اور یہاں کیوں لائے تھے۔ وہ ان کے ساتھ کیوں رہ رہی تھی۔ وہ اتنا روکیوں رہی تھی۔

فارس انہیں سنتے ہوئے اپنی جگہ ساکت سا کھڑا تھا۔ جنت کو دیکھ کر بالکل نہیں لگتا تھا، وہ کتنے بڑے ٹراما سے گزری تھی۔ گو کہ وہ بتا رہے تھے کہ چائلڈ سائکائٹرسٹ کے پاس اس کا چھ ماہ تک علاج چلتا رہا تھا اور اب وہ پہلے سے بہت بہتر تھی۔ مگر پھر بھی وہ حیران ہوا تھا۔

''جو بھی ہوا، نا سمجھی میں ہوا۔ مگر میری بیٹی جنت کو قصوروار سمجھتی ہے۔ بہت نفرت کرتی ہے اس سے۔'' وہ بول رہے تھے تو لہجے میں درد پنہاں تھا۔ ''اگر میری اپنی اولاد ایسا نہ کر رہی ہوتی تو شاید۔ میں کبھی مانتا ہی نہیں کہ مائیں بھی ایسا کر سکتی ہیں۔'' اپنی بات ختم کر کے وہ کرب سے مسکرائے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

''سو جاؤ، کافی رات ہو چکی ہے۔'' اس کا کندھا تھپتھپا کر وہ چلے گئے مگر فارس وجدان کتنی ہی دیر تک اپنی جگہ کھڑا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جنت کا ہنستا مسکراتا چہرہ تھا اور کانوں میں سسکیوں کی آواز گونج رہی تھی۔

جن خوش قسمت ترین بچوں کے ساتھ وہ اپنے نصیب کا موازنہ کر کے خود کو بدقسمت ترین گردانتا رہا تھا۔ ان میں ایک ہنستا مسکراتا وجود تو بالکل اس کے جیسا تھا۔ ٹھکرایا ہوا۔ نفرتوں سے گھرا۔ نامکمل اور ادھورا سا۔ مگر پھر بھی خوش۔ مطمئن اور بہت پرسکون۔

☆☆☆

اگلے دن وہ پھر سے ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ گھر کے مین گیٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ اتنی خوش اور آنکھوں میں اتنا سارا انتظار سموئے۔ جانے کیوں وہ نظریں چرا گیا۔ وہ بھاگ کر اس کے پاس آئی۔

با آواز بلند اتنا لمبا گڈ مارننگ کہہ کر بیگ کی اسٹرپس پر گرفت جمائے اس کے آگے آگے چلنے لگی۔ اور معمول کی طرح راستے میں کہیں سے مونی، کہیں سے کاکا، کہیں سے ٹیپو اور شاکا شامل ہوتے گئے۔ انہیں بڑی حیرت ہوئی کہ آج فارس نے انہیں سخت، تلخ کچھ کہا نہیں تھا اور نہ ہی اونچا بولنے سے منع کر رہا تھا، وہ شور کرنے پر انہیں ٹوک بھی نہیں رہا تھا۔

یہ ایک انہونی تھی، وہ اس انہونی پر بڑے خوش ہوئے۔ مگر یہ خوشی انہیں زیادہ دیر راس نہ آئی۔ کھیلتے بھاگتے جنت اس قدر زور سے گری کہ کسی پتھر سے رگڑ کھا کر اپنا گھٹنا چھلوا بیٹھی۔ تکلیف کی شدت سے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔

''میں تو مر جاؤں گی۔'' وہ روتے ہوئے کہے جا رہی تھی۔

''اتنی سی چوٹ لگنے سے کوئی نہیں مرتا۔'' اس نے نرمی سے کہا۔

''میں تو...... میں تو مر جاتی ہوں۔''

فارس اپنی جگہ تھم گیا۔ ٹھہر گیا۔ ذرا سی نظریں اٹھا کر اس نے جنت کو دیکھا۔ اس کی سسکیاں ہچکیوں میں بدل چکی تھیں۔ آنسوؤں سے چہرہ تر اور لال ہو رہا تھا۔ درد صرف ایک گھٹنا چھلنے کا نہیں تھا۔ درد صرف کسی ایک زخم کا بھی نہیں تھا۔

اس نے جیب سے ٹشو نکال کر اس کے آنسو صاف کیے، بازو سے پکڑ کر اس کے کپڑے جھاڑے۔ پھر اس کی طرف پشت کیے پنجوں کے بل جھک گیا۔

''آؤ گھر چلیں۔'' گردن میں بازو حمائل کرتی وہ پشت پر سوار ہوگئی۔ کچھ دیر تک وہ اس کی سسکیاں سنتا رہا پھر وہ چپ ہوگئی۔

مونی، کاکا، شاکا، ٹیپو بڑی ہی سوگواری کے عالم میں ان کے پیچھے آرہے تھے۔

گھر پہنچ کر زخم صاف کر کے سنی پلاسٹ لگانے کے بعد وہ پھر سے۔ اور ویسے ہی چہکتی پھر رہی تھی۔ جیسے اسے کبھی کوئی چوٹ آئی ہی نہیں تھی۔ اور وہ گم صم بیٹھا اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

شیرازی مینشن کے سرسبز احاطے میں اس کے فٹ بال سے کھیلتی جنت کمال، اور اس کا بھرپور ساتھ دیتا وہ۔ منظر مکمل تھا کہ وہ خوش تھا۔ اور مدحت نے وہ منظر کیمرے میں محفوظ کرلیا تھا۔ وہ تصویر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے البم میں سج گئی تھی۔

مسکراہٹ تو وہ ہوتی ہے جو آنکھوں میں جھلکتی ہے، جو زندگی سے بھرپور لگتی ہے تو فارس وجدان کی مسکراہٹ جمیلہ داؤد کے بعد جیسے اب زندہ ہوگئی تھی۔

وہ کم گو تھا مگر وہ جنت سے باتیں کرنے لگا تھا۔ اس کے لطیفوں پر ہنسنے لگا تھا۔ وہ اس کے کمرے میں بھاگ بھاگ کر چیزیں دیکھتی تھی تو وہ اسے روکتا نہیں تھا۔ قیمتی اشیا کو چھیڑنے کی کوشش کرتی تھی تو اسے ڈانٹتا نہیں تھا۔ اور مدحت خوشگوار حیرت کے ساتھ اس کا بدلاؤ دیکھتی رہتی۔ کبھی مسکرا دیتی۔ کبھی فارس کے تاثرات سے محظوظ ہونے لگتی۔

جنت ایک تنگ کوٹھری میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جیسے تھی۔ اس کی موجودگی میں شیرازی مینشن کے اس الگ تھلگ حصے میں جیسے زندگی کی لہر دوڑ جاتی۔

وہ جب بھی ملنے آتی، اپنا بیگ نت نئی چیزوں سے لازمی بھر کر لاتی تھی۔ ایک ایک چیز وہ نکال کر فارس کو دکھاتی جاتی۔ یہ بالوں پر ایسے لگائے جاتے ہیں۔ اور انہیں ایسے باندھا جاتا ہے۔ اور ایسے لپیٹا جاتا ہے۔ اس کے پاس تو کھلونا میک اپ کٹس بھی تھیں۔ فارس کو ان چیزوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر جنرل نالج سمجھ کر وہ بے دلی سے ہوں ہاں میں سر ہلاتا سنتا جاتا۔

ایک بار وہ اپنی کسی نیلو آپا سے نیل پالش لے کر آئی اور فارس سے اپنے دونوں ہاتھوں اور پیر کے ناخنوں پر لگوالی۔ بعد میں ڈاکٹر مصطفیٰ سے بھی سر جھکا کر ڈانٹ سن لی۔

پھر اگلے دن وہ نیل پالش اس کے پاس امانتاً رکھوا کر گئی کہ جب کبھی لگوانی ہوگی تو وہ اس کے پاس آکر لگوا جائے گی اور مدحت کتنی دیر تک ہنستی رہی تھی۔

''رنگ اچھا تھا۔ سوچ رہی ہوں میں بھی تم سے لگوا لوں۔'' آنکھوں میں شرارت سمو کر اس نے کہا۔

''آپ مجھے ڈسٹرب کر رہی ہیں!'' فارس نے کتاب آگے کر کے اپنا چہرہ مکمل چھپا لیا۔

وہ زیرلب مسکراتے ہوئے الماری میں اس کے استری شدہ کپڑے رکھتی رہی۔

ملاقات کی مدت ایک ماہ پچیس دن تھی۔ اور شاید یہ اس کی زندگی کی سب سے خوبصورت ترین مدت تھی۔ یہ اس کا خیال تھا۔ کہ اس کی زندگی میں کچھ شرارت بھرے رنگ، اور مسکراہٹ بھری خوشیاں جنت کی وجہ سے آئی تھیں۔ یہ اس کی اور اس کے دوستوں کی صحبت کا اثر تھا کہ اب اسے ان کی باتیں، شرارتیں، لطیفے اور کہانیاں سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ کسی مزاحیہ بات پر اب اسے ہنسی آ جاتی تھی۔ کسی انوکھے قصے کو وہ انجوائے کرلیا کرتا تھا۔ اب جب وہ چاند پر کسی چرخا کاتتی بڑھیا کا ذکر کرتے تھے تو وہ فوراً مان لیتا تھا۔ کاکا کی ٹیڈپول مچھلیاں ہیں۔ ٹیپو کا گھوڑا جب بڑا ہوگا تو اس کے پر نکلیں گے۔ پھولوں پر پریاں منڈلاتی ہیں۔ درختوں کی جڑوں میں ان کے چھوٹے چھوٹے گھر ہیں۔ اور نہر میں جل پریاں رہتی ہیں۔

وہ بہت سی پریشانیوں اور الجھنوں کے ساتھ شیرازی مینشن آیا تھا مگر اب اسے اپنی محرومیوں کو سوچنے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ ان بچوں کی سنگت میں وہ جیسے سب کچھ بھول بھال جاتا تھا۔

شاید ''خوشی'' ایسی ہی ہوتی ہے۔ جو سابقہ ہر غم، ہر اذیت بھلا دیتی ہے۔ جو آنے والے ہر دن سے متعلق خوش گمانی میں مبتلا کر دیتی ہے۔

یہ احساس خوب صورت تھا۔ وہ اس احساس کے ساتھ جینے لگا تھا۔

☆☆☆

چھٹیاں ختم ہونے میں دو دن باقی تھے۔ وہ اپنی پیکنگ کر رہا تھا جب جنت مونی کے ساتھ ملنے چلی آئی تھی۔ کچھ دیر تک باہر کھیلتے رہنے کے بعد مونی چلی گئی تو جنت اس کے پاس آ گئی۔

''تم اتوار کو چلے جاؤ گے؟''

''ہاں۔''

''کہاں جاؤ گے؟''

''اپنے ہاسٹل۔''

کچھ دیر تک وہ تصور ہی تصور میں ہاسٹل کے معنی ڈھونڈتی رہی پھر بولی۔ ''پھر تم دوبارہ کب آؤ گے؟''

اپنی کتابیں بیگ میں رکھتے وہ لمحے بھر کے لیے رکا، پھر اس نے مڑ کر جنت کو دیکھا۔

شیرازی مینشن۔اعظم شیرازی۔سرونٹ کوارٹرز میں اس کا کمرہ۔ادھورا نام لیے کسی ملازم کے یتیم بیٹے کی پہچان۔

یہ تمام اندھیرے ایک طرف۔اور جنت کا منتظر روشن چہرہ دوسری طرف۔

''گرمیوں کی چھٹیوں میں آؤں گا۔''

اس نے کہا،اور بہت دل سے کہا۔فیصلہ کرکے،ارادہ باندھ کر کہا۔

''وعدہ؟''جنت کی تسلی نہیں ہوئی۔

''وعدہ۔''

''پکاوالا وعدہ۔''آنکھوں سے تائید چاہتی وہ اسے کوئی جیتی جاگتی گڑیا لگی۔

''ہاں پکاوالا وعدہ۔''وہ ہنسا۔وہ کھل اٹھی۔اس کے چہرے پر ایک ساتھ کئی رنگ اور کئی خواب سج گئے۔

''پھر ہم پارک جائیں گے۔اور پہاڑیوں پر بھی چڑھیں گے۔اور وہاں دور تک جائیں گے۔''اس نے فضا میں ہی ہاتھ بلند کر کے کسی تصوراتی سرزمین کی طرف اشارہ کر دیا۔''اور بہت سارا گھومیں پھریں گے۔مونی کاکا،میں،اور ٹیپو۔اور تم۔اور اور سلیم۔''سلیم کا ذکر کرتے کوئی بات یاد آئی تو چہرے کے تاثرات بدل گئے۔

''ہم سلیم کو نہیں لے کر جائیں گے۔وہ بابا سے میری شکایتیں لگاتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔''اس نے ہامی بھر لی۔وہ خوش ہوئی۔

کسی خیال کے تحت وہ رائٹنگ ٹیبل کی درازیں کھینچ کر کچھ ڈھونڈنے لگا۔مطلوبہ چیز نہ ملنے پر اس نے وارڈروب کا رخ کیا۔اب وہ نچلے خانے میں کچھ دیکھ رہا تھا۔جنت پنجوں کے بل اس کے برابر بیٹھ گئی۔جیسے وہ کچھ ڈھونڈ رہا ہے تو وہ بھی دیکھے۔وہ کیا ڈھونڈ رہا ہے۔

اندر لکڑی کا بڑا باکس رکھا تھا جسے پورا نکال کر اس نے فرش پر رکھ دیا اور وہ چیزیں الگ کرنے لگا جو وہ اسے تحفتاً دے سکتا تھا،حالانکہ اسے اپنے کھلونے اور بچپن کی اشیاء بہت عزیز تھیں۔

کہانیوں کی کتابیں،ڈھیر سارے رنگ اور مارکرز،چند گاڑیاں بھی تھیں جو چھوٹے سائز کی تھیں۔اور ایک خوب صورت سا خرگوش بھی تھا۔لکڑی کا باکس۔سیاہ رنگ کا۔جس پر حرف ایف کی کیلی گرافی کی گئی تھی۔سلائڈ کر کے کھلتا تھا۔اندر تین ڈائریز پیک شدہ حالت میں جوں کی توں رکھی تھیں۔اس نے یہ ڈائریز پچھلے سال کافی مہنگی قیمت پر خریدی تھیں مگر باوجود کوشش کے بھی وہ ان پر کچھ لکھ نہیں سکا تھا۔

اس نے وہ باکس جنت کو دے دیا۔بھلے سے وہ ان صفحوں کو پھاڑ کر ضائع کرے یا سبق لکھ کر مسخ کرے یا ڈرائنگ بناتی رہے

اسے پرواہ نہیں تھی۔بس وہ چاہتا تھا اس کی چیزوں کو استعمال کرے کہ اس کے پاس تو ہر تحفہ اور ہر چیز جوں کے توں پڑی رہتی تھی۔

جنت اتنی ساری چیزیں دیکھ کر بے پناہ خوش ہوئی۔

''تم بہت اچھے ہو۔بابا سے بھی اچھے۔''اسے جب اپنی شدید خوشی کا اظہار کرنا ہوتا تو وہ اسے نانا سے اوپر کا درجہ دے دیتی تھی۔

وہ اسے تحائف کے ساتھ گھر چھوڑ کر آیا تو کتنی دیر تک اس کا دل بوجھل رہا۔بورڈنگ اسکول میں ایڈمیشن کے بعد ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ وہ واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔اس نے خود کو ہاسٹل تک محدود کر کے شیرازی مینشن میں کبھی نہ آنے کا فیصلہ تین سال پہلے کیا تھا۔مگر اب وہ آنا چاہتا تھا۔بار بار آنا چاہتا تھا۔

خواہش دل کی تھی۔لبوں پر نہیں لائی جاسکتی تھی۔نہ یہ گھر اس کا تھا،نہ لوگ اس کے اپنے تھے۔نہ اس کے احساسات کی قدر تھی،نہ خواہشات کی کوئی منزلت تھی۔وہ اپنی من مانی نہیں کر سکتا تھا۔اپنے راستے خود سے نہیں چن سکتا تھا۔اپنی منزل خود سے متعین نہیں کر سکتا تھا۔

رات کروٹیں بدلتے گزر گئی۔دن کے اجالے میں بھی اس پر اداسی چھائی رہی۔مکمل تیاری کے ساتھ جب وہ کمرے سے باہر نکلا تو اس نے سیاہ رنگ کی دو گاڑیوں کو بیرونی دروازے کے سامنے کھڑے دیکھا۔آغا علی جس گاڑی میں اس کا سامان رکھ رہا تھا وہ گاڑی شیرازی خاندان کے مکینوں کے زیر استعمال رہتی تھی۔اس کی رفتار خود بخود مدھم ہوگئی۔گاڑی کے قریب پہنچنے تک اس کے تاثرات مکمل بدل چکے تھے۔وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ اب دوسری گاڑی کو دیکھ رہا تھا۔

شیشے سیاہ تھے مگر وہ جانتا تھا گاڑی کی عقبی نشست پر کوئی موجود تھا۔سکیورٹی سخت تھی۔اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ کوئی اہم شخصیت ہی تھی۔

ہارون شیرازی۔اعظم شیرازی۔یا پھر......

''بیٹھو۔''آغا علی نے عقبی نشست کا دروازہ اس کے لیے کھولا تو وہ بیگ داہنے کندھے سے لٹکائے اپنی جگہ کھڑا رہا۔

''آپ کی جیپ کہاں ہے؟''

''خراب ہے۔مکینک کو ٹھیک کرنے کے لیے دی ہے۔کچھ دن لگ جائیں گے۔''

فارس اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہلا۔نگاہیں آغا علی کے چہرے پر جمی رہیں۔برابر والی سیاہ گاڑی کے شیشوں سے کسی نے اس کی طرف ایک بیزار سی نظر ڈالی۔پھر ہیڈفونز گردن پر ٹھہرا کر،نوٹ پیڈ پر کچھ لکھتے ہوئے،اس نے کین سے گھونٹ بھرا۔

''ملازموں کے بچے ان گاڑیوں میں سفر کر سکتے ہیں؟''اور گاڑی سے باہر،عین سامنے فارس وجدان آغا علی سے پوچھ رہا

تھا۔

"جی صاحب نے اجازت دی ہے۔"

اور "صاحب" نے جانے کیسے اجازت دے دی تھی۔اس نے مزید کوئی سوال نہ کیا۔

وہ گاڑی میں سوار ہوا تو آغا علی نے مسکرا کر دروازہ بند کر دیا۔ڈرائیونگ سیٹ پر بلیک ٹو پیس سوٹ میں ملبوس شخص بیٹھا تھا۔ پسنجر سیٹ بھی اس کے جیسے ایک لحیم شحیم گارڈ نے سنبھال رکھی تھی۔بیک ویو مرر سے ایک نظر اسے دیکھتے گاڑی اسٹارٹ کر دی گئی۔

بیرونی احاطے سے نکل کر گاڑی مرکزی شاہراہ کی طرف بڑھی تو اس نے بلندی سے دور تک پھیلے سبزے کو دیکھا۔ڈاکٹر مصطفیٰ کا مکان اسے واضح نظر آ رہا تھا۔

اسے جنت کا خیال آیا تو وہ اسے سوچ کر مسکرایا۔اور قسمت اسے دیکھ کر مسکرائی۔

☆☆☆

راستے جدا ہوئے، منزل اندھیر ہوگئی۔کچھ خواب آنکھوں میں ٹھہر گئے، اور کچھ منتشر ہو کر بکھر گئے۔

امید قائم تھی۔انتظار دائم رہا تھا مگر گرمیوں کی وہ چھٹیاں کبھی نہیں آئی تھیں۔

فارس وجدان نے جو وعدہ جنت کمال سے کیا تھا وہ کبھی پورا نہیں ہو سکا تھا۔

اور وہ تمام کی تمام، یادیں، لمحے اور اشیا اس کے سامنے بکھری پڑی تھیں۔منتشر، ٹوٹے بکھرے خوابوں کی طرح۔کسی بھولی بسری یاد کی طرح مبہم۔دھند میں ملفوف۔اور زخموں سے چور ہو کر۔

تلوار ویسی ہی مضبوط تھی، ہلکا سا رنگ اڑ چکا تھا۔ووڈن باکس پرانا لگ رہا تھا، حرف ایف کی کیلی گرافی کے گرد چسپاں اسٹیکرز محض اس نشانی کے طور پر رہ گئے تھے کہ انہیں اتارنے کی ناکام کوشش کی گئی تھی۔

ڈاکٹر مصطفیٰ اور ان کی نواسی کی یادگار تصویریں ووڈن فلور پر یہاں وہاں بکھری تھیں۔وہ ہر تصویر میں ان کے کندھے سے اور کہیں سینے سے لگی کھڑی تھی۔اور ہر تصویر میں اس کی جاندار مسکراہٹ شہد رنگ آنکھوں سے جھلکتی نظر آ رہی تھی۔

اس نے تین ڈائریز دی تھیں۔اور ان میں صرف ایک ہی اس کے قدموں میں پڑی تھی۔

اس نے ہمت کر کے کپکپاتے ہاتھوں سے ڈائری اٹھالی۔

وہ سات سالہ جنت کی ڈرائنگز دیکھنے کی توقع کر رہا تھا مگر ڈائری کے صفحے گزرے وقت کی ان حکایتوں اور محسوسات سے پر تھے جنہیں بیان کرنے کا جنت کو کبھی موقع نہیں ملا تھا۔وہ غم جو اسے لہولہان کرتے تھے، وہ محرومیاں جو اسے فنا کرتی تھیں، وہ تنہائی جو اس کا مقدر ہوگئی تھی، اور وہ خوف جو اس کے حواسوں پر سوار رہنے لگا تھا۔اذیت بھرے لمحے، باتیں اور احساسات اس نے حرف

بہ حرف درج کر رکھے تھے۔

وہ خود کو ادھورا، ناقص اور نامکمل سمجھتی تھی۔سارے اعتراض، شکوے اس نے صفحوں پر دھر دیے تھے۔ہر درد کو امر کر دیا تھا۔ہر دکھ کو سجا دیا تھا۔

کہیں غم رف لکھائی سے جھلکتا تھا۔اور کہیں موت کی خواہش کرتی کسی عبارت سے لڑھکتا تھا۔

شوہر کے گھر زندگی "جہنم" تھی۔اور ماں کا رویہ کسی ذہنی اذیت سے کم نہیں تھا۔ایسے میں اس نے ہر جگہ نانا کو یاد رکھا تھا۔وہ ہوتے تو اس کی زندگی ایسی نہ ہوتی۔وہ دعا کرتے تو یقیناً محرومیاں ٹل جاتیں۔محبتیں رہ جاتیں۔حالات ایسے نہ ہوتے۔سزائیں اتنی نہ ہوتیں۔نہ کردار پر بات آتی۔نہ قتل کا الزام لگتا۔نہ اللہ کے ارادوں پر کوئی سوال اٹھاتا۔نہ کوئی تکبر کی دلدل میں اترتے ہوئے خود کو خدا کرتا۔

ہاں وہ ایسے ہی تھے۔ہر ضرب کے آگے ڈھال بن جاتے تھے، کھری کھری سنا کر لاجواب کر دیتے تھے۔نانا یقیناً اسے بچا لیتے۔کسی وادی میں چھپا لیتے۔انہوں نے پہلے بھی یہی کیا تھا۔وہ اب بھی یہی کرتے۔

مگر وہ نہیں تھے۔ان کی جیسی نہ کسی کی چاہت تھی۔ان کے جیسا نہ کسی کا رویہ تھا۔

رشتوں کے معاملے میں وہ خود کو "بدقسمت" اور محبت کے معاملے میں خود کو "بدنصیب" سمجھتی تھی۔وہ حرف بہ حرف اسے پڑھتا جا رہا تھا اور وہ خود کو لکھ لکھ کر مٹاتی جا رہی تھی۔

ڈائری کا سفر ڈاکٹر مصطفیٰ کی وفات سے شروع ہو کر برہان سے طلاق پر ختم ہو گیا تھا۔آگے کے تمام صفحے بہت صاف اور خالی تھے۔ایسے جیسے زندگی بس تھی ہی برہان تک۔برہان سے طلاق اور ماں کی وفات تک۔اس کے بعد آگے کچھ نہ تھا۔اس نے بے دھیانی میں کئی صفحے پلٹ ڈالے تھے۔مگر کہیں بھی اس کا ذکر نہ تھا، نہ نفرتوں کی نشاندھی تھی، نہ اذیتوں کا حوالہ تھا۔ایسے جیسے اس کی زندگی میں فارس وجدان نہیں آیا تھا۔اس کی دوسری شادی نہیں ہوئی تھی۔اسے دوسرا گھر نہیں ملا تھا۔

سطریں خالی تھیں۔خالی ہی رہی تھیں مگر گزشتہ پانچ ماہ فارس وجدان کی آنکھوں میں سما گئے تھے۔وقت رک گیا تھا۔منظر بدلتے جا رہے تھے۔

"جو کچھ سن چکا ہوں، وہ سب ممی کو بتاؤں گا تو وہ کیا سوچیں گی؟ ایک ایسی لڑکی کو بہو بنا بیٹھی ہیں جو **infertile** ہے۔جس نے اپنی سوتن کے بچے کی جان لینے کی کوشش کی ہے۔جس کے خاندان کے لوگ اسے اچھوت کی طرح ٹریٹ کرتے ہیں۔اور جو اپنی ماں کی موت کا سبب بنی ہے۔"

اپنی ذات کے قلعے میں محصور وہ اپنے آپ میں فنا ہونے لگا۔

عسر یسرا۔ حسنیٰ حسین

''تمہاری ایک مشکل آسان کر دیتا ہوں جس دن میں تمہیں اس گھر سے باہر کا راستہ دکھاؤں گا اس دن تمہارے بینک اکاؤنٹ میں اتنی رقم ہوگی کہ تم اگلے دس پندرہ سالوں تک گھر میں بیٹھ کر بھی اڑاؤ گی تو ختم نہیں ہوگی، سو یہ سوچنا چھوڑ دو کہ طلاق کے بعد تمہارا کیا بنے گا۔ دولت ملے گی تو تم بھول جاؤ گی برہان کون تھا...... فارس کون ہے۔''

کسی قدر کوشش سے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''سیلف ریسپکٹ کیا اپنے ایکس ہزبنڈ کے گھر بیچ کھائی ہے تم نے؟''

بمشکل قدم اٹھاتے ہوئے وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا تھا۔

''ویسے تمہاری یہ ادائیں تمہارے پہلے شوہر کے کام نہیں آئیں؟ میرا مطلب ہے، تم اس کے ساتھ پانچ سال رہی ہو۔ پانچ سال کا عرصہ کوئی مذاق نہیں ہے......اس کے باوجود تمہیں طلاق ہوئی۔''

سینے پر کوئی ثقیل شے آن پڑی تھی۔ تنفس بھاری ہونے لگا تھا۔ دستک دے کر اس نے مسز شیرازی کے بیڈروم کا دروازہ کھول دیا۔

وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بالکل خاموش بیٹھی تھیں۔ آہٹ پر سر اٹھائے اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

زرد روشنی میں انہوں نے اس کا حلیہ، اس کی آنکھیں۔ اس کے تاثرات دیکھے اور پریشان ہوگئیں۔

وہ آہستگی سے قدم اٹھاتا ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بے تحاشا سرخ ہو رہی تھیں۔ چہرہ کرب کی عکاسی کر رہا تھا۔

''میں نے یہ شادی آپ کے لیے کی تھی، میں اسے نبھانا نہیں چاہتا تھا۔''

مسز شیرازی دکھ اور صدمے سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

''میں نے اس سے بہت بار کہا، یہ کانٹریکٹ میرج ہے، میں اسے ختم کر دوں گا۔'' اس کا چہرہ آنسوؤں سے مکمل تر ہو چکا تھا۔

''میں نے کہا جب تک ممی ہیں۔ تم تب تک تم یہاں ہو۔''

مسز شیرازی کی آنکھوں میں کرب اترا۔ آنکھیں دھندلا گئیں۔

''میں نے اسے خوف دکھایا۔ میں نے اسے گردن سے پکڑا تھا ممی! میں نے اسے بہت نفرت دکھائی ہے۔ بہت زیادہ نفرت دکھائی ہے۔'' اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ''وہ ساری رات فرش پر بیٹھ کر روتی رہی۔ میں آواز سنتا رہا مگر میں نہیں گیا۔ حالانکہ جب وہ چھوٹی تھی۔ اور روتی تھی تو میں فوراً جاتا تھا۔''

وہ ان کے غصے اور ناراضی کی پروا کیے بغیر رندھی ہوئی آواز میں سب کہتا جا رہا تھا۔

''وہ سدرہ کی شادی پر نہیں جانا چاہتی تھی۔ میں اسے زبردستی لے کر گیا تھا۔ وہ میرے ساتھ واپس آنا چاہتی تھی، میں اسے ان ہی لوگوں میں چھوڑ کر آ گیا تھا۔ اس نے مجھے فون کیا، میں نے موبائل آف کر دیا۔ اس نے ریکارڈنگ بھیجی، میں نے سنے بغیر نمبر بلاک کر دیا۔ یہ میری نفرت تھی ممی! اور آپ مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔ اس نے میرا انتظار کیوں نہیں کیا؟ وہ میرا انتظار کیسے کرتی؟ وہ گھر چھوڑنے سے پہلے۔ میرے لیے کیسے رکتی؟ میں تو کبھی نہیں رکا اس کے لیے۔ میں نے تو کبھی انتظار نہیں کیا۔''

مسز شیرازی اسے اذیت اور بے بسی سے دیکھ کر رہ گئیں۔ وہ یوں ٹوٹا ہوا تھا جیسے کبھی جڑ نہیں سکے گا۔ یوں بکھرا ہوا تھا جیسے کبھی سمٹ نہیں سکے گا۔

''لیکن آپ۔ میرا یقین کریں۔'' س نے مسز شیرازی کے ہاتھ تھام لیے

''میں کوشش کر رہا تھا۔ مجھے خود نہیں پتا۔ لیکن میں بدل رہا تھا ممی! میں......میں اسے اپنا رہا تھا۔''

وہ ایک دم سے وہی سات سالہ فارس ہو گیا تھا۔ جو اپنی کہتا جاتا تھا، اور روتا جاتا تھا۔ ایک ایک کر کے سارے شکوے وہ ان کی ہتھیلیوں پر دھر دیتا تھا، سارے غم سنا دیتا تھا، ساری محرومیاں دکھا دیتا تھا۔ وہ اسے بانہوں میں بھرتی تھیں تو وہ پرسکون ہو جاتا تھا، مگر آج ان کے سینے سے لگ کر بھی وہ بے سکون ہو رہا تھا۔

''میں اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا تھا۔ میں دوبارہ محبت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن۔ میرا دل۔ ممی میرا دل۔''

وہ اپنی تمام تر ہمت اور چٹان حوصلے کے ساتھ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اسے بانہوں میں سمیٹتے سمیٹتے وہ خود بھی آبدیدہ ہو گئیں۔

☆☆☆

اس کے آس پاس اب صرف اندھیرے تھے اور ماضی تھا۔ جنت تھی۔ اور اس کا رویہ تھا۔ اس کی امید تھی، اس کا یقین تھا۔ کتنے مان سے وہ اس کا ہر کام کرتی تھی۔ کتنی امید سے وہ اس کے آگے پیچھے پھرتی تھی۔ اور کتنے صبر سے وہ اس کی ہر کڑوی کسیلی بات سہہ جاتی تھی۔ اسے یقین تھا، وہ بدل جائے گا۔ اسے یقین تھا، وہ اس کا پتھر دل موم کر لے گی اور جب یقین اثر کرنے لگا تھا تو وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

اس نے طلاق اور کانٹریکٹ میرج کا ذکر ختم کر دیا مگر اس کے ذہن سے نہ نکال سکا۔ اپنے فیصلے بدلنے لگا مگر اپنے ارادوں سے آگاہی نہ دے سکا۔ اس کی ہر عنایت سزا اور ہر مہربانی انتقام ہوگئی اور وہ چاہ کر بھی اس کی غلط فہمی دور نہ کر سکا۔

معاملات دل کے تھے، اور دل تک رہ گئے تھے، لفظی اظہار تو کہیں بھی نہ تھا، نہ اعمال سے امید ظاہر ہوئی تھی۔ وہ جو خود اپنے احساسات سے بے خبر رہا تھا۔ اسے خبر کیسے دیتا؟ وہ جو خود مایوسی کی دلدل میں دھنسا ہوا تھا، اسے امید کیسے دلاتا؟

وہ ایک ''انعام'' تھی۔ بے شمار خسارے اور نقصانات کے بعد اس کے حصے میں آئی تھی۔ وہ اس کا نصیب تھی۔ اس کا رزق۔

اس کی راحت۔اس کا سکون۔جسے وہ اپنے ہاتھوں سے گنوا بیٹھا تھا۔

خود احتسابی کی دو دھاری تلوار پر قدم دھرتے ہوئے وہ واپس پلٹ رہا تھا۔مگر پیچھے۔ایک نہ ختم ہونے والی خلش اور کسک کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔

کبھی تمنا کے راستوں پر
نکل پڑو تو خیال رکھنا
ہوائیں، بادل، فضائیں، موسم، خیال
چہرے بدل بدل کر تمہیں ملیں گے
تو لمحہ لمحہ بدلتے رنگوں کے
شوخ دھوکے میں آ نہ جانا
کبھی جو چاروں طرف تمہارے
کرن کرن اپنا خواب آسا بدن نکھارے
زمین پہ اترے
تو دھندلکوں میں سما نہ جانا
کبھی جو آنکھوں میں چاند ہنس ہنس
کے چاندنی کا خمار بھر دے
تو اپنی آنکھیں کہیں خلا میں گنوا نہ آنا
کہ یہ نہ ہو کہ پھر جو خواب ٹوٹے
دھنک دھنک کا سراب ٹوٹے
تو جسم و جان پر عذاب ٹوٹے
اور تم بمشکل لرزتے ہاتھوں میں
کرچی کرچی بدن سنبھالے
کہیں بلندی پہ چڑھ کے
رستی ہوئی نگاہوں سے

واپسی کے نشان ڈھونڈو
اجڑ گیا جو جہان ڈھونڈو
کبھی تمنا کے راستوں پر
نکل پڑو تو خیال رکھنا
کہیں سے خالی پلٹ کے آنا
بہت کٹھن ہے
بہت کٹھن ہے
بہت کٹھن ہے۔

☆☆

اس نے دھیرے سے آنکھیں کھول دی تھیں۔منظر دھندلا سا تھا۔ہاتھ اٹھا کر اس نے پیشانی کو چھوا۔پھر آنکھوں کو مسلا۔

چند لمحوں کے بعد ہسپتال کا کمرہ مدھم نیلگوں روشنی میں نمایاں ہوا۔قطرہ قطرہ رگوں میں سرایت کرتی ڈرپ۔کئی خاموشیاں اور سناٹے لیے بند کھڑکیوں سے جھانکتی اداس شام۔

پلکیں جھپکا کر اس نے گہرا سانس لیا۔اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔آنکھوں میں جلن تھی۔سر بھاری تھا۔سامنے ہی کرسی پر صابرہ بوا تسبیح ہاتھوں میں لیے بیٹھی تھیں۔اسے ہوش میں آتا دیکھ کر تیزی سے اٹھ کر اس کے پاس آ گئیں۔کسی قدر کوشش سے وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

انہوں نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھاما، پیشانی چومی۔اسے بھینچ کر خود سے لگایا۔وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں ان کے سینے سے لگی سوچے جا رہی تھی تو بس یہی کہ وہ یہاں کیوں کر اور کیسے موجود تھی؟

دھند مٹ رہی تھی۔اندھیرے چھٹ رہے تھے۔منظر واضح ہو رہا تھا۔

دماغ کی تاریک سرنگوں میں ایک روشنی سی پھیلی۔مین روڈ پر دوڑتی گاڑیوں کا شور اس کے حواسوں پر چھانے لگا۔موسلا دھار بارش کے تصور سے وجود ایک بار پھر لرزیدہ ہوا۔

اس نے اسٹور پر کسی لڑکے سے موبائل لے کر سلیم کو فون کیا تھا۔وہ اسلام آباد میں پوسٹڈ تھا۔اس کی پکار پر بھاگا چلا آیا تھا۔وہ پورا دن اس کے گھر اس کی بیوی کے پاس رہی تھی۔طبیعت پہلے سے خراب تھی اور کچھ بارش کا بھی اثر تھا کہ اسے بخار نے آ لیا تھا۔مگر وہ ان کے بے حد اصرار پر بھی نہ ہاسپٹل جانے کو تیار ہوئی تھی۔اور نہ ہی کچھ کھانے کو رضامند تھی۔صورت حال کے پیش نظر

عسریسرا۔ حسنیٰ حسین

سلیم نے صابرہ بوا سے فون پر رابطہ کر کے ان کی ٹکٹ شام تک کروادی تھی۔

اسے بس کا وہ مشکل ترین سفر یاد آیا۔تاریکیوں میں گھرا وہ شاق دن یاد آیا۔

انگاروں پر لوٹتا وجود، جلتی ہوئی ویران آنکھیں۔ کپکپاتی انگلیاں۔روتا تڑپتا دل۔انگ انگ میں اترتا اضطراب۔

صابرہ بوا کے گھر پہنچنے تک، ان کے سامنے آنے تک اور پھر کسی بے جان وجود کی طرح ان کی بانہوں میں سمانے تک اسے سب یاد تھا۔

اس کے بعد جب سر چکرایا تھا اور اندھیرے چھائے تھے تو چیخ و پکار سنتے اسے گمان ہوا تو بس اس امر کا کہ اب وہ مرنے والی ہے۔مگر وہ مری نہیں تھی۔اس کی سانسیں ہنوز چل رہی تھیں۔دل ہنوز دھڑک رہا تھا۔کیفیت یوں ہو رہی تھی جیسے وہ لمبی بیماری سے اٹھی ہو۔

کیا انجام اب کسی نئے آغاز سے جڑ چکا؟

آنکھوں میں کرب لیے اس نے نظر اٹھا کر صابرہ بوا کو دیکھا۔کچھ کہنے کے لیے لبوں کو جنبش دی۔آواز حلق سے نہ نکلی۔ آنکھوں کے کنارے نم ہو گئے۔

صابرہ بوا نے ایک دم سے آب دیدہ ہو کر اس کا زرد چہرہ ہتھیلیوں میں لے لیا۔ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔اب وہ کچھ کہہ رہی تھیں۔وہ سرخ پڑتی خالی ویران آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

سماعت میں پڑتے الفاظ اسے مجسم کرنے لگے، دھڑکن تھمنے لگی۔تنفس بھاری ہوا۔آنکھیں پتھرانے لگیں۔

ہاتھ اٹھا کر خدا کا شکر ادا کر کے، اسے کندھوں سے تھام کر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے وہ اب اسے "رپورٹ'' دکھا رہی تھیں۔

دماغ پہلے سے ماؤف تھا۔حواس شل رہے۔لفظ عدم اور آواز صامت رہی۔

محرومیوں کے بوجھ تلے فنا ہوتا وجود یقین اور بے یقینی کے درمیان معلق ہو گیا۔

اس کا سر بے ساختہ نفی میں ہلا۔اس نے اپنا آپ چھڑا لیا۔وہ گہرے صدمے سے گزر رہی تھی۔صابرہ بوا کو ایسا مذاق نہیں کرنا چاہیے۔ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔

مگر وہ مذاق تھا، نہ مزاح۔ایک خبر تھی۔ بشارت تھی۔انہوں نے رپورٹ سامنے رکھی۔کہ وہ خود دیکھے۔خود سمجھے۔یہ سراب نہیں تھا۔خواب بھی نہیں تھا۔

اور اس نے دیکھا۔اپنی ان ویران آنکھوں سے دیکھا۔پلکیں جھپکا کر اور دھڑکنوں کو تھام کر دیکھا۔

پانچ سالوں تک جو رپورٹ "منفی'' تھی وہ "مثبت'' ہو کر سامنے تھی۔پانچ سالوں تک جو محرومی "ساتھی'' تھی، وہ "انعام'' ہو

کر واضح تھی۔

وہ ساکت بیٹھی تھی۔منجمد۔بے حس! بے جان۔پتھرائی ہوئی نگاہوں سے زندگی کو کھوجتے۔سانسوں کو جوڑتے، ایک بے جان کاغذ کو کپکپاتی انگلیوں میں دباتے۔

"تم بانجھ ہو جنت! اور بانجھ عورت ایک مرد پر بوجھ کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔''

گلدان ٹوٹ گیا تھا۔کانچ کے ٹکڑے بکھر گئے تھے۔وہ ایک مکمل تصویر پرزوں میں بٹ گئی تھی۔

"جنت نہیں۔جنت میرا بچہ۔''

"میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ابھی اور اسی وقت دفع ہو جاؤ یہاں سے۔''

وقت پلٹنے لگا۔صفحے الٹنے لگا۔حکایتیں صبیح ہو گئیں۔دن تاریک۔اور تاریک راتیں صفا ہو گئیں۔

"یہ ایک کاغذی شادی ہے جنت کمال! یہ صرف کاغذ تک محدود رہے گی۔''

"اب تم حق مہر کی رقم اپنے پاس رکھ سکو گی۔''

اس نے پلکیں جھپکائیں۔سرخ ڈوروں میں کرب ہلکورے لے کر اٹھا، آنسو رواں ہو گئے۔

" کچھ محرومیاں عطا کا ایک روپ ہوتی ہیں جنت! اللہ کی " کن'' کی منتظر۔اپنا روپ بدلنے کو ہر لمحہ مستعد۔اصل امتحان تو اس مدت کا ہے۔جو اس محرومی میں گزاری جاتی ہے۔اس دوران ہمارے صبر کو جانچا جاتا ہے۔ہمارے شکر کو پرکھا جاتا ہے۔پھر ایمان کا درجہ متعین ہوتا ہے۔''

''اللہ!'' پورے وجود پر ایک لرزہ سا طاری ہوا۔آنکھوں سے وحشت اتر گئی۔سانسوں سے وزن ہٹ گیا۔

''جنہ...... بچے......'' صابرہ نے اسے کندھوں سے تھاما ہوا تھا۔وہ اسے پکار رہی تھیں۔مگر وہ ان کی سن نہیں رہی تھی۔

"مانگتی رہو اور دیکھتی جاؤ اللہ کی مرضی سے تمھاری جھولی میں کیا گرتا ہے، جو گرے اسے بخوشی اپنا لو، خواہ وہ نقطے جتنی خوشی یا ذرے جتنی برکت ہی کیوں نہ ہو۔'' پردوں کی درز سے جھانکتی سورج کی تیز روشنی۔مسز شیرازی کا مسکراتا چہرہ۔ بے شمار کلر ٹیوبز۔ کینوس۔اور پینٹنگ۔ہنزہ کی پینٹنگ۔عسر یسرا کی پینٹنگ۔

"ہر عسر کے ساتھ یسرا ہے! اور یہ یسرا کیا ہے اگلی بار میں اس کا جواب دوں گی آپ کو۔''

یکا یک منظر بدلا تھا۔

"تمھاری فارس سے شادی میری وجہ سے نہیں ہوئی ہے، نہ ہی تمہاری خالہ کی وجہ سے...... یہ تمہارا نصیب ہے جو تمہیں یہاں لایا ہے۔''

نصیب! نصیب! ہر طرف ایک ہی گونج تھی۔ایک ہی صدا۔اس ایک لفظ نے اسے کتنا ڈرایا تھا۔کتنا رلایا تھا۔آن کی آن میں اب۔کتنا معتبر۔کتنا منفرد، کتنا بدیع (انوکھا) ہو گیا تھا۔

"جس وقت منفی سوچ جڑ پکڑے۔اور مایوسی انتہا کی گہری ہو جائے تو سمجھ جاؤ۔یہ شیطان کا آخری وار ہے۔ٹھیک اس وقت پڑ رہا ہے جب وہ تمھارے "انعام" سے واقف ہو چکا ہے۔"

اور اس کا انعام کیا ہو سکتا تھا؟ اس نے تب بھی سوچا تھا۔وہ اب بھی سوچ رہی تھی۔اس وقت ایک لمحے کے لیے بھی یہ انعام اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔اب بھی نہیں آ رہا تھا۔بالکل نہیں آ رہا تھا۔

"جنہ! بچے۔"

اس نے سر اٹھا کر روتی سسکتی نگاہوں سے صابرہ بوا کو دیکھا۔یقین اور بے یقینی کے عالم میں۔اندر ہی اندر ٹوٹتے بکھرتے ہوئے۔خود اذیتی کی دلدل میں اترتے ہوئے۔بار بار تاریک رات کا منظر آنکھوں آ رہا تھا۔اپنا فیصلہ یاد آ رہا تھا۔موت اور اس کے درمیان ایک قدم کا فاصلہ تھا۔چند لمحوں کی مسافت تھی۔

وہ خودکشی کرنے والی تھی۔اپنی جان لینے والی تھی۔اسے وہ آخری لمحہ یاد آیا۔وہ آخری پل۔جب فٹ پاتھ سے آگے سڑک پر قدم جماتے وہ ٹھہر گئی تھی۔پتا نہیں کیوں۔وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی تو نہیں ہل سکی تھی۔اسے نانا ابو یاد آئے تھے۔ان سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا تھا۔

اذیت بھری زندگی تو گزار رہی تھی۔آخرت برباد کرنے کا حوصلہ نہیں تھا اس میں۔

اور وہ لمحہ ٹھہر گیا۔وہ لمحہ رہ گیا۔

پوری دنیا میں خود کو تنہا تصور کرنے والی جنت کمال۔اس لمحے "تنہا" نہیں تھی۔

اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔صابرہ بوا نے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ان کے سینے میں سر دیے وہ چھوٹے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

ساری محرومیاں، ساری اذیتیں، سارے کے سارے غم یکایک عدم ہوئے۔وہ ایک عطا۔ہر مصیبت پر بھاری ہو گئی۔وہ ایک انعام ہر درد کو فنا کر گیا۔

"دعائیں رد نہیں ہوتیں جنت!! محفوظ کر لی جاتی ہیں، جو آپ مانگ رہے ہوں وہ نہ ملے تب بھی۔ آپ کے ہاتھ خالی نہیں لوٹائے جاتے! اللہ ہمیشہ بڑھ کر عطا کرتا ہے، وہ آپ کو حیران کر دیتا ہے۔"

اور اس کے خدا نے اسے حیران کر دیا تھا۔

☆☆☆

"جنت کے شوہر نے بتایا نہیں اس نے گھر کیوں چھوڑا؟"

سیڑھیاں اتر کر نیچے آتے ہوئے آواز سماعت سے ٹکرائی تو عمار اپنی جگہ تھم کر رہ گیا۔بے ساختہ گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔پھر آہستگی سے قدم اٹھاتا آگے بڑھا۔ڈرائنگ روم کی نشستوں پر خاندان کے بڑے سب براجمان تھے۔سائرہ سامنے ہی سر جھکائے بیٹھی تھیں۔جنت کے چچا، چچی، پھپھی، چھوٹی چچی وغیرہ سب موجود تھے۔

"کسی کے ساتھ کوئی چکر تو نہیں چل رہا تھا اس کا؟" کریمہ آنٹی اس کے باپ سے کہہ رہی تھیں۔وہ اپنی جگہ ساکت سا انہیں دیکھ کر رہ گیا۔وہ جنت کی سگی پھپھو تھیں۔

مجلس میں جنت کا کردار ڈسکس ہو رہا تھا۔خاندان بھر میں طرح طرح کی باتیں پھیل گئی تھیں۔اور طرح طرح کی پھیلی ہوئی ان باتوں کی تصدیق کے لیے ہی وہ لوگ یہاں جمع ہوئے تھے۔کسی کو یہ خبر ملی تھی کہ وہ گھر کے کسی ملازم کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور کسی نے یہ سنا تھا کہ فارس وجدان کے کسی دوست کے ساتھ اس کا چکر چل رہا تھا تب ہی اسے گھر سے نکال دیا گیا۔

وہ اپنی جگہ ساکت سا، پتھرایا ہوا کھڑا تھا۔کوئی اتنا بے حس، اتنا بے رحم کیسے ہو سکتا ہے؟ گردن موڑ کر اس نے حفصہ آپی کو دیکھا۔وہ سر جھکائے شرمندہ سی بالکل خاموش بیٹھی تھیں۔نہ جواب دینے کی ہمت تھی۔نہ صفائی پیش کرنے کی سکت۔جنت کمال ایک بار پھر ان کی ذاتی زندگیوں میں بھونچال لے آئی تھی۔ایک بار پھر ان کی فیملی زبان زد عام آ گئی تھی۔ کمال کی بیٹی۔کمال کی بیٹی۔اب سب کہہ رہے تھے۔اور وہ خاموش تھیں۔ہمیشہ کی طرح۔آج بھی ان کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔

"حیرت ہے کسی نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ جنت نے اپنا گھر فائزہ آنٹی کی وجہ سے چھوڑا ہے جنہوں نے اس کے گھر جا کر اچھا خاصا تماشا کری ایٹ کیا۔" وہ اندر داخل ہوتے ہی بول پڑا تھا۔

"ہاں تو حرکتیں ہی اس کی ایسی تھیں، منہ دکھانے کے قابل جو نہیں رہی ہوگی۔" کریمہ آنٹی نے فوراً سے پینترا بدلا۔

"حرکتیں؟ کیسی تھیں اس کی حرکتیں؟" وہ آنکھوں میں غصہ لیے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"ایسی فتنہ پرور لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔پہلے اپنے بھائی کی جان لی، پھر ہمارے بھائی کا سر کھایا۔برہان کی زندگی جہنم بنائے رکھی۔ذرا پوچھو تو عالیہ سے۔کیسے دن بھر فون سے چپکی رہتی تھی۔عشق معشوقے سے فرصت ملتی تو گھر سنبھالتی۔ایک تو بانجھ۔" انہوں نے حقارت سے سر اٹھایا۔"اور اوپر سے ڈھٹائی الگ۔ماہین کا بچہ مارنے کی کوشش تک کر ڈالی۔نفیسہ بہن تو اس کی موت ماری گئیں۔ارے میں نے تو سجاد سے کہہ دیا تھا، غیروں کے لائق نہیں ہے یہ۔اپنے زمان سے نکاح کر دو، وہی اسے سیدھا رکھے گا مگر نہیں۔"

عسریسرا۔ حسنیٰ حسین

وہ غصے اور حقارت سے بہت سی باتیں۔ بہت سے قصے۔ بہت سے واقعات سناتی جارہی تھیں۔اور کوئی بھی انہیں ٹوک نہیں رہا تھا۔

یہ سب ایسے ہی تھا۔ یہ سب شروع سے ایسے ہی چلتا آرہا تھا۔

"بس کردیں آنٹی فار گاڈ سیک۔'' وہ سارا لحاظ اور مروت بالائے طاق رکھتے ہوئے چیخ پڑا۔

"ابراہیم صاحب! آپ کا بیٹا تو پورا باؤلا ہوگیا ہے، نہ چھوٹے بڑے کی تمیز ہے نہ لحاظ کر رہا ہے کسی کا۔''

ابراہیم صاحب نے اسے تنبیہہ کرتے ہوئے بڑوں کی محفل سے چلے جانے کا حکم دیا تھا مگر آج اسے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ نہ سائرہ۔ نہ ابراہیم۔اور نہ خاندان کا کوئی فرد۔

"اگر پاگل کہہ ہی دیا ہے آپ نے مجھے۔تو پھر میرے پورے پاگل پن کا مظاہرہ بھی دیکھ لیں۔آپ کو کیا لگتا ہے ہم کل کے بچے۔بے وقوف اور ناسمجھ ہیں؟ ہمیں کچھ نظر نہیں آتا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا؟ نفیسہ آنٹی جنت کی وجہ سے نہیں۔آپ سب کی وجہ سے مری ہیں۔'' اس نے انگلی اٹھا کر سب کی طرف اشارہ کیا تھا۔''انہیں بیٹیوں کے طعنہ دینے والے آپ لوگ تھے۔ان پر طنز و تشنیع کرنے والے آپ لوگ تھے۔ان کی محرومی کا آپ لوگوں نے سر عام مذاق اڑایا۔انہیں ذہنی مریض بنا دیا۔ذرا محاسبہ کرتے ہیں آنٹی۔مجھے بتائیے صبا آپی نے حال ہی میں چوتھی بیٹی کو جنم دیا ہے۔دن رات سسرالیوں کے طعنے سن رہی ہیں ناوہ۔وہی لفظ جو کبھی آپ نے نفیسہ آنٹی کو سنائے تھے؟''

کریمہ آنٹی کے چہرے پر تاریک سایا لہرا گیا۔

''آپ کی اپنی اولاد آپ کے غرور اور تکبر کا خمیازہ بھگت رہی ہے اور آپ میں اب بھی جرأت باقی ہے کہ......آپ اسی عورت کی بیٹی کو ایک بار پھر نشانہ بنا رہی ہیں؟''

ڈرائنگ روم میں خاموشی تھی۔اب تو جیسے کوئی سانس بھی نہیں لے رہا تھا۔

"روحینہ چچی کو ناز تھا وہ چار بیٹوں کی ماں ہیں۔ چار شیر جوان ان کے گھر پیدا ہوئے ہیں۔ان کی نسلیں آگے چلیں گی۔نفیسہ آنٹی ان کے سامنے سات بیٹیوں کی ماں۔کوئی حقیر سی مخلوق تھیں۔ اور آج۔ان کے وہ تمام کے تمام بیٹے۔صرف "بیٹیوں'' کے باپ ہیں۔'' اس نے رخ بدل کر انہیں دیکھا۔''آپ اب اس بات کو زیر بحث کیوں نہیں لاتیں؟ سات بیٹیوں کی ماں ہونا نفیسہ آنٹی کا قصور تھا۔اب اتنی ساری پوتیوں کی دادی ہونا کس کا قصور ہے؟''

اور روحینہ چچی کو یوں لگا تھا جیسے بھرے بازار میں کسی نے طمانچہ دے مارا ہو۔سائرہ نے پہلی بار اپنے بیٹے کو نہیں ٹوکا تھا۔ حفصہ آنکھوں میں حیرت صدمہ لیے اسے دیکھے جارہی تھی۔

"میں حیران ہوں، آپ لوگوں میں ابھی بھی ہمت ہے اس طرح اس عورت کی اولاد پر زبان درازی کرنے کی جس کی زندگی آپ لوگوں نے خود جہنم بنائی۔اور اتنی بے حسی کہ ذرا فرق نہیں پڑا۔اللہ تو اپنا حساب لے رہا ہے۔یہ کیسے ہوسکتا ہے آپ سب اپنے حساب سے۔اس طرح بے خبر رہیں؟ آپ لوگوں نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں تو اس کا مطلب ہے ہمیں بھی کچھ نظر نہیں آتا ہوگا؟''

ڈرائنگ روم میں اتنا سناٹا چھا گیا تھا کہ اگر سوئی بھی گرتی تو اس کی بھی آواز آتی۔کسی بھی بڑے فرد کی سکت نہیں رہی تھی کچھ بھی بولنے کی۔ وہ سب جنت کے معاملے میں اکھٹے ہوئے تھے۔اور عمار نے تو جیسے ان سب کے اجتماع کو نشانہ بنا کر سب کی حقیقتیں ان کے منہ پر دے ماری تھیں۔

وہ شدید غصے کے عالم میں بپھرا ہوا سا کھڑا تھا۔

"جنت کبھی اپنی اولاد کے لیے درباروں مزاروں پر نہیں گئی۔اور آپ لوگ کہتے ہیں ماہین کا بچہ ضائع کرنے کے لیے اس نے تعویذ گنڈے کروائے ہیں؟''

وہ سراپا سوال بنا ان سب کو دیکھے جارہا تھا۔

''اب بر جان کے گھر جو بھی نقصان ہوگا تو اس کا الزام ساری عمر جنت کے سر ڈالتے رہیں گے آپ لوگ؟ جب اسے اپنی زندگی سے، خاندان سے بے دخل کر چکے ہیں تو پھر اسے ڈسکس کرنے کا مقصد؟ فائزہ چچی کو کوئی حق نہیں پہنچتا تھا اس طرح اس کے گھر جا کر، اس کے سسرالیوں کے سامنے بے عزت کرنے کا۔اور خدا کے لیے۔'' اس نے ہاتھ جوڑے۔''اب بخش دیں جنت کو!''

بات ختم نہیں ہوئی تھی۔مگر اس نے ختم کردی۔عکس ادھورے تھے۔اور اس نے ادھورے رہنے دیے۔آئینہ مکمل اور سلامت تھا۔حقیقتیں بھی اتنی ہی تلخ اور نمایاں۔

جو خاموشی اس کی موجودگی میں چھائی ہوئی تھی، وہ اس کی غیر موجودگی میں بھی ٹھہری رہی۔کسی میں ہمت نہ رہی تھی مزید کوئی بات یا بحث کر سکے۔کوئی دلیل دے سکے۔یا کچھ تردید کر سکے۔

وہ مجلس، وہ اجتماع سب کا احتساب ہوگیا تھا۔آئینے میں ہر کسی کا کریہہ چہرہ واضح تھا۔اور اس چہرے سے تقریباً سب نے نظریں چرائی تھیں۔کہ حقیقت کا سامنا تو پھر وہ لوگ کرتے ہیں جو خود کو بدلنا چاہتے ہوں۔

ایک ایک کر کے سب اٹھتے چلے گئے۔صرف حفصہ کمال ہی تھی جو اپنی جگہ سن بیٹھی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

وہ تین دن ہسپتال میں رہی۔طبیعت کچھ بہتر ہوئی تو اسے ڈسچارج کر دیا گیا۔صابرہ بوا اسے اپنے گھر لے آئیں۔ان کا الگ

پورشن تھا۔وہ بیرونی دروازے سے ان کے ہمراہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی تھی۔ بیماری کا اثر ہنوز تھا۔کمزوری اتنی ہوگئی تھی کہ ذرا سی سیڑھیاں چڑھنے پر اس کا سانس پھول گیا تھا۔

اوپر ایک وسیع وعریض کمرہ تھا۔بوا اسے کمرے میں لے آئیں۔

ہوادار لمبی کھڑکیاں جو پیچھے سرسبز کھیتوں کی طرف کھلتی تھیں۔اور سامنے والی کھڑکیوں سے نیچے صحن کا پورا منظر نظر آتا تھا۔ جامن کا پھیلا ہوا درخت۔سائے میں بچھی ہوئی چارپائی۔سرخ اینٹوں کا پکا صحن۔سفید دیواروں پر سرسبز بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ آہنی گیٹ بند تھا۔نیچے تین کمرے تھے۔کچن تھا۔مردوں کے لیے الگ سے بیٹھک سامنے ہی بنی ہوئی تھی جس کا ایک دروازہ باہر سے کھلتا تھا۔

صابرہ بوا کی بھانجی نیچے مقیم تھی۔اوپر کا کمرہ، واش روم اور چھوٹا سا کچن ان کے حوالے تھا۔

وہ کھڑکی میں کھڑی نیچے دیکھنے لگی۔

بچوں کے شور کے ساتھ صندل آپا کی آواز واضح تھی۔ان کا نو سالہ بیٹا پائپ ہاتھ میں پکڑے درختوں کو پانی دیتا اس کا رخ اپنی چھوٹی بہن کی طرف موڑ چکا تھا۔اور اس شدید گرمی میں ٹھنڈک کے احساس سے خوش ہونے کے بجائے وہ بھاں بھاں کر کے رونے لگی تھی۔

"علی۔"صندل آپا نے کچن سے ہی اسے کڑی نظروں سے دیکھا تھا۔اور اس نے وہیں پائپ سر پر کیے خود کو مکمل بھگو لیا۔

"ایک تو گرمی میں کام کرواتی ہیں۔اوپر سے ڈانٹتی بھی ہیں۔"

"یہ درختوں کو ذرا سا پانی دینے سے تمھاری کمر ٹوٹتی ہے؟"

"ذرا سا پانی دیتا ہوں؟" آنکھیں پھیلا کر وہ اپنی ماں کی طرف مڑا۔

"ابھی کہیں گی، پورے صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کرو۔پھر یہاں سے ساری چارپائیاں ہٹوا کر وہاں رکھوائیں گی۔اس کے بعد باہر بھیجیں گی۔علی یہ لے آؤ۔علی وہ لے آؤ۔علی یہ کام کرو۔علی وہ کام کرو۔"شلوار اور بنیان میں وہ دھوپ میں کملایا ہوا سا کھڑا تھا۔ جنت کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ ابھری۔صندل آپا اس سے ہسپتال میں ملنے آئی تھیں تو ان کے ساتھ وہ بھی تھا۔

"اللہ معاف کرے۔کب تم سے چارپائیاں اٹھواتی ہوں میں؟"

"اس دن نہیں اٹھوائی تھیں جب یاور چاچو آئے تھے؟ یہاں رکھو۔وہاں رکھو۔ اب وہاں رکھو۔"

"ایک ہی تو چارپائی تھی۔وہ بھی فاطمہ کی۔حد ہے۔طعنے سن لو موصوف سے۔"وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔موٹر بند کر کے کچن کا رخ کیا تو وہ مکمل بھیگا ہوا کمر پر ہاتھ ٹکائے کھڑا تھا۔دھوپ میں آنکھیں چندھیا کر یہاں وہاں دیکھتا۔چھوٹی بہن اپنا منہ خشک

کرتی، جامن کے ساتھ بندھے جھولے پر ٹنگ گئی تھی۔

اب وہ بہن کے سر پر کھڑا تھا۔اور اسے جھولا چھوڑنے کا کہہ رہا تھا۔بہن نے رسیوں پر گرفت جما کر نفی میں زور وشور سے سر ہلایا اور ایک بار پھر چلائی۔

"اماں۔"

"علی!مت تنگ کرو اسے۔"صندل آپا جھنجھلائیں۔

"اے ہے لڑکے!دو گھڑی سکون سے بیٹھ جا کہیں۔"صابرہ بوا کمرے سے باہر نکل کر سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے بولی تھیں۔وہ پھر سے بگڑ گیا۔دھپ دھپ پاؤں اٹھاتا آہنی گیٹ دھکیل کر باہر نکل گیا۔

پھر اسے آنگن میں دو سالہ بچی نظر آئی۔فیڈر ہاتھ میں لیے وہ جھولا جھولتی بہن کے پاس چلی گئی تھی۔کچھ دیر بعد کسی کونے سے تیسری بچی نمودار ہوئی۔تقریباً چھ سال عمر ہوگی۔ایک ہاتھ میں کاپی اور دوسرے ہاتھ میں پینسل لیے۔سائے میں رکھی چارپائی پر بیٹھ کر اپنا ہوم ورک کرنے لگی۔

"یہ میں صندل کا سوٹ لے آئی ہوں۔یہی پہن لو۔کل بازار جاؤں گی تو گرمیوں کے سوٹ لے آؤں گی۔"بوا اندر داخل ہوتے ہی بولی تھیں۔وہ مڑ کر انہیں دیکھنے لگی۔

الماری کھول کر انہوں نے ایک سوٹ اندر لٹکا دیا۔اور دوسرا بیڈ پر رکھ دیا تھا۔

"نہا کر کپڑے بدل لو۔میں تب تک کھانے کا انتظام دیکھ لوں۔صندل تو کہہ رہی ہے، آلو گوشت پکائے گی۔میرا ارادہ ہے، ساتھ میں بریانی بنا لیتے ہیں۔تمہیں ویسے بھی بریانی بہت پسند ہے۔"تیزی سے بیڈ شیٹ بدلتے ہوئے انہوں نے کہا اور جنت گم صم انہیں دیکھتی رہی۔

"ڈاکٹر نے کہا ہے، خوراک کا بہت خیال رکھنا ہے۔بالکل کمی نہیں ہونی چاہیے۔ اور تم تو ہو ہی سدا کی لاپروا۔سب کچھ مجھے ہی دیکھنا ہوگا۔"ان کے لہجے اور انداز سے پیار، خفگی، تنبیہ خوشی نمایاں تھی۔بات کرتے ہوئے وہ اشتیاق میں آ جاتیں۔کچھ سوچ کر بے ساختہ مسکرانے لگتیں۔"ڈاکٹر صاب زندہ ہوتے تو کتنے خوش ہوتے۔"

"میرے لیے اتنا اہتمام نہ کریں۔" اس کے لب ہلے۔

بوا نے اب کے اسے ذرا خفگی سے دیکھا تھا۔"کیوں اہتمام نہ کریں؟ میں تو کوئی کمی نہیں ہونے دوں گی۔سلیم کو بتایا تو کہہ رہا تھا، پیسے بھیج دے گا۔مجھے خاص تاکید کی جنت کا خیال رکھیے گا۔کسی چیز کی کمی نہ ہو۔پھل فروٹ، سبزیاں۔اب کل عامر سے کہہ کر منگواؤں گی سب۔"

وہ جیسے خود سے سب طے کر رہی تھیں۔ اسے اپنی ذمہ داری سمجھ کر۔ اس کے لیے ہر فیصلہ خود کر رہی تھیں۔

"میں آپ پر بوجھ نہیں بننا چاہتی بوا!" جو بات دل میں تھی۔ وہ لبوں پر آ گئی۔

"چپ۔ ایک لفظ نہیں۔" انہوں نے جھڑک دیا۔ "یہ تیرا گھر ہے، تو میری بیٹی ہے، میں وہ دن کیسے بھول سکتی ہوں جب ڈاکٹر صاب نے مجھے اور سلیم کو اپنے گھر پناہ دی تھی۔ جب ہم بے سہارا تھے تو وہ ہمارا سہارا بنے۔ سلیم کو اس کے پیروں پر کھڑا کیا، اس کے سارے اخراجات خود اٹھائے۔ اور اب جب ان کی بیٹی پر وقت آیا ہے تو میں منہ موڑ لوں گی؟"

انہوں نے بہت محبت سے اس کے گال پر ہاتھ رکھا۔ اس کے آنسو پونچھے۔ وہ نچلا لب دانتوں تلے دبائے رونے پر قابو پاتی رہی۔

"چل جلدی سے فریش ہو جا پھر کھانا بھی کھانا ہے۔"

وہ کپڑے اٹھا کر واش روم میں گھس گئی۔ شاور چلتا رہا تو آنسو بھی بہتے رہے۔ اپنی حالت سوچ سوچ کر اذیت بڑھتی رہی۔

کپڑے بدل کر وہ تولیے سے بال خشک کرتی باہر آئی تو دروازے کی درز سے جھانکتا سر یکا یک غائب ہوا۔

وہ علی تھا۔ یقیناً علی تھا۔ دروازہ کھول کر باہر آئی تو وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتا نظر آیا۔

اس نے ظہر کی نماز پڑھی پھر کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر بال اچھی طرح خشک کیے۔ کنگھی کی۔ کچھ ہی دیر بعد بوا ٹرے ہاتھوں میں لیے اندر آ گئی تھیں۔ ساتھ ہی صندل آپا بھی تھیں۔ دو سالہ بیٹی کو اٹھائے وہ اس سے بہت محبت سے ملیں۔

کھانا انہوں نے وہیں اکٹھے کھایا۔ یہ الگ بات تھی کہ ان کی محبت اور اخلاق کے آگے وہ بار بار آنکھوں میں ابھرتی نمی کو پیچھے دھکیل رہی تھی۔

بمشکل آدھی روٹی اور بریانی کے کچھ چمچ لینے کے بعد اس نے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ بوا اسے پیار بھری خفگی سے دیکھ کر رہ گئیں۔ "ختم کرو اسے شاباش۔"

"بھوک نہیں ہے بوا!"

"اب تمہیں صرف اپنی بھوک کی فکر تھوڑی کرنی ہوگی۔" صندل آپا ہنسیں۔ وہ خفیف سا ہو کر سر جھکا گئی۔ اسے بہت سارا رونا آ رہا تھا۔ شاید بیماری کا اثر زائل نہیں ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت حساس ہو رہی تھی۔

"بعد میں کھا لوں گی بوا۔ ابھی اتنا ہی۔"

بوا نے مزید اصرار نہ کیا۔ میڈیسن لینے کے بعد وہ تیز پنکھا چلائے سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ بوا اس کی طرف سے تسلی کر کے نیچے چلی گئیں۔

صحن میں ایک بار پھر صندل آپا اور علی کی تکرار شروع ہو چکی تھی۔ مگر آواز مدھم تھی۔ اور کچھ دیر میں مدھم سے بالکل ختم ہو گئی تھی

☆☆☆

دیوار گیر کھڑکیوں سے پوری تاریخ کا چاند نظر آ رہا تھا۔ پردے بندھے ہوئے تھے۔ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔

کمرے میں ہر طرف اور ہر جگہ بے ترتیبی سی تھی۔ خود وہ صوفے پر بیٹھا تھا۔ پیچھے کی طرف سر گرائے۔ بازو پھیلائے۔ چھت پر کچھ دیکھتے۔ یادداشت کے کسی کونے میں کچھ کھوجتے۔ سکون اندر باہر اور آس پاس کہیں نہ تھا۔ راتوں کی نیند تو ویسے بھی اڑی ہوئی تھی۔ بھوک ختم۔ طلب تمام۔

سماعتیں فون پر ٹھہری تھیں۔ منتظر نگاہیں، اسکرین کو تکتی تھیں۔ دوسری طرف خاموشی تھی۔ کوشش تھی اور ناامیدی تھی۔

پانی کا گلاس ٹیبل پر رکھا تھا۔ کافی کا خالی کپ اور نیند کی گولیاں بھی۔

اس نے اپنی آنکھوں کو مسل ڈالا۔

دروازے پر ایک بار پھر دستک ہوئی۔ ملازمہ ایک بار پھر اسے مسز شیرازی کا پیغام دینے آئی تھی۔ اس نے جواب دیا، نہ اٹھ کر نیچے گیا۔ قدموں کی چاپ ابھری۔ راہداری میں خاموشی چھا گئی۔

کچھ ہی دیر میں جنت کا موبائل بج اٹھا۔ مسز آفاق کے نمبر سے سات سالہ زید کے میسجز آنے لگے۔ وہ اپنی ممی کے ساتھ شاپنگ کر رہا تھا۔ اور اس نے جنت کے لیے ایک انگیجمنٹ رنگ بھی پسند کر لی تھی۔

ہر تھوڑی دیر بعد وہ اپنی ماں کے موبائل سے اپنی سیلفی بھیج دیتا۔ کہیں پر ہنستے۔ کہیں پر مسکراتے۔ کہیں پر سوزی کو گلے لگاتے ہوئے۔

اب کی بار نوٹیفیکیشن میں دو تصویریں نظر آئیں۔ وہ جنت سے پوچھ رہا تھا ان دونوں میں سے کس رنگ کی انگوٹھی زیادہ پیاری ہے۔ فارس نے موبائل اٹھا کر تصویر دیکھی۔ اسے دونوں پسند نہیں آئیں۔

"وچ ون؟" جنت کا فیانسی پوچھ رہا تھا۔ اور شوہر لب بھینچ کر میسجز دیکھ رہا تھا۔ کچھ توقف کے بعد دو اور تصویریں بھیجی گئیں۔

بچوں کی کھلونا دکانوں میں نقلی میک اپ کٹس کے ہمراہ پلاسٹک جیولری سے منتخب کی جانے والی ایک ٹافی جتنی انگوٹھی۔

اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی گلابی رنگ کی انگوٹھی کو ڈن کر دیا۔ خیال تھا اب میسجز نہیں آئیں گے۔ مسیج نہیں آئے۔ ریکارڈنگ آ گئی۔

"زویا سئے السلام علیکم ٹو یور فیوچر بھابی!" وہ اپنی تین سالہ بہن کو سکھا رہا تھا۔ بہن کے حلق سے ہلکی سی اور کیوٹ سی آواز ابھری۔ "اشامیکم بابی!"

یہ دنوں بچے پچھلے کئی دنوں سے اس کا دردسر بنے ہوئے تھے۔اس نے موبائل سائلنٹ کر کے خود سے پرے رکھ دیا۔پانی کے ساتھ نیند کی گولی لینے کے بعد ایک بار پھر سونے کی کوشش کی۔

اندر کا اضطراب بڑھ گیا۔شور بڑھ گیا۔درد بڑھ گیا۔

دروازے پر ایک بار پھر دستک ہوئی۔وہ سنی ان سنی کیے پڑا رہا۔

☆☆☆

وہ بیڈ سے ٹیک لگائے کارپٹ پر دوزانو بیٹھی تھی۔چہرہ زرد تھا،آنکھیں سرخ اور بے تحاشا نم ہو رہی تھیں۔

زرکار روشنی میں کرب نمایاں تھا۔تنہائی میں وہ سراپا مجسم ہوئی خالی ویران آنکھوں سے اندھیرے میں دیکھ رہی تھی۔

پانی کا گلاس پاس رکھا تھا۔صرف دو گھونٹ لیے گئے تھے۔زندگی اور نصیب کی دہشت ویسی ہی تھی۔خوف وہیں ٹھہرا تھا۔سانسیں وہیں اٹکی تھیں۔

رات کے آخری پہر بہت اچانک اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور اب تب سے وہ اسی حالت اور اسی پوزیشن میں بیٹھی ہوئی تھی۔بہت سی باتیں تھیں جو یاد آ رہی تھیں۔بہت سی حکایتیں تھیں جو واضح ہو رہی تھیں۔بہت سے خیال،وسوسے،اندیشے۔رہ رہ کر سر اٹھا رہے تھے۔دل تڑپ رہا تھا۔آنسو بہتے جا رہے تھے۔اسے مسز شیرازی بہت شدت سے یاد آ رہی تھیں۔انہیں کھو دینے کا غم تڑپائے جا رہا تھا۔

اس نے وعدہ کیا تھا،وہ انہیں ان کے پوتے سے ضرور ملوائے گی اور یہ وعدہ اس گھر کی دہلیز پار کرتے ہی فنا ہو گیا تھا۔سارے رشتے،سارے تعلق وہیں رہ گئے تھے۔اس سے پہلے کہ وہ اسے چھوڑتیں،وہ خود انہیں چھوڑ آئی تھی۔مگر دل وہیں رہ گیا تھا۔روح یہاں بھٹک رہی تھی۔

محبت کو نفرت میں بدلتے وہ دیکھ چکی تھی۔دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔اس اذیت سے دوبارہ گزرنے کا حوصلہ نہیں تھا اس میں۔اور اسے غم تھا۔اور بہت بڑا غم تھا کہ وہ ان کی محبت سے محروم کر دی گئی تھی۔

مسز شیرازی اب ہاتھ اٹھاتی ہوں گی تو اس کا نام نہیں لیتی ہوں گی۔اسے سوچ کر انہیں کراہت آتی ہوگی۔وہ اس کے وجود سے نفرت کھاتی ہوں گی۔کم الزام نہیں تھے جو فائزہ چچی نے اس کی ذات پر لگائے تھے۔کسی گناہ،کسی غلطی،کسی جرم کا پردہ نہیں رکھا تھا انہوں نے۔سب اگل دیا تھا۔سب کہہ دیا تھا۔

کمرے کی تمام کھڑکیاں اور دروازے کھلے ہوئے تھے۔پنکھا بھی چل رہا تھا۔موسم ٹھنڈا تھا اور اسے پھر بھی گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔

"ایک سرپرائز ہے تمھارے لیے۔کراچی سے آؤں گا تب۔"

حکایت لکھی جا چکی تھی۔انجام سوچا جا چکا تھا۔اور اسے پھر بھی رونا آ رہا تھا۔یہ جدائی۔یہ فاصلے۔یہ سزا تو روز اول سے طے تھی۔وہ ہر حقیقت کو تسلیم کر چکی تھی۔ساتھ رہنے کی خواہش بدل چکی تھی۔اس نے خواب نوچ کر پھینک دیے تھے۔انتظار سمیٹ کر رکھ دیا تھا۔احساسات کو منجمد۔اور جذبات کو فنا کر کے اس نے خود کو عدم کی وادیوں میں دفنا دیا تھا۔اس کا خیال تھا،ایسے درد کم ہو گا،دکھ کم ہوگا،رونا کم آئے گا۔

مگر اس کا خودساختہ ڈیفنس میکینزم خسارے میں گیا تھا۔اسے تکلیف زیادہ ہوئی تھی۔اسے رونا زیادہ آ رہا تھا۔وہ تڑپ رہی تھی۔وہ جل رہی تھی۔

"مجھے طلاق فوری چاہیے ہوگی۔تمہیں ابھی سے ڈاکومنٹس کا انتظام کر لینا چاہیے تاکہ مناسب وقت پر بنا کسی تاخیر کے سائن کر کے ایک دوسرے سے جان خلاصی کی جا سکی!لیکن اگر کچھ وجوہات کی بنا پر۔مجھے قبل از وقت یہ گھر چھوڑنا پڑ جاتا ہے۔ اور اس دوران میرا تم سے فی الفور رابطہ بھی ممکن نہیں ہو پاتا تو میں ایک ماہ تک کی مدت کو ذہن میں رکھوں گی اور اس کے بعد سمجھ جاؤں گی کہ مجھے طلاق ہو چکی ہے۔سو تمہیں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ مجھے اس ایک ماہ کے اندر اندر طلاق ہو جانی چاہیے۔"

دو ہفتے گزر چکے تھے۔تیسرا ہفتہ گزرنے والا تھا۔اس نے اپنی آنکھوں کو ایک بار پھر بے دردی سے رگڑ ڈالا۔اب تک وہ یقیناً اسے طلاق دے چکا ہوگا۔عدینہ زبیر اس کی زندگی میں واپس آ چکی ہوگی۔نفرتوں کے بادل چھٹ گئے ہوں گے۔محبتوں کا نور پھیل گیا ہوگا۔جو اس کے ساتھ ہوتے ہوئے ادھورا تھا،وہ من چاہے ساتھی کے ساتھ مکمل ہو گیا ہوگا۔اس کی زندگی میں جنت کمال کی جگہ پہلے بھی نہیں تھی،اب بھی نہیں رہی ہوگی۔گال صاف کر کے وہ اٹھ گئی۔وضو کر کے جائے نماز بچھائے قبلہ رخ کھڑی ہو گئی۔

کچھ سجدوں میں وہ روتی رہی تھی۔اور کچھ سجدوں میں ہمت اور آسانیاں مانگتی رہی تھی۔اسے یہاں۔اس نئی جگہ پر۔اک نئی زندگی کا آغاز کرنا تھا۔وہ اپنا ماضی بھلا دینا چاہتی تھی۔

اور باہر دروازے کے پاس کھڑی صابرہ بوا آنکھوں میں رحم اور ہمدردی لیے اسے دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

اقصیٰ نے ذرا دور سے ہی فارس کو دیکھا۔کچن کاؤنٹر ٹیبل کے اس پار سیاہ ٹراؤزر پر فل سلیو سفید شرٹ میں ملبوس اپنے لیے قہوہ بنا رہا تھا۔سر جھکا ہوا تھا،ماتھے پر بے ترتیبی سے بکھرے بال آنکھوں پر آ رہے تھے۔ابھی کچھ دیر پہلے پٹھانی نے کہا تھا،اسے صاحب بلا رہے ہیں۔تب سے ہی وہ فکر میں تھی۔وہیں کھڑے کھڑے اس نے ذہن دوڑا کر خود سے سرزد ہونے والی کسی ممکنہ غلطی یا کوتاہی کو یاد کرنا چاہا مگر ذہن ماؤف ہی رہا۔

بمشکل گلا کھنکھارتے ہوئے اس نے فارس وجدان کو اپنی موجودگی کا سگنل دینا چاہا۔ ساتھ ہی دوپٹے کو انگلیوں میں ڈال کر بے چینی سے گھمایا جا رہا تھا۔ ''آپ نے بلایا مجھے؟''

قہوہ کپ میں انڈیل کر وہ اس کی طرف مڑا۔ ''بیٹھو۔''

"جی؟''

گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے سامنے اسٹول چیئر کی طرف اشارہ کر دیا۔ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتی وہ بیٹھ گئی۔ سر جھکا ہوا تھا۔ ذرا سی نگاہیں اٹھا کر اپنے صاحب کو دیکھنا چاہا۔

لاپرواہ سا حلیہ۔ بے خوابی کا شکار سرخ آنکھیں۔ بڑھی ہوئی شیو۔ زرد چہرہ۔ اس کی جنت آپی کی غیر موجودگی میں صاحب ''ایسے'' ہو گئے تھے۔

"پچھلے ماہ جنت تمہیں ساتھ لیے کافی گھومتی پھرتی رہی ہے۔''

"جی صاحب!'' پھانس کی طرح کوئی شے اس کے حلق میں آ کر اٹک گئی۔ گزشتہ ایک ماہ کی روٹین ذہن میں دوڑ گئی۔ جنت کی باتیں، وعدے، ڈانٹ اور تنبیہہ سب یاد آ گیا۔

"ڈرائیور بتا رہا تھا، اس نے ایک بار جنت کے کہنے پر کسی رہائشی کالونی میں اسے اتارا تھا۔ تم بھی ساتھ تھیں۔ پھر واپسی پر وہیں سے چار گھنٹوں کے بعد پک کیا تھا۔''

اقصیٰ کو ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ سمجھ میں نہیں آیا۔ اقرار کرے یا انکار!

"کہاں گئی تھیں تم دونوں؟''

کچھ بتاتے بتاتے اس نے یکا یک نچلا لب دانتوں تلے دبایا۔ "جی......وہ......شاپنگ پر گئے۔ تھے۔''

"رہائشی کالونی کی تنگ گلیوں میں شاپنگ ہو رہی تھی؟''

فارس نے بھاپ اڑاتا کپ رکھ دیا۔ اقصیٰ جی بھر کر پریشان اور شرمندہ ہوئی۔ اب کیا کرے؟ اسے جھوٹ بولنا واقعی میں نہیں آتا تھا۔

"کچھ پوچھ رہا ہوں میں تم سے اقصیٰ؟''

اس نے ذرا سی نظریں اٹھا کر اپنے صاحب کو دیکھا۔ وہ بہت تحمل سے پوچھ رہا تھا۔ مگر وہ جانتی تھی مطلوبہ جواب نہ ملنے کی صورت میں یہ تحمل اس پر زلزلہ بن کر گر سکتا تھا۔

اس نے کچھ ہمت مجتمع کی۔ کچھ حوصلہ پیدا کیا۔ جو قسمیں کھا رکھی تھیں، ان کے ٹوٹنے پر کفارے کے طور پر روزوں کا حساب

کیا۔ ایک بار پھر پسینہ صاف کیا۔

"جنت آپی مجھے کسی کے گھر لے کر گئی تھیں۔'' اس نے بتا دیا۔ حالانکہ جنت نے کہا تھا اس کا ہر راز قبر تک جانا چاہیے۔ اب راز چھپاتے چھپاتے وہ خود تو قبر میں نہیں اتر سکتی تھی نا؟

"اگر میں تمہیں وہاں لے جاؤں تو تمہیں گھر کا اندازہ ہو جائے گا؟''

اقصیٰ نے کچھ فکرمندی سے اسے دیکھا۔ جنت آپی کی وجہ سے پورا گھر پریشان تھا۔ اگر اس طرح ان کا کوئی سراغ ملتا ہے تو اسے ہرگز ہرگز خاموش نہیں رہنا چاہیے۔ ہمت کر کے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ایک بار پھر قسم اور وعدوں کا غم کھانے لگا تھا۔ جنت آپی جب واپس آئیں گی تو اسے ہرگز ہرگز معاف نہیں کریں گی۔ لیکن کوئی نہیں۔ وہ روزے رکھ لے گی۔ اور روزوں کے تصور سے اسے ایک بار پھر رونا آیا۔

غٹاغٹ ایک پانی کا گلاس چڑھایا اور فارس کے حکم پر اپنے ابا سے اجازت لے کر اس کے ساتھ روانہ ہو گئی۔ ڈرائیور کو جگہ کا علم تھا۔ گاڑی سڑک کنارے روک دی گئی۔

گاڑی سے اتر کر وہ پیدل اس کے پیچھے تنگ گلیوں میں چلتا رہا۔ کبھی دائیں طرف مڑتے۔ اور کبھی بائیں طرف رخ کرتے وہ تین منزلہ عمارت کے سامنے رک گئی۔ سامنے سے بالکونیاں نظر آ رہی تھیں۔ اسے یاد تھا، وہ دوسری منزل والے گھر میں گئی تھی۔ اور یہ بات اس نے فارس کو بتا بھی دی۔

"گھر میں کون کون تھا؟''

"ایک مرد تھا۔ اس کی بیوی۔ اور ایک بیٹا!''

فارس نے لمحے بھر کے لیے کچھ سوچا پھر واپسی کے لیے مڑ گیا۔

"آپ جائیں گے نہیں؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ جیسے یہ جگہ۔ یہ گھر ہی دیکھنے آیا تھا۔ اور شاید ملاقات کے لیے وہ کسی اور کو بھیجنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

ڈرائیور نے اسے گھر ڈراپ کر دیا۔ بیرونی گیٹ سے اندر داخل ہوتے اس نے گاڑی کی عقبی نشست کی طرف دیکھا۔

فارس موبائل فون کان سے لگائے کسی سے بات کرتے ہوئے مسلسل اپنی پیشانی مسل رہا تھا۔ وہ گہرا سانس لے کر اندر چلی گئی۔ گاڑی آگے بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

شام کا وقت تھا۔

صندل آپا کی چھوٹی بیٹی مروہ کو پہلو میں سلائے وہ چارپائی پر کروٹ کے بل لیٹی تھی۔ دوسری چارپائی پر صابرہ بوا ابھی آ کر بیٹھی تھیں۔ پرسوچ نگاہوں میں بہت سے سوال اور فکر لیے وہ جنت کو دیکھ رہی تھیں۔

"میں جانتی ہوں، یہ ایک مشکل بات ہے۔ لیکن کرنا بھی ضروری ہے۔" یونہی بیٹھے بیٹھے وہ کچھ سوچ کر مخاطب ہوئی تھیں۔

"اس نے تجھے ڈھونڈا تو ضرور ہوگا۔"

جنت کی آنکھیں دھیرے سے کھل گئیں۔ سوال غیر متوقع تھا۔

"کیوں ڈھونڈے گا وہ مجھے؟" اس نے ہمت کر کے پوچھا۔

"بیوی ہے تو اس کی۔"

لمحے بھر کے لیے ایک سکوت سا اس پر طاری ہوا۔ برہان کی بھی وہ بیوی تھی۔ وہ کبھی اس کے پیچھے نہیں آیا تھا۔ فارس شیرازی کے ساتھ تو یہ ایک زبردستی کا ان چاہا رشتہ تھا۔ جس کے آغاز سے پہلے ہی انجام طے کر دیا گیا تھا۔ وہ بھلا اس کے پیچھے کیسے آ سکتا تھا؟ اسے کیسے ڈھونڈ سکتا تھا؟

وہ بوا کو بتانا چاہتی تھی، انسان انہیں ڈھونڈتا ہے جو گم ہو جائیں۔ انہیں نہیں جنہیں وہ خود گم کر دے۔

"جنہ۔" اس کی خاموشی پر وہ ذرا بے قرار ہوئیں۔

"اب تک وہ اپنی پہلی بیوی کو واپس بھی لے آیا ہوگا بوا۔" اس نے اتنے عام لہجے میں اس انداز میں بات کی جیسے وہ اپنے شوہر کی نہیں محلے کے کسی دوسرے مرد کی بات کر رہی ہو۔ بوا تحیر سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

"اور تو...... تجھے واپس نہیں لانا چاہے گا؟"

اور بات تو "چاہت" کی تھی۔

"خواہش" کی تھی۔

اور "محبت" کی بھی۔

اور وہ نہ چاہت تھی۔ نہ خواہش۔ اور نہ محبت۔

"ہو سکتا ہے اس نے اب تک مجھے طلاق بھی دے دی ہو۔" اس نے مبہم لفظوں میں بہت نارمل سے لہجے میں طلاق کا اشارہ دے دیا۔ وہ چاہتی تھی بوا سمجھ لیں اختلاف کوئی چھوٹا موٹا نہیں۔

"اگر دے بھی دے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ طلاق تو نہیں ہو سکتی۔ تو حمل سے جو ہے۔"

جنت کی دھڑکنیں تھم سی گئیں۔ اندر باہر سناٹا چھا گیا۔ یہ خیال تو ایک لمحے کے لیے بھی اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔

"کیا بہت ظلم کرتا تھا؟ مارتا پیٹتا تھا؟" آنکھوں میں فکرمندی سموئے انہوں نے چند لمحوں کے توقف کے بعد تشویش سے پوچھا۔

لفظوں کی مار کے آگے۔ جسمانی تشدد کی کیا اوقات؟ اسے برہان سے پڑنے والا وہ تھپڑ یاد آیا۔ تکلیف اس تھپڑ کی زیادہ تھی۔ اور بہت زیادہ تھی۔

"نہیں۔"

بوا کی اٹکی ہوئی سانسیں یکایک بحال ہوئیں۔ انہوں نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ چلو تشدد کا مسئلہ نہیں۔

ایک بار پھر خاموشی حائل ہوگئی۔ آنکھیں موند کر جنت نے دل سے دعا کی بوا اور کچھ نہ پوچھیں۔

"جنہ۔ بچے! کیا صلح کا کوئی راستہ نہیں نکلتا؟" اب وہ محتاط لہجے میں بہت نرمی سے پوچھ رہی تھیں۔ اور یہ فقط سوال نہیں تھا۔ وہ اسے پلٹنے کا راستہ دکھا رہی تھیں۔ جنت دم سادھے رہی۔

"پہلے کی بات اور تھی۔ اب تو اس کے ہونے والے بچے کی ماں ہے! مرد لاکھ پتھر دل سہی۔ کم از کم اپنی اولاد کے لیے تو نرم پڑ ہی جاتا ہے۔"

اس کا چہرہ اوجھل رہا۔ نم آنکھیں بند رہیں۔ اپنی سسکیاں دبائے وہ چپ چاپ لیٹی رہی۔

وہ اٹھ کر اس کی چارپائی پر آ گئیں۔ نرمی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"میں جانتی ہوں، یہ تیرے لیے بہت مشکل ہے مگر...... تو خود سوچ۔ اس طرح تنہا زندگی کیسے گزارے گی؟ پھر تجھ پر ایک بچے کی ذمہ داری آنے والی ہے۔ اس لیے اگر صلح صفائی کا کوئی بھی حل نکلتا ہو تو تجھے اس حل پر واقعی غور کرنا چاہیے۔"

اپنی بات ختم کر کے انہوں نے چند لمحوں تک اس کے جواب کا انتظار کیا۔ مگر جنت نے گویا لب سی لیے تھے، سانسوں کو روک لیا تھا۔

"سوچنا ضرور۔" آنکھوں میں فکر لیے، اس کی پشت تھپتھپا کر وہ اپنی چارپائی پر چلی گئیں۔

جنت نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کا پورا کا پورا وجود درد کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔

اس نے ابھی تک بوا کو اپنے مسئلوں سے آگاہی نہیں دی تھی۔ فارس کی نفرت اور ان چاہے رشتے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ بوا پانچ سالوں کا عذاب جانتی تھیں۔ پانچ ماہ کی اذیت سے ناواقف تھیں۔

انہیں اس کے درد کا، اس کی بے کسی اور بے بسی کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ وہ ابھی تک اس پوشیدہ اختلاف کو معمولی نوعیت کا سمجھ کر اسے فائزہ چچی کی حرکت سے جوڑ رہی تھیں۔ انہیں اس کے معاملات اتنے صاف اور سیدھے لگتے تھے کہ ان کا خیال تھا اس کا شوہر

اولاد کی خبر ملتے ہی اسے بخوشی اپنا لے گا۔ وہ اس کے اس طرح اچانک گھر چھوڑنے پر بھی بہت فکر مند ہوا ہوگا۔

بوا حل کی بات کرتی تھیں۔ صلح کی راہ دیکھتی تھیں۔ احساس کا ذکر کرتی تھیں۔ معافی پر یقین رکھتی تھیں۔ وہ فارس وجدان کو نہیں جانتی تھیں۔ جان بھی نہیں سکتی تھیں۔ مگر وہ تو جانتی تھی اسے۔ اور بہت اچھی طرح سے جانتی تھی۔

اس کی ناک گال اور آنکھیں سرخ ہونے لگیں۔ آنکھوں پر بازو رکھے وہ بیآواز رونے لگی۔

وہ فارس کے گھر مسز شیرازی کی وجہ سے رکی ہوئی تھی۔ اور مسز شیرازی کی ہی وجہ سے اب واپس نہیں جانا چاہتی تھی۔ اور یہ بات وہ چاہ کر بھی بوا کو نہیں بتا سکتی تھی۔ وہ انہیں فارس وجدان کی نفرت کی وجہ نہیں سمجھا سکتی تھی۔ سارے لفظ، ساری دلیلیں، ساری کی ساری وضاحتیں ختم ہو جاتی تھیں۔ ایک خاموشی ہی تھی جو رہ جاتی تھی۔ ایک جمود ہی تھا جو طاری ہو جاتا تھا۔

اس نے پہلے بھی کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ اب بھی نہیں بتانا چاہتی تھی۔

لیکن بوا ان سب باتوں سے بے خبر ان راستوں کو ڈھونڈ رہی تھیں جو اذیت بھرے اور پر خار تھے۔ ان خوشیوں کو تلاش رہی تھیں جن پر اس کا حق تھا ہی نہیں۔

بات نصیب کی تھی۔

اور اب بھی۔ نصیب کی ہی تھی۔

☆☆☆

کہاں آ کے رکنے تھے راستے، کہاں موڑ تھا، اسے بھول جا
وہ جو مل گیا اسے یاد رکھ جو نہیں ملا، اسے بھول جا

رنگ برنگے غبارے اڑا دیے گئے۔ ٹب میں پانی بھرا گیا، کاغذ کی کشتیاں بنائی گئیں۔ رنگوں سے کئی لکیریں صفحوں پر لگائی گئیں، کئی پھول بنائے گئے، کئی گھر سجائے گئے۔ اور کئی خوشیاں سبز درختوں کی شاخوں پر پرندوں کی صورت بٹھا دی گئیں۔

وہ ترے نصیب کی بارشیں کسی اور چھت پہ برس گئیں
دل بے خبر مری بات سن اسے بھول جا، اسے بھول جا

فاطمہ کی دو گڑیاں تھیں۔ ایک کو دلہن اور دوسری کے بال چھپا کر، مارکر سے مونچھیں ڈاڑھی بنا کر، سفید شلوار سوٹ پہنا کر زبردستی کا گڈا بنا دیا گیا۔ شام تک شادی سرانجام پانا تھی۔ اس کے کمرے میں، الماری کے ایک خانے میں دلہن کا پورا کمرہ سیٹ کیا جانے لگا۔ ننھے ننھے شادی کارڈ چھوٹی چھوٹی بچیوں میں بانٹے گئے۔

میں تو گم تھا تیرے ہی دھیان میں، تری آس تیرے گمان میں
صبا کہہ گئی مرے کان میں، مرے ساتھ آ اسے بھول جا

مغرب تک صحن میں جیتے جاگتے پھول جمع ہو گئے۔ گڑیا کا کمرہ، اس کا سامان، اس کا جوڑا دیکھا گیا، دولہا کو بڑی شرارتی نگاہوں سے پرکھا گیا، ہنسی دبائی گئی۔ پھر رخصتی ملاحظہ کی گئی۔ نیچے صحن سے اوپر اس کے کمرے تک بارات آئی۔ پھر پلاؤ کھایا گیا۔ ہنستے مسکراتے پھول خوشی خوشی چلے گئے مگر ان کی آمد سے جو سکون اترا وہ وہیں ٹھہر گیا۔

کسی آنکھ میں نہیں اشک غم ترے بعد کچھ بھی نہیں ہے کم
تجھے زندگی نے بھلا دیا، تو بھی مسکرا، اسے بھول جا

کمرے کی صفائی کرتے، اپنے کپڑے دھو کر تار پر پھیلاتے، تیز دھوپ میں گلابی رنگت لیے منڈیر سے آگے دور دور تک پھیلے سرسبز کھیتوں کو دیکھتی وہ۔

کیوں اٹا ہوا ہے غبار میں، غم زندگی کے فشار میں
وہ جو درد تھا ترے بخت میں، سو وہ ہو گیا اسے بھول جا

اور نیچے اپنی بہنوں کی غیر موجودگی میں جھولے پر بیٹھا علی۔ ذرا سی خفگی سے اسے دور سے دیکھتا ہوا۔ کہ اس کی آمد کے بعد سے اس کی تین عدد شرارتی بہنیں اب ہر وقت آپی آپی کرتی اوپر ہی پائی جاتی تھیں۔

اب نہ کسی سے پائپ چھیننے پر لڑائی ہوتی۔ نہ جھولا ہتھیانے پر شور مچتا۔ نہ چھوٹی چارپائی کے لیے رونا دھونا ہوتا۔

کتنا سکون۔ اور کتنی خاموشی تھی گھر میں۔ اس کی اماں اب آرام سے ہر کام کرتی تھیں۔ پڑوسیوں کے گھر چکر بھی لگا آتی تھیں۔ شاپنگ پر بھی بغیر فکر کے چلی جاتی تھیں۔ اب وہ اس سے یہ نہیں کہتی تھیں علی تم ان کا خیال رکھنا، اور ایسے خیال رکھنا! اور اس طرح خیال رکھنا۔ دور سے ہی اس غاصب لڑکی نے اسے دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلایا تو دادی، نانی کے لاڈلے نے نخوت سے چہرے کا رخ موڑا۔

تجھے چاند بن کے ملا تھا جو، ترے ساحلوں پہ کھلا تھا جو
وہ تھا ایک دریا وصال کا سو اتر گیا، اسے بھول جا

اجالے آسمانوں پر سمٹ گئے، اندھیرا دھرتی پر اتر آیا۔ چہار سو سکون بھری خاموشیاں چھا گئیں۔ اور بہت اوپر سے مدھم روشنی میں وہ منظر نمایاں ہوا۔

سلیم سے ویڈیو کال کرتی بوا۔ اور سامنے ہی وہ بیٹھی تھی۔ فاطمہ، عیشا، اور ننھی مروہ کو ساتھ لیے۔ آج صبح ہی بوا نے لوڈو منگوا کر دی تھی۔ اور اب ہنستے مسکراتے وہی کھیل کھیلا جا رہا تھا۔

عسریسرا۔ حسنیٰ حسین

وہ جیت رہی تھی۔ بچیاں ہار رہی تھیں۔ سلیم کو پتا چلا تو خوب ہنسا۔

’’یہ ویسی کی ویسی ہے اماں! ذرا نہیں بدلی۔‘‘ وہ مسکرائیں۔ اور یہی مسکراہٹ اس کی آنکھوں کی نمی بن گئی۔

نہ وہ آنکھ ہی تری آنکھ تھی، نہ وہ خواب ہی ترا خواب تھا
دل منتظر تو یہ کس لیے ترا جاگنا، اسے بھول جا، اسے بھول جا

وہ نیچے علی کے پاس گئی۔ کمر پر ہاتھ رکھ کر، سر اٹھا کر فاتحانہ انداز میں مسکرائی۔

"تمھاری بہنیں مجھ سے ہار گئیں، تم جیت کر دکھاؤ تو بات بنے۔‘‘

اتنے دنوں تک اسے نظر انداز کرتا علی یک ٹک اسے دیکھ کر رہ گیا، اس کی ننھی سی غیرت کو بہنوں کی شکست گوارا نہ ہوئی۔ چیلنج قبول کر کے فوراً اوپر آ گیا۔ ایک بار پھر محفل جمی۔ اور وہ نو سالہ بچے سے ہار گئی۔

یہ جو رات دن کا ہے کھیل سا، اسے دیکھ، اس پہ یقیں نہ کر
نہیں عکس کوئی بھی مستقل سر آئینہ، اسے بھول جا، اسے بھول جا

" آپ کو نہیں پتا لیکن میں بہت ذہین ہوں۔‘‘ اس نے سر اٹھا کر فاتحانہ انداز میں جتایا۔ بہنیں اس کے ساتھ جڑی بیٹھی تھیں اور اتنا خوش ہو رہی تھیں جیسے ان کے بھائی کو ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ ایک مروہ ہی تھی جو فیڈر منہ میں ڈالے اس کی گود میں بیٹھی، اس کی خاموش ساتھی بنی ہوئی تھی۔

جو بساط جاں ہی الٹ گیا، وہ جو راستے سے پلٹ گیا
اسے روکنے سے حصول کیا، اسے مت بلا، اسے بھول جا

اس کی آنکھیں دھندلائیں۔ تبسم ہونٹوں پر ٹھہر گیا۔ دن بے دار ہوا، شام آنکھوں میں اتر آئی۔

وقت گزرا، چند دن گزر کر ایک بار پھر رک گیا۔

وہ صندل آپا کے بچوں کو اب شہزادیوں کی کہانیاں سنا رہی تھی، علی ناک بھوں چڑھا رہا تھا۔ اسے تو کسی بھوت، کسی جن، کسی طاقت ور شہزادے کی کہانی سننی تھی۔ جس نے کئی لوگوں کے سر پھاڑے ہوں، دیو بھگائے ہوں، پہاڑ گرائے ہوں، تباہیاں مچائی ہوں۔

" مجھے نہیں آتیں ایسی کہانیاں۔‘‘ وہ اسے گھور کر کہہ رہی تھی۔

" آپ بہت بور کرتی ہیں۔‘‘ رخ بدل کے اس نے کان پر ہاتھ رکھا تھا۔

تو یہ کس لیے شب ہجر کے اسے ہر ستارے میں دیکھنا

وہ فلک کہ جس پہ ملے تھے ہم، کوئی اور تھا، اسے بھول جا

سفیدے کے پتوں سے ہوائیں سرسرا کر گزریں۔ بادلوں کی اوٹ سے نکلتی چاندنی صحن میں اتر آئی۔

اس کے آس پاس ہر طرف امید کے نقرئی ذرے بکھر گئے۔ اس نے دعا مانگتے ہوئے ان ذروں کو انگلی کی پور پر چنا۔

آنکھوں میں ننھی جان خواب ہو کر بس گئی۔ قلب سرور کی لے میں ڈوبا تو انگ انگ میں سکون ٹھہر گیا۔

کہاں آ کے رکنے تھے راستے، کہاں موڑ تھا، اسے بھول جا
وہ جو مل گیا اسے یاد رکھ، جو نہیں ملا اسے بھول جا

آسمان کو دیکھتے اس نے آنکھیں موند لیں۔ تکیہ پھر سے بھیگنے لگا۔ مگر لبوں پر مسکراہٹ ٹھہری رہی۔ اور کافی دیر تک ٹھہری رہی۔

☆☆☆

مطلع ابر آلود تھا۔ فضا میں حبس کے ساتھ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ شدید گرمی سے اکتائے ہوئے علی کا خیال تھا آج بارش ضرور ہوگی۔ وہ بھی یہی چاہتی تھی لیکن گھر پہنچنے سے پہلے تک نہیں۔

صندل آپا ننھی مروہ کو لیے اپنے میکے گئی ہوئی تھیں۔ صابرہ بوا نے اپنی ہمسائی کے یہاں دعوت پر اسے اور بچیوں کو بھیج دیا تھا۔ خود وہ گھر میں سلیم کی بیوی انعم کی کسی رشتہ دار کی وجہ سے رک گئی تھیں جو آج صبح ہی ان سے ملنے آ گئی تھی۔

صابرہ بوا کی ہمسائی کا گھر ہرے بھرے کھیتوں اور وسیع سبزہ زار کے اس پار تھا۔ دعوت سے چار بجے تک فارغ ہو کر اس نے واپسی کا رخ کیا تو اس وقت آسمان سیاہ بادلوں کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔

فاطمہ، عیشا اور علی پگڈنڈی پر شور مچاتے بھاگے چلے جا رہے تھے اور وہ سر پر دوپٹہ لیے احتیاط سے قدم اٹھاتی ان کے پیچھے چل رہی تھی۔ شہد بالوں کی کچھ لٹیں پیشانی سے چپکی ہوئی تھیں۔ گرمی کی شدت سے چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

" آج تو طوفان آئے گا۔‘‘ علی نے ہاتھ اٹھا کر آسمان کو دیکھتے ہی کہہ دیا۔

"اللہ نہ کرے علی۔‘‘ وہ دہل کر بولی۔ اسے بارش ضرور چاہیے تھی مگر طوفان کے ساتھ ہرگز نہیں۔

علی نے مڑ کر اسے دیکھا۔ پھر رک گیا۔ ’’آپ یہاں نئی آئی ہو نا۔ اس لیے آپ کو نہیں پتا۔ ہمیں پتا ہے۔ یہاں ساری ہوائیں رک جاتی ہیں۔ پھر بادل آتے ہیں۔ وہ بالکل کالے ہو جاتے ہیں۔ پھر ہوائیں چلتی ہیں۔ اور بہت زور سے چلتی ہیں۔ اتنی زور سے کہ اگر آپ کمرے میں نہیں چھپیں گی تو اڑ جائیں گی۔‘‘

جنت نے رک کر پسینہ صاف کیا۔ گہرا سانس لے کر پھر سے قدم اٹھائے۔ پتا نہیں علی کو یہ کیوں لگتا تھا کہ وہ کسی اور سیارے کی

مخلوق تھی جسے بارش، آندھی اور طوفان کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔

"اس کے بعد بارش آتی ہے۔ بہت تیز۔" علی نے دونوں ہاتھ چہرے کے قریب لا کر، آنکھیں میچیں "اتنی تیز۔ اتنی تیز کہ۔۔"

"کہ اگر میں کمرے میں نہیں چھپوں گی تو بہہ جاؤں گی۔" بقیہ جملہ اس نے بیزار ہو کر مکمل کیا۔

"بالکل۔" علی اترایا۔ پھر تیزی سے بھاگا۔ فاطمہ نے اس کے دیکھا دیکھی رفتار پکڑی۔ البتہ عیشا پگڈنڈی سے گزرتی کہیں سے پھول، کہیں سے پتے، کہیں سے کوئی کلی توڑتی جا رہی تھی۔ اور اس عمل کی وجہ سے وہ جنت سے بھی پیچھے رہ گئی تھی۔

"عیشا۔" ہر تھوڑی دیر بعد وہ رک کر اسے پکارنے لگتی۔ اور عیشا سرعت پکڑ کر پھر سے سست ہو جاتی۔

کھیتوں کے اس پار مضبوط راستے پر قدم جماتے ہی اسے فضا میں یکا یک ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ ہوائیں چل گئی تھیں۔ مگر اتنی تیز نہیں تھیں کہ اسے اڑا لے جائیں۔

عیشا کا ہاتھ پکڑ کر اپنی رفتار بڑھاتے ہوئے وہ دائیں طرف گلی میں داخل ہو گئی۔ بالکل سامنے سڑک واضح نظر آتی تھی۔ جس پر اکا دکا گاڑیاں گزرتی ہوئی دکھائی دے جاتی تھیں ورنہ موٹر سائیکل یا پھر رکشے نظر آتے رہتے۔

ایک سیاہ لینڈ روور اسے سڑک کنارے ہی کھڑی دکھائی دے گئی تھی۔ شاید کوئی جاگیردار اپنی زمینوں کے دورے پر تھا۔

گردن موڑ کر اسی طرف دیکھتے وہ دوسری گلی میں داخل ہوئی اور اگلے ہی لمحے اپنی جگہ پتھر کی طرح ساکت ہو گئی۔

علی نے بھاگ کر آہنی دروازہ اندر کی جانب دھکیل دیا تھا۔ فاطمہ اس کے پیچھے بھاگی تھی۔ عیشا کو گلی میں ہی کوئی چیز نیچے گری ہوئی ملی تھی جسے اٹھانے کے لیے وہ جھک گئی تھی۔

وقت لمحے بھر کے لیے رکا تھا۔ اور پھر جیسے رکا رہ گیا تھا۔ بارش کے قطرے فضا میں معلق ہوئے، ہوائیں رک گئیں، شور تھم گیا۔

سیاہی مائل جینز پر خاکی کاٹن آف وائٹ شرٹ میں ملبوس فارس وجدان اس کے سامنے کھڑا تھا۔ کشادہ پیشانی پر بال بکھرے تھے۔ ہیزل آنکھوں کی سرخی میں نمی ٹھہری تھی۔

بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ یقین اور بے یقینی میں مدغم ہوتے تاثرات میں ایک پوشیدہ کرب لیے وہ وہم سے خیال، اور پھر خیال سے ایک حقیقت ہو گیا تھا۔

بادلوں کی گھن گرج کے ساتھ بارش شروع ہوئی۔

اسے گھر چھوڑے ہوئے پچیس دن ہو چکے تھے، چھبیسویں دن وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے وہ مدت پوری ہونے نہیں دی تھی۔ اسے وقت کی حد سے نکلنے نہیں دیا تھا۔

جنت کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ فارس وجدان یہاں نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اس کے پیچھے یہاں نہیں آ سکتا تھا۔

ایک نکاح ہی تو تھا۔ اور اس نکاح کی تو فارس وجدان کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ وہ کسی بزنس ڈیل کی طرح اس رشتے کو ایک عام سا کانٹریکٹ سمجھتا تھا۔ اور اس عام سے کانٹریکٹ کے لیے وہ اتنا سفر طے کر کے یہاں تک نہیں آ سکتا تھا۔ اس کا راستہ نہیں روک سکتا تھا۔ لیکن جو فارس اس کے سامنے کھڑا تھا، اس نے ایسا کر دیا تھا۔

وہ اب قدم اٹھا رہا تھا تو اس کی چال غیر متوازن تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ کسی لمبے سفر سے شکست خوردہ سا لوٹا ہو۔ منزل اب بھی اس کے لیے بے نام، اور راستہ ابھی بھی اس کے لیے مشکل رہا ہو۔ جانے وہ بارش تھی جس نے اس کا چہرہ تر کر دیا تھا یا وہ آنسو تھے جو اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے؟ وہ سمجھ نہ سکی۔

فارس کے ساتھ اس کے معاملات اس نوعیت کے ہرگز نہیں تھے کہ وہ اس لمحے کمزور پڑتی یا حساس ہو جاتی۔ وہ اس کا سہارا نہیں تھا کہ اس کے بنا وہ ٹوٹ کر ریزہ ہوتی۔ لیکن اسے رونا آیا تھا۔ اور جانے کیوں شدت سے رونا آیا تھا مگر وہ ساری چیخیں آنکھوں میں لیے ضبط کیے کھڑی تھی۔ وہ زندگی کی طرف بہت مشکلوں سے پلٹی تھی۔ دوبارہ فنا نہیں ہونا چاہتی تھی۔

وہ وہیں کھڑی تھی، جہاں وہ تھی، مگر فارس وہاں نہیں تھا، جہاں وہ ہوا کرتا تھا۔ وہ پہلے کسی اور مقام پر تھا۔ اب کسی اور مقام پر نظر آ رہا تھا۔

فاصلہ ختم ہوا۔ اور وقت رک گیا۔ قریب پہنچ کر اس نے آہستگی سے ہاتھ اٹھایا۔ کپکپاتی انگلیوں سے اس کا گال چھوا۔ وہ یقین کرنا چاہتا تھا جنت خیال نہیں تھی، ایک حقیقت ہو چکی تھی۔

اس کے چہرے کے تاثرات یکا یک یوں ہوئے جیسے اس میں ابھی ابھی زندگی کی اک نئی لہر دوڑی ہو۔ یا جیسے اس کی تھمی ہوئی سانسیں نئے سرے سے بحال ہو گئی ہوں۔ وہ پھر سے جی اٹھا ہو۔ وہ اس کی ہر کیفیت اور احساس سے بے خبر اسے بہت صدمے سے دیکھ رہی تھی۔

علی کہہ رہا تھا، آج طوفان آئے گا۔ علی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

جنت کمال کی زندگی میں طوفان آ چکا تھا۔

یکا یک وہ اپنے سکتے سے باہر آئی۔ اس نے فارس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اسی سرعت سے رخ بدل کر گھر میں داخل ہوئی، اور اسی تیز بوچھاڑ میں بھیگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھتی اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔

☆☆☆

بارش نے زور پکڑ لیا تھا۔ آندھی شدت اختیار کر گئی تھی۔ سفیدے کے درخت ہوا کے زور سے گویا صحن کی دیواروں پر جھکے

چلے آرہے تھے۔ دور کہیں بجلی چمکی تھی۔ بادل گرجے تھے۔ اندر اور باہر کا موسم ایک سا ہو گیا تھا۔

فضا کا سکوت طوفان نے درہم برہم کیا تھا اور اس کے اندر کا سکون فارس وجدان نے ختم کر دیا تھا۔ وہ اندھیرے میں کھڑکی کے سامنے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ چہرہ ستا ہوا تھا۔ لب بھینچے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں نمی ٹھہری تھی۔

فارس وجدان کسی کے بلانے پر یہاں نہیں آیا تھا۔ بوا ابھی کچھ دیر پہلے ہی اپنی پوزیشن کلیئر کر کے گئی تھیں۔ انہوں نے فارس سے رابطہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس سلسلے میں سلیم سے کوئی بات کی تھی۔ وہ یہ ضرور چاہتی تھیں، جنت اپنے شوہر کے پاس چلی جائے مگر اس کے لیے انہوں نے خود سے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اسے اعتماد میں لیے بغیر ایسا کوئی قدم اٹھانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔

تو کیا مسز شیرازی نے اسے بھیجا تھا؟ کیا وہ ان کے کہنے پر یہاں آیا تھا؟ اس کا دل چاہا، وہ ابھی نیچے جائے اور اس سے مسز شیرازی کے بارے میں پوچھے۔ مگر وہ نہیں گئی۔ ذہن کو، ہر طرح کے خوف اور وسوسے کی گرفت سے چھڑاتی وہیں بیٹھی رہی۔

جانے کتنے غم تھے جو یاد آئے جا رہے تھے۔ اپنی ریاضتیں، صبر، برداشت اور فارس وجدان کی نفرت، دھمکیاں اور طلاق۔ ایک وعدہ تھا جو اس نے خود سے کیا تھا۔ اور اپنے اس وعدے پر اسے ہر صورت قائم رہنا تھا۔ واپسی کی ہر راہ اس پر پہلے سے مسدود تھی۔ دل کا ہر دروازہ اس پر بہت پہلے سے بند تھا۔ اب اسے کوئی حماقت نہیں کرنی تھی۔ اور کسی صورت نہیں کرنی تھی۔ نہ سر جھکانا تھا۔ نہ منت کرنی تھی اور نہ کسی دباؤ میں آ کر کوئی قدم اٹھانا تھا۔ بات اب اس کے بچے کی تھی۔ اور صرف بچے کی ہی رہ گئی تھی۔ وہ عدم تھی تو اب اسے منظر نہیں ہونا تھا۔ تصور تھی۔ تو اب اسے حقیقت نہیں ہونا تھا۔

بوا اسے ارسلان بھائی کا سوٹ دے کر اوپر آئیں تو آنکھوں میں خوش گوار سا تاثر ٹھہرا تھا۔ وہ فارس کی آمد پر اتنی خوش تھیں کہ پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ ایسے جیسے وہ ان کا سچ مچ کا داماد ہو۔

"میں سوچ رہی ہوں، تیرے گھر والے کو خوش خبری سنا دوں۔ یا تو خود سنا دے گی؟" انہوں نے پوچھا۔ وہ گم صم سی انہیں دیکھ کر رہ گئی۔ بوا اس کے لیے سب کتنا مشکل کر رہی تھیں۔

"اور یہ کیا تو اندر چھپ کے بیٹھ گئی ہے۔ کیا سوچے گا وہ؟"

بوا اس پر خفا ہوئیں۔ انہیں فارس کی کتنی فکر ہونے لگی تھی۔ صرف اس لیے کہ وہ اس کا شوہر تھا۔ اس کی آمد کا مقصد، اس کا ارادہ جانے بغیر صرف اس لیے کہ وہ اس کی تھی۔ تو وہ اہم ہو گیا تھا۔

"ویسے ماشاءاللہ تیرا گھر والا ہے بڑا سوہنا۔" لگے ہاتھوں تعریف بھی کر ڈالی۔

"کوئی سوہنا وہنا نہیں ہے وہ۔" وہ جو اتنی دیر سے صبر کیے بیٹھی تھی، بول پڑی۔

بوا نے مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ خفا خفا سی چہرے کا رخ بدل گئی۔ انہوں نے الماری سے ایک مردانہ شال نکالی اور جانے کیوں

مسکراتی ہوئی چلی گئیں۔

بارش کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ مدھم پھوار ہنوز برس رہی تھی۔ اس نے دوسری موم بتی جلائی۔ پھر تیسری۔ پھر چوتھی۔ مگر اندھیرا رہا۔ الجھن بڑھتی رہی۔

کچھ ہی دیر بعد علی آ گیا۔

"وہ آپ کے شوہر ہیں؟" پتا نہیں علی پوچھ رہا تھا یا بتا رہا تھا۔ اس نے کچھ نہ کہا۔

"ٹھنڈ لگ گئی ہے انہیں۔ چھینکیں آئی جا رہی ہیں۔ اتنی دیر تک تو وہ دروازے میں کھڑے بارش میں بھیگتے رہے۔" وہ اس کے برابر میں تخت پر ٹک گیا۔ ٹارچ ہاتھ میں تھی۔

اماں نے ابو کے کپڑے دیے ہیں انہیں۔ بالکل اچھے نہیں لگ رہے۔"

"کپڑے؟" اب کے ذرا سا رخ موڑا۔

"نہیں وہ خود......"

اس نے نگاہیں موم بتی پر جما لیں۔ لائٹ جانے کب آنا تھی۔

"ان کی گاڑی اچھی ہے۔ اور موبائل بھی۔"

پھر جیسے کام کی بات یاد آئی تو فوراً نیچے اترا۔ "اماں کہہ رہی ہیں، سر درد کی گولی دے دیں۔"

"کس کو چاہیے؟"

"جن کو چھینکیں آئے جا رہی ہیں انہیں۔"

اب کے وہ ذرا سا چونک کر اس کی طرف مڑی۔ "بوا نے کہاں بٹھایا ہے اسے؟"

"بیٹھک میں۔"

اسے یاد آیا، بیٹھک کے بیرونی دروازے سے اکثر ایک بلی اندر آ جایا کرتی تھی۔ بارش کے موسم میں تو لازمی ایسا ہوتا تھا۔

سب کچھ چھوڑ چھاڑ وہ تیزی سے نیچے آئی۔

عیشا اور فاطمہ برآمدے میں رکھی چارپائی پر بیٹھی تھیں۔ بوا نے ڈانٹ کر بٹھایا تھا کہ عیشا بھاگتے ہوئے دو بار پھسل کر گر چکی تھی۔

"بوا!" وہ سیدھا کچن میں آ گئی۔

بوا نے کھانا گرم کرتے ہوئے اس کی طرف ذرا سی خفگی سے دیکھا کہ محترمہ کو نیچے آنا یاد آ گیا؟

"آپ اسے کسی اور کمرے میں بٹھا دیں۔'' انگلیاں مسلتے ہوئے وہ پریشانی سے بولی۔

"جنہ! مجھے تجھ سے یہ امید نہیں تھی۔''بوا کو باقاعدہ غصہ آ گیا۔

"میں نے یہ تو نہیں کہا، اسے گھر سے نکال دیں۔'' وہ احتجاجاً دبی آواز میں چلائی۔

"ایک ہی بات ہے۔''ان کا پارہ چڑھ گیا۔''میں دیکھ رہی ہوں جب سے وہ بے چارہ آیا ہے تجھے آرام نہیں مل رہا۔''

"بے چارہ؟'' جنت کی آنکھوں میں اس ناانصافی پر آنسو آ گئے۔

"اسے بلیوں سے الرجی ہے بوا! بیٹھک میں بیٹھا رہا تو طبیعت خراب ہو جائے گی۔''

"طبیعت تو اس کی پہلے سے خراب ہے، پتا نہیں کیسے گاڑی چلا کر یہاں آیا ہے۔'' وہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے برتن میں سالن نکالنے لگیں۔

"تو جا، جہاں بٹھانا ہے بٹھا دے۔'' انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کر دیا۔

"بوا!'' وہ روہانسی ہوئی۔ بوا نے خود کو سخت پتھر کر لیا۔ اس کا شوہر، اس کا فرض، اس کی ذمہ داری۔

وہ بگڑے تیوروں کے ساتھ باہر نکل گئی۔ علی کو آواز دے کر بیٹھک میں بھیجا اور خود سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی۔

بیڈ پر سے کچھ رسالے غصے سے اکٹھے کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھے۔ تکیے وغیرہ درست کیے۔ چند مزید موم بتیوں کا اضافہ کر کے روشنی بڑھانا چاہی۔

عین اسی لمحے علی کمرے میں داخل ہوا۔''انہوں نے کہا میں یہیں ٹھیک ہوں۔''

" کیا مطلب، یہیں ٹھیک ہوں۔ تم نے بتایا نہیں انہیں، کمرے میں بلی آتی رہتی ہے؟''

"یہ کیوں بتانا تھا؟'' علی سراپا سوال بن گیا۔

"اف!'' اس نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔ پھر ضبط کر کے سیڑھیاں اترتی نیچے آ گئی۔ علی بڑے مزے سے ٹہلتا اس کے پیچھے تھا۔

''بتایا تھا میں نے۔ بتایا تھا بلی آتی ہے کمرے میں۔ لیکن وہ پھر بھی نہیں اٹھے۔''

اس نے مڑ کر علی کو دیکھا پھر دانت کچکچاتے ہوئے ڈرائنگ روم کا ادھ کھلا دروازہ پورا کھول دیا۔

دروازے کے بالکل قریب وہ صوفے پر شلوار سوٹ میں ملبوس بیٹھا تھا۔ چھینکوں سے کچھ عاجز ہو کر اس نے سر اٹھایا۔ آنکھوں میں خفگی، غصہ ناراضی اور جانے کیا کچھ لیے جنت کمال ایک بار پھر اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"اگر اب تمہیں ری ایکشن ہوا تو میں تمہیں سی پی آر نہیں دوں گی۔ ہاسپٹل بھی کافی دوری پر ہے۔ ابھی سے بتا رہی ہوں تمہیں۔'' لہجے کو حتی الامکان سخت رکھتے ہوئے اس نے اپنے مخصوص لہجے اور انداز میں اس پر واضح کر دیا۔

اور جانے کیسے، اور جانے کس طرح فارس وجدان کے لبوں پر تبسم بکھرا۔ آنکھوں کی نمی یکایک بڑھ گئی۔ بے نام سا حزن سرخ ڈوروں میں ٹھہر گیا۔

"اپنی زندگی پیاری ہے تو اوپر کمرے میں آ جاؤ۔''

وہ کہہ کر پلٹ گئی۔ فارس اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی خاموشی کے ساتھ وہ اس کے پیچھے سیڑھیاں چڑھتا چھت والے کمرے تک آ گیا۔ دروازہ کھول کر اسے اندر داخل ہونے کا راستہ دیتی وہ خود باہر ہی رہی۔ اور کچھ ہی دیر میں وہ پھر سے نیچے تھی۔

بوا ٹرے ہاتھوں میں لیے باہر آئیں تو اس نے چہرے کا رخ پورا کا پورا موڑ لیا کہ مبادا اب وہ اس سے یہ نہ کہہ دیں کہ کھانا بھی وہ لے جائے۔ صد شکر کہ بوا نے ایسا کچھ نہ کہا۔

وہ کھانا دینے گئیں تو کچھ دیر تک اوپر بیٹھی رہیں۔ اور نیچے وہ جلے پیر بلی کی طرح چکراتی رہی۔ یہاں سے وہاں۔ اور پھر وہاں سے یہاں۔

لائٹ آ چکی تھی۔ بچے سو گئے تھے۔ صندل آپا نے فون کر کے کہہ دیا، موسم خرابی کی وجہ سے وہ کل ہی آئیں گی۔ اور اسے کسی صورت نہ نیند آ رہی تھی اور نہ سکون مل رہا تھا۔ عجیب سی ٹینشن تھی جس نے اسے گھیر لیا تھا۔

جانے بوا کیا بات کر رہی ہوں گی۔ وہ ان سے کیا کہہ رہا ہو گا؟ ایسا نہ ہو بوا منت سماجت کرنے لگ جائیں اس کی؟ اس نے نچلا لب دانتوں تلے دبایا۔

کچھ ہی دیر میں اس نے بوا کو سیڑھیاں اترتے دیکھا۔

"زیادہ تو کچھ نہیں کھایا۔'' وہ کچن میں ٹرے رکھ کر اس کے پاس آ گئیں۔

"تو...... پھر......'' وہ خود سے کچھ پوچھ بھی نہیں رہی تھی، اور چاہتی تھی بوا سب بتا دیں۔

"طبیعت نہیں ٹھیک۔ گولی دی ہے میں نے۔ کوئی بات بھی نہیں کر رہا۔ تم جاؤ اوپر۔ اس سے پوچھو، کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ میرے سامنے جھجک رہا تھا تمہیں بتا دے گا۔''

"بوا'' اس نے روہانسا ہو کر سر اٹھایا۔ ''آپ۔''

"جنہ......'' انہوں نے خفگی سے ٹوکا۔ ''شوہر ہے وہ تیرا، کوئی اجنبی نہیں ہے۔ جا شاباش!'' انہوں نے محبت سے پچکارا تو آنکھوں میں ڈھیر ساری نمی لیے وہ بگڑے تیوروں کے ساتھ اوپر آ گئی

"ایک تو بوا......'' آنکھیں رگڑ رگڑ کر صاف کیں۔ ''کچھ سمجھتی ہی نہیں ہیں۔'' بڑبڑاتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔

سامنے ہی وہ اسے بیڈ پر نیم دراز دکھائی دیا۔ وہ جانتی تھی، اسے اپنے گھر کے علاوہ کسی اور جگہ پر ٹھیک سے نیند نہیں آتی تھی۔

مگر وہ بیڈ پر ایک ہی پوزیشن میں اتنی گہری نیند سو رہا تھا کہ وہ چند لمحوں کے لیے اس کے چہرے سے نظر نہ ہٹا سکی۔

اسے بے سکون کر کے وہ ہمیشہ کتنے سکون سے سوتا تھا۔ تپ کر لب بھینچے۔ آنکھیں رگڑیں۔ ایک بار پھر اسے دیکھا۔

بارش سے موسم کافی سے زیادہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ ہلکا سا پنکھا بھی چل رہا تھا تو کچھ سوچ کر کمبل پھیلا دیا کہ اس کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔

پاس ہی موبائل رکھا تھا۔ جھک کر اٹھا لیا۔ موبائل آف تھا۔ بیٹری تقریباً ختم۔ اس موبائل کی چارجر والی پن پورے گھر میں کسی کے پاس نہیں تھی۔ اسے بے اختیار مسز شیرازی کا خیال آیا۔ جب کبھی وہ رابطہ نہیں کر پاتا تھا تو وہ اس کے لیے بہت پریشان ہو جایا کرتی تھیں۔ اب بھی ہو رہی ہوں گی۔

گہری سانس لے کر موبائل رکھ دیا۔ بلب بجھا کر اس نے کھڑکی کا ایک پٹ کھول دیا اور خود شال اوڑھے باہر آ گئی۔ منڈیر کے پاس رک کر اس نے تاریکی میں دور تک دیکھا۔

طوفان گزر چکا تھا۔ مگر اس کے آثار رہ گئے تھے۔

☆☆

کروٹوں پر کروٹیں بدلتی وہ کافی دیر تک بے آرام پڑی۔ بمشکل بارہ بجے آنکھ لگی تو ڈیڑھ بجے کھل گئی۔ اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اطراف میں نگاہ دوڑائی۔

پورا گھر خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ سب ہی خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ ایک وہی تھی جسے ایک پل کا آرام نہیں تھا۔

اس نے چپل ڈھونڈ کر پہنی۔ کچن میں جا کر پانی پیا، پھر فاطمہ پر ٹھیک سے لحاف ڈالتی سیڑھیوں کی طرف جا کھڑی ہوئی۔ سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔

نیچے سب سو رہے تھے تو اوپر وہ بھی یقیناً سو ہی رہا ہو گا۔ کچھ دیر تک وہ شال کو کندھوں پر ڈالے گومگو سی کیفیت میں اپنی جگہ کھڑی رہی۔

وہ فارس وجدان کو جگا کر بوا کی غیر موجودگی میں ہی اس کی آمد کی وجہ جاننا چاہتی تھی۔ اور یہ کام وہ صبح سے پہلے پہلے کر لینا چاہتی تھی۔

جانتی تھی بوا مداخلت سے باز نہیں آئیں گی۔ وہ ان کے مابین صلح کی ہر ممکن کوشش کریں گی اور وہ یہ نہیں چاہتی تھی۔

اسی طرح خود سے الجھتی وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی تھی۔ خیال تھا وہ سو رہا ہو گا، مگر کمرے کی لائٹ روشن تھی۔ اس نے

کھڑکی کی اوٹ سے اندر جھانکا۔ کمرہ خالی۔۔ فارس ندارد!!

یہ کدھر گیا؟ یہاں وہاں نگاہ دوڑاتے وہ منڈیر تک گئی۔ اور یہیں سے اس نے سڑک کی طرف دیکھا جہاں اندھیرے میں گاڑی کا گمان ہو رہا تھا۔

کمرہ اور پھر صحن کا چکر کاٹ کر اچھی طرح سے جائزہ لیتی وہ دائیں طرف مڑی اور اگلے ہی لمحے کسی سے ٹکرا گئی۔

خوف اپنی جگہ۔ جھٹکا دوسری۔ مگر جو چوٹ ناک پر لگی اس کا درد پورے جسم میں دوڑ گیا۔ فارس نے اسے بازو سے پکڑ کر گرنے سے الگ بچایا۔

''آئرن مین کے سگے۔'' ناک سہلاتے اس پر پھٹ پڑی۔ ''دیکھ کر نہیں چل سکتے۔''

حالانکہ چل تو وہ رہی تھی۔ آئرن مین تو کھڑا تھا۔

''تم......ٹھیک ہو؟'' کھانسی اور زکام کی شکایت لیے فارس کی آواز بھاری۔ تنفس بھی بھاری۔ اور دل بھی بھاری۔ ''تمیں سیکنڈ پہلے تک ٹھیک تھی۔'' اس نے فارس کے بخار سے تپتے ہاتھ کی گرفت سے اپنا بازو چھڑایا۔ ''بلکہ سات گھنٹے پہلے تک بالکل ٹھیک تھی میں۔'' تپ کر جھلا کر جواب دینے کے بعد اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ''تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ نیم تاریکی میں اس کے ہیزل آنکھوں کا اب جیسے کوئی رنگ نہ تھا۔ صرف سیاہی ہی تھی۔ ہر جگہ اور ہر طرف۔ اس کے تاثرات مبہم پیچیدہ تھے۔ نہ اس کی آمد سمجھ میں آ رہی تھی۔ نہ وہ اس کا دماغ پڑھ پا رہی تھی۔ کچھ تو ہوا تھا اس کی غیر موجودگی میں...... یقیناً کچھ تو......

یکایک کسی ممکنہ خدشے نے سر اٹھایا تو دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

''آنٹی ٹھیک ہیں؟'' پہلا خیال ہی مسز شیرازی کا آیا۔ پہلی فکر، پہلا خوف، پہلا اندیشہ ہی ان سے متعلق تھا۔ اس کی وجہ سے انہیں کتنی پریشانی ہوئی ہو گی۔ اپنے بیٹے کے معاملے میں، اپنی پسند کو سوچ کر وہ کتنا ڈپریس ہوئی ہوں گی۔

فارس کا سر اثبات میں ہلا۔ اس کی رکی ہوئی سانسیں بحال ہو گئیں۔ صد شکر بات ان کی نہ تھی۔ صد شکر وہ خیر خیریت سے تھیں۔

''تو پھر......؟'' اس نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔

سرد ہوائیں سفیدے کے پتوں سے سرسرا کر گزریں۔ دھرتی پر پھیلا ہوا اندھیرا سمٹ گیا۔ چاندنی زمین پر اتر آئی۔ بادلوں کے آوارہ ٹکڑے سیاہی میں نمایاں ہوئے۔ مگر جو خاموشی تھی وہ کچھ دیر تک ٹھہری۔

''اس رات۔'' فارس کے لب ہلے۔ مگر جملہ ادھورا رہ گیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا وہ اس کا انتظار کر لیتی۔ وہ کیسے کہہ دے وہ اس کا

انتظار کر لیتی؟ اس کا ہر لفظ بے وقعت ہو گیا۔ ہر بات، ہر دلیل، ہر حجت بے وزن ہو گئی۔ باوجود کوشش کے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ کچھ نہ بتا سکا۔

بات دل کی تھی۔ اور دل تک تھی......اسے زباں پر لانے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ ہمت کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ نہ اعتراف کی سکت رہی تھی نہ معذرت کا حوصلہ رہا تھا۔ جانے وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جو کسی کو رلا کر آسانی سے معافی مانگ لیتے ہیں، اس سے تو نہیں ہو رہا تھا۔ بالکل نہیں ہو رہا تھا۔

اس نے اپنے اندر کی بے قراری پر قابو پاتے ہوئے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ اس کے خیالات منتشر تھے۔ اس کی سوچ واہموں میں گھری ہوئی تھی۔ اس کا دل اندیشوں کے جالوں سے پر تھا۔ درد اب ہر جگہ تھا۔ اندر باہر ایک سی کیفیت ہو رہی تھی۔

''اس رات جو ہوا مجھے اس کا بے حد افسوس ہے۔'' اس کے احساسات سے قطعی بے خبر جنت کمال کہہ رہی تھی۔ ''میں آنٹی کو کوئی بھی ٹینشن نہیں دینا چاہتی تھی لیکن فائزہ چچی اچانک آ گئیں۔ انہوں نے آنٹی کو میرے بارے میں سب بتا دیا۔'' شال کے کنارے سے کسی دھاگے کو کھینچتے ہوئے وہ آنکھوں میں افسوس اور ندامت لیے اس طرح سے بات کر رہی تھی جیسے وہ تمام کی تمام باتیں اس کی پوشیدہ حقیقتیں، اس کی سچائیاں، اس کے اعمال تھے۔

جنت کمال کے سامنے کھڑا فارس وجدان موم کے پتلے کی طرح پگھلنے لگا۔ اس کا دل مٹھی میں جکڑا گیا تھا، اس کے سینے پر وزن بڑھ گیا تھا۔

''تم بہت اچھے ہو۔ بابا سے بھی اچھے!'' اس کے کمرے کے عین وسط میں ایک سات سالہ بچی نے بازو پھیلا کر گول گول گھومتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا تھا۔

آن کی آن میں، بہت سی باتیں، لہجے، طنز اور طعنے اسے یاد آ گئے۔ ہر وہ تلخ بات جو اس سے کر چکا تھا۔ ہر وہ زخم جو لفظوں کی صورت اسے دے چکا تھا۔ کتنی چوٹیں تھیں۔ کتنا تشدد تھا۔ کتنی نفرت تھی۔ کتنا بڑا عذاب۔ کتنی بڑی سزا تھی یہ......اس نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا اگر وہ تمام کی تمام باتیں جھوٹ ثابت ہوئیں تو؟

''میری وجہ سے آنٹی کو بہت دکھ پہنچا ہوگا۔'' وہ ابھی تک اسی غم میں تھی۔ ''اس کے لیے آئم ایکسٹریملی سوری۔''

فارس وجدان کی ماں کو جو تکلیف اس کے وجود سے پہنچی۔ اس کی معذرت! بہت دل سے معذرت!

اور وہ خاموش تھا۔ بہت زیادہ خاموش۔ اسے لگا وہ سانس بھی نہیں لے رہا۔

یکا یک کسی خیال کے ذہن میں آتے ہی اس نے شال کا سرا چھوڑ چھاڑ کر سر اٹھایا۔

''کہیں اب تم اس بات کا ایشو بنا کر مجھے کوئی ''سزا وزا'' دینے تو نہیں آئے؟'' اب کے خاصی مشکوک نظروں سے اس نے

فارس کو گھورا۔

ہوا کے زور سے بال پیشانی پر جھکے۔ آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ جنت کے ساتھ ساتھ ہر منظر دھندلا گیا۔

''اب اگر تم نے کہا میں تمہیں طلاق نہیں دینا چاہتا، ساری عمر اسی طرح لٹکا کر رکھوں گا۔ وغیرہ وغیرہ تو آئی سویئر میں خلع کے لیے کورٹ چلی جاؤں گی۔'' سخت لہجے میں دھمکا کر اس نے اپنے ارادے واضح کر دیے۔

وہ اس پر نظریں جمائے منجمد سا کھڑا تھا۔ جنت کمال اس سے کبھی نہیں ڈری تھی۔ نہ پندرہ سال پہلے۔ نہ پندرہ سال بعد۔

''اور اگر تم سمجھ رہے ہو کہ میں......''

''ایک کپ چائے ملے گی۔'' اسے لگا اگر وہ اسے سنتا رہا بار بار اس کے شک، اس کے شبہات، اس کے سوالات کی زد میں کھڑا رہا تو فنا ہو جائے گا۔

جنت کمال نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ یہاں اس کی جان پر بنی ہوئی تھی اور اس امیر زادے کو چائے کا کپ چاہیے تھا؟ وہ بھی رات کے ڈھائی بجے؟

دھتکار، نفرت ایک طرف۔ لحاظ اور مروت دوسری طرف۔ نوکروں کی فوج بہر حال یہاں نہیں تھی۔ سلگ کر اسے دیکھا۔

صرف اس لیے کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اور صرف اس لیے کہ وہ بوا کا ''مہمان'' تھا، وہ غصے سے پاؤں پٹختی کچن میں چلی گئی۔

''اپنی چہیتی بیوی کو ساتھ لانا تھا نا ان خدمت داریوں کے لیے۔'' بڑبڑاہٹ واضح تھی۔

وہ اس کے پیچھے دروازے میں آن کھڑا ہوا۔ لبوں کو مسکراہٹ چھو کر گزری۔ دل میں غم سا ٹھہر گیا۔

''مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ جب تمہیں اپنی پہلی بیوی سے اتنی محبت تھی تو تم نے مجھ سے شادی کیوں کی؟ آنٹی نے گن پوائنٹ پر تو نکاح نہیں پڑھوایا تھا۔ تم انکار بھی تو کر سکتے تھے۔''

خاموشی۔ مکمل خاموشی۔

سلنڈر جلا کر کیتلی رکھی۔ دودھ ڈالا۔

''بھلے سے تمہیں برا لگے لیکن ایک بات ہے، تمہاری چوائس ہے بہت بری۔'' عدینہ زبیر ایک بار پھر اپنے تمام تر غرور، حسن اور نزاکت کے ساتھ اس کے حواسوں پر چھا گئی تھی تو بھڑاس نکالنا ضروری ہو گیا تھا۔

''ممی کی چوائس اچھی ہے؟''

''ہاں بالکل۔'' وہ بے ساختہ کہہ گئی مگر اگلے ہی لمحے پل۔ جب سمجھ میں آیا کیا کہہ دیا ہے تو گالوں پر سرخی دوڑ گئی۔ لب بھینچ کر

عسریسرا۔ حسنیٰ حسین

خودکو دل ہی دل میں کوسا اور لب سی لیے۔ کہ اب وہ کچھ نہیں بولے گی۔

خاموشی سے اس کی طرف پشت کیے چائے بنا کر کپ میں انڈیل کر مڑی تو کچن کے دروازے پر وہ نہیں تھا۔ اپنا مگ ساتھ رکھ کر وہ کمرے میں آ گئی۔ سامنے ہی وہ بیڈ پر ہلکی سی کھانسی کی زد میں بیٹھا تھا۔ ٹشو کا پیک ہاتھ میں تھا۔ روشنی میں اب اس نے دیکھا تھا آنکھیں سرخ اور کنارے سوجے ہوئے لگ رہے تھے۔

اس نے چائے پیش کر دی۔

''بسکٹس نہیں ہیں؟''

وہ جانے کے لیے مڑی اور پھر ضبط کر کے پلٹی۔ بسکٹس کے ساتھ ایک گلاس پانی بھی رکھ دیا۔ اپنا مگ ہاتھوں میں لیے دروازے میں جا کھڑی ہوئی۔ چند لمحوں تک اسے گھورتی رہی کہ اب وہ کچھ بولے گا اور اپنی آمد کی وجہ بتائے گا مگر فارس وجدان چائے اور بسکٹس کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے اسے مکمل نظرانداز کر چکا تھا۔ وہ اندر تک سلگ اٹھی۔

''تمہیں پتا ہے یہاں بوا کے گھر میرے لیے کتنے رشتے آ چکے ہیں؟'' آخر اسے یہ باور بھی تو کرانا تھا کہ وہ کوئی گری پڑی لڑکی نہیں ہے۔ اور اگر فارس وجدان کو کئی لڑکیاں مل سکتی ہیں تو اسے بھی اپنانے والے بہت ہیں۔

وہ چائے میں بسکٹ ڈبو کر کھاتے ہوئے لمحے بھر کے لیے رکا۔

''بوا تو ہنس کر ٹال دیتی ہیں، انہیں ہمارے معاملات کا علم نہیں لیکن میں بہت غور کر رہی ہوں۔ ایک رشتہ مجھے اپنے لیے مناسب لگا ہے۔ بوا کا دور پرے کا رشتہ دار ہے۔ بیوی کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔ دو چھوٹی چھوٹی سی بیٹیاں ہیں۔ لڑکا بھی کوئی زیادہ بڑی عمر کا نہیں۔ تم سے طلاق کے بعد مجھے اپنے لیے بھی کچھ سوچنا ہے۔ اب میں کہانیوں کی ہیروئن کی طرح یہ نہیں کہہ سکتی کہ پلیز مجھے اپنا نام دے دو۔ میں ساری عمر اسی نام کے سہارے تنہا رہنا چاہتی ہوں بلا...... بلا...... بلا!'' باقاعدہ چہرے کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ہاتھ جھلا کر کہا۔

چائے میں بسکٹ ڈبو کر منہ تک لے جاتے فارس نے رک کر نظر اٹھائی۔ بسکٹ ٹوٹ کر چائے میں گرا۔ اس کا دل بھی۔

مگ ہاتھوں میں لیے اس سے دس قدموں کے فاصلے پر اب وہ میز پر چڑھی بیٹھی تھی۔ پیچھے کھڑکی پوری کی پوری کھلی ہوئی تھی۔ ہوا کے زور سے دوپٹہ ڈھلک کر کندھوں پر آ گرا تھا۔ شہد بالوں کی لٹیں پونی سے نکل کر چہرے کے اطراف میں ڈھیلی ہو رہی تھیں۔

''تمہارے لیے رشتے آ رہے ہیں؟''

''تو کیا نہیں آ سکتے؟'' ابرو چڑھا کر پوچھا۔ وہ اپنی چائے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جنت کمال نہیں بدلی تھی۔

''ویسے میں تم سے کچھ دنوں تک رابطہ کرنے والی تھی۔ میرا سامان بھی تمہارے گھر رہ گیا ہے۔ تم نے کہیں پھینکوا تو نہیں

دیا؟'' ناک اونچی کر کے ظاہر کیا اسے تو اب صرف اپنے سامان سے مطلب ہے۔

ایک اور بسکٹ ٹوٹ گیا۔ آدھا جو منہ میں گیا اس کی مٹھاس ختم ہو گئی۔ اس نے پانی کے چند گھونٹ بھرے بسکٹ کا دوسرا پیک کھولا۔

''آنٹی کو معلوم ہے تم یہاں آئے ہو؟''

وہ خاموش رہا۔

اور یہ خاموشی جنت کے دل میں کرب اتار گئی۔ ظاہر ہے اگر وہ انہیں بتاتا تو کیا وہ اسے آنے دیتیں؟؟ اس جیسی لڑکی کی اب ان کی زندگی میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ اس بات پر رنجیدہ ہوتی ہوں گی کہ انہوں نے فارس کے لیے اس کا انتخاب کیوں کیا؟

''تم یہاں کیوں آئے ہو؟'' گھوم پھر کر وہی سوال۔ مگر وہ جواب نہیں دے رہا تھا۔ نہ طنز، نہ طعنے، نہ کوئی سخت بات، نہ کوئی تضحیک آمیز رویہ۔ نہ تلخ لہجہ۔

فارس وجدان اب کیا کرنے والا تھا؟ وہ فکر میں پڑ گئی۔

کافی دیر تک جب وہ کچھ نہ بولا تو نوٹ بک کا صفحہ پھاڑ کر، اس میں اپنی کچھ چیزیں درج کر کے وہ اس کے پاس آ گئی۔

''یہ تمہارے لیے بے شک کچرا ہو گا مگر مجھے میری چیزیں بہت عزیز ہیں۔ اس لیے اپنے کسی ملازم کے ہاتھ بھجوا دینا۔''

فارس نے صفحہ لے لیا۔ فولڈ کر کے اس کے ارسلان بھائی کی قمیص کی جیب میں رکھ دیا۔ وہ تپ گئی۔ لیکن منہ سے کچھ نہ کہا۔ پھر انہی بگڑے تیوروں کے ساتھ جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ فارس نے ہاتھ تھام لیا۔

''تمھاری بوا کہہ رہی تھیں کوئی بات ہے جو تم مجھے بتانا چاہوں گی؟''

وہ اپنی جگہ پتھر ہوئی۔ چہرے کا رنگ فق، آنکھیں نم، پلکیں بھاری ہو گئیں۔

''کچھ نہیں!'' بھرائی ہوئی آواز میں کہہ کر اس نے ہاتھ چھڑانا چاہا۔ گرفت سخت نہیں تھی مگر اتنی نرم بھی نہیں کہ وہ آزاد ہو سکتی۔

''میرا ہاتھ چھوڑو۔'' آن کی آن میں اس کے تاثرات بدل گئے تھے۔ وہ تحمل سے بات کرتے ہوئے بھی غصے کی انتہا پر لگ رہی تھی۔ فارس نے چند لمحوں کے لیے اسے پشیمانی سے دیکھا۔

اسے اس نہج پر لانے والا وہ خود تھا۔ فاصلوں کی دیوار اس نے خود قائم کی تھی۔ نرمی کو اپنی تلخی سے نوچا تھا۔ امید کو اپنے لفظوں سے مارا تھا۔

نازک کلائی گرفت سے آزاد ہو گئی۔ اس نے ٹرے اٹھائی اور کمرے سے نکل گئی۔ کچن میں دیوار سے لگ کر، کئی بار اپنی آنکھوں کو مسلا، لب بھینچ کر، گال رگڑ کر خود کو سنبھالا، خود کو سمجھایا کہ جس راستے پر وہ گامزن تھی، وہ اس کا اختیار کردہ ہرگز نہیں تھا۔ یہ

مقدر کی چال تھی۔نفرتیں، دھتکار اور بلاوجہ کی عداوتیں اس راستے کا خاصا تھیں جو اسے کچھ لوگوں کی بے رخی سے عنایت ہوا تھا۔

فارس وجدان، عدینہ زبیر کا تھا، اس کے دل پر عدینہ زبیر کی حکمرانی تھی۔اس کی زندگی میں جنت کمال کی کوئی گنجائش نہ پہلے تھی، نہ اب ہو سکتی تھی۔ جو طے ہو چکا تھا اسے قبول کر کے اسے ہر صورت اپنے سفر کو جاری رکھنا تھا۔اسے کمزور نہیں پڑنا تھا۔

وہ نیچے چلی گئی۔اپنی چارپائی پر لیٹ کر، آسمان کو دیکھتے وہ مسلسل اپنے رونے پر قابو پاتی رہی۔

فارس کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ ہرگز نہیں آنا چاہیے تھا۔اس کے سکون میں خلل پڑ چکا تھا، اس کے لائحہ عمل میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ وہ اس کے بچے کا باپ تھا۔جتنی نفرت وہ اس سے کرتا تھا، وہ اولاد کے معاملے میں بھی اب اسے کسی نئے امتحان میں ڈال سکتا تھا۔

کروٹ پر کروٹ بدلتے رات گزر گئی۔ دن بیدار ہوا۔صبح کی نماز پڑھ کر سونے کی کوشش کی تو آنکھ لگ گئی۔ کچھ گزشتہ شب کی بے خوابی تھی کہ وہ دن چڑھے تک سوتی ہی رہی۔

دس بجے اس کی آنکھ کھلی تو سورج سوا نیزے پر آ چکا تھا۔صحن میں دھوپ ہر کونے تک پہنچی ہوئی تھی۔ دروازہ بند تھا، کھڑکیوں کی درز سے نیم تاریکی میں روشن لکیریں نمایاں ہو رہی تھیں۔

پہلا خیال اسے فارس کا ہی آیا۔ دماغ از سر نو الجھن گیا۔ٹینشن شروع ہو گئی۔ اٹھ کر باہر گئی تو معلوم ہوا وہ تو صبح سے پہلے پہلے یہاں سے جا چکا ہے۔

جنت اپنی جگہ بے یقین کھڑی رہ گئی۔

''ضرور تو نے ہی اسے کچھ کہا ہوگا۔'' صابرہ بوا اس سے سخت خفا تھیں۔ ''تیری وجہ سے وہ بخار میں گھر چھوڑ کر چلا گیا۔''

بے دلی سے دہی کے ساتھ پراٹھا کھاتے ہوئے وہ آنکھوں میں ابھرتی نمی کو پرے دھکیلتی رہی۔ بوا کے سوال، ان کا غصہ، ان کی ناراضگی اور ساری سچویشن کو کسی طور نہ سمجھنے کا یہ عمل اسے شدید اذیت سے دوچار کر رہا تھا۔

اب کیا وہ اس کے پاؤں پکڑتی کہ وہ اسے طلاق نہ دے؟ خود کو جتنا بے مول کرنا تھا وہ کر چکی تھی۔ محبت سے، اخلاق سے، خدمت گزاری سے اس رشتے کو بچانے کی جتنی کوشش اس نے کرنی تھی کر لی تھی۔ اب تو کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ نہ محبت، نہ عزت، نہ ہمت، نہ سکت اور حوصلہ تو بالکل بھی نہیں۔ اب تو برداشت بھی اپنی آخری حد کو چھو رہی تھی۔ وہ پھر سے کسی امتحان میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ پھر سے کوئی غلط قدم نہیں اٹھانا چاہتی تھی۔ مگر بوا......

صندل آپا، ارسلان بھائی کے ساتھ گھر میں داخل ہوئیں تو وہ چپ ہو گئیں۔ لیکن آنکھوں سے واضح کر دیا کہ ان کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ سارا دن وہ پریشانی میں مبتلا یہاں وہاں ٹہلتی رہی۔ سکون تو کسی پل نہیں تھا۔ آخر وہ کیوں آیا تھا؟ اور معاملات کلیئر کیے بغیر کیوں چلا گیا تھا؟ ان کے مابین طلاق کا فیصلہ ہونا تھا۔ تو ایسے کیسے وہ خاموشی سے جا سکتا تھا؟ اس پر مستزاد یہ کہ اس کے سامان کی لسٹ بھی یہیں چھوڑ گیا تھا۔

شام کو بوا کمرے میں آئیں تو وہ عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد بیڈ پر نیم دراز بیٹھی تھی۔ اخبار سامنے ہی کھلا پڑا تھا۔ ذہن الجھا ہوا تھا اور نگاہیں خلا میں کہیں بھٹک رہی تھیں۔

''اس نے بتایا نہیں وہ دوبارہ کب آئے گا؟'' تہ کیے ہوئے کپڑے الماری میں اندر رکھتے ہوئے انہوں نے ہنوز خفگی سے پوچھا۔ اس نے گردن موڑ کر انہیں مضطرب نگاہوں سے دیکھا۔ ان کی سوچ ابھی بھی وہیں تھی۔

''ہو سکتا ہے کچھ دنوں تک وہ مجھے طلاق کا نوٹس بھجوا دے۔'' ہمت مجتمع کر کے اس نے کہہ دیا۔ اب بھلے سے بوا سخت ناراض ہوں اسے پرواہ نہیں تھی۔ وہ کچھ باتیں ان پر ہر صورت واضح کر دینا چاہتی تھی۔

''مگر طلاق تو نہیں ہو سکتی۔'' الماری بند کر کے بوا اس کی طرف مڑیں۔

''ہو جاتی ہے بوا! عورت حمل سے ہو تب بھی طلاق ہو جاتی ہے۔''

''مگر وہ شید و تو یہی کہہ رہی تھی کہ نہیں ہوتی۔'' اپنی سمجھ اور فہم کے مطابق جو انہوں نے سن رکھا تھا کہہ دیا تھا۔

بیڈ سائڈ ٹیبل سے قرآن اٹھا کر اس نے مطلوبہ سورت ڈھونڈی، اور پھر مطلوبہ صفحہ کھولا، مطلوبہ آیت پر اپنی انگلی رکھی۔

''یہ دیکھیں۔ یہاں لکھا ہے۔''اور حمل والیوں کی عدت ان کے بچہ جننے تک ہے'' (سورہ طلاق)۔ یہ آیت مطلقہ اور بیوہ دونوں کے بارے میں ہے بوا۔ طلاق ہر صورت ہو جاتی ہے۔'

دلیل قرآن سے تھی، بوا کے پاس نفی یا انکار کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ اب وہ الجھن میں کھڑی تھیں۔ فکر نے از سر نو گھیر لیا تھا۔ انہیں اب معاملہ سلجھتا ہوا ہرگز نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن انہیں اپنی طرف سے ہر ممکن سعی کرنی تھی۔

کچھ سوچ کر وہ اس کے پاس بیڈ آ بیٹھیں۔

''تو نے اسے خوشخبری تو سنا دی تھی؟''

جنت کا دل بھاری ہوا۔ نظریں جھک گئیں۔ کس قدر کوشش سے اس کا سر نفی میں ہلا۔

صابرہ بوا حق دق اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ جنت یہ کیا کر رہی تھی؟

''تو اس بات سے اسے کیسے بے خبر رکھ سکتی ہے جنت؟؟ کیسے؟؟ یہ اس کے ساتھ زیادتی ہے بیٹا۔''

''اور جو زیادتیاں میرے ساتھ ہوئیں وہ؟'' صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ آواز بھرا گئی۔ ''مجھے اس کے ساتھ اب نہیں رہنا تو کیا زبردستی ہے؟'' وہ اس لمحے بہت پریشان۔ مضمحل۔ اور شکست خوردہ سی لگ رہی تھی۔ بوا کے دل کو کچھ ہوا۔

عسریسرا۔ حسنیٰ حسین

''میں پہلے سے بہت مشکل میں ہوں اور آپ۔ آپ اس طرح کی باتیں کر کے مجھے اور مشکل میں ڈال رہی ہیں۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو گئے۔

اسے ترحم بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بوا نے بہت نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''عورت کو رشتہ نبھانے کے لیے بہت قربانیاں دینا پڑتی ہیں بچے! یہ شادی۔ عمر بھر کا ایک فیصلہ ہوتا ہے۔ اسے یوں جذبات میں آ کر نہیں توڑا جاتا۔ گھر بسانے کے لیے عورت کو بہت کچھ برداشت کرنا ہے۔''

اس نے سر اٹھا کر تکلیف دہ نگاہوں سے بوا کو دیکھا۔ بات گھر بسانے، رشتہ نبھانے اور برداشت کی انتہا پر جانے کی تھی۔ بوا کو اندازہ ہی نہیں تھا فارس وجدان کے ساتھ اپنے اس رشتے کو بچانے کے لیے اس نے کیا کچھ برداشت نہیں کیا تھا۔

اس کا صبر، اس کا تحمل، اس کا انتظار کیا ابھی بھی ناکافی تھا؟ وہ خود مٹ چکی تھی مگر اس کا صبر باقی رہنا چاہیے؟ اس کی ہمت، اس کی برداشت۔ اس کا تحمل باقی رہنا چاہیے؟ یہ کیسی منطق تھی؟ یہ کیسا طریقہ تھا؟

کتنی ہی دیر تک وہ اپنے آپ سے الجھتی رہی۔ اندر ہی اندر خود کو نوچتی کھسوٹتی رہی۔ محاسبہ شروع ہو چکا تھا۔ پانچ سالوں کا موازنہ پانچ مہینوں سے ہونے لگا تھا۔

برہان ایک طرف تھا تو فارس وجدان دوسری طرف۔ وہ دو گھروں کے درمیان۔ ایک ویران گلی میں تنہا لاوارث کھڑی تھی۔ دروازے دونوں طرف سے بند تھے۔ اور وہ خود کو جانچ رہی تھی۔ دل میں جا کر، روح کی گہرائیوں میں اتر کر، ماضی کی تکلیفوں کو سہتے ہوئے، مستقبل کا خوف اٹھاتے ہوئے۔

اس کے اندر کی الجھنیں بڑھ گئیں۔ سوال بڑھ گئے۔ اضطراب بڑھ گیا۔

سر اٹھا کر اس نے بوا کو دیکھا۔ اب تک جانے وہ گھر بسانے سے متعلق اسے کتنے گر بتا چکی تھیں۔ ان کے لب متحرک تھے۔ آنکھوں سے ایک آس چہرے سے امید جھلک رہی تھی۔ وہ بہت پیار سے اسے سمجھا رہی تھیں۔

''بوا ایک بات تو بتائیے۔'' وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئیں تو اس نے اخبار سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیا۔ ذرا سا آگے سرک کر ان کے قریب ہوئی۔ ''عورت نکاح نامے پر سائن کس لیے کرتی ہے؟'' نم آنکھوں میں ایک سادہ سا سوال لیے وہ اب ان سے پوچھ رہی تھی۔ بوا کو اس کا سوال سمجھ میں نہ آیا۔ ''ذلت؟ دھتکار؟ بے عزتی؟ طنز؟ تحقیر؟ محرومیوں کے لیے؟ کیا یہ سب برداشت کرنے کے لیے شادی کی جاتی ہے؟ اسی عذاب کو جھیلنے کے لیے ''قبول ہے'' کہا جاتا ہے؟''

بوا کو سکتہ سا ہوا۔ لبوں کو جنبش دے کر کچھ کہنا چاہا مگر آواز نے ساتھ نہ دیا۔ جنت یہ کیا پوچھ رہی تھی؟ اس نقطے کی طرف کیوں جا رہی تھی جس نقطے سے یہ رشتہ آغاز پکڑتا تھا۔ وہ ایجاب و قبول کی گھڑی۔ جب دو لوگ ایک ہوتے تھے؟ اور جب دو لوگ ایک

ہوتے تھے تو رشتہ نبھانے کے معاملے میں وہ ''دو'' الگ کیوں ہو جاتے تھے؟؟ سفر کا سارا بوجھ صرف ایک کے کندھے پر کیوں آ جاتا تھا؟ رشتہ بچانے کی ساری محنت پھر کسی ایک فریق کو کیوں کرنی پڑتی تھی؟؟

''شادی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ کیا ہمارے نبی کی سنت یہ کہتی ہے اپنی عزت فنا کر دیں۔ اپنا وجود مٹا دیں۔ اپنے حق کے لیے آواز نہ اٹھائیں اور ظلم برداشت کریں۔ اور مرتے دم تک کرتے جائیں؟''

بوا بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

''آپ ہی مجھے سمجھا دیں یہ گھر بسانے کا، رشتہ نبھانے کا کون سا طریقہ ہے بوا؟'' اس کی آواز کپکپائی، ''عورت نفسیاتی مریضہ ہو جائے اور اف تک نہ کرے؟ اندر سے مر جائے، مٹ جائے، فنا ہو جائے لیکن آہ تک نہ کرے؟''

وہ بائیس سالہ جنت کمال۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کی نواسی۔

تتلیوں کے پیچھے بھاگنے والی۔ پریوں کی باتیں کرنے والی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ اور بوا اسے دیکھ رہی تھیں۔ اسے سن رہی تھیں۔ وقت اور حالات نے اسے کتنا بڑا کر دیا تھا۔ اس کی سوچ کتنی پختہ ہو گئی تھی۔ اس کی باتوں میں کتنا وزن آ گیا تھا۔ تسلی دینے کو، تشفی کرنے کو ان کے پاس ایک لفظ بھی تو نہیں رہا تھا۔ جو کچھ وہ سہ آئی تھی اور جن حالات سے گزر کر وہ ان تک پہنچی تھی۔ وہ اس کا سفر، اس کا راستہ، اس کی مجبوری سمجھے بغیر اس کی ہر بات کیسے رد کر سکتی تھیں؟ کیسے جھٹلا سکتی تھیں؟ کیسے؟

''میں نے برہان کے ساتھ پانچ سال گزارے ہیں بوا...... میں نے اس کے لیے اس کے گھر والوں کی ہر نفرت برداشت کی ہے۔ ہر طنز، ہر طعنہ۔ خود پر لگنے والے الزامات۔ سب کچھ۔ میں نے ''برداشت'' اور ''صبر'' سے اپنا گھر بسانا چاہا تھا۔ اور بدلے میں اس نے مجھے کیا دیا؟ طلاق؟'' اس نے رک کر ان کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''پانچ سالوں کا ساتھ تھا ہمارا۔ اس نے مجھے پانچ سیکنڈ میں آزاد کر دیا۔ میں اس کے گھر والوں کو ''برداشت'' کر رہی تھی۔ وہ بھی تو مجھے ''برداشت'' کر سکتا تھا؟ میں اس کی بے رخی پر صبر کر رہی تھی۔ وہ بھی تو مجھ پر ''صبر'' کر سکتا تھا؟ وہ جانتا تھا میرا کوئی نہیں ہے۔ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا مجھے تو میری سگی ماں بھی قبولنے کو تیار نہیں۔ اس کے باوجود اس نے۔ اس نے مجھے طلاق دے دی۔ مجھے اپنے گھر سے نکال دیا۔ اس نے میرے منہ پر جو تھپڑ مارا اس کی جلن مجھے آج تک محسوس ہوتی ہے۔'' اس کا چہرہ آنسوؤں سے مکمل تر ہو چکا تھا۔

''اس نے رویہ بدلا، ترجیحات بدلیں، حقوق بدلے، میری جگہ کسی اور کو دی۔ میرا وقت کسی اور کو دیا۔ میرا حق کسی اور کو دیا اور میں خاموش رہی۔ آخر کس لیے؟'' اس کی آواز بھیگی، ''صرف اس لیے کہ میرا گھر بچا رہے۔ مجھے بتائیے میرا وہ گھر پھر کیوں نہیں بچا؟ کیوں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر میری آنکھوں کے سامنے بکھر گیا؟''

جنت کے آنسو، اس کی سسکیاں، اس کا درد، اس کے سوال انہیں تکلیف پہنچا رہے تھے۔ وہ آنکھوں میں نمی لیے اسے دکھ سے

سن رہی تھیں۔

''مجھے اب خود سے نفرت ہوتی ہے بوا، غصہ آتا ہے میں خاموش کیوں رہی۔ میں نے یہ سب کیوں ہونے دیا۔ میں نے خود کو اتنا کیوں جھکایا؟ اتنا کیوں گرایا؟ میں نے اپنے حق کے لیے آواز کیوں نہیں اٹھائی۔ اگر میں وقت سے پہلے خود کوئی اسٹیپ اٹھا لیتی۔ اگر میں خود برہان سے الگ ہو جاتی۔ تو امی...... امی کم از کم اس صدمے سے تو نہ مرتیں کہ ان کی بیٹی ایک قاتلہ ہے۔ یہ ڈرامہ۔ یہ ہنگامہ تو نہ ہوتا بوا! میری وجہ سے میری بہنیں امی سے جدا تو نہ ہوتیں۔ میری طرح وہ بھی یہ رشتہ تو نہ کھوتیں۔''

بوا نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھاما۔ وہ اسے مزید روتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

''میں نے اپنے اور فارس کے رشتے کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے بوا۔ آپ خود بتائیں۔ کون لڑکی چاہے گی اس کی دوسری شادی بھی ختم ہو جائے؟ اسے دوسری بار بھی طلاق ہو جائے؟؟'' آواز نے ساتھ چھوڑا تو اس نے آنکھیں رگڑ کر صاف کیں۔ ''میں نے یہاں بھی صبر کیا ہے۔ بہت صبر کیا ہے لیکن...... یہ گھر بھی آپ کی جنہ کا نہیں ہے۔ آپ کی جنہ اس دوسرے مرد کی بھی نہیں ہے بوا۔''

ان کا دل کرچی کرچی ہوا۔ وہ آبدیدہ ہو گئیں۔ کون کہہ سکتا تھا، زندگی سے بھرپور ہنستی مسکراتی لڑکی کا نصیب ایسا ہوگا؟ اس کے راستے میں ایسے پہاڑ آئیں گے۔ ایسی آزمائشیں اور ایسے امتحان!

''نانا کہا کرتے تھے، صبر حالات پر کیا جاتا ہے۔ ظلم پر نہیں۔ ظلم انسان تب برداشت کرے۔ جب اس کے پاس بچاؤ کا کوئی راستہ نہ ہو۔''

ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کر کے۔ چہرے کے اطراف میں سیدھا گرتی لٹوں کو اس نے کان کے پیچھے کیا۔

اس کی ناک، گال، آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں لیکن وہ متحمل لگ رہی تھی۔ جیسے اس نے خود کو سنبھال لیا ہو۔

''میں نے جو غلطی پہلے کی۔ وہی غلطی دوبارہ نہیں دہرانا چاہتی۔ آپ یہ مت سمجھیں کہ جذبات میں لیا ہوا فیصلہ ہے۔ جذبات میں ایسا کرنا ہوتا تو بہت پہلے کر لیتی۔ جہاں میری کوئی جگہ نہیں وہاں میں زبردستی جگہ نہیں بنانا چاہتی۔ اپنی اولاد کو استعمال کر کے تو...... بالکل بھی نہیں۔''

بات ختم ہو چکی تھی۔ وہ اٹھ کر باہر چلی گئی تھی۔

اپنے اندر بہت سی خاموشیاں لیے صابرہ خاتون اپنی جگہ گم صم بیٹھی رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

مسز شیرازی دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد چائے کا کپ لیے بیڈ پر بیٹھی تھیں۔ ملازمہ نے لیپ ٹاپ ان کے سامنے رکھ دیا

تھا۔ کمرے میں اب وہ اکیلی تھیں۔ منتظر نگاہوں سے اسکرین کو تکتی وہ فکروں میں گھری بیٹھی تھیں۔ گزشتہ شب فارس سے رابطہ نہیں ہو سکا تھا مگر صبح اس نے اپنی خیریت کا میسج ارسال کر کے کہا تھا وہ دوپہر تک ضرور کال کرے گا۔

کچھ ہی دیر میں کال مل گئی۔ اسکرین پر کمرے کا منظر نمایاں ہوا۔

موبائل کو اسٹینڈ پوزیشن میں رکھے وہ سامنے کارپٹ پر بیٹھا تھا۔

شاور لے کر باہر نکلا تھا۔ سیاہ ٹینک ٹاپ میں کسرتی بازو نمایاں ہو رہے تھے۔ بال ابھی بھی گیلے تھے۔ عقب میں دیوار گیر کھڑکیاں، بیڈ اور وارڈروب نظر آ رہی تھی۔ وہ یقیناً ہوٹل کے کمرے میں تھا۔

میز پر کہنیاں ٹکائے اب وہ خیر خیریت پوچھ رہا تھا اور وہ بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ سرخ آنکھوں میں ہلکی سی سوجن تھی۔

''کیسی ہے میری بہو؟''

اس نے نظر اٹھا کر مسز شیرازی کو دیکھا۔ پھر منرل واٹر کی بوتل اٹھالی۔ آدھی بوتل خالی کر کے فرنچ فرائز کی پلیٹ قریب کر لی۔

''اچھی ہے۔'' جواب مختصر تھا۔

''صرف اچھی ہے؟''

''کہہ رہی تھی بہت رشتے آ رہے ہیں اس کے۔ اور اگر میں اسے چھوڑ سکتا ہوں تو اسے اپنانے والے بہت ہیں۔''

مسز شیرازی کے لبوں پر مسکراہٹ ابھری جسے لب بھینچ کر انہوں نے دبا لیا۔ ''اور......؟''

''مجھے دیکھ کر اسے بالکل بھی خوشی نہیں ہوئی۔ ایک کپ چائے پلانے پر دس باتیں سنائی ہیں۔ اسے لگتا ہے یقیناً میں اسے کوئی سزا دینے آیا ہوں۔'' وہ بتاتے ہوئے فرنچ فرائز بھی کھا رہا تھا۔

''اچھا'' انہوں نے گود میں کشن رکھ لیا۔

''وہ چاہتی ہے وعدے کے مطابق اب میں اسے آزاد کر دوں۔ نہ کیا تو وہ خلع کے لیے کورٹ چلی جائے گی۔''

اور اس آخری بات پر مسز شیرازی فارس کو بغور دیکھنے لگیں۔

وہ جنت سے ملنے کے بعد کچھ حد تک پرسکون تھا مگر آنکھوں میں ابھی بھی فکر اور غم ٹھہرا ہوا نظر آ رہا تھا۔

''اور تم نے کچھ نہیں کہا؟''

رک کر، اس نے نظر اٹھائی۔ اپنی ماں کو دیکھا۔ وہ بچوں کا سا اشتیاق لیے اب اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ جز بز ہوا۔ ان کا بیٹا سب خاموشی سے سنتا رہا ہوگا، ایسا تو نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن ایسا ہو چکا تھا۔

اس نے پلیٹ سے ہاتھ اٹھالیا۔ پانی کی بوتل خالی کر کے سائڈ پر رکھ دی۔

’’میں اس سے کہنا چاہتا تھا وہ مجھے معاف کر دے۔ میرے ساتھ واپس آجائے مگر نہیں کہہ سکا۔‘‘ سر اٹھا کر ایک بار پھر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

’’کیوں نہیں کہہ سکے؟‘‘ پہاڑ جتنی اذیتیں برداشت کرنے والے کے لیے چند لفظ بھاری، چند لفظ مشکل پڑ گئے تھے؟

’’صرف ایک لفظ سے تو سب ٹھیک نہیں ہوسکتا ممی۔ پانچ مہینوں کی اذیت ہے۔ پانچ منٹ میں تو ختم نہیں ہوسکتی۔‘‘

اس کا لہجہ۔ اس کا انداز۔ اس کی آواز۔ آنکھیں اور تاثرات۔ ان کا دل ڈوبا۔

’’وہ میرے کہنے پر کبھی واپس نہیں آئے گی۔ اور زبردستی میں نہیں کرنا چاہتا۔‘‘ سر جھکائے اب وہ قالین کے ریشوں پر داہنے ہاتھ کی انگلی سے لکیریں کھینچ رہا تھا۔ عمل غیر ارادی تھا۔ کانٹے کا نشان۔ منفی اور جمع...... پھر جمع سے منفی کا نشان۔

’’کوشش بھی نہیں کی۔ اور رد ہوجانے پر یقین کر لیا؟‘‘ انہوں نے نرمی سے پوچھا۔

’’میں نے اسے بہت دکھ دیے ہیں ممی۔‘‘ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ دیوار گیر کھڑکیوں سے ترچھی ہو کر سورج کی کرنیں سیدھا اس کے بالوں پر پڑ رہی تھیں۔ ہیزل آنکھوں کا رنگ بھی عیاں۔ حزن بھی عیاں۔ درد بھی عیاں تھا۔

’’تم مداوا بھی تو کرنا چاہتے ہو۔‘‘

’’مداوا سے پہلے اعتبار اہم ہے ممی! وہ مجھ پر اعتبار کبھی نہیں کرے گی۔‘‘

منفی جمع کا کھیل اب ختم ہو چکا تھا۔ وہ سر جھکائے گم صم بیٹھا تھا۔ پچھتاووں میں گھرا ہوا۔ وقت، نصیب اور قسمت کے اس انوکھے کھیل کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوا۔ کوئی اور بھی تو ہوسکتی تھی جس سے اس کا نکاح ہوتا۔ جنت کمال ہی کیوں؟ ڈاکٹر مصطفیٰ کی نواسی ہی کیوں؟ اس کی بلاوجہ کی نفرت اور عداوتوں کا سامنا جنت کمال کے حصے میں ہی کیوں آیا؟ اس کی تکلیف بڑھ گئی۔ ندامت بڑھ گئی۔ درد بڑھ گیا۔

مسز شیرازی اب کسی گہری سوچ میں گم بالکل خاموش بیٹھی تھیں۔ وہ بھی چپ تھا۔ کہنے کو جیسے مزید کچھ رہا ہی نہ تھا۔ راستے مسدود۔ دیواریں مضبوط اور حصار پھر سے قائم ہونے لگا تھا۔

’’میں خود کو قصور وار سمجھتی ہوں! یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ میرے محسن ڈاکٹر مصطفیٰ کی نواسی ہے، میں نے اس کے لیے یہ مشکل راستہ چنا۔‘‘

فارس وجدان اذیتوں میں گھر گیا۔

’’تم شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ میں نے تمہیں مجبور کیا۔ میں نے غلط کیا۔ میں صرف اتنا چاہتی تھی تم ماضی کو بھلا کر اپنی

زندگی نئے سرے سے شروع کرو۔ بیوی آئے گی۔ بچے ہوں گے تو سب ٹھیک ہوجائے گا لیکن......شاید میں غلط ہوں۔ ظلم تو پھر ظلم ہے۔ اور چونکہ فیصلہ میرا تھا تو میں خود کو بری الذمہ نہیں سمجھتی۔‘‘

’’ممی......!‘‘ اس نے بے بسی سے کہنا چاہا مگر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ ’’مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی فارس! بالکل بھی نہیں تھی۔‘‘

وہ سر جھکا گیا۔ بیوی کے ساتھ ساتھ ماں کا دل بھی بری طرح سے دکھا چکا تھا۔

’’عدیل احمد کو ایڈریس بھیج دو۔ میں تمھاری طرف آنا چاہتی ہوں۔‘‘ انہوں نے اتنے اچانک سے کہا کہ وہ حیرت زدہ سا بیٹھا رہ گیا۔ اس کی ماں یہ کیا کہہ رہی تھیں؟

’’آپ...... یہاں آئیں گی؟‘‘

’’میں مزید انتظار نہیں کر سکتی۔ مجھے اپنی بہو سے ملنا ہے۔ تمھارے اس کے مسئلے اپنی جگہ......مگر گھر اس نے میری وجہ سے چھوڑا ہے۔ کہ آنٹی کو وہ باتیں پتا چل گئیں جو پتا نہیں چلنی چاہیے۔ جو میرا رشتہ ہے وہ کسی صورت ختم نہیں ہوسکتا۔‘‘ اسے شدید حیرت میں مبتلا کر کے انہوں نے اقصیٰ کو آواز دی۔ بیٹھے بیٹھے ملازمہ کو کپڑوں کا آرڈر جاری کیا۔ ضروری سامان کی پیکنگ۔ کھانے کا انتظام۔ آن کی آن میں سب طے پایا جانے لگا۔

’’موسم کیسا ہے؟‘‘ یہاں وہاں سارے حکم نامے جاری کر کے انہوں نے فارس سے پوچھا۔

’’بارش کی وجہ سے کچھ ٹھنڈا ہے۔‘‘ اس کے لب ہلے۔ وہ شاک میں نہیں تھا مگر شاک میں ہی لگ رہا تھا۔

’’آپ بائے ایئر۔‘‘

’’نہیں میں بائے کار ہی آنا چاہوں گی۔‘‘ انہوں نے واضح کیا۔ ’’راستے میں ہم اقصیٰ کے گاؤں سے بھی ہوتے آئیں گے۔ کیوں اقصیٰ؟‘‘

’’جی جی بالکل!‘‘ اقصیٰ کی خوشی سے بھرپور آواز۔ جنت آپی آنے والی تھیں اس کی خوشی الگ۔ ماں سے ملنے کی خوشی الگ۔ اور مسز شیرازی کے ساتھ اتنی بڑی گاڑی میں سفر کرنے کی الگ۔

’’سفر لمبا ہے ممی!‘‘

’’ایسے سفر لمبے ہی ہوتے ہیں!‘‘

اگلے کئی لمحے وہ خود پر خاموشی طاری کیے بیٹھا رہا

’’ایک ریکوئسٹ ہے ممی!‘‘

''بولو!'' وہ فارس کی آنکھوں میں دکھ، فکر مندی، کچھ کھو دینے کا خوف واضح طور پر دیکھ سکتی تھیں۔ جو وہ کہہ رہا تھا اسے سنتے ہوئے ایک بار پھر ان کا دل ڈوبا تھا۔

بات ختم ہوئی تو انہوں نے چند لمحے کچھ سوچ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

کال ڈسکنیکٹ ہوئی۔ چہرہ غائب ہوا۔ بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے اس نے میز پر ہیڈ ڈاؤن کر لیا۔

دیوار گیر کھڑکیوں کے اس پار۔ آسمان پر روئی کے گالوں جیسے بادل۔ سورج کی کرنوں سے دہکتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

☆☆☆

سنو تم لوٹ آؤ نا
کہ دل ہے درد سے بوجھل
سکوں ایک پل نہیں ملتا
کہیں بھی دل نہیں لگتا
سنو!! سنسان ہوں تم بن
بہت ویران ہوں تم بن
مجھے سانسیں نہیں آتیں
کہ میں بے جان ہوں تم بن
سنو! بکھرا ہوا ہوں میں
سہارا چاہتا ہوں اب
تمھارے لوٹ آنے کا
اشارہ چاہتا ہوں اب
بھنور میں ہوں بہت دن سے
کنارہ چاہتا ہوں اب
سنو! تم لوٹ آؤ نا
کہ مجھ پر ہجر طاری ہے
عجب بے اختیاری ہے

نہیں طلب کسی شے کی
طلب اک بس تمہاری ہے
سنو!
تم بن نہیں رہنا
دکھوں کو اب نہیں سہنا
یہ خالی ہاتھ ہیں میرے
تم ان میں پیار بھر دو نا
میری تکمیل تم سے ہے
مجھے تکمیل کر دو نا
سنو تم لوٹ آؤ نا
سنو تم لوٹ آؤ نا

☆☆☆

اقصیٰ نے بھاگم بھاگ گاڑی کا دروازہ کھولا۔ ہینڈ بیگ اندر پھینکا۔

عدیل احمد اپنی جگہ ذرا محتاط سا کھڑا تھا۔ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

اتنا بڑا سیاہ چشمہ زرد، سبز اور سرخ رنگوں کے امتزاج کے اس کپڑوں والی کی ناک سے بار بار پھسلا جا رہا تھا۔ تیاری سے لگ رہا تھا کہیں شادی پر انوائیٹڈ ہے مگر انداز خاصے تباہ کن تھے۔ نہ ہیل کی پرواتھی، نہ چوڑیوں کی، نہ اتنے لمبے ائیر رنگز کی۔ اور چمکیلے دوپٹے کی چمک اور ستارے مرکزی دروازے سے یہاں تک بکھرے نظر آ رہے تھے۔ اتنا کچھ تو وہ گاڑی کی ڈگی میں رکھ چکی تھی اور ابھی بھی اس کا سامان ختم نہیں ہو رہا تھا۔ حالانکہ مسز شیرازی نے کہا تھا انہیں تو بس دوسرے شہر تک ہی جانا ہے۔ چند گھنٹوں کے لیے۔ اور پھر واپسی......بس اتنا ہی! باس کی طرف سے بھی یہی آرڈر ملا تھا۔

اور اس نے پتا نہیں کتنے رسالے، میگزین، کتابیں، ہینڈ بیگز اور جانے کیا کچھ اندر رکھ ڈالا تھا۔

''آپ کی تعریف؟'' رنگوں کی فیکٹری اب کے سامنے سے گزری تو اس سے رہا نہیں گیا۔

کوئی تیسری بار گاڑی کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی چند ایک تصویریں لینے کے بعد اقصیٰ سیدھی ہوئی اور ناک پر پھسلتی عینک کو ذرا نیچے کر کے اس نے موصوف کو سر تا پیر دیکھا۔ سوٹڈ بوٹڈ نوجوان۔ بال خاصے گھنگریالے تھے۔ ناک ذرا سی لمبی تھی۔ قد کاٹھ بھی

مناسب تھا۔فرنچ کٹ داڑھی میں بلا کا سوبر اور سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کرتا وہ اسے ایک آنکھ نہ بھایا۔

''مستقبل قریب کی ڈاکٹر اقصیٰ!اور جنت آپی کی حالیہ مینیجر!۔'' اترا کر اپنا تعارف کرایا۔کہ اگر وہ فارس وجدان کا خاص ملازم ہوسکتا ہے تو اس کی پوزیشن بھی شیرازی خاندان میں کم نہیں۔

''آپ کو اتنا سامان گاڑی میں رکھنے کی اجازت کس نے دی ہے؟''

''کیوں یہ گاڑی آپ کی ہے۔'' بڑی بڑی گول شیشوں والی عینک کو واپس آنکھوں پر جما کر پوچھا۔وہ لاجواب ہوا۔ہیل پر ڈولتی ہوئی وہ ایک بار پھر کوارٹر کا رخ کر چکی تھی۔عبدالغفور مالی دروازے میں کھڑا تھا۔سر پر ہاتھ رکھے کچھ کہہ رہا تھا اور وہ کبھی اثبات میں۔ اور کبھی نفی میں سر ہلانے لگتی تھی۔

اب کے واپس آئی تو ہاتھ میں شاپر تھا۔عدیل احمد کے سامنے ایک بار پھر سر جھٹک کر اپنی عینک درست کی اور مسز شیرازی کو بلانے اندر چلی گئی۔

رسٹ واچ پر ٹائم دیکھتا وہ گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا تھا۔

گاڑی سے دروازے تک جگہ جگہ بکھرے نگوں کی سورج کی روشنی میں چمک تھی۔اور بے تحاشا چمک تھی۔

☆☆☆

سہ پہر کا سورج غروب ہو رہا تھا،اندھیرے بڑھ رہے تھے،روشنیاں مٹ رہی تھیں۔منزل واضح ہو کر بے نام تھی اور راستے آسان ہو کر مشکل ہو رہے تھے۔دل اندیشوں میں گھرا ہوا تھا۔کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔

مسز شیرازی کی آمد کے متعلق جاننے کے بعد سے وہ اپنی جگہ سر جھکائے بالکل خاموش بیٹھی تھی۔دوپٹے پر گرفت جمائے، نگاہیں جھکی ہوئی۔

آنسو ابھرتے، پلکوں پر جھلکتے، پھر ٹھہر جاتے۔رونے پر قابو پائے وہ خود کو آنے والے وقت کے لیے تیار کرنا چاہ رہی تھی۔مگر کر نہیں پا رہی تھی۔آنکھوں کے سامنے ایک ہی منظر۔ایک ہی لمحہ۔ایک ہی ساعت بار بار گزر رہی تھی۔

امی کا گھر......مرکزی دروازے سے عین سامنے......نیم اندھیرے میں کھڑی نفیسہ اس پر نظر پڑتے ہی برف کے مجسمے میں ڈھلتیں،ٹوٹتیں پھر بکھر کر فنا ہوتی نفیسہ۔ان کی خاموش آواز،ان کی ساکت نگاہیں۔

''امی۔امی میں نے کچھ نہیں کیا!امی!!امی!!''

''دور ہٹو جنت۔'' ایمان نے چیختے ہوئے اسے پرے دھکیلا تھا۔

پلکیں جھپکا کر اس نے آنکھوں کو مسل ڈالا۔پھر نظروں کا زاویہ بدلا۔دوبارہ بدلا۔پہلے وہ دیوار کو دیکھ رہی تھی۔اب الماری پر

نظریں جمائے بیٹھی تھی۔پھر اس نے رخ بدل کر دروازے پر نظریں ٹھہرا لی تھیں۔زاویہ بدلنے سے منظر نہیں بدل رہا تھا۔ماضی نہیں بدل رہا تھا۔کیفیت نہیں بدل رہی تھی۔

''میں نے کچھ نہیں کیا۔'' ایک جنت بیڈ پر بیٹھی تھی تو دوسری جنت اسے روتی سسکتی،تڑپتی اپنی صفائی میں بمشکل لفظ ادا کرتی نظر آ رہی تھی۔تب تک،جب تک نفیسہ کی میت گھر نہیں آئی تھی۔تب تک،جب تک زندگی کا احساس باقی رہا تھا۔اور جب تک اپنوں کا اعتبار مکمل ختم نہیں ہوا تھا۔

وہ بار بار آنکھیں رگڑ رہی تھی۔بار بار سینے پر ہاتھ رکھ کر گہرا سانس لے رہی تھی۔آنکھیں خاموش تھیں۔دل رو رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں بوا آ گئی تھیں۔

''وہ تم سے ملنا چاہتی ہیں!''

دل کی دھڑکن تیز ہوئی۔سر جھکا رہا۔

''جنہ!۔''

قریب آ کر انہوں نے کندھوں پر ہاتھ رکھا تو اس نے بمشکل سر اٹھایا۔

''میں کیسے۔'' اس کے لب ہلے۔

''وہ تم سے بات کرنا چاہتی ہیں!''

''بوا۔میں ان کا سامنا کیسے۔''

''میری طرف دیکھ۔'' چہرہ ہاتھوں میں لے کر انہوں نے کہا۔''حق پر ہے نا تو؟ تو پھر اتنا ڈر کا ہے کو؟؟ اٹھ شاباش۔'' انہوں نے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ گئی۔

''پریشان نہیں ہو،تیری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔تو جو فیصلہ کرے گی میں تیرے ساتھ کھڑی رہوں گی۔'' انہوں نے ایک بار پھر یقین دہانی کروائی تھی۔

کمرے سے باہر،پھر سیڑھیاں اتر کر ڈرائنگ روم تک جاتے اس کی ہمت جواب دینے لگی۔قدم بھاری ہونے لگے۔

بچے کمرے میں تھے۔اقصیٰ ان کے پاس بیٹھی تھی۔صندل آپا چہرے پر پریشانی لیے کچن کے سامنے کھڑی تھیں۔

دروازہ کھل گیا۔بوا وہیں کھڑی رہیں۔''جا!''

ہمت کر کے وہ اندر داخل ہو گئی مگر دروازے میں ہی جھکے سر کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

سامنے ہی صوفے کے پاس وہیل چیئر پر مسز شیرازی بیٹھی تھیں۔اس کی نظران کے قدموں تک گئی اور پھر وہیں ٹھہر گئی۔

باہر اندھیرے پھیل رہے تھے۔کھڑکیاں تاریک ہو رہی تھیں۔وقت متحرک تھا۔وہ منجمد ہو چکی تھی۔

مسز شیرازی اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔مگر کن نظروں سے دیکھ رہی تھیں اس نے جاننے کی کوشش نہیں کی۔لب باہم پیوست کیے مجرموں کی طرح سر جھکائے بالکل خاموش کھڑی رہی۔

''تم نے مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا،وہ وعدہ پورا کیے بنا تم نے گھر کیسے چھوڑ دیا؟ مجھے کیسے چھوڑ دیا؟''

دوپٹے کے اندر انگلیاں باہم پیوست ہو گئیں۔سر جھکا رہا۔لب بھنچے رہے۔اور آنسو گرنے لگے۔اندر ہی اندر۔دل پر۔خاموشی صرف لبوں پر تھی تو آنکھوں میں بھی اتر گئی۔نظریں قدموں سے ہٹ کر فرش پر جم گئیں۔

اس کے پیچھے۔ ادھ کھلے دروازے کے بے حد قریب۔دیوار سے پشت لگائے فارس وجدان کھڑا تھا۔دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں تھے،سر جھکا ہوا تھا۔کچن میں کھانے کا انتظام دیکھتی صندل کی نظر بار بار اس کی طرف اٹھ رہی تھی۔

اس کی موجودگی سے قطعی بے خبر۔وہ ہنوز اپنی جگہ۔اپنے خول میں بند۔صامت کھڑی تھی۔

''یہاں آؤ۔''مسز شیرازی نے اب کے ہاتھ بڑھایا۔

مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔آنکھ کے کنارے پھر سے نم ہونے لگے۔

مسز شیرازی نے گہرا سانس لے کر ہاتھ نیچے کر لیا۔

''میں صرف ساس تو نہیں ہوں۔دوست بھی تو ہوں۔تم نے کہا تھا ماں جیسی لگتی ہوں۔اور اگر واقعی میں ایسا ہی ہے۔تو کیا یہ ماں اتنا بھی حق نہیں رکھتی کہ جان سکے۔اس کی بیٹی کے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

دھڑکن تھم گئی۔سانس رک گیا۔اس نے بے ساختہ سر اٹھایا۔گال پر آنسوؤں کی لکیر نمایاں ہوئی۔مسز شیرازی اسے دیکھ رہی تھیں۔اور وہ انہیں......

وہ رات......ایک بار پھر آ کر ٹھہر گئی تھی۔فائزہ چچی کی باتیں،ان کے الزام،ان کا غصہ۔ان کی نفرت۔اس رات وہ اسے برباد کرنے آئی تھیں۔اور اسے لگا وہ واقعی میں اسے برباد کر گئی تھیں۔انہوں نے یقین چھین لیا تھا۔اعتبار کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔اب تک وہ یہی سوچتی رہی تھی۔اب تک اسے گمان سے بھڑتی رہی تھی۔

مگر جو عورت سامنے بیٹھی تھی اس کی آنکھوں میں نہ تو نفرت تھی۔نہ حقارت،نہ بے اعتباری......کیا ایسا بھی ممکن تھا؟

وہ خاموشی جو مہینوں سے طاری تھی۔جو طلاق،قتل کا الزام،اور بھائی کی وفات کا گھیراؤ کرتی تھی۔جو ہر دلیل،ہر تاویل۔اور ہر وضاحت کو دفنا دیتی تھی۔وہی طاقت ور خاموشی۔روح سے دل،اور پھر دل سے زبان کو جکڑ کر رکھنے والی......زنجیر نما خاموشی ٹوٹنے لگی۔

''کیا ہوا تھا؟''وہ پوچھ رہی تھیں۔سوال جتنا مختصر تھا،جواب اتنا ہی طویل۔اتنا ہی تکلیف دہ۔

''میں نے ماہین کا بچہ ضائع کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔''اس اس کے لب ہلے۔آنکھیں سرخ ہونے لگیں۔''مجھے کام والی نے بلایا تو میں اس کے کمرے میں۔اسے دیکھنے گئی تھی۔اس نے دروازہ بند کر دیا اور۔اور اس نے سب توڑ دیا۔خود کو زخمی کر لیا۔میں نے اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچائی۔میں نے اسے زخمی نہیں کیا تھا۔''وہ کپکپاتے ہوئے،روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔جیکٹ کی جیبوں میں فارس کی مٹھیاں سختی سے بھنچ گئیں۔

''وہ کہتی تھی میں بانجھ ہوں۔کبھی ماں نہیں بن سکتی اور مجھے...... مجھے برہان کی زندگی سے نکل جانا چاہیے۔میں نہیں نکلی تو پھر اس نے۔'' سسکیاں ہچکیوں میں بدل گئیں۔''گھر پر،میرے نمبر پر۔رانگ کالز آتی تھیں۔ انہیں میرا نام۔میری ہر معلومات پتا ہوتی تھی۔میں نے برہان کے علاوہ کبھی بھی۔کسی سے رابطہ نہیں رکھا۔کبھی بھی نہیں۔لیکن برہان مجھ پر شک کرنے لگا۔''وہ اذیت کے عالم میں سب کہتی جا رہی تھی۔

''میں نے حسنین کی جان نہیں لی تھی۔ وہ سب۔وہ غلطی سے۔''آواز ساتھ چھوڑ رہی تھی۔لفظ بمشکل ادا ہو رہے تھے۔''آنٹی وہ میری گڑیا چھین رہا تھا۔وہ......وہ......'' منظر جیسے آنکھوں میں تھا۔سیڑھیاں سے پھسلتا۔فرش پر ڈھیر ہوتا حسنین۔اطراف میں پھیلتا سرخ خون۔منظر آنکھوں میں تھا۔وہ پنجوں کے بل فرش پر بیٹھی۔''سب کہتے ہیں میں بدبخت ہوں،بدنصیب ہوں،میری وجہ سے میرا بھائی مارا گیا۔مگر میرا یقین کریں آنٹی۔ میں نے اسے جان بوجھ کر نہیں مارا۔وہ سب۔''اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔گلا بیٹھ گیا۔لیکن وہ بول رہی تھی اور مسز شیرازی اسے بولنے دے رہی تھیں۔جو کچھ ذہن میں تھا،دل میں تھا،روح میں تھا،وہ لبوں پر آ گیا تھا۔ان کہے لفظ چنگاریوں کی طرح دہکتے تھے،روح کو گھائل کرتے تھے۔خاموش لفظوں کا عذاب۔جسم و جاں پر کتنا بھاری تھا۔کوئی جنت کمال سے پوچھتا۔

''وہ غلطی سے گر گیا تھا۔آنٹی میں نے جان بوجھ کر نہیں۔''

وہیل چیئر دھکیل کر وہ آگے ہوئیں۔اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا۔

''کوئی کچھ بھی کہے جو تمہاری حقیقت ہے وہ نہیں بدل سکتی۔مجھے تمہارے ایک ایک لفظ پر پورا یقین ہے۔''انہوں نے اس کے آنسو صاف کیے۔

''میں تو اتنا جانتی ہوں میری بہو کسی بچے کی جان لینے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔کسی کو جاننے کے لیے پانچ ماہ کم نہیں ہیں۔اللہ گواہ ہے میں نے تمہارے کردار میں کوئی جھول نہیں دیکھا۔اور رہی بات تمہارے بھائی کی۔تم صرف پانچ سال کی تھیں جنت۔وہ صرف ایک حادثہ تھا۔''

چھ سال پہلے تک وہ یہ لفظ اپنے نانا سے سنتی رہی تھی۔صرف وہی تھے جو اس کے ذہن میں ابھرتے ہر منفی خیال کی تردید کر دیا کرتے تھے، ان کی ہر بات ’حادثہ‘ اور ’ناسمجھی‘ سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتی تھی۔

اتنے عرصے بعد، مسز شیرازی سے سن کر۔ اس کا دل بھر آگیا۔ اسے تو لگتا تھا کوئی بھی اس پر کبھی یقین نہیں کرے گا۔ کبھی بھی نہیں۔ مگر مسز شیرازی۔

اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لیے وہ اس کی آنکھوں میں بہت نرمی سے دیکھ رہی تھیں۔

’’تم نے گھر کیوں چھوڑ دیا۔‘‘

’’میں ڈر گئی تھی آپ مجھ سے نفرت کریں گی۔ مجھے گھر سے نکال دیں گی۔‘‘ وہ روتے ہوئے کہے جا رہی تھی۔ ’’مجھے لگا آپ میری کسی بات کا یقین نہیں کریں گی۔‘‘

’’میں زیادہ سے زیادہ کیا کرتی جنت؟ یہی سوال پوچھ لیتی! تم جواب دے دیتیں۔ بات ختم ہو جاتی!‘‘

بات ختم ہو جاتی۔ آنسو آنکھوں میں ٹھہر گئے۔ سر اٹھا کر اس نے مسز شیرازی کو دیکھا۔ یہ بات اس کے اپنوں نے کبھی ختم نہیں کی تھی۔ سگی ماں نے۔ سگی بہنوں نے، سگے رشتوں نے حتیٰ کے برہان نے فارس وجدان نے بھی نہیں۔

’’میں......میں بہت پریشان تھی۔ مجھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔‘‘

’’اچھا بس اب رونہیں۔‘‘ انہوں نے ٹیبل سے گلاس اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔ ’’لو شاباش پانی پی لو۔‘‘ چند گھونٹ لے کر اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ وہ اتنی محبت اور اتنے پیار سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس کے مل جانے کی خوشی آنکھوں میں لیے۔ چہرے پر امید بھرے تاثرات لیے۔

اب وہ ان کے سامنے، بے حد قریب صوفے پر بیٹھی تھی۔ ہاتھ ابھی بھی ان کے ہاتھوں میں دبا ہوا تھا۔

ستائیس دن کا سفر تھا، بے گھر ہو جانے کی حقیقت تھی۔ ماضی تھا، اور مستقبل کا خوف الگ۔ ہر خوف، ہر ٹینشن، ہر گھبراہٹ سے نبرد آزما ہوتی اب وہ خاموشی سے انہیں سن رہی تھی۔

’’گھر کے بڑے کس لیے ہوتے ہیں جنت؟ جو آپ کا رشتہ طے کرتے ہیں، یا آپ کی شادی کرتے ہیں کیا وہ اتنا بھی حق نہیں رکھتے کہ آپ کے معاملات کو جان کر انہیں سلجھانے کی کوشش کر سکیں؟ آپ کی مدد کر سکیں؟ تم دونوں نے مجھ سے اپنی ہر بات چھپا کر بالکل اچھا نہیں کیا۔‘‘ وہ صحیح معنوں میں اب خفا لگ رہی تھیں۔ وہ کچھ حیرت سے انہیں دیکھ کر رہ گئی۔ اس نے ابھی تک فارس کے رویے سے متعلق تو کوئی بات ہی نہیں کی تھی۔ کیا انہیں شک تھا؟ یا وہ جان گئی تھیں؟ اگر ہاں تو کیسے جان گئی تھیں؟ کیا فارس نے؟ دل نے دلیل دی۔ ذہن نے فوراً تردید کر دی۔

’’میں نے۔‘‘ اس نے کچھ ہمت مجتمع کی۔ لفظ ترتیب دیئے۔ ’’میں نے......ایک اور بات بھی آپ سے چھپالی۔‘‘ آواز ایک بار پھر بھرائی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیسے بتائے۔ وہ ان کی مزید ناراضی مول نہیں لینا چاہتی تھی۔

’’تم نہ بھی بتاؤ تو کوئی بات نہیں۔‘‘ وہ سمجھ رہی تھیں، یقیناً یہ بھی خاندان سے متعلق کوئی بات ہوگی۔

’’بتانا ضروری ہے۔‘‘ اب کے گال رگڑ کر صاف کیے۔

’’اچھا بتاؤ۔‘‘ اتنا تو وہ رو رہی تھی۔ وہ ذرا پریشان ہوئیں کہ پتا نہیں کیا بات ہے۔ ذرا بوجھ ہلکا ہوا اس کا۔

’’آپ......آپ......دادی بننے والی ہیں۔‘‘

باہر دروازے کے پاس کھڑا فارس وجدان اپنی جگہ پتھر ہوا۔ بے حس۔ ساکت۔ منجمد!

ہاسپٹل کے کاریڈور میں اسٹریچر کے پہیوں کی حرکت، لگژری فلیٹ کے لاؤنج میں کافی ٹیبل پر رکھا سفید کاغذ۔ ڈریسنگ ٹیبل سے ایک جھٹکے سے سب بکھیرتے دودھیا ہاتھ۔ ان گنت سوال لیے، شک و شبہات کے دائرے میں معلق ہوتا اس کا وجود۔ سوالیہ نشان ہوتی اس کی ذات۔ مبہم ہوتا اس کا نام۔ مسخ ہوتی اس کی پہچان۔

اس نے بے ساختہ سر اٹھایا۔ سرخ آنکھوں میں کناروں تک نمی پھیل گئی۔ سامنے ہی برآمدے کے اس پار روشن کھڑکیاں دھندلا گئیں۔ جس دیوار سے وہ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ وہ دیوار فنا ہوئی۔ وہ سہارا کھو کر پنجوں کے بل جھک گیا۔ اس کا سانس اب بھاری ہو رہا تھا۔ اس کی کیفیت اب عجیب سی ہو رہی تھی۔ چہرے پر پل بھر کے لیے شاک تھا، پھر خوش گوار سی حیرت اور پھر اس حیرت میں کرب گھل گیا تھا۔ ان کی آن میں سوئے ہوئے کئی غم۔ کئی درد۔ کئی تکلیفیں۔ کئی محرومیاں جاگ اٹھی تھیں۔

وہ ماضی کی زنجیروں میں ایک بار پھر جکڑا گیا تھا، زندگی کی ڈور ہاتھوں میں لیے، یقین کی وادیوں میں اترتے، منفی خیالات کی گرفت سے اپنے ذہن کو چھڑاتے وہ ایک بار پھر اپنے اندر بھٹک گیا تھا، اپنے آپ سے بچھڑ گیا تھا۔

’’میرے اللہ! کیا واقعی؟ جنت آر یو ریئلی۔‘‘ مسز شیرازی لمحے بھر کے لیے جیسے بے یقین ہوئی تھیں۔

سر ہلاتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تو انہوں نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو ابھر آئے۔ اگلے ہی لمحے انہوں نے اسے خود سے لگایا۔ ’’مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔‘‘ اس کا ماتھا چوم کر اب وہ شکوہ کر رہی تھیں۔ وہ اتنا خوش تھیں۔ جیسے سارے غم، سارے درد مٹ گئے ہوں۔

’’میں دادی بننے والی ہوں! میرے اللہ! شکر الحمدللہ۔‘‘ شال کے پلو سے آنسو صاف کیے۔ ایک بار پھر سر اٹھا کر جنت کو دیکھا۔ وہ ایک بار پھر رونے کو تیار بیٹھی تھی۔

’’اب کیا ہوا؟‘‘ انہوں نے اتنے پیار سے دونوں ہاتھ تھام کر پوچھا تو ضبط ختم ہو گیا۔

"مجھے فارس کے ساتھ نہیں رہنا! مجھے طلاق چاہیے۔" رونا پھر سے شروع ہو گیا۔ دل پر بھاری بوجھ لیے فارس اپنی جگہ بیٹھا رہا۔

"وہ جہاں شادی کرنا چاہتا ہے آپ اس کی وہیں کر دیں۔"

"جنت بیٹا!"

"میں اس کے ساتھ اب کبھی نہیں رہوں گی آنٹی! کبھی نہیں۔" فیصلہ حتمی تھا۔ رد و بدل کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔" انہوں نے مسکراہٹ دبا کر اس کے گال پر ہاتھ رکھا۔ "تم دونوں کے اختلاف اپنی جگہ۔ لیکن کیا تمہارا نہیں خیال جب تک ڈلیوری نہیں ہو جاتی تمہیں ہمارے ساتھ چلنا چاہیے؟"

"آنٹی! وہ فارس......"

"کیا یہ مناسب نہیں رہے گا کہ تم اپنے بچے سے پوچھو اس کی ممی کو کیا فیصلہ کرنا چاہیے؟"

جنت نے چونک کر مسز شیرازی کو دیکھا۔ وہ دھیرے سے ہنس دیں۔

"کافی عرصے بعد ہمارے گھر میں خوشی آئی ہے جنت۔ میں پنی بہو کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتی ہوں۔ تم یہاں رہو گی تو مجھے فکر ہوتی رہے گی۔ اور یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ نئے فیملی ممبر کو آنے دو۔ پھر جیسا تم چاہو گی۔ ویسا ہی ہو گا! جو فیصلہ تم کرو گی میں تمہیں مکمل سپورٹ کروں گی۔ ابھی گھر چلو۔ میری خاطر!؟"

اسے ایک بار پھر رونا آیا۔

"اب نہیں رونا" پیار سے کہا تو آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" مسز شیرازی اسے خود سے لگائے کہہ رہی تھیں۔ اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔

"ہاں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"چلو شاباش اپنی تیاری کرو۔" انہوں نے کہا۔

فارس وجدان اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دروازہ کھول کر وہ باہر آئی اور اس کی موجودگی سے قطعی بے خبر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ اسے جاتا دیکھتا رہا۔

☆☆☆

کپڑے بدل کر بالوں کی ڈھیلی سی چٹیا بنائے وہ دوپٹے کے ساتھ شال اوڑھ کر نیچے آئی تو پہلی نظر ہی فارس وجدان پر پڑی۔

وہ نیم تاریکی میں دروازے میں کھڑا نظر آ رہا تھا۔ لمحے بھر کے لیے نظر ملی۔ دل جانے کیوں عجیب لے پر دھڑکا۔ مسز شیرازی نے یقیناً اب تک اسے بتا دیا ہو گا۔ جانے اس کے تاثرات کیسے رہے ہوں گے۔ جانے اس نے کیا کہا ہو گا!؟ رخ بدل کر وہ برآمدے کی طرف چلی گئی۔ اقصیٰ باقاعدہ چیخ کر اس سے لپٹ گئی۔

"جنت آپی! آپ کو نہیں پتا میں نے آپ کو کتنا یاد کیا۔"

علی کی گھوریاں اقصیٰ کے لیے ختم ہی نہیں ہو رہی تھیں۔ وہ صندل آپا سے ملی۔ پھر بچیوں سے جو اس کا جانے کا سن کر ہی اداس ہو گئی تھیں۔ علی کے تاثرات عجیب سے تھے۔ جیسے ابھی رو پڑے گا۔ اور صابرہ بوا۔

وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ کھڑی تھیں۔ اسے خود سے لپٹائے جانے کتنی ہی دیر تک دعائیں دیتی رہیں۔

"تیری ساس بہت اچھی عورت ہے! بہت نیک اور بڑے ظرف والی۔ مجھے زبان دی ہے۔ بیٹی بنا کر لے جا رہی ہے۔ کوئی تکلیف نہیں ہونے دے گی۔ ان شاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ خاموشی سے سنتی رہی۔

"رابطے میں رہنا، اپنا بہت خیال رکھنا۔" نم آنکھوں کے ساتھ اس نے سر ہلایا۔

"آپ اسلام آباد کب تک آئیں گی؟"

"صندل کی ڈلیوری تک یہیں ہوں، اس کے بعد ہی سلیم کے پاس جا سکوں گی۔ لیکن تو فکر نہ کر۔ جلد ملنے آؤں گی۔"

سب اسے چھوڑنے دروازے تک آئے۔ مسز شیرازی کو فارس پہلے ہی گاڑی میں بٹھا آیا تھا۔ اب اس کے انتظار میں وہیں کھڑا تھا۔ اقصیٰ عجلت میں قدم اٹھاتی اس سے پہلے ہی نکل گئی تھی۔ گلی کا راستہ بارش کی وجہ سے کافی خراب تھا۔

وہ باہر نکلی اور دیوار کے ساتھ اسے مکمل نظر انداز کیے گاڑیوں کی طرف بڑھ گئی۔

فارس نے قدم اٹھائے اور پھر رک کر مڑا۔ صابرہ بوا اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

"آپ نے جو کچھ کیا۔ اس کے لیے آپ کا بہت شکریہ۔ میری طرف سے جنت کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔"

"اللہ خوش رکھے تم دونوں کو۔" انہوں نے دل سے دعا دی۔ وہ جانے کے لیے مڑ گیا۔

جنت آہستگی سے قدم اٹھا رہی تھی۔ اندھیرے میں گاڑی کی روشنیاں بکھری تھیں۔ سفید گاڑی فارس کی تھی۔ اتنا تو جنت کو پتا تھا۔ دوسری گاڑی میں ڈرائیور تھا۔ عدیل احمد جو باہر کھڑا تھا۔ عقبی نشست پر مسز شیرازی براجمان تھیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دروازہ کھول کر جھٹ سے اقصیٰ بیٹھی۔ دروازہ بند کرتے، لاک لگا کر شیشہ نیچے کیا۔ جنت کے قریب پہنچنے تک سرگوشی میں کچھ نہ کچھ طے پا گیا تھا۔

"تم فارس کی گاڑی میں بیٹھ جاؤ جنت! ہماری گاڑی میں تو بہت کم جگہ ہے۔" مسز شیرازی نے کہا۔

''ہاں ہاں ہماری گاڑی میں تو بالکل بھی جگہ نہیں ہے۔'' اقصیٰ مزید پھیل گئی۔ ''ہم خود اتنی مشکل سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ کیوں مسٹر عدیل؟'' لگے ہاتھوں عدیل احمد سے بھی مشورہ لیا۔ اس بونگے کو تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اتنی بڑی گاڑی میں جنت کمال کی جگہ کیوں نہیں ہو سکتی تھی، لیکن جب اقصیٰ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی ایک ہزار اشارے دیے تو......

''جی میم۔ بالکل۔ جی ہاں۔ بالکل جگہ نہیں۔ آپ اس طرف آ جائیں۔'' ساتھ ہی ادب سے ہاتھ دراز کر کے فارس کی گاڑی کا راستہ دکھایا۔

کی لاک سے گاڑی کا لاک کھولتا فارس وجدان اس سچویشن سے قطعی لاعلم رک کر انہیں دیکھنے لگا کہ ہو کیا رہا ہے۔ جنت ابھی تک باہر کیوں کھڑی ہے؟

''آنٹی۔'' اس نے روہانسی ہو کر مسز شیرازی کو دیکھا۔

''جاؤ بیٹا۔'' انہوں نے پیار سے اصرار کیا۔ ''چند گھنٹوں کا تو سفر ہے۔''

فارس وہیں آ گیا۔ ''اینی پرابلم؟'' وہ عدیل احمد سے پوچھ رہا تھا۔ اقصیٰ کی باچھیں کھل گئیں۔ ''یہاں تو پرابلم ہی پرابلم تھے۔'' فارس نے اسے گھوری دی تو سٹپٹا کر سر جھکا گئی۔

اس سے پہلے کہ مسز شیرازی فارس سے کہتیں کہ وہ جنت کو اپنے ساتھ لے جائے، جنت خود ہی قدم اٹھاتی رینج روور کی طرف بڑھ گئی۔ دروازہ کھول کر پسینجر سیٹ پر بیٹھتے ہی دھڑام سے بند کیا۔ سینے پر بازو باندھے چہرے کا رخ خفگی سے شیشے کی طرف موڑ لیا۔ فارس کی کوئی بھی بات۔ اس نے کبھی نہیں مانی تھی۔ ابھی بھی یہ تاثر قائم کرنا تھا وہ مسز شیرازی کی وجہ سے گاڑی میں بیٹھی ہے۔ اس کے کہنے پر یا اس کی وجہ سے تو بالکل بھی نہیں۔

اور اس تمام صورت حال کو سمجھتے ہی فارس کے لبوں پر اداس سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

''تھینکس ممی۔'' مسز شیرازی کی طرف کا دروازہ کھول کر وہ اندر کو جھکا۔

''سب کچھ مجھے ہی کرنا پڑ رہا ہے۔ تم بھی کچھ کرو۔'' انہوں نے دبی آواز میں ذرا سا جھاڑ دیا۔ ''ایکسکیوز کرو اس سے، معافی مانگو، بات کرو۔ میں ہرگز نہیں چاہتی تم دونوں کی لڑائیوں کا اثر میرے گرینڈ چائلڈ پر پڑے!''

انداز میں محبت بھری خفگی تھی۔ اصرار تھا، تنبیہہ تھی اس نے کس قدر کوشش سے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں ایک بار پہلے اسے تمھاری زندگی میں لائی تھی فارس! اب تم خود لاؤ گے۔'' انہوں نے ہاتھ دبا کر کہا۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر بوسہ لیا، ایک بار پھر انہیں ممنون نگاہوں سے دیکھا۔ پھر دروازہ بند کر کے آگے بڑھ گیا۔

اقصیٰ جو اس تمام عرصے میں فارس کی دہشت سے کھڑکی کی طرف مؤدب ہو کر بت بنی بیٹھی تھی اس کے جاتے ہی سکھ بھری

سانس لی، جھٹ سے اپنا تھیلے نما کالج بیگ سے نمکو پیکٹ نکالا۔

عدیل احمد نے اس کی طرف کے شیشے پر دستک دی۔ اس نے کچھ چونک کر سر اٹھایا پھر شیشہ نیچے کیا۔

''آپ کے پاس آئینہ ہے؟؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''ہاں ہے......تو؟'' اترائی۔

''دیکھ لیجیے۔''

وہ کہہ کر سیٹ پر براجمان ہوا۔ اقصیٰ نے ذرا حیرت سے اسے دیکھا پھر بیگ کھنگال کر آئینہ نکالا۔ گاڑی میں زرکار مدھم روشنی تھی۔ پھر بھی موبائل نکال فلیش لائٹ آن کر کے اپنی شکل دیکھی۔

کاجل دونوں آنکھوں کے گرد اچھا خاصا پھیلا ہوا تھا۔ نیلا شیڈ بھنوؤں کے نیچے۔ اطراف میں۔ ہر طرف۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے باقاعدہ دو گھونسے آنکھوں پر جڑ دیے ہوں۔

ایک لمبی سی چیخ اس کے حلق سے نکلتے نکلتے دم توڑ گئی۔

کسی نے اسے بتایا کیوں نہیں؟ ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے۔ اس عرصے میں سب اس کی یہی شکل دیکھتے رہے تھے؟ شرم سے پانی پانی ہونے لگی۔

جھٹ سے ٹشو نکالا اور رونے پر قابو پاتے رگڑ رگڑ کر صاف کرنے لگی۔ میک اپ، کاجل، مسکارا اور لائنر لگا کر تو وہ بھول گئی تھی اور صابرہ خاتون کے گھر داخل ہوتے ہی چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھپاکے دے مارے تھے۔ تو بچے اس لیے مجھے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے؟ مارے خفت کے آنکھیں میچ لیں۔

سیٹ پر براجمان عدیل احمد بیک ویو مرر سے اس کے تاثرات ملاحظہ کرتا اپنی ہنسی کسی حد تک دبا چکا تھا۔

☆☆☆

دروازے لاک ہو چکے تھے۔ گاڑی اسٹارٹ تھی تقریباً۔ مگر ابھی حرکت میں نہیں آئی تھی۔ اندر باہر سناٹا سا چھایا تھا۔ ایک مکمل خاموشی دونوں کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔

وہ فکروں میں گھری شیشے کا رخ کیے بیٹھی تھی۔ ناخن انگلی تلے دبائے۔ شال کے اندر مٹھی سختی سے بند کیے۔

''کیا حال ہے؟'' برابر میں بیٹھے فارس وجدان نے خاموشی توڑی۔

''مجھ سے کوئی بات مت کرو۔''

''یہ سوال میں نے۔ کسی اور سے بھی پوچھا ہے۔''

جنت کا چہرہ سرخ پڑا۔ ''ہم سے کوئی بات مت کرو۔''

اور جس استحقاق سے اس نے ''ہم'' کہا، وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ اپنی قسمت، اپنا نصیب اسے آج سے پہلے کبھی اتنا اچھا نہیں لگا تھا۔

''لیکن میں کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

عدیل احمد کی گاڑی برابر سے گزر کر آگے ہوئی تو اس نے اسٹیرنگ وہیل پر گرفت جمائے ایک بار پھر رخ موڑ کر جنت کو دیکھا۔ سینے پر بازو باندھے وہ کھڑکی کی طرف رخ کیے بیٹھی تھی۔ چہرہ اوجھل تھا۔ خفا آنکھیں باہر کہیں تاریکیوں سے الجھ رہی تھیں۔

''تم نے مجھ سے پوچھا نہیں وہ سرپرائز کیا تھا جو میں کراچی سے واپسی پر تمہیں دینا چاہتا تھا؟'' وہ آہستگی سے گویا ہوا۔

''پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟ جب وہ سرپرائز خود چل کر میرے سامنے آ گئی تھی۔'' جل کر جواب دیتے ہوئے اب کے اس نے اپنا رخ فارس کی طرف موڑا۔ ''بائے دا وے مسٹر شیرازی! میں صرف آنٹی کی وجہ سے گھر جا رہی ہوں۔ تمہارے ساتھ جو میری ڈیل ہوئی تھی وہ ابھی بھی قائم ہے۔ میں نے تو آنٹی سے کہہ دیا ہے، بھلے سے تمہاری دوسری شادی ہو، تیسری شادی ہو، چوتھی شادی ہو۔ آئی ریئلی ڈونٹ کیئر!!! مجھے صرف اپنی طلاق سے غرض ہے!''

خاموشی سے اس کی پوری بات سن لینے کے بعد وہ تمام تر توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کر چکا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس کا پرسکون رویہ جنت کو اندر تک سلگا گیا۔

''اور گاڑی میں بھی اس لیے بیٹھی ہوں کیونکہ انہوں نے مجھ سے کہا۔ اس لیے نہیں کہ میں بیٹھنا چاہتی تھی۔ تمہارا تو مجھے پتا ہے۔ تم تو یہی سوچو گے۔ تمہاری ساری پلاننگز کا بیڑہ غرق جو ہو چکا ہے۔'' وہ شروع ہو چکی تھی۔

''کچھ لو گی؟'' فارس نے عقبی نشست کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ پیچھے کھانے کے پیک کیے لوازمات رکھے تھے جو مسز شیرازی گھر سے لائی تھیں۔ اپنی بات قطع ہو جانے پر اس نے سرد نظروں سے اسے دیکھا پھر غصے سے رخ موڑ گئی۔ ''ڈونٹ ٹاک ٹو می۔''

وہ دکھ سے مسکرایا۔ جانتا تھا بات کرنا چاہے گا تو وہ الجھ پڑے گی، یا کانوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگ جائے گی۔ اور وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ ان آنکھوں نے بہت رو لیا تھا۔ اب اور نہیں۔

ان کے مابین ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ جنت نشست کے ساتھ پشت ٹکائے ایزی ہو کر سامنے دیکھ رہی تھی۔ گاڑی مین روڈ پر سرعت پکڑے ہوئے تھی۔ آس پاس اندھیرے میں روشنیاں بکھیرتی گاڑیاں گزر رہی تھیں۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے وہ ہر تھوڑی دیر بعد اس کی طرف دیکھتے ہوئے جیسے تسلی کر لیتا تھا۔ حقیقت کو خواب ہونے میں دیر ہی

کتنی لگتی ہے؟ اس کا خوف، اس کا خدشہ، اس کی تمام تر اذیتیں اپنی جگہ قائم تھیں۔ شیشے کے ساتھ پیشانی ٹکائے۔ کسی گہری سوچ۔ کسی گہرے خیال میں گم جنت نے آنکھیں موند لی تھیں۔ زندگی نے ایک بار پھر راستوں کا تعین کر لیا تھا۔ منزل ابھی بھی دھندلی تھی۔ بے نام اور غیر واضح سی تھی۔ انجام ابھی بھی نہیں بدلا تھا۔ فرق حالات پر پڑا تھا۔ نفسیات پر بھی۔ اعصاب پر بھی۔

اس کے کندھے کسی بوجھ سے جھکے نہیں جا رہے تھے۔ دل سے جیسے کوئی ثقیل شے ہٹ گئی تھی۔ وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہی تھی۔ ماضی ہنوز جڑا ہوا تھا مگر ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اس کی تکلیف اسے اپنے حال کا احاطہ کرتی ہوئی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ یہ خوشی چند لمحوں کی ہی سہی۔ یہ سکون کچھ پل کا ہی سہی۔ لیکن ملا تو سہی۔ وہ مسز شیرازی کو ایک بار پھر سوچنے لگی تھی۔

غموں کے بادل پوری طرح سے نہیں چھٹے تھے مگر اسے آسمان ابھی سے۔ بہت اجلا۔ بہت نیلا نظر آنے لگا تھا۔ وہ کچھ ادھورے خوابوں کو آنکھوں میں سجائے آنے والے کل کو سوچ رہی تھی۔ ادھوری تصویر کا ایک حصہ مکمل ہونے والا تھا۔

پرسکون خاموشی میں اس کی آنکھیں آہستگی سے بند ہونے لگیں۔ سختی سے بند انگلیوں کی گرفت ڈھیلی پڑی۔ شال کا ایک سرا کندھے سے سرک کر پہلو میں آن گرا۔ باہر ہلکی ہلکی سی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔

فارس کے ساتھ واپسی کا ہر سفر ایسے ہی بادلوں سے اور بارشوں سے گھرا رہتا تھا۔ اور کسے علم تھا۔ واپسی کے اس سفر میں وہ دو نہیں تین ہوں گے؟ وہ نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔ اور فارس وجدان اپنی نگاہیں روڈ پر جمائے یکسوئی سے ڈرائیونگ کرتا رہا۔

☆☆☆

جانے کتنا وقت بیتا تھا لیکن اسے یقین تھا زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ ہی گزرا ہو گا یا اس سے بھی کم۔

بارش تھم چکی تھی۔ ونڈ اسکرین پر کہیں کہیں قطرے نظر آ رہے تھے۔ اس کی طبیعت مکدر ہو رہی تھی۔ متلی کا احساس شدید ہونے لگا۔ پہلے پہل تو آنکھیں موندے بیٹھی رہی کہ ٹھیک ہو جائے گی۔ مگر جب ابکائی کا احساس ہوا تو اس نے بے ساختہ فارس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''گاڑی روکو فارس!''

''کیا ہوا؟'' گاڑی کی رفتار یکایک سست پڑی اور اگلے ہی لمحے سڑک سے ذرا نیچے ہو کر رک گئی۔

وہ دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ اندھیرے میں سڑک کنارے گھاس اور اونچے لمبے درختوں کے سامنے وہ پنجوں کے بل جھک گئی تھی۔ پانی کی بوتل اٹھائے فارس اس کے پیچھے باہر آ گیا۔

کھانستے ہوئے قے کرتی وہ اذیت میں لگی۔ وہ کچھ فکر مندی سے پیچھے کھڑا رہا۔

وہ اٹھ کر سیدھی ہوئی تو اس نے پانی کی بوتل بڑھائی۔ اس نے بوتل لے کر منہ ہاتھ دھویا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

سانس بھاری تھا۔

ہمت کر کے قدم اٹھانے لگی تو فارس نے ہاتھ آگے کیا۔ جو کہ بغیر کسی تردد کے اس نے تھام لیا۔ شاید اسے ڈر تھا وہ گر نہ جائے۔ کپکپاتا ہوا سرد ہاتھ فارس کے ہاتھ میں دیے وہ پسنجر سیٹ پر بیٹھی۔

''آر یو آل رائٹ؟'' وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

بھاری سانسوں کے ساتھ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وجود پر ایک کپکپی سی طاری تھی۔

وہ اپنی سیٹ سنبھالے اب اس کی طرف پوری طرح سے متوجہ تھا۔ آنکھوں میں فکر تھی۔ موبائل ہولڈر میں ایستادہ اس کے موبائل کی اسکرین یکایک روشن ہوئی تھی۔ اے۔ آر کے نام سے کال آرہی تھی۔ چند ایک میسجز کا نوٹیفیکیشن بھی۔ فارس نے کال ڈسکنیکٹ کر دی۔ پیچھے کہیں دور۔ اور بہت دور کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس تاریک ہوگئی تھیں۔

اب کی بار اس نے اجازت نہیں چاہی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر عقبی نشست سے ڈنر باکس کھولا۔

''پلاؤ، قیمہ مٹر، فرائیڈ چکن۔ میٹھے میں کھیر ہے، فروٹ ٹرائفل بھی۔'' اس نے کھانے گنوائے کہ شاید اب وہ کچھ کھالے۔

''تم گھر سے اتنا کچھ لائے ہو۔'' ذرا حیران ہو کر اس کی طرف مڑی۔ نیند سے بھری ہوئی بے آرام آنکھیں۔ بے تحاشہ رونے کی وجہ سے سوجی ہوئی لگ رہی تھیں۔

''ممی لائی ہیں۔''

''ہاں وہی لا سکتی ہیں۔ تم سے مجھے ایسی کوئی امید بھی نہیں۔''

فارس اسے دیکھ کر رہ گیا۔

وہ جو کچھ دیر پہلے تک اس کے آفر کرنے پر بھی انکار میں سر ہلائے ناراضی کی دیوار قائم کیے بیٹھی تھی تو اب خود اٹھ کر پیچھے چلی گئی تھی۔

دروازہ بند ہوا تو فارس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔

گاڑی کی زر کار ڈوم لائٹس آن کیے اب وہ باکس وغیرہ دیکھ رہی تھی۔ بوا کے گھر سے آتے وقت ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھا سکی تھی۔

اپنے لیے پلیٹ میں پلاؤ نکالا۔ ساتھ ہی چکن کا لیگ پیس رکھا۔ گاڑی اشتہا انگیز کھانوں کی خوشبو سے بھر گئی۔

''لاؤ یہ میں کھول دیتا ہوں۔'' رائتے کا ننھا سا باکس اس سے نہیں کھل رہا تھا۔

''کھول لوں گی میں خود ہی۔'' اس نے کہا مگر یاد آیا اگر ایک خراش برداشت نہ کرنے والے کی گاڑی کے اندر رائتے کا کوئی

ایک قطرہ بھی گرا تو وہ کتنا ہنگامہ کرے گا؟ کیونکہ جس طرح سے وہ کھولنا چاہ رہی تھی۔ تو یہی ہونا تھا۔

تمیز سے باکس اسے دیا۔ جسے کھول کر اس نے واپس کر دیا۔

''ایک پلیٹ میرے لیے بھی۔'' پلاؤ کا تیسرا چمچ منہ تک لے جاتے اس نے رک کر فارس کو دیکھا۔ ناگواری سے بھنویں سکیڑ کر اپنی پلیٹ ایک طرف رکھی۔

دوسری پلیٹ میں پلاؤ نکالا۔ ساتھ ہی لیگ پیس، رائتہ، سلاد وغیرہ ڈال کر فارغ ہوئی تو پتا چلا وہ کب کا اس کی پلیٹ اٹھائے کھانا شروع بھی کر چکا تھا۔

''تم......'' لب بھینچ کر اسے کچھ سخت سست کہنا چاہا مگر رک گئی۔ سمجھتا کیا تھا یہ خود کو؟

''پانی چاہیے؟'' فارس نے اپنی بوتل سے آدھا پانی پی کر بقیہ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ اسے گھورتی ہوئی اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔ ''تمھارا بچا ہوا نہیں چاہیے!''

''او کے۔ ویسے بھی یہ آخری ہے۔'' اس نے بوتل دوبارہ لبوں سے لگانا چاہی۔

''ادھر دو مجھے۔'' غصے سے جھڑک کر بوتل کھینچی۔ مرچیں بھی تو لگ رہی تھیں۔ شاید رائتے میں زیادہ تھیں۔

مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے وہ رخ بدل گیا۔

عقبی نشست پر آلتی پالتی مارے اب وہ کھانا کھا رہی تھی۔ بہت آرام اور تسلی سے۔ چہرہ کرب سے عاری۔ آنکھیں درد سے خالی۔ لاپرواہ سا انداز۔ جیسے گاڑی میں اس کے ساتھ اور کوئی تھا ہی نہیں۔ اپنے آپ میں مگن۔۔ اپنے رزق سے انصاف کرتی۔۔ بیک ویو مرر اس پر ایڈجسٹ کیے وہ اس پر نگاہیں جمائے بیٹھا رہ گیا تھا۔

پندرہ سال پہلے اپنی ساری خفگیاں ناراضگیاں بھلائے وہ اسے بہت خوش اخلاقی سے ویلکم کیا کرتی تھی۔ کیا وہ آج بھی ایسا کر پائے گی؟؟

نہیں!! تبسم مٹ گیا۔

شاید نہیں! حزن ٹھہر گیا۔

اور درد بڑھ گیا۔

☆☆☆

اوصاف منزل میں کام کرتے یہ اس کا دوسرا مہینہ تھا۔ اور اس مختصر عرصے میں اس گھر کا نقشہ کس حد تک بدل چکا تھا۔ مزدور مستری آج بھی کام پر لگے ہوئے تھے۔ نچلی منزل پر سامنے والے دو کمروں کو روغن کیا جا رہا تھا۔ اوپر والا پورشن نیا تعمیر ہوا تھا۔ اب

دروازوں اور کھڑکیوں کا کام باقی رہ گیا تھا۔ پلاٹ کی قسطیں ادا ہو چکی تھیں۔ اسٹور کھل گیا تھا، گاڑی خرید لی گئی تھی۔ فرنیچر نیا ہو چکا تھا، صوفے بدل چکے تھے۔ ہر کمرے میں مہنگے نفیس ٹائلز بھی لگوائے جا رہے تھے۔ مہینے کے آخر تک طارق صاحب کی بڑی بیٹی کی شادی تھی۔

وہ اس گھر کی ملازمہ تھی تو جہیز کی تیاری خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ ثمرین نے اپنے لیے مہنگا ترین فرنیچر پسند کیا تھا۔

روز شاپنگ کے لیے بازاروں کے چکر لگتے تھے۔ مہنگے مہنگے برانڈڈ کپڑے، جیولری، میک اپ وغیرہ خریدے جاتے تھے۔

برآمدے سے آگے شیشے لگی دیواروں کے آس پاس نفیس صوفوں پر بیٹھ کر، کپڑے پھیلا پھیلا کر جائزہ لیا جاتا تھا، پسند ناپسند کو جانچا جاتا۔

آئے روز مہمانوں کی آمدورفت۔ اور وہ سارا سارا دن کچن میں کھانا پکانے اور صفائی میں ہلکان ہوئی رہتی۔ مجال ہے جو گھر کا کوئی ایک فرد بھی اسے سانس بحال کرنے دیتا ہو۔ ذرا دیر کو جو کہیں آرام کی غرض سے بیٹھتی تو ڈانٹ پھٹکار شروع ہو جاتی۔ وہ اس کی ماں کو اس کے کام کی اچھی خاصی تنخواہ دے رہے تھے۔ دو مہینے تو اس نے جیسے تیسے گزار لیے تھے مگر اس کی اماں چاہتی تھیں وہ سال ڈیڑھ سال تک یہیں رہے تاکہ باپ کا اچھے سے علاج بھی ہو جائے اور جو قرض انہوں نے لے رکھا ہے وہ بھی اتر جائے۔ ان کی دوست کے توسط سے یہ کام اسے ملا تھا مگر گھر کے مکین اسے انسان کم۔ کام والی مشین زیادہ سمجھتے تھے۔ اوپر سے سال بھر کے بچے کی ذمہ داری بھی اسے سونپ رکھی تھی۔ جو گھر سے منسلک الگ تھلگ اسٹور روم نما کمرے میں اس کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔

اور ہمیشہ کی طرح کچن میں۔ انتہا کی گرمی برداشت کرتے۔ گھر آئے مہمانوں کے لیے مینگو شیک بناتے وہ بھول چکی تھی بجلی پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے غائب ہے اور بچہ کمرے میں اکیلا ہے۔

گھر کے مکینوں کے پاس تو انتظام تھا مگر اس کا اسٹور نما کمرہ اس آسائش سے مکمل محروم تھا۔

وہ عجلت میں ٹرے اٹھائے ڈرائنگ روم میں گئی۔ سب کو جوس سرو کیا۔ اور اس سے قبل کہ پھر سے کوئی حکم نامہ جاری ہوتا وہ عجلت میں قدم اٹھاتی کچن کے عقبی دروازے سے اپنے اسٹور روم نما کمرے میں آ گئی۔

پسینے سے شرابور، گرمی سے نڈھال بچہ رو رو کر ہلکان ہو چکا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ہاتھ اٹھائے اس کی طرف لپکنے لگا۔ روبی کے دل کو کچھ ہوا۔ اسے بازوؤں میں بھرے کچن میں لے آئی۔

''معاف کر دو یار!! میں تو بھول ہی گئی۔'' گلاس میں ٹھنڈا پانی ڈال کر اس کے لبوں سے لگایا تو وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھ ٹھنڈے گلاس پر جمائے یوں پانی پینے لگا جیسے صدیوں کا پیاسا ہو۔

بال ماتھے سے چپکے ہوئے تھے۔ چہرہ، ناک آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں۔

وہ اتنا پیارا تھا کہ دل چاہتا دیکھتے جاؤ۔ مگر اس پیارے سے بچے کی قسمت کتنی خراب تھی۔ باپ مر چکا تھا۔ ماں اسے بھائیوں کے در پر چھوڑ کر گئی تو پھر پلٹ کر خبر نہ لی تھی۔

رشیداں سے اس نے سنا تھا۔ وہ صرف اپنی ماں کی فوتگی پر آئی تھی اور اس کے بعد اس نے بھولے سے بھی اس گھر کا رخ نہیں کیا تھا۔

''یہ اتنی وڈی گاڑی میں بیٹھ کے آئی تھی۔ تدفین کے بس کچھ دیر بعد ہی نکل گئی۔''

وہ کاؤنٹر ٹیبل کے پاس اسے لیے کھڑی تھی۔

ثمرین اپنے کمرے کی صفائی کا حکم دینے آئی تو بچے کو اس کے ہمراہ کچن میں دیکھ کر سیخ پا ہو گئی۔

''کتنی بار کہا ہے اسے گھر میں مت لایا کرو۔''

''بی بی جی! بجلی کب کی گئی ہوئی ہے تو کمرے میں بڑی گرمی ہے۔''

وہ ناگواری سے ایک نظر بچے کو دیکھتی اسے اپنے کمرے کی صفائی کا آرڈر دے کے چلی گئی۔ وہ اسے بازوؤں میں اٹھائے ثمرین کے کمرے میں آ گئی بچے کو ایک جگہ پر بٹھایا۔ ''اب یہاں سے مت ہلیو۔ میرے کو کام کرنے دو۔'' بچے نے اسے معصوم آنکھوں سے دیکھا۔ اور اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ ٹوٹی ہوئی کھلونا کار جو اس کی گود میں رکھی تھی۔ اسے جھنجھوڑتا۔ ہلاتا۔ وہ ہمیشہ کی طرح بہت خاموش اور بہت پرسکون تھا۔

اوصاف منزل میں جب وہ نئی نئی آئی تھی اور اس کے لیے مکمل انجان تھی تو تب بھی جب اس نے اٹھایا تھا تو وہ بہت آرام سے اپنے بازو خود سے اٹھائے اس کی گود میں آ گیا تھا۔ وہ رات کو سوتے میں بھی بالکل تنگ نہیں کرتا تھا۔ اکثر رات میں آنکھ کھلتی تو وہ برابر میں لیٹا ہوتا۔ آنکھیں کھلی ہوتیں۔ اور اس کے دوپٹے کا سرا منہ میں۔

''بڑا امیر چاچا ہے بچے کا۔ مہینے کے مہینے پیسے بھیجتا ہے۔'' رشیداں نے یہ بھی بتایا تھا۔ ''لاکھ تو دیتا ہوگا وہ تیرے طارق صاحب کو۔''

وہ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ سگا چاچا بچے کو اپنے پاس بھی تو رکھ سکتا تھا۔

''یہاں آتا ہے کیا وہ؟''

''ارے نہیں۔ کبھی نہیں آیا۔ تجھ سے پہلے جو سلیمہ مائی تھی۔ اس نے بتایا تھا۔ بینک میں پیسے بھیجتا ہے۔ ڈھیر سارے ہوتے ہیں۔ تو نے دیکھا نہیں کیسے امیر ہو گئے یہ سب۔ پلاٹ بھی لیا ہے۔ کہہ رہے ہیں ثمرین کی شادی وڈے شادی ہال میں کریں گے۔''

بیڈشیٹ بدلتے، کتابیں سمیٹ کر ریک میں رکھتے اور پھر کپڑے سے فرنیچر، ڈریسنگ ٹیبل اور آئینہ رگڑ کر صاف کرتے وہ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے تسلی کر لیتی تھی۔

سرمئی نیکر اور ملگجی رنگ کی پرانی شرٹ میں وہ بچہ وہیں بیٹھا تھا جہاں وہ اسے بٹھا کر آئی تھی۔

کبھی اسے لگتا وہ اس کی بولی سمجھتا ہے۔ اس کا کہا مانتا ہے۔ بھلا اتنے چھوٹے سے بچے میں اتنی سمجھ کیسے ہو سکتی تھی کہ وہ کسی عام سی روبی کی بات مانے؟ جس کی سگی ماں اسے یہاں کام پہ لگائے گھر کے خرچے پورے کر رہی تھی؟

وہ سونے سے پہلے پتا نہیں کتنی باتیں اس سے کرتی جاتی۔ گال چھو کر ٹھوڑی ہلا کر ہنساتی تو وہ ہنس پڑتا۔ نیچے کے دو کھانے کے ننھے موتی جیسے دانت نمایاں ہوتے۔ وہ اسے سارا سارا دن اسی کمرے میں چھوڑ کر گھر بھر کے کام نمٹاتی رہتی اور بھاگ بھاگ اسے بھی دیکھنے آ جاتی۔

کبھی وہ رو رو کر نڈھال ہو چکا ہوتا اور کبھی اس کی دی گئی اشیا سے کھیلتا مکمل پُرسکون۔

چیزوں کو پکڑ کر اٹھ جاتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے قدم بھی اٹھا لیتا۔ کمرے میں نقصان دہ کوئی شے نہ تھی۔ صرف ایک چارپائی اور بند سنگل الماری۔ بوسیدہ سا قالین۔ اور بس......اس لیے اسے مکمل اطمینان رہتا کہ وہ ٹھیک ہو گا۔

پنکھا چلائے وہ صفائی میں مگن تھی۔

بڑی بی بی نے کمرے میں اسے اور بچے کو دیکھا تو سیخ پا ہو گئیں۔ اچھی خاصی جھاڑ پلانے کے بعد ایک عدد تھپڑ بھی جڑ دیا۔ آخر اس کی جرات کیسے ہوئی تھی کہ اس نے ثمرین کے کمرے کا پنکھا چلا دیا تھا اور بچے کو بھی لے آئی تھی۔ وہ بچہ جس کے پیسوں سے پورا گھر چل رہا تھا۔

گال رہ رہ کر دہکتا رہا۔ بجلی آئی تو اسے ایک بار پھر کمرے میں تنہا چھوڑ آئی۔

وہ کھیلتے کھیلتے کارپٹ پر بھوکا سو گیا۔ شام میں فیڈر بنا کر آئی، جگا کر منہ سے لگایا تو سکون سے دودھ پیتے وہ اس کے پرانے سے پھٹے ہوئے دوپٹے کا کونا اپنی ننھی منی انگلیوں میں ل دبانے لگا اور وہ رونے لگی۔

"پتا نہیں تیرا چاچا کیسا انسان ہے۔ اس جہنم میں جھونک کے پیسے بھیجے جا رہا ہے۔"

باہر کا حبس شدید تھا۔ بجلی پھر سے غائب تھی۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے تمام کھڑکیاں کھولے وہ اپنی چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔

بچہ خالی فیڈر منہ سے لگائے آنکھیں بند کر چکا تھا۔ اور وہ کھڑکی کی جیل جیسی سلاخوں سے باہر دیکھ رہی تھی۔

ہو سکتا ہے بچے کے چاچا کو گھر کے مکینوں کے رویے کی بالکل بھی خبر نہ ہو؟ ہو سکتا ہے اسے لگتا ہو وہ پیسے بھیج رہا ہے تو اس کے سگے ماموں اس کا بہت خیال رکھتے ہوں گے؟

ننھے ہاتھ کی انگلیوں میں اپنی انگشت شہادت دیے وہ اس کی بند آنکھوں کو دیکھتے کچھ سوچ رہی تھی۔ اور اپنی اس سوچ پر عمل کرنے کا حتمی فیصلہ بھی کر چکی تھی۔

☆☆

موبائل پر فارس کا میسج موصول ہوا تھا۔ جنت اپنی بوا کے پاس تھی۔ وہ اسے واپس لا رہا تھا۔

میسج پڑھتے ہی سائرہ جائے نماز پر تسبیح لیے بے ساختہ سجدے میں گر گئی تھیں۔ یہ سجدہ۔ سجدہ شکر تھا۔ پلٹنے کے لیے۔ سمٹنے کے لیے۔ اور بدلنے کے لیے تھا۔ وہ اپنا احتساب کر رہی تھیں۔ ایک یتیم بچی کے لیے ان سے بھول ہوئی تھی۔

انہیں وہ وقت اچھی طرح سے یاد تھا جب بیماری کے دنوں میں ان کے والد نے انہیں فون کر کے اپنے گھر بلایا تھا۔ اپنے پاس بٹھا کر انہوں نے جنت کمال کے متعلق وصیت کرتے ہوئے اپنے کوئٹہ والے مکان کے کاغذات کے ساتھ ساتھ ایک بند لفافہ ان کے ہاتھوں میں پکڑا دیا تھا۔

"اگر کبھی خاندان میں جنت کی زندگی تنگ ہو جائے تو اسے کھول لینا۔"

وہ لفافہ اگلے پانچ سالوں تک ان کی الماری میں محفوظ اور بند پڑا رہا تھا۔

اس لفافے کو کھولنے کا خیال انہیں پورے پانچ سال بعد اس وقت آیا تھا جب برہان اسے طلاق دے چکا تھا، اور نفیسہ وفات پا چکی تھیں۔ سگے چچا نے جنت پر تسلط جما لیا تھا، وہ اس کا رشتہ زمان صفدر کے ساتھ طے کر رہے تھے۔ وہ جنت کے ہر معاملے میں خود کو قطعی بے بس تصور کرتی تھیں۔ سو انہیں ایک یہی حل نظر آیا تھا۔

بند لفافے میں ایک کاغذ تھا جس پر جمیلہ داؤد شیرازی کا نام اور شیرازی مینشن کا ایڈریس لکھا تھا۔ نیچے کہیں شیرازی انٹرپرائزز کا فون نمبر بھی تھا۔

سنہری حروف کا ایک قیمتی بزنس کارڈ، جو یقیناً قریبی ساتھیوں کو عطا کیا جاتا ہے۔ اور چند دعوت نامے۔ ان میں ایک دعوت نامہ کسی حماد شیرازی کی سالگرہ کا تھا۔

اگلے کئی لمحوں تک وہ انہیں ہاتھ میں لیے بیٹھی رہ گئی تھیں۔ شیرازی خاندان کے ساتھ ڈاکٹر مصطفیٰ کے تعلقات کتنے دیرینہ اور گہرے رہے تھے، اس کا اندازہ ان کارڈز سے بخوبی ہو رہا تھا۔ چونکہ شیرازی خاندان ایک نامور خاندان تھا سو اس ایک لمحے میں، کئی خبریں، کئی قصے اور کئی باتیں ان کے ذہن میں گھوم گئی تھیں۔

لفافے میں ایک چھوٹا سا کاغذ تھا جس میں جمیلہ داؤد کے نام ایک تحریر لکھی تھی۔

"میری نواسی جنت کمال اب آپ کی امانت ہے۔"

مختصر سی عبارت۔ مزید کوئی حوالہ۔ کسی طرح کا کوئی اشارہ نہ تھا۔

پہلے پہل تو وہ کچھ سمجھ ہی نہ پائیں مگر پھر شام تک انہوں نے اپنے بیٹے کی مدد سے جمیلہ داؤد سے متعلق معلومات حاصل کر لیں۔

جمیلہ داؤد آج کل اسلام آباد میں اپنے بیٹے کے ساتھ رہائش پذیر تھیں۔ ایڈریس ملتے ہی اگلے دن وہ ملاقات کے لیے اسلام آباد ان سے ملنے چلی گئی تھیں۔

وجدان ہاؤس کے گیٹ پر سخت سکیورٹی تھی۔ بغیر کسی تعارف یا جان پہچان کے انہیں اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں مل سکتی تھی۔

''آپ مسز شیرازی سے کہہ دیں، ڈاکٹر مصطفیٰ کی بیٹی ان سے ملنے آئی ہے۔''

انہوں نے وہ لفافہ بھی اندر بھجوا دیا جس میں کچھ کارڈز اور وہ خط تھا۔ کچھ ہی دیر بعد گیٹ کھول دیا گیا۔ ایک باوردی ملازم انہیں اندر لے گیا۔

شان دار گھر کے اندرونی احاطے سے ہوتے ہوئے لاؤنج سے وہ پرتعیش ڈرائنگ روم میں آ گئی تھیں۔

سامنے ہی ایک سوبر سی خوب صورت خاتون وہیل چیئر پر آتشدان کے سامنے بیٹھی تھیں۔ کارڈ ہاتھ میں لیے۔ کچھ حیرت۔ کچھ تڑپ اور کچھ صدمے سے انہیں دیکھتے ہوئے۔

''ڈاکٹر مصطفیٰ۔''

انہیں یوں لگا جیسا یہ نام ان خاتون کے اندر ایک زندگی سی دوڑا گیا ہو۔

رسمی تعارف کے بعد انہوں نے جنت کمال کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ بچی جسے ڈاکٹر مصطفیٰ نے پالا تھا، وہ طلاق اور ماں کی وفات کے بعد سخت ترین حالات سے گزر رہی تھی۔ ان کے لہجے اور انداز سے بے بسی جھلکتی تھی۔ جیسے وہ جنت کے لیے کچھ بھی کرنے کی صلاحیت نہ رکھتی ہوں۔ وہ ان کے پاس صرف اس لیے آئی تھیں کیونکہ خط میں ان کا نام لکھا تھا۔

جمیلہ داؤد شیرازی نے پوری بات بہت خاموشی اور توجہ سے سنی تھی۔ کچھ دیر تک وہ خاموش رہی تھیں، پھر جیسے انہوں نے بغیر کسی تردد کے جنت کمال کا رشتہ مانگ لیا۔

سائرہ اپنی جگہ بالکل خاموش اور ساکت بیٹھی رہ گئیں۔ وہ اس لیے یہاں نہیں آئی تھیں۔ یہ سوچ کر تو ہرگز نہیں آئی تھیں۔ اور جس نوجوان کے لیے وہ خاتون رشتہ مانگ رہی تھیں وہ نوجوان تو۔ ان کا دماغ ماؤف ہوا۔ کتنی ہی دیر تک وہ کچھ کہہ نہ سکیں۔

ایک طرف زمان تھا تو دوسری طرف۔ انہوں نے سر اٹھا کر جمیلہ داؤد کو دیکھا۔ جمیلہ داؤد کوئی معمولی خاتون نہ تھیں۔ نہ ہی

شیرازی خاندان کوئی عام سا خاندان تھا۔ اور جس کے لیے وہ رشتہ مانگ رہی تھیں وہ نامور بزنس ٹائیکون اعظم شیرازی کا پوتا فارس وجدان تھا۔

کتنی ہی دیر تک وہ سوچ میں غرق گم صم بیٹھی رہیں۔

بہت سی باتیں تھیں۔ سوالات تھے۔ خدشے تھے۔ مگر چونکہ یہ راستہ۔ یہ گھر انہیں ان کے والد نے دکھایا تھا سو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس رشتے پر غور کرنے لگی تھیں۔

فارس وجدان کا پروپوزل قبول کرتے وقت انہیں لگا تھا، وہ ٹھیک کر رہی ہیں۔ ان کی نیت میں کوئی کھوٹ نہیں۔ ارادوں میں کوئی جھول نہیں۔ فیصلوں میں کوئی مطلب۔ کوئی غرض نہیں۔ لیکن فرق تھا۔ ہر چیز میں فرق تھا۔ ایسا رشتہ سدرہ کے لیے آتا تو یقیناً وہ انکار کر دیتیں۔ جس انسان کی ذات شبہات کے دائرے میں گھوم رہی ہو، اس کا انتخاب وہ اپنی بیٹی کے لیے ہرگز نہ کرتیں۔ تاہم زمان کے مقابلے میں انہیں وہ مناسب لگا تھا۔ انہوں نے ہر خیال پس پشت ڈال دیا تھا۔ ہر منفی سوچ کی تردید کر دی تھی۔

انہوں نے ''رسک'' لے لیا تھا۔ وہ اسے اپنی اولاد کہتی تھیں، اور بھول گئی تھیں، اولاد کے معاملے میں ''رسک'' نہیں لیے جاتے۔

انہوں نے جمیلہ داؤد کو جنت کے بارے میں زیادہ آگاہ نہیں کیا تھا، وہ اس کا ماضی، اس کی طلاق کی وجہ تک چھپا گئی تھیں۔

سب ہی معاملات طے کر کے وہ لاہور واپس آ گئیں۔ دو دن بعد نکاح اور رخصتی سرانجام پا گئی اور جنت کمال اس گھٹن زدہ ماحول اور اپنے سگے رشتوں کے تسلط سے آزاد ہو کر اسلام آباد چلی گئی۔

بظاہر سب ٹھیک تھا مگر عجلت میں کیے گئے اس رشتے کو لے کر وہ کبھی کبھار فکرمند ضرور ہو جاتی تھیں۔

عمار کے سوالات، اس کا غصہ، فارس وجدان شیرازی سے متعلق ملنے والی افواہیں۔ قصے۔ قضیے۔ وسوسے۔

مگر وہ جیسے تیسے خود کو مطمئن کر لیتیں۔ اپنے ضمیر کے سامنے ڈٹ جاتیں۔ اپنے نفس کا ہاتھ تھام لیتیں۔ اور یقیناً تھامے ہی رکھتیں اگر جنت کے گھر چھوڑ دینے کی خبر نہ ملتی۔

اس ایک لمحے میں انہیں احساس ہوا تھا کہ آگ سے بچانے کے لیے انہوں نے اسے گہرے سمندر میں دھکیل دیا ہے۔

آگاہی کا وہ لمحہ ان پر اپنی ذات کے حوالے سے بہت سی حقیقتیں آشکار کر گیا تھا۔

ان کے والد نے ایک راستہ دکھایا تھا، وہ آخری راستہ تھا۔ آخری آپشن، آخری چانس، آخری راہ، جب خاندان میں کچھ نہ رہے، کہیں نہ رہے۔ کوئی جگہ، کوئی مقام، کوئی آسانی، کوئی رشتہ، کوئی احساس نہ رہے۔

اور وہ خود کو ہر کسی سے جدا اور الگ سمجھتی رہیں۔ مخلص اور حساس گردانتی رہیں مگر اب ان پر ادراک ہوا تھا کہ وہ بھی اسی

خاندان کا حصہ تھیں جس نے جنت کمال کے ساتھ زیادتیاں کی تھیں۔انہوں نے بھی اپنا فائدہ، اپنی مصلحت، اپنی آسانی دیکھی تھی۔انہوں نے بھی جنت کمال سے چھٹکارا پانا چاہا تھا۔

وہ لفافہ۔وہ خط۔وہ کبھی کھلنا نہیں چاہیے تھا۔وہ آخری آپشن صرف ایک آپشن ہی رہنا چاہیے تھا۔وہ کتنی نادان تھیں۔اپنے والد کی محبت، ان کی وصیت، ان کا احسان، ان کی خواہش، ان کا امتحان سمجھ ہی نہ پائیں۔

انہوں نے خود کو جنت کے معاملے میں ''بے بس'' سمجھا تھا۔مگر وہ بے بس نہیں تھیں۔خاندان بھر کی ناراضی تو انہوں نے ویسے بھی مول لے لی تھی۔پھر اس کا انتخاب وہ اپنے کسی بیٹے کے لیے کیوں نہیں کر سکی تھیں؟ اگر وہ واقعی میں رحم دل اور حساس تھیں تو جنت کمال کی جگہ ان کے اپنے گھر میں، ان کی اپنی اولاد کی زندگی میں کیوں نہیں بن پائی تھی؟ وہ اپنے کسی بھی بیٹے سے اس کا نکاح کروا سکتی تھیں۔عمار تو خود کہہ رہا تھا۔

مگر جنت کمال۔ایک طلاق یافتہ، بانجھ لڑکی انہیں اپنی اولاد کے لیے کیونکر قبول ہو سکتی تھی؟

یہ ایک تلخ سچائی تھی۔سانپ جیسی۔وجود کو گرفت میں لے کر۔ایک تلخ، ایک بے رحم سچائی۔

پورے ستائیس دن انہوں نے جنت کی خیریت مانگتے، اس کی واپسی کی دعا کرتے گزار دیے تھے۔اور اب جب وہ مل گئی تھی تو وہ اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھیں۔

شاید یہ ضمیر ہی تھا جو ذات کے آئینوں کو شفاف کرتا جا رہا تھا، نیت پر پڑی ہوئی خود غرضی کی دھول مٹی کو بے دردی سے اڑاتا جا رہا تھا۔

جنت کمال ان کے والد کی امانت تھی۔اور انہیں لگا، وہ اس امانت کا پاس نہیں رکھ پائی ہیں۔وصیت پر عمل نہیں ہوا ہے۔اور یہ درد۔یہ کسک۔یہ احساس ندامت تاعمر ان کے ساتھ رہنے والا تھا۔

☆☆☆

کھڑکیوں پر دبیز مخملیں پردے گرے ہوئے تھے۔کمرے میں اے سی کی ٹھنڈک تھی۔ملگجی سی روشنی کا مدھم سا تاثر کمرے کی ہر ایک شے کو نمایاں کر رہا تھا۔تکیے پر نظریں جمائے چند لمحوں تک وہ پلکیں جھپکاتی رہی پھر کہنیوں کے بل اٹھ بیٹھی۔ریشمی، ملائم شہد رنگ بال پونی سے نکل کر چہرے کے اطراف میں اور کندھے پر ڈھیلے ہونے لگے۔تکیے کے سہارے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگاتے اس نے بازو پھیلا کر انگڑائی لی۔

سفر کی تھکان اتر چکی تھی۔نیند مکمل۔ذہن کچھ حد تک پرسکون تھا۔اور تب تک پرسکون ہی رہا تھا جب تک اسے برابر میں کسی کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا تھا۔بالوں کو سمیٹ کر جوڑے کی شکل دیتی وہ اپنی جگہ سن ہوئی۔

صبح کے تین بجے جب وہ گھر پہنچے تھے تو وہ ضد پر اڑ گئی تھی کہ اسے الگ کمرہ ہی چاہیے۔اور فارس نے یہ کہہ کر بیڈروم چھوڑ دیا تھا کہ وہ کہیں اور سو جائے گا۔اسے نہیں پتا تھا ''کہیں اور'' اصل میں وہی بیڈروم ہے جو اس کے حوالے کیا جا رہا ہے۔

وہ تو اس بات پر بھی حیران ہوئی تھی کہ فارس نے اتنی آسانی سے اپنا کمرہ اسے کیوں دے دیا ہے۔عقدہ تو اب کھلا تھا۔اسے زچ کرنے سے وہ کیسے باز آ سکتا ہے؟ گھر اس کا۔کمرہ اس کا۔دروازے اس کے۔کھڑکیاں اس کی۔

جنت کی آنکھوں میں ناگواری اور چہرے پر سختی در آئی۔چند لمحوں تک بازو کی درز سے جھانکتی اس کی بند آنکھوں کو دیکھتی رہی۔پھر سر اٹھا کر مدھم سی روشنی میں اطراف کا جائزہ لیا۔

کمرے کی سیٹنگ ویسی ہی تھی جیسی وہ چھوڑ کر گئی تھی۔صرف بیڈ نما صوفہ غائب تھا جو سامنے دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔اس کی جگہ دو سنگل شاہی صوفے اور ایک کافی ٹیبل رکھی تھی۔

ڈریسنگ ٹیبل پر اس کی چین، کیچر، ہیئر پنز رکھے تھے۔وہ حیران ہوئی۔پرفیوم، برش اور فیس پاؤڈر بھی۔سفری بیگ ہنوز وارڈروب کے ساتھ موجود تھا۔

کسی خیال کے تحت وہ بیڈ سے اتر کر وارڈروب کی جانب بڑھ گئی۔سلائڈ کر کے پٹ کھولے، دونوں ہاتھ اٹھا کر باکس گرفت میں لیا، پھر احتیاط سے دیوار گیر کھڑکی کے پاس پنجوں کے بل بیٹھ گئی۔پردہ ہلکا سا سرکا کر اس نے باکس کھول دیا تھا۔تیز روشنی کی لکیر نیم تاریکی کو چیرتی ہوئی بیڈ تک پہنچ گئی۔سویا ہوا وجود ذرا سا کسمسایا۔کہ روشنی سیدھا بند آنکھوں پر پڑ رہی تھی۔

وہ کچھ بے قراری سے اپنی چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

خط، ڈائریز، تلوار، گھڑی، چاندی کی زنجیر، ننھا سا لاکٹ۔کارڈز، اسٹیکرز، تصاویر، صد شکر کہ اس کی ہر ایک شے سلیقے اور حفاظت سے موجود تھی۔

اس نے اپنے نانا کی تصویریں باہر نکالیں۔نم آنکھوں سے انہیں دیکھا۔انہیں چھوا۔پھر سینے سے لگایا۔کچھ دیر تک وہ اسی پوزیشن میں بیٹھی رہی۔پھر تسلی کر کے باکس الماری میں رکھنے کے بعد مڑی اور اپنی جگہ رک گئی۔

بیڈ پر پشت کے بل آڑا ترچھا لیٹا فارس ذرا سا سر اٹھائے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔آنکھیں ابھی بھی نیند سے بوجھل اور دوبارہ بند ہونے کو مکمل بے قرار تھیں۔وہ جنت کا چہرہ دیکھ چکا تھا، وہ شدید غصے میں لگ رہی تھی۔

''میں نے تم سے کہا تھا، مجھے روم شیئر نہیں کرنا۔''

''گیسٹ روم کا اے سی ٹھیک سے کولنگ نہیں کر رہا تھا۔'' پانچ چھ گھنٹوں تک مسلسل گاڑی ڈرائیو کرنے والے کی آواز تا حال تھکاوٹ سے چور اور خمار بھری تھی۔

''اور تم چاہتے ہو، میں اس بات پر یقین کرلوں؟'' وہ اس کی اسٹیٹمنٹ پر اچھی خاصی تپ گئی۔

''نہیں۔'' فارس نے اپنا سر واپس تکیے میں گاڑ لیا۔

نہیں؟ جنت کا منہ کھلا۔ پھر آنکھیں پھیلیں۔ پھر تپ چڑھی، تن فن کرتی پاس آئی۔ سختی سے تکیہ ہٹایا۔ لحاف کھینچا۔ پھر اس کا بازو ہلایا۔ مگر مجال ہے جو اس کی نیند میں ذرا سا بھی خلل پڑا ہو۔

ایسے بے ہوشی کی نیند بھلا کون سوتا ہے؟ اس کا پارہ مزید چڑھ گیا۔ مگر ضبط کر کے واش روم میں گھس گئی۔ آئینہ سامنے تھا۔ اس نے خود کو دیکھا۔ رنگت زرد، صحت کمزور، اور آنکھوں کے گرد حلقے کافی گہرے لگ رہے تھے۔ عرصہ ہوا، اس نے آئینہ دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ کہ دیکھنے پر عجیب سی تکلیف کا احساس ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب جب خود کو دیکھا تو ادراک ہوا۔ وہ اپنا خیال واقعی میں نہیں رکھ رہی تھی۔ بوا ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ وہ زندگی سے بھٹک گئی تھی۔ اپنے آپ سے بے پرواہ ہو گئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ فریش ہو کر باہر تھی۔

ایک کڑی نگاہ سوئے ہوئے وجود پر ڈالی۔ خود ہی اپنی ہمت بڑھائی، مضبوطی پکڑی۔ ارادے باندھے۔

کمرہ تو وہ بالکل شیئر نہیں کرے گی۔ بالکل بھی نہیں۔ اب فارس وجدان کی مرضی نہیں چلے گی۔ نہ تو وہ اس کی دھمکیوں کا اثر لے گی اور نہ ہی اس کے رعب میں آئے گی۔

اس نے سوچا، وہ مسز شیرازی کے کمرے میں شفٹ ہو جائے گی۔ ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ فارس سے کیا بعید گیسٹ روم کا اے سی خراب کر دے۔ وہ منصوبے بناتی سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ اور اطراف کا جائزہ لیتی جا رہی تھی۔

انڈور پلانٹس میں ابھرتی ہوئی خاموش زندگی۔ سفید ٹائلز سے جھلکتا سیلنگ کی روشنیوں کا عکس۔ سمٹے ہوئے مخملیں پردوں کے اس پار نظر آتا۔ باہر کا پرفسوں منظر۔ سوئمنگ پول کا ساکت پانی۔ اور آسمان کا نیلا رنگ۔

''مسز شیرازی کہاں ہیں؟''

''وہ اپنے اسٹوڈیو میں ہیں۔'' ملازمہ اس کے سامنے مؤدب سی کھڑی ہو گئی تھی۔ ''میم! آپ ناشتا کر لیجیے۔''

ایک ہاتھ سے ڈائننگ ہال کا راستہ دکھاتے اس نے بہت ادب سے سر جھکا کر کہا تھا۔

اس کی نگاہیں راہداری کے اختتام پر اسٹوڈیو کے وسیع دروازے تک گئیں۔ پھر کچھ سوچ کر وہ ڈائننگ ہال کی طرف بڑھ گئی۔

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے کچھ وقت مسز شیرازی کے ساتھ ان کے اسٹوڈیو میں گزارا۔ گزشتہ ستائیس دن کی کچھ حکایتیں تھیں، اداسیاں تھیں، احساسات تھے جو دونوں نے ایک دوسرے سے شیئر کیے۔

''تمہارے چلے جانے سے یہ گھر بہت خاموش۔ بہت ویران ہو گیا تھا۔'' وہ کہہ رہی تھیں۔ ''ڈائننگ ٹیبل پر کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ چائے پر کوئی ساتھی نہیں ہوتا تھا۔ اسٹوڈیو تو میں آتی ہی نہیں تھی۔''

وہ اندر ہی اندر بہت پشیمان اور شرمندہ ہوئی۔ ''آئم سوری۔'' ایک بار پھر معذرت کی۔

''بہت عجیب سے خیال آتے تھے، پریشانی ہوتی تھی۔ مجھے تو یہ ڈر تھا کہیں تمہیں کسی نے اغوا نہ کر لیا ہو۔'' انہوں نے رک کر ایک گہرا سانس لیا۔ جنت کا سر مزید جھک گیا۔

''وعدہ کرو مجھ سے۔'' انہوں نے اس کے ہاتھ پر گرفت جمائی تو اس نے سر اٹھا کر ان کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''اس طرح دوبارہ کبھی نہیں کرو گی۔ کوئی بھی مسئلہ ہو، پریشانی ہو۔ پہلے خود کوشش کرو سلجھانے کی۔ نہیں سلجھ رہا تو کسی بڑے سے کہو۔ لیکن اس طرح خاموشی سے گھر چھوڑ دینا ٹھیک نہیں۔''

اس نے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ ہاں! فرار کسی بھی مسئلے کا حل نہیں۔

''آنٹی...... میں یہاں......'' اس کا خوف، اس کی فکر، اس کی پریشانی ابھی بھی وہیں تھی۔

''ڈیلوری کے بعد جیسا تم چاہو گی ویسا ہی ہو گا۔ فی الحال کچھ مت سوچو۔'' گال پر ہاتھ رکھ کر سمجھایا۔ ''اپنی صحت کا خیال رکھو، بہت کمزور ہو گئی ہو۔''

سامنے ہی کینوس پر ان کی پینٹنگ ادھوری تھی۔ پھول کی چند پنکھڑیاں رنگین تو چند بے رنگ سی تھیں۔ اتنے دنوں تک انہوں نے رنگوں کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ اسے دکھ ہوا۔ اٹھ کر کینوس اسٹینڈ ان کے سامنے رکھا۔ کلر ٹیوبز، پیلٹ، اور ڈھیر سارے برش ٹیبل پر اکٹھے کیے۔

''یہ ایسے نامکمل سی بالکل اچھی نہیں لگ رہی۔'' اس نے کہا۔ وہ مسکرائیں۔

''تو یہ طے تھا اس پینٹنگ نے پورے ایک ماہ بعد مکمل ہونا ہے۔''

اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔ آنکھوں میں ایک چمک لیے وہ بھی اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

''جس طرح ہم اپنے اختیار میں آئی ہوئی چیزوں کے لیے وقت مقرر کرتے ہیں، بالکل اسی طرح۔ جس کے اختیار میں ہم ہیں، وہ ہمارے لیے کرتا ہے۔ ہمیں صرف اس پر بھروسا رکھنا ہوتا ہے۔''

وہ کلر پیلٹ پر رنگ پھیلانے لگیں۔

''میں نے تمہارا ریسرچ ورک پڑھا تھا۔ تم نے کافی محنت کر کے بہت اچھی طرح سے آیات کو سمجھا۔''

جنت کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔

''اپنے لیے امید ڈھونڈی۔ اپنے لیے یقین ڈھونڈا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت، اس کی حکمت۔ اس کے ارادوں پر بھروسا کیا۔''

آنسو پلکوں میں شگاف ڈالتے اس کے گال پر پھسلے۔ دل غم سے، درد سے بھر گیا۔ مسز شیرازی کی نظر اس پر پڑی تو پریشان ہو

عسریسرا۔ حسنیٰ حسین

گئیں۔

''کیا ہوا بیٹا؟ تم ٹھیک ہو؟''

وہ ان کے پاس آئی۔ ان کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھ گئی۔ ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے کچھ دیر تک بیٹھی رہی۔

''میں پانچ سال تک بے اولاد رہی۔ میں نے پانچ سالوں تک اس بات پر یقین رکھا کہ میں بانجھ ہوں۔ پانچ سالوں تک میں نے۔'' اس کی آواز بھیگی۔ لب کپکپائے۔ مسز شیرازی اسے دکھ سے دیکھ کر رہ گئیں۔

''میں ساری زندگی حالات کو سزا سمجھتی رہی۔ عذاب۔ بددعا۔ مجھے لگتا تھا میرے ساتھ کبھی اچھا نہیں ہوگا۔ کبھی خوشی نہیں ملے گی۔ میں دعائیں چھوڑ چکی تھی۔ میں نے یقین ختم کر دیا تھا۔ مگر آپ نے۔ آپ نے مجھے یہ سب دوبارہ سکھایا۔ یقین۔ حسن ظن۔ اور دعا۔ اور پھر اللہ نے میری سنی۔ اللہ نے آپ کو سبب بنایا۔ تاکہ میں۔ میں اس اذیت سے نکل سکوں۔'' بہت عرصے تک روتی رہنے والی آنکھیں ایک بار پھر نم ہو رہی تھیں۔ خوشی اور غم کی ملی جلی کیفیت لیے دل پھر سے رو رہا تھا۔

''میری طرف دیکھو۔'' انہوں نے کلر پیلیٹ رکھ کر اس کا ہاتھ تھاما۔

''اندر ہی اندر جب ہم ٹوٹ کر بکھرتے ہیں تو سب سے پہلا خیال ہمیں ''اللہ'' کا ہی آتا ہے۔ مگر ہمیں یہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہوتا کہ اب خود کو سمیٹ کر جوڑنا کیسے ہے اور زندگی کا سفر نئے سرے سے شروع کیسے کرنا ہے۔ اس صورت میں قرآن کی آیات ہمیں زندگی سے جڑنا اور سنبھلنا سکھاتی ہیں۔ یہ ہمارے اندر مثبت سوچ پیدا کرتی ہیں۔ کس مایوسی کی چوٹ پر، امید کا کون سا مرحم رکھنا ہے اور کیسے رکھنا ہے یہ قرآن ہمیں بتاتا ہے۔'' انہوں نے اس کے آنسو پونچھے۔

''ہم سب انسان ہیں۔ ہم سب ٹوٹتے ہیں۔ ہم سب بکھرتے ہیں۔ مگر ہم میں سے کامیاب وہ ہے جس نے خود کو سمیٹ کر سنبھالا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کامل عزم اور یقین کے ساتھ۔''

وہ انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ انہیں سن رہی تھی۔ وہ انہیں سمجھ رہی تھی۔

''لوگ یہ بات نہیں سمجھتے۔ یا شاید سمجھنا نہیں چاہتے۔ لیکن ایک ہماری پلاننگ ہوتی ہے۔ اور ایک اللہ کی ہوتی ہے۔ ایک راستہ ہم اپنے لیے چاہتے ہیں، اور ایک راستہ اللہ ہمارے لیے چنتا ہے۔ ہمارے لیے کہاں کتنی خیر، اور کتنا شر ہے، اللہ یہ دیکھ کر فیصلہ کرتا ہے۔ تاکہ وہ ہمیں بڑی تکلیف سے بچا سکے۔ اور ہمیں ہمارے صبر کے بدلے کچھ بہترین عطا کر سکے۔''

یکایک ان کا موبائل بجنے لگا۔ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سائڈ ٹیبل سے موبائل اٹھا کر انہیں دیا، جب تک وہ بات کرتی رہیں، وہ اسٹوڈیو میں یہاں وہاں ٹہلتی پینٹنگز دیکھتی رہی۔

فارس کا باکس الماری کے اوپری خانے میں موجود نہیں تھا۔ وہ دیکھ کر لمحے بھر کے لیے چونکی۔ پھر کچھ یاد آ جانے پر مسز شیرازی

کی طرف مڑی۔

''آنٹی۔''

وہ بات ختم کر چکی تھیں۔ موبائل رکھ کر متوجہ ہوئیں۔ ''جی بیٹا۔''

''آپ لوگوں کو کیسے پتا چلا کہ...... میں بوا کے پاس ہوں؟'' یہ سوال وہ فارس سے نہیں پوچھنا چاہتی تھی۔

''اقصیٰ نے بتایا تھا میرے خیال سے۔ تم بوا کے بیٹے کے گھر گئی تھیں شاید!''

''اقصیٰ!'' جنت کا منہ کھلا۔ شاک کی سی کیفیت ہوگئی۔ پھر کچھ کہنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے وہ ان سے معذرت چاہتی باہر آ گئی۔ سماعت پر یقین نہیں آیا تھا کہ اقصیٰ اس طرح کوئی بات فارس کو بتا سکتی ہے۔ اس کے سامنے تو کئی وعدے کیے تھے اس نے۔ قسمیں کھائی تھیں۔

تن فن کرتی وہ اقصیٰ کے سر پر پہنچ گئی۔

''میں نے کہا تھا میرا ہر راز تمھارے ساتھ قبر تک جانا چاہیے۔''

اقصیٰ روہانسی ہوئی۔ اب وہ مالکن کو کیسے سمجھاتی کہ اتنی سی عمر میں وہ قبر میں نہیں اترنا چاہتی تھی۔

''تم سے ایک چھوٹی سی بات نہیں چھپائی گئی اقصیٰ؟''

''جنت آپی! پلیز معاف کر دیں۔'' اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے۔ ''آئندہ کبھی بھی نہیں بتاؤں گی۔ کچھ بھی نہیں بتاؤں گی۔ بھلے سے فارس صاحب مجھے پھانسی پر چڑھا دیں۔ بالکل بھی زبان نہیں کھولوں گی۔''

''تم نے میرا دل، میرا مان، میرا بھروسا توڑا ہے اقصیٰ۔'' جنت حد سے زیادہ جذباتی ہوئی۔ اقصیٰ کو رونا آیا۔

''آپی انہیں پتا تھا پہلے سے۔ وہ جانتے تھے آپ وہاں گئی تھیں۔ مجھے تو بس وہ کنفرم کرنے کے لیے لے گئے تھے۔'' وہ وضاحتیں دینے لگی۔ جنت کا غصہ کسی صورت کم نہ ہوا۔

''مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ بالکل بھی امید نہیں تھی۔'' نفی میں سر ہلاتی گئی۔

''آپی!''

''اور کیا بتایا تم نے اپنے فارس صاحب کو؟'' ڈانٹ کر پوچھا۔

''بس وہ۔ ایک ذرا سی بات بتائی تھی۔'' اس نے ڈر کر اعتراف کیا۔

جنت کا دل زور سے دھڑکا۔ اور کون سا راز فاش ہو گیا تھا اس کا؟

''کیا بتایا؟'' خشک ہونٹوں کو تر کر کے پوچھا۔

"یہی کہ جب ہم پارک گئے تھے تو آپ روتی رہیں اور آپ نے کہا، بھاڑ میں جائے یہ فارس وجدان۔"

جنت پلکیں جھپکانا بھول گئی۔ جس رخ کھڑی تھی، جس انداز میں کھڑی تھی، کھڑی رہ گئی۔ دماغ نے سمجھایا، اسٹیٹمنٹ کمال کی تھی سو۔ دل میں سکون اتر گیا۔ یکایک فضا اچھی ہوگئی۔ موڈ اچھا ہوگیا۔ ایسے راز تو بالکل فاش ہونے چاہئیں، لیکن اقصیٰ کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

"اور جب ہم مال گئے تھے تو آپ نے۔ ان کے لیے گفٹ خریدا تھا۔ اور نیلے رنگ کے بڑے بڑے دلوں والا کارڈ بھی بنوایا تھا۔ اور اس پر آپ نے لکھوایا تھا۔

Love You my dearest Faris Wajda

جنت بھونچکا سی اسے دیکھ کر رہ گئی۔ یہ کب ہوا تھا؟ کیسے ہوا تھا؟ اس نے کب لکھوایا یہ جملہ؟ کب کارڈ بنوائے؟ کب گفٹ خریدا؟ وہ ہکا بکا کھڑی رہ گئی۔

"وہ اس دن۔ شام میں مال گئے تھے ہم۔" اقصیٰ نے گھبرا کر یاد دلایا "جب آپ نے وہ سیاہ رنگ کا سوٹ پہنا تھا، اور آپ کے جوتے کا اسٹریپ ٹوٹ گیا تھا؟"

دماغ پر منظر تازہ ہوا اور جنت کا دل چاہا۔ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ لیکن زمین میں سمانے سے پہلے اقصیٰ کا گلا دبانا ضروری تھا۔

"آپی۔ معاف کر دیں۔" اسے اپنی طرف لپکتا دیکھ کر وہ سرخ اینٹوں کی کیاری پر چڑھ گئی۔ اوپر کہیں بالکنی کا دروازہ سلائڈ ہوا۔ گہری سانس لے کر بالوں میں ہاتھ پھیرا گیا۔ پھر ریلنگ پر کہنیاں جمائے اطراف کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی اور تب ہی نگاہ لان کے اس حصے پر ٹھہر گئی جہاں جنت کمال اقصیٰ کے ساتھ موجود تھی۔ آواز تو نہیں آ رہی تھی مگر انداز سے واضح تھا، لڑائی ہو رہی ہے۔

"اقصیٰ تم۔ اف۔ میرے اللہ کیا کروں اب میں تمہارا؟" وہ سر پکڑ کر دبی آواز میں چلائی۔

"تو کیا نہیں لکھوایا تھا؟" اس نے رندھی ہوئی آواز میں دہائی دی۔

"وہ فارس کے لیے نہیں تھا۔" اسے رونا آ رہا تھا۔ "میں نے زید کے لیے کارڈ بنوایا تھا۔ تم نے دیکھا تھا فارس کا نام لکھا ہوا؟ ہاں؟؟"

نفی میں سر ہلاتے ہوئے اقصیٰ نے انگلیاں منہ میں داب لیں۔ "لیکن......وہ......میں سمجھی کہ......آپ نے ان کے لیے۔"

"تمہارے فارس صاحب ریموٹ کنٹرول کار سے کھیلتے ہیں؟" وہ بھنائی۔

"مجھے لگا، وہ ڈیکوریشن پیس ہے ان کی سٹڈی کے لیے۔" اقصیٰ کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔

"تم خود سے کیا کیا مفروضے گھڑتی رہتی ہو اقصیٰ۔" اسے جی بھر کر رونا آیا۔ اب وہ کیا سمجھتا رہا ہوگا کہ میں اس کی محبت میں مری جا رہی تھی؟ کارڈ لکھواتی پھر رہی تھی؟

"آپی!" مسکین سی صورت بنا کر اقصیٰ نے کان پکڑے۔ "آئندہ نہیں بتاؤں گی۔"

"آئندہ تو میں تمہیں کچھ بتاؤں گی بھی نہیں۔ تم فارس کی جاسوسہ۔ صرف اس کے ساتھ ہی سنئیر ہو۔"

وہ غصے سے پلٹ گئی۔ اقصیٰ نے آنکھیں پھاڑ کر مالکن کو دیکھا۔ لقب اچھا تھا۔ فارس کی جاسوسہ! لیکن مالکن زیادہ اہم تھی۔ فوراً سے اس کے پیچھے بھاگی۔

"آپی! معاف کر دیں۔ پلیز!"

صدر دروازے کے پاس رک کر جنت جھٹکے سے اس کی طرف مڑی۔ ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

"سب ختم!"

اقصیٰ کے سینے پر ہاتھ پڑا۔ کندھے جھک گئے، شکل رونی ہوگئی۔ جنت اندر چلی گئی تھی۔ مسکین سی صورت بنائے اقصیٰ وہیں کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆

وہ کمرے میں آئی تو فارس موجود نہیں تھا۔ اٹیچڈ باتھ سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے بیڈ سائڈ ٹیبلز کی تلاشی لے کر اپنا موبائل اٹھایا اور نیچے آ گئی۔ کچن کاؤنٹر ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے موبائل آن کیا۔ مسڈ کالز کے کافی نوٹیفیکیشن تھے۔

گیلری بالکل صاف تھی۔ عدینہ زبیر کی طرف سے واٹس ایپ پر موصول ہونے والی تصاویر اور مسیجز مٹائے جا چکے تھے۔ وہ فارس کی اس حرکت پر لب بھینچ کر رہ گئی۔

بے شمار ان دیکھے میسجز آمنہ کی طرف سے منتظر تھے، سائرہ خالہ اور سدرہ کے میسجز بھی۔ اس نے مسز لغاری کی واٹس ایپ چیٹ کھولی۔ نیچے سے اوپر تک سکرول کرتی گئی۔

کتنے گڈ مارننگ اور گڈ نائٹ کی عبارتیں تھیں، سوال تھے، پھول اور رنگ برنگے دل تھے، ریکارڈنگز تھیں۔ وہ ایک ایک کر کے سنتی گئی۔ زید کی باتیں، اس کے قصے۔ دوستوں سے لڑائی۔ اپنی ننھی بہن کی شرارتیں۔ ماں سے ناراضی۔ اور فارس کی شکایتیں تو اتنی تھیں کہ بس۔

وہ سنتی گئی اور حیران ہوتی گئی کہ اس کی طرف سے "اوکے، فائن، ڈونٹ وری" جیسے مختصر مسیج بھی بھیجے گئے تھے۔ آخری

ریکارڈنگز میں وہ منگنی کی انگوٹھی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ایک نیلے رنگ کی تھی اور دوسری گلابی رنگ کی۔فارس نے گلابی رنگ والی انگوٹھی کو ڈن کر کے وہ نمبر بلاک کیا ہوا تھا۔اور وہ اپنی جگہ ششدر سی بیٹھی تھی۔سمجھتا کیا ہے یہ خود کو؟ تڑپ کر نمبر ان بلاک کیا۔زید کو ریکارڈنگ بھیجی۔شکریہ ادا کیا۔معذرت بھی کی کہ وہ اس سے بات نہیں کر سکی۔پھر آئمہ کے میسجز کا جواب دیا۔اسی وقت اس کی کال آ گئی۔

''اوہ مائی گاڈ جنت! تم کہاں سے زندہ ہوگئیں؟''

وہ خفیف سا ہنس دی۔

''فارس بھائی نے بتایا تھا تم اپنے میکے گئی ہوئی ہو۔''

''ہاں وہ میں۔خالہ کی طرف تھی۔'' کھنکھار کر کہا۔ساتھ ہی گلاس میں پانی انڈیلا۔

''مجھے تو پورا شک تھا،لڑ کر گئی ہو،اسی لیے فارس بھائی اداس پھر رہے تھے۔'' پانی پیتے ہوئے جنت کو زور کا اچھو لگا۔کھانستے ہوئے گلاس ٹیبل پر رکھا۔اداس پھر رہے تھے؟ صدمہ!

''مسئلہ حل ہوگیا کیا؟'' آئمہ کی آواز میں شرارت تھی۔

''م......مسئلہ تو کوئی نہیں تھا'' وہ گھبرائی۔

''اوہ کم آن جنت! شاید تم بھول رہی ہو،میری ایک عدد بھابھی ہیں۔وہ جب بھی میکے جاتی ہیں ایک ہفتے سے زیادہ نہیں رہتیں۔بھائی پہنچ جاتے ہیں لینے۔لیکن ایک بار جب ان دونوں کی لڑائی ہوگئی تھی تو بھابھی پورا مہینہ میکے رہی تھیں۔'' وہ بتاتے ہوئے ہنسی۔

اور جنت نے بے ساختہ اپنی پیشانی کو چھوا۔یہ آئمہ کتنی پہنچی ہوئی چیز تھی۔

''ہاں مگر......ایسا کچھ نہیں تھا۔''

''پھر تمھارا موبائل کیوں آف تھا؟ میسج کے جواب کیوں نہیں دیے تم نے؟''

''وہ دراصل۔'' وہ صحیح معنوں میں پھنس گئی۔دوسری طرف آئمہ آنکھوں میں شرارت لیے بیٹھی تھی۔

''اچھا چھوڑو۔'' اسے جیسے ترس آ گیا۔''میں تمھاری نند بھی تو ہوں۔کسی معاملے میں میری ہیلپ چاہیے ہو تو میں حاضر ہوں! میں تو اپنی بھابھی کا بھی پورا پورا ساتھ دیتی ہوں۔ناراض ہو کر جب میکے جاتی ہیں تو ان کی تیاری میں خود کرواتی ہوں۔بھائی کی ساری خبریں بھی میں ہی پہنچاتی ہوں۔کہاں سے آ رہے ہیں،اب کہاں جا رہے ہیں،کیا کھا رہے ہیں۔کتنے اداس ہیں۔یا کتنے خوش نظر آ رہے ہیں۔سب۔''

''تمھارا کوئی علاج نہیں۔'' جنت ہنس دی۔آئمہ کو بات کر کے اچھا لگا۔عجیب سی انسیت ہوتی تھی اسے جنت سے۔

''شام کا کیا پلان ہے؟ کہیں باہر چلیں؟'' وہ اپنی روزمرہ کی روٹین،پڑھائی اور آخری سمسٹر کا رونا دھونا شیئر کرنے کے بعد پوچھ رہی تھی۔جنت کو مسز شیرازی کے ساتھ کچھ وقت گزارنا تھا۔پھر طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں تھی،اس لیے معذرت کر لی۔''میں خود بتاؤں گی تمہیں،پھر پلان کریں گے کچھ۔''

آئمہ سے بات کرنے کے بعد کچھ دیر تک سائرہ خالہ کو سوچ کر فکرمند ہوتی رہی۔کئی بار کانٹیکٹ نمبر نکالا اور ہر بار کال کرتے کرتے رک جاتی۔ان ہی الجھنوں میں گھری بیٹھی تھی کہ زید اپنی ننھی بہن کا ہاتھ تھامے اسکول یونیفارم میں ہی اسکول سے واپسی پر سیدھا اس سے ملنے آ گیا۔

وہ بہت خوش ہوئی۔بچے مسز شیرازی سے مل کر اور ان کی پینٹنگز کا نظارہ کر کے آئے تو وہ کچن میں تھی۔

اپنے ننھے مہمانوں کی خاطر مدارت میں ہلکان ہوتی وہ ڈائننگ ٹیبل پر پلیٹیں رکھ رہی تھی جب اس نے فارس وجدان کو سیڑھیاں اترتے دیکھا۔

نیلی جینز پر سفید ٹی شرٹ میں ملبوس،بھیگے بال کچھ سلیقے سے جمے ہوئے،آنکھوں میں ہلکی سی سوجن ابھی بھی موجود تھی۔

زید کی نظر اس پر پڑی تو اس کا پھولا ہوا چہرہ مزید پھول گیا۔

''گڈ مارننگ۔'' ڈائننگ ہال سے گزرتے ہوئے اس نے کہہ دیا۔

''گڈ آفٹرنون کہو۔'' جنت کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

موصوف نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا۔پھر پیشانی مسلی،جھک کے پلیٹ سے فرنچ فرائز اٹھائے اور راہداری کی طرف بڑھ گیا۔

شکایتوں کی پٹاری کھل گئی۔زید شروع ہوگیا۔

''یہ مجھے آپ سے ملنے نہیں دیتے تھے،کبھی کہتے تھے آپ گھر پر نہیں ہیں،کبھی کہتے تھے،آپ سو رہی ہیں،کبھی کہتے تھے،آپ بزی ہیں۔میں نے آپ کو کارڈ بھی لکھا تھا۔کینڈی بھی بھیجی تھی۔میں سوزی کو بھی لایا تھا۔انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا۔''

جنت نے بڑی مشکل سے اسے سمجھا بجھا کر اس کا غصہ ٹھنڈا کیا۔

''اس دن ہم باہر کھیل رہے تھے۔انہوں نے میرا فٹ بال مجھے واپس نہیں کیا۔'' یہ ایک اور قصہ تھا۔جنت نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا۔یہ تو وہ بھی جانتی تھی فارس بچوں سے الجھ پڑتا تھا،مگر ایسے الجھتا ہوگا اس کی توقع نہیں تھی۔

''آپ کو یہ بھی تو بتانا چاہیے کہ فٹ بال میرے سر پر لگا تھا۔''

فارس کی آواز پر جہاں زید چونکا، وہاں اتنے قریب سے اس کی آواز آنے پر وہ گڑبڑائی۔ وہ اس کی کرسی کے پیچھے، بہت قریب سے جھکا ہوا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر زید کی پلیٹ سے مزید فرنچ فرائز اٹھا لیے۔ زید نے لڑاکا عورتوں کی طرح کینہ توز نظروں سے اسے گھورا۔ پھر اپنی پلیٹ پر دونوں ہاتھ رکھ لیے۔ کہ اب اٹھا کر دکھاؤ۔

اس کی ننھی بہن بڑے مزے میں تھی۔ پر تجسس نگاہوں سے کبھی بھائی کو، کبھی فارس کو دیکھتی پھر دوسرے نوالے کے لیے منہ کھول کر جنت کی طرف رخ کر لیتی۔

وہ جیب میں والٹ رکھتا باہر چلا گیا۔

’’مجھے یہ بالکل بھی۔ ذرا سا بھی اچھے نہیں لگتے۔‘‘ زید نے ایک ہزار بار کہے جانے والا جملہ ایک بار پھر دہرایا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

وہ کچن کاؤنٹر پر موبائل ہاتھوں میں لیے بیٹھی تھی جب صدر دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی فارس وجدان کچن میں آ گیا۔ بچوں کے جانے کے بعد وہ اب ہی اسے اکیلی نظر آئی تھی۔

’’کیسی ہو؟‘‘ اس نے فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے پوچھا۔ آواز بھاری، لہجہ ٹھہرا ہوا۔

’’جیسی بھی ہوں، تمہیں اس سے کیا؟‘‘ موبائل پر خود کو مصروف ظاہر کرتے اپنا غصہ نکالا۔

’’خیر سے اب تم یہ تو نہیں کہہ سکتیں۔‘‘

جنت نے سر اٹھا کر ایک سلگتی نگاہ اس پر ڈالی۔

’’کہہ سکتی ہوں! بالکل کہہ سکتی ہوں۔‘‘ دانت پیس کر جواب دیا۔

فارس نے رک کر اسے دیکھا۔ وہ موبائل پر نظریں جمائے خود کو مصروف اور بے نیاز ظاہر کر رہی تھی۔ مگر آنکھوں میں غصہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ اس کی موجودگی پر قطعاً خوش نہیں لگ رہی تھی۔

’’کیا ہم بات کر سکتے ہیں؟‘‘

کوئی بھی جواب دیے بغیر اس نے سر اٹھا کر یہاں وہاں دیکھا۔ کچھ اور نظر نہ آیا تو کٹنگ بورڈ پر پیاز اور چھری رکھی ہوئی نظر آ گئی۔ فوراً سے آستینیں چڑھا کر شروع ہو گئی۔ خیال تھا جب وہ اسے مصروف دیکھے گا تو کوئی بات نہیں کرے گا۔ مگر یہ اس کی خام خیالی تھی۔ فارس عین اس کے پیچھے آن کھڑا ہوا۔

’’میں طلاق بھی نہیں دینا چاہتا۔ اور چاہتا ہوں کہ تم کورٹ بھی نہ جاؤ۔ اس کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟‘‘

جنت کی دھڑکنیں تھم گئیں۔ سماعت پر یقین نہیں آیا۔ گردن موڑ کر اس نے فارس کو صدمے سے دیکھا۔ وہ اس کے پیچھے بے حد قریب کھڑا تھا۔ اتنا قریب کہ وہ اس کے کپڑوں سے اٹھتی مردانہ کلون کی خوشبو با آسانی محسوس کر سکتی تھی۔

’’مذاق اڑا رہے ہو تم میرا؟‘‘

’’خواہش کا اظہار کر رہا ہوں۔‘‘

’’غلط انسان کے سامنے غلط خواہش کا اظہار کر رہے ہو۔‘‘ رخ بدل کر وہ پھر سے پیاز کاٹنے لگی۔

’’میں اپنے بچے کی ماں سے بات کر رہا ہوں۔‘‘ جھک کر سرگوشی کی۔ جنت کے ہاتھ ساکت ہوئے۔ دھڑکن تیز ہو گئی۔ پھر سنبھل کر لب بھینچ کر اسے دیکھا۔ ’’گویا اپنے بچے کے لیے اس رشتے کو بحال کرنا چاہ رہے ہو۔‘‘

’’نہیں، یہ کام میں صرف تمہارے لیے کرنا چاہ رہا ہوں۔‘‘

وہ دم سادھے اگلے کئی لمحوں تک ایک ہاتھ میں چھری، دوسرے ہاتھ میں پیاز لیے کھڑی رہ گئی۔ یوں جیسے یقین کرنا چاہ رہی ہو، اس سے یہ بات فارس وجدان نے کی ہے۔

’’اچھا مذاق ہے یہ۔‘‘ اذیت سے بڑبڑا کر رخ بدل گئی۔

’’مگر میں تو سنجیدہ ہوں۔‘‘

چھری پٹخ کر اس نے رخ بدلا۔

’’مجھے ہرگز پسند نہیں ہے، کوئی مجھ پر ترس کھائے۔‘‘ اس کی آواز تیز ہوئی تھی۔

’’تمہیں لگتا ہے، میں تم پر ترس کھا سکتا ہوں؟‘‘ اس نے جنت کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ دم سادھے کھڑی رہی۔

’’کیوں کر رہے ہو یہ سب؟‘‘ اس نے ضبط کر کے تحمل سے پوچھا تھا۔

’’بتایا تو ہے۔ تمہارے لیے کر رہا ہوں۔‘‘

’’میرے لیے؟‘‘ اسے سخت نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے انگلی سے اپنی طرف اشارہ کیا۔ برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ اور وہ حد اس ایک لمحے میں ختم ہوئی تھی۔

’’تمہارا دل چاہے گا تو تم نکاح کو کاغذ تک رکھو گے، پھر میرے احساسات کی فکر کیے بغیر اپنا جائز حق بھی وصول کر لو گے۔ تمہاری مرضی تم مجھے ساتھ رکھو۔ تمہاری مرضی تم مجھے طلاق دے دو۔ سب تمہارے اس دل کے گرد گھوم رہا ہے۔‘‘ اس نے فارس کے سینے پر انگشت شہادت ٹھونکی۔ ’’اور تم کہہ رہے ہو۔ میرے لیے کر رہے ہو۔‘‘

روح کا درد آنکھوں سے کیسے جھلکتا ہے، اذیت لفظوں میں کیسے اترتی ہے، آواز سے کیسے چھلکتی ہے، یہ اس لمحے فارس وجدان

نے جانا تھا۔

''تم کسے بے وقوف بنا رہے ہو؟ مجھے یا خود کو؟'' بظاہر مضبوط لہجہ، مضبوط آواز۔ مگر وہ اس کے اندر کی توڑ پھوڑ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

''میں نے ایک بات کی ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اقرار یا انکار کا اختیار تمھارے ہاتھ میں ہے۔''

''جیسے میں نہیں جانتی کہ تم اختیار چھیننے میں کتنے ماہر ہو۔''

وہ آنکھوں میں دکھ اور پچھتاوا لیے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

بہت سی باتیں وہ نظر انداز کر گیا تھا۔ بہت سی الجھنیں اسے یاد نہیں رہی تھیں۔ گرہ سخت تھی۔ اب سخت ترین ہو گئی تھی۔ وہ اس کے خدشات کی تہہ تک اب پہنچا تھا۔ اس کی پریشانیوں کو جیسے اب سمجھا تھا۔ جنت کا یقین ٹوٹا تھا۔ اس کا اعتماد بکھرا تھا۔ اس نے یہاں اس گھر میں رویے کی اذیت سہی تھی۔ بے رخی کو جیا تھا۔ وہ اتنی جلدی۔ اور اتنی آسانی سے اسے موقع نہیں دے سکتی تھی۔ اس کا خوف بجا، اس کی پریشانی جائز تھی۔

''میں نے صرف ایک چانس مانگا ہے۔''

''میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔''

مڑ کر وہ ایک بار پھر پیاز کاٹنے لگی تھی۔ اس کے پیچھے وہ خاموش کھڑا رہا۔

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ تسلی یا مداوا کا ایک لفظ ہی سہی۔ مگر لفظوں کی قلت تھی۔ اور ہمت تو صفر ہو چکی تھی۔

وہ الٹے قدم پیچھے ہٹا۔ جیبوں سے ہاتھ نکالے اور کچھ بھی کہے بغیر چلا گیا۔

جنت نے چھری رکھ دی۔ کنارے پر ہاتھ جمائے، سر جھکا گئی۔ آنسو بہنے لگے۔ اپنے آپ کو کسی نئے غم سے بچانے کے لیے اس نے پیاز کاٹنا شروع کی تھی، مگر اندر تک وہ پھر بھی کٹ گئی تھی۔

☆☆☆

سارا دن خود سے الجھتے رہنے کے بعد شام تک سائرہ نے ہمت کر کے جنت کو کال کی تھی۔ انہیں ڈر تھا، وہ کال ریسیو نہیں کرے گی مگر اس نے کر لی تھی۔

''السلام علیکم خالہ۔'' اس کی آواز کمزور نہیں تھی، مگر جانے کیوں انہیں لگا جیسے جنت کمال کو مخاطب ہونے میں دقت کا سامنا کرنا پڑا ہو۔

''وعلیکم السلام۔'' اتنی ہی مشکل انہیں ہوئی تھی۔ اتنی ہی دقت۔ اتنی ہی صعوبت کے مراحل سے گزرنا پڑا تھا انہیں۔

اب وہ کیا کہیں اس سے؟ کس بات کا شکوہ کریں، کس امر پر خفگی دکھائیں، کیسے پوچھیں اس نے گھر کیوں چھوڑا، اس سے رابطہ کیوں نہ کیا، اپنے مسئلوں سے آگاہی کیوں نہ دی؟

وقت پوچھنے کا نہیں رہا تھا۔ اب اعتراف کی ساعت تھی

''مجھے...... مجھے معاف کر دو۔'' کس قدر ہمت سے انہوں نے کہا تھا۔ اور دوسری طرف ایک صدمہ بھری خاموشی چھا گئی تھی۔

''کس بات کی معافی خالہ! معافی تو مجھے مانگنی چاہیے۔ میں نے آپ سب کو پریشان کر دیا۔''

موبائل کان سے لگائے، نفی میں سر ہلاتے ہوئے انہوں نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھ لیے تھے۔

''تم مجھ سے ناراض تھیں۔ تم نے گھر چھوڑ دیا لیکن مجھ سے بات نہیں کی۔''

نچلا لب کاٹتے ہوئے وہ ذرا شرمندہ ہوئی۔ ''میں آپ پر بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی۔ پہلے بھی میری وجہ سے آپ کو بہت پریشانی اٹھانا پڑی ہے۔''

سائرہ خالہ کا دل کٹ گیا۔

''میں آپ کے پاس آ جاتی تو خاندان کے لوگ۔'' وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ ''آپ کے لیے اور مسئلے کھڑے ہو جاتے خالہ۔''

مشکل ترین حالات میں بھی وہ ان کی فکر کر رہی تھی۔ ان کا دل غم سے بھر گیا۔

''میں نے تمہیں زمان سے بچانا چاہا تھا۔''

''میں بھی صرف اسی سے بچنا چاہتی تھی۔'' اس نے یوں کہا جیسے اس کے خواب نہیں تھے، خواہشات نہیں تھیں۔ ایک غیر امین ٹھکانے سے وہ ایک صرف امان والی جگہ چاہتی تھی۔ اسے گھر نہیں چاہیے تھا، زندگی نہیں چاہیے تھی۔ دوری چاہیے تھی خاندان سے، رشتوں سے، اذیتوں سے، تکلیفوں سے، طنز اور طعنوں سے۔ اور ان سزاؤں سے جو کتنے سالوں سے وہ جھیل رہی تھی۔ اور تو کوئی خواہش نہیں تھی۔ اس نے ظاہر کیا۔ اور تو کسی شے کی طلب نہ تھی۔

''ابو تمہیں خوش دیکھنا چاہتے تھے۔'' ان کی آواز لرز رہی تھی۔ ''جنت میں ان کی وصیت پر عمل نہیں کر سکی۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے۔''

''ایسا نہیں ہے۔'' وہ روہانسی ہوئی۔

''ایسا ہی ہے بیٹا! میں تمھاری مجرم ہوں۔''

''خالہ آئم پریگننٹ۔'' کس قدر ہمت سے اس نے کہا تھا۔

ان کی آنکھوں میں نمی ٹھہر گئی۔لب ساکت ہو گئے۔

''بانجھ ہے یہ بانجھ! کبھی ماں نہیں بن سکتی۔''

''اب میرا بیٹا ایسے ہی بے اولاد رہے گا ساری عمر؟'' اس کی تائی کی آواز، غصہ، نفرت۔ جنت کے پانچ سالوں کا صبر ان کی آنکھوں میں گھوم گیا۔جس محرومی کی وجہ سے وہ ہر جگہ سے رد ہوئی تھی۔وہی محرومی۔کسی اور کی زندگی میں عطا بن گئی تھی۔عطا ہو گئی تھی۔اللہ کی حکمت،اللہ کے معاملات اللہ ہی جان سکتا ہے۔ورنہ ان کے جیسے لوگ تو صرف ساحل پر رک کر گہرائی کا اندازہ لگایا کرتے تھے۔خود سے مفروضے گھڑا کرتے تھے،اپنی نعمتوں پر اترایا کرتے تھے۔اپنی مصلحتوں پر مسکرایا کرتے تھے۔

''تم.....تم ماں بننے والی ہو۔'' خوشی سے آنسو چھلک پڑے۔غم سے مردہ ہوتا دل اس خبر پر زندہ ہوا۔وہ رو پڑیں۔

''اب آپ کیسے سوچ سکتی ہیں میں خوش نہیں ہوں گی؟'' اس کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔

سائرہ خالہ احساس ندامت میں گھر گئیں۔وہ اب بھی ان سے متعلق خوش گمان تھی۔ایک لمحے کے لیے بھی غلط نہیں سوچ رہی تھی۔الٹا انہیں سمجھا رہی تھی۔انہیں تسلی دے رہی تھی۔

''مجھے یہاں آ کر پتا چلا ہے،خوشی ایک نعمت ہے اور سکون اس سے بھی بڑی نعمت! خوشیوں کا تعلق دنیاوی نعمتوں سے ہے اور سکون کا تعلق صرف اللہ سے!! دل اللہ سے جڑ جائے خالہ تو پھر زندگی کتنی ہی مشکل کیوں نہ ہو۔آسان ہو جاتی ہے۔''

اس کا ایک ایک لفظ ان کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر گیا۔وہ کتنی خاص تھی۔انہوں نے کبھی سمجھا ہی نہیں۔

''تم کتنی بڑی باتیں کرنے لگی ہو۔'' انہوں نے ہاتھ کے پشت سے آنسو صاف کیے۔

وہ ہنس دی۔بڑی باتیں سمجھنے کے لیے اسے بڑی بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا تھا۔

''اب سب ٹھیک ہے نا؟ اور فارس۔فارس تمہارے ساتھ کیسا ہے؟'' جنت کی گمشدگی کے بعد فارس کی دیوانہ وار جستجو اور فکرمندی وہ اپنی آنکھوں سے تو دیکھ ہی چکی تھیں۔مگر اب جیسے وہ آنکھوں پر یقین نہیں رکھنا چاہتی تھیں۔اب گہرائی میں اترنا چاہتی تھیں۔اب ''خالہ'' ہونا چاہتی تھیں۔

''کوئی بھی مسئلہ ہو تو مجھے بتاؤ۔میں اور تمہارے خالو اس سے بات کریں گے۔اسے سمجھائیں گے۔''

وہ لمحے بھر کے لیے خاموش ہوئی تھی مگر چاہ کر بھی کوئی شکوہ شکایت نہ کر سکی۔ذہن بلینک ہو گیا۔یوں لگ رہا تھا جیسے انسانوں کو بتانے کے لیے اب تو کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں۔جیسے پہلے سب ہی معاملات اللہ نے سنبھالے تھے تو اب بھی وہی سنبھالے گا۔

''جنت!''

''اب تو سب ٹھیک ہے خالہ!'' سوچ سمجھ کر کہا۔''گھر چھوڑنا میری غلطی تھی۔فارس نے تھوڑی نہ نکالا تھا۔''

گو کہ پیروں تلے زمین نہیں تھی۔نہ سر پر آسمان رہا تھا۔مگر جس فضا میں وہ معلق تھی۔اس فضا نے دونوں کو جوڑ رکھا تھا۔

بات ختم ہو گئی۔فون بند ہو گیا۔سائرہ کو یوں لگا جیسے مسئلہ سلجھ گیا ہو۔ضمیر کی ملامت تھوڑی کم ہو گئی ہو۔مگر بے سکونی ہنوز قائم تھی۔

''آپ نے اپنی طرف سے میرے لیے بہت اچھا سوچا، مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔''

جنت کمال کو بے شک ان سے کوئی گلہ نہیں تھا۔مگر انہیں خود سے بہت گلے ہو چکے تھے۔

☆☆☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔کمرے میں اندھیرا تھا۔برابر میں مسز شیرازی سو رہی تھیں۔

اسے اپنی طبیعت میں غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔شاید چکر آ رہے تھے یا پھر متلی سی ہو رہی تھی۔اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو سر گھوم کر رہ گیا۔چند لمحوں تک گہری سانسیں لیتی رہی، پھر اٹھ کر باہر آ گئی۔دیوار کا سہارا لیے اس نے واش روم کا رخ کیا تھا۔

اسے یکا یک قے ہوئی۔شام کو لی جانے والی خوراک باہر تھی۔واش بیسن پر گرفت جمائے اس نے خود کو آئینے میں دیکھا۔شکل دھندلی اور چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا۔

اس نے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھپاکے مارے اور بے حد احتیاط اور آہستگی سے قدم اٹھاتی لاؤنج میں آ گئی۔اسے یاد تھا سائرہ خالہ کے فون کے بعد وہ مسز شیرازی سے باتیں کرتی ان کے کمرے میں ہی سو گئی تھی۔

کچھ دیر تک وہ صوفے پر ہی بے دم سی لیٹی رہی۔نہ اب اٹھنے کی ہمت تھی نہ کسی کو آواز دینے کی سکت۔

ذہن ماؤف تھا۔آنکھوں پر دھند چھائی تھی۔

اس نے پیشانی کو اور پھر آنکھوں کو مسلا۔نظر سیڑھیوں کے اس طرف آفس کے ادھ کھلے دروازے پر جا ٹھہری۔کمرہ روشن تھا۔ٹائلز پر زرد روشنی بکھری ہوئی تھی۔

کیا فارس اندر تھا؟ اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بمشکل سانس لی۔پھر کچھ قوت پیدا کر کے اسے آواز دی۔

روشنی موجود رہی۔دروازہ ساکت رہا۔نحیف آواز اس تک نہیں پہنچی تھی۔اسے بے اختیار رونا آیا۔

''ف......فارس۔'' کشن اٹھا کر پھینکا۔اب وہ رو رہی تھی۔دل پھٹا جا رہا تھا۔عجیب وحشت اور گھبراہٹ ہو رہی تھی۔منظر کچھ اور دھندلا یا تھا۔قوت کچھ اور مٹ گئی تھی۔اسے لگا وہ نہیں آئے گا۔

''فارس!'' ایک بار پھر اسے پکارا۔

یکا یک دروازہ کھل گیا۔اس نے فارس کو باہر نکلتے،اور پھر عجلت میں اپنی طرف آتے دیکھا۔

''کیا ہوا؟ تم ٹھیک ہو؟'' کندھوں سے تھام کر پوچھا تھا۔ آنکھوں میں فکر، لہجے میں پریشانی تھی۔ اس نے روتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ وجود اب بے جان ہو رہا تھا۔ اسے لگا وہ بس مرنے والی ہے۔

''جنت۔'' وہ آخری آواز تھی جو اس نے سنی۔ وہ آخری چہرہ تھا جو اس نے دیکھا۔ روشنی تیز ہوگئی۔ آوازیں مدھم۔ جیسے کوئی پکارتے ہوئے دور، بہت دور ہوتا جا رہا ہو۔ اور پھر سب تاریک ہوگیا۔

☆☆☆

داہنے ہاتھ کی پشت پر کہیں چبھن کا احساس ہوا۔ ذہن پر چھائی ہوئی دھند چھٹنے لگی۔ آوازوں کو مفہوم مل گیا۔ اس کا بایاں سرد ہاتھ کسی کی گرفت میں تھا۔ نرم سی گرفت۔ جیسے نانا کے ہاتھوں کی ہوا کرتی تھی۔ اس نے انگلیوں کو جنبش دیتے ہوئے ہاتھ بند کرنا چاہا۔ ذہن ایک بار پھر غنودگی میں چلا گیا۔

دوبارہ اسے ہوش آیا تو ہسپتال کے کمرے میں نیم تاریکی سی تھی۔ نانا وہاں کہیں نہیں تھے۔ داہنے ہاتھ پر ڈرپ لگی تھی۔ سامنے ہی کھڑکی کے پاس فارس موبائل ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ اسے ہوش میں آتا دیکھ کر اس کے پاس آ گیا۔

''کہ......کیا......ہوا مجھے؟'' اس کی آنکھوں میں خوف سمایا ہوا تھا۔

''کچھ نہیں ہوا۔ سب ٹھیک ہے۔ لیٹی رہو!'' فارس نے ہاتھ تھام کر تسلی دی۔ تکیے پر سر رکھتے ہوئے اس نے داہنے ہاتھ سے پیشانی کو چھوا۔

''اب کیسی طبیعت ہے۔'' وہ برابر میں بیٹھ کر پوچھ رہا تھا۔ آنکھوں میں فکر تھی۔

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے کہا۔ سر ابھی بھی کچھ بھاری تھا۔ مگر پہلے جیسی حالت نہیں تھی۔

گہری سانس لے کر کمرے کا جائزہ لیا۔ نیلگوں روشنی میں ایک پراسراری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کھڑکیوں کے اس پار رات ابھی بھی باقی تھی۔

''کیا ٹائم ہو رہا ہے؟'' اس کی آنکھیں کچھ دیر کے لیے کھلتی تھیں پھر بند ہو جاتی تھیں۔

''ڈھائی بجے رہے ہیں۔''

''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔'' اختلاف، ناراضی، غصہ اپنی جگہ۔ مگر رزق پر کوئی سمجھوتا نہیں۔

''میں کھانے کے لیے کچھ لے کر آتا ہوں۔'' ایک نرم سی نگاہ اس پر ڈالے وہ اٹھ گیا۔

خشک لبوں کو تر کرتے ہوئے جنت نے گہری سانس لی۔

''فارس! تم یہاں......'' وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا ہی تھا جب کوئی عورت اس کے سامنے آ گئی تھی۔ ''خیریت ہے؟''

جنت کی آنکھیں کھل گئیں۔ بے ساختہ دروازے کی طرف دیکھا۔

''مائی وائف از ناٹ فیلنگ ویل۔'' اس نے سنا۔ فارس کی پشت نظر آ رہی تھی۔

''اوہ، کیا ہوا عدینہ کو؟ ٹھیک تو ہے وہ؟ میری تو کافی عرصے سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔''

جنت کی دھڑکن تھم گئی۔ فارس نے ادھ کھلا دروازہ کھینچ کر بند کر دیا۔ آوازیں معدوم ہوگئیں۔ دروازے کے نیچے قدموں کے آثار بھی غائب ہوگئے۔

کمرے کی خاموشی وجود میں اتر آئی۔ شب کا اندھیرا آنکھوں میں حلول کر گیا۔ وہ چند لمحوں تک دم سادھے پڑی رہی۔ پھر کروٹ بدل کر آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

☆☆☆

اوصاف منزل میں ایک سے زائد کام والیوں کا اضافہ ہو چکا تھا، شادی کے دن قریب تھے تو اس کے حصے کا کام بھی بڑھ گیا تھا۔

آج ثمرین کی مہندی تھی۔ مہمانوں سے بھرے گھر میں ہر طرف رنگ برنگے آنچل ہی نظر آ رہے تھے، کوئی آ رہا ہے، کوئی جا رہا ہے۔ وہ بچے کے ساتھ ہی چھوٹے موٹے کام نمٹا رہی تھی۔ اور گاہے بگاہے آنے والے مہمانوں اور رشتہ داروں کا بھی جائزہ لے رہی تھی۔ بچے کی ماں طارق صاحب کی سگی بہن تھی۔ اپنی بھتیجی کی شادی پر تو ضرور آئے گی۔ مگر اسے ابھی تک کوئی ایسی عورت نظر نہیں آئی تھی جس کے متعلق وہ یہ گمان کرتی کہ وہی اس بچے کی ماں ہوگی۔ زیادہ تر چہروں کو وہ پہچانتی تھی۔ کوئی بھی نیا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

مہمانوں کی دیکھ بھال اور انہیں مشروب پیش کرنے کی ذمہ داری اس پر آئی تو اس نے اس ننھی جان کو کچن کے دروازے کے پاس بٹھایا، صغریٰ کو اس پر نظر رکھنے کا کہا اور ٹرے اٹھائے سیڑھیاں چڑھ گئی۔ خیال تھا بس دو منٹ میں پیش کر کے نیچے آ جائے گی مگر دو سے دس منٹ لگ گئے۔ نیچے آئی تو صغریٰ اسے اٹھائے کھڑی تھی۔ بچہ درد کی شدت سے چیخ چیخ کر نڈھال ہو چکا تھا۔

''ہائے اللہ جی! اسے کیا ہوا!'' بوکھلا گئی۔

''دروازے میں ہاتھ آ گیا۔''

ننھے سے سرخ ہاتھ پر نظر پڑتے ہی روبی کے پیروں تلے سے گویا زمین نکل گئی۔

''میں کہہ کر گئی تھی اس کا خیال رکھیو۔''

''اے ہے، کتنے کام دیکھوں میں؟'' صغریٰ تپی کھڑی تھی۔

وہ روتے بلکتے بچے کو اٹھائے اسی وقت طارق صاحب کے پاس چلی گئی جو کھانے کا حساب کتاب دیکھ رہے تھے۔

''وہ جی بچے کا ہاتھ آ گیا دروازے میں۔''

انہوں نے سر اٹھایا۔ ایک نظر اسے دیکھا۔ دوسری نظر روتے بچے پر ڈالی۔ پھر پاس کھڑے بیٹے سے یوں مخاطب ہوئے جیسے انہوں نے روبی کی کوئی بات سنی ہی نہ ہو۔ وہ مسئلہ زیادہ اہم تھا جس میں وہ الجھے کھڑے تھے۔ وہ اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔ پھر وہ مالکن کے پاس گئی، اس کے بعد اپنے بڑے صاحب کے چھوٹے بھائی کے پاس۔ مایوس ہو کر وہ رشیداں کے یہاں چلی گئی۔

''اسے ہسپتال لے جاؤ رشیداں!''

بچے کی حالت دیکھ کر خود رشیداں کو ترس آ گیا، فوراً سے چادر اٹھائی۔ بچہ لیا اور ہسپتال چلی گئی۔

اس تمام عرصے میں روبی خالی الذہنی کیفیت میں اپنے مالکوں کا کام کرتی بولائی بولائی سی پھرتی رہی۔

ننھی ننھی سی انگلیاں کتنی سرخ ہو رہی تھیں۔ چاند سے چہرے پر، گال اور ماتھے پر کیسے خراش آئی ہوئی تھی۔ اور وہ کتنا چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ وہ اسے سوچ سوچ کر بہت پریشان ہوتی رہی۔

مہندی کی رسم ادا کی جا رہی تھی۔ فارغ ہو کر وہ باہر صحن کی سیڑھیوں پر جا بیٹھی۔ نوکیا کا ٹچ بٹن موبائل ہاتھ میں تھا۔ منتظر نگاہوں سے اسکرین کو تک رہی تھی۔ بیلنس تو تھا ہی نہیں کہ کال کر لیتی۔ نہ ہی کبھی کال کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی۔ اماں ہی فون کرتی تھیں۔

یکایک موبائل بج اٹھا۔ رشیداں کی کال تھی۔

''میں پہنچ گئی ہوں گھر۔ آ جا اب۔''

وہ فوراً سے اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگی۔ عجلت میں قدم اٹھاتی دائیں طرف گلی میں مڑ گئی اور جو پہلا دروازہ نظر آیا، اسے کھول کر اندر چلی گئی۔

بالکل سامنے ہی چارپائی پر رشیداں بیٹھی تھی۔ بچہ پہلو میں ہی سویا پڑا تھا۔ کچھ بے قراری سے وہ اس پر جھکی۔ اس کا ماتھا چوما۔ اس کے ننھے سے ہاتھ کو دیکھا جس پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

ایک ہاتھ سے پنکھا جھلتے ہوئے رشیداں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''ڈاکٹرنی نے تو مجھے اچھی خاصی جھاڑ پلا دی۔ سمجھ رہی تھی، میرا بچہ ہے۔ میری لاپروائی سے ہاتھ دروازے میں آ گیا ہوگا۔ اور چوٹ صرف ایک تو نہیں تھی روبی۔''

''کل صائمہ بی بی کے بیٹے نے دھکا دیا تھا تو۔ سیڑھیوں سے گر گیا۔'' اس نے گلوگیر آواز میں بتایا

رشیداں گہری سانس لے کر رہ گئی۔

''دیکھ رشیداں۔'' سر اٹھا کر مخاطب ہوئی۔ ''یتیم بچہ کے لیے ایک ذرا سا کام ہی تو کہا ہے تجھے۔''

''تو تو ایسے کہہ رہی ہے جیسے یہ کام بہت آسان ہو۔ بھئی مجھے کیا پتا، اس کا چچا کون ہے، کہاں رہتا ہے، نہ مجھے اس کی ماں کی کوئی خبر ہے۔''

''تو اتنے سالوں سے ان کے پڑوس میں رہ رہی ہے کچھ تو پتا ہوگا تجھے۔ کچھ تو۔''

''دیکھ، مجھے بس اتنا پتا ہے وہ کوئی بڑا امیر آدمی ہے، اسلام آباد میں رہتا ہے بس۔'' رشیداں نے باقاعدہ سر پر دوپٹہ جماتے ہوئے ہاتھ کھڑا کیا۔

''تو اپنے گھر والے سے بات تو کر۔ کچھ تو پتا ہوگا اسے۔ مجھے بس فون نمبر چاہیے یا پھر گھر کا پتا۔ باقی میں سب خود دیکھ لوں گی۔''

رشیداں نے تعجب سے اس دھان پان سی لڑکی کو دیکھا۔ جس کا خود کا کوئی سہارا نہ تھا وہ لاوارثوں کی طرح پلتے اس بچے کے لیے سہارا ڈھونڈ رہی تھی۔

''کیا خبر تیری یہ نیکی اللہ کو پسند آ جائے اور وہ تیرے لیے آسانیاں کر دے۔'' وہ منت سماجت پر اتر آئی تو رشیداں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ بات کروں گی میں۔ لیکن وعدہ نہیں کر سکتی۔''

روبی نے خوش ہو کر ممنون نگاہوں سے اسے دیکھا پھر بچے کو احتیاط سے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ دوائیوں کا شاپر بھی ساتھ تھا۔

''ڈاکٹرنی کہہ رہی تھی بچہ بہت کمزور ہے، صحت کا خیال رکھو۔'' تشویش سے کہا۔

''جتنا ہو سکے، رکھتی تو ہوں۔ دودھ میں پانی ڈال کے دیتی ہوں۔ بڑی بیگم ایک ایک چیز پر نظر رکھتی ہے۔''

رشیداں کو افسوس ہوا۔

''تو میرے سے لے جائیو کچھ چاہیے ہو تو۔ ظالم لوگ۔ اللہ کے قہر سے نہیں ڈرتے۔ یتیم کے ساتھ ایسا سلوک؟''

وہ اسے سینے سے لگائے چوکھٹ عبور کر گئی۔ گھر پہنچتے ہی سیدھا اپنے کمرے میں گئی۔ بچے کو احتیاط سے سلانے کے بعد چارپائی کو کھینچ کھانچ کر کھڑکی کے پاس رکھا۔ برابر میں بیٹھ کر بہت نرمی اور افسوس سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

لانبی پلکوں پر جگہ جگہ نمی ٹھہری تھی۔ ستا ہوا گلابی چہرہ کتنا زرد ہو رہا تھا۔ ننھے ننھے سے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ وہ واقعی میں بہت کمزور لگ رہا تھا۔

"بس کچھ دن اور۔ تجھے میں یہاں تو نہیں رہنے دوں گی۔" اس کے گرد بازو ڈالے تسلی دی۔ کھڑکی کے اس پار عین سامنے شادی والا گھر روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ مہمانوں کی آمد ورفت تا حال جاری تھی۔ دروازے کے پاس ہی طارق صاحب کھڑے تھے۔ کچھ پیسوں کا حساب کتاب کرتے ہوئے۔

اللہ کے قہر کو دعوت دیتے لوگ۔ اللہ کے نام پر، صدقہ خیرات کے نام پر اچھی خاصی رقم نکالنے کا سوچ رہے تھے، تاکہ ان کی اپنی اولاد کی خوشیاں سلامت اور محفوظ رہیں۔

☆☆☆

نیم تاریکی میں آنکھوں کو چبھتی ہوئی روشنی لیپ ٹاپ اسکرین کی تھی۔ ٹائپنگ ہو رہی تھی۔ مگر ٹائپنگ کی آواز بہر حال نہیں تھی۔ اسے پیاس لگ رہی تھی۔ حلق سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔ کسی قدر کوشش سے وہ کہنی کے بل اوپر ہوئی۔ ہاتھ بڑھا کر سائڈ ٹیبل کا لیمپ آن کیا۔ پانی کا جگ یا گلاس وہاں نہیں رکھا تھا۔

"کچھ چاہیے؟" لیپ ٹاپ کشن سے ہٹا کر ایک طرف رکھتے ہوئے وہ اس کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

"پانی۔" اس کی آواز نیند سے بوجھل۔ اور آنکھیں خمار بھری تھیں۔ مدھم سی روشنی میں بھی وہ اس کے چہرے کی پژمردگی کو محسوس کر سکتا تھا۔

گزشتہ کچھ دنوں سے اس کی طبیعت خراب تھی۔ دوبار ہاسپٹل بھی لے جا چکا تھا۔ وہ میڈیسن اور ضروری سپلیمنٹس بھی لے رہی تھی مگر کبھی بخار، کبھی سر درد، اور کبھی کمزوری کے باعث طبیعت نڈھال ہوئی رہتی تھی۔

لحاف ہٹا کر ایک سائڈ پر کرتے ہوئے وہ روم فریزر کی طرف بڑھ گیا۔ پانی کی بوتل اور گلاس اٹھا کر اس کے پاس آیا تو وہ تب تک اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔ اس نے گلاس لے کر پانی پیا۔

"کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

جنت نے خالی گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اسے دیکھا۔ پچھلے تین دنوں سے وہ ایسی ہی ایک نظر اس پر ضرور ڈالتی تھی۔ شک۔ حیرت۔ اور الجھن بھری نظر۔

"میری غیر موجودگی میں تمھارے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا تھا؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں! کیوں؟" وہ اس کے سوال پر کچھ حیران ہوا۔

"تم مجھ سے پوچھتے ہو۔ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں، مطلب تم پوچھتے ہو۔" ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"نہیں پوچھنا چاہیے؟"

"پورے پانچ ماہ تک نہیں پوچھا تو اب کیوں؟"

سوال بجا تھا۔ اعتراض بھی بجا۔ وہ لاجواب ہوا۔ زیر لب کچھ بڑبڑاتے ہوئے وہ تکیے کو درست کرتی نیم دراز ہو گئی۔ فارس دوسری طرف اپنی سابقہ پوزیشن میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ لحاف ٹانگوں پر ڈالتے ہوئے کشن پر لیپ ٹاپ رکھا اور ایک بار پھر اپنا کام کرنے لگا۔

وہ اس کی جانب کروٹ بدل کر گال کے نیچے ہاتھ رکھے خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔ آنکھوں پر فریملس گلاسز تھے، پیشانی پر بال ترتیب سے بکھرے ہوئے۔ یکسوئی سے اپنا کام کرتے ہوئے وہ اطراف سے یکسر بے نیاز نظر آتا تھا۔

"جانتے ہو ڈاکٹر آمنہ مجھ سے کیا کہہ رہی تھیں؟" اس کی آواز نیند سے متاثر لگ رہی تھی۔

"کیا کہہ رہی تھیں؟" فارس نے نظروں کا زاویہ نہیں بدلا تھا۔ کی پیڈ پر انگلیاں تیزی سے متحرک تھیں۔

"آپ ٹینشن نہ لیں مسز فارس! کیا مطلب کیوں ٹینشن نہ لوں؟ یہ ڈاکٹرز اس طرح کی نصیحتیں ہمیں کیوں کرتی ہیں۔ مطلب شوہروں سے نہیں کہہ سکتیں، اپنی بیویوں کو ٹینشن نہ دو۔" دھیما سا لہجہ۔ کچھ نرم۔ کچھ خفگی بھرا۔

مسز فارس! اس کی باتیں۔ اس کا غصہ، لہجہ، انداز۔ وہ ایسے ہی لڑنے کے چکروں میں اس کے دل کے تار چھیڑ گئی تھی۔

فارس نے بے ساختہ لیپ ٹاپ سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔ اسے لگا کہ وہ اپنا فوکس اپنے کام پر نہیں جما سکے گا۔

دھیمی سی زرکار روشنی میں جنت کا مومی چہرہ نمایاں تھا۔ سرخ آنکھوں میں خفگی ٹھہری ہوئی تھی۔ پیشانی پر ڈھیر سارے بل تھے۔ ایک لمحے کے لیے اگر اس کے تاثرات نرم ہوتے تھے تو دوسرے پل وہ شدید غصے میں نظر آتی تھی۔

"اچھا بتاؤ، کیا ٹینشن ہے تمہیں؟" اس کا یہ انداز، لہجہ، رویہ جنت کے لیے قطعی نیا تھا۔ وہ لمحے بھر کے لیے حیران، پھر دوسرے پل کچھ پریشان، اور تیسرے سیکنڈ میں صدمے سے باہر آ گئی۔

"تم ہی تو میری سب سے بڑی ٹینشن ہو۔" بھنا کر کہہ دیا۔ گزشتہ تین دنوں سے وہ جس طرح اس کا خیال رکھ رہا تھا تو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے خاموش رہنا پڑا تھا۔ وہ اسے غصہ، ناراضی، خفگی۔ کچھ بھی نہیں دکھا سکی تھی۔ بس خاموش رہی تھی۔ اب مزید خاموش نہیں رہ سکتی تھی۔

"میں نے کہا تھا مجھے تمھارے ساتھ کمرہ شیئر نہیں کرنا۔ اور دیکھو مجھے بیڈ تک شیئر کرنا پڑ رہا ہے۔ اور آنٹی سے تم کیا کہتے ہو؟ شی از فری ٹو ڈو واٹ ایور شی وانٹس! (یہ اپنی مرضی سے کچھ بھی کرنے میں آزاد ہے)" باقاعدہ چہرے کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ اس نے فارس کی نقل اتاری۔ اس نے اپنے لبوں پر امڈتی مسکراہٹ کو دبا لیا۔

"تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو اس لیے۔"

"اس لیے کیا؟" کہنی کے بل اوپر ہو کر اس نے فارس کو مشکوک نظروں سے گھورا۔ "پہلی بار تو خراب نہیں ہوئی۔ اور یاد ہے تم نے ایک بار مجھے ہاتھ سے پکڑ کر بیڈ سے اتارا تھا۔ سونا ہے تو صوفے پر سو جاؤ ورنہ اس کمرے سے دفع ہو جاؤ۔" آواز بھاری کر کے، چہرے کے تاثرات سخت کر کے اس کی نقل بہت خوب صورتی سے اتاری تھی۔ وہ محض گلا کھنکھار کر رہ گیا۔

"اس دن بھی میری طبیعت خراب تھی۔ سر میں درد تھا۔ ہاتھ پاؤں دکھ رہے تھے۔ اس دن تو تم نے میری کوئی تیمارداری نہیں کی تھی۔"

فارس کو اندر ہی اندر اپنی اس حرکت پر بہت افسوس ہوا۔

"ہاں لیکن جب تم لاہور سے آئی تھیں، تب کی تھی۔"

وہ جو کچھ کہنے کے لیے منہ کھول ہی رہی تھی لب بھینچ کر رہ گئی۔

"اس لیے کی تھی تاکہ مجھے جتا سکو؟"

"میرا مطلب یہ نہیں تھا۔"

"تو کیا مطلب تھا تمھارا؟"

کیا اس کا لڑائی کا موڈ ہو رہا ہے!؟ فارس نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"تم مان کیوں نہیں لیتے کہ مجھے تمھاری مرضی کے مطابق جینا پڑ رہا ہے۔ پہلے بھی۔ اور اب بھی؟"

قطرہ قطرہ لفظوں کا تیزاب۔ فارس کو اندر ہی اندر جھلسانے لگا۔ بظاہر وہ عام سے لہجے میں بغیر کسی دکھ کا اظہار کیے بات کرتی تھی مگر وہ۔ اس کا غم۔ اس کا درد۔ بہت اندر سے محسوس کرنے لگتا تھا۔

"تمھارے دماغ میں اب کیا چل رہا ہے؟" اس کی خاموشی سے عاجز آ کر وہ بہت سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

"تم خود کو پریشان کر رہی ہو۔" اس نے کہا۔

"پریشان تم مجھے کر رہے ہو۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر بولی۔ "میں کیسے مان لوں، تم اب کوئی چال نہیں چل رہے؟ یا اب تمھارا کوئی پلان نہیں ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس طرح رویہ بدل کر تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔" اس نے واضح کہہ دیا۔

فارس چند لمحوں تک اسے خاموش نظروں سے دیکھتا رہا۔

"عدیل احمد کل تمھیں کیٹلاگ دے جائے گا۔ فرنیچر پسند کر لینا۔ ایک دو دن میں کمرہ فرنشڈ ہو جائے تو پھر تم نیچے شفٹ ہو سکتی ہو۔" اس کا لہجہ سخت نہیں تھا، نہ ہی لفظوں میں نفرت کی کاٹ تھی۔

"ہاں تم تو یہی چاہو گے۔ تم تو پہلے بھی یہی چاہتے تھے کہ میں اس کمرے سے نکل جاؤں۔"

وہ کچھ حیرت سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"میں تو بس اس لیے کہہ رہا تھا کیونکہ تمھیں الگ کمرہ چاہیے۔"

"ہاں چاہیے۔ بالکل چاہیے۔ جب تک میں یہاں ہوں۔ مجھے الگ کمرہ ہی چاہیے۔ تمھارے ساتھ رہ رہ کر مجھے پاگل نہیں ہونا۔" سرد لہجے میں کہہ کر کہیں اور دیکھنے لگی۔ وہ چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہا۔

"چلو، تمھاری ایک ٹینشن تو کم ہوئی۔" مسکراہٹ دبا کر کہا۔

"ٹینشن کم نہیں کرنی مجھے۔ ختم کرنی ہے۔"

وہ اس کی دیدہ دلیری پر حیران ہوئے بنا نہ رہ سکا۔

"اب میں خود کو اس لیے تو ختم نہیں کر سکتا کہ میں ایک ٹینشن ہوں۔ لیکن۔ کوشش کر کے خود کو تھوڑا سا بدل سکتا ہوں۔ ٹینشن کی جگہ کچھ اور ہو سکتا ہوں۔" اس کا لہجہ خالص دوستانہ تھا۔

گردن موڑ کر وہ کچھ صدمے سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ کہاں وہ ذرا ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتا تھا اور کہاں اب اسے کسی بھی بات پر غصہ نہیں آ رہا تھا۔

"مجھے پورا یقین ہے، تمھارے سر پر کوئی چوٹ لگی ہے۔"

"ہاں چوٹ تو لگی ہے۔ لیکن سر پر نہیں۔" اس کا معنی خیز جملہ جنت کے سر پر سے گزر گیا۔ وہ اس کے پرسکون رویے پر تپ گئی۔ اس کی مسکراہٹ سے چڑ گئی۔

پھر گہری سانس لے کر اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

وہ سینے پر بازو باندھے چہرے کا رخ موڑے اسے سنجیدگی سے دیکھ رہا تھا۔ لیپ ٹاپ کی روشنی اس کے نفیس گلاسز پر منعکس ہوتی سبزی مائل لہروں کا تاثر دے رہی تھی۔ گلاسز میں اچھا لگ رہا تھا وہ۔ فوراً سے نظر ہٹا کر دل کو جھڑک دیا۔ کہ گلاسز کے ساتھ اچھا لگے یا برا۔ اسے کیا؟

"مت بھولنا کہ میں یہاں آنٹی کی وجہ سے صرف ڈیلیوری تک ہوں۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔" اپنے اندر بہت سارا خوف اور ڈھیر سارا غصہ لیے پچھلے تین دنوں میں یہ بات کئی بار دہرا چکی تھی۔

"تم جانتی ہو، میں ممی کی کوئی بات نہیں ٹالتا۔" وہ بس اس ایک جملے سے ہی اس کے خدشات رفع کر سکتا تھا۔

"اسی بات کی تسلی ہے، ورنہ تم پر مجھے چیونٹی جتنا بھی بھروسا نہیں۔" کہہ کر کروٹ بدل گئی۔ فارس نے کچھ نہ کہا۔

جنت نے گہری سانس لے کر آنکھیں موند لیں۔عدینہ زبیر کا تصور ایک طرف۔مسز شیرازی کی ہدایتیں اور نصیحتیں دوسری طرف۔اور آنے والے وقت اور فارس کی ٹینشن تیسری طرف۔اتنا تو وہ بھی جانتی تھی فارس مسز شیرازی کی کوئی بات نہیں ٹالتا تھا۔یقیناً انہوں نے ہی اسے خیال رکھنے کا کہا ہوگا۔اب بات بچے کی تھی تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی لہجے اور رویے میں بدلاؤ لے آیا ہو گا۔اپنی اولاد کے لیے انسان اتنا تو کرتا ہی ہے۔ہاں اتنا تو کرتا ہی ہے۔

''ایک سوال پوچھوں تم سے؟''

''ہوں۔'' نگاہیں اسکرین پر مرکوز تھیں۔وہ کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔جنت نے اس کی طرف کروٹ بدلی۔

''عدینہ زبیر نے تم سے طلاق کیوں لی؟''

فارس کی انگلیوں کی حرکت تھمی۔سانس ٹھہر گیا۔وہ سوال۔صرف سوال نہیں تھا۔مدھم روشنیوں کا فانوس گویا چھنا کے سے ٹوٹ کر اس کے حواسوں پر گرا۔اس کے تاثرات بدل گئے۔نرمی مفقود ہوگئی۔گردن موڑ کر اس نے جنت کو دیکھا۔

تکیے پر سر رکھے،لحاف کو ہونٹوں تک کھینچے وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔بظاہر لہجے میں کوئی چبھن نہیں تھی۔نہ ہی آنکھوں میں درد یا تجسس نظر آ رہا تھا۔مگر وہ سوال۔وہ عام سا سوال نہیں تھا۔اتنا خفیف بھی نہیں کہ پوچھنے والے پر بھی اثر انداز نہ ہوتا۔

''رات کافی ہو چکی ہے۔اب سونا چاہیے۔'' اس نے لیپ ٹاپ بند کر کے اٹھنا چاہا۔

''اس نے تمہیں چھوڑا اور تم اسے پھر بھی اپنانا چاہتے ہو۔کیوں؟'' وہ سراپا سوال بنی پوچھ رہی تھی۔لہجہ غصے سے عاری تھا۔نہ سختی تھی۔نہ خفگی۔

فارس نے بہت نرمی سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔''تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے،تمہیں اب آرام کرنا چاہیے۔''

''تم نے میرے موبائل سے ساری تصویریں ڈیلیٹ کر دیں۔یہ سمجھ کر اس طرح میری یادداشت سے بھی سب مٹ جائے گا؟'' وہ اس کی نہیں سن رہی تھی۔وہ صرف اپنی کہہ رہی تھی۔

وہ رک کر اسے دیکھنے لگا

جنت کی سرد آنکھوں میں نمی تیر گئی۔چہرہ پوشیدہ تھا مگر اذیتیں تو پھر بھی آنکھوں سے جھلکتی ہیں۔''میں نے دیکھا ہے تم اس کے ساتھ کتنا خوش تھے۔'' اس نے کہا۔

وہ موت جیسے سناٹے کی زد میں آیا تھا۔اسے اندازہ نہیں تھا،وہ ایسی بات کرے گی۔ایسا سوال۔ایسا استفسار کرے گی۔

''میں......میں اس پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔'' کس قدر کوشش سے اس نے کہا۔

''میں بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔مگر تم ہر بار ہمیشہ میری پہلی شادی کو بیچ میں لے آتے تھے۔'' جنت کا لہجہ اب کے ذرا سا تلخ ہوا

تھا۔

''میں غلط کرتا رہا۔تو کیا یہ ضروری ہے تم بھی وہی غلطی دہراؤ؟''

غلطی کا اعتراف!ہاں یہ غلطی کا اعتراف تھا۔

کچھ تو تھا اس کے لہجے میں،اس کی آواز اور آنکھوں میں۔بظاہر سنجیدہ سپاٹ چہرہ۔دکھ و غم سے مکمل عاری۔مگر کچھ تو تھا۔کچھ تو تھا۔

''میں ذکر نہیں کروں گی تو تمہیں میری تکلیف کا اندازہ کیسے ہوگا؟'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔''یہ کیسے پتا چلے گا کہ جب کسی لڑکی کی دوسری شادی ہوتی ہے تو وہ اپنی پہلی شادی کا ذکر کسی صورت نہیں سننا چاہتی۔''

''تم ذکر نہ بھی کرو تو مجھے اندازہ ہے تم کس تکلیف سے گزر رہی ہو۔''

جنت اپنی جگہ تھم گئی۔آنکھوں میں کرب اتر آیا۔دل غم سے بھر گیا۔

''تمہیں اندازہ ہے؟ وہ بھی میری تکلیف کا؟ صرف اس لیے کہ میں تم سے۔تمھاری پہلی بیوی کی بات کر رہی ہوں۔تم مجھے اس طرح کے جواب دے رہے ہو۔'' اس کا غصہ بڑھنے لگا تھا۔برداشت ختم ہو رہی تھی۔

''ایکس وائف!'' فارس نے تصحیح کی۔''اور میں چاہتا ہوں،تم اس کے بارے میں مجھ سے کوئی بات مت کرو۔'' اس نے سنجیدگی سے منع کیا۔لہجہ ابھی بھی سخت نہیں تھا۔وہ جیسے نارمل لہجے میں بہت نارمل سی بات کر رہا تھا مگر اس کے اندر۔

''کیوں بات نہ کروں؟'' وہ اٹھ کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔''وہ میرے سامنے آسکتی ہے؟ مجھ سے بات کر سکتی ہے؟ اپنی محبت اور تمھاری دیوانگی کی داستان بھی سنا سکتی ہے لیکن میں۔تم سے اس کے بارے میں کوئی بات نہ کروں؟'' آنکھوں میں غیض وغضب کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔لہجہ غصیلا۔آواز پتھریلی۔آج سے پہلے وہ اتنے غصے میں اسے کبھی نظر نہیں آئی تھی۔

''تم مجھ سے میرے ماضی کے بارے میں سوال کر سکتے ہو،میری سابقہ شادی کا مذاق اڑا سکتے ہو۔میرے کردار پر بات کر سکتے ہو۔لیکن میں تم سے تمھاری زندگی کے بارے میں ایک چھوٹا سا سوال بھی نہیں پوچھ سکتی۔'' وہ اذیت سے ہنسی۔آنکھیں تر ہو چکی تھیں۔مگر فارس۔وہ خاموش تھا۔وہ بالکل خاموش تھا۔اس کے لب باہم پیوست تھے۔اس کی آنکھوں میں ویرانی اتری ہوئی تھی۔اس کا چہرہ تاثرات سے عاری ہو چکا تھا۔وہ اتنا بول گئی تھی۔اتنا کہہ گئی تھی اور وہ پھر بھی خاموش تھا۔

وہ سر اٹھائے کھڑی تھی۔اور وہ سر جھکائے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

یکا یک جنت کو احساس ہوا اس نے عدینہ زبیر کا ذکر چھیڑ کر اپنی پوزیشن کمزور کر لی ہے۔اپنا خوف،اپنے خدشات فارس وجدان پر عیاں کر دیے ہیں۔اس نے پردہ ہٹا دیا ہے۔اس نے تاریکی بڑھا دی ہے۔

''میں اس لیے نہیں پوچھ رہی تھی کہ مجھے تمھاری زندگی میں کوئی انٹرسٹ ہے۔'' اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے اس نے آواز کو حتی الامکان مضبوط کرلیا۔ وہ جو نمی سی آنکھوں میں ابھری تھی اسے چھپالیا۔ وہ جو خوف سا ظاہر ہوا تھا لہجے سے، باتوں سے۔ اسے دبالیا۔

''مجھے تم سے کوئی مطلب نہیں۔ پہلے بھی کہہ چکی ہوں۔ اب دوبارہ کہہ رہی ہوں۔ بھلے سے کسی بھی عدینہ پودینا کو اپنی زندگی میں لے آؤ آئی ریئلی ڈونٹ کیئر! لیکن میں جب تک یہاں ہوں، ایک ہی گھر میں اس کے ساتھ نہیں رہوں گی۔ اینڈ آف ڈسکشن۔''

اپنی بات ختم کر کے وہ بیڈ پر جا لیٹی تھی۔ لحاف اس نے سر تک تان لیا تھا۔ اب خاموشی سے سانسوں کو گن رہی تھی۔ اپنی دھڑکنوں کو سن رہی تھی۔ دل رو رہا تھا۔ دل تڑپ رہا تھا۔

موت کی سی خاموشی میں اسے دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز آئی۔ کمرے میں اب اس کے سوا کوئی نہ تھا۔

اس کی دھیمی دھیمی سسکیاں گونجنے لگیں۔ جانے اس نے صحیح کیا تھا یا غلط۔ مگر اب وہ رو رہی تھی۔

☆☆☆

صبح اس کی آنکھ کھلی تو اس وقت دس بج رہے تھے۔ پہلے پہل دھند میں لپٹا ذہن ماؤف رہا۔ پھر خیال ابھرے، باتیں یاد آئیں، اپنی بحث، سوال اور فارس کا رویہ یاد آیا۔ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگالی۔

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا فارس ٹائی کی ناٹ باندھ رہا تھا۔ چہرے کے تاثرات نارمل تھے۔

وہ اس کی تیاری دیکھ کر کچھ حیران ہوئی کہ آج اس کا آف تھا۔ مگر ''اپنے کام سے کام رکھو'' اصول کے تحت اس سے پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔

''کیسی طبیعت ہے؟'' معمول کی طرح وہ آج بھی پوچھ رہا تھا۔ نہ لہجہ سرد تھا، نہ تاثرات میں سختی تھی۔

وہ روز جواب دیتی تھی، آج خاموش رہی۔

ٹائی کی ناٹ باندھنے کے بعد اس نے پرفیوم چھڑکا۔ پھر سامنے صوفے پر بیٹھ کر جوتے پہننے لگا۔

''ضروری کام سے چند دنوں کے لیے جرمنی جارہا ہوں۔''

''مجھے کیوں بتا رہے ہو؟'' اس کا وہی خفا خفا کھڑا لہجہ۔ حالانکہ اعتراض اس پر کرنا تھا کہ اب کیوں بتا رہے ہو؟

''نہیں بتا سکتا؟'' اس نے سوالیہ ابرو اچکائی۔

''پہلے نہیں بتاتے تھے تو اب کیوں بتا رہے ہو؟'' اب کے رخ بدل کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''پہنچ کر کال کروں گا۔'' وہ اس کا سوال نظرانداز کیے اپنی کہے گیا۔

''میں ریسیو نہیں کروں گی۔'' واضح کہہ دیا۔ وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی تو اس کی مسکراہٹ بھی نہیں دیکھ سکی تھی۔

''میں میسج کروں گا۔''

''میں نہیں پڑھوں گی۔'' چہرے کا رخ مشرق کی طرف تھا۔ اسے فارس کی باتوں پر اب غصہ آرہا تھا۔ وہ ایسا کیسے ظاہر کرسکتا ہے جیسے کل رات ان کے مابین کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ کوئی لڑائی یا بحث نہیں ہوئی تھی۔

''ریکارڈنگ بھیجوں گا۔''

''میں تمہیں بلاک کردوں گی۔'' واضح دھمکی۔

''اوہ تم تو بالکل ٹھیک ہو۔ میں ایسے ہی فکرمند ہو رہا تھا۔'' وہ مسکرایا۔

وہ اچھا خاصا تپ گئی مگر تحمل سے بیٹھی رہی۔

وہ چند لمحوں تک اسے مسکراتی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

''اپنا خیال رکھنا۔''

''یہ بات میں تم سے نہیں کہوں گی۔''

''خود کو بیوہ ہونے سے بچانے کے لیے بھی نہیں؟''

''کیا مصیبت ہے۔'' وہ بے طرح سے چڑ کر جھنجھلائی اور اٹھنے کا ارادہ ترک کر کے دوبارہ لحاف میں گھس گئی۔

اور وہ کھڑا رہا۔ متبسم نگاہوں سے اسے تکتے ہوئے۔ اس کی موجودگی کو اپنے آس پاس زندگی کی طرح محسوس کرتے ہوئے۔ پل بھر میں کتنے مناظر تھے جو آنکھوں میں سمائے تھے۔ اس کا سی آف کرنے کے لیے اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے گاڑی تک جانا۔ دروازہ کھولنا۔ بے تکی سی بات پر بحث شروع کر دینا۔ اور پھر ہنستے رہنا۔ دھڑا دھڑ میسج۔ بہت سے سوالات۔ اس نے کچھ اذیت سے خیالات کو جھٹک دیا۔

''اللہ حافظ۔'' اس نے کہا۔ جنت کے وجود میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ کچھ دیر بعد قدموں کی آہٹ کے ساتھ دروازہ بند ہوگیا۔

سکھ بھری سانس لے کر لحاف ہٹایا۔ کچھ دیر تک اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ پھر اٹھ کر بالکنی میں جا کھڑی ہوئی۔ اسے فارس وجدان گارڈ کے ہمراہ اپنی گاڑی کی طرف جاتا ہوا نظر آیا۔

کسی احساس کے تحت وہ رک کر مڑا۔ جنت تیزی سے پلر کی اوٹ میں ہوگئی۔ دیکھے بنا ہی جان گئی تھی وہ اسی طرف ہی دیکھ رہا ہوگا۔

کچھ ہی دیر بعد گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔اس نے سر نکال کر ایک بار پھر دیکھا۔

عقبی نشست کا شیشہ نیچے ہوا تھا۔گھڑی کے چمکتے ڈائل والا ہاتھ باہر نکلا۔فارس نے ہاتھ ہلایا۔

اس نے گڑبڑا کر اپنا سر اندر کر لیا۔

پتا نہیں وہ اس کی ہر حرکت کا کیسے اندازہ لگا لیتا تھا؟ ہڑبڑا کر واش روم میں گھس گئی تھی۔

☆☆☆

وہ ناراض تھی۔اس کا موڈ بالکل بھی ٹھیک نہیں تھا۔کبھی خود پر غصہ آ رہا تھا اور کبھی فارس پر۔کبھی اپنی سوچ الجھانے لگتی تھی اور کبھی فارس کا رویہ سلگانے لگتا تھا۔ناشتے کے بعد لان میں ٹہلتے ہوئے وہ حتی الامکان پرسکون ہونے کی کوشش کرتی رہی اور اس کوشش میں بری طرح سے ناکام ہوتی رہی۔

اس پر نظر جمائے اقصیٰ نے کوئی ساتویں بار ٹھنڈی آہ بھر کر اپنے کمرے کی کھڑکی سے سر اندر کیا تھا۔دو بار معذرت کے لیے جا چکی تھی۔تین بار آئی ایم سوری والے کارڈ لکھ کر بھیجے تھے۔چار بار دور سے کان پکڑ کر بھی دکھایا تھا مگر اس کی آپی۔وہ تو کچھ ماننے کو تیار ہی نہیں تھی۔

ایک لمبی سی ٹھنڈی آہ بھر کر اپنا سر تکیے پر رکھا اور بڑی بوڑھیوں کی طرح ٹھنڈی آہیں بھرنے لگی۔

اور تب ہی اسے گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔گیٹ کھلنے کے ساتھ ہی گاڑی اندر داخل ہوئی۔جھٹ سے اٹھ کر کھڑکی میں آئی۔

پورچ میں سفید یارِیس کھڑی تھی۔عدیل احمد باہر نکل آیا تھا۔

''اللہ! یہ کیا کر رہا ہے یہاں۔''

گلاسز ہٹا کر موصوف نے سیدھا کوارٹرز کی طرف دیکھا تھا۔وہ جھٹ سے پردے کی اوٹ میں ہو گئی تھی۔دوبارہ محتاط ہو کر سر نکالا تو وہ لان سے ہوتے ہوئے صدر دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ہاتھ میں شاید کوئی فائل تھی۔

اس نے گہری سانس لے کر فوراً آئینہ دیکھا۔چہرہ بالکل صاف اور نکھرا نکھرا سا تھا مگر اسے اپنی اس رات والی شکل ہی نظر آ رہی تھی۔اور یہ آج نہیں ایک ہفتے سے ہو رہا تھا۔

''چلو اچھا ہوا جنت آپی خفا ہیں۔اس طرح مجھے اس کے سامنے تو نہیں جانا پڑے گا۔'' اسے تسلی ہوئی۔

کیسے ہنس رہا تھا اس دن۔عدیل احمد کا چہرہ یاد آیا تو اپنا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا۔عین اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔

جا کر کھولا تو سامنے ملازمہ کھڑی تھی۔

''آپ کو چھوٹی صاحبہ بلا رہی ہیں۔''

''ک۔۔۔۔کون چھوٹی بیگم صاحبہ!'' اس کی ہوائیاں اڑ گئیں

ملازمہ نے اسے ایسے دیکھا جیسے اس کی عقل پر شک گزرا ہو۔

''جنت صاحبہ۔''

وہ گھبرا گئی۔''مجھے!؟'' انگلی سے اپنی طرف اشارہ کیا۔

''جی ہاں آپ کو۔''

وہ پیغام دے کر چلتی بنی اور اقصیٰ کی تو سچ مچ میں جان پر بن گئی۔

''وہ تو ناراض ہیں مجھ سے۔کیوں بلا رہی ہیں آخر۔'' اسے رونا آیا۔ایک بار پھر آئینہ دیکھ کر تسلی کی کہ کہیں ''لائنر وائنر، مسکارا شسکارا'' وغیرہ کے نشان تو نہیں۔پھر اپنے تاثرات پر قابو پاتی وجدان ہاؤس کی طرف بڑھ گئی۔

مرکزی دروازے سے لاؤنج تک وہ کیسے گئی یہ صرف وہ ہی جانتی تھی۔

''آپ نے مجھے بلایا؟'' پورے اعتماد کے ساتھ جنت کے پاس مؤدب سی جا کھڑی ہوئی۔سامنے عدیل احمد براجمان تھا۔

ملازمہ اسے مشروب پیش کر رہی تھی۔اقصیٰ نے بھولے سے بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔

''تم میری منیجر ہو؟'' جنت حیران تھی۔عدیل مسکراہٹ دبا گیا۔

اقصیٰ کی شکل دیکھنے لائق تھی۔چونکہ رخ جنت کی طرف تھا تو آنکھوں ہی آنکھوں میں اور زبان ہلا کر اسے اشارے دیے کہ اور کچھ نہ کہیں۔اس چائنیز عدیل کے سامنے تو بالکل نہیں کہ مزید بے عزتی وہ افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔

''اقصیٰ۔''

''جی آپی وہ۔۔۔۔میں۔۔۔۔'' گھبرا کر دوپٹے کا پلو انگلیوں میں گھمایا۔اے سی کی ٹھنڈک میں پیشانی پسینے سے تر بتر، ہوش اڑے ہوئے۔جنت نے گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔حالانکہ بلایا تو اس لیے تھا کہ اس کی کلاس لی جا سکے مگر۔۔۔۔۔

''جیسا کہ مسٹر عدیل! آپ جانتے ہیں، میں اپنی منیجر کے بغیر کوئی کام سرانجام نہیں دیتی۔''

اقصیٰ کی جان میں جان آ گئی۔ممنون ہوتی نگاہوں سے اپنی مالکن ٹائپ آپی کو دیکھا۔عدیل ہنوز مبہم سی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلا کر رہ گیا۔

''بیٹھو۔'' آنکھوں سے اشارہ دیا تو وہ جنت کے برابر میں ٹک گئی۔کیٹلاگ تھمایا۔صفحے پلٹے۔کیا شاندار فرنیچر کی تصاویر تھیں۔اقصیٰ کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''آپ دیکھ کر مجھے میسج کر دیجیے گا۔'' عدیل احمد اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا۔''اب اجازت چاہتا ہوں۔'' کوٹ کے بٹن بند کرتے

ہوئے کہا۔''لیکن اس سے پہلے۔کیا میں مسز شیرازی سے مل سکتا ہوں؟''

''شیور! میں بلا کر لاتی ہوں۔'' جنت اٹھ کر چلی گئی۔عدیل نے اقصیٰ کی طرف دیکھا جو کیٹلاگ پر نظریں گاڑے یوں بیٹھی ہوئی تھی جیسے دنیا کا کوئی مشکل ترین کام اس کے حوالے کر دیا گیا ہو اور جسے سرانجام دیے بغیر دنیا نے ختم ہو جانا ہو۔

''کیسی ہیں آپ؟''

سنی ان سنی کیے خاموش رہی۔

''اس کے ساتھ میک اپ پمفلٹ بھی ہے۔'' عدیل نے فرنیچر کیٹلاگ کی طرف اشارہ کیا۔''یہ برانڈ واٹر پروف میک اپ مہیا کرتی ہے۔تھوڑا مہنگا ہو سکتا ہے۔بٹ اٹس ورتھ اٹ! میری کزن یہی استعمال کرتی ہے۔''

اور اقصیٰ کا جی چاہا، زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

''آپ اپنے مشورے اپنے پاس رکھیں۔'' سر اٹھا کر کہا۔مگر جس طرح اس نے اپنی مسکراہٹ ضبط کی، اسے احساس ہوا وہ ابھی بھی اس کا وہی چہرہ دیکھ رہا ہے۔

اللہ کرے اس کا پاؤں پھسلے، کیچڑ میں گرے، سیڑھیوں سے لڑھکے۔آفس کے پورے اسٹاف کے سامنے۔تپ کر سوچا۔

''آپ ان سے مل سکتے ہیں۔'' جنت نے آکر کہا تو وہ اٹھ کر مسز شیرازی کے اسٹوڈیو میں چلا گیا۔

اقصیٰ نے میک اپ ایڈ کے صفحے نکالے۔چھوٹی سے چھوٹی چیز کی قیمت بھی کوئی ہزار دو ہزار کے قریب تھی۔اپنے چند ایک طبق روشن کروا کر اس نے پمفلٹ بند کیا۔

''میں نے کون سا اب کبھی میک اپ کرنا ہے۔'' پمفلٹ تروڑ مروڑ کر اکٹھا کیا۔''نیچرل لک ہونا چاہیے بس۔'' داہنے ہاتھ سے بالوں کو جھٹک کر اٹھ گئی۔

☆☆☆

مسز شیرازی کی مدد سے اپنی پسند کا فرنیچر منتخب کر کے عدیل احمد کو میسیج بھیجنے کے بعد جب فارغ ہوئی تو فارس کا میسیج آ گیا۔نوٹیفکیشن ریکارڈنگ کی تھی۔وہ بدمزہ ہوئی کہ اگر وہ میسیج لکھ کر بھیجتا تو ٹک بلیو آف کر کے وہ آرام سے مسیج پڑھ سکتی تھی مگر یہاں تو پیغام جاننے کے لیے ریکارڈنگ سننا ضروری ہو گیا تھا۔اور ریکارڈنگ تو ہر حال میں اشارہ دیتی ہے کہ اسے سن لیا گیا ہے۔

موبائل سائڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ میگزین کی ورق گردانی کرنی لگی۔اسے فارس وجدان کو بالکل اسی طرح سے نظر انداز کرنا تھا جیسے وہ کرتا تھا۔

مگر یہ سسپنس کہ اس نے کیا کہا ہوگا، یہ اسے کوئی بھی کام نہیں کرنے دے رہا تھا؟ فیشن میگزین کی رنگ برنگی تصاویر سے اس

کی دلچسپی ختم ہوگئی۔میگزین رکھ کر موبائل اٹھا لیا۔

اس کا ایک واٹس ایپ گروپ تھا۔جس کی بس وہی اکلوتی ممبر، اور اکلوتی ایڈمن تھی۔فارس کی ریکارڈنگ پلے کیے بغیر اسی گروپ میں شیئر کی۔پھر تسلی کر کے سننا شروع کیا۔

''جانتا ہوں تم مجھے سن رہی ہو۔یہ ٹرک مجھے بھی آتی ہے۔''

گڑبڑا کر موبائل بند کر کے پرے رکھا جیسے وہ ابھی کے ابھی موبائل سے نکل آئے گا۔

''مصیبت!'' بڑبڑا کر اٹھ گئی۔موبائل اس نے کمرے میں ہی چھوڑ دیا۔

رات گئے تک فارس کے کئی میسیجز، کئی ریکارڈنگز اور کئی تصاویر موصول ہوتی رہیں۔مگر اس نے اس کا ہر مسیج ان دیکھا رہنے دیا۔بالکل ویسے ہی جیسے وہ ان دیکھی رہ جاتی تھی۔

☆☆☆

دیوار گیر کھڑکیوں کے سامنے وہ صوفے پر آلتی پالتی مارے بیٹھی ہوئی تھی۔کچھ کاغذات ٹیبل پر بکھرے تھے اور کچھ اس کے برابر میں صوفے پر رکھے تھے، چند ایک ہاتھوں میں تھے جنہیں وہ یکسوئی سے پڑھ رہی تھی۔ہر تھوڑی دیر بعد اس کی آنکھوں کا تاثر بدل سا جاتا تھا۔نمی ٹھہر جاتی تھی، دل تھم جاتا تھا۔وہ ایک ایک لفظ۔ایک امید، ایک تسلی۔ایک پیغام سمجھ کر پڑھ رہی تھی

اس نے سر اٹھا کر مسز شیرازی کو دیکھا۔وہ کینوس کی طرف متوجہ تھیں مگر گاہے بگاہے اسے بھی دیکھ لیتی تھیں۔اس کے تاثرات انہیں ایک الوہی سی خوشی دیتے تھے۔جیسے وہ کچھ سمجھ رہی ہے۔بدل رہی ہے۔

''آپ اس طرح آیات کو کیسے سمجھ لیتی ہیں؟'' وہ کہے بنا نہ رہ سکی۔

وہیل چیئر کو حرکت دیتے ہوئے وہ کچھ آگے ہوئیں۔اس کے قریب۔پھر ہاتھ بڑھا کر کچھ صفحات اٹھا لیے۔لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوگئی۔

جو صفحہ ہاتھ میں تھا وہ مکمل زرد رنگ کا تھا۔زرد رنگ کے صفحے پر وہ ہمیشہ آیات لکھا کرتی تھیں۔گلابی صفحات پر ان کا ریسرچ ورک ہوتا تھا۔ہلکے سبزی مائل صفحے پر ٹو دی پوائنٹ وہ بات جو تحقیق کا حاصل ہوتی تھی۔اور پھر یہ صفحات فائل میں ایک ترتیب سے لگے رہتے تھے۔

''تمہارے خیال سے ایک عورت کے لیے سب سے بڑی دو آزمائشیں کون سی ہو سکتی ہیں؟''

ان کا سوال سن کر اس کی نظریں بے ساختہ اس زرد صفحے کی طرف اٹھ گئیں جو انہوں نے اس کی جانب بڑھایا تھا۔اس نے صفحہ تھام لیا۔

مسز شیرازی نے یہ کیا پوچھا تھا؟ وہ کیا لکھ رہی تھیں جسے انہوں نے ادھورا چھوڑ دیا تھا؟ کیا سمجھ رہی تھیں جو آنکھیں اتنی نم اور دل اتنا بھر گیا تھا۔

صفحے پر دو آیات لکھی تھیں۔ ایک آیت ام موسیٰ کی تھی جب انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو سمندر کے حوالے کیا تھا۔ دوسری آیت مریم علیہ السلام کی تھی جب انہیں حمل ٹھہرا تھا۔ دونوں کو ''لاتحزنی'' (غم نہ کرو) کہا گیا تھا۔ اور دونوں ہی اس وقت تکلیف کی انتہا سے گزر رہی تھیں۔

''کردار کی پاکیزگی۔ اور اولاد کا غم۔'' ذہن نے فوراً ہی کام کیا تھا۔ اس نے بے ساختہ سر اٹھایا۔

''بس اللہ کا یہی پیغام ڈھونڈ رہی تھی میں۔ لاتحزنی (غم نہ کرو)......وہ جانتا ہے ایک عورت کا دل کتنا کمزور ہے، خصوصاً ایک ماں کس تکلیف سے گزرتی ہے۔ کس درد کو سہتی ہے۔ اس کے سوا اور کوئی جان ہی کیسے سکتا ہے۔''

وہ کہہ کر خاموش ہوگئیں اور جنت ترحم بھری نگاہوں سے انہیں دیکھ کر رہ گئی۔ جوان اولاد کی موت کا غم سہتی ہوئی ماں۔ اسے مسز شیرازی کے بیٹے اور پھر یتیم پوتے کا خیال آیا۔ بے اختیار دل میں کرب گھل گیا۔

وہ ماں بیٹے کے اس معاملے میں بالکل نہیں آنا چاہتی تھی مگر۔

''آپ فارس سے بات کیوں نہیں کرتیں۔''

''کس بارے میں؟''

''اپنے پوتے کے بارے میں۔''

مسز شیرازی نے رک کر اسے دیکھا۔ ''یہ بات اس سے کرنے والی نہیں ہے بیٹا۔''

وہ بے بسی سے مسز شیرازی کو دیکھ کر رہ گئی۔ وہ ایسا کیسے کہہ سکتی تھیں۔ اس طرح فارس کو لاتعلق کیسے سمجھ سکتی تھیں۔

''وہ اس کا چچا ہے آنٹی! باپ کی جگہ ہے۔''

مسز شیرازی نظریں جھکا گئیں۔

''وہ آپ سے اتنی محبت کرتا ہے، آپ کوئی بھی کہا نہیں ٹالتا۔ تو پھر کیسے۔ وہ کیسے۔'' وہ اٹک گئی۔ یہ معاملہ اس کا نہیں تھا۔ یہ بحث اس کی نہیں تھی۔ مسز شیرازی نظر جھکائے بالکل خاموش بیٹھی رہیں۔ وہ ہمیشہ ایسے ہی اپنے درد، اپنے غم پردے میں رکھتی تھیں۔ نہ خلاف کچھ سنتی تھیں، نہ حمایت میں کچھ کہتی تھیں۔ انہوں نے جیسے خود کو سیل بند کر دیا تھا۔

وہ فکرمندی سے اٹھ کر ان کے پاس آ گئی۔

''آئم سوری! میں نے آپ کو پریشان کر دیا نا۔'' محبت سے کہہ کر ان کے گرد بازو ڈالا۔ ''میں ملاؤں گی آپ کو اس سے۔''

وہ نم آنکھوں سے بمشکل مسکرائیں۔

''آپ اس پینٹنگ کو مکمل کریں جلدی۔ کیونکہ مجھے اپنے نئے روم میں بیڈ کے اوپر یہی پینٹنگ لگانی ہے۔''

انہوں نے خیالات کو جھٹک کر برش اٹھایا۔ وہ جیسے خود کو اس کیفیت سے نکالنا چاہتی تھیں۔

جنت میز پر رکھی پینٹنگز دیکھنے لگی۔ ان میں سے دو تو اس نے اپنے کمرے کے لیے نکال لی تھیں۔ تیسری کا جائزہ لے رہی تھی۔ اسے کمرے کے انٹیریئر کے حساب سے وہی رنگ منتخب کرنے تھے جو کمرے کی دیواروں پر جچیں۔

''عسر یسرا کا کیا ہوا جنت؟'' کچھ یاد آ جانے پر انہوں نے پوچھا۔ جنت نے مڑ کر انہیں دیکھا۔ خفیف سی ہو کر ہنس دی۔

''ابھی سفر میں ہوں۔ جلد سمجھ لوں گی۔''

مسز شیرازی مسکراتے ہوئے کینوس کی طرف متوجہ رہیں۔ برش حرکت میں تھا۔

کچھ یاد آ جانے پر جنت ان کے پاس فلور کشن پر آ بیٹھی۔

''آنٹی سورہ الطلاق میں بھی تو عسر یسرا کی ایک آیت ہے۔

''عنقریب اللہ تنگی کے بعد آسانی کر دے گا۔'' (طلاق، 7)۔

سورہ انشراح کے برعکس اس آیت میں عسر کے ساتھ الف اور لام نہیں ہے۔ اور اس میں ''بعد'' ہے۔ ''مع'' نہیں ہے۔''

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں! مگر سوال یہ بھی ہے۔ یہ مشکل اور آسانی والی آیت سورہ الطلاق میں ہی کیوں ہے؟''

''جی؟'' جنت چونکی۔

انہوں نے برش رکھ دیا۔ رومال سے ہاتھ صاف کیے۔ پھر ٹیبل سے قرآن اٹھالیا۔ مطلوبہ صفحہ کھولا تو جنت ان کے برابر میں صوفے پر بیٹھ گئی۔

''اب دیکھو۔ سورت کا نام الطلاق ہے۔ جسے ہم ایک معیوب، ایک اذیت بھرا لفظ سمجھتے ہیں۔ اس ایک لفظ میں ہمیں رشتے کا اختتام، جدائی، تکلیف، رویوں کا دکھ، صبر کا غم، حالات کی فکر، معاشرے کی ٹینشن، حتیٰ کہ اپنے کردار کی پاکیزگی تک کا خوف نظر آتا ہے۔ لیکن جس سورت کا نام الطلاق ہے اس سورت میں ایسے کسی بھی خوف، ناامیدی اور مایوسی کی جگہ نہیں ہے۔ کچھ احکامات ہیں، اور ان احکامات کے ساتھ امید ہے! تسلی ہے۔ زندگی کے حوالے سے ایک مثبت پیغام ہے! اور سرکش لوگوں کے لیے وعید ہے۔''

ایک لمحہ توقف کر کے انہوں نے جنت کو دیکھا جو بہت توجہ اور غور سے انہیں سن رہی تھی۔

''میں سوچا کرتی تھی کہ قرآن میں ہر انسان کے لیے، ہر کیفیت، ہر حالات کے حوالے سے تسلی ہے، امید ہے، اجر کا وعدہ ہے۔ جیسے ایک ماں کے لیے ام موسیٰ کی وہ آیت۔

کہ اللہ کیسے دل کو جوڑ دیتا ہے۔اور کیسے انہیں نصیحت کرتا ہے کہ وہ غم نہ کریں۔ بیماری کے وقت ایوب علیہ السلام کی دعا، مچھلی کے بطن میں یونس علیہ السلام کی پکار، یعقوب علیہ السلام کی فریاد۔ زکریا علیہ السلام کی اولاد کی خواہش۔اور مریم علیہ السلام کی پاکیزگی کا وعدہ۔اسی طرح اور بھی بہت سے معاملات ہیں۔لیکن ایک مظلوم طلاق یافتہ۔مرد یا عورت کے لیے کیا ہوگا؟''

جنت دم سادھے انہیں دیکھ رہی تھی۔انہیں سن رہی تھی۔

''مشکل اور سخت حالات کی تسلی اور امید تو قرآن میں ہر جگہ ہے۔آزمائش کا ذکر بھی ہے۔اجر کا وعدہ بھی ہے۔لیکن میں طلاق کے حوالے سے اس امید اور تسلی کو اسی سورت سے سمجھنا چاہ رہی تھی۔جو مخصوص اسی ٹاپک کے لیے نازل ہوئی ہے۔''

وہ لمحے بھر کو رکیں۔

''اب دیکھو۔سورۃ الطلاق کی بارہ آیات ہیں۔ان میں سے چھ آیات کے اختتام پر۔ہر ٹوٹے ہوئے محزن (غمگین) انسان کے لیے چھے امید بھرے میسیجز ہیں۔''سنجیدگی سے کہتے ہوئے اب وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں۔

''اگر ہم تفسیر کے ساتھ پوری آیت کو سمجھیں گے تو پھر اس کا معنی ومفہوم ہمیں اس احکام کے ساتھ جڑا ہوا نظر آئے گا جو آیت میں طلاق، عدت، رضاعت وغیرہ کے حوالے سے واضح موجود ہے۔لیکن جب ہم ہر آیت کے آخر میں اس ایک مخصوص حصے پر غور کریں گے تو ہمیں زندگی اور اپنے حالات کے حوالے سے ایک مکمل اور منفرد پیغام نظر آئے گا۔خصوصاً ایک طلاق یافتہ کے لیے۔''

رک کر اس کی جانب دیکھا۔''اور چونکہ اس سورت میں تقویٰ کا لفظ بارہا استعمال ہوا ہے تو ہم اس ایک لفظ کو بھی اپنے ذہن میں رکھ کر گہرائی میں اتریں گے۔''

قرآن ہاتھ میں تھا۔کھول کر پھر انگلی رکھ کر بالترتیب وہ آیات کی نشاندہی کرنے لگیں۔

''یہ پہلی آیت کے آخر میں لکھا ہے،''اور تم کیا جانو شاید اللہ اس کے بعد کوئی نئی بات پیدا کردے۔''(سورۃ الطلاق، آیت 1)۔

''جب آپ کو اپنی زندگی اندھیر الگ رہی ہو، سب ختم ہو چکا ہو، دروازے بند ہوں، نہ امید نظر آئے اور نہ آسانی کا کوئی سبب باقی رہا ہو۔تو اس وقت اللہ آپ کے لیے، آپ کی زندگی میں کچھ نیا کر سکتا ہے۔ایک لمحے میں سب بدل سکتا ہے۔غم خوشیوں میں۔محرومیاں عطا میں۔صبر اجر میں۔اور خواب حقیقت میں۔لیکن شرط یہ ہے آپ کے اندر''تقویٰ''ہو۔''روانی سے بولتے ہوئے وہ ایک لمحے کو رکیں۔

''اب یہ تقویٰ کن معاملات میں ہوتا ہے؟ ایک خالق کے معاملات میں۔دوسرا اس کی مخلوق کے معاملات میں۔رشتہ چاہے اللہ کے ساتھ ہو یا اس کی مخلوق کے ساتھ۔اسے نبھانے کے لیے آپ کی سوچ، آپ کی نیت، آپ کے اعمال بہت اہمیت رکھتے

ہیں۔کیونکہ ان ہی سے اللہ کی عدالت میں اس بات کا تعین ہوتا ہے کہ آپ ظالم ٹھہرے ہیں یا پھر مظلوم؟ آپ حد میں رہے ہیں یا پھر سرکش ہوئے ہیں؟ آپ نے اپنے فرائض بھی سرانجام دیے ہیں یا پھر اپنے حقوق کا ہی مطالبہ کرتے رہے ہیں؟''

جنت کمال کی نگاہیں آیات پر ٹھہر گئی تھیں۔قرآن کے پیغام مرہم کی طرح تھے۔سینے کی ٹھنڈک اور دل کا سکون۔

''پھر دوسری آیت کے اختتام پر ہے۔

''اور جو اللہ سے ڈرتا ہے، اللہ اس کے لیے نجات کی صورت نکال دیتا ہے۔''

مخرج۔باہر نکلنے کا راستہ۔اس تنگی۔پریشانی۔غم یا مصیبت کے دائرے سے باہر کا راستہ۔مخرج۔ایگزٹ۔آپ اس دائرے۔اس آزمائش۔اس مصیبت سے ایک لمحے میں باہر ہوں گے۔یہاں بھی تقویٰ لازمی شرط ہے۔''

سنجیدگی سے کہہ کر انگلی کو اگلی آیت پر رکھا۔

''تیسری آیت میں ایک ساتھ تین میسیجز ہیں۔

''اور اسے وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں سے اسے گمان بھی نہ ہو اور جو اللہ پر بھروسا کرتا ہے سو وہی اس کو کافی ہے، بے شک اللہ اپنا حکم پورا کرنے والا ہے۔اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک پیمائش مقرر کردی ہے۔''(3)

''شادی، محبت، خوشی، سکون۔عزت۔اولاد۔یہ رزق ہے۔اور یہ رزق اپنے صاحب تک اللہ کی مرضی سے ہر حال میں پہنچتا ہے جنت۔اور وہاں سے پہنچتا ہے جہاں سے گمان بھی نہ ہو۔بات صرف اللہ پر توکل کی ہے۔امید کی ہے۔یقین کی ہے۔آپ اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر اللہ کی ہی مرضی سے قدم اٹھائیں گے تو اللہ اپنا حکم ضرور پورا کرے گا۔جہاں آسانیوں کا وعدہ ہے وہاں آسانیاں ضرور ملیں گی۔''رک کر کہا۔''پھر آگے لکھا ہے۔

اور جو اللہ سے ڈرتا ہے وہ اس کے کام آسان کر دیتا ہے۔(4)

اس میں''یسرا''استعمال ہوا ہے۔الف کے ساتھ۔یہاں

''یسرا''کو تقویٰ سے جوڑا گیا ہے۔''

اب توجہ کا مرکز اگلی آیت تھی۔

''جو اللہ سے ڈرتا ہے تو اللہ اس سے اس کی برائیاں دور کر دیتا ہے اور اسے بڑا اجر بھی دیتا ہے۔''(5)

اب ذرا ہم رک کر اس پر غور کرتے ہیں۔تقویٰ کے ذریعے سیئات کا مٹ جانا۔برائیاں، گناہ یا جو بھی۔بعض دفعہ ہم زندگی کے مشکل ترین حالات سے اسی لیے گزارے جاتے ہیں تاکہ ہماری تمام کی تمام سیئات مٹائی جا سکیں۔اور جب سیئات نہ رہیں تو پھر''اجر''رہ جاتا ہے۔اور یہ اجر صرف آخرت سے جڑا ہوا نہیں ہوتا جنت۔یہ دنیا میں بھی ملتا ہے۔آسانیوں کی صورت۔''

پھر چھٹی کو چھوڑ کر ساتویں آیت کے اختتام پر ہے۔

''عنقریب اللہ تنگی کے بعد آسانی کر دے گا۔(7)

اور جیسا کہ تم نے کہا۔ یہاں ''بعد'' ہے۔ ''مع'' نہیں ہے۔ سیجعل استعمال ہوا تو اس کا مطلب ہے کنفرم بات ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ تو کیا یہ کوئی اور عسر ہے؟'' سوال کر کے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ جنت کے پاس فی الحال کوئی جواب نہ تھا۔

''اور دیکھو۔ ان تمام لفظوں کے آخر میں الف ہے۔ امرا۔ مخرجا۔ قدرا۔ اجرا۔ یسرا۔ سب کے آخر میں الف ہے۔''

اور اس نکتے پر آ کر جنت ایک لمحے کے لیے بالکل سن سی ہوگئی تھی۔ ''مجھے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا ایسا کوئی ہنٹ اس سورت سے مل سکتا ہے۔''

مسز شیرازی مسکرائیں۔ ''جب تم ''یسرا'' کو جان لوگی تو یہ سارے لفظ تمہیں بہتر سمجھ میں آ جائیں گے۔''

بات ختم ہوگئی۔ جنت کی نگاہیں صفحے پر، آیات پر، اور حروف پر ٹھہری رہ گئیں۔

''کیا سوچ رہی ہو؟''

''زندگی کے دیگر سخت حالات کی طرح طلاق بھی انسان کو توڑتی ہے آنٹی۔ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ایک طلاق یافتہ کو زندگی اور رشتوں کے حوالے سے کوئی امید نہیں دلاتا۔ مگر جس کے ہاتھ میں ہماری جان ہے، ہمارا نصیب ہے، ہماری خوشیاں اور ہمارا رزق ہے۔ وہ دلا رہا ہے۔ اسی سورت میں۔ جس کا نام الطلاق ہے۔''

اپنے اندر کے غم سے لڑتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔

''جب مجھے طلاق ہوئی تو مجھے لگا تھا میری پوری زندگی اب ختم ہوگئی ہے۔ میری حیثیت مٹی ہو چکی ہے۔ اب میں ساری عمر ایسی ہی رہ جاؤں گی یا شاید کسی بڑی عمر کے شخص سے میری شادی کر دی جائے گی۔ خاندان کے لوگ باتیں کرتے تھے۔ مجھے دوسروں کی آنکھوں میں اپنے لیے عزت نظر نہیں آتی تھی۔ میرے اتنے صبر اور برداشت کے باوجود سب کو قصور میرا ہی نظر آ رہا تھا۔ اور میں۔''

وقت جیسے پلٹ آیا تھا۔ وہ جیسے اسی ٹینشن زدہ ماحول میں قید ہوگئی تھی۔

''میں ایک کمرے میں بند ہوگئی۔ مایوس ہوگئی۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گی اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ میں اپنی طلاق کے بعد سچ مچ میں مر گئی تھی۔'' اس نے کہا۔

''تو پھر کیا ویسا ہوا، جیسا تم نے سوچا تھا؟'' انہوں نے نرمی سے پوچھا۔ جنت کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نے اس زندگی کا تو تصور ہی نہیں کیا تھا۔''

''یہی تو مین پوائنٹ ہے سورہ الطلاق کا!'' انہوں نے کہا۔ ''یہی تو امید اور یقین ہے جسے ہم نے اپنے مشکل ترین حالات میں قائم رکھنا ہے۔'' رک کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگیں۔

''مجھے ایک بات بتاؤ۔ وہ ساری کی ساری منفی سوچ، خیال، وسوسے اور ناامیدی تم نے کہاں سے لی تھی؟''

جنت نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ سوال واضح تھا۔ وہ بے طرح سے چونکی تھی۔ کہ بات صرف ان سرگوشیوں کی نہیں تھی جو شیطان اس کے اندر کرتا تھا۔ بات ان سرگوشیوں کی بھی تھی جو انسانوں کے ذریعے اس تک پہنچتی تھیں۔

''ٹاکسک ریلیشن سے آزاد ہونے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اب آپ کمتر ہو چکے ہیں یا آپ کا رزق، آپ کے حصے کی برکتیں، آپ کے حصے کی خوشیاں آسمان کی طرف اٹھا لی گئی ہیں۔ نہیں...... بالکل بھی نہیں، جو آپ کا ہے۔ وہ آپ کا ہی ہے۔ پوری دنیا مل کر بھی آپ کو اس نعمت سے محروم نہیں کر سکتی جو اللہ نے آپ کے لیے لکھ دی ہے۔ آپ کی شادی بھی ہوگی۔ آپ کا گھر بھی آباد ہو گا۔ لوگوں کی باتیں۔ ان کے طنز۔ ان کے طعنے۔ ان کی نگاہیں۔ ان کے سوال۔ ان کے اشارے۔ آپ سے آپ کا رزق نہیں چھین سکتے۔''

وہ اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ وہ جیسے اس جنت سے مخاطب تھیں جو اپنی پہلی طلاق پر ایک بند کمرے میں غم زدہ سی مایوس بیٹھی تھی۔ اس جنت سے جو یسرا کے معنی تلاشتی سورہ الطلاق تک پہنچ گئی تھی۔ جو اپنی زندگی کے ہر پہلو کے حوالے سے ایک مثبت پیغام۔ ایک امید ڈھونڈ رہی تھی۔

''لوگوں کے ہاتھوں میں آپ کا نصیب نہیں ہوتا جنت! وہ آپ کے ''مالک'' نہیں ہیں۔ وہ آپ کے ''رازق'' نہیں ہیں۔ انہوں نے آپ کو تخلیق نہیں کیا ہے۔ سو انہیں اس بات کی اجازت ہی کیوں دی جائے کہ وہ آپ کے اندر مایوسی کا زہر بھر دیں؟ آپ سے آپ کے خواب چھین لیں؟ آپ کو آپ کی اپنی نظروں میں بے وقعت کر دیں؟ آپ نے صرف اللہ کو دیکھنا ہے، صرف اللہ کو سننا ہے، اور صرف اللہ پر ہی بھروسا رکھنا ہے جس نے آپ سے خود آسانیوں کا وعدہ کیا ہے۔''

ان کا ایک ایک لفظ اسے دل کی گہرائیوں میں اترتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

مسز شیرازی نے قرآن اس کی ہتھیلیوں پر رکھ دیا تھا۔

''طلاق اس بات کی علامت ہے آپ کا ایک تعلق، ایک رشتہ آپ کی اپنی بہتری کے لیے ختم ہو چکا، اس بات کی نہیں کہ آپ ختم ہو چکے۔'' انہوں نے برش اٹھا لیا۔

''ہر اختتام ایک نئے آغاز سے جڑ جاتا ہے۔ یہ ہم ہیں جو اپنا اینڈ خود کر لیتے ہیں! ان لوگوں کی وجہ سے جن کا ہماری زندگی پر کوئی اختیار نہیں۔''

تین رنگوں کو ایک دوسرے میں ضم کر کے ایک نیا اچھوتا رنگ تخلیق کیے وہ ادھوری پینٹنگ کو مکمل کرنے لگی تھیں۔

جنت سر جھکائے صفحے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔

''عموماً میں کسی بھی سورت کو سمجھتے ہوئے اس بات پر بھی غور کرتی ہوں کہ اس میں اللہ کی کن صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ جیسے کہ اس میں ''اللہ'' اور ''قدیر'' (قدرت رکھنے والا) استعمال ہوا ہے۔ یہ بھی ایک نشانی ہے۔ نیچے کی باقی آیات پڑھو گی تو تمہیں یہ بھی سمجھ میں آئے گا کہ جو حد سے تجاوز کرتے ہیں، احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہیں، ظلم کرتے ہیں تو ان کے حصے میں شدید عذاب آتا ہے۔ سو اس بات کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ کوئی کسی پر ظلم ڈھا کر خوش رہ سکتا ہے یا کسی کو برباد کر کے اپنی زندگی آباد کر سکتا ہے۔''

بات جیسے اب ختم ہو چکی تھی۔ مگر وہ چاہتی تھی مسز شیرازی بولتی رہیں اور وہ سنتی رہے۔ سمجھتی رہے۔

کتنی بار اس سورت کو پڑھا تھا اس نے۔ اور کتنی ہی بار اسے صرف احکام کے حوالے سے جانا تھا۔ کبھی بھی اس کی نظر ان آیات پر نہیں گئی تھی۔ اس پیغام پر۔ اس امید پر نہیں گئی تھی۔

''اب تم کب تک مجھے یسرا کے معنی بتانے والی ہو؟'' خوش گوار لہجے میں پوچھا تو وہ نم آنکھوں کے ساتھ مسکرا دی۔

''ان شاء اللہ بہت جلد!! پھر آپ کو بس مجھے ایڈریس دینا ہوگا اور میں آپ کے پوتے سے ملنے جاؤں گی۔ اور صرف اتنا نہیں۔ میں اسے یہاں بھی لاؤں گی۔ دیکھنا آپ۔''

وہ ان سے لپٹ کر کہہ رہی تھی۔ وہ دھیرے سے مسکرا کر رہ گئیں۔ مگر آنکھوں کی نمی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

وہ جرمنی سے تیسرے دن ہی آ گیا تھا۔ جنت اس کے جلدی آ جانے پر حیران ہوئی مگر کوئی سوال نہ کیا۔ آج کل ویسے بھی وہ اپنے نئے کمرے کی سیٹنگ میں مصروف تھی۔ فرنیچر تقریباً سیٹ ہو چکا تھا۔ اب بس اسے کمرے کو رہائش کے قابل بنانا تھا۔ کچھ سامان رکھنا تھا، کچھ چیزیں خریدنی تھیں۔

ابھی بھی وہ اقصیٰ کے ساتھ الماری میں کپڑے رکھوا رہی تھی جب وہ دستک دے کر اندر آیا تھا۔ ایک ستائشی سی نگاہ پورے کمرے میں دوڑائی۔

''سفید رنگ ویسے بھی میرا فیورٹ ہے۔'' اسے پتا تھا کب کیسے جنت کمال کی خوشی کو غارت کرنا ہے۔ وہ اندر ہی اندر شعلوں کی زد میں آ گئی مگر زبردستی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے اس کی طرف مڑی۔

''اوہ! مجھے معلوم نہیں تھا۔ ویسے آنٹی کا کمرہ بالکل سامنے ہے۔''

وہ اس کے جواب پر مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔

پھر ہاتھ میں پکڑا ہوا کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔ جسے لیتے ہوئے جنت نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''میرے دوست کی شادی ہے۔ ہم ہفتے کو لندن جا رہے ہیں۔''

وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ پھر ملازموں کا لحاظ کر کے وہ اس کے پیچھے باہر آ گئی۔

''ہم کیوں جا رہے ہیں؟'' لہجے میں دبا دبا سا غصہ تھا۔ ''تم خود جاؤ۔''

''چلا جاتا۔ لیکن کارڈ پر مسٹر اینڈ مسز فارس لکھا ہوا ہے۔''

جنت نے دانت پیس کر اسے دیکھا۔ ''لیکن میں تمھارے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گی۔'' وہ اپنی ضد پر اڑ گئی۔ اور یہ ضد شام تک خود ہی ختم ہو گئی جب مسز شیرازی نے اپنے پاس بٹھا کر اسے شادی اٹینڈ کرنے کے لیے رضا مند کیا۔ وہ انہیں انکار نہیں کر سکی تھی۔ اور چونکہ بات فارس کے دوست کی تھی تو فارمیلیٹی پوری کرنے کو ہی سہی۔ اس کی شرکت ضروری تھی۔

وہ اوپر کمرے میں آئی تو چہرہ اچھا خاصا پھولا ہوا تھا۔

''ویسے پیکنگ کی تو ضرورت نہیں پڑے گی؟'' اشارہ اس بیگ کی طرف تھا جو وارڈ روب کے ساتھ کھڑا تھا اور جسے دو ماہ پہلے وہ تیار کر چکی تھی۔

''مجھ سے کوئی بات مت کرو تم۔'' ایک قہر بھری نظر اس پر ڈالی واش روم میں گھس گئی۔ وہ زیر لب مسکرا کر رہ گیا۔

☆☆☆

وہ لندن پہنچے تو اس وقت صبح کے سات بج رہے تھے۔ ایئرپورٹ سے باہر گاڑی پہلے سے موجود تھی۔ انتظار میں گارڈ اور سیکرٹری بھی کھڑے تھے۔ اسے لندن کی فضا میں سردی کا شدت سے احساس ہوا تھا۔ گاڑی کا سفر کچھ خاموشی سے کٹا تھا البتہ فارس وقفے وقفے سے آنے والی کالز ریسیو کرتا رہا تھا۔

اس کا اپارٹمنٹ لندن کے ایک پوش ایریا کی چودھویں منزل پر تھا۔ وہ سفر سے کچھ اس حد تک تھکی ہوئی تھی کہ پہنچتے ہی سو گئی تھی۔ دوپہر میں آنکھ کھلی تو فارس موجود نہیں تھا۔ البتہ میڈ کچن میں کھانے کا انتظام کر رہی تھی۔

اس نے گھوم کر پورے گھر کا جائزہ لیا لگژری اپارٹمنٹ کا سارا انٹیریئر سفید رنگ کا تھا۔ ہر ایک شے نفیس اور قیمتی تھی۔ بے انتہا پرتعیش۔ بیڈروم ایک ہی تھا مگر ایسا شاہانہ اور خوب صورت کہ وہ سراہے بنا نہ رہ سکی۔ ایک مسلمان میڈ تھی جو گھر کی دیکھ بھال اور کھانے کا انتظام سنبھالے ہوئے تھی۔ اس نے کھڑکیوں سے پردے ہٹا کر لندن کی فلک بوس عمارتوں کو دیکھا اور رات تک وقفے وقفے سے یہی سرگرمی دہراتی رہی۔

عسر یسرا۔ حسنیٰ حسین

پہلے دن تو فارس اپنے بزنس کے معاملات میں کافی مصروف رہا۔اور وہ بھی گھر میں رج کے بور ہوئی۔دوسرے دن وہ شام کو تاخیر سے گھر آیا تھا،اور تیسرے دن تو وہ گھر سے کہیں گیا ہی نہیں۔مصروف اتنا جیسے سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں۔

میڈ نے شام کے کھانے کے لیے کچھ گروسری کا سامان لینا تھا تو اسے باہر جاتا دیکھ کر وہ خود بھی تیار ہوگئی۔ضروری ہے کہ اب وہ لاٹ صاحب کی منت کرے کہ اب لندن لے ہی آئے ہو تو تھوڑا گھما پھرا دو۔اور ویسے بھی وہ کون سا خوشی سے لایا تھا۔موصوف کی مجبوری تھی۔شادی کارڈ پر مسز اینڈ مسٹر فارس جو لکھا ہوا تھا۔کیسے جتا کر کہا تھا اس نے۔جیسے اگر صرف مسٹر فارس لکھا ہوتا تو وہ اکیلا ہی آتا۔

''کہیں جارہی ہو؟''

وہ لاؤنج میں لیپ ٹاپ اور فائلز کے درمیان گھرا بیٹھا تھا جب اسے کمرے سے کوٹ مفلر اور دستانوں میں تیار شیار سا باہر نکلتا دیکھا۔

اسے فارس کا سوال بھی عجیب لگا۔بیگ میں موبائل اور پانی کی بوتل رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔''میڈ کے ساتھ مارکیٹ تک جانا چاہ رہی ہوں۔آؤٹنگ کے لیے۔''

''اس وقت؟''فارس نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا۔''شام کے پانچ بج رہے تھے۔

''کیوں اس وقت نہیں جا سکتی میں؟''اس کی آنکھوں میں ناگواری سی در آئی۔

وہ اٹھ کر اس کے پاس آگیا۔

''میں کل تک فری ہو جاؤں گا تو چلیں گے۔''

''میں نے تم سے اجازت تو نہیں مانگی۔''

''لیکن میں منع کر رہا ہوں۔''فارس کا لہجہ ہنوز نرم تھا۔

''کس حق سے منع کر رہے ہو؟''وہ سوالیہ نشان بن گئی۔وہ خاموش ہو گیا۔اس کا انداز،اس کا لہجہ،اس کا رویہ۔اب وہ کیسے کہے کہ فکر میں منع کر رہا ہے؟ جبکہ اسے کسی بھی بات پر یقین نہیں آتا تھا۔

''شاید میں نے کبھی ذکر نہیں کیا لیکن......''اسے جملہ مکمل کرنے میں کچھ وقت ہوئی۔''میرے دشمن زیادہ ہیں۔''

''تو......؟''وہ یوں دیکھ رہی تھی جیسے اسے فارس کی بات سمجھ ہی میں نہ آئی ہو۔

وہ چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہا۔''میں نہیں چاہتا،کوئی تمہیں نقصان پہنچائے۔صرف اس لیے کہ تم میری بیوی ہو۔''

اگلے کئی لمحوں تک جنت ساکت سی کھڑی رہ گئی تھی۔

''بیوی اب ہوں؟ پانچ ماہ پہلے تک کیا تھی؟''وہ ایک سوال کاری ضرب جیسا تھا۔اسے لگا وہ زمین کی تہوں میں اتر گیا ہے۔

''پہلے تو تمہیں کبھی فکر نہیں ہوئی۔کبھی روک ٹوک نہیں کی۔گھنٹوں تمہارے آفس کے باہر اجازت کے لیے کھڑی رہتی تھی صرف اس لیے کہ تم منع کرو اور میں رک جاؤں۔تاکہ مجھے احساس ہو تم مجھے اپنی ذمہ داری سمجھتے ہو۔مگر تم کیا کرتے تھے؟ جواب تک نہیں دیتے تھے۔کبھی منع نہیں کیا،کبھی محتاط رہنے کو نہیں کہا،کبھی پروا نہیں کی۔اور اب اچانک تمہارا خیال ہے مجھے اجازت بھی لینی چاہیے اور تمہارے منع کرنے کے بعد رک بھی جانا چاہیے!اس لیے کہ میں تمہاری بیوی ہوں؟''

اس کا لہجہ طنز میں گھل گیا مگر آنکھوں کی نمی،آواز کی کمزوری۔اس کے جذبات،اس کی تکلیف عیاں کر رہی تھی۔

''مجھے وہ کار ایکسیڈنٹ کے وقت تمہارے تاثرات نہیں بھولتے۔تب تم چاہتے تھے میں مر جاؤں۔میری حادثاتی موت تمہارے بہت سے مسئلے حل کر دیتی۔ہے نا۔''

وہ اس کی آنکھ میں اپنے لیے شک،غصہ بدگمانی،بے اعتباری جیسے تاثرات دیکھتا بالکل خاموش کھڑا تھا۔

''اب بات بچے کی ہے تو تمہیں فکر ہو رہی ہے۔لیکن تم سے زیادہ فکر مجھے ہے۔''بیگ ایک کندھے سے دوسرے کندھے پر ڈالا۔

ہمیشہ کی طرح فارس کے تاثرات اس کی سمجھ سے باہر تھے مگر اس کی آنکھیں۔فارس وجدان کی آنکھیں۔وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

بند دروازے کے اس پار لفٹ کے عین سامنے وہ سر جھکائے کھڑی رہی۔آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھرنے لگی تھیں۔چہرہ جذبات کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔اسے بہت رونا آ رہا تھا مگر وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔فارس کی میڈ کے سامنے تو بالکل بھی نہیں۔آنکھیں صاف کر کے اطراف میں گرتی لٹوں کو پیچھے اڑسا مفلر کو اچھی طرح سے لپیٹی آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

وہ میڈ کے ساتھ بارک لین مارکیٹ میں آگئی تھی۔

بھانت بھانت کے لوگ تھے،سڑک اور مختلف دکانوں پر کافی رش تھا۔ایک ہلچل اور شور سا مچا ہوا تھا۔خرید و فروخت جاری تھی۔کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے وہ آگے بڑھتی رہی۔میڈ ہر تھوڑی دیر بعد کلائی موڑ کر وقت دیکھتی تھی اور پھر اسے۔جس کے چہرے پر اب غم یا خوف کا کوئی تاثر نہ تھا۔آنکھیں جانے کب کی خشک ہو چکی تھیں۔

میڈ کو واپسی کی جلدی تھی کہ شام کے کھانے کا انتظام بھی دیکھنا تھا مگر جنت اس کی بھی نہیں سن رہی تھی۔وہ بس ٹہل رہی تھی۔چیزیں دیکھ رہی تھی۔گھوم رہی تھی۔اور کہیں اگر ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر گھومتے جوڑے پر نظر پڑتی تو بڑبڑا بھی رہی تھی۔

اس قدر کھلی فضا اور ماحول میں، اتنے سارے لوگوں کے بیچ و بیچ اسے ایک بار پھر شدت سے تنہائی کا احساس ہوا تھا عجیب سا دکھ تھا۔حسرت تھی۔غم تھا۔اور غصہ تھا۔

دائیں طرف مڑتے ہوئے اس کی نظر کلا مشین پر جا ٹھہری۔گلاس باکس کے اندر بے تحاشا روئی کے رنگ برنگے کھلونے تھے۔مگر اس کی تمام تر توجہ اس سبزی مائل ڈائنوسار پر تھی جو اسے بہت خوبصورت لگا تھا۔

''میں یہ ٹرائے کرنا چاہتی ہوں۔'' میڈ سے کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ ہر طرح کی منفی سوچ اور خیالات کو جھٹکا، دل کو سنبھالا کہ کیا ہوا اگر جو وہ اکیلی ہے؟ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ اپنے لمحات کو یادگار نہیں بنا سکتی؟

میڈ کا موبائل بج اٹھا۔اس نے جیب سے نکال کر اسکرین کو دیکھا تو چہرے کے تاثرات بدل گئے۔

جنت اس کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔اب چونکہ بیگ کے ساتھ کلا مشین سے ڈائنوسار نکالنے میں دقت ہو رہی تھی سو اس نے اپنا بیگ میڈ کو تھمایا اور شروع ہو گئی۔پہلی کوشش میں ناکام، دوسری میں بھی ناکام۔تیسری کوشش میں ڈائنوسار ہاتھ میں تھا۔اس کی خوشی دیکھنے لائق تھی۔میڈ بھی دیکھتے ہوئے بدقت مسکرائی۔

''انسان کو اپنے ساتھ زندگی کرنی چاہیے۔ضروری ہے کوئی ساتھ ہو تب ہی آپ ہنسیں گے، مسکرائیں گے۔''

اس نے دل ہی دل میں خود کو شاباش دی۔ پھر کھلونا میڈ کے حوالے کرتی دوسرے اسٹال سے ننھی منی سی اشیاء دیکھنے لگی۔

اسے اقصیٰ کے لیے ایک آئینہ پسند آیا۔اور تب ہی وہ اپنا پرس لینے کے لیے مڑی اور اپنی جگہ تھم گئی۔

میڈ وہاں کہیں نہیں تھی۔اس نے گھبراہٹ کے عالم میں گھوم کر چاروں طرف دیکھا۔آس پاس بہت دور تک دیکھا مگر وہ اسے کہیں بھی نظر نہ آئی۔

جنت کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا، سانسیں پھولنے لگیں۔بعجلت قدم اٹھاتی وہ آگے بڑھی۔دائیں طرف، پھر بائیں طرف۔اس کے بعد ناک کی سیدھ میں قدم اٹھاتی گئی۔

وہ بھٹک گئی تھی۔بچھڑ گئی تھی۔اتنے بڑے شہر میں یکا یک تنہا ہو گئی تھی۔اتنے سارے لوگوں کے ہجوم میں۔ایک بار پھر عدم۔ایک بار پھر نفی ہو گئی تھی۔

سورج مکمل غروب ہو چکا تھا۔نیلگوں آسمان رنگ بدل رہا تھا۔اسٹریٹ لائٹس کی روشنیاں چہار سو نظر آ رہی تھیں۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اب کیا کرے!؟ کہاں جائے؟ فارس کا نمبر اسے یاد نہیں تھا۔اپنا موبائل بھی پاس نہیں تھا۔اپنا بیگ میڈ کے حوالے کرنے پر وہ پچھتا رہی تھی۔مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟

مفلر گردن کے گرد اچھی طرح سے لپیٹتے ہوئے دستانوں میں مقید ہاتھوں کو منہ پر رکھا۔اب وہ دیوار سے لگی کھڑی تھی۔آتے

جاتے لوگوں کو کچھ خوف اور گھبراہٹ سے دیکھتی ہوئی۔

سامنے ہی اول جلول سے حلیے میں دو لڑکے کھڑے تھے، بار بار رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھا تو اندر تک لرز گئی۔

آنکھوں کا خوف عیاں تھا۔تب ہی نظروں میں آ رہی تھی۔ایک بار پھر قدم اٹھاتی آگے بڑھی۔گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ وہ تلاش میں گھومتی رہی۔نہ پیسے تھے، نہ گھر کا ایڈریس معلوم تھا۔اور نہ کسی سے جان پہچان۔

روتی سسکتی ایک گلی میں کھڑی ہو گئی۔

وہ میڈ فارس کی تھی۔یقیناً یہ فارس کا حکم ہوگا۔یقیناً اس نے ہی سزا کے لیے یہ حرکت کی ہو گی۔وہ اس کی غلطیاں نظر انداز نہیں کرتا تھا۔وہ بدلے لیتا تھا۔وہ سزائیں دینے والوں میں سے تھا۔روتے سسکتے اپنا سر گھٹنوں پر رکھا۔وجود سردی کی شدت سے کپکپا رہا تھا۔

وہ ایسا کیسے کر سکتا ہے؟ کیسے؟ وہ بھی تب جب وہ اس حالت میں ہے؟

☆☆

اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔رو رو کر آنکھیں سوج گئی تھیں۔ٹانگیں دکھ رہی تھیں۔

دل لرز رہا تھا۔فکر اور اندیشوں نے ازسرنو گھیرا تھا۔صدمہ تھا، دکھ تھا۔اذیت تھی۔وہ جیسے ایک بار پھر دھوکے میں آئی تھی۔

جو انسان اس کی زندگی کو جہنم بنا سکتا تھا۔اسے اذیتوں کے دوراہے پر لا سکتا تھا۔اسے پارکنگ ایریا میں چھوڑ کر جا سکتا تھا۔اس پر اپنی شرائط، اپنی مرضی، اپنے ارادے سزا کی طرح مسلط کر سکتا تھا، وہ اس انسان پر کیسے بھروسا کر سکتی تھی؟ کیسے؟ یہ غلطی یہ بھول اس سے کیوں کر ہو گئی تھی؟

اس کا خیال تھا وہ اپنے بچے کی وجہ سے اب اس کا لحاظ کرے گا۔یہ خیال محض اک خیال ہی تھا۔خوش فہمی کا ایک طلسم۔یہاں مسز شیرازی نہیں تھیں۔یہاں فارس وجدان ایک بار پھر اپنی اصلی شکل میں آ گیا تھا۔

''اسے لندن آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔'' سسکتے ہوئے خود کو کوسا۔''بالکل نہیں آنا چاہیے تھا۔''

وہ بھٹکتی ہوئی کبھی اس سمت جا رہی تھی۔اور کبھی اس سمت۔۔رو رو کر اپنا حشر بگاڑ لیا تھا۔بریک لین کا وہ راستہ زندگی کی طرح ہو گیا تھا۔کوئی منزل نہیں تھی بس اک خلا رہ گیا تھا۔وہی لوگ۔وہی آنکھیں۔وہی دہشت۔تنہائی۔خوف۔

اتنے شور اور اتنی ساری آوازوں میں یکا یک ایک مانوس سی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔اسے لگا، اس کے کان بج رہے ہیں۔خوف کے عالم میں رک کر پیچھے دیکھا۔اسے اپنا نام ایک بار پھر سنائی دیا۔

اس نے بے اختیار گھوم کر چاروں طرف دیکھا۔آنسو بہہ رہے تھے تو ہر منظر دھندلا ہو رہا تھا۔اور تب اس کی نظر فارس وجدان

پر پڑی۔

وہ لوگوں کو چیرتا ہوا اس کی طرف آرہا تھا۔اس نے بے ساختہ فارس کی طرف قدم بڑھائے۔لمحے بھر کے لیے لڑکھڑائی۔ایک دو لوگوں سے کندھا مس ہوا، دھکا بھی لگا۔

وہ اتنے دکھ، اتنے صدمے اور غصے میں تھی کہ اسے فارس کی آنکھوں میں اپنے لیے فکر، پریشانی اور خوف نظر ہی نہ آیا۔

وہ اس کے قریب پہنچا تو بغیر کچھ سوچے، بغیر کچھ سمجھے، اس کے سینے پر مکے مارنا شروع کر دیے۔آس پاس کے لوگ رک کر ،مڑ کر انہیں دیکھنے لگے تھے۔

''میں نے کہا تھا۔میں نے کہا تھا میرے ساتھ کوئی ڈراما مت کرنا۔'' وہ روتے ہوئے اس پر چلائی۔''میں نے منع کیا تھا میرے۔ساتھ۔۔اس طرح مت کرنا۔'' وہ اتنی مشتعل تھی، اس قدر دکھ اور غصے میں تھی کہ خود پر اختیار کھو بیٹھی تھی۔دو گھنٹے سے وہ اس شدید سردی میں بھٹک رہی تھی۔دو گھنٹے ایک سزا کے نام ہو گئے تھے۔

زخم پھر سے ادھڑ گئے، سارے غم تازہ ہو گئے، ساری اذیتیں جاگ اٹھیں۔بچپن سے لے کر اب تک سہا جانے والا ہر دکھ رگ رگ میں اتر گیا۔دل و دماغ میں وحشت پھیل گئی۔

روتے کرلاتے۔غصہ دکھاتے وہ جتنا لڑ سکتی تھی وہ لڑی، جتنا مار سکتی تھی، اس نے مارا۔

وہ اسے سنبھالنا چاہ رہا تھا مگر وہ اس کے قابو میں نہیں آرہی تھی۔وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔اس کی نہیں سن رہی تھی۔کچھ بے دردی اور غصے سے اس کے ہاتھ جھٹک کر وہ پیچھے ہٹنا چاہ رہی تھی مگر فارس نے اسے ایسا کرنے نہیں دیا تھا۔وہ سڑک کے بیچوں بیچ اس کے مضبوط بازوؤں کے حصار میں مقید ہو گئی تھی۔

اب وہ اسے نہیں مار سکتی تھی۔اب وہ صرف رو سکتی تھی۔اور وہ رو رہی تھی۔وہ اپنے نانا کو پکارتے ہوئے بچوں کی طرح رو رہی تھی۔

''آئم سوری! آئم سو سوری!'' اپنے آپ میں چھپائے بھاری دل سے کہا۔وہ آواز صرف لبوں کی جنبش تھی۔جنت کمال تک نہیں پہنچی تھی۔اس کا وجود فارس کے بازوؤں میں بے جان ہو گیا تھا۔

☆☆☆

وہ کتنی دیر ہوش و خرد سے بیگانہ رہی، اسے یاد نہ تھا البتہ جب ہوش آیا تب وہ بیڈ روم میں تھی۔ڈاکٹر بھی موجود تھا۔اس کا معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے اسے ٹینشن اور اسٹریس سے بچانے کی خاص ہدایت کی تھی۔

فارس ڈاکٹر سے بات کر رہا تھا تو وہ سرخ و متورم آنکھوں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔وہ گرم کپڑوں کے بغیر باہر نہیں نکلتا تھا۔

دستانے، مفلر اور لانگ کوٹ کے بغیر تو بالکل بھی نہیں۔مگر جو اس وقت اس کے پاس موجود تھا۔وہ سیاہ ٹراؤزر پر براؤن اونی سویٹر میں ملبوس نظر آرہا تھا۔یعنی وہ جن کپڑوں میں بیٹھا تھا، ان میں ہی اٹھ کر اسے لینے آ گیا تھا۔

اس کے ہونٹوں کے دائیں طرف گال پر ہلکی سی لکیر کا نشان تھا۔یہ کارنامہ اس کا تھا۔اس نے نظریں ہٹالیں۔کروٹ بدل کر آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔آنکھیں مکمل سرخ تھیں۔چہرہ ستا ہوا تھا۔زکام کی بھی شکایت ہو رہی تھی۔بخار بھی ہو رہا تھا۔

چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔قدموں کی چاپ بیڈ کے پاس آ کر تھم گئی۔

''کیا ہم بات کر سکتے ہیں؟'' فارس کی آواز پریشانی کا پتا دے رہی تھی۔

خاموشی......

اتنے سارے الزامات کی لسٹ اپنے کندھوں پر اٹھائے وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''میں نے اسی لیے تمہیں منع کیا تھا۔''

''ہاں اور جب میں نہیں رکی تو سوچا، اسے سزا دینی چاہیے۔تاکہ آئندہ یہ ایسی حرکت نہ کرے۔'' روتے ہوئے کہا۔وہ کس قدر بدگمان ہو چکی تھی اس سے۔فارس اسے افسوس سے دیکھ کر رہ گیا۔

''تم نے اپنا ہینڈ بیگ میڈ کو کیوں دیا؟'' وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔''اگر تم ایسا نہ کرتیں تو ادھر ادھر ہو جانے پر کم از کم مجھے کال تو کر سکتی تھیں۔اگر کال نہ بھی کرتیں تب بھی لوکیشن موبائل میں موجود تھی۔ڈرائیور کا نمبر تک میں نے سیو کر دیا تھا۔'' حجت اور دلیل سے بات کر کے وہ اس کی غلط فہمی دور کرنا چاہتا تھا۔

''تو تم اب مجھے یہ بتانا چاہتے ہو کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا، اس میں تمہاری کوئی پلاننگ نہیں تھی؟'' اٹھ کر بیٹھتے ہوئے وہ آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اس پر جمائے لڑ پڑی۔

''میں بھلا کیوں چاہوں گا، تمہارے ساتھ ایسا ہو؟'' اسے بہت اندر تک دکھ سا ہوا۔

''یہ سوال تم مجھ سے پوچھ رہے ہو؟'' جنت کے لہجے میں غم بھرا غصہ در آیا۔آواز رندھی ہوئی تھی۔''بھول گئے جب تم مجھے پارکنگ میں چھوڑ کر گئے تھے؟''

وہ نہیں بھولا تھا۔بھول ہی نہیں سکتا تھا۔مگر جب وہ یاد دلاتی تھی تب زیادہ تکلیف ہوتی تھی۔جب وہ ذکر کرتی تھی تب زیادہ پچھتاوا ہوتا تھا۔

''مجھے پتا تھا، تم ایسی کوئی حرکت ضرور کرو گے۔اور تم نے کی۔مجھے تم پر بالکل بھی بھروسا نہیں ہے۔'' وہ روئے جا رہی تھی۔گہری سانس لیتے ہوئے اس نے بے ساختہ اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا تھا۔اس کے داہنے ہاتھ کی پشت پر ہلکی سی خراش واضح

تھی۔

''ٹھیک ہے، میں مانتا ہوں، شروع میں تمہارے حوالے سے میں بہت زیادہ لاپرواہ رہا ہوں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ تم جب بھی گھر سے نکلی ہو، کبھی بھی اکیلی نہیں تھیں۔ میرا ایک گارڈ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہا ہے۔ چاہے تم مال میں تھیں، یا پارک میں...... یا کسی دعوت پر یا آئمہ کے ساتھ کسی گیدرنگ میں۔ میرے پاس تمہارے ہر ایک لمحے کی رپورٹ ہوتی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کوئی تمہیں میری وجہ سے نقصان پہنچائے۔ ہاں لاہور میں مجھ سے غلطی ہوئی۔ شاید اس وقت میں بہت غصے میں تھا۔ میں نے تمہاری سیفٹی کا خیال نہیں کیا۔ مجھے لگا تم اپنے رشتے داروں میں ہو، سو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ یا شاید میں اتنا اپ سیٹ تھا تمہارے رویے سے کہ میں نے اس بات کو اہمیت نہیں دی۔ بہر حال یہ میری غلطی ہے۔''

اس کی پوری بات جنت کمال نے بہت تحمل سے۔ کچھ دکھ اور بے یقینی سے سنی تھی۔ بس ایک لمحے کے لیے منجمد احساسات پگھلے کہ وہ اپنی غلطی تسلیم کر رہا ہے۔ مگر اس کے بعد......

''یعنی مجھے نقصان پہنچانے کا حق صرف تمہارے پاس ہے، اور کوئی مجھے کچھ نہ کہے۔'' بھرائی ہوئی آواز۔ آنسو متواتر گر رہے تھے۔

فارس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ صدمے سے۔ اور پھر بند کر لیا۔ وہ جنت کمال سے نہیں جیت سکتا تھا۔ اس حالت میں۔ اس معاملے میں۔ اس سچویشن میں تو بالکل بھی۔

''میں نے یہ نہیں کہا۔''

''میں تو یہی سمجھی ہوں۔'' وہ سسک پڑی۔

اس نے ہار ماننے والے انداز میں اپنے ہاتھ اٹھائے۔ ٹرے اس کے قریب رکھی۔ اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔ بند دروازے کے اس پار وہ بھاری دل کے ساتھ کتنی ہی دیر تک اپنی جگہ کھڑا رہا تھا۔

جنت کی سسکیاں تھم چکی تھیں۔ اس کا رونا بند ہو چکا تھا۔ اب صرف خاموشی تھی جو اس کے آس پاس ہر طرف ٹھہر گئی تھی۔

وہ دروازہ دھکیل کر اندر آ گیا۔ جنت سو چکی تھی۔ رو رو کر آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ ناک سرخ۔ کہیں کہیں آنسو ہنوز پلکوں پر ٹھہرے تھے۔ سوپ اس نے نہیں لیا تھا۔ کپڑے بھی نہیں بدلے تھے۔

ایک تاسف بھری نظر اس پر ڈالتے ہوئے اس نے بے حد احتیاط سے سر کے نیچے تکیہ دیا۔ لحاف درست کیا اور ٹرے اٹھائے کچن میں واپس آ گیا۔ پھر اس نے مسز شیرازی کو کال کی۔

''وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اچھا خاصا سین کری ایٹ کر دیتی ہے۔ رونے لگ جاتی ہے۔'' پورا حوالہ دینے کے بعد کچھ

فکرمندی سے وہ انہیں بتا رہا تھا۔ بس اس کے چیل کی طرح جھپٹنے والی بات گول کر گیا تھا۔

''موڈ سوینگز ہوں گے، پریگننسی میں ایسا ہوتا رہتا ہے، تم اپنا رویہ ٹھیک رکھو۔''

''میرا رویہ ٹھیک ہے ممی! اس کا ٹھیک نہیں ہو رہا۔'' وہ کچھ پریشان لگ رہا تھا۔ ''کچھ بھی غلط ہو جائے اسے لگتا ہے، میں نے جان بوجھ کر کیا ہے۔''

''تم اس کی جگہ ہوتے تو تم بھی یہی کرتے۔''

''میں شکوہ تو نہیں کر رہا۔'' وہ سر جھکا گیا۔ ''مجھے بس دکھ ہوتا ہے جب وہ...... میری نیت پر اس طرح شک کرتی ہے۔''

''تم بھی کرتے تھے بیٹا۔'' بات تلخ تھی۔ مگر سچ تھی۔ اس نے تسلیم کرتے ہوئے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ ہاں وہ بھی تو کرتا تھا۔ اس کی محبت، عنایت، فکرمندی سب اسے ڈراما اور ڈھونگ لگتا تھا۔ اور وہ کتنے دھڑلے سے اس کے منہ پر کہہ دیتا تھا۔ اس کی بے عزتی کر دیتا تھا۔ وہ اس کی دولت، اس کی وجاہت، اس کے اسٹیٹس کے لیے اپنی عزت نفس کی بھینٹ چڑھا رہی ہے۔ مطلب اور فائدے کے لیے اس کے آگے پیچھے پھر رہی ہے۔ اسے اپنے لفظ یاد آتے تھے۔ اپنا رویہ، لہجہ۔ نفرت۔ بے رخی۔ وہ خود کو خود ہی معاف نہیں کر پا رہا تھا تو وہ کیسے کر سکتی تھی؟

''وہ مجھ پر کبھی ٹرسٹ نہیں کرے گی۔'' آواز دل کی تھی۔ دل مایوس ہو رہا تھا۔

''ایسا سوچتے رہے تو کبھی نہیں کرے گی۔''

اس نے سر اٹھا کر اپنی ماں کو دیکھا۔

''اگر تم نے اپنے ارادے اور فیصلے بدلے ہیں تو وہ بھی ضرور بدلے گی۔''

ان کی یہ بات سن کر وہ بالکل خاموش ہو گیا۔

''اگر...... مزید گڑ بڑ ہو گئی تو؟'' خدشے کا اظہار کر دیا۔

''پھر سمجھ لینا، نصیب کا لکھا کوئی نہیں ٹال سکتا۔''

''ممی!'' اس نے سٹپٹا کر انہیں دیکھا۔ وہ دھیرے سے ہنس دیں۔

اپنے رشتوں کی فکر کرتا ہوا، اپنی زندگی کو سمجھتا ہوا، اپنا آپ کسی اور میں تلاشتا ہوا وہ انہیں فکرمند سا اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اس تبدیلی پر جتنا شکر کرتیں کم تھا۔

''پریشان نہیں ہو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' انہوں نے تسلی دی۔

مسز شیرازی سے بات کر کے باہر آیا تو شاپنگ بیگ سے جھانکتا ڈائنوسار اسے اندر تک سلگا گیا۔ اس ایک چیز کی وجہ سے

اتنے پھڑے ہوگئے تھے۔اس کی زوجہ محترمہ پورے دو گھنٹے پریشان میں گزار آئی تھیں۔اور قصور پھر بھی اس کا تھا۔مجرم پھر بھی وہی تھا۔اپنے بالوں میں انگلیاں چلاتا وہ لاؤنج کے صوفے پر جالیٹا۔اس کی ہر کام سے دلچسپی تقریباً ختم ہوچکی تھی۔اب وہ گہری نیند سونا چاہتا تھا۔مگر جانتا تھا نیند اسے نہیں آئے گی۔اس حالت میں۔اس کیفیت میں۔اس پریشانی میں تو بالکل بھی نہیں۔

اور اندر اسے مکمل بے آرام کر کے جنت کمال نیند کی گہری وادیوں میں اتری ہوئی تھی۔

☆☆☆

سرسبز میدان کے وسط میں بازو پھیلا کر بھاگتے ہوئے اس نے اوپر۔بہت اوپر آسمان کی طرف دیکھا تھا۔رم جھم بارش برس رہی تھی۔انگلی جتنے ایک ننھے سے کپ کو ہونٹوں سے لگا کر چائے پینے کی اداکاری کرتے نانا عین اس کے سامنے بیٹھے تھے۔ہوائیں یکا یک تیز ہوگئی تھیں۔ہر سو دھند پھیلنے لگی تھی۔کھڑکیاں تاریک ہو رہی تھیں۔روشنیاں ایک ایک کر کے گل ہونے لگی تھیں۔وہ نانا کے گھر تھی۔اور پل جھپکتے ہی اپنے گھر پہنچ گئی تھی۔

اور پھر وہی منظر۔شدید گرمیوں کی دوپہر۔سرخ اینٹوں کا فرش۔سیڑھیوں پر اس کے سامنے کھڑا حسنین۔ٹوٹتی بکھرتی ایک گڑیا۔وہی منظر، وہی تکلیف، وہی درد اور پھر وہی گڑیا کو بچانے کی جستجو۔مگر اب کے منظر بدلا تھا۔اب کی بار سیڑھیوں سے پھسلتا وجود حسنین کا نہیں اس کا تھا۔وہ چیخی تھی۔اور پھر چیختی چلی گئی تھی۔

''جنت۔''بازو سے پکڑ کر کسی نے جھنجھوڑ کر اسے جگایا تھا۔ایک جھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

آنکھیں آنسوؤں سے مکمل بھری ہوئی، سانس چڑھا ہوا، رنگت اڑی ہوئی۔۔

اس نے بمشکل سانس لیتے ہوئے خود پر جھکے چہرے کو دیکھا۔وہ فارس تھا۔وہ خود سے بیدار نہیں ہوئی تھی۔اسے جگایا گیا تھا۔

اس کے سہارا دینے پر وہ لرزتے وجود کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔تنفس بھاری تھا۔پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔وہ وحشت زدہ سی بوکھلائی ہوئی بیٹھی تھی۔

بیڈ سے اتر کر وہ اس کے لیے پانی کا گلاس لے آیا۔اس نے گلاس تھامنا چاہا تو ہاتھ بے طرح کپکپا رہے تھے۔فارس نے گلاس اپنے ہاتھوں میں رہنے دیا۔اس نے یوں پانی پیا جیسے صدیوں کی پیاسی ہو۔

نہ حالت سنبھلی۔نہ آنسو تھمے۔وجود سسکیوں کی زد میں رہا۔اثر خواب کا تھا۔وہ اپنی حقیقت سے بھی آزردہ ہو رہی تھی۔

''مجھے اکیلا چھوڑ دو۔اب۔''اپنی ہتھیلیاں مسلتے ہوئے کہا۔آواز رندھی ہوئی تھی۔اب تک اس نے بہت مضبوطی دکھائی تھی۔اپنے خوف کو ہمیشہ چھپا کر رکھا تھا۔کبھی آپے سے باہر نہیں ہوئی تھی۔مگر اب جو بریک لین میں ہوا تھا۔اور اس وقت بھی جو اس کی

حالت ہو رہی تھی۔اس کے بعد وہ فارس وجدان کو اپنے آس پاس نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

مگر وہ کھڑا رہا۔اس کے پاس، اس کے بالکل سامنے۔وہ ہمیشہ اس کی نیند میں خلل ڈالنے کے بعد بہت خاموشی سے کمرہ چھوڑ کر اسٹڈی روم میں چھپ جاتی تھی۔اب ایسا کرنے کی سکت رہی تھی نہ طاقت موجود تھی۔

''سنا نہیں، میں نے تم سے کیا کہا ہے؟''سر اٹھا کر سخت لہجے میں کہا۔آواز بے حد کمزور تھی۔

مگر وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہلا تھا۔اپنے گرد بازو باندھے وہ دائیں طرف کو جھک کر اپنا چہرہ چھپا گئی۔

وہ اس کے برابر میں بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''میری طرف دیکھو۔''مگر اس نے نہیں دیکھا۔

''جنت!''اس کا لہجہ نرم تھا۔

جنت نے رخ بدلا نہ سر اٹھایا۔

اور دوسرے ہی پل اس نے بہت نرمی سے بازو پھیلا کر اسے اپنے حصار میں لیا تھا۔وہ اس کی اس حرکت پر لمحے بھر کے لیے تھمی تھی۔پھر سکتے میں گئی تھی۔

بیک وقت کئی لمحے آنکھوں میں ٹھہر گئے، کئی منظر احساسات کا لبادہ اوڑھے حقیقت کا روپ دھار گئے۔فارس نے بہت نرمی سے جنت کمال کی پیشانی اپنے کندھے سے مس کی......

اور اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔وہ احساس، وہ لمس، وہ گرفت ویسی ہی تھی جیسی اس کے نانا کی ہوا کرتی تھی۔محبت اور سکون کا احساس دلاتی ہوئی۔تسلی تشفی کراتی ہوئی۔

''خواب ہی تو تھا۔''وہ بولا۔

''وہ صرف خواب نہیں تھا۔''وہ سسک پڑی۔اپنے تمام اختلاف، اپنا غصہ، اپنی ناراضی ایک طرف رکھے وہ اس کا ہاتھ تھام چکی تھی۔بہت مضبوطی سے۔سختی سے۔بالکل ویسے ہی جیسے وہ نانا کا ہاتھ پکڑا کرتی تھی۔فارس کے دل کو کچھ ہوا۔اپنے کسی خواب کے اثر سے نکلنا اس کے لیے کتنا مشکل رہا ہوگا، اس کا اندازہ جیسے آج ہو رہا تھا۔

اسے وہ وقت یاد آیا جب اس نے جنت کو کمرے سے نکال دیا تھا اور وہ دروازہ بجاتے ہوئے اس کی منت کرتی رہی تھی، وہ اسے اندر آنے دے۔اس رات اس نے دروازہ نہیں کھولا تھا۔اس رات اس کی حالت زیادہ خراب تھی۔وہ زیادہ خوف زدہ تھی۔وہ زیادہ پریشان تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا، وہ اب اس کا خوف کیسے کم کرے، لفظ کم پڑ گئے تھے۔ذہن خالی ہوگیا تھا۔

''کہیں باہر چلیں؟''اس نے کہا۔

''اس وقت؟''

''ہاں۔''اس نے جنت کے ہاتھ پر نرمی سے گرفت بڑھائی۔اس نے نفی میں سر ہلایا۔وہ چاہتی تھی، وقت رک جائے، سب ٹھہر جائے۔بس یہ احساس باقی رہے۔یہ کیفیت ٹھہری رہے۔

''واک کرتے ہیں! یا کوئی مووی دیکھ لیتے ہیں۔''

نانا بھی اسے بہلانے کو ایسے ہی کہا کرتے تھے۔ایسے ہی اس کا ہاتھ تھپتھپایا کرتے تھے۔اسے کندھے سے لگایا کرتے تھے۔وہ ان کے مضبوط کندھے سے پیشانی ٹکاتی تھی تو دنیا کا ہر غم اور ہر تکلیف ان کے حصار میں آتے ہی ختم ہو جاتی تھی۔اب بھی یہی ہوا تھا۔فارس وجدان میں نانا آگئے تھے۔فارس وجدان میں ''محبت'' آگئی تھی۔''ترحم'' آگیا تھا۔

کیفیت سمجھ سے باہر ہوگئی۔اس کی سسکیاں بڑھتی گئیں۔

''میں کھانا لگاتا ہوں۔تم کچھ کھائے بغیر ہی سوگئی تھیں۔''

''کہیں مت جاؤ۔۔پلیز۔''

وہ رک گیا۔اس کی دھیمی دھیمی سسکیاں اس کی اذیت بڑھانے لگیں۔

''وہ صرف ایک خواب تھا۔ختم ہوگیا۔''نرمی سے ایک بار پھر سمجھایا۔فارس وجدان کیا جانے، اس پر وہ ساعتیں اسی انداز میں گزرتی تھیں۔اور بار بار گزرتی تھیں۔خواب تو اک بہانا تھا۔حقیقت اپنا آپ دہرانے آتی تھی۔

چند لمحوں کے بعد وہ کچھ حد تک سنبھل کر آنسو صاف کرتے خود ہی الگ ہوگئی۔

''میں کھانا لگاتا ہوں۔''

وہ اٹھ کر چلا گیا۔

جنت کچھ دیر تک ایسے ہی بیٹھی رہی۔پھر خود کو سنبھالتے ہوئے اٹھ کر باہر آگئی۔گھر تاریک تھا مگر اوپن کچن کی تمام بتیاں روشن تھیں۔

وہ کاؤنٹر ٹیبل کے اس پار فارس وجدان کو فریج سے کچھ نکالتا دیکھ سکتی تھی۔آہٹ پر اس نے مڑ کر جنت کو دیکھا۔

''ہیو آ سیٹ پلیز!''اس نے اشارہ کیا تو چہرے کے اطراف میں منڈلاتی لٹوں کو پیچھے اڑستی وہ ہاتھ دھونے کے بعد کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی تھی۔

شہد رنگ بال پشت پر سیدھا گر رہے تھے، آنکھیں سوجی ہوئی کچھ متورم سی لگ رہی تھیں۔کچھ دیر پہلے والی کیفیت نہیں رہی

تھی مگر تاثرات ابھی بھی ویسے ہی تھے۔

وہ مائکروویو اوون میں کھانا گرم کرتے ہوئے میز پر ترتیب سے رکھتا جا رہا تھا۔

اسے ادراک ہوا، وہ بھوکی سوئی تھی تو کھانا فارس نے بھی نہیں کھایا تھا۔

''شروع کرو۔''فرائیڈ چکن، فرائڈ رائس، پیزا، وہ مختلف چیزیں اس کے سامنے رکھ رہا تھا۔

اس نے اپنی پلیٹ قریب کر لی۔کوئی بھی بات کیے بغیر خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔ذرا سی نظر اٹھا کر وہ اسے دیکھ لیتی۔کیا وہ شروع سے ایسا تھا؟ یا اب ہو گیا تھا؟

نفرت کہاں گئی تھی؟ حقارت کہاں چھپی تھی؟ چالیں ایسی تو نہیں ہوتیں؟ منصوبے اس طرح کے تو نہیں ہوتے؟

''کچھ چاہیے؟''اسے یوں اپنی جانب دیکھتا پا کر فارس نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے نظر ہٹالی۔

کھانا کھانے کے بعد وہ استعمال شدہ برتن دھو رہا تھا تو وہ بھی بچا ہوا کھانا فریج میں رکھنے لگی تھی۔اس کے بعد اس نے کافی بنانے کا ارادہ کیا تو فارس نے روک دیا۔

''میں چاہوں گا، اب تم ریسٹ کرو۔''

''مجھے نیند نہیں آئے گی۔''وہ اس کی طرف دیکھے بنا بولی۔

''آجائے گی۔''

برنر بند کر کے وہ اس کی کلائی تھامے اسے کمرے میں لے آیا۔

اس کے کہنے پر سر درد اور بخار کی گولی لے کر وہ سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔

شاید اسے پانچ منٹ لگے تھے، دس منٹ یا شاید پندرہ منٹ۔اپنے اندر کے خوف سے لڑتے وہ نیند کی وادیوں میں اتر گئی تھی۔

فارس نے ایک بار پھر اس کی پیشانی کو چھو کر دیکھا۔ہلکا سا بخار تھا۔لیکن وہ نیند میں اب مکمل پرسکون تھی۔وہ بھی سکون میں آ گیا۔

باہر تاریکی میں وقفے وقفے سے بجلی چمکنے لگی تھی۔گلاس والز پر کہیں کہیں بارش کے ننھے ننھے قطروں میں شہر کی روشنیاں منعکس ہو رہی تھیں۔وہ اپنے لیے کافی بنا کر گلاس والز کی سامنے جا کھڑا ہوا۔بجلی ایک بار پھر چمکی تھی۔ہر طرف اندھیرے بڑھ گئے تھے۔

☆☆☆

اگلی صبح اس کی آنکھ نو بجے کھلی تھی۔ کمرے میں اس کے سوا کوئی نہ تھا۔ دیوار گیر کھڑکیوں کے پردے سمٹے ہوئے تھے۔ آسمان سرمئی بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی بارش ابھی بھی ہو رہی تھی۔ اور پھر ذہن میں نیند سے محو ہو جانے والا ہر دکھ، ہر قصہ، ہر قضیہ پھر سے واضح ہو گیا۔

وہ بریک لین میں کھو گئی تھی۔ اس نے فارس وجدان سے لڑائی کی تھی۔ وہ خواب میں ڈر گئی تھی۔ اور پھر وہ احساس۔ اس نے بھیگی آنکھوں کو مسل ڈالا۔ نئی صبح کی شروعات آنسوؤں سے نہیں ہونی چاہیے۔ گلا کھنکھار کر، گال تھپتھپا کر خود کو کمپوز کیا۔ ہر منفی خیال کو جھٹک دیا۔

اس نے اٹھ کر وارڈروب سے کپڑے نکالے۔ نیم گرم پانی سے شاور لے کر فریش ہوئی، بالوں کو ڈرائیر سے خشک کر کے کھلا چھوڑ دیا۔ سفید ٹراؤزر پر گلابی رنگ کی قمیص اور اس پر گلابی ہی رنگ کا اونی سویٹر زیب تن کیے وہ کمرے سے باہر آئی تو خلاف معمول آج میڈ نہیں آئی تھی۔

کچن میں نیلی جینز پر سفید رنگ کے اونی سویٹر میں ملبوس فارس ناشتے کا انتظام خود دیکھ رہا تھا۔ اسے شدید حیرت ہوئی۔ مگر خود سے گفتگو کا آغاز کیے بغیر وہ کچن میں چلی آئی۔ اپنے لیے گلاس میں پانی ڈال کر پیا۔ ایک سرسری سی نگاہ میز پر دھرے ناشتے کے لوازمات پر ڈالی۔

ہاف فرائی ایگ، ٹوسٹ، مینگو شیک، کیک، چائے۔

''گڈ مارننگ۔'' فارس کا رویہ ویسا ہی تھا جیسا ہر صبح ہوتا تھا۔ حالانکہ گزشتہ شب بریک لین میں جو سین اس نے پیش کیا تھا، اس کے بعد اس رویے کی قطعی کوئی گنجائش نہیں بنتی تھی۔

''اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟'' وہ کانچ کے گلاس میں مینگو شیک ڈالتے ہوئے بولا۔

''بہتر ہے۔'' وہ خالی گلاس پر پیانو کے سے انداز میں انگلیوں کو جنبش دے رہی تھی۔

''بیٹھو۔'' اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے اس نے جنت کو بائیں ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ایک اور خراش نما سرخ لکیر نظر آ گئی۔

جنت اپنی اس حرکت پر جی بھر کر شرمندہ ہوئی۔ پتا نہیں اسے کیا ہوا تھا۔ اس نے ایسا پہلے تو کبھی نہیں کیا تھا۔ اور پھر جب یاد آیا، وہ اسے ایک عدد تھپڑ سے بھی نواز چکی ہے۔ تو نچلا لب بے ساختہ دانتوں تلے آ گیا۔ دل شرمندہ تھا، دماغ فورا اسے ڈٹ گیا۔ اس تھپڑ کا تو خیر وہ بہت مستحق تھا۔ بہت زیادہ۔ لیکن اب کے جنگلی بلی کی طرح اس نے حملے کی جو کوشش کی تھی اس پر دماغ بھی اس کی سائیڈ نہیں لے رہا تھا۔ اب حواس پوری طرح سے بحال تھے تو اس نے کچھ خوف، شرمندگی اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اسے دیکھا تھا۔

فارس نے ابھی تک غصہ نہیں دکھایا تھا۔ نہ ہی ناراضی کا اظہار کیا تھا۔ وہ اس کی حالت کے پیش نظر خاموش رہ گیا ہوگا مگر بھولا تو ہرگز نہیں ہوگا۔

پھر اسے یاد آیا اس نے رات بھر اس کا کتنا خیال رکھا تھا۔ اور کیسے اسے خوف بھری کیفیت سے نکالا تھا۔

لیکن اس کا مطلب یہ تو ہرگز نہیں کہ وہ سزا کا نہیں سوچ رہا ہوگا؟ وہی واہمے۔ وہی سرگوشیاں۔ وہی بے اعتباری۔ اور وہی سوال۔ ایک ایک حرکت کا حساب لینے والا اب اتنی بڑی بات کیسے نظر انداز کر گیا؟ اب کے سر اٹھایا تو نگاہیں فارس سے دوچار ہوئیں۔

''نہیں، میں انتقام لینے کا نہیں سوچ رہا۔ اور نہ ہی میں نے کھانے میں زہر ملایا ہے۔''

اور جنت کا دل چاہا، زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ لیکن اپنے تاثرات سے بالکل ظاہر نہیں ہونے دیا کہ ایسی کوئی خواہش اس کے اندر جاگ چکی ہے۔

''چاہو تو کھانا چکھ کر دے دوں شہزادی صاحبہ؟'' اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ وہ اس کی کیفیت سے حظ اٹھا رہا تھا۔

اندر ہی اندر وہ بہت سارا چیخی لیکن باہر سے خود کو کمپوز کیے سنجیدہ سی کھڑی رہی۔

''جس دن زہر دو گے، اس دن چکھنے کی بات بھی نہیں کرو گے۔''

بڑی مضبوطی دکھا کر کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ وہ اس کی حاضر جوابی سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔ ہاں اب وہ ٹھیک تھی۔ فارس کو تسلی ہوئی۔ ''میری وائف کتنی جینئس ہے۔''

اس نے طنز نہیں کیا تھا مگر جنت کو وہ اچھا خاصا طنز ہی لگا۔ اوپر سے اس کی مسکراہٹ۔ وہ نظر ہٹا گئی۔

ایک ٹوسٹ کھانے کے بعد اس نے کیک کا پیس اور مینگو شیک اپنے قریب کر لیا۔

فارس کی خاموش نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

اس نے فورک سے کیک کا حصہ کاٹ کر منہ میں ڈالا۔ فارس وجدان کو سات سالہ جنت ایک جھلک کی طرح نظر آئی۔ آنکھیں مٹکا کر، ہاتھ جھلا کر کیک اور مینگو جوس سے انصاف کرتی۔ بے تحاشا باتیں کرتے ہوئے۔ مگر جو سامنے بیٹھی تھی۔ بالکل خاموش۔ کچھ حد تک اداس۔ بہت حد تک پریشان۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟'' وہ کچھ جزبز ہوئی۔

''جب میں چودہ سال کا تھا تو ایک چھوٹی سی بچی میری زبردستی کی مہمان بنی تھی۔'' وہ اپنے کپ میں چائے ڈالنے لگا۔

''اس کی خواہش تھی کہ اس کی خاطر مدارت مینگو جوس اور کیک سے کی جائے۔ بھلا کوئی مہمان ایسے کہتا ہے؟'' ٹی پاٹ رکھ کر

عسریسرا۔ حسنیٰ حسین

اپنا کپ اٹھالیا۔

''وہ بہت باتونی تھی۔ بہت زیادہ۔ میں چاہتا تھا وہ اپنا جوس اور کیک جلد ختم کرے تاکہ میں اسے واپس اس کے گھر چھوڑ آؤں مگر وہ بہت آہستہ آہستہ کھا رہی تھی۔ تو میں نے اس کا کیک اور جوس خود ہی کھالیا۔''

جنت نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''تم تب بھی ظالم تھے؟'' توقع کے عین مطابق اسے تپ چڑھی۔ وہ مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔

''اب میں دو تین گھنٹوں تک اس کے ساتھ باؤنڈ ہو کر تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اور پھر وہ بہت شرارتی اور ایکٹو تھی اور مجھے اس پر باقاعدہ نظر رکھنی پڑ رہی تھی۔ سو اس کے لیے ضروری تھا، میں اسے گھر ہی چھوڑ آؤں۔'' اس نے کندھے اچکا کر اپنی پوزیشن کلیئر کی۔

جنت نے اسے یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو تمہارا کوئی علاج نہیں۔

''ویسے تم کیسی تھیں بچپن میں؟''

''میں؟'' وہ اس کے اس طرح اچانک پوچھنے پر گڑبڑا گئی۔

''ہاں تم!''

''میں.....'' رک کر کچھ سوچا۔ ایک ہی لمحے میں بچپن اور لڑکپن کی بہت سی باتیں، قصے، واقعات، نانا کی ڈانٹ اور شرارتیں یاد آئی تھیں۔

''میں تو بہت ڈیسنٹ بچی تھی۔ بالکل شور نہیں کرتی تھی، نہ ہی شرارتی تھی، اور اتنا کم بولتی تھی۔ نانا کے سب دوست میری تعریف کرتے تھے۔''

لب بھینچ کر فارس نے اپنی مسکراہٹ ضبط کر لی۔ ''اچھا'' اس کا اچھا ضرورت سے کچھ زیادہ لمبا ہو گیا تھا۔

''ہاں تو اور کیا؟''

''یعنی اگر ہماری بیٹی ہوئی تو وہ تم پر جائے گی۔ خاموش۔ پرسکون۔ شرارتیں بھی نہیں کرے گی۔ بولے گی بہت کم۔''

''بالکل!'' فوراً سے سر ہلایا۔ پھر ہلا کر پچھتائی۔ ساری گفتگو بچے کی طرف مڑ گئی تھی۔

''بیٹا مجھ پر جائے گا پھر۔'' فارس نے کچھ سوچ کر کہا۔

''مجھے کھڑوس اولاد نہیں چاہیے۔'' وہ بے ساختہ کہہ گئی۔

وہ اس کے انداز اور لہجے پر دھیرے سے ہنس دیا۔ جنت کمال نے اسے لمحے بھر کے لیے مبہوت ہو کر دیکھا۔ وہ ہنستے ہوئے کتنا اچھا لگا تھا۔ فوراً ہی نظریں ہٹائیں۔

''کوئی پیدائشی کھڑوس تھوڑی نہ ہوتا ہے۔ وقت اور حالات بنا دیتے ہیں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''میں تو نہیں بنی۔''

اور وہ رک گیا۔ ہاں! یہی تو اس کی خوبی تھی۔ اس نے حالات کو کبھی بھی اپنے رویے اور شخصیت پر حاوی ہونے نہیں دیا تھا۔ وہ تلخیوں سے گزر کر بھی اپنی زندگی کے لیے تلخ نہیں ہوئی تھی۔

فورک سے کیک کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے جنت نے اسٹرا دانتوں تلے دبایا۔

فارس کو لگا یہی مناسب وقت ہے۔ نئی ابتدا کے لیے پہل کر لینی چاہیے۔

''دوستی کرو گی مجھ سے؟ بہت اچھا لڑکا ہوں میں۔ ساری عمر ساتھ نبھاؤں گا۔''

جنت کی دھڑکن مس ہوئی۔ سوال بہت اچانک اور غیر متوقع تھا۔ آفر بھی ویسی ہی حیران کن سی تھی۔ وہ اس کا جملہ دہرا رہا تھا۔ اس کی جگہ پر آ کر۔ اس کی نگاہوں میں آ رہا تھا۔ وہ اسے بالکل بھی نظر انداز نہیں کر پا رہی تھی۔

''اور یہ دوستی کی آفر تم کتنی لڑکیوں کو کر چکے ہو؟'' بھنویں سکیڑ کر تندی سے گھورتے ہوئے پوچھا۔ بالکل فارس وجدان کے انداز میں۔ اور ایسا کرتے ہوئے اسے وہ بہت اچھی لگی۔

''تم پہلی ہو۔ اور تم ہی آخری ہو۔''

جنت کا دل زوروں سے دھڑکا۔ حیرت آنکھوں میں سما گئی۔ دل چاہا، جھٹ سے عدینہ زبیر کو اس دعوے پر لا پٹخے مگر پھر رک گئی۔ بات دوستی کی تھی۔ محبت کی تو نہیں۔

''سوچوں گی۔'' لاپروائی سے اترا کر کہا۔ پھر کیک کا آخری ٹکڑا منہ میں ڈالا۔ اب وہ پہلے سے کافی بہتر لگ رہی تھی۔

''کتنا سوچو گی؟''

''جتنا بھی سوچوں۔ تمہیں اس سے کیا۔''

فارس نے تائید میں سر ہلایا۔ بہت زیادہ سوچنے میں وہ حق بجانب تھی۔ اسے کوئی اعتراض نہ تھا۔

''پانچ بجے تیار رہنا! کہیں باہر چلیں گے۔'' وہ کچن کا بکھیڑا سمیٹ رہی تھی جب فارس نے آ کر کہا۔ خیال تھا شاید وہ اب بھی غصہ یا ناراضی دکھائے گی یا کوئی سخت تلخ بات تو ضرور کرے گی مگر اس نے کچھ نہ کہا۔ بس رک کر اسے دیکھا۔

تھری پیس سوٹ میں ملبوس وہ مکمل تیاری کے ساتھ، سیاہ رنگ کا لانگ کوٹ بازو پر ڈالے، دوسرے ہاتھ میں موبائل اٹھائے کھڑا تھا۔

''وسٹ فیلڈ مال چلیں گے، شاپنگ کے لیے۔ باہر کھانا کھائیں گے۔ موسم کچھ سرد ہے اور بارش کا بھی امکان ہے تو آؤٹنگ

کے لیے کچھ دن انتظار کر لیتے ہیں۔‘‘

وہ رخ بدل کر پھر سے برتن دھونے لگی۔ فارس بھی کچھ لمحوں تک خاموش رہا۔ جانے اس کے تاثرات اب کیسے تھے؟ احساسات اور کیفیت کیسی ہوئی تھی۔ مزاج تو اس کے لمحوں میں بدلتے تھے۔ کسی لمحے بہت زیادہ خوش۔ کسی پل بہت زیادہ اداس۔ لیکن اس کی خاموشی میں فارس وجدان کو عنادیا خفگی کا تاثر نظر نہیں آ رہا تھا اور یہ ایک خوش آئند بات تھی اس کے لیے۔

’’اپنا خیال رکھنا۔‘‘ اس نے کوٹ پہنتے ہوئے جنت کمال سے کہا۔ اور جنت کمال نے کچھ ہی دیر بعد آٹومیٹک دروازہ کھلنے اور سگنل کے ساتھ بند ہونے کی آواز سنی۔

جھاگ زدہ ہتھیلی کھول کر وہ ہونٹوں تک لائی۔ پھونک کر اڑایا۔ پھر دھیرے سے گنگناتی بقیہ کام سمیٹنے لگی۔

☆☆☆

وسٹ فیلڈ لندن مال کے کڈز سیکشن میں گلابی اور آسمانی رنگ کی اشیاء کا ڈھیر تھا جو جنت کمال کی ٹرالی میں اکٹھا ہو چکا تھا۔ وہ تو بہت سوچ سمجھ کر چیزیں اٹھا رہا تھا مگر جنت کا بس نہیں چل رہا تھا پورا شاپنگ مال خرید لے۔ وہ اس کی ایکسائٹمنٹ، اس کا جنون اس کی خوشی دیکھ کر مسکراتا ہی رہا۔

وہ دو رنگوں کی چیزیں خرید رہی تھی کہ اگر بیٹا ہوا تو بیٹی کے لیے خریدی جانے والی اشیاء چیریٹی کر دے گی۔ اور اگر بیٹی ہوئی تو پھر بیٹے کے لیے خریدا جانے والا سامان خیرات میں جائے گا۔

’’اور اگر ٹوینز ہوئے تو؟‘‘ فارس نے سوال کیا۔ وہ لمحے بھر کے لیے تھمی۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں! اسے الجھا کر وہ متبسم چہرے کے ساتھ رخ موڑ کر کچھ اور دیکھنے لگا۔

’’تب ہم آدھی چیزیں رکھیں گے اور آدھی چیریٹی کر دیں گے۔‘‘ اس کے پیچھے جا کر کہا۔ بے دھیانی میں وہ ’’ہم‘‘ کہہ گئی۔

’’ٹھیک ہے ’’ہم‘‘ (زور دے کر) ایسا ہی کریں گے۔‘‘

’’میں صرف اپنی بات کر رہی ہوں۔‘‘ سٹپٹا کر تصحیح کی۔

’’نہیں تم ہماری بات کر رہی ہو۔‘‘

وہ ضبط کر کے رخ بدل گئی۔

’’اور اگر ٹرپلٹس ہوئے تو؟‘‘ کچھ دیر بعد پیچھے سے آواز آئی۔ گہری سانس لے کر جنت نے رخ موڑا۔ وہ آنکھوں میں شرارت لیے اسٹینڈ پر لٹکے نومولود بچوں کے کپڑوں میں سر دے چکا تھا۔

’’پہلے ایک، پھر دو، پھر تین۔ کچھ دیر بعد کہو گے چار۔‘‘ اس نے گھورا۔

’’اس بار ٹوینز ٹھیک ہیں۔‘‘ وہ بولا۔ ’’ان شاء اللہ اگلی بار ٹرپلٹس!‘‘

’’میرے ساتھ زیادہ فری ہونے کی کوشش مت کرو تم۔‘‘ کچھ اور سمجھ میں نہیں آیا تو ڈانٹ کر چلی گئی۔ وہ ہنس دیا۔

’’یہ بات ایک بیوی اپنے شوہر سے کہہ رہی ہے۔‘‘

’’وہی شوہر جو کچھ عرصے تک کہتا رہا۔ میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔‘‘ آخری جملے میں بھرپور نقل اتاری۔

’’مگر وہ اب نہیں کہتا۔‘‘ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ اس کے پیچھے تھا۔

’’مگر مجھے تو ابھی بھی سنائی دیتا ہے۔‘‘ وہ ٹرالی دھکیلتی جا رہی تھی۔

’’پھر تم اس کے دل کی نہیں سن رہی ہو۔‘‘

’’میں سننا بھی نہیں چاہتی۔‘‘

وہ زیر لب مسکراتے ہوئے اس کے پیچھے رہا۔

’’ویسے نام کے بارے میں کیا سوچا ہے؟‘‘

’’مسٹر شیرازی۔‘‘ وہ ضبط کر کے اس کی طرف مڑی۔ ’’شاید آپ بھول رہے ہیں، میں نے دوستی کی آفر ابھی قبول نہیں کی ہے۔‘‘

’’کر لو! پھر اتنا تنگ نہیں کروں گا۔‘‘ اس کا لہجہ صلح جو تھا

’’یعنی تم مانتے ہو، تم مجھے تنگ کر رہے ہو۔‘‘ لب بھینچ کر پوچھا۔

’’میں نے ایسا تو ہرگز نہیں کہا۔‘‘ وہ صاف مکر گیا۔ دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں تھے۔ مفلر اس نے عادتاً گردن کے گرد ہونٹوں تک اوڑھ رکھا تھا۔ سو وہ بس اس کی آنکھوں سے جھلکتی شرارت ہی دیکھ سکتی تھی۔ مسکراہٹ ہرگز نہیں۔

’’تم ذرا دیر کے لیے وہاں بیٹھ نہیں سکتے؟‘‘ اس نے زچ ہو کر ہاتھ سے اس کے پیچھے اشارہ کیا جہاں ایک عدد گورا شوہر بنچ پر بیٹھا گیم کھیل رہا تھا۔ بیوی شاپنگ میں کہیں مصروف ہو گی۔

’’ہاں، تا کہ تم دوبارہ گم ہو جاؤ اور پھر وہی شور مچاؤ۔ تم نے جان بوجھ کر مجھے گم کیا۔۔ تم نے جان بوجھ کر۔ یہ کیا......وہ کیا...... تم ظالم۔ ڈرامے باز۔ دھوکے باز۔ جھوٹے۔۔ فراڈیے۔‘‘

اب وہ اس کی نقل اتار رہا تھا۔ غصے کے باوجود جنت سٹپٹا گئی۔ چہرہ خفت سے سرخ پڑا۔ داہنا ہاتھ ایک پل کے لیے شرم ساری سے آنکھوں پر رکھا پھر لب بھینچ کر اسے ایک خطرناک قسم کی گھوری دی۔

’’عدیل مجھے مشورے دے رہا تھا۔ سر میم کے موبائل میں ٹریک ایپ انسٹال کر لیں۔ اسے نہیں معلوم اس کی میم خود گم ہونے

سے پہلے تسلی سے اپنا موبائل گم کرتی ہیں۔''

''تم.....''اس کا پارہ چڑھا۔''اب میرے پیچھے آئے تو دیکھنا۔''دھمکا کر چلی گئی۔

وہ لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ سجائے رخ بدل کر ننھے منے جوتوں کو دیکھنے لگا۔ مفلر اس نے گردن پر ٹھہرا لیا۔

عین سامنے ٹوڈلرز کا سیکشن تھا۔ اور پھر اس سے آگے چھوٹی بچیوں کے کھلونے رکھے تھے۔ کھلونوں میں گلابی رنگ کا ایک منی کچن سیٹ ان میں نمایاں تھا۔ اور بے حد نمایاں تھا۔ فارس کے قدم جامد، ہاتھ بے جان ہوئے۔ نگاہیں اسی مقام پر جم گئیں۔ جنت کی نظر اس پر پڑی تو اپنی جگہ رک گئی۔

فارس کی آنکھیں ویران۔ چہرہ ہر تاثر سے بالکل عاری ہو چکا تھا۔ لبوں پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ آنکھوں میں زندگی نہیں تھی۔ وہ اس کے ساتھ۔ اس مال میں۔ اس کے ہمراہ جیسے اب کہیں نہیں تھا۔

اس نے سر اٹھا کر اس طرف دیکھا جس سمت فارس کی نگاہیں ٹھہری تھیں۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ کچھ نہ تھا۔

ایسی ہی ایک حالت اس کی پہلے بھی ہوئی تھی۔ شاید کار ایکسیڈنٹ کے وقت۔ بوا کے گھر کے سامنے۔ بارش کے دوران؟ شاید تب۔ جب اس نے عدینہ زبیر کا ذکر کیا تھا؟ لیکن نہیں۔ یہ تاثر مختلف تھا۔ ان سب سے مختلف۔

قریب آ کر اس کے بازو پر آہستگی سے ہاتھ رکھا۔ نہ جمود ٹوٹا۔ نہ وہ اپنے خیال سے باہر آیا۔

''فارس!''ہلا کر آواز دی۔

طلسم ٹوٹ گیا۔ دروازے بند ہوئے، شور تھم گیا۔ آوازیں ختم ہو گئیں۔ فارس نے کچھ چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ جنت نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ وہ تین منٹ تک مسلسل ایک ہی جگہ پر نظر جمائے اطراف سے یکسر بے نیاز کھڑا رہا تھا۔ وہ ظاہر نہ بھی کرتی تب بھی یہ واضح تھا وہ پریشان ہوئی تھی۔

''ہاں۔ بولو۔''وہ اس کی طرف متوجہ تھا مگر پوری طرح سے بالکل نہیں۔

''کچھ نہیں۔ کاؤنٹر پر جانا ہے۔''اس نے کہہ دیا۔

''بس.....اور کچھ نہیں لینا؟''اس نے کپکپاتے ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈال لیے تھے۔ جنت نے نفی میں سر ہلا دیا۔

وہ اپنے والٹ سے کریڈٹ کارڈ نکالتے ہوئے ٹرالی دھکیلتا کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔ جنت کمال نے اس کے پیچھے چلتے ہوئے ایک بار پھر اسی سمت دیکھا مگر اسے کوئی بھی ایسی شے یا کوئی بھی ایسا شخص نظر نہ آیا جس نے کچھ دیر کے لیے فارس وجدان کو فریز کر دیا تھا۔ اسے اپنا وہم گردانتے ہوئے وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی تھی۔

شاپنگ کے بعد وہ اسے حلال فوڈ ریسٹورنٹ میں لے آیا تھا۔ اس کی آمد کا سن کر سوٹڈ بوٹڈ منیجر خود مینو کارڈ لے کر آیا۔ آؤ بھگت

دیکھ کر جنت نے خود سے ہی اندازہ لگا لیا، وہ یہاں کا ریگولر کسٹمر ہو گا یا پھر مالک کے ساتھ اس کے گہرے مراسم رہے ہوں گے۔

وہ مینو کارڈ اٹھائے آرڈر نوٹ کروا رہا تھا اور وہ اپنے آس پاس نگاہیں دوڑا رہی تھی۔ سیاہ اور گولڈن تھیم میں ریسٹورانٹ کا انٹیریئر واقعی میں خوب صورت تھا۔ اسے بہت اچھا لگا۔ اس نے تصویریں کھینچ کر مسز شیرازی کو بھی سینڈ کیں۔ آس پاس دوسری میزوں پر اور بھی بہت سی مسلم فیملیز نظر آ رہی تھیں۔

''تو میرا کانٹیکٹ نمبر اب تم نے کس نام سے سیو (محفوظ) کر رکھا ہے؟''کھانا سرو کر دیا گیا تو فارس نے پوچھا۔

''کسی نام سے نہیں۔''بے نیازی سے بولی۔

فارس کی نگاہیں میز پر اس کے برابر میں رکھے موبائل پر پڑیں۔ اگر ابھی جو وہ کال کرے تو یقیناً اسکرین پر نام ابھر آئے گا۔ اسے وہ نیلے پیلے دلوں والا کاغذی ہزبینڈ یاد آیا۔ پہلے والی جنت یاد آئی۔ تب وہ اسے کاغذی شوہر مان کر ہی بہت خوش تھی۔

''یہ تو میرے ساتھ نری زیادتی ہے۔''وہ کہے بنا نہ رہ سکا۔

جنت نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔''اچھا تمہارے ساتھ زیادتی ہے؟ بھلا کیسے؟؟''

''جب کاغذی شوہر تھا تب اہمیت تھی، اب اصلی شوہر ہوں تو.....''

''اہمیت تمہاری اس وقت بھی نہیں بنتی تھی۔''اس نے جھٹ سے کہا۔''میں پاگل تھی جو یہ سوچ رہی تھی، تمہارے دل میں جگہ بنا لوں گی۔ یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا، تمہارا تو صرف دماغ ہے۔ دل تو سرے سے ہے ہی نہیں۔''

وہ چمچ منہ تک لے جاتے ہوئے ایک لمحے کے لیے رکا تھا۔ بس ایک لمحے کے لیے۔ ریسٹورانٹ کی روشنیوں میں اس کی آنکھوں میں حزن کی مبہم سی لہر اٹھی۔ اور وہی لہر مسکراہٹ بن کر لبوں پر بکھر گئی۔ جنت اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اب اسے نہیں دیکھتی تھی۔ نہ اس کی آنکھوں میں اپنا عکس۔ نہ اس کے دل میں اپنی جگہ.....

''یہ تو تم نے بالکل ٹھیک کہا۔''

جیب سے موبائل نکال کر نمبر ملایا۔ جنت کا موبائل جگمگ کرنے لگا۔

اوپر بڑا بڑا سا لکھا تھا۔''آنٹی کا بیٹا''بیک گراؤنڈ کی تصویر سرد، برفیلے آندھی طوفانوں سے گھرے پہاڑوں کی تھی۔

جنت نے گڑبڑا کر فوراً ہی اپنا موبائل پلٹ دیا۔

آنٹی کا بیٹا حیران کن تھا مگر فارس کو صدمہ بیک گراؤنڈ تصویر سے پہنچا تھا۔

''یہ تم نے میرے نام کے ساتھ کے ٹو کی تصویر لگائی ہوئی ہے؟''خیال گزرا آنکھوں کو دھوکا ہوا ہو گا۔

''ہاں تو۔''

عسریسرا۔ حسنیٰ حسین

''کیوں؟''

''کیوں کیا مطلب؟ میری مرضی میں، کوئی بھی تصویر لگاؤں؟ اب تم مجھے کھانا کھانے دو گے؟''

''شیور۔'' دانت پیس کر کہا پھر اپنا موبائل اٹھالیا۔ جنت نے جز بز ہو کر اسے دیکھا۔ ''کیا کر رہے ہو؟''

''اگر تم میرے نام کے ساتھ خوف ناک تصویریں لگا سکتی ہو تو میں کیوں نہیں؟''

لمحوں میں سب سیٹ کر کے موبائل رکھ دیا۔ لبوں پر ایک جلا دینے والی مسکراہٹ سجائے پھر سے کھانے لگا۔ جنت لب بھینچ کر اسے دیکھ رہی تھی۔

''مجھے پروا نہیں، تم کوئی بھی تصویر لگاؤ۔'' کندھے اچکا کر کہا مگر اندر ہی اندر۔

اچھی بات ہے۔'' اس نے سر ہلایا۔

کھانے کے بعد لانگ ڈرائیو کا پلان تھا۔ واپسی پر شام کے گیارہ بج گئے۔ وہ سو گیا تو چپکے سے اس کا موبائل اٹھا کر اپنے موبائل سے مسڈ کال دی۔ اسکرین پر نام روشن ہوا۔

بڑا بڑا سا لکھا ہوا تھا۔ ''ممی کی بہو۔'' اور بیک گراؤنڈ میں ایک ذومبی کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ اس نے تپ کر فارس وجدان کو دیکھا۔ دل چاہا موبائل توڑ دے مگر ضبط کر کے اٹھ گئی تھی۔

☆☆☆

آج فارس وجدان کے دوست کی شادی تھی۔

اپنی تیاریوں میں مگن اس نے دو کام دار جوڑے بیڈ پر پھیلائے ہوئے تھے۔ ایک آسمانی رنگ کا تھا، دوسرا ہلکے گلابی رنگ کا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کون سا والا پہنے؟ پسند تو دونوں تھے تب ہی اٹھا لائی تھی۔ مسز شیرازی کو تصویریں بھیج کر ان کے انتظار میں ایسے ہی ٹہلتے ہوئے اسکرین کو تک رہی تھی جب وہ ڈریسنگ روم سے نکل آیا۔ کف لنکس لگاتے ہوئے نگاہ بیڈ پر رکھے کپڑوں سے ہوتی ہوئی جنت تک گئی۔ موبائل کان سے لگائے، ہونٹ کاٹتی وہ شش و پنج میں مبتلا لگ رہی تھی۔

اس نے واسکٹ پہننے کے بعد کلائی پر گھڑی چڑھاتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں جنت کو دیکھا پھر کوٹ اٹھاتے ہوئے بیڈ کے قریب آیا۔ ایک سرسری سی نگاہ کپڑوں پر ڈالی پھر سائڈ ٹیبل سے موبائل اٹھاتے ہوئے سیدھا ہوا۔

''یہ کلر زیادہ سوٹ کرے گا۔'' اشارہ ہلکے آسمانی رنگ والے جوڑے کی طرف تھا۔

جنت کمال چونک کر مڑی مگر وہ تب تک لمبے لمبے ڈگ بھرتا بیڈ روم سے جا چکا تھا۔

''ہاں، اور میں تو جیسے اس کی بات مان لوں گی۔''

کہہ کر سر جھٹکا۔ ایک بار پھر اسکرین کو دیکھا۔ مسز شیرازی آن لائن نہیں تھیں۔ نچلا لب دانتوں تلے دباتے ہوئے ایک بار پھر اپنے کپڑوں کو دیکھا۔ پھر روہانسا ہو کر دس تک گنتی کی۔ پھر جھنجھلا کر ایک سوٹ اٹھایا اور ڈریسنگ روم میں گھس گئی۔

پورے ایک گھنٹے کے بعد وہ مکمل تیاری کے ساتھ بیڈ روم سے باہر آئی تو فارس شیرازی اس پر نگاہ ڈال کر ہٹانا بھول گیا۔ ہلکے گلابی رنگ کے کام دار جوڑے میں ملبوس، نیچرل سا لک دیتا لائٹ پنک میک اپ کیے وہ کسی جیتی جاگتی گڑیا کے مشابہ لگ رہی تھی۔ بال کھلے چھوڑ رکھے تھے، اطراف میں نقرئی پنز کی مدد سے سیٹ کیے گئے تھے۔

لانبی گھنیری پلکوں کے سائے میں شہد آنکھیں لائنر کی وجہ سے اور نمایاں ہو رہی تھیں۔

لمبے جگ مگ کرتے ایئر رنگز، گردن میں چمکتا نفیس لاکٹ، مخروطی انگلیوں میں ٹھہری ہوئی انگوٹھی۔ وہ کندھے پر دوپٹہ سیٹ کرتے ہوئے سامنے صوفے پر بیٹھ کر اپنی سلیور سینڈلز کی اسٹرپس بند کرنے لگی۔

چند لمحوں وہ اسے اپنے دل کی نگاہ سے دیکھتا رہا۔ داہنا ہاتھ بے اختیار کوٹ کی جیب تک گیا۔ انگلیوں کی گرفت میں مخملیں ڈبیہ آئی۔

''یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا، تمہارا تو صرف دماغ ہے، دل تو سرے سے ہے ہی نہیں۔'' وہ شکوہ بھری ایک تنبیہی آواز اس کی قوت صلب کر گئی۔

''سب تمہارے اس دل کے گرد گھوم رہا ہے۔''

اس نے جیب سے ہاتھ باہر نکال لیا۔

اسٹرپس باندھ کر اٹھی تو نگاہیں سیدھا فارس وجدان کی ٹائی پر جا ٹھہریں۔ ایک لمحے کے لیے منہ کھلا، اور پھر رخ بدل کر نچلا لب دانتوں میں دبایا۔ اس کے فراک کے ساتھ فارس وجدان کی ٹائی میچ کر رہی تھی۔

''اللہ!'' وہ اندر ہی اندر زور سے چیخی۔ اس نے جان بوجھ کر آسمانی رنگ والا جوڑا چنا تھا کہ وہ گلابی فراک پہنے۔ اسے یقین تھا وہ اس کی بات نہیں مانے گی۔ اف! جنت! تم اتنی **predictable** کیوں ہو؟ آخر کیوں؟ آنکھیں میچ کر خود کو اندر ہی اندر سے جھڑکا۔

''اچھی لگ رہی ہو۔'' وہ کوٹ کا بٹن بند کرتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''وہ تو میں شروع سے ہوں۔'' کمال بے نیازی سے کہہ کر رخ بدلا۔ کہ تمہاری تعریف سے میری ہارٹ بیٹ مس نہیں ہوئی ہے، نا ہی احساسات میں کوئی فرق آیا ہے۔ لیکن اندر ہی اندر۔ اف!!! اس نے تعریف کی۔۔ فارس وجدان نے تعریف کی۔ دوسری چیخ۔۔ دل بند ہونے کو تھا۔ گال دہک اٹھے تھے۔

لیکن بہت ہی تحمل، وقار اور نزاکت کے ساتھ اپنے چھوٹے سے بیگ کی لمبی سی نقرئی زنجیر پر گرفت بڑھاتے ہوئے ایک ادا سے سر اٹھایا۔ وہ لاکھ چھپاتا مگر وہ اس کے سنجیدہ سے باوقار چہرے پر مسکراہٹ اور شرارت کا رنگ دیکھ سکتی تھی۔

"کل رات میرے موبائل پر ممی کی بہو کی مسڈ کال آئی ہوئی تھی۔ خیریت ہے؟ اتنی رات گئے آپ نے ایک ہی کمرے میں ہوتے ہوئے مجھے کال کی۔" متبسم لہجے میں قدرے سنجیدگی سے پوچھا۔

یہ کچھ بھولتا بھی ہے یا نہیں؟ وہ دانت کچکچا کر رہ گئی۔

"ذرا بتانا پسند کرو گے زومی اور مجھ میں کیا قدر مشترک ہے؟" ڈٹ کر پوچھ لیا۔

"تم بتانا پسند کرو گی، مجھ میں اور کے ٹو میں کیا قدر مشترک ہے؟" جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"بہت کچھ مشترک ہے۔" دانت پیس کر کہا۔

"تم میں اور زومی میں بھی۔" وہ بولا۔

"مثلاً کیا؟" وہ ضبط کی کڑی آزمائش سے گزر رہی تھی۔

"دونوں دماغ بہت کھاتی ہو۔" اس نے کہہ کر کوٹ اٹھایا۔ جنت کا خوب صورت چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔ اب اگر اسے اپنی تیاری کا خیال نہ ہوتا تو یقیناً وہ کچھ کر گزرتی۔

"میں تمہارا دماغ کھاتی ہوں؟ میں؟" غصے سے پھٹ پڑی۔ "میں نے تو پھر بھی خوب صورت پہاڑوں کی تصویر لگائی ہے۔"

"خطرناک پہاڑوں کی۔" فارس نے تصحیح کی۔ "کے ٹو ایک کلر ماؤنٹین ہے۔"

جنت نے مٹھیاں بھینچ کر اسے دیکھا۔ خواہ مخواہ کا ایشو......

میں نے ایک رینڈم تصویر لگائی ہے۔" تحمل سے احتجاج کیا۔

"سوچ سمجھ کر لگائی ہے۔" وہ دوبدو جواب دے رہا تھا۔ جنت کے غصے کا گراف بڑھ گیا۔

"آخر میں تم سے کیوں بات کر رہی ہوں۔" اس نے خود کو خود ہی جھڑک دیا۔

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" فارس کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ "اب چلیں؟ باقی کی لڑائی گھر آ کر لڑ لیں گے۔" تپا دینے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

اپنا سفید کوٹ اٹھا کر پاؤں پٹختی دروازے کی طرف بڑھی۔

"آہستہ......آرام سے۔" اس نے پیچھے سے کہا۔

"میری فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔" تنفر سے کہہ کر باہر نکل گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے والٹ اور چابی

اٹھائی اور اس کے پیچھے چلا آیا۔

☆☆☆

شاندار میرج ہال کے بیرونی گیٹ کے سامنے گاڑی روک دی۔ وہ دونوں باہر نکل کر مرکزی احاطے سے اندرونی سمت بڑھے تو استقبالیہ میں کھڑے کئی لوگوں کی نگاہیں ان کی طرف اٹھی تھیں۔ وہ جانتی تھی سب فارس کو دیکھ رہے تھے۔ اور وہ یہ بھی جانتی تھی نظروں کی زد میں وہ بھی اس کی وجہ سے ہی آ رہی تھی۔

فارس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے بازو پر رکھا۔

"اگر دنیا کو یہ بتانا مقصود ہے کہ ہم میریڈ ہیں۔ تو انہیں یہ بھی پتا چلنا چاہیے کہ ہم ہیپی لی میریڈ ہیں۔"

"تمہیں اپنی ریپوٹیشن کی کتنی فکر ہے نا۔" تپ کر بولی۔

"یہ ایک پرائیوٹ میرج سیریمنی ہے ورنہ میری خبر یا تصویروں کو وائرل ہونے میں دیر نہیں لگتی۔"

"اوہ اچھا! اب تم مجھے یہ بتا رہے ہو کہ تم ایک سیلیبریٹی ہو؟" اس نے خاصی اونچی آواز میں طنز کیا۔

"سیلیبریٹی تو خیر سے نہیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"مگر ایک سیلیبریٹی کا بیٹا تو ہے۔" اس کا جملہ اچک کر کسی اور نے مکمل کیا تھا۔

فارس کی مسکراہٹ اڑن چھو ہوئی۔ تاثرات پتھر ہو گئے۔ جنت نے سر اٹھا کر آواز کی سمت دیکھا تو مشروب کا گلاس ہاتھ میں لیے ایک شخص نے سر کے خفیف اشارے سے سلام کیا تھا۔ فربہی مائل جسم۔ سر اور مونچھوں کے بال مکمل سفید تھے۔

"میں نے تو کامران بھائی سے بھی کہا تھا۔ انہیں انوائیٹ کر لیتے تو ہماری عید ہو جاتی۔"

فارس کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ آنکھوں میں سرخی اتر آئی۔

"جمال گردیزی۔" اپنا تعارف کرواتے ہوئے جنت کی جانب اپنا ہاتھ بڑھایا۔ سلام کے لیے۔

"چلیں۔" اس شخص کو کوئی بھی جواب دیے بغیر وہ جنت کو بازو کے حصار میں لیتا استقبالیہ کی طرف بڑھ گیا۔ جمال گردیزی کے لبوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی۔ نگاہوں نے ان کا دور تک تعاقب کیا تھا۔ فارس کے رویے سے جنت کو حیرت ہوئی۔ کیا وہ ہر کسی سے ایسے ہی پیش آتا تھا؟

مسز شیرازی ایک آرٹسٹ تھیں، یقیناً وہ اپنے آرٹ ورک کی وجہ سے انٹرنیشنل لیول پر جانی پہچانی جاتی ہوں گی تب ہی جمال گردیزی نے ذکر کیا ہوگا۔ اس نے سوچا۔ اس پر اتنا خفا ہونے کی تو کوئی بات نہیں تھی۔ مگر فارس کے تاثرات۔۔۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے نرمی مفقود ہو چکی تھی۔ حالانکہ آتے وقت اس کے تاثرات کافی سے زیادہ خوش گوار تھے۔

شادی ہال میں فارس کے دوستوں سے، ان کی بیویوں سے، اوران کے قریبی رشتے داروں سے ملتے ہوئے اسے ادراک ہوا، وہ اتنے سارے ملکی اور غیر ملکی لوگوں میں اپنے اسٹیٹس، اپنے کاروباری معاملات کی وجہ سے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ لوگ اسے ڈھونڈ کر خود آ کر مل رہے تھے۔ خواتین اس کی توقع سے زیادہ اس کے ساتھ اچھا رویہ برت رہی تھیں۔ وہ ہر تھوڑی دیر بعد سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگتی تھی۔

وہ کم گو اور ریزرو نیچر کا مالک تھا۔ وہ اسے کسی کے ساتھ ہنستا مسکراتا یا پھر کھل کر گفتگو کرتا ہوا نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے ہر انداز، ہر بات اور ہر عمل میں ایک حد یا دیواری سی قائم کیے ہوئے تھا۔ وہ سر کے خفیف اشارے سے نفی یا اثبات میں سر ہلاتا، مختصر لفظوں میں کوئی جواب دے کر بات ختم کرتا نظر آ رہا تھا۔

اس نے نگاہ ہٹا لی۔ اب وہ آتی جاتی لڑکیوں کو دیکھ رہی تھی۔ کچھ اس کے دوستوں کی بہنیں تھیں۔ کچھ ان بہنوں کی دوستیں تھیں۔ کچھ کی آنکھوں میں رشک تھا۔ کچھ حسد میں مبتلا تھیں۔ اسے بے اختیار عدینہ زبیر کے ساتھ ہونے والی اپنی پہلی ملاقات یاد آئی۔ اس کی مذاق اڑاتی نگاہیں۔ تضحیک آمیز رویہ یاد آیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اپنا مقابلہ عدینہ زبیر سے کرنے لگی۔ شاید وہ واقعی میں فارس وجدان کے ساتھ اچھی نہیں لگتی تھی۔ یا شاید۔ اس کے ساتھ عدینہ زبیر جیسی لڑکی ہی جچتی تھی۔ اس کی روشن آنکھوں کی چمک یکایک ماند پڑی۔ وجود میں بے چینی سی اتر آئی۔

گہری سانس لے کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ فارس بالکل سامنے ہی کچھ کاروباری شخصیات کے گھیرے میں کھڑا تھا۔

وہ دائیں طرف باہر کی جانب قدم اٹھاتی گئی۔ طویل راہداری، اونچی دیواریں اور دیوار گیر کھڑکیاں کسی محل کے اندرونی حصے کا پتا دے رہی تھیں۔ وہ رسٹ روم میں چلی گئی۔

اونچی لمبی شیشے کی دیواروں کے سامنے اپنے سراپے کا از سر نو جائزہ لے کر اس نے دوپٹہ سیٹ کیا۔ گلابی لبوں پر لپ گلوس کا اضافہ کر کے باہر آئی تو طویل راہداری کے دوسرے سرے پر اسے فارس نظر آیا۔ وہ یقیناً اس کے انتظار میں وہاں کھڑا تھا۔

''بتا کر جانا چاہیے تھا تمہیں۔'' وہ قریب پہنچی تو اس نے کہا۔

''اب کوئی چھوٹی کاکی تھوڑی نہ ہوں کہ گم ہو جاؤں گی۔'' وہ بڑبڑا کر رہ گئی۔ گیلری کی طرف کا شیشہ سلائڈ کیا تو باہر کی طرف روشنیوں میں نہایا ہوا سرسبز قطعہ نظر آنے لگا۔ اس نے موبائل نکال کر کچھ تصویریں کھینچیں۔

''مسز سلیمان تم سے کیا کہہ رہی تھیں؟'' وہ ستون کے ساتھ پشت ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔

''وہ ہماری شادی پر نہیں آ سکی تھیں اس لیے شادی کی اسنیپس دیکھنا چاہ رہی تھیں۔''

''تو تم نے دکھائیں؟''

''نہیں۔''

''کیوں؟'' وہ حیران ہوا۔

جنت نے گردن موڑ کر اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورا جیسے پوچھ رہی ہو کیا تم واقعی نہیں جانتے؟

''میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''آئمہ نے ہماری تصویریں دیکھ کر جانتے ہو مجھ سے کیا کہا؟ یہ فارس بھائی ایسے کیوں بیٹھے ہیں جیسے مرچیں چبائے ہوئے ہوں۔ اب میں دوسروں کو خود پر مذاق اڑانے کا موقع دوں؟ وہ سوال اٹھائیں، دولہا آخر ایسے کیوں بیٹھا ہے۔ اس کا موڈ کیوں آف ہے۔ اتنے غصے میں کیوں لگ رہا ہے؟ خوش کیوں نہیں ہے؟ زبردستی کی شادی ہوئی ہے کیا؟ کوئی ایک تصویر بھی ایسی نہیں کہ بس اتنی سی مسکراہٹ ہی نظر آ رہی ہو۔''

اس کا لہجہ غمگین اور انداز شکوہ بھرا تھا۔ فارس وجدان اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ دل کی کیفیت عجیب ہوئی کہ وہ خوب صورت ترین لمحوں کو نہ صرف اپنے لیے بلکہ اس کے لیے بھی تکلیف دہ بنا چکا تھا۔ وہ وقت جو یادگار رہنا تھا۔ وہ تصویروں میں مقید ہو کر اذیت کا باعث بن رہا تھا۔

وہ اس کے پیچھے، بہت قریب آ کھڑا ہوا۔ وہ ریلنگ پر ہاتھ رکھے دور تک دیکھ رہی تھی۔

آہستگی سے موبائل جیب سے نکالا۔ بازو کے حصار میں لے کر قریب کیا۔ موبائل کا فرنٹ کیمرہ آن تھا۔ لمحے میں تصویر کلک ہوئی تھی۔ وہ اپنے خیالوں میں گم تھی۔ اس حرکت پر بوکھلائی۔ دوسری کلک ہوئی۔ شکوہ اس لیے تو نہیں کیا تھا کہ وہ تصویریں لے۔

''اچھی آئی ہے۔'' کہہ کر اسے بھی دکھائی۔

وہ منجمد اعصاب کے ساتھ کھڑی تھی۔ ہاں وہ اپنی تصویر کو اچھا کہہ سکتا تھا۔

''ڈیلیٹ کرواسے۔'' آگے بڑھ کر موبائل چھیننا چاہا۔

''میں بہت اچھا لگ رہا ہوں۔''

''لیکن میں اچھی نہیں لگ رہی۔ ادھر دو مجھے۔'' ایک تو وہ لمبا، اوپر سے ہاتھ بھی اونچا کر لیا۔ وہ روہانسی ہوئی۔

''ممی کو سینڈ کرتا ہوں۔''

''ہرگز نہیں!'' وہ دبی آواز میں چلائی۔

''مگر کیوں؟'' ذرا حیران ہو کر اسے دیکھا۔

''میری تصویر اچھی نہیں آئی، اسے ڈیلیٹ کر دو۔'' ضبط کر کے بولی۔

''تو ٹھیک ہے ممی کے لیے ایک تصویر کھنچوالو میں اسے ڈیلیٹ کردوں گا۔''

''فارس!'' اسے غصہ چڑھ گیا۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے پیچھے ہٹا۔ وہ اس کی ضد سے واقف تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مدھم پڑی۔ تیور بگڑے ہوئے تھے۔ ''ٹھیک ہے۔ پہلے وعدہ کرو تم یہ ڈیلیٹ کردو گے۔''

''ہاں کردوں گا۔'' اچھی خاصی تصویر کا وہ ایشو بنا رہی تھی۔

''مجھے تم پر کوئی یقین نہیں۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں، کسی کو نہیں بھیجوں گا، خود ہی دیکھ کر ہنستا رہوں گا۔'' شرارت سے کہا۔

اور وہ سچ مچ آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھرلائی۔ فارس اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہ اتنی سی بات پر اتنی حساس کیوں ہو رہی تھی؟

''اچھا نہیں ہنسوں گا اور ڈیلیٹ بھی کردوں گا۔'' قریب آ کر بازو دراز کر کے ایک سیلفی لینا چاہی۔ اب کی بار وہ اس کی پہلو میں آرام سے کھڑی رہی۔ سر اٹھا کر مسز شیرازی کے لیے دل سے مسکرائی۔ آنکھوں کی نمی بڑھی۔ اور تصویر بہرحال بہت اچھی آئی۔ وہ دونوں اپنے آپ میں ادھورے۔ اپنی تصویر میں مکمل لگ رہے تھے۔

کچھ دیر تک راہداری میں ٹہلتے رہنے کے بعد وہ اس کے ساتھ ہال میں واپس آ گئی۔ وہ اب کچھ بہتر تھی۔ ذرا موڈ بھی بہتر تھا۔ پہلو میں بیٹھا فارس بے حد سنجیدگی سے ہر تھوڑی دیر بعد کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور کر دیتا جس سے وہ غصے سے لال بھبھوکا ہو جاتی۔ پھر جھک کر سرگوشی میں جواب دے کر اسے لاجواب کرتے ہوئے طنز سے مسکراتی تو اپنے چہرے پر سنجیدگی طاری رکھنا فارس کے لیے مشکل ہو جاتا۔ اس کی آنکھیں مسکرانے لگتی تھیں۔ تاثرات میں تبسم آ جاتا تھا۔ مسرت بھرے رنگ ہر انداز سے چھلکنے لگتے تھے۔ وہ نظروں میں کچھ اس لیے بھی آ رہا تھا کہ معمول سے ہٹ کر وہ بہت مطمئن، بہت خوش لگ رہا تھا۔

غالبًا اسے کبھی بھی، کسی نے اس طرح اتنے خوش گوار موڈ میں۔۔ اتنا مسکراتا نہیں دیکھا تھا۔ اس کی دوسری شادی کے سلسلے میں جتنی چہ مگوئیاں ہوئی تھیں، جتنے افسانے گھڑے گئے تھے، جتنی باتیں بنائی گئی تھیں تو اب وہاں بھی بہت سے حریفوں کو اپنے منہ کی ہی کھانی پڑی تھی۔

وہ لمحے خوب صورت تھے۔ اور خوب صورتی سے گزر گئے۔ شادی کا فنکشن ختم ہوا تو اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے۔ کچھ قریبی دوستوں سے ملنے کے بعد وہ فارس کے ہمراہ بیرونی دروازے پر آئی تو اس وقت رم جھم بارش برس رہی تھی۔ ٹھنڈک کا شدت سے احساس ہوا۔ اس نے کوٹ، مفلر اور دستانے پہنے ہوئے تھے مگر پھر بھی کپکپا رہی تھی۔

''کیا بنے گا آپ کا۔'' فارس کہے بنا نہ رہ سکا۔

''اس طرح کھڑے رہے تو قلفی بن جاؤں گی۔'' لرزتی آواز میں کہا۔ پھر اس کے بازو پر گرفت بڑھاتے ہوئے چھتری کے سائے میں گاڑی کی جانب بڑھ گئی تھی۔

وہ اتنی تھکی ہوئی تھی کہ گھر پہنچتے ہی سو گئی مگر فارس نے کپڑے بدل کر لیپ ٹاپ اٹھا لیا تھا۔

وہ شادی کے پورے سات ماہ بعد آج اپنی شادی کی تصویریں دیکھ رہا تھا۔

وہ اس کے پہلو میں بظاہر مطمئن، سر اٹھائے بیٹھی تھی مگر اس کی شہد آنکھوں میں خوف نمایاں تھا۔ جیسے وہ نہ جانتی ہو اب اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ زندگی اب اسے کس دوراہے پر لانے والی تھی۔ کس آزمائش میں ڈالنے والی تھی۔ اس کے ہاتھ باہم پیوست تھے۔ چہرے پر کہیں کہیں تفکرات کی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔

وہ برائڈل ڈریس میں انتہا کی حسین لگ رہی تھی اور یہ حسن اس رات اسے نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے تو نظر بھر کر اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔

جنت کمال نے اپنی رات اس کی اسٹڈی میں بتائی تھی۔ یہ نئی زندگی کا آغاز تھا۔ نئے گھر میں پہلی رات۔ نئے رشتے کی پہلی نفرت تھی۔

وہ بھاری دل کے ساتھ تصویریں بدلتا جا رہا تھا۔

ولیمے کی تصاویر میں وہ سر اٹھائے، گردن اونچی کیے زیادہ مسکرا رہی تھی۔ زیادہ خوش نظر آ رہی تھی۔ ہر کسی سے بہت کانفیڈنس سے بات کرتی، اپنے دوپٹے کو سیٹ کرتی، اپنا پوسچر بہتر کرتے ہوئے اس نے اپنی تصویریں بہت اعتماد سے کھنچوائی تھیں۔ وہ حیران تھا۔ وہ ایک بار پھر حیران ہوا تھا۔ اس شب جو رویہ اس نے دیا تھا۔ اور جس طرح اس کی حیثیت واضح کی تھی، اسے کمرے سے نکالا تھا، اس کے بعد بھی وہ کھل کر مسکراتے ہوئے اتنے سارے لوگوں کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

وہ اپنے خاندان میں واپس نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ اس شادی کو ہر صورت نبھانا چاہتی تھی۔ مگر اس کے احساسات، اس کی زندگی اس کی مجبوریوں سے قطعی بے خبر فارس وجدان نے اس کا ہر خواب، اس کی ہر امید خاک میں ملا دی تھی۔ زندگی جتنی اس پر تنگ تھی مزید اس نے کر دی تھی۔

وہ لاؤنج سے اٹھ کر کمرے میں آ گیا۔

وہ گہری نیند میں تھی۔ صوفے کی وجہ سے خود میں سمٹ کر سونے کی عادت ہو چکی تھی۔ کتنی ہی دیر تک وہ اس کے پاس کھڑا رہا۔ پھر پاس بیٹھ کر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

ایسے جیسے ابھی بھی ڈر ہو، وہ پلک جھپکتے ہی کسی خواب۔ کسی خیال کا حصہ ہو جائے گی۔ یہ خوف۔ یہ بے سکونی۔ یہ کچھ کھو دینے

کا احساس اس کی رگ رگ میں اترا ہوا تھا۔

وہ نیند میں ذرا سا کسمسائی تو اس کی بے آرامی کا خیال کر کے ہاتھ ہٹا لیا۔

شادی اچھے حالات میں نہیں ہوئی تھی۔شادی مرضی اور چاہ سے بھی نہیں ہوئی تھی۔مگر جو عطا کیا گیا تھا وہ ایک مرہم تھا۔ان زخموں کا جنہیں وہ سالہا سال سے اپنی روح پر لیے پھر رہا تھا۔اور اس امر کا ادراک اسے بہت تاخیر سے ہوا تھا۔اپنے انعام سے آگاہی بہت دیر سے ملی تھی۔اور اسے اس بات کا پچھتاوا تھا۔بے حد پچھتاوا تھا۔

☆☆☆

مسز سلیمان نے فون کر کے انہیں اپنے گھر انوائٹ کیا تھا۔اب چونکہ ان کی تین دن بعد واپسی تھی تو اس کا خیال تھا دعوت اٹینڈ کر لینی چاہیے۔

''میں تو نہیں جا سکوں گا!تم چلی جاؤ۔''

وہ ریموٹ سے چینل بدلتے پاپ کارن کا پیکٹ ہاتھوں میں لیے صوفے پر دراز تھا۔

''اور تم کیوں نہیں جا سکو گے؟''

''کتے، بلیاں، پرندے، مچھلیاں۔ہر طرح کی مخلوق پال رکھی ہے انہوں نے اپنے گھر میں۔باہر کہیں دعوت ہوتی تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔''

''پھر تو مجھے بھی نہیں جانا چاہیے۔''وہ کچھ سوچ کر گویا ہوئی۔

''ایسے انکار کرو گی تو اچھا نہیں لگے گا۔میں ان سے اپنی طرف سے معذرت کر لوں گا۔لیکن تم ضرور جاؤ۔''

''اکیلی؟''وہ کچھ پریشان ہوئی۔

فارس نے اسکرین سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔''ڈرائیور۔گارڈ۔اور چاہو تو ہیلن کو ساتھ لے جاؤ۔''

''اب یہ ہیلن کون ہے؟''مشکوک نظریں۔

''میرے منیجر کی اسسٹنٹ ہے!وہ تمہارے ساتھ چلی جائے گی۔''

''اور تم یہاں اکیلے بیٹھ کے مزے اڑاؤ گے؟''تنک کر پوچھا۔

''نہیں۔مجھے اپنے بھی بہت کام ہیں! آٹھ بجے تو میری میٹنگ ہے۔دس بجے جاپانی انویسٹرز کے ساتھ ڈنر کا پلان ہے۔اور بھی کچھ کام ہیں۔باقی دو دن رہ گئے ہیں۔''وہ اپنے پروگرام سے آگاہی دے رہا تھا تو جنت کی رگیں تن گئی تھیں۔

''یوں کہو نا کہ تمہارے اپنے سو کام ہیں۔کتے بلیوں کو کیوں الزام دے رہے ہو؟''

وہ گہری سانس لے کر سیدھا ہو بیٹھا۔''تم غصہ کیوں ہو رہی ہو؟اس لیے کہ میں تمہارے ساتھ نہیں جا رہا؟''

''میں تمہارے بغیر ہی ٹھیک ہوں۔اور میں دعوت پر ضرور جاؤں گی۔بلکہ ایسا کروں گی آج رات ان کے گھر ہی رک جاؤں گی۔میرے ہزبینڈ کو بہت زیادہ کام ہیں نا۔رات کے بارہ ایک بجے سے پہلے تک تو تم نے فری نہیں ہونا۔کام دو دن میں ختم ہونا ضروری ہیں۔''

طنزیہ لہجے میں زبردستی کی مسکراہٹ دکھا کر اٹھ گئی۔وہ متبسم چہرے کے ساتھ بیٹھا رہا۔پھر اٹھ کر کمرے میں آیا۔وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی بال بنا رہی تھی

''میں واپسی پر تمہیں خود پک کر لوں گا۔''اس نے کہا۔

''کوئی ضرورت نہیں۔میں ویسے بھی ان کے گھر میں بلیوں کے ساتھ وقت گزاروں گی۔''وہ اچھی خاصی تپی ہوئی تھی۔

''ٹھیک ہے۔''اس نے مزا لیا۔''جیسے تمہاری مرضی!لیکن گھر آ کر تمہیں اچھے سے شاور لینا ہوگا۔کپڑے چینج کرنا پڑیں گے۔ہاتھ اچھی طرح سے دھونا ہوں گے۔جوتے تو باہر ہی اتار کر آنا۔''وہ ہدایت نامہ جاری کر رہا تھا۔وہ ضبط کر کے اس کی طرف مڑی۔

''یہ ساری احتیاطی تدابیر صرف میرے لیے ہیں؟تمہارے لیے کچھ نہیں ہے؟''

''کیوں تمہیں بھی کوئی الرجی ہے؟''

''ہاں ہے نا۔مجھے فارس الرجی ہے۔''دانت پیس کر کہا۔''اب ہٹو میرے راستے سے۔''بیگ کندھے پر ڈالتے ہوئے اسے راستے سے ہٹایا۔

''اوہ!!خاصی سیریس الرجی لگتی ہے۔''وہ محظوظ ہوا تھا۔

جنت نے قہر بار نگاہوں سے اسے دیکھا۔بیٹھ کر اسنیکرز پہنے، تسمے باندھ کر سیدھی ہوئی تو موبائل پر کال آنے لگی۔

''ہیلن آ چکی ہے۔''فارس نے اسکرین پر نگاہ دوڑاتے ہوئے اطلاع دی۔

اس نے گرم شال اوڑھ کر ہینڈ بیگ میں موبائل رکھا، دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے رکی۔پھر مڑ کر اسے دیکھا۔وہ اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

''اپنا خیال رکھیے گا مسز فارس۔''جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کی طرف جھک کر کہا۔

''اچھا کس لیے؟''اس کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔

''اگر آپ نے اپنا خیال نہ رکھا تو میں وہ ہو جاؤں گا۔کیا کہتے ہیں اسے۔۔بیوہ کا جو دوسرا لفظ ہے۔''

جنت نے جھنجھلا کر اسے پرے دھکیلا۔

''ہاں تو پھر کر لینا دوسری تیسری شادی۔'' اس نے باہر نکلتے ہی ٹھاکر کے دروازہ زور سے بند کیا۔

''بات سنو۔'' فارس دروازہ کھول کر باہر آیا۔ سامنے ہی وہ سفید ٹائلز پر پاؤں پٹختی لفٹ کی طرف جا رہی تھی۔

''ان کا کافی بڑا گھر ہے۔ گم مت ہو جانا۔ یہ نہ ہو وہ مجھے کال کریں کہ آ کر اپنی بیوی کو ڈھونڈو۔ ہمیں مل نہیں رہی۔''

''اللہ!'' وہ جھٹکے سے مڑی۔ مٹھیاں بھینچ کر یہاں وہاں دیکھا کہ کوئی چیز ہاتھ آئے اور وہ اسے دے مارے۔ لیکن وہاں بس انڈور پلانٹ رکھا تھا اور وہ اتنا بھاری گملہ اٹھا کر اسے مار نہیں سکتی تھی۔

''چلو باقی باتیں فون پر۔'' وہ جانے کے لیے مڑا۔

''خبردار جو تم نے مجھے فون کیا تو۔'' بھنا کر شدید غصے کے عالم میں وارن کیا۔ ''اور مجھے لینے مت آنا۔ آج میں گھر نہیں آؤں گی۔'' دھمکا کر لفٹ میں گھس گئی۔ وہ لبوں پر مسکراہٹ لیے تب تک وہاں کھڑا رہا جب تک کے دروازے برابر نہیں ہو گئے تھے۔

☆☆☆

''لینے آ جاؤں؟''

میسج کا نوٹیفکیشن آیا تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر موبائل کی طرف متوجہ ہوئی۔ دوپہر تین بجے سے وہ گھر سے باہر تھی اور موصوف کو اب اس کا خیال آیا تھا۔

''نہیں!! میرا گھر آنے کا کوئی ارادہ نہیں۔'' ساتھ ہی غصیلی سرخ شکلیں بھی بھیج دیں۔

''اوکے۔ جیسی تمہاری مرضی۔'' اس کی طرف سے خاصا ٹھنڈا جواب آیا۔ جیسے اس بات سے کوئی فرق ہی نہ پڑا ہو۔

''ایسا کرنا کل بھی لینے مت آنا۔ پرسوں بھی نہیں۔ فلائٹ سے گھنٹہ پہلے پک کر لینا مجھے۔'' اب اسے کیسے پتا چلتا وہ غصے میں ہے تبھی نیلے پیلے ہر طرح کے غصیلے چہرے بھی ساتھ بھیج رہی تھی تاکہ صرف میسج نہ جائے، احساسات جذبات بھی پہنچ جائیں۔

''لگتا ہے بہت اچھا وقت گزر رہا ہے تمہارا۔'' فارس کی طرف سے طنزیہ مسکراہٹیں ہی آ رہی تھیں۔

''ہاں بہت اچھا! بہت سکون میں ہوں میں تو۔'' جل کر لکھا۔ ''اور تم نے مجھ سے جھوٹ بولا ان کے گھر بلیاں کتے ہیں؟''

''کیا وہ اب نہیں رکھتیں؟'' دوسری طرف سے وہ حیران ہوا تھا۔

''یہ کیسا سوال ہے؟'' جنت کو اور غصہ چڑھا۔ دوسری طرف اگلے تین چار منٹ تک خاموشی چھائی رہی۔ وہ آن لائن تھا مگر کچھ کہہ نہیں رہا تھا۔

''اس وقت کہاں ہو تم؟'' ساتھ ہی شکی گھورتی نگاہیں بھی بھیج دیں۔

''گھر پر ہوں۔''

''کس کے گھر پر ہو؟''

''اپنے گھر پر اور کہاں؟'' وہ حیران ہوا تھا۔

''تم تو کہہ رہے تھے پتا نہیں کہاں جانا ہے تم نے؟''

''جہاں جہاں جانا تھا وہاں سے ہو آیا ہوں۔''

وہ لب بھینچ کر رہ گئی۔ کچھ تو تھا جو وہ اس سے چھپا رہا تھا۔

''لینے آؤں یا نہیں؟''

''نہیں۔''

اب یہ بھی کوئی پوچھنے والا سوال تھا؟ وہ اندر تک سلگ گئی۔ ٹھیک ہے، وہ ناراض ہے۔ اس نے غصے میں جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ لیکن رات بھر کسی اور کے گھر تو وہ نہیں رک سکتی تھی۔ مگر اس کا یہ آخری میسج سین نہیں کیا گیا تھا۔ فارس آف لائن ہو گیا تھا۔

مسز سلیمان سے معذرت چاہتے ہوئے وہ اٹھ کر کھڑکیوں کی طرف جا کھڑی ہوئی۔ اسے کال کی۔ دوبارہ کی۔ بیل جا رہی تھیں مگر وہ فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ ایک ساتھ کئی میسج بھیجے مگر جواب ندارد!!

اسے غصہ آ گیا۔ بمشکل ضبط کیے خود کو نارمل پوز کرتی مسز سلیمان کے ساتھ محو گفتگو رہی مگر ذہن بے طرح سے الجھا رہا۔ جانے کتنی بار وہ اسے کال کر چکی تھی۔ شاید بیس بار؟ یا تیس کا ٹارگٹ تو پورا ہونے ہی والا ہو گا۔

ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگا دیا گیا تو مسز سلیمان کے کہنے پر اسے اٹھ کر جانا پڑا۔ ورنہ پریشانی کے باعث تو آدھی بھوک وہیں ختم تھی۔ اگر وہ سچ مچ میں اسے لینے نہ آیا تو؟ اسے بہت فکر ستا رہی تھی۔ کیا سوچیں گی مسز سلیمان۔ پہلی بار کی مہمان اور گھر آ کر بیٹھ گئی۔ اف!

کھانا کھاتے ہوئے سوچ مسلسل الجھی رہی۔ فارس سے اس کی دو گھنٹے پہلے بات ہوئی تھی۔ اور ابھی تک اس نے دوبارہ رابطہ نہیں کیا تھا۔

ڈنر کے بعد وہ مسز سلیمان کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی کافی پی رہی تھی جب ملازمہ نے اندر آ کر اپنی مالکن کو کسی کی آمد کی اطلاع پہنچائی۔ چونکہ وہ موبائل میں الجھی بیٹھی تھی تو جان نہیں سکی۔ مگر جب فارس وجدان کو ڈرائنگ روم میں داخل ہوتا دیکھا تو جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

سیاہ جینز پر سفید شرٹ اور میرون سویٹر میں ملبوس وہ سیاہ رنگ کا کوٹ زیب تن کیے ہوئے تھا۔ مفلر گردن میں تھا، ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں۔ بال ترتیب سے جمے ہوئے تھے مگر جو ماتھے پر تھے وہ بے ترتیب ہو رہے تھے۔

''تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے، میں نے تمہیں کتنی کالز کی ہیں؟''

اس نے اچنبھے سے جنت کو دیکھا، پھر جیب سے موبائل نکالا۔ اتنی ساری مسڈ کالز دیکھ کر حیران ہوا۔ ''تم نے مجھے کالز کیں؟ حیرت ہے؟''

جنت کے لب بھنچ گئے۔ آنکھوں میں غصہ اتر آیا۔

''مجھے تو بالکل بھی پتا نہیں چلا۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''ہاں تمہیں کچھ کیسے پتا چل سکتا ہے۔'' اس کے پاس آ کر بگڑی۔ آواز ذرا پست تھی۔

''تو کیسا گزرا تمہارا وقت؟'' آنکھوں میں شرارت لیے سنجیدگی سے پوچھا۔

''تمہیں اس سے فرق پڑتا ہے؟''

''بالکل پڑتا ہے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

''تمہارے بغیر بہت اچھا وقت گزرا۔'' سر اٹھا کر ایک ادا سے جواب دیا۔

''اتنے سارے میسج اور اتنی ساری کالز دیکھ کر اندازہ ہو رہا ہے۔'' وہ مسکرایا۔ وہ اچھا خاصا تپ گئی مگر چپ رہی۔

''میرے ساتھ بھی اچھا وقت گزارنے کی عادت ڈالو۔'' مسکراتی نگاہیں اس کے چہرے پر جما کر بولا۔

''میں صرف اچھی عادتیں اڈاپٹ کرتی ہوں۔'' اترا کر کہتے ہوئے اس نے رخ بدلا۔ جھٹ سے اپنا پرس اٹھایا۔ کافی تو ویسے بھی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ ایک سانس میں خالی کر کے مگ رکھا۔ مسز سلیمان اور ان کی بیٹیوں سے ملی۔ شکریہ ادا کیا۔ دعائیں لیں۔

''چلیں۔'' اس کے پاس آ کر مدھم آواز میں بولی۔

''میں نے تم سے کب کہا، میں تمہیں لینے آیا ہوں؟'' وہ پیشانی پر بل ڈالے پوچھ رہا تھا۔

جنت نے سر اٹھا کر اسے آنکھیں دکھائیں۔ ''چلو بھی۔'' دونوں ہاتھوں سے اس کا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے دروازے کی طرف لے جانے لگی۔ ساتھ ہی ہنستے ہوئے مسز سلیمان کو دور سے اللہ حافظ کہا۔

''تمہارے ان دعووں کا کیا ہوا؟ مجھے لینے مت آنا۔ فلائٹ سے پہلے پک کر لینا۔۔ میں گھر نہیں آؤں گی وغیرہ وغیرہ!!''

گاڑی میں بیٹھتے ہی فارس نے اسے لتاڑا۔

''ہاں تو غصے میں کہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ تم مجھے دوسروں کے گھر چھوڑ کر خود عیاشیاں کرتے پھرو۔''

''عیاشیاں!'' اسٹیئرنگ وہیل پر گرفت جمائے وہ کچھ صدمے سے اس کی طرف مڑا۔ گاڑی ابھی اسٹارٹ نہیں کی تھی۔ وہ کھڑکی کی طرف کھسک گئی۔ جتنی بھی مضبوط بنتی اس کے کسی نہ کسی تیور سے ڈر ہی جاتی تھی۔

''آپ مجھ سے کیا کہہ رہی ہیں، ذرا وضاحت کریں گی شہزادی صاحبہ؟''

''ڈسٹرب نہ کرو مجھے۔ میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔'' کہہ کر اس نے چہرے کا رخ کھڑکی کی طرف کر لیا۔ فارس نے گہری سانس لے کر گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔

☆☆☆

چونکہ منگل کی شب ان کی واپسی کی فلائٹ تھی اس لیے آج کا پروگرام شاپنگ اور باہر گھومنے پھرنے کے لیے طے تھا۔ مگر جنت کی طبیعت صبح سے ٹھیک نہیں تھی۔ اور وہ اس موقعے کو گنوانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے تیار ہو کر باہر آئی تو فارس نے صاف منع کر دیا۔

''نہیں بالکل نہیں! مجھے لسٹ بنا دو، تمہیں کیا کیا چاہیے میں خود لے آؤں گا۔''

وہ روہانسی ہوئی۔ ''مارننگ سکنس تو مجھے روز ہوتی ہے۔ اب ٹھیک ہوں۔''

''جا کر آرام کرو۔'' فارس کے لہجے میں تحکم تھا۔ وہ رونی صورت بنائے اپنی جگہ کھڑی رہی۔

''میڈ میرے آنے تک یہیں رہے گی۔ میں نے اسے مینیو دیا ہے، کھانا تیار کر رہی ہے۔'' تو یہ واضح تھا وہ اپنا فیصلہ نہیں بدلے گا۔

وہ بگڑے تیوروں کے ساتھ کمرے میں واپس چلی گئی۔ فارس اٹھ کر اس کے پیچھے آیا۔ وہ گلاس والز کے قریب نرم ریشوں والے قالین پر بیٹھی تھی۔

''ضروری تو نہیں کہ اس بار ہی سب جگہیں دیکھ لی جائیں۔''

''میں نے کچھ کہا ہے تمہیں؟'' نروٹھے پن سے کہہ کر اس کی طرف دیکھا۔ آنکھوں میں نمی اتری ہوئی تھی۔ ''اور میں نے کب کہا، میں تمہارے ساتھ گھومنا پھرنا چاہ رہی ہوں؟''

''ہاں! یہ بات تو تم نے بالکل نہیں کی۔'' سینے پر بازو باندھے دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ ''میں ہی پروگرام بنا رہا تھا۔''

''ہاں وہی تو!'' لب بھینچ کر رخ بدل گئی۔

وہ آنکھوں میں مسکراہٹ لیے اسے دیکھتا رہا۔

''جو تمہیں چاہیے اس کی لسٹ بنا دو میں لے آؤں گا۔''

''میرے ذہن میں کچھ نہیں ہے۔'' وہ کشن گود میں رکھے، قالین کے ریشوں کو چھیڑنے لگی۔

فارس نے سائڈ ٹیبل سے اس کا موبائل اٹھا کر اسے دیا۔ ''جب ذہن میں آ جائے تو مجھے میسج کر دینا۔''

وہ کہہ کر چلا گیا اور جنت کے ذہن کی طویل لسٹ میں مزید اضافہ ہونے لگا۔فوراً سے خود کو جھڑک کر نفی میں سر ہلایا۔سر کے نیچے کشن رکھے لیٹ گئی۔موبائل ہاتھ میں تھا۔اب وہ گیم کھیل رہی تھی۔

دروازے کی درز سے اندر دیکھتے ہوئے فارس نے اس کی طرف سے جیسے تسلی کی تھی پھر میڈ کو ہدایات دیتا چلا گیا تھا۔

☆☆☆

لندن کے آسمان پر گھٹائیں چھائی تھیں۔سورج غروب ہو چکا تھا۔اندھیرے اتر آئے تھے، بتیاں جل اٹھی تھیں۔رات میں بھی دن کا سماں بندھ گیا تھا۔سڑکیں، مال، مارکیٹ میں ہر جگہ زندگی کے آثار تھے۔شہر کی نائٹ لائف مکمل بیدار ہو چکی تھی۔

سردی شدید تھی تو گزشتہ کچھ دنوں سے وقفے وقفے سے ہونے والی بارش نے موسم کو مزید ٹھنڈا کر دیا تھا۔بارش ابھی بھی برس رہی تھی اور ہر گزرتے لمحے شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔

اس نے مین روڈ سے دائیں طرف گاڑی موڑ کر ایک ہی قطار میں ایستادہ کئی گھروں کی روشن کھڑکیوں کی جانب دیکھا اور سڑک کے کنارے گاڑی پارک کر دی۔چند لمحوں تک ونڈ اسکرین پر متحرک وائپرز کو دیکھتا رہا۔منظر دھندلا کر بس ایک لمحے کے لیے ہی صاف ہوتا تھا۔عین سامنے ہی بالکل آخر میں روشن کھڑکیوں کے بیچ ایک تاریک گھر نظر آ رہا تھا۔

گہری سانس لے کر اس نے جیسے ایک بار پھر خود میں ہمت مجتمع کی اور چھتری کھول کر باہر نکل آیا۔

سیاہ جینز پر سیاہ رنگ کا سویٹر اور اس پر سیاہ کوٹ میں ملبوس وہ عجلت میں قدم اٹھا رہا تھا۔باڑ کے اس پار لان کا قطعہ تھا۔گھاس بے ہنگم تھی۔وہ لان عبور کرتا مرکزی دروازے تک گیا۔سیڑھیاں چڑھ کر اس نے گہری سانس لی پھر چابی گھما کر دروازہ اندر کی جانب دھکیل دیا۔

اس نے اپنے اندر۔اپنے وجود کی تاریکی میں قدم دھر دیئے کہ وہ گھر اس کے اندر جیسا تھا۔ساکن۔ویران۔خاموش۔سالہا سال سے بند۔

ہاتھ بڑھا کر لائٹس آن کرنے کا اس کا ہرگز دل نہیں چاہ رہا تھا۔اس گھر میں اسے اندھیروں کی عادت تھی۔وہ ہر منظر سے بھاگتا پھرتا تھا، ہر اس اذیت سے جو دیواروں پر رقم تھی۔ہر اس دکھ سے جو اس فضا میں رچا ہوا تھا۔

شاید وہ خون کی باس تھی۔زخموں کا درد تھا۔روح کی چیخیں تھیں جو اسے اپنے آس پاس ایک بار پھر محسوس ہونے لگی تھیں۔

گہری سانس لے کر اس نے دیوار پر ہاتھ رکھا۔مرکزی دروازے سے ہال سے تک بلب جل اٹھے۔مدھم سی روشنی میں گرد سے اٹی ہر ایک شے نمایاں ہوئی۔وہ اپنی جگہ کئی لمحوں تک کھڑا رہا۔یوں جیسے لکڑی کے فرش نے اس کے قدم جکڑ لیے ہوں۔شدت سے دھڑکتا دل مٹھی میں بند ہو رہا تھا۔اسے اندر تک درد کی لہر اٹھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔آواز وہ جو لبوں پر آ کر دم توڑ رہی تھی۔

اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔آہستگی سے قدم اٹھاتا لاؤنج تک گیا۔

سیاہ صوفے صفائی نہ ہونے کی وجہ سے اپنی ہیئت پر مٹی کی چادر اوڑھے ہوئے تھے۔میگزین، رسائل، اخبار کافی ٹیبل اور ٹیبل کے نیچے قالین پر بکھرے تھے۔کانچ کا ٹوٹا ہوا گلاس اس کے قدموں میں تھا۔ٹکڑے یہاں وہاں بکھرے تھے۔فرش پر کہیں کہیں خون کے بقیہ رہ جانے والے نشان بھی تھے۔یہ صرف وہی جانتا تھا۔اور اپنے خون کو صرف وہی پہچانتا تھا۔

کچن اتنا سنسان۔جیسے کبھی وہاں کوئی رزق نہیں لایا گیا تھا۔میز پر چند ایک سفید خون کی پٹیاں۔چھری۔فرسٹ ایڈ کا باکس جوں کا توں رکھا تھا۔

وہ خود کو سر جھکائے اسی میز پر بیٹھا ہوا دیکھ سکتا تھا۔نظر ہٹا کر سیڑھیوں کا رخ کیا۔وزن پڑنے پر آواز آتی تھی۔اس نے ریلنگ کو مضبوطی سے تھام لیا۔

اوپر کمرہ تھا۔اسے کھولنے سے پہلے رک کر اپنے حواس بحال کرنا پڑے۔اس قدر شدید سردی میں بھی اس کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔

اس نے ہینڈل گھما کر دروازہ کھول دیا۔لائٹس آن کر دیں۔

کمرہ روشن ہو کر بھی اس کے لیے تاریک اور مبہم سا رہا۔

اس نے پلکیں جھپکائیں۔سانس بھاری ہو گیا۔سینے پر بوجھ پڑ گیا۔قلب میں درد ٹھہر گیا۔

بیڈ پر بے ترتیبی سے بکھرے کشن۔کچھ نیچے گرے ہوئے۔وارڈ روب کھلی ہوئی۔ڈریسنگ ٹیبل کا سامان بے ترتیبی لیے ہوئے۔کچھ نیچے گرا ہوا۔کچھ ٹوٹ کر بکھرا ہوا۔

''کون ہو تم؟''

ٹوٹے ہوئے آئینے سے اس کی نگاہ کھڑکیوں کی طرف گئی۔کافی دیر تک وہاں ٹھہری رہی۔پھر وہ آگے بڑھ گیا۔بیڈ سائڈ ٹیبل کے پاس بیٹھتے ہوئے اس نے دراز کھینچی۔ایک ساتھ کئی رپورٹس اس کے ہاتھ میں آ گئیں۔سنبھال کر رکھی گئی تھیں۔سنبھلی ہوئی ملی تھیں۔اسے لگا اس کا سانس بند ہو جائے گا۔دل پھٹ جائے گا۔وہ اپنے قدموں پر کھڑا نہیں ہو سکے گا۔اس کمرے سے باہر کہیں جا نہیں سکے گا۔وہ درد ایسا ہی تھا۔وہ غم۔وہ آزمائش۔وہ مصیبت ایسی ہی تھی۔اس کی آنکھیں مکمل تر ہو چکی تھی۔اس کا وجود شعلوں کی زد میں آ چکا تھا۔اس کا مستقبل۔اس کا حال مٹ گیا تھا۔ماضی ٹھہر گیا تھا۔ماضی رہ گیا تھا۔کتنی ہی دیر تک وہ بے جان کاغذوں پر زندگی کی نشان دہی کرتی مبہم لکیروں کو تکتا رہا تھا۔اندر ایک شور سا بپا تھا۔ضمیر ملامت کر رہا تھا۔انگلیاں اس کی طرف اٹھ رہی تھیں۔وہ برپا ہونے والی قیامت کا ذمہ دار خود تھا۔

ہر طرح کے خیالات کو جھٹک کر وہ الماری تک گیا۔ پٹ کھول دیے۔ اس کے برانڈڈ کپڑے، قیمتی گھڑیاں، جوتے ہر ایک شے جوں کی توں رکھی تھی۔ مگر وہ ان چیزوں کے لیے نہیں آیا تھا۔

وہ اپنی اشیاء کو الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ اور اسے ڈھونڈنے پر بھی وہ نشانی۔ انتظار، الفت اور محبت سے جڑی شے نہیں مل رہی تھی۔ اور پھر جیسے کپڑوں کے نیچے سے بیگ مل گیا۔ اسے نکال کر زیپ کھولی۔

کچھ دیر تک ان چیزوں کو ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا۔ چیزیں بے جان تھیں۔ غیر متحرک۔ بالکل ساکت۔ اس کی طرح۔

وقت ایک بار پھر رک گیا تھا۔ اپنے اندھیروں سے لڑتا وہ کتنی ہی دیر تک فرش پر بے حس و حرکت بیٹھا رہا تھا۔

کئی منظر آنکھوں میں لہرائے۔ کئی باتیں یاد آئیں۔ کئی غلطیاں۔ کئی سزائیں۔ کئی فیصلے۔ کئی کوتاہیوں کا خیال آیا۔ وہ اپنی ہتھیلیوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ خالی تھے۔ بار بار خالی ہو رہے تھے۔

وہ بیگ میں کاغذات وغیرہ رکھ کر اٹھا۔ زپ کھینچ کر کندھے پر ڈالا اور لائٹس آف کر کے باہر آ گیا۔ باوجود اس کے کہ وہ اس گھر سے، اس کے بوسیدہ ماحول سے، تکلیف دہ یادوں سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا۔ مگر پھر بھی اس کے قدموں میں عجلت نہیں تھی۔

وہ بھاری تنفس کے ساتھ دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ لاک لگا کر مڑا تو جھٹکے سے رک گیا۔

ایک ادھیڑ عمر انگریز خاتون چھاتا تانے، ہاتھ میں فلیش اٹھائے بہت حیران ہو کر اسے دیکھ رہی تھیں۔ فلیش لائٹ کی روشنی آنکھوں پر پڑی تو اس نے بے ساختہ ہاتھ اوپر کیا۔

''فاااریس۔'' ہمیشہ کی طرح اس نے کافی لمبا نام کھینچا۔ آنکھوں میں بچوں جیسا اشتیاق اور خوشی لہرائی۔ ''میں نے صوفی سے کہا تھا یہ لڑکا ضرور آئے گا۔''

وہ انہیں دیکھ کر رہ گیا۔ اتنے سالوں بعد وہ اسے پہچان گئی تھیں۔

کافی بوڑھی ہو چکی تھیں۔ بمشکل چل پاتی تھیں۔ آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑا۔ بالکل ویسے ہی جیسے وہ دس گیارہ سال پہلے پکڑا کرتی تھیں۔ وہ قوت رکھتے ہوئے بھی نہ بازو چھڑا سکا۔ نہ سکت رکھتے ہوئے انکار کر سکا۔ اس کے گھر کی باڑ ایک طرف سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہ یقیناً وہیں سے آئی تھیں۔ وہ اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے آئیں۔ دروازے میں لمحے بھر کے لیے وہ جھجکا کہ پہلی نگاہ ہی اس سفید ریشوں والی بلی پر پڑی تھی جو بالکل سامنے بیٹھی تھی۔

''آؤ نا!''

وہ چند ثانیوں کے لیے رکا پھر ان کا اصرار دیکھ کر اندر آ گیا۔ لاؤنج کے صوفے پر بیٹھتے ہی اسے چھینک آئی۔ بلی صوفے کے

نیچے سے۔ اور بالکل اس کے قدموں میں سرسرا کر گزری تھی۔

''اتنا عرصہ کہاں گم رہے تم؟ ایک بار بھی نہیں آئے؟'' ساتھ ہی انہوں نے کسی کو آواز دی۔ اور پھر یاد آنے پر ہنسی۔ ''ارے میں تو بھول ہی گئی ہوں۔ میں تو اکیلی رہتی ہوں۔''

کچن میں جا کر نیا گلاس نکالا۔ اس میں جوس ڈال کر لائیں۔ پہلے کی نسبت وہ کافی بھاری ہو گئی تھیں۔ ٹھہر ٹھہر کر قدم اٹھاتی تھیں۔ نظر بھی کمزور تھی۔ اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ کر اون کا گولا اٹھا لیا۔

وہ چھینکوں میں الجھا ہوا تھا۔ مفلر ناک تک کھینچا، جیب سے ٹشو نکالا۔ بلی کافی سے زیادہ فرینڈلی تھی۔ اس کے بالکل قریب ہی بیٹھی تھی۔ اور پھر اسے ادراک ہوا وہ ایک نہیں تھی۔ اس کے کئی بچے بھی تھے۔ صوفے کے نیچے۔ میز کے نیچے۔ قالین پر رینگتے ہوئے۔

اس کی آنکھوں سے اب باقاعدہ پانی آ رہا تھا۔ گردن کے پچھلے حصے پر، خارش ہونے لگی تھی مگر وہ پھر بھی بیٹھا رہا تھا۔

''تم اتنے دن کہاں غائب رہے؟'' بغور دیکھ کر پوچھا۔ ''پھر کسی سے لڑ کر آئے ہو؟'' خفگی سے گھورا۔ ''اس بوڑھے آرتھر نے کہا کہ یہ گھر اب بک جائے گا۔ کیا ایسا ہی ہے؟'' اب کے ذرا پریشان ہوئیں۔ ''تم کیوں بیچ رہے ہو؟ تم یہاں آ کر رہتے کیوں نہیں ہو؟''

''میں پاکستان شفٹ ہو چکا ہوں۔'' سنجیدگی سے کہہ کر اس نے گلاس اٹھایا۔ اسے زکام ہو چکا تھا۔ کھانسی بھی ہو رہی تھی۔ آنکھوں سے لگاتار پانی آ رہا تھا۔

''اوہ اچھا۔'' اون کا گولا رکھ کر بلی کو گود میں لے لیا۔ جیسے ایک ننھے معصوم بچے کو گود میں لیا جاتا ہے بالکل ویسے ہی۔ ''لیکن تم تو پاکستان کبھی نہیں جانا چاہتے تھے۔''

وہ انہیں دیکھ کر رہ گیا۔ ان کی یادداشت میں سب آگے پیچھے ہو چکا تھا۔ بہت سی باتیں وہ بھول گئی تھیں۔ بہت سی حکایتیں انہیں یاد نہیں رہی تھیں۔ یہ بھی کہ اس وقت وہ اٹھارہ سال کا نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہ اب وہ ان کے پڑوس میں نہیں رہتا ہے۔

''تمہارا پسندیدہ جوس۔ کوکیز لونا۔ سب حلال ہے۔'' بس وہ یہ نہیں بھولی تھیں کہ وہ مسلمان ہے۔ اور یہ بھی نہیں کہ وہ اکیلا ہے۔

''اب میں چلتا ہوں۔'' خالی گلاس میز پر رکھتے ہوئے اٹھا۔ کھانسی زیادہ ہو رہی تھی۔

''فا......ریس۔'' وہ خود بھی اٹھ کر اس کے پاس آئیں۔ وہ چاہ کر بھی ان سے دو چار قدم دور نہیں ہو سکا۔

''اتنا شور تھا تمہارے گھر۔ سب ٹھیک ہے نا؟ بیوی کہاں ہے تمہاری؟''

یہ سوال صدمہ تھا۔ یہ سوال اذیت تھی۔

اس کی حالت بہت ابتر ہو چکی تھی مگر وہ پھر بھی اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہلا تھا۔ جواب کے لیے منتظر نگاہوں سے اسے دیکھتی وہ اپنا سوال بھول گئیں۔

اپنا جھریوں زدہ ہاتھ اٹھا کر اس کے گال پر رکھا۔ پھر دوسرا رکھا۔ بھول گئیں پہلے کیا کہہ رہی تھیں۔ اب کیا کہنے والی تھیں۔

''ارے تم تو بہت ہینڈسم ہو گئے ہو۔'' ان کی کمزور آنکھوں میں خوشی اتری۔ وہ بدقت مسکرایا۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی آمیزش شامل ہو گئی۔

''میں پھر آؤں گا۔'' کہہ کر جانا چاہا۔

''ہاں ہاں! ٹھیک ہے۔ پڑھائی بھی تو کرنی ہو گی۔'' انہوں نے ہاتھ ہٹا لیے۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا تو کچھ یاد آ جانے پر اسے پھر سے پکارا۔

''فارس!! تمہارے پاس پیسے تو ہیں نا؟''

وہ اپنی جگہ ٹھہرا رہ گیا۔ مڑ کر انہیں دیکھا۔ جانے کہاں سے پیسے ڈھونڈ لائیں۔ زبردستی اس کے ہاتھوں میں پکڑائے۔ ''کچھ کھا لینا۔''

وہ جذبات کے حدت سے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ کھڑا رہا۔ پھر ہوڈی سر پر چڑھاتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

''کون تھا باہر؟'' صوفی بیچ بیچ سیڑھیوں سے اُتری تھی۔

''کون؟'' وہ ذرا سا حیران ہوئی کھڑی تھیں۔

''ابھی جو آیا؟''

''کوئی بھی تو نہیں آیا'' بڑبڑاتے ہوئے دروازے سے ہٹ گئیں۔ پھر خالی گلاس اور کوکیز دیکھ کر صوفی سے لڑ پڑیں۔

''میرے کوکیز۔ تم نے میرے کوکیز کھا لیے۔''

ہمیشہ کی طرح اپنی مہمان نوازی بھول کر وہ سارا الزام اس کے سر ڈال رہی تھیں۔ لان میں کسی اجنبی کو سڑک کی طرف جاتے دیکھ کر صوفی گہری سانس لے کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی کسی قدر قوت سے دروازہ کھینچ کر بند کر دیا تھا۔ کپکپاتے ہاتھوں سے کمپارٹمنٹ باکس کھول اپنی

میڈیسن نکالی۔ اس کی سانسیں بھاری ہو چکی تھیں۔ کھانسی نے حالت ابتر کر دی تھی۔ میڈیسن لینے کے بعد اپنی سیٹ کے ساتھ ہی کمر ٹکائے، گردن سیدھی کیے وہ اب سانسیں کھینچ رہا تھا۔ شدید بارش میں ہر سو بے انتہا تاریکی تھی۔ قریب گزرتی گاڑی کی ہیڈ لائٹس آنکھوں پر پڑی۔ جھماکے سے ٹوٹتے شیشوں کا منظر آنکھوں میں لہرایا۔ وہ ایک چیخ تھی جو اس نے سنی۔ وہ اذیت تھی جو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ وجود لہولہان تھا۔ اسٹریچر کے پہیے شور کرنے لگے۔ کاریڈور کی ٹائلز پر کوئی وجود ڈھیر ہونے لگا۔ ۔وہیل چیئر کے ہتھے پر رکھا ہاتھ کپکپا اٹھا۔ سر جھکا ہوا تھا۔ سر جھکا ہی رہا۔

روح میں وحشت اتر گئی۔ اضطراب انگ انگ میں ٹھہر گیا۔ سوئی ہوئی اذیتیں جاگ اٹھیں۔ ذہنی دباؤ بڑھ گیا۔

''میں آپ کو برباد کر دوں گا'' وہ خود کو سن سکتا تھا۔ واضح سن سکتا تھا۔

اس نے فل نیک جیکٹ کی زپ کھینچ ڈالی۔ جیب سے موبائل نکالا۔ کال لاگ میں پہلا نمبر عدیل احمد کا تھا۔ اسے کال کر کے اب وہ کھانستے ہوئے بمشکل لفظ ادا کرتا اپنا ایڈریس بتا رہا تھا۔

''ایک نام ہے اور وہ بھی تمہارا نہیں ہے۔''

اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ مگر آواز بند نہ ہوئی۔ شور کم نہ ہوا۔

دور کہیں گاڑی کا ہارن بجا تھا۔ ہیڈ لائٹس پھر سے روشن ہوئی تھیں۔ شور مبہم ہو کر اب معدوم ہو چکا تھا۔ اب بارش کی بھی آواز نہیں تھی۔

پسنجر سیٹ پر رکھا بیگ۔ اس میں جمع شدہ اشیاء۔ ان اشیاء سے جڑی یادیں۔ ان یادوں سے جڑی اذیتیں۔ اس کے ہاتھ یکا یک خون آلودہ ہو گئے۔ اس کی غلطیاں اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئیں۔ اس کا حوصلہ ٹوٹ گیا۔ اس کی ہمت ختم ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں پانی تھا۔ اب آنسو آ گئے تھے۔ ریشنز صرف گردن تک تھے۔ اب روح پر آ گئے تھے۔

یکا یک کھڑکی کے شیشے پر دستک ہوئی۔ بمشکل سانس لیتے اس نے سر اٹھایا۔ عدیل احمد دروازہ کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے شیشہ بجا رہا تھا۔

اس نے لاک ہٹا دیا۔ دروازہ کھل گیا تھا۔

''سر آر یو آل رائٹ؟'' وہ کچھ پریشانی سے پوچھ رہا تھا۔ اس نے جواب نہیں دیا۔ اس کے پاس جواب دینے کی سکت نہیں رہی تھی۔

اسے سہارا دے کر عقبی نشست پر بٹھا کر عدیل احمد نے خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ دس منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ اسے قریبی ہاسپٹل لے آیا تھا۔ ایمرجنسی ٹریٹمنٹ کے بعد اس کی بگڑتی ہوئی حالت کچھ حد تک سنبھل گئی تھی۔

عدیل احمد راہداری میں ٹہل رہا تھا۔ اس نے کال کر کے اسے بلایا تو وہ فوراً آ گیا۔

''سر! ڈاکٹر کہہ رہا تھا، آپ صبح تک یہیں رہیں تو۔'' اسے کوٹ پہنتا دیکھ کر بول پڑا۔

اس نے جن کڑی نگاہوں سے اسے دیکھا، وہ بات اُدھوری چھوڑ کر سر جھکا گیا۔ تین گھنٹے تو اس نے گزار ہی لیے تھے۔ حالت خطرے سے باہر تھی، البتہ کھانسی، زکام اور طبیعت کا فرق ویسا ہی تھا۔ آنکھوں کی سوجن بس کچھ ہلکی ہوگئی تھی مگر سرخی ہنوز ٹھہری تھی۔ گردن پر ریشز بھی نمایاں تھے۔ اسے اپنی نہیں جنت کی فکر تھی۔ وہ صبح سے باہر تھا اور وہ گھر میں اکیلی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر از حد پریشان ہو جاتی تھی۔ اس کا گھر میں ہونا ضروری تھا۔

کوٹ پہن کر اٹھا تو طبیعت خرابی کے باعث قدم جمانے اور توازن برقرار رکھنے میں تھوڑی سی دشواری ہوئی۔ عدیل احمد نے مدد کرنا چاہی تو اس کا ہاتھ سختی سے جھٹک دیا۔ وہ اپنے باس کو حیرت سے دیکھ کر رہ گیا۔

یہ حقیقت تھی کہ وہ سخت اور بے انتہا روڈ تھا مگر اس حالت میں اس کا یہ رویہ اچنبھے کا باعث تھا۔ چونکہ فارس وجدان کا حکم اس کے لیے فرض کی طرح تھا تو کوئی بھی اعتراض کیے بغیر وہ اس کے پیچھے چل دیا تھا۔

☆☆☆

جنت کی آنکھ کھلی تو اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ باہر شدید بارش ہو رہی تھی۔ گرج چمک کی آواز بھی وقفے وقفے سے سنائی دینے لگی تھی۔ پردے سمٹے ہوئے تھے تو روشنیوں میں شہر بھیگا ہوا لگ رہا تھا۔ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس نے اپنے برابر میں دیکھا تھا۔ فارس وہاں نہیں تھا۔

اس نے آٹھ بجے کال کر کے کہا تھا وہ تاخیر سے گھر آئے گا تب ہی وہ کھانا کھا کر جلد ہی سو گئی تھی مگر اب تو کافی وقت ہو چکا تھا۔ موبائل اٹھایا۔ نوٹیفکیشن چیک کیے۔ پھر اونی شال اوڑھ کر باہر آ گئی۔ پورے اپارٹمنٹ میں مدھم سی زرد روشنی اندھیرے سے الجھتی نظر آ رہی تھی۔

وہ سیدھا کچن میں گئی۔ پانی پیا۔ یکایک ساعت سے کھانسی کی آواز ٹکرائی تو وہ اپنی جگہ تھم گئی۔ جھٹکے سے مڑ کر لاؤنج کی طرف دیکھا۔ پھر آگے بڑھ کر سینٹرل لائٹ جلائی۔ نیچے کارپٹ پر شاپنگ بیگ وغیرہ رکھے تھے۔

کیا فارس گھر پر ہے؟ وہ کچھ چونک کر تیزی سے آگے بڑھی۔ راہداری سے گزر کر سٹنگ ایریا کی طرف گئی جہاں وہ اسے دیوار گیر کھڑکیوں کے آگے کاؤچ پر نیم دراز دکھائی دے گیا۔

قریب آئی تو ٹیبل پر پانی کی بوتل۔ الرجی ٹیبلٹس، آٹو انجکٹر وغیرہ رکھے نظر آئے۔ موبائل سر کے پاس ہی تھا۔ اور مسلسل بجے جا رہا تھا۔ مگر اس کی آواز سے فارس کی نیند میں ذرا سا بھی خلل نہیں آیا تھا۔

وہ یک دم گھبرا کر اس پر جھکی۔ چہرے کا رخ موڑا۔ پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ نبض چیک کی۔ بے اختیار سکھ بھری سانس لی کہ اس کا تنفس ہموار تھا۔

اس نے میز سے ٹیبلٹس اٹھا کر دیکھیں تو اندازہ ہوا اس نے سلیپنگ پلز اور اینٹی ڈپریسنٹ بھی لے رکھی تھیں۔ وہ بالکل سن بیٹھی رہی۔ آج سے پہلے ایسی ادویات اس کے بیڈروم میں، اس کی سائڈ ٹیبل پہ اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔

کچھ فکرمندی سے دوبارہ اسے دیکھا۔ جانے اسے ٹھنڈ لگ رہی تھی یا اندر کا موسم واقعی میں اتنا سرد۔ اتنا سفاک ہو گیا تھا کہ ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بیڈروم سے لحاف اٹھا کر لے آئی۔ اچھے سے اس پر پھیلایا۔ سر کے نیچے تکیے کی بھی پوزیشن درست کی۔ اب وہ نیچے کارپٹ پر بیٹھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں بہت ساری فکر، بہت سارا خوف، بہت ساری پریشانی تھی۔

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کسی کو کال کر کے ڈاکٹر کو بلوائے یا پھر اس کے جاگنے کا انتظار کرے!؟ وہ بہت محتاط رہتا تھا، اگر کوئی سیریس معاملہ ہوتا تو یقیناً وہ گھر نہ آتا۔ سیدھا ہاسپٹل ہی جاتا۔ لیکن ہر طرح کی دلیلوں کے باوجود اس کی ٹینشن کسی صورت کم نہیں ہوئی تھی۔

وہ بے سدھ سا کافی گہری نیند سو رہا تھا۔ سانسیں کبھی ہموار۔ اور کبھی غیر ہموار ہو جاتی تھیں۔ یقیناً دواؤں کے اثر میں تھا۔ لیکن وقفے وقفے سے اسے کھانسی ضرور ہونے لگتی تھی۔ ایک دو بار اس نے کندھا ہلا کر جگانے کی کوشش کی۔ مگر نو رسپانس!

جنت کی ٹینشن بڑھتی گئی۔ بے قراری کے عالم میں پورے گھر کا ایک چکر کاٹ کر وہ ایک بار پھر اس کے پاس آ کر بیٹھی۔ کندھا ہلا کر، اور آواز دے کر جگایا۔ اب جب تک وہ جواب نہ دیتا اس کی تسلی نہیں ہو سکتی تھی۔ کندھے سے پکڑ کر تقریباً جھنجھوڑ ہی ڈالا تو اس کے حواس کچھ بیدار ہوئے۔

''ہوں۔'' بمشکل آنکھیں کھولیں

اس کی آنکھیں بے تحاشہ سرخ، پپوٹے ذرا سے بھاری اور سوجے ہوئے۔ ہونٹ خشک۔ رنگت زرد تھی۔

''تمہاری طبیعت کیسی ہے اب؟'' اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' کہہ کر آنکھیں بند کرنا چاہیں۔ جنت نے دوبارہ سے کندھا ہلا کر جگایا۔ وہ بمشکل بیدار ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

''میرے خیال سے ہاسپٹل چلنا چاہیے۔''

وہ نیم غنودگی کے عالم میں اس کی آنکھوں میں اپنے لیے خوف، فکر اور اضطراب دیکھ سکتا تھا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ضرورت ہے۔'' پریشان ہو کر اس کا موبائل اٹھا لیا۔ ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ فارس نے اس کے ہاتھ سے موبائل لے لیا۔

''جنت! میں ٹھیک ہوں۔''

''تم سے بات تک نہیں کی جا رہی۔'' وہ رو دینے کو تھی۔

''میں نے میڈیسن لی ہے۔ خطرہ نہیں ہے۔ اب بہتر ہوں۔'' بمشکل کہہ کر اسے تسلی دینا چاہی۔ اس خیال سے کہ وہ اس کی وجہ سے پریشان ہو رہی تھی، وہ خود بھی بے چین ہوا تھا۔ ''صبح تک ٹھیک ہو جاؤں گا۔'' اس نے کہا مگر جنت کے اضطراب میں کمی نہیں آئی تھی۔

''تم آٹو انجکٹر استعمال کر لو۔'' وہ اپنی کہے جا رہی تھی۔ پچھلی بار وہ موت کے منہ میں جاتے جاتے بمشکل بچا تھا۔ اس کی پریشانی بجا تھی۔

''میں ہاسپٹل گیا تھا۔'' اس نے گہری سانس لے کر بتایا۔ خیال تھا اس کی پریشانی کم ہو گی۔ مگر وہ آنکھوں میں صدمہ لیے اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ وہ اتنی تکلیف میں تھا اور اس نے بتایا تک نہیں۔ خاموشی سے گھر آ گیا اور جگایا تک نہیں۔

وہ آنکھوں میں مبہم سی نمی لیے اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی تھی۔

''اپی پن رکھا ہے۔ اگر دوبارہ حالت خراب ہوئی تو۔'' اس نے آٹو انجکٹر کی طرف اشارہ کیا۔ یہ جانے بغیر کہ اس وقت وہ اس کی کسی بھی بات سے مطمئن ہونے کے بجائے مزید اذیتوں میں گھر گئی تھی۔

اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے جنت نے گہری سانس لی۔ ہر طرح کے منفی خیال کو جھٹک دیا۔ اپنی اس کیفیت سے باہر نکل آئی۔

''تمہیں اپنا پراپر علاج کروانا چاہیے۔'' اب وہ آٹو انجکٹر ہاتھ میں لیے اس کی طرف رخ کیے قالین پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی محتاط ہو کر۔ اس کی پروا نہ کرنے کا تہیہ کر کے اس کی تکلیف میں مکمل مبتلا ہو کر۔

''مجھے یہ وراثت میں ملا ہے، اپنے دادا سے۔'' فارس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ کس قدر کوشش سے خود کو بیدار رکھے ہوئے تھا تاکہ وہ پریشان نہ ہو۔

''اوہ!'' جنت کے لب گول ہوئے۔

''تو تمہارے کسی اور فیملی ممبر کو نہیں ہے؟ میرا مطلب ہے تمہارے والد۔ یا پھر......'' لمحے بھر کو رکی۔ ''تمہارے بھائی کو؟''

اس عرصے میں پہلی بار جنت کمال نے اس کے بھائی کا ذکر کیا تھا۔

''نہیں۔ صرف مجھے!'' کھانستے ہوئے جواب دیا۔

''تمہیں کافی مشکل ہوتی ہو گی۔ ایسے کھلی یا صاف ستھری فضا میں بھی ہر وقت الرٹ ہو کر رہنا۔''

''ہوں!'' اس پر پھر سے غنودگی چھانے لگی۔ مگر وہ اس کے لیے بیدار رہنا چاہتا تھا۔ ''تم نے کھانا کھا لیا تھا؟''

''ہاں۔'' وہ آٹو انجکٹر پر لگے اسٹیکر کو کھرچ رہی تھی۔

''ممی۔ سے بات۔ ہوئی تھی؟''

''ہاں۔ وہ ٹھیک ہیں۔'' جواب دے کر اس کی جانب دیکھا۔

پھر خاموشی۔

مزید خاموشی۔ فارس کی آنکھیں مکمل بند ہو چکی تھی۔

وہ گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے اسے دیکھے گئی۔ باہر بجلی چمکی تو کھڑکیوں کی طرف گردن موڑی۔ شیشوں پر بوندیں ابھرتی اور پھسلتی جا رہی تھیں۔ ہوائیں یکا یک تیز ہوئی تھیں۔ روشنیوں میں نہایا ہوا شہر یکا یک دھندلا ہوا تھا۔

''ممی! مجھے کب۔ لینے آ رہی ہیں؟'' مدھم سی بڑبڑاہٹ نما آواز سماعت سے ٹکرائی۔ جنت اپنی جگہ تھم گئی۔ مڑ کر حیرت سے فارس کو دیکھا۔ چونک کر گھٹنوں کے بل اوپر ہوئی۔

''کیا کہہ رہے ہو؟'' چہرے پر جھک کر پوچھا۔

''ممی......وہ......حماد کو نہیں......چھوڑ سکتیں۔ اس لیے نہیں آتیں۔'' بند آنکھوں کے ساتھ وہ پھر بڑبڑایا۔ جنت کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے جگانا چاہا۔ پھر رک گئی۔

''تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟''

''اگر میں نہ گیا۔ تو وہ مجھے مار دیں گے......'' وہ کہہ رہا تھا۔

''کون؟''

''اعظم شیرازی۔''

جنت کا دل رکا۔ سانسیں تھم گئیں۔ وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ یقیناً کسی غیر حقیقی سچویشن میں پھنس گیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اور کچھ نہیں سوچ سکتی تھی۔ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔

''وہ مجھے۔ مار دیں گے۔'' اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہوئے تھے۔ جنت نے بے ساختہ اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ ''وہ مجھے مار......دیں گے۔''

''فارس!'' نرمی سے پکارا۔

"وہ مجھے۔۔۔۔۔ مار۔۔۔۔۔ دیں گے۔"

"فارس!"

"وہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔"

جنت اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ آنکھیں کھل گئیں۔ حواس کچھ بیدار ہوئے۔ وہ نیم وا آنکھوں سے اس کی شکل دیکھ کر روہانسا ہوا۔

"جنت!! مجھے سونے دو۔ پلیز۔۔۔۔۔"

جنت نے ہاتھ ہٹا لیے، خود بھی پیچھے ہٹ گئی۔ قالین پر دوزانو بیٹھی وہ اسے دیکھ رہی تھی اور تب تک اسے دیکھتی رہی جب تک کہ وہ پوری طرح سے سو نہیں گیا۔

حماد۔۔۔۔۔

اعظم شیرازی۔۔۔۔۔

وہ اٹھ کر واش روم میں گئی۔ ٹھنڈے پانی کے چھپاکے چہرے پر مارے۔ واش بیسن پر ہاتھ جمائے کتنی ہی دیر تک کھڑی رہ گئی۔ اس کی دھڑکن معمول سے ہٹ کر تھی۔ آئینے میں خود کو دیکھا تو عقب میں باتھ ٹب پر رکھے کپڑوں پر نگاہ پڑی۔

جینز، شرٹ، سویٹر، کوٹ۔ اور سب ہی بھیگے ہوئے۔ اس نے اٹھا کر دیکھا۔ اتنی شدید بارش میں آخر وہ کہاں گیا تھا؟ پھر اس نے کوٹ کی جیبیں ٹٹولیں تو ایک کی چین ہاتھ آ گئی۔ اس کا ایک سرا ٹوٹا ہوا تھا۔ تین چابیاں جڑی ہوئی تھیں۔ سیاہ رنگ کا ایک موبائل فون تھا۔ مہنگا مگر تین چار سالہ قدیم ماڈل۔ اسکرین پر کریک تھے۔ اس نے وہ چیزیں جیسی تھیں ویسی رکھ دیں۔ گہری سانس لے کر ایک بار پھر اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

نیند کی حالت میں اس کا داہنا ہاتھ گردن تک آیا تھا۔ جلد پر جس جگہ ریشز تھے شاید وہاں خارش ہو رہی تھی۔ اس نے فارس کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے ہٹا دیا۔ شرٹ اور سویٹر کے اوپری بٹن کھول کر اس نے گردن اور سینے پر جہاں جہاں سرخ نشان دیکھے کریم لگائی۔

ایک بار پھر اسے بہت فکرمندی سے دیکھا۔ آنکھوں میں اب کے عجیب سا تاثر ابھرا۔ خشک لبوں کو تر کرتے ہوئے وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے بیٹھی رہی۔ وہ نیند میں بھی کافی سے زیادہ بے چین تھا۔ گردن کو جنبش دیتے ہوئے ہر بار اس کے چہرے پر تکلیف دہ تاثرات ابھر آتے تھے۔ پیشانی پسینے سے تربتر ہو جاتی اور سانسیں غیر ہموار ہونے لگتی تھیں۔

وہ ساری رات جنت نے پریشانی کے عالم میں اس کے پاس قالین پر بیٹھ کر آنکھوں میں گزار دی۔ صبح کی نماز کے بعد جب

اس کی حرارت کچھ کم ہوئی اور وہ نیند میں بھی کچھ پرسکون ہوا تو اس کی جان میں جان آ گئی۔ تکیہ اور کمفرٹر اٹھا کر وہ اس کے برابر میں نیچے قالین پر سوئی تو پھر دوپہر کے ڈھائی بجے ہی آنکھ کھلی۔ نیم کھلی آنکھوں سے وہ میز کو دیکھتی یہی سوچتی رہی، وہ قالین پر کیا کر رہی ہے۔ اور جیسے ہی فارس کا خیال آیا، گھبرا کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

وہ صوفے پر اس کی طرف رخ کیے لیٹا تھا، ایک کشن سر کے نیچے، دوسرا ٹانگوں میں پھنسا تھا۔ کمفرٹر آدھا صوفے پر تو آدھا نیچے گرا ہوا تھا۔ وہ آرام دہ حالت میں بازو موڑ کر سر کے نیچے رکھے جانے کب سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

اس کے احساسات سے، جذبات سے، آنکھوں کے تاثر، اور تاثرات کی حکایتوں سے مکمل بے خبر وہ گھٹنوں کے بل اوپر ہوئی۔ ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔

"تم ٹھیک ہو؟" انداز ایسا تھا جیسے اگر اس نے "نہ" کہا تو وہ وہیں فوت ہو جائے گی۔

خاموشی۔۔۔۔۔

"فارس۔" گھبرا کر آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلایا۔ پھر اس کی پیشانی پر اپنا ٹھنڈا ہاتھ رکھا۔ حرارت تو بالکل بھی نہیں تھی۔

"اب ٹھیک ہوں۔" اس نے کہا۔ آواز بھاری۔ گمبھیر اور بے انتہا گہری تھی۔ جنت نے بے اختیار سکھ بھری سانس لی۔ پھر اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورا۔

"تم نے مجھے بتایا نہیں، کل رات تمہاری بلیوں کے ساتھ میٹنگ تھی۔"

فارس کے لبوں پر تبسم بکھر گیا۔ آنکھوں کی نمی کچھ اور بڑھ گئی۔

"تم کیا کرتیں؟"

"تمہارے ساتھ جاتی۔ اور کیا؟" جل کر بولی۔ بخدا اس نے بلیوں سے قطع تعلق کر لیا تھا مگر شوہر نامدار کو ہر دوسرے تیسرے ہفتے پھر بھی الرجی ہو جاتی تھی۔ فائدہ بلیوں سے دور رہنے کا؟

وہ قالین پر تھی، اور صوفے پر کہنی ٹکائے انتہائی سنجیدگی اور کچھ برہمی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ فارس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے گال پر پھسلتی لٹ کو کان کے پیچھے کر دیا۔ "تم کیسی ہو؟"

"مجھے کیا ہونا ہے؟" شان بے نیازی سے کہا۔

"کافی پریشان تھیں تم۔"

"نہیں! بالکل بھی نہیں! مجھے تو صرف آنٹی کی فکر ہوتی ہے جنہیں تمہارے جیسا لاپروا اور نالائق بیٹا ملا ہے۔"

"یہی نالائق شیرازی انٹرپرائز کا سی ای او ہے۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نگاہیں سنٹرل ٹیبل پر رکھی اپنی ادویات پر پڑیں تو ایک دم

سے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔اینٹی ڈپریسنٹ اور سلیپنگ پلز سامنے ہی رکھے تھے۔

''تم رات کہاں گئے تھے؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔

''شاپنگ مال۔''

''اس کے علاوہ؟''

''کہیں نہیں۔'' مختصراً کہہ کر کہیں اور دیکھنے لگا۔

وہ چند لمحوں تک منتظر رہی شاید وہ کچھ کہے گا مگر......

''ہاں!! مجھے کیوں بتاؤ گے تم!!۔'' جنت کو غصہ آ گیا۔''میں تمہاری لائف پارٹنر تھوڑی ہوں جس سے تم اپنے غم یا راز شیئر کرو گے۔''

پاؤں پٹختی وہاں سے چلی گئی۔فارس نے سر اٹھا کر اسے جاتا دیکھا۔نگاہیں بھٹکتی ہوئی فرش پر آٹھہریں۔وقت گزر گیا تھا۔زخم بھر گئے تھے۔درد پھر بھی اٹھ رہا تھا۔سر سے، بازو سے، پیٹ کے داہنے حصے سے بھی۔ہاتھ بھی زخمی تھے۔روح بھی مجروح تھی۔وہ اسے کیا بتائے؟ وہ اسے کیا دکھائے؟

گہری سانس لے کر اینٹی ڈپریسنٹ اور سلیپنگ پلز جیب میں رکھتا واش روم چلا گیا۔فریش ہو کر باہر آیا تو وہ ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگا چکی تھی۔ناشتے کا وقت تو ویسے بھی گزر چکا تھا۔وہ کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

کھانے کے دوران مکمل خاموشی رہی۔نہ وہ اسے دیکھ رہا تھا۔اور نہ وہ کوئی بات کر رہی تھی۔البتہ گاہے بگاہے ایک نظر اس پر ضرور ڈال لیتی تھی۔

کھانے کے بعد چائے بنا کر وہ لاؤنج میں آ گئی۔ایک کپ اس کے آگے رکھا اور اپنا کپ ہاتھوں میں لیے دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی۔

وہ بے مقصد چینل بدل رہا تھا۔معمول کے برعکس بہت خاموش تھا۔

''چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔'' اس نے کہا تو ٹرے قریب کرتے ہوئے اس نے پانی کا گلاس اٹھا لیا۔اپنی ٹیبلٹس منہ میں رکھتے ہوئے پانی پیا۔

اسے فارس کی خاموشی پر غصہ آنے لگا۔اس کے ہر معاملے پر نظر رکھ کر وہ اپنے سبھی معاملات سے اسے بے خبر رکھے ہوئے تھا۔اور یہ نہیں کہ کوئی بات شیئر کر لے۔سوچ کر تپ چڑھی۔سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''کل رات تم مجھ سے باتیں کرتے رہے۔'' ایک لمحے کا توقف کر کے اضافہ کیا۔''نیند میں۔''

فارس کو اچھو لگا۔کھانستے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''میں باتیں کرتا رہا؟'' آنکھوں میں بے یقینی اتر آئی۔

جنت نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تم سے؟'' حیرت۔۔

''ہاں۔''

''نیند میں؟'' صدمہ۔۔

''بالکل۔''

وہ اندر تک سن ہوا۔لیکن پھر یہ سوچ کر کہ جنت اس طرح کی باتیں صرف تنگ کرنے کے لیے کر سکتی ہے تو کچھ پرسکون ہو گیا۔

''نائس ٹرائے!! لیکن مجھے نیند میں باتیں کرنے کی عادت نہیں ہے۔'' اپنا کپ اٹھا کر مسکرایا۔وہ بھی مسکرائی۔

''ہاں، جانتی ہوں لیکن کل رات تم نے باتیں کیں۔خود سے بولتے رہے۔''

وہ مذاق میں لے رہی تھی مگر فارس کے تاثرات میں یکا یک سنجیدگی اتر آئی۔

''ایسا نہیں ہو سکتا۔'' وہ قطعی لہجے میں بولا۔

''ہو چکا ہے۔'' وہ مزے میں تھی۔

''کیا بات کی میں نے؟'' اب کے وہ اس کی آنکھوں میں اضطراب دیکھ سکتی تھی۔

''لو تم تو ابھی مان ہی نہیں رہے تھے۔'' وہ ہنسی۔

''جنت! میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔'' وہ سنجیدہ تھا۔

''میں بھی بہت سیریس ہو کر بات کر رہی ہوں۔'' وہ چائے میں چینی ڈال کر چمچ ہلانے لگی۔

''میں نے کیا کہا؟''

''کچھ ایسا جو پہلے کبھی نہیں کہا۔'' وہ اس کی کیفیت سے محظوظ ہو رہی تھی۔

فارس نے گھور کر اسے دیکھا۔

''میں بھلا تمہیں کیوں بتاؤں؟'' جواباً اس نے اور زیادہ گھورا۔

''تو پھر کسے بتاؤ گی؟''

''ڈاکٹر بخاری کو۔اور کسے؟''

''ڈونٹ یو ڈیئر!''اس نے کپ رکھ دیا۔

جنت کے چہرے پر ہر طرح کے مسرت بھرے رنگ بکھرے۔اتنے دنوں سے وہ اسے تنگ کر رہا تھا۔بالآخر آج وہ اسے زچ کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔

''مجھے ڈاکٹر بخاری نے کہا تھا اگر میں تمہارے بی ہیویر میں کسی بھی طرح کا بدلاؤ دیکھوں۔یا کسی بھی میڈیسن کے استعمال کے بعد کچھ بھی تبدیلی محسوس کروں تو انہیں ضرور آگاہ کروں۔''

''میں تھکا ہوا تھا۔مجھے الرجی بھی ہوئی۔اگر دواؤں کے اثر میں کچھ کہہ بھی دیا تو کیا ہو گیا؟''

''کچھ بھی نہیں ہوا۔کیا میں نے کوئی اعتراض کیا؟''وہ مزے سے چائے کے گھونٹ لے رہی تھی۔

''جنت۔''وہ اچھا خاصا چڑ گیا۔

''جو بھی بات ہو گی۔ڈاکٹر بخاری سے ہو گی۔''اس نے ہاتھ اٹھا کر اعلان کیا۔

''تم جانتی ہو وہ ممی سے رابطے میں رہتے ہیں۔''وہ صحیح معنوں میں اسے پریشان نظر آیا تھا۔

''نہیں میں بالکل نہیں جانتی۔''وہ اسے تنگ کر کے بہت خوشی محسوس کر رہی تھی۔وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''میرے لیے یہ بہت سیریس بات ہے۔پلیز!''وہ ازحد سنجیدہ تھا۔

''تم ڈر کیوں رہے ہو؟''

''میں ڈر نہیں رہا ہوں۔میں۔''وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔''تمہیں مجھے جگانا چاہیے تھا۔نا کہ اس طرح مجھے سنتی رہتیں۔''اس نے جھڑک دیا۔

''جگایا تو تھا،تم نے مجھے ڈانٹ دیا آگے سے۔''

وہ آنکھوں میں اضطراب لیے کھڑا رہ گیا۔

''اور اگر سن بھی لیا تو کیا ہو گیا؟''اس نے لہجے میں نرمی سمو کر معصومیت سے پلکیں جھپکائیں۔

فارس کے لب بھینچ گئے۔آنکھوں میں ناراضی اتر آئی۔پیشانی پر ڈھیر سارے بل لیے وہ لاؤنج سے چلا گیا۔

''چائے تو پی لو۔''وہ اٹھ کر تیزی سے اس کے پیچھے آئی۔

مگر کوئی بھی جواب دیے بغیر اس نے بیڈروم کا دروازہ غصہ سے بند کر دیا تھا۔

جنت اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆

فارس وجدان اس سے ناراض ہو چکا تھا۔پیکنگ کے دوران اس کے آگے پیچھے پھرتے ہوئے اس نے بات کرنے کی کوشش کی تو اس نے کوئی جواب نہ دیا۔تیاری کرتے ہوئے بار بار مخاطب کر رہی تھی مگر وہ تو ایسا ہو گیا جیسے کچھ سن ہی نہ رہا ہو۔کھانے کی میز پر بھی انتہا کی خاموشی تھی۔اب وہ وہی کھڑوس،مغرور اور بدمزاج فارس تھا(پرانے والا!)

جنت حیران تھی۔آخر اسے ہوا کیا تھا؟ایسی کون سی بات تھی جو اسے بری لگ گئی تھی؟

''اچھا ٹھیک ہے۔کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔''خاصی سوچ و بچار کے بعد ذرا سا احساس ہوا تو کہہ دیا۔گاڑی ایئرپورٹ کی جانب رواں دواں تھی۔وہ عقبی نشست پر اس کے برابر میں بیٹھی تھی۔

''پورے پاکستان کو بتاؤ میری بلا سے۔''ایک شان اور تمکنت سے براجمان وہ کروفر سے کہہ کر باہر دیکھنے لگا۔جنت حیران ہوئی۔

''واقعی؟''پھر کندھے اچکا کر اس نے بھی رخ بدل لیا۔

لندن کے ہیتھرو ایئرپورٹ پر عدیل احمد نظر آیا تو چھوٹتے ہی پوچھ لیا۔

''مسٹر عدیل!کیا آپ کسی ایسے انسان کو جانتے ہیں جو نیند میں باتیں کرتا ہو؟''

''سوری؟''عدیل کو جنت کمال کی بات خاک سمجھ میں نہ آئی۔

''مطلب جو نیند میں باتیں کرے۔میں ایک کو جانتی ہوں۔''ہاتھ سے اپنی طرف اشارہ کیا یوں جیسے بڑے اعزاز کی بات ہو۔

فارس نے غصہ دباتے ہوئے جنت کو بازو سے پکڑ کر اپنی دائیں طرف کھڑا کیا۔''باز آجاؤ تم۔''

''نہیں باز آسمان پر ہی ٹھیک ہے،اسے نیچے مت بلاؤ تم۔''

وہ بڑے مزے میں تھی۔''اینڈ بائے دا وے تم نے خود مجھے کہا سب کو بتا دو۔اب کیا مسئلہ ہے؟''

وہ ضبط کر کے جھٹکے سے پلٹ گیا۔

ایئرپورٹ کے ویٹنگ ایریا میں تو اس نے انتہا کر دی۔قریب بیٹھے کسی سوٹڈ بوٹڈ آدھے انگریز،آدھے پاکستانی انکل سے سلیپ ٹاکنگ کا موضوع چھیڑ دیا۔وہ بتا رہے تھے کہ کیسے ان کے عزیز نیند میں چلا کرتے تھے اور کیسے وہ ایک بار گھر سے باہر نکل گئے تھے۔اور وہ بہت حیران و پریشان ہو رہی تھی۔

''کیا واقعی انکل؟ایسا ہی ہوتا ہے؟

اوہ میرے اللہ! اچھا پھر......پھر کیا ہوا تھا؟''

وہ سیٹ آرم پر کہنی ٹکائے، ہاتھ کو پیشانی اور آنکھوں پر رکھے ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہا تھا۔

انکل صاحب سے گفتگو ختم ہوئی تو محترمہ کو بھوک لگ گئی۔ بیگ سے چپس کا پیکٹ نکال لیا۔ فارس کو آفر کی تو وہ اچھا خاصا جلا بھنا بیٹھا تھا، رسپانس تک نہ دیا۔ وہ کندھے اچکا کر رخ بدل گئی۔ چپس کے چند پیکٹ۔ چاکلیٹس، بسکٹس نکال لیے۔ وہ مزے سے کھا رہی تھی تو سامنے بنچ پر بیٹھے بچے اس پر سنجیدگی سے نظریں جمائے ہوئے تھے۔ بیگ تھا یا کوئی جادوئی تھیلا۔ چیزیں ختم ہی نہیں ہو رہی تھیں۔ اسی دوران ایک ننھی سی بچی نظروں میں آگئی۔ اس کے پیروں میں پھولوں جیسے جوتے تھے۔ جب وہ قدم اٹھاتی تھی تو سرخ روشنی سی بکھرتی تھی۔

''ہم بھی ایسے جوتے لیں گے۔'' فارس کی جانب جھک کر کہا۔ وہ موبائل پر کچھ لکھ رہا تھا، سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر دیکھتا ہی رہا۔ بچی نے نیا نیا چلنا سیکھا تھا۔ فراک میں تو کوئی کھلتا ہوا پھول ہی لگ رہی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ ''ہم'' یہی لیں گے۔'' وہ منظر دیکھ کر اس کا موڈ خوش گوار ہو گیا۔

''میں صرف اپنی بات کر رہی ہوں۔'' محترمہ کو ہوش آیا تو پھر سے ٹوکا۔

''یہ ''ہم'' اب صرف تم ہو؟'' اب کے کڑی نظروں سے اسے گھورا۔ وہ اسٹرا دانتوں میں دبائے رخ بدل گئی۔ فارس کی نگاہیں کافی دیر تک اس بچی کے تعاقب میں رہیں۔

''تمہیں لگتا ہے جب ہمارا بے بی آئے گا تو ہم الگ ہو سکیں گے؟'' اس نے کہا۔ جنت نے چونک کر اسے دیکھا۔ اسٹرا منہ میں ٹھہر گیا۔ اندر تک خاموشی چھا گئی۔

''تم میں ایسا کرنے کی ہمت آسکتی ہے۔ مجھ میں تو بالکل بھی نہیں۔'' وہ سچ کہہ رہا تھا۔ وہ جتنا ہی مضبوط تھا۔ اپنی اولاد کے لیے اتنا ہی کمزور ہو سکتا تھا۔

''تم مجھے پریشان کر رہے ہو۔'' جنت کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ آنکھیں، ناک، گال سرخ ہونے لگے۔

''اوہ گاڈ! کیا ہو گیا ہے۔'' وہ صحیح معنوں میں گھبرایا تھا۔ ''میں نے تم سے یہ تو نہیں کہا، میں اسے تم سے چھین لوں گا۔''

''میں یہی سمجھی ہوں۔'' وہ رو پڑی۔

''تم غلط سمجھی ہو۔ فار گاڈ سیک! رونا بند کرو۔ لوگ ہمیں دیکھ رہے ہیں، جنت۔''

''ہاں تو دیکھنے دو۔ انہیں پتا چلنا چاہیے۔ تم کتنے برے ہو۔''

وہ اٹھ کر اپنی پشت پر ہاتھ باندھے اس کے آگے کھڑا ہو گیا تھا تاکہ کسی کو یہ پتا نہ چلے وہ کتنا برا ہے۔ وہ اس کی اس حرکت پر

سیخ پا ہو گئی۔

''ہاں چھپ کر روتی رہوں، کوئی پروا نہیں۔ یہ نہیں کہ دو لفظ تسلی کے بول دو۔'' پست آواز میں شکوہ کیا۔

وہ قدرے حیرت سے اس کی طرف مڑا۔

''اب میں تم سے کیا کہوں؟'' برابر میں بیٹھ کر پوچھا۔ ''یہی کہ میرے بچے کو پورا کا پورا اپنے پاس رکھ لینا۔ میں ہفتے میں ایک دن مل لیا کروں گا؟ یا پھر یہ کہ خلع کے لیے جو وکیل چاہیے وہ میں ہائیر کر دوں گا؟'' وہ لمحے بھر کے لیے تھمی۔ اندر ہی اندر اور رونا آیا۔

''خبردار جو مجھ سے تم نے بات بھی کی تو......'' اپنا بیک پیک اس کی گود میں پٹخ کر دوسری بنچ پر جا بیٹھی۔ فارس گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔'' آنسو صاف کرتے ہوئے بڑبڑائی۔

''ہاں مگر آپ کے والا تو خوب صورت بھی بہت ہے۔'' آنٹی جی نے کتاب سے نظر ہٹا کر عینک آگے پیچھے کر کے اس کے والے کو بغور دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا۔ غالباً وہ کافی دیر تک ان کی چخ چخ ملاحظہ فرما رہی تھیں۔ ''شوہر ایسا ہو تو بیوی کو کیا خاک سکون کی نیند آتی ہو گی۔''

''یہ تو آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔'' ان کی بات سمجھے بغیر اس نے اپنی کہی۔

''گڈ لکنگ مردوں کی بیویوں کو بہت زیادہ محتاط رہنا چاہیے۔''

جنت کا منہ کھلا۔ بات تو جیسے اب سمجھ میں آئی۔

''کوئی گڈ لکنگ نہیں ہے وہ۔'' تڑپ کر کہا۔

آنٹی جی نے اب کے عینک ناک پر کھسکا کر اسے گھورا۔ بھلا یہ کیسی بیوی تھی جس سے اپنے شوہر کی تعریف برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

''نظر رکھا کرو اس پر۔'' ماؤں کی طرح نصیحت کی۔

''مجھے نہیں رکھنی کوئی نظر وظر۔'' بگڑ کر سینے پر بازو باندھے۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھی۔ ''کرتا ہے تو کر لے دوسری، تیسری، چوتھی شادی۔''

رونے کے باعث محترمہ کی آنکھیں اور ناک سرخ ہو رہی تھیں۔

آنٹی جی کو اس کی خود سری پر غصہ آ گیا۔ یہ آج کل کی نوجوان نسل۔ برداشت تو ہے ہی نہیں ان میں۔ لو بتاؤ۔ دوسری، تیسری،

چوتھی شادی...... یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے؟ اور کل کو اگر دوسری، تیسری، چوتھی آ گئی تو لگ پتا جائے۔

آنٹی کی برہمی دیکھ کر وہ ذرا مدھم پڑی۔ ابھی تو اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے اور یہ بھی کہ وہ کورٹ میں جا کر خلع لےگی۔ پھر شاید وہ جوتا ہی اتار لیتیں۔

فارس کو مکمل نظر انداز کیے وہ ان سے باتیں کرنے لگی۔

آنٹی کے پاس بہت سے مفت مشورے تھے۔ انہوں نے ہاتھ تھاما اور شوہر کو مٹھی میں کرنے کے گر سکھانے لگیں اور گر سکھاتے سکھاتے اپنی نند اور جیٹھانی کے قصے چھیڑ کر بیٹھ گئیں۔ جنت ان کی خاندانی سیاست اور مسئلوں میں ایسی الجھی کہ فارس کے ساتھ اپنی لڑائی غصہ ناراضی سب بھول بھال گئی۔

اس کا ہرے رنگ کا بیک پیک اپنے گھٹنے پر رکھے فارس نے بے ساختہ سکھ بھرا سانس لیا۔ پندرہ منٹ بڑے سکون سے گزرے۔ اعلان ہوا تو وہ اٹھ کر اس کے پاس آیا۔

”میرا تو یہ فورتھ منتھ چل رہا ہے۔“ وہ سارے حال احوال یوں دے رہی تھی جیسے کئی سالوں کی شناسائی ہو۔ اور آنٹی جی بھی تسبیح کے دانے گھماتے ہوئے یوں خوش ہوئیں جیسے وہی نانی بننے والی ہوں۔ پریگننسی کے حوالے سے بھی نصیحتیں کیں۔ جاتے وقت فون نمبرز کا بھی تبادلہ ہوا۔

”میں آپ کو بہت مس کروں گی آنٹی۔“ ان سے گلے لگ کر بولی۔ فارس نے آنکھیں گھمائیں۔ سر راہ چلتے کسی سے بھی اس کی دوستی ہو جاتی تھی۔

”کاش میری سیٹ آپ کے ساتھ ہوتی۔“

”ہاں! کاش۔“ فارس نے ہاتھ پکڑ کر دانت پیسے اور اسے اپنے ساتھ لے جانے لگا۔

”صبر نہیں ہے تم میں۔“ اسے برا لگا۔

”پچھلے ایک گھنٹے سے صبر ہی تو کر رہا ہوں۔“

”ہاں تو کیا اس میں میرا قصور ہے، فلائٹ لیٹ ہو گئی؟“

”سراسر میری غلطی ہے۔“ وہ معترف ہوا۔ اور اس کا ہاتھ گرفت میں لیے آگے بڑھ گیا۔ وہ محض اسے گھور کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

بزنس کلاس کیبن میں نیلگوں روشنی کا گمان تھا۔ پرسکون خاموشی تھی۔ آس پاس بہت سے مسافر نیند کی آغوش میں اتر چکے تھے بشمول اس کی زوجہ محترمہ کے۔ تاہم وہ جاگ رہا تھا۔

ٹیبل ٹرے پر لیپ ٹاپ رکھا تھا۔ اسکرین روشن تھی۔ کچھ بے چینی سے پیشانی مسلتے ہوئے وہ آرام دہ حالت میں براجمان بہت بے چین لگ رہا تھا۔ آنکھوں میں تفکرات کی پرچھائیاں تھیں۔ دل میں واہموں کا خوف تھا۔ حالات کی دہشت تھی۔ ماضی کی وحشت تھی۔ اور سوال تھے۔ بہت زیادہ اور مشکل سوال تھے۔ اسے سنبھلنے میں وقت لگا تھا۔ اب بہت زیادہ وقت لگ رہا تھا۔ کیفیت یوں ہو رہی تھی جیسے وہ وہیں کھڑا ہو۔ اندر بہت شور تھا۔ اور بے تحاشہ بے سکونی تھی۔

”تم سوئے نہیں؟“

جنت کی آواز پر چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اسے دوبارہ ومٹنگ ہوئی تھی تو طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ابھی بھی پیٹ پر ہاتھ رکھے وہ نڈھال نیم دراز تھی۔

”نیند نہیں آ رہی۔“ کہہ کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”پریشان ہو؟“ جانے کب سے وہ اس کی بے چینی ملاحظہ کر رہی تھی تو پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

”نہیں۔“

وہ چپ ہو گئی۔

”تم کچھ کھا لو۔“ اس نے کہا

”میرا دل نہیں چاہ رہا۔“ منہ کے زاویے بگاڑتے ہوئے اس نے آنکھیں میچ لیں۔ حلق کڑوا تھا۔ ذائقہ خراب۔ کھانے کے تصور سے ہی ابکائی آنے لگی۔

”اب اس طرح کی چیزیں کھاؤ گی تو یہی ہو گا۔“

”کس طرح کی چیزیں؟“

”جن سے بیگ بھرا ہوا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے مارننگ سکنس، چپس، چاکلیٹس کھانے کی وجہ سے ہوتی ہے؟“ جنت کی بھنویں سکڑ گئیں۔

”تم سے بحث فضول ہے۔“ اس نے فلائٹ اٹینڈنٹ کال بٹن دباتے ہوئے کہا۔

”ہاں لاجواب جو ہو گئے ہو۔ اب تو تم یہی کہو گے۔“ تنک کر بولی۔ کچھ ہی دیر بعد فلائٹ اٹینڈنٹ حاضر ہوئی۔ فارس نے فروٹ پلیٹر میل کا آرڈر دیا جو کہ کچھ ہی دیر میں پیش کر دیا گیا۔

اس کے اصرار اور ایک دو سخت گھوریوں کے بعد وہ نا چاہتے ہوئے بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”چاہو تو ہر پانچ منٹ بعد ایک بائٹ لو لیکن یہ ہر صورت ختم ہونا چاہیے۔“ اس کی سیٹ کی پوزیشن ایڈجسٹ کرتے ہوئے

ٹیبل ٹرے کھول دی۔ ایر ہوسٹس ایک ایک کر اشیاء رکھتی گئی۔ وہ گہری سانس لے کر باہر تاریکی میں دیکھنے لگی۔ فورک اٹھالیا۔ پھر بے دلی سے تھوڑا تھوڑا کر کے کھانے لگی۔

اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اب وہ سامنے دیکھ رہا تھا۔ لیپ ٹاپ کی اسکرین تاریک ہو چکی تھی۔ اور ایسی ہی تاریکی اس کے اندر بھی آگئی تھی۔ سینے پر بوجھ بڑھا ہوا تھا۔ گہری سانس لے کر اس نے اپنی پیشانی مسلی۔ گزشتہ شب والی کیفیت ایک بار پھر اس پر طاری ہو رہی تھی۔ بات سامان کی تھی۔ اس گھر کی تھی۔ اور گھر کی دیواروں سے جڑی حکایتوں کی تھی۔ شاید اسے وہاں نہیں جانا چاہیے تھا۔ جو دروازے سالوں سے بند تھے، انہیں کھولنا نہیں چاہیے تھا۔

ایک منظر ابھرا۔ پھر دوسرا۔ تیسرا۔ اس نے آنکھیں میچ کر گردن کے پیچھے دونوں ہاتھوں سے دباؤ ڈالا۔ پھر پانی کی بوتل اٹھا لی۔ چند گھونٹ بھرے۔ پھر جیب سے ٹیبلٹس کا چھوٹا سا پیک نکالنے ہی والا تھا کہ جنت کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔

”گردیزی صاحب اس دن تمہارے دادا کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے تمہاری پرسنالٹی بھی ان کے جیسی ہے۔“

وہ لمحے بھر کے لیے ساکت ہوا پھر گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”گردیزی صاحب؟“

”ہاں! وہ جن کے سفید لمبے بال ہیں۔ اس دن شادی پر بھی تھے۔ جمال گردیزی۔“

وہ سن ہوا۔ سلیمان نے تو اسے نہیں بتایا تھا۔ تو کیا وہ جنت سے ملنے آئے تھے؟

”وہ کہہ رہے تھے تمہاری بزنس اسٹریٹجی، تمہارے فیصلے، تمہارے ہر معاملات میں اپنی ٹیم کو لے کر چلنے کا طریقہ لیٹ چیئر مین اعظم شیرازی جیسا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے آج بھی سب وہی ڈیل کر رہے ہوں۔“ وہ بہت نارمل لہجے میں بتا رہی تھی مگر فارس کے اندر سب فنا ہو رہا تھا۔

بظاہر یہ تعریف ایک ”رائے“ تھی۔ اور یہ ”رائے“ صرف گردیزی صاحب کی نہیں تھی۔ اس کے حلقہ احباب اور بزنس سوسائٹی میں تقریباً ہر دوسرا شخص یہی کہتا ہوا پایا جاتا تھا۔ مگر حیران کن بات یہ تھی، وہ یہ سب جنت سے سن رہا تھا۔ کچھ غلط ہو گیا تھا یقیناً۔ خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ گردیزی صاحب کے تصور سے اس کے جبڑے بھنچ گئے۔

”کیا ایسا ہی ہے؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”نہیں۔“ اس کا داہنا ہاتھ بے ساختہ گردن تک آیا۔ اس نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر دی۔ کالر کے بٹن بھی کھول دیے۔ وجود میں آگ جل اٹھی تھی۔ آنکھوں میں دھواں سا بھر گیا تھا۔ زخم سلگنے لگے تھے۔ روح جھلس رہی تھی۔

وہ اعظم شیرازی نہیں تھا۔ وہ اعظم شیرازی جیسا نہیں ہو سکتا تھا۔

اس کے احساسات سے قطعی بے خبر جنت نے لیمونیڈ کے کچھ گھونٹ لیے۔

”اور کیا کہا؟“ وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ آنکھوں میں سرخی اتری ہوئی تھی۔ تاثرات بظاہر سخت نہیں تھے مگر اندر کی کرختی اس کی آنکھوں سے عیاں ہو رہی تھی۔

”اور تو کچھ خاص نہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے آئے تھے، اس لیے جلدی چلے گئے۔ اوہ ہاں!“ پھر جیسے کچھ یاد آیا تو اس کی طرف دیکھا۔ ”مجھ سے کہنے لگے، یو شڈ بی ویری کیئرفل آف یور ہزبینڈ! یو ڈونٹ نو ہم۔“ (تمہیں اپنے شوہر سے بہت محتاط رہنا چاہیے، تم اسے نہیں جانتیں)

حملہ شدید۔ اور ضرب کاری تھی۔ ہمیشہ تب ہی پڑتی تھی جب توقع نہیں ہوتی تھی۔ اس کی مٹھیاں سختی سے بھنچ گئیں۔ جنت کو مسز سلیمان کے گھر اکیلے بھیج کر اس نے غلطی کر لی تھی۔

”پھر؟“

”پھر یہ کہ میں نے کہا۔ یہ بات کرنے کے بعد آپ کو میرے ہزبینڈ سے بہت زیادہ محتاط رہنا چاہیے۔“

فارس وجدان ششدر سا اسے دیکھ کر رہ گیا۔

فضا کی کشیدگی یکایک کم ہوئی۔ گھٹن کا احساس ختم ہوا۔ سانسوں سے بوجھ ہٹ گیا۔

”میں نے صرف اتنا کہا اور وہ ایک دم سے ہنسنے لگ گئے۔ عجیب طرح سے۔ پھر بولے۔ ایسی بات فارس کی بیوی ہی کہہ سکتی ہے۔ اس کے بعد وہ زیادہ دیر نہیں رکے۔“ سیب کی قاش منہ میں ڈالتے ہوئے سر اٹھایا اور رک گئی۔ فارس اسے دیکھ رہا تھا۔ پلکیں جھپکائے بغیر وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ جنت کمال کے لیے اس کے تاثرات قطعی سمجھ سے باہر ہو گئے۔ اس کی ہیزل آنکھیں دھندلی مبہم ہو گئیں۔ اس کی ہر حکایت پھر سے اندھیرا ہو گئی۔ مکمل سناٹا ہو گئی۔

”تم نے گردیزی صاحب سے کہا۔ وہ مجھ سے محتاط رہیں؟“ اس نے جیسے تصدیق چاہی تھی۔

”ہاں! کیا نہیں کہنا چاہیے تھا؟“ وہ پزل ہوئی۔

وہ اگلے چند لمحوں تک کچھ کہہ نہ سکا۔ وہ اسے حیران کر رہی تھی۔ بہت زیادہ حیران کر رہی تھی۔

”اور جو بات وہ کر رہے تھے۔“ دانستہ رک گیا۔

”کون سی بات؟“ بھنویں سکیڑ کر فارس کو گھورا۔ پہیلیوں میں باتیں کیوں کرتا تھا وہ؟

”انہوں نے تم سے کہا یو شڈ بی کیئرفل آف یور ہزبینڈ۔“

''ہاں وہ تو میں شروع سے بہت ''کیئرفل'' ہوں۔'' ایزی ہو کر بہت مطمئن لہجے میں بولی۔ فارس اسے دیکھ کر رہ گیا۔

''وہ تو ایسے بات کر رہے تھے جیسے تم کوئی سیریل کلر ہو اور مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ مجھے علم نہ ہو؟'' تائید کے لیے اس کی طرف دیکھا مگر دوسری طرف تو ایک گہرا سکوت تھا، تعجب تھا، حیرانی تھی۔ صدمہ تھا۔

وہ ایسی کیوں تھی؟ ڈاکٹر مصطفیٰ کی نواسی۔ وہ ایسی کیوں تھی؟ اپنی تمام تر ناراضی کے باوجود اس نے گردیزی صاحب کو اس کا ویک پوائنٹ نہیں دیا تھا۔ اس نے ثابت کر دیا تھا وہ اس کی ہی بیوی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کھڑی تھی۔ اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود۔ اتنی اذیتیں۔ اتنا درد۔ اتنے غم سہنے کے باوجود۔ اتنے اختلافات کی زد میں رہتے ہوئے بھی۔ اسے اپنا فیصلہ سنا کر۔ اپنی ناراضی پر قائم ہو کر بھی وہ اس کے ساتھ ہی تھی۔ اپنے اندر اسے یک دم سکون سا اترتا محسوس ہوا۔

''لیکن ان کی یہ بات تو ٹھیک ہے، تم مجھے نہیں جانتیں۔''

ایک بار پھر اسے ٹٹولا کہ شاید کہیں تو اس کے اندر شک و شبہات کے سائے ہوں گے۔ کہیں تو اسے کوئی ایسی بات ملی ہو گی جس نے اس کے اندر کا سکون مٹایا ہو گا، احساسات جلائے ہوں گے۔ مگر......

''میں نے تمہیں جان کر کیا کرنا ہے؟'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے لاپروائی سے پوچھ رہی تھی۔

وہ صحیح معنوں میں لاجواب اب ہوا تھا۔

''میں نے کون سا تمہارے ساتھ ساری عمر کے لیے رہنا ہے۔''

ایک ادا سے اپنے بالوں کو جھٹکا، باتوں باتوں میں آدھی پلیٹ خالی ہو چکی تھی۔

فارس کے لیے مسکراہٹ چھپانا مشکل ہو گیا تھا۔ ''یہ تو تم نے بالکل ٹھیک کہا۔''

''میں ہمیشہ درست بات کہتی ہوں۔''

اسے اندازہ ہی نہیں تھا وہ انجانے میں اس کے دل سے کتنا بھاری بوجھ ہٹا چکی تھی۔

اب وہ مزے سے کھا رہی تھی، کچھ دیر بعد نگاہوں کی تپش کا احساس کر کے اس کی طرف گردن موڑی۔

سیٹ آرم ریسٹ پر کہنی ٹکائے، بائیں ہاتھ کی انگلیوں کو اپنے ہونٹوں پر ٹھہرائے وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ بہت نرمی سے اور بے انتہا انسیت کے ساتھ۔ وہ اس بزنس کیبن کی واحد مسافر تھی جو اپنی سیٹ پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔

''تم مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟'' مشکوک ہو کر گھورا۔

''کیسے دیکھ رہا ہوں؟''

''جیسے دیکھ رہے ہو۔''

''وہی تو۔ کیسے دیکھ رہا ہوں؟''

''سوال میں پوچھ رہی ہوں تم سے۔'' وہ چڑ گئی۔

''کین آئی آسک یو سمتھنگ؟'' (کیا میں تم سے کچھ پوچھ سکتا ہوں) چند لمحوں کے بعد اس نے کہا۔

''شیور۔'' (بالکل) ایک ہاتھ میں پلیٹ اور دوسرے ہاتھ میں فورک اٹھائے اجازت دی۔

''وائے آر یو سو کیوٹ؟'' (تم اتنی پیاری کیوں ہو؟)

اور وہ جو سوچے ہوئے تھی کہ کبھی بھی اس کی کسی بھی بات پر کسی بھی طرح کا ری ایکشن نہیں دے گی تو سچ مچ میں بلش کر گئی۔ سٹپٹا کر پلیٹ رکھ دی۔ ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کا رخ موڑا۔

''کہیں اور دیکھو تم۔''

وہ ہنس دیا۔

خود کھڑکی کی طرف ہو کر پلیٹ قریب کر لی۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ آواز کانوں میں بھی گونج رہی تھی۔ جہاز میں بھی گونج رہی تھی۔ اسے لگا یہ دھک دھک فارس بھی سن رہا ہے۔ مسافر بھی سن رہے ہیں۔

''آر یو آل رائٹ۔'' وہ ہنسی ضبط کیے پوچھ رہا تھا۔

''پلیز، مجھے ڈسٹرب مت کرو۔'' کہہ کر اپنی شکل پھر سے گم کر لی۔

''بھلا جس کے پاس جنت ہو۔ اسے اینٹی ڈپریسنٹ کی کیا ضرورت؟''

وہ مسکراتے ہوئے سر جھٹک کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

پاکستان پہنچتے ہی اس نے پہلے تو اچھی خاصی نیند لے کر اپنی سفری تھکان اتاری اور اس کے بعد فرصت سے اپنی شاپنگ دکھانے مسز شیرازی کے بیڈروم میں پہنچ گئی۔

اپنے کپڑے، کوٹ، اسٹالر کے بجائے اسے بچے کے لیے کی جانے والی شاپنگ دکھانے کا زیادہ شوق تھا۔ اب تک اس نے جتنی بھی چیزیں خرید رکھی تھیں، وہ سب کی سب بیڈ پر پھیلا دیں۔ وہ ایک ایک چیز اٹھاتی جا رہی تھی اور انہیں دکھاتے ہوئے بتاتی جا رہی تھی کہ اس نے یہ کب اور کہاں سے لی تھیں۔ فارس کے ساتھ کی جانے والی سب سے پہلی شاپنگ تو یادگار سی تھی۔ اس دن جو کچھ وہ انہیں نہیں دکھا سکی تھی تو آج دکھا رہی تھی۔

مسز شیرازی آنکھوں میں خوشی کی رمق لیے بہت محبت سے ایک ایک چیز ہاتھوں میں لیتے ہوئے اسے بھی دیکھ رہی تھیں۔

لندن کی فضا نے جنت پر اچھا اثر چھوڑا تھا۔صحت کچھ بہتر ہوگئی تھی۔ حلقے کم ہو گئے تھے، چہرہ فریش بھرا بھرا سا لگ رہا تھا۔ اب وہ مسکراتی تھی تو آنکھیں بھی چمک اٹھتی تھیں۔مزاج میں جیسے ایک ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔اس کا خوف ختم ہو چکا تھا۔واہمے مبہم ہو گئے تھے۔وہ پہلے سے بہتر تھی۔اور بہت زیادہ بہتر تھی۔دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے انہوں نے ان کے تعلقات کی مزید بہتری کی دعا کی۔

اس نے بیگ سے سیاہ شاپنگ بیگ نکالا۔

''یہ کب لیا؟'' ذرا حیران ہوئی کہ اسے یاد نہیں تھا۔نہ پہلے اسے دیکھا تھا۔کھولا تو اندر سفید رنگ کے ننھے ننھے سے موزے، جوتے، اونی کیپ اور لباس تھا، فیڈر بھی سفید رنگ کا۔کیا یہ فارس نے لیے تھے؟ آنکھوں میں اشتیاق لیے کپڑوں کو ہاتھوں میں لیا۔اتنی نرم وملائم چیزیں۔اس نے فوراً سے اٹھا کر مسز شیرازی کو دکھائیں اور وہ اپنی جگہ ساکت ہوگئیں۔

''یہ یقیناً فارس نے لیے ہیں۔کتنے پیارے ہیں نا؟'' وہ کہہ رہی تھی۔ان کی پلکیں لرزیں۔ان کے لب کپکپائے۔ان کے سینے پر ایک بھاری بوجھ آ کر ٹھہر گیا۔

جنت نے چھوٹا سا منی کچن سیٹ نکالا۔''یہ اس نے بہت جلدی لے لیا ہے۔'' وہ کہہ کر ہنسی۔

مسز شیرازی کو لگا وہ سانس نہیں لے سکیں گی۔جو کپڑے ہاتھ میں تھے، ان پر گرفت بڑھ گئی۔آنکھیں مکمل نم۔وجود اندر تک ویران ہوگیا۔

''پتا نہیں اس نے کب لیے؟'' سر اٹھا کر مسز شیرازی کی طرف دیکھا۔ان کے بدلتے تاثرات اسے پریشان کر گئے۔

''آپ ٹھیک ہیں؟'' اٹھ کر ان کے پاس آ گئی۔

انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔''ہاں ٹھیک ہوں۔''

اس نے فوراً ہی گلاس میں پانی ڈال کر انہیں دیا۔چند گھونٹ لینے کے بعد وہ وقفے وقفے سے گہری سانسیں لیتی رہیں۔

''آنٹی!'' ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے فکرمندی سے انہیں دیکھا۔

''ٹھیک ہوں میں، ایسے ہی ذرا دل گھبرا گیا۔''

''آپ آرام کریں۔میں بھی تو کب سے آپ کا سر کھا رہی ہوں۔'' شرمندہ ہو کر ساری چیزیں سمیٹنا شروع کیں۔

''ایسا نہیں ہے بیٹا۔'' انہوں نے روکنا چاہا۔

''بس باقی کی شاپنگ کل دیکھ لیں گے۔''

انہیں احتیاط سے بیڈ پر لٹایا۔بہت محبت اور فکرمندی سے ان کی آنکھوں میں دیکھا۔

''تھک گئی ہوں شاید اس لیے۔'' ان کی آواز آنسوؤں سے رندھی ہوئی تھی۔

''میں فارس کو بلاتی ہوں۔'' اٹھ کر جانے لگی تو انہوں نے ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

''پریشان ہو جائے گا وہ۔آرام کروں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔''

وہ ان کے گرد بازو ڈالے ان کے برابر میں ہی لیٹ گئی تھی۔

''آپ سو جائیں اب۔'' ان کے کندھے پر اپنا سر رکھا۔انہوں نے خود کو پرسکون کرتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔وہ تب تک ان کے پاس رہی جب تک کہ وہ سو نہیں گئیں۔احتیاط سے اٹھ کر لیمپ آف کر دیا اور بے آواز قدموں کے ساتھ باہر آ گئی۔چند لمحوں تک وہاں کھڑی رہی۔

پھر اس نے راہداری کی جانب دیکھا۔آہستگی سے قدم اٹھاتی سیڑھیوں تک آئی۔سر اٹھا کر بہت اوپر تک دیکھا۔صبح اس کے بیدار ہونے سے پہلے ہی فارس اپنے آفس چلا گیا تھا۔اور وہ بھی دوپہر تک بڑے دھڑلے سے اپنے نئے کمرے میں سامان سمیت شفٹ ہوگئی تھی۔نہ آمنا سامنا ہوا تھا۔نہ میسج پر کوئی بات ہو سکی تھی۔واپسی پر کچھ وقت مسز شیرازی کے ساتھ گزار کر وہ دوبارہ اپنے کمرے میں بند ہو گیا تھا۔

وہ پہلے بھی ایسا ہی تھا۔ایسے ہی کرتا تھا مگر جانے کیا بات تھی اس کے رویے کا یہ بدلاؤ اسے بہت زیادہ محسوس ہوا تھا۔ممکن ہے اس کی طبیعت ٹھیک نہ ہو۔یا وہ اپنے کاروباری معاملات کو لے کر کچھ پریشان ہو؟

نچلا لب کاٹتے ہوئے وہ اسٹینڈ پر ہاتھ رکھے چند لمحوں تک کھڑی رہی۔پھر کچھ سوچ کر سیڑھیاں چڑھتی اوپر آ گئی۔اب تک یقیناً وہ سو چکا ہو گا مگر تسلی کر لینے میں کوئی حرج تو نہیں؟

راہداری کے آخر میں سٹنگ ایریا کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔پردے ہوا سے لہرا رہے تھے۔اس نے محتاط ہو کر آہستگی سے بیڈ روم کا دروازہ کھول دیا۔

وہ شاور لے کر ابھی باہر نکلا تھا، اور وارڈروب کے سامنے کھڑا شرٹ پہن رہا تھا۔مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔

''تم یہاں۔'' وہ حیران ہوا تھا۔جنت بری طرح سے پھنس گئی۔خیال تھا، وہ سو رہا ہوگا تو ایک نظر دیکھ کر چلی جائے گی مگر......

''وہ میں......اپنی چیزیں لینے آئی تھی۔''

شرٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے کچھ حیرت سے اسے دیکھا۔

''شیور۔''

وہ ذرا کنفیوژ سی اندر داخل ہوئی۔ٹھیک ہے جب وہ صبح سے اسے نظر انداز کر رہا تھا تو ایسے میں منہ اٹھا کر اس کے کمرے میں

آنے کی کیا تک بنتی تھی؟ اندر ہی اندر خود کو ملامت کرتے ہوئے وارڈ روب ایک طرف سلائڈ کی۔ خانے مکمل خالی تھے۔اس کا ضروری سامان تو آج صبح ہی نیچے منتقل ہو چکا تھا۔ یاد آنے پر نچلا لب کاٹ ڈالا۔ پھر دوسری سلائڈ کھولی۔ وہ بھی خالی ملی۔ اللہ کچھ تو نظر آجائے جسے دکھا کر وہ کہے کہ ہاں وہ اس کے لیے آئی تھی۔

تیسری میں تو فارس کے کپڑے، گھڑیاں، جوتے اور ٹائیاں وغیرہ رکھی تھیں۔اف......

وہ اپنے نم بالوں کو تولیے سے خشک کرتا اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ آئینے میں اس کا عکس واضح دیکھ سکتی تھی مگر دیکھنا نہیں چاہ رہی تھی۔

’’یہاں نہیں ہے۔‘‘ پھنسی پھنسی سی آواز حلق سے نکلی۔ مڑ کر جانا چاہا تو وہ راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

’’مجھے بتاؤ، میں مدد کرتا ہوں۔‘‘

’’نہیں......وہ میں نے......شاید کہیں رکھ دیا ہوگا۔ وہ......میری وائٹ کلر کی شرٹ تھی۔ وہی نہیں مل رہی تھی۔‘‘

’’بس وہی شرٹ ڈھونڈنے آئی تھیں؟‘‘ نظر جھکی ہوئی تھی تو اس کی آنکھوں کے تاثر سے لاعلم تھی۔ لیکن لہجے میں جو شرارت تھی وہ چھپی نہیں رہ سکی تھی۔

’’ہاں تو اور کیا چاہیے ہوگا مجھے؟‘‘ اس کی بائیں طرف سے کھسکنا چاہا تو وہ ایک بار پھر اس کے راستے میں آ گیا۔ وہ بے طرح سے روہانسی ہوئی مگر اوپر سے بالکل ظاہر نہیں ہونے دیا۔

انگوٹھے سے انگلی کے پور کو کھرچتے وہ اب سر جھکائے کھڑی تھی اور وہ قدرے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

میک اپ سے مکمل عاری چہرہ، بالوں کو بس یونہی لپیٹ سمیٹ کر ایک میسی سا بن بنایا ہوا تھا۔ کچھ لٹیں گالوں کے اطراف ہلکا سا خم لیے گردن کو چھو رہی تھیں۔ شکن لیے سفید رنگ کی لمبی سی ڈھیلی ڈھالی شرٹ۔ جس کی جیبوں میں غالباً بادام بھرے ہوئے تھے۔ آج صبح کھاتے ہوئے نظر آئی تھی۔ نیلگوں پاجامہ۔ گلے میں جھولتا دوپٹہ کسی اور رنگ کا تھا، سلیپرز کسی اور رنگ کے تھے۔ اس کا اپنا اب کوئی اور رنگ ہو رہا تھا۔ وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

’’میرا تو اپنے کمرے میں بالکل دل نہیں لگ رہا۔ تمہارا لگ رہا ہے؟‘‘ سینے پر بازو باندھے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا۔ جنت کی دھڑکن مس ہوئی۔ سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

بے خوابی کا شکار آنکھیں، ہلکی سی بڑھی ہوئی شیو، لبوں پر مسکراہٹ، آنکھوں میں نرمی، لہجے میں حزن، اور تاثرات میں مبہم سی اداسی لیے وہ اسے نرمی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ نظریں جھکا گئی۔

’’ہاں، میرا تو بہت دل لگ رہا ہے۔‘‘ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے تیزی سے کہا۔

’’پھر تم یہاں کیا کر رہی ہو؟‘‘

’’جی؟‘‘ چونک کر سر اٹھایا۔ شرارت بھری آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھی۔ وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔

’’بتایا تو ہے، شرٹ لینے آئی تھی۔‘‘ جواب دے کر دوسری طرف سے نکلنا چاہا مگر فارس نے بازو پھیلا کر روک لیا۔

’’کیا ہے۔‘‘ وہ زچ ہوئی۔

وہ چند لمحوں تک اسے مسکراتی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

’’اب دل میں جگہ نہیں دے سکتیں تو اپنے کمرے میں ہی دے دو۔‘‘ بہت چاہت سے مطالبہ کر کے اس کی دھڑکنوں کو منتشر کر دیا۔

فارس کے عقب میں اور بالکل سامنے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا سفید کپڑا اس کی نظروں میں آ گیا۔

’’وہ رہا۔‘‘ ایک دم سے اشارہ کیا تو فارس نے بے اختیار پیچھے دیکھا۔ وہ اس کی بائیں طرف سے نکل گئی۔ لپک کر ڈریسنگ ٹیبل سے اپنا کپڑا اٹھالیا۔ ’’یہ رہ گیا تھا۔‘‘ دکھا کر کہا۔

’’تم وائٹ شرٹ کے لیے آئی تھیں۔‘‘ سینے پر بازو باندھ کر اسے یاد دلایا۔

’’اس کے لیے بھی آئی تھی۔‘‘ وہیں کھڑے کھڑے کپڑا اپنے بالوں میں پھنسالیا۔ کہ جیسے اس کے بغیر تو رات بھر اسے نیند ہی نہ آتی۔

’’اچھا اور کس کے لیے آئی تھیں؟ ہو سکتا ہے تمہاری اس لسٹ کے آخر میں کہیں میرا نام بھی ہو۔‘‘ محظوظ ہو کر پوچھا۔

’’تمہارا نام میری لسٹ میں ہے ہی نہیں۔‘‘ تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ وہ دھیرے سے مسکرا کر رہ گیا۔

سیڑھیاں اتر کر راہداری کی طرف جاتے ہوئے اس نے فرصت سے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا۔ آخر وہ اس کے کمرے میں گئی ہی کیوں؟ آخر کیوں؟ خود کو اندر ہی اندر ڈھیر سارا ڈانٹا۔ رخ کچن کی طرف تھا۔ بیچ راستے میں یاد آیا کمرہ اس طرف نہیں ہے۔ راہداری میں داخل ہوئی تو سیدھا اسٹوڈیو میں پہنچ گئی۔ وہاں سے جھنجھلا کر اپنے کمرے میں واپس آئی۔

دروازہ بند کر کے اپنے دونوں ہاتھ دہکتے گالوں پر رکھے۔

’’میرا تو اپنے کمرے میں بالکل دل نہیں لگ رہا۔ تمہارا لگ رہا ہے؟‘‘ یوں لگا جیسے اس نے قریب آ کر ایک بار پھر سوال دہرایا ہو۔

دل دھڑک اٹھا۔ احساسات عجیب ہونے لگے۔ اسے پہلے غصہ آتا تھا۔ اب تو برا بھی نہیں لگا تھا۔

’’دل میں جگہ نہیں دے سکتیں تو اپنے کمرے میں ہی دے دو۔‘‘

گال سے ہاتھ ہٹا کر۔ پھر اپنے احساسات سے الجھ کر اپنی پیشانی کو چھو کر تسلی کی کہ طبیعت تو ٹھیک ہے؟ پھر دل ایسے کیوں دھڑک رہا ہے؟

گہری سانس لے کر خود کو اس کی ہیزل آنکھوں کے اثر سے نکالا پھر جیب سے بادام نکال کر منہ میں ڈالتی کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

وہ ٹریک سوٹ میں ملبوس پچھلے ایک گھنٹے سے جاگنگ ٹریک پر تھا۔شرٹ کمر سے چپکی ہوئی تھی۔ بال پسینے سے بھیگ رہے تھے۔ چہرے پر سرخی تھی اور سانسیں چڑھی ہوئی تھیں۔

صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔دھوپ میں سبزہ چمک رہا تھا۔روڈ پر بھی آمد روفت نظر آنے لگی تھی۔ایئر فونز کان سے نکال کر جیبوں میں اڑستے ہوئے وہ بنچ پر بیٹھ گیا تھا۔ کچھ دیر تک اس کی نگاہیں سبزے سے ہوتی ہوئی جاگنگ ٹریک کے اس پار آہنی باڑ پر جمی رہیں۔اس نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا اور پھر اٹھ کر گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

گھر میں معمول کی طرح زندگی بیدار ہو چکی تھی۔اس نے شاور لے کر کپڑے بدلے۔فریش ہو کر نیچے آیا تو کچن میں ناشتے کا انتظام ہو رہا تھا۔

وہ سیدھا اپنی ماں کے کمرے میں گیا۔ کچھ دیر تک ان کے پاس بیٹھا رہا۔منتظر نگاہیں بار بار دروازے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ جنت ابھی تک نہیں آئی تھی۔

مسز شیرازی نے پوچھا تو وہ اٹھ گیا۔''میں دیکھتا ہوں اسے۔''

کمرے سے نکل کر دائیں جانب اسٹوڈیو کے برابر میں سامنے والا کمرہ اس کا تھا۔وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

پردوں کی درز سے جھانکتی تیز روشنی میں وہ اسے بیڈ پر دکھائی دی۔ کشنز کے ڈھیر میں وہ اس قدر سکون سے سو رہی تھی کہ اسے جگانے کا ارادہ ترک کر کے وہ کھڑکیوں کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ذرا سے پردے سرکا کر سوئمنگ پول کے اس پار دیکھا۔گزشتہ شب کا واقعہ یاد آیا تو مسکراہٹ لبوں کو چھو کر گزری۔مڑ کر کمرے کا جائزہ لیا۔ بہت سی اشیاء سیٹ ہو چکی تھیں۔اور کچھ سامان ابھی بھی صوفے پر، اور بیگز میں رکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔کمرے کی ترتیب اور سجاوٹ سے اندازہ ہو رہا تھا، ہر چیز بہت چاہت سے منتخب کی گئی تھی، ہر رنگ بہت سوچ کر چنا گیا تھا۔کھڑکیوں کے پردے، دیواروں کی پینٹنگز، گلدان۔قالین۔

ایسے ہی ایک بار اس نے بیڈ روم سجایا تھا اور پھر اس کے رویے سے دل برداشتہ ہو کر اپنی پسند اور مرضی کی ہر ایک شے اس نے کمرے سے نکال بھی دی تھی۔تب اس نے پردے، پینٹنگز، بیڈ شیٹس، اس کے کپڑوں کی ترتیب، دراز میں رکھی اس کی گھڑیوں اور

ٹائیوں کی سیٹنگ کو بھی اپنی مرضی سے بدل ڈالا تھا۔ وہ جیسے اس کا ہر کام اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی تھی۔اس کی ضرورت، اس کی چاہت ہونا چاہتی تھی۔

گہری سانس لے کر اس نے ایک طائرانہ نگاہ کمرے میں دوڑائی۔ جہاں سب کچھ تھا مگر وہ نہیں تھا۔نہ اس کی کوئی چیز تھی۔نہ جگہ تھی۔لندن میں انہوں نے سب کچھ ایک ساتھ شیئر کیا تھا۔مگر یہاں آ کر جیسے ایک بار پھر ایک خلا سا آ گیا تھا۔یہ اس کا خیال تھا۔ مگر یہ خیال غلط تھا۔تمام تر کوششیں اس کی طرف سے تھیں۔ جنت کمال نے قدم نہیں بڑھائے تھے۔وہ ایک فاصلہ سے قائم رکھے جہاں تھی، ابھی بھی وہیں نظر آ رہی تھی۔

نیند میں ذرا سا کسمساتے ہوئے اس نے کروٹ بدل کر آنکھیں کھولیں تو وہ مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔وہ بھی مندی مندی آنکھوں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ سستی اور طبیعت کا بوجھل پن ایسا کہ اٹھنے کو اب بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔

''گڈ مارننگ۔'' کھڑکی کے پردے کھینچ کر وہ اس کے پاس آ گیا۔

آسمانی رنگ کی جینز پر سیاہ اور سفید امتزاج کی شرٹ جس کا ہوڈی گردن پر تھا۔آستینیں کہنی تک مڑی ہوئی تھیں۔ ہر اسٹائل سے مکمل عاری بال جو پیشانی پر بکھرے تھے۔دیوار گیر کھڑکیوں کی دھوپ اس کے بالوں پر پڑ رہی تھی۔

''کیا ٹائم ہو رہا ہے؟''اس نے آنکھیں مسل کر اور پیشانی رگڑ کر پوچھا۔

''ناشتے کا ٹائم ہو رہا ہے۔''فارس نے جھک کر ہاتھ بڑھایا جسے کسل مندی سے تھام کر وہ اٹھ بیٹھی۔

''رات تم دیر تک جاگتی رہیں۔''

''نیند نہیں آ رہی تھی۔''

ایک مبہم سی مسکراہٹ فارس کے لبوں کو چھو کر گزری۔

''کل رات کوئی کہہ رہا تھا اس کا اس کمرے میں بہت دل لگ رہا ہے۔''اس نے مذاق اڑایا۔ جنت گڑبڑا کر رہ گئی۔

''نیند کا دل لگنے سے کیا تعلق ہے بھلا؟'' تپ کر پوچھا۔

''تعلق ہے......اور بہت گہرا تعلق ہے۔'' وہ صوفے پر جم کر بیٹھ گیا۔''میرے کمرے میں تو ادھر تکیے پر سر رکھا اور ادھر نیند آ گئی۔'' ٹانگ پر ٹانگ جمائے میگزین اٹھا لیا۔

''وہ تو میں اس لیے سو جاتی تھی کیونکہ تم میرا سر بہت کھاتے تھے۔''

فارس نے میگزین کے صفحے اُلٹتے ہوئے نگاہ اٹھائی۔

''ایک ذومعنی کے منہ سے یہ بات سن کر عجیب لگ رہا ہے۔''

عسریسرا۔ حسنیٰ حسین

جنت کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ جبڑے بھنچ گئے، مٹھیاں بند ہو گئیں۔ اس کے یہ تاثرات انتہائی سنجیدگی سے ملاحظہ فرمائے گئے۔

''کیا ڈاکٹر آمنہ نے تم کو یہ نہیں بتایا غصہ تمہاری صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔'' میگزین رکھ کر بولا۔

''کیا آنٹی نے تم سے یہ نہیں کہا، مجھے غصہ مت دلایا کرو؟'' آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یاد دلایا۔ لندن میں دو تین بار تو وہ اس کی شکایتیں لگا کر مسز شیرازی سے ڈانٹ پڑوا چکی تھی۔

''میں جسٹ ایک بات کرتا ہوں اور تمہارا پارہ چڑھ جاتا ہے۔''

''صرف بات کرتے ہو؟ صرف بات؟'' لہجے میں غصہ، حیرت، صدمہ سب در آیا۔

''ہاں! فار ایگزامپل اگر میں تم سے یہ کہوں تم اس طرح۔ نیند میں اٹھ کر۔ اور اس اول جلول سے حلیے میں بھی بہت خوب صورت لگ رہی ہو تو تمہیں اس بات پر بھی غصہ چڑھ جائے گا۔''

اور جنت کمال کے تاثرات، احساسات، جذبات ایک دم سے بدلے۔ بنجر ویران سرزمین یکا یک سبزہ زار ہو گئی۔ چہرے پر ایک دم سے سرخی دوڑی۔ غصہ کہاں گیا۔ پتا نہیں؟ بات کیا ہو رہی تھی۔ اندازہ نہیں۔ دماغ نے جھنجھوڑ کر دل کو پٹخا، بار بار پٹخا۔ لفظ ''اول جلول سے حلیے پر'' توجہ دلانے کی کوشش کی۔ فارس کی چالوں کا احساس دلایا، ماضی کا حوالہ دیا۔ دردناک قصے سنائے تب جا کر محترمہ کو ہوش آیا۔

''تم۔ بس تم جاؤ یہاں سے۔'' بازو سے پکڑ کر اسے صوفے سے اٹھایا۔ پورا زور لگا کر کھینچتے ہوئے دروازے تک لائی۔

''دیکھا۔ اب یہ بات ہے، مجھے کمرے سے نکالنے والی؟'' وہ دروازے میں ہی ایستادہ ہو گیا۔

''میں تمہیں نکال نہیں رہی۔ جانے کا کہہ رہی ہوں۔'' روہانسا ہو کر وضاحت دی۔

''دونوں میں فرق کیا ہے؟''

''دونوں میں فرق میرا سر ہے۔'' جھنجھلا کر کہا۔

''کیا سر میں دماغ بھی ہے؟''

''اللہ مجھے صبر دے، اللہ مجھے صبر دے۔'' اس نے دونوں ہاتھ اٹھائے۔ وہ بے ساختہ ہنس دیا۔

وہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے پاؤں پٹختی واش روم میں گھس گئی۔

''اوہ ہاں یاد آیا۔ ذومی کا تو دماغ نہیں ہوتا۔'' بلند آواز میں کہا۔ واش روم میں کوئی چیز فرش پر ٹھاہ کر کے گری تھی۔ وہ کمرے کا دروازہ بند کرتا مسکراتے ہوئے پلٹ گیا۔

اور واش روم کے اندر آئینے کے سامنے کھڑی جنت کمال اپنے اول جلول سے حلیے کو دیکھ رہی تھی۔ اور بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

ناشتے کی میز پر اسے اندازہ ہوا آج فارس کا آفس جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ چند ایک فون کالز اٹینڈ کرنے اور کچھ ضروری ہدایات یہاں وہاں دینے کے بعد اس نے اپنا موبائل فون بھی آف کر دیا۔ اب وہ جہاں جہاں جاتی تھی، وہ اپنی شرٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

''کیا ہے؟'' چڑ کر پوچھا۔

''میں تو بس ٹہل رہا ہوں۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

''تو کہیں اور جا کر ٹہلو۔''

مگر وہ کہیں نہیں گیا۔

''تمہیں پتا ہے، آج میں آفس کیوں نہیں گیا؟''

''کیوں نہیں گئے؟''

''کیونکہ آج سے تم جم میں میرے ساتھ ورک آؤٹ کرنے والی ہو۔''

جنت کی آنکھیں پھیلیں۔ ''مجھے تمہاری طرح کوئی مسلز نہیں بنانے۔ میں آل ریڈی بہت اسمارٹ ہوں۔'' فوراً سے کہا۔ مگر فارس نے جیسے اس کی بات نہیں سنی۔

''ہر ٹرائمسٹر کے لیے سیف ایکسرسائز جو تم آرام سے کر سکو گی۔''

''لیکن مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ضرورت ہے۔''

''میں پریگنینٹ ہوں۔ بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔'' اس کی آنکھوں میں تشویش نمایاں ہوئی تھی۔

''جہاں میرے جیسا پرسنل ٹرینر ہو۔ جو بچے کا باپ بھی ہو۔ وہاں بھلا تمہیں کیا مسئلہ پیش آ سکتا ہے۔''

''یہی تو اصل مسئلہ ہے۔'' دانت پیس کر کہا۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھامے گراؤنڈ فلور پر اپنے جم لے آیا۔ ایک لمبا سا ہال جو ہر طرح کی ایکوپمنٹ سے بھرا ہوا تھا۔ وہ گلاس والز سے اسے ورک آؤٹ کرتے ہوئے جھانک لیتی تھی مگر اندر کبھی نہیں گئی تھی۔ اب اندر آ گئی تھی تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا باہر کیسے نکلے۔ سلائیڈ ڈور بند کر کے فارس اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''چلو، اب شروع کرتے ہیں۔''

وارم اپ کے بعد اس نے سب سے پہلے کارڈیو ورک آؤٹ کروانا شروع کیا اور جنت کچھ بے دلی اور جھنجھلاہٹ سے اس کی انسٹرکشنز پہ یہ سوچ کر عمل کرتی رہی کہ بس دس پندرہ منٹ تک ایکسرسائز کروائے گا اور پھر چھٹی ہو جائے گی۔ مگر اس کی حیرت اور صدمے کی انتہا نہ رہی جب وہ دورانیہ بڑھتا گیا۔ اوپر سے ذرا ذرا سی غلطی پر ڈانٹ الگ سے پڑ رہی تھی۔

''ایسے ایکسرسائز کرتے ہیں؟''

''ہاتھوں میں جان نہیں ہے کیا؟''

''یہ کیا کر رہی ہو؟''

''آر یو ڈیڈ؟؟'' (کیا تم مر چکی ہو)

وہ اچھا خاصا تپی ہوئی تھی مگر تحمل سے سب سنتی سہے جا رہی تھی۔

''دوسروں کے شوہروں کی بیویاں پریگنٹ ہوتی ہیں تو وہ کہتے ہیں ہل کر پانی بھی مت پیو اور ایک تم ہو۔''

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد بنچ پر ورک آؤٹ کرتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔

''ذرا بتاؤ تو یہ کون سے مرد ہیں جو کہتے ہیں ہل کر پانی بھی مت پیو۔ میں تو ایسے کسی مرد کو نہیں جانتا۔'' اس کے پاس کھڑا واچ بینڈ پر سیکنڈز کے حساب سے ٹائم دیکھ رہا تھا۔

''ہاں تو تم اپنے جیسوں کو ہی جانتے ہو گے نا۔'' تپ کر بولی۔ ''کھڑوس۔ بے رحم۔ ظالم۔'' بقیہ لفظ زبان میں ادا کیے۔

''کچھ کہا؟''

''تمہاری تعریف کر رہی تھی۔''

''اونچی آواز میں کرو ذرا میں بھی سنوں۔'' دانت پیسے۔

''اب بس۔ میں بہت تھک چکی ہوں۔'' اس نے ہاتھ اٹھا لیے۔

''پانچ منٹ باقی ہیں۔'' اس نے سختی دکھائی۔ وہ روہانسی ہوئی۔ پانچ منٹ بڑی مشکل سے گزرے۔ دو منٹ کا وقفہ ملا تو گہری سانس لیتی بنچ پر بیٹھ گئی۔ سرد آہ یوں بھری جیسے اس پر نہ جانے کتنا بڑا ظلم ڈھا دیا گیا ہو۔ بوتل منہ سے لگا کر دو گھونٹ لیے۔ پھر مڑ کر فارس کو دیکھا۔

وہ سامنے ہی سیاہ میٹ پر کھڑا دس دس کے جی اٹھائے ہوئے تھا۔ لمحے بھر کے لیے آنکھیں پھیلی تھیں۔ دوسرے ہی پل منہ سے ماشاءاللہ نکلا تھا۔ ایسے تو نہیں وہ اتنا فٹ نظر آتا تھا۔ اور تیسرے ہی پل وہ خود سے اپنے لیے اپنی مرضی کا ورک آؤٹ منتخب کیے

ریک پر پہنچ گئی۔ اس سے ساری مشکل ورزش کروائی جا رہی ہے اور خود دیکھو کتنے آرام سے ڈمبل اٹھا رہا ہے۔ آسان کام اپنے لیے۔ اور مشکل کام اس کے لیے۔

اس نے بڑے سائز والا اٹھانا چاہا تو دن میں تارے دکھا گئے۔ چلو کوئی بات نہیں، شروعات کم وزن سے کر لینی چاہیے۔ کوئی مسئلہ نہیں۔ خود کو خود ہی تسلی دیتی سیدھی ہوئی اور تب ہی نگاہ فارس سے دوچار ہوئی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں مہارت سے وزنی ڈمبل اٹھائے آرم ورک آؤٹ کرتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ ابھری جسے دبا کر رخ بدل گیا۔

اب وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی۔ گلا کھنکھار کر گال پر بکھرتی لٹوں کو پیچھے کیا اور جیسے تیسے دونوں ہاتھوں سے پورا زور لگا کر پانچ کے جی کا ڈمبل اٹھایا۔ آنکھوں میں فاتحانہ سی چمک ابھری۔ اگلے ہی پل وہ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر گرا، اتنی ہی زوردار آواز گونجی اور اتنی ہی سرعت سے وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹی۔ فارس اپنا ڈمبل رکھ کر تیزی سے اس کے پاس آیا تھا۔

وہ جھک کر قدموں میں دیکھ رہی تھی۔ اللہ کا شکر تھا کہ پاؤں بچ گئے تھے ورنہ اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی خود کو نقصان پہنچانے کی۔

''آر یو آؤٹ آف یور مائنڈ۔'' بازو سے پکڑ کر اسے پیچھے ہٹاتے ہوئے سختی سے ڈانٹ دیا۔

''وہ...... پتا نہیں کیسے۔ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔'' گھبرا کر فوراً ہی وضاحت دی۔

''خود سے چل کر تمہارے ہاتھوں میں آیا اور چھوٹ گیا؟'' اس کا پارہ چڑھ گیا تھا۔ ''کچھ ہو جاتا اگر۔ چوٹ لگ جاتی تو؟''

وہ آنکھوں میں حیرانی لیے اسے دیکھ کر سہم گئی۔

''مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے جیسے تم نے مجھے تصور کر کے یہ ڈمبل گرایا ہے؟'' تیوری پر بل ڈال کر غصے سے کہا۔

''نہ...... نہیں تو......''

''پھر یہ مجھے میرے سر پر گرتا ہوا کیوں محسوس ہوا ہے؟'' ضبط کر کے پوچھا۔

''اب اگر تم نے مجھے کچھ اور کہا نا۔ تو میں یہ سچ مچ میں تم پر گرا دوں گی۔'' اس کے تاثرات سے خائف ہو کر فوراً ہی دھمکی دی۔

''پہلے ٹھیک سے اٹھانا تو سیکھ لو بروس لی کی بہن۔'' اس کے قدموں سے ڈمبل اٹھا کر واپس اس کی جگہ پر رکھا۔ وہ بھنویں سکیڑے کھڑی رہی۔

''جو ورک آؤٹ میں نے بتایا ہے وہ کون کرے گا؟'' اپنے سینے پر بازو باندھ کر سختی دکھائی۔

''مجھے نہیں پتا اب بس۔ ختم کرو یہ سب۔''

''ابھی تو صرف تیس منٹ ہوئے ہیں۔'' بازو سے پکڑ کر اسے ٹریڈمل پر کھڑا کر دیا۔ اسے جی بھر کر رونا آیا۔ اسپیڈ ایڈجسٹ کی

تو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے آہستگی سے قدم اٹھانا پڑے۔

''تم آخر مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہو، ہاں؟'' دس منٹ کے بعد اسپیڈ بڑھانے آیا تو پھٹ پڑی۔ مگر اسے تو جیسے کوئی آواز ہی نہیں آئی تھی۔

''کیا مصیبت ہے۔'' جھنجھلاہٹ کے عالم میں تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ سانس پھول رہا تھا۔ دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ مڑ کر دیکھا تو وہ اسے کہیں نظر نہ آیا۔ فوراً سے رفتار کم کی۔ سکھ بھری سانس لیتے اب مریل سے قدم اٹھا رہی تھی جب وہ کسی جن کی طرح اچانک نمودار ہوا۔

''یہ کیا ڈومی کی طرح چل رہی ہو۔'' ڈانٹ کر اسپیڈ واپس ایڈجسٹ کرنا چاہی۔ اور جنت کی تو جیسے سر پر لگی تلووں پر بجھی۔

''ڈومی مت کہو مجھے۔'' چیخ کر بولی۔ اگلے ہی پل اس کا رنگ اڑا۔ گھبرا کر تیز تیز قدم اٹھانا شروع کیے۔ فارس اسپیڈ بڑھا رہا تھا۔

''فارس......فارس پلیز اسپیڈ کم کرو۔'' وہ چیخی۔ مگر اس نے تو جیسا کچھ سنا ہی نہیں۔

''ہاں تو کیا کہہ رہی تھیں آپ؟'' کنٹرول بٹن پر ہاتھ رکھے اب وہ تپا دینے والی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔

''کچھ نہیں کہہ رہی تھی میں۔'' اسے بہت تیز تیز قدم اٹھانا پڑ رہے تھے۔ بس بھاگنے کی کسر رہ گئی تھی۔ پریشان ہو کر ہتھوں پر گرفت بڑھا لی کہ گر نہ جائے۔

''آنٹی.....! فارس کو دیکھیں۔'' کچھ اور سمجھ نہ آیا تو وہیں کھڑے کھڑے چلائی۔

''انہوں نے مجھے بہت بار دیکھا ہوا ہے، اب تم دیکھ لو۔'' اپنی گہری آنکھیں اس پر جمائے سنجیدگی سے کہا۔

''میں گر جاؤں گی۔''

''کیا میں اتنا ہینڈسم ہوں؟''

''فارس پلیز ز.....''

''نہیں گرو گی۔ یہ مناسب اسپیڈ ہے۔ شاباش تیز تیز قدم اٹھاؤ۔'' وہ کنٹرول بٹن پر ہاتھ رکھے ذرا سا پیچھے ہٹا۔

''دوبارہ ایسے نہیں کروں گی۔'' منت کر کے بولی۔ اس کی روتی شکل دیکھ کر ترس آ گیا۔ اسپیڈ کم کر دی۔

''ڈرامے کرنا کوئی تم سے سیکھے۔ پندرہ منٹ تک اب یہی اسپیڈ رہے گی۔'' تحکم سے کہہ کر وہ واپس بنچ پر جا بیٹھا۔

منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے بے دلی سے چلتی رہی۔

اللہ اللہ کر کے ورک آؤٹ ختم ہوا اور وہ تو جیسے رسیاں تڑا کر جم سے بھاگی۔

''آج پہلا دن ہے تو اس لیے کم وقت دیا ہے۔'' راہداری سے گزرتے ہوئے فارس نے کہا۔

''یہ کم وقت تھا؟'' جنت کی آنکھیں ابل پڑیں۔

''کارڈیو ورک آؤٹ کل ٹھیک سے کرنا ہے تمہیں۔ بائیسپ ورک آؤٹ آج دس بار کیے ہیں تو کل پندرہ دفعہ کریں گے۔ ٹریڈمل پر پچیس منٹ واک کرنا ہو گی۔ شولڈر ورک آؤٹ کا دورانیہ بھی بڑھانا ہو گا۔'' وہ ابھی سے آنے والے کل کے لیے سب ترتیب دے رہا تھا۔ اور جنت کی شکل ایسی ہو رہی تھی جیسے کسی بھی لمحے رو دے گی۔

''اللہ کرے کل اسے صبح سات بجے ہی آفس جانا پڑ جائے۔'' آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے دعا کی۔

''تم نے کچھ کہا؟'' اس نے گردن موڑ کر پوچھا

وہ گڑبڑا کر رکی۔ کہ دعا تو دل میں کی تھی۔ اس نے کیسے سن لی؟

''نہیں، بھلا میں کیا کہوں گی؟'' کندھے اچکا کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔

☆☆☆

قرآن کی تلاوت سے فارغ ہو کر مسز شیرازی جنت کے کمرے میں آ گئیں۔ نیچے شفٹ ہو جانے کا ایک یہ فائدہ ہوا تھا کہ وہ اس کے کمرے میں با آسانی آ جا سکتی تھیں۔

کھڑکیوں سے سوئمنگ پول نظر آتا تھا۔ دیواروں پر دھوپ اتری ہوئی تھی۔ سبزہ روشنی میں چمک کر اور ہرا لگ رہا تھا۔ وہ اسی طرف دیکھ رہی تھیں۔

جنت مسلسل بولتے ہوئے وارڈروب کھولے کھڑی تھی۔ وہ اس کی سن رہی تھیں۔ اسے جواب بھی دے رہی تھیں۔

وارڈروب میں صرف اس کی چیزیں، اس کا سامان تھا۔ بچے کے لیے کی جانی والی اشیا وہ ترتیب سے نیچے رکھ رہی تھی۔

کمرہ چونکہ بڑا تھا تو دائیں طرف کا حصہ بچے کے لیے بہت خوب صورتی سے سیٹ کیا جا سکتا تھا۔

''بے بی کاٹ یہاں اچھا لگے گا۔''

انہوں نے کہا۔

''ہے نا! میں نے بھی کل رات یہی سوچا۔ اور اس دیوار کے ساتھ میں الگ سے وارڈروب لے لوں گی۔ کپڑے، کھلونے سب ترتیب سے رکھ دوں گی۔''

انہیں ادراک ہوا، آنے والے وقت کے بارے میں اس کی سوچ کافی حد تک بدل چکی ہے۔ وہ اپنے خوف کو مٹا کر نئے خواب سجانے لگی ہے۔ انہیں اس مثبت تبدیلی پر خوشی محسوس ہوئی

''ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔'' وہ دل سے مسکرائیں۔

جنت ان کے پاس صوفے پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ ''سچ سچ بتائیں آپ کی کیا خواہش ہے؟''

''کس بارے میں؟''

''آپ کا پوتا ہونا چاہیے یا پوتی؟'' وہ آنکھوں میں تجسس اور اشتیاق لیے پوچھ رہی تھی۔

''مجھے بس اپنے بیٹے کی صحت مند اولاد چاہیے۔ بیٹا ہو یا بیٹی۔ اس سے فرق نہیں پڑتا۔'' انہوں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا۔

''یہ کہنے کے لیے ڈھیر سارا شکریہ۔'' ان کے گال سے گال مس کر کے کہا۔ پھر اٹھ کر دوسری اشیا سمیٹنے لگی۔ ساتھ ہی شادی کا حوالہ بھی دے رہی تھی۔

مسز شیرازی اب وارڈ روب کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ پندرہ دن فارس وجدان کی سنگت میں گزارنے کے باوجود اس نے کمرہ الگ کر لیا تھا۔ جانتی تھیں فارس اسے وقت اور سپیس دے رہا ہے۔ وہ اس پر اپنی مرضی مسلط نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ ایک آزادی تھی۔ خود سے ایک فاصلہ قائم کر کے وہ اسے اپنا فیصلہ بدلنے کا موقع دے رہا تھا۔ ان کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ ٹھہر گئی۔ مگر کچھ سوچ کر جانے کیوں دل اداسیوں میں گھر گیا۔ منی کچن سیٹ۔ سفید رنگ کے مخملیں کپڑے۔ آنکھوں میں اضطراب لیے انہوں نے جنت کی طرف دیکھا۔

''لندن میں فارس ٹھیک رہا؟ کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟'' انہوں نے پوچھا۔

جنت رک گئی۔ گردن موڑ کر انہیں دیکھا۔ چند لمحوں تک کھڑی رہی۔ اب وہ انہیں الرجی ری ایکشن کا بتائے؟ یا سلیپنگ پلز اور اینٹی ڈیپریسنٹ کا حوالہ دے؟ وہ انہیں کسی بھی صورت پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''جی وہ ٹھیک رہا، بس اسے ذرا سا زکام ہوا تھا۔ اور کچھ نہیں۔'' مسکرائی۔

وہ گہری سانس لے کر چپ ہو گئیں۔ رخ بدل کر پھر سے باہر دیکھنے لگیں۔

''کل آپ کہہ رہی تھیں مجھے پینٹنگ دکھائیں گی؟'' ان کی خاموشی اور آنکھوں سے جھلکتی پریشانی محسوس کر کے ان کے پاس آ گئی۔

''ہاں ایک مکمل کی ہے۔ کافی عرصے سے بنا رہی تھی لیکن ادھوری ہی تھی۔ تم دونوں لندن چلے گئے تو پھر فرصت سے مکمل کر لی۔''

''چلیں، پھر مجھے دکھائیں۔ تاکہ میں اسے ریٹ کر سکوں۔ ویسے تو میں آپ کی ہر پینٹنگ کو دس میں سے پورے بیس نمبر دیتی

ہوں۔''

وہ ہنس دیں۔ جنت وہیل چیئر پر ہاتھ جمائے ان کے ساتھ اسٹوڈیو میں آ گئی۔

سامنے ہی دیوار پر سفید چادر میں ایک لارج سائز کی پینٹنگ دیوار کے ساتھ رکھی تھی۔ اب تک کی مسز شیرازی کی تمام پینٹنگز میں یہ سب سے بڑی تھی۔ تقریباً آدھی دیوار کور کر رکھی تھی۔

اس نے آگے بڑھ کر کپڑا ہٹا دیا، گہرے رنگوں سے مزین ایک ڈارک سی پینٹنگ سامنے تھی۔ جنت کمال دم سادھے کھڑی رہ گئی۔

سمندر کی طرف آسمان کی بلندیوں کو چھوتا ایک وسیع و عریض محل۔ لمبے مینار۔ اونچی مضبوط دیواریں۔ محل کے باہر جگہ جگہ سیاہ ہوتی گھاس سے آدھے چھپے، آدھے ظاہر ہوتے خون آلودہ نیزے، تیر، اور تلواریں۔ محل کی تمام کھڑکیاں تاریک صرف ایک کھڑکی روشن تھی۔ اس کھڑکی کی چوکھٹ پر سرخ خون ٹپک رہا تھا۔ اندر کسی کی موجودگی کا گمان بھی ہو رہا تھا۔ انگلیاں خون سے رنگی ہوئی۔ تلوار ٹوٹی ہوئی اور حفاظتی چوغہ پھٹا ہوا نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے اس قدر تفصیل اور صفائی سے ایک ایک چیز بنائی تھی کہ وہ متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکی۔

''زبردست!'' اس کے منہ سے بےساختہ نکلا۔ ''یہ آپ نے کب بنائی؟''

''کافی عرصے سے بنا رہی ہوں۔ ہمیشہ ادھوری ہی رہ جاتی ہے۔ اب مکمل کرنے میں کامیاب ہوئی ہوں۔'' کہہ کر وہ آگے ہوئیں۔ اسے ادراک ہوا اسٹور روم میں دیوار کے ساتھ جو سفید کپڑے میں ڈھکی ہوئی چیز تھی، وہ یہی دیوار گیر پینٹنگ تھی۔

''بہت گہری ہے۔'' اس نے کہا۔ ''جیسے یہ ہتھیار۔ خون۔ دیواریں۔ اور یہ سیاہ جڑیں۔ ایسے لگ رہا ہے جیسے ہر ایک شے کی اپنی ایک حکایت ہے۔''

''اس کی واقعی میں ایک کہانی ہے۔ سنو گی؟''

جنت نے مڑ کر انہیں دیکھا۔ ''ضرور۔'' آنکھوں میں اشتیاق لیے کہا۔

جیبوں میں ہاتھ ڈالے فارس اسٹوڈیو کے دروازے میں رکا تھا۔ دستک کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ مگر مسز شیرازی کی آواز سنتے ہی رک گیا۔

''ایک جادوگر شہزادے نے زخمی ہو کر اونچی لمبی دیواروں کے ایک مضبوط محل میں خود کو قید کر لیا۔'' انہوں نے ہاتھ سے محل کی واحد روشن کھڑکی کی جانب اشارہ کیا۔ ''اس کا بدن زخموں سے چور ہے۔ ہاتھ خون آلودہ ہیں۔ ہتھیار بھی ٹوٹ چکا ہے۔ گھوڑا بھی نہیں رہا۔''

جنت دم سادھے انہیں بہت توجہ سے سن رہی تھی۔

’’جادوگر شاہزادے نے اپنی رہی سہی قوت مجتمع کی اور محل کی دیواروں کے ساتھ اگے خوبصورت پھول اور پودوں کو خطرناک کانٹے دار جھاڑیوں میں بدل دیا۔ رنگ برنگے پھول۔ نرم ملائم گھاس۔ اور سورج کی روشنیوں سے چمکتا سبزہ سب سیاہ ہو گیا۔ دیواروں سے وحشت ٹپکنے لگی۔ اونچا مضبوط محل ہر کسی کو خوف زدہ کرنے لگا۔‘‘

ادھ کھلے دروازے سے انہیں دیکھتا فارس اپنی جگہ منجمد کھڑا تھا۔

’’اب جب بھی کوئی خزانے کی تلاش میں محل کی حدود میں داخل ہونے کی کوشش کرتا تو اپنے اندر زندگی کی لہر لیے وہ خونخوار جھاڑیاں دیوار بن کر اسے لہولہان کر دیتیں۔ ہر طرف خوف و ہراس پھیلنے لگا۔ لوگ محل سے دور بھاگنے لگے۔‘‘

جنت کی نگاہیں مسز شیرازی پر ٹھہری تھیں۔ اور مسز شیرازی کی نگاہیں پینٹنگ پر۔

’’وقت گزرنے لگا۔ دنیا بدلنے لگی۔ صدیاں بیت گئیں۔ مگر محل کے اندر جادوگر شاہزادے کے لیے اس کا وقت رکا رہا۔ اس کے زخم۔ اس کی اذیت۔ اس کا ہر غم اس کے لیے ٹھہرا رہا۔

شاہزادے کو لگتا تھا یہ اس کی اس دنیا میں آنے کی سزا ہے یا پھر اس فتح کی۔ جو اس نے اپنا سب ختم کر کے حاصل کی ہے۔‘‘

دروازے کے اس پار کھڑے فارس کی آنکھوں میں حزن کی ایک لہر اٹھی۔ سرخ ڈوروں میں کرب اترا۔ لب بھینچے رہے۔ درد بڑھتا گیا۔

’’پھر؟‘‘ جنت سامنے ہی فلور کشن پر بیٹھی انہیں مگن ہو کر سن رہی تھی۔

’’پھر یہ کہ ایک غریب یتیم لڑکی جو جادوگر خاندان سے نہیں تھی۔ کچھ وحشیوں سے بچتی بچاتی محل کی طرف آنکلی۔ اپنی زندگی بچانے کے لیے اس نے محل میں داخل ہونے کی ٹھانی۔ مگر چونکہ وہ جادو نہیں جانتی تھی، اس لیے اس کا محل کے حدود میں داخل ہونا ممکن نہیں تھا۔

جس وقت وہ محل کی بیرونی دروازے پر وحشی درندوں میں گھری ہوئی کھڑی تھی۔ اس وقت شاہزادے نے حیران ہو کر اسے کھڑکی سے دیکھا۔

محل کے بیرونی دیوار سے اندر تک کا حصہ اپنا رنگ بدل رہا تھا۔ سیاہ گھاس ہری ہو رہی تھی۔ زمین سے پودے پھوٹ پڑے تھے۔ جس جگہ پر لڑکی کھڑی تھی، اس جگہ پر اب کوئی کانٹے دار جھاڑی نہ تھی۔ دروازے پر جو جڑیں لپٹی ہوئی تھیں وہ بھی ٹوٹ کر راکھ ہو رہی تھیں۔ دروازہ صاف ہوا تو لڑکی اندر آ گئی۔ وحشی درندے اس حد سے باہر رہے۔ اندر نہ آ سکے۔‘‘

روانی سے بولتے ہوئے انہوں نے ایک لمحے کا توقف کیا۔

’’جادوگر شاہزادے کے لیے وہ منظر کسی صدمے سے کم نہیں تھا۔ اس کا جادو اس لڑکی پر کسی طور اثر نہیں کر رہا تھا۔ اس کے لیے زمین ہری ہو رہی تھی۔ پھول کھل رہے تھے۔ محل صدیوں سے تاریک رہا تھا۔ مگر اب لڑکی کے آتے ہی کرنیں بھی زمین پر اترنے لگی تھیں۔

شاہزادے کو لگا، وہ لڑکی اس کے مضبوط حصار میں شگاف کر دے گی۔ جھاڑیاں روپ بدلیں گی تو دیواریں کمزور ہو جائیں گی۔ دیواریں کمزور ہو گئیں تو پھر وہ غیر محفوظ ہو جائے گا۔ اذیت۔ غم۔ اور سب ہی دکھ پھر سے آ جائیں گے۔ ماضی اپنا آپ دہرائے گا۔ پھر سے جنگ ہو گی۔ پھر سے فتح ہو گی۔ اور پھر سے قید ملے گی۔

جادوگر شاہزادہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ غصے اور انتقام کی آگ میں جھلستے ہوئے اس نے اس لڑکی کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔‘‘

جنت کی سانسیں رکیں۔ تجسس کے ساتھ ساتھ خوف بھی بڑھ گیا۔ وہ جیسے ایک ایک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھتی ایک ماورائی کہانی میں مکمل غرق ہو چکی تھی۔

’’پہلے پہل اس نے کوشش کی، لڑکی محل کے اندر داخل نہ ہو سکے۔ مگر چونکہ جادو کا اثر اس لڑکی پر نہیں ہوتا تھا، اس لیے وہ دروازوں پر چڑھی خطرناک بیلوں کو زیادہ دیر تک اس کے راستے میں حائل نہ کر سکا۔

لڑکی جب محل کے اندر داخل ہوئی تو اس کا اٹھایا جانے والا ہر قدم خوف کی تاریکی اور وحشت کے سناٹے کو مٹاتا گیا۔ کھڑکیوں سے کرنیں اندر آنے لگیں۔ جو مخلوق تاریکی میں بسیرا کرتی تھی، وہ روشنی میں فنا ہونے لگی۔

محل کی پوری نو منزلیں تھیں۔ اور ہر منزل جادوئی سی۔ اپنے اندر بہت سے راز لیے ہوئے تھی۔

لڑکی پہلی منزل پر دس دن رہی۔ دوسری منزل پر بھی دس دن۔ تیسری منزل پر بھی دس دن۔ اور اس دوران اسے شاہزادے کی خودنوشت ملی جو وہ صدیوں سے لکھتا آ رہا تھا۔ ہر منزل پر اسے کچھ حصہ مل جاتا جسے پڑھتے ہوئے وہ ایک ان دیکھے وجود کی محبت میں گرفتار ہونے لگی۔

اسے اپنے آس پاس شاہزادے کی موجودگی کا گمان ہونے لگا تھا۔ وہ اس سے باتیں کرتی۔ آوازیں بھی دیتی۔ نغمے بھی سناتی۔ مگر کبھی جواب نہیں آتا تھا۔

’’میں تمہیں بچا سکتی ہوں۔‘‘ وہ اکثر اونچی آواز میں کہتی۔

’’میں تمہیں آزاد کر سکتی ہوں۔‘‘ وہ اسے یقین دلاتی۔

’’تمہارے زخم بھر جائیں گے۔ تمہارا درد بھی ختم ہو جائے گا۔ ایک بار میرے سامنے آ جاؤ۔‘‘

مگر شاہزادہ جو اسے ایک تھریٹ کے طور پر دیکھتا تھا وہ اس کے سامنے کیسے آ سکتا تھا؟ اس کے لیے تو وہ ایک مجرم تھی۔ سزا کی

مستحق جو اس کی اجازت اور مرضی کے بغیر اس کے محل میں گھس آئی تھی۔

ساتویں منزل پر پہنچتے ہی لڑکی کو احساس ہوا اس کے پاؤں زخمی ہونے لگے ہیں۔ وہ ہڈیوں میں درد محسوس کرنے لگی۔ آٹھویں منزل پر اس کی جلد پر لکیریں ابھرنے لگیں جیسے چھوٹے چھوٹے کٹ لگتے ہیں ویسے ہی۔ شاہزادے کو خوشی ہوئی کہ لڑکی کی صلاحیت بالآخر ختم ہونے لگی ہے۔ اس نے اپنے جادو کا زور مزید بڑھا دیا۔

آٹھویں سے نویں منزل پر پہنچتے تک لڑکی زخموں سے چور اور بری طرح سے نڈھال ہو چکی تھی۔ مگر اس نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ پہلی اور آخری بار اس قلعے کے بھوت سے۔ یعنی کہ اس شاہزادے سے ملنا چاہتی تھی۔ اس نے وہ دروازہ کھولا جس میں شاہزادہ بند تھا۔ وقت کے دائرے میں قید، زخموں سے چور کسی بپھرے ہوئے شیر کی طرح سر اٹھائے کھڑا تھا۔ حملہ کرنے کو مکمل تیار۔ لڑکی کے قدم رکھنے کی دیر تھی۔ محل کی بقیہ تمام منازل کی طرح اس منزل پر بھی اس کی موجودگی کا اثر ہونے لگا۔ سیاہی مٹ گئی، اندھیرا چھٹ گیا، روشنی بکھر گئی۔ منظر صاف ہونے لگا۔ مگر یہاں ایک انہونی ہوئی۔ اس کا اثر صرف محل کے درو دیوار کو نہ ہوا بلکہ شاہزادے پر بھی ہوا۔ وقت کی زنجیر ٹوٹ گئی۔ شاہزادے کے زخم بھرنے لگے، اس کا درد ختم ہو گیا۔ اس کا جسم پھر سے صحیح اور سلامت ہو گیا۔ اور لڑکی بے جان ہو کر اس کے قدموں میں آ گری۔۔''

''آنٹی نہیں پلیز۔ سیڈ اینڈنگ نہیں۔'' فوراً ہی دکھی ہو کر کہا۔ مگر مسز شیرازی اس کہانی کی رائٹر نہیں تھیں۔ وہ اس کی اینڈنگ نہیں بدل سکتی تھیں۔

''شاہزادے کو اس آخری لمحے میں احساس ہوا کہ اپنا حصار مضبوط کرنے کے لیے وہ پچھلے نوے دنوں سے جس لڑکی کو اذیتوں سے دوچار کرتا رہا ہے۔ وہی لڑکی اس کے تمام درد اور اذیتیں اپنے وجود میں سمیٹ کر اسے اپنی آواز کا عادی بناتے ہوئے اس کے دل میں اپنے لیے محبت جگا کر ختم ہو چکی ہے۔

وہ چپ ہو گئیں۔ جیسے کہانی بس یہیں تک تھی۔ ایک فسوں سا بندھا ہوا تھا جو ان کی خاموشی سے ٹوٹا۔ فارس کہانی کے حصار سے باہر نکل آیا۔

''ظالم شاہزادہ! نوے دن تک اس کی محبت نہیں پہچان سکا۔ گدھا۔'' جنت کو غصہ چڑھ گیا۔ وہ دکھی اختتام پر بے انتہا دکھی ہوئی بیٹھی تھی۔ مسز شیرازی مسکرائیں۔ اور باہر۔ دروازے کے پاس کھڑا فارس۔ مسکرا تک نہ سکا۔

''تمہیں شاہزادے کی سائیکالوجی بھی سمجھنی چاہیے بیٹا۔''

''میں اسے کیا سمجھوں۔ آپ یہ دیکھیں وہ لڑکی اس کا درد چننے آئی تھی آنٹی۔ اس کے لیے مرہم لائی تھی۔'' اسے بہت دکھ ہو رہا تھا۔

''مگر شاہزادے کو کیا پتا، وہ جو اپنے ساتھ لائی ہے وہ اس کا مرہم ہے؟ اس کے زخموں کے لیے ہے؟'' انہوں نے نرمی سے پوچھا۔

''اسے سمجھنا چاہیے تھا کہ لڑکی کے آنے سے پھول کھل رہے ہیں! یہ زندگی کی علامت ہے۔'' وہ اپنی بات پر ڈٹی ہوئی تھی۔

''یہی پھول اس کے جادو کا اثر ختم کر رہے تھے۔ تو وہ کیسے بھروسا کرتا؟''

وہ لاجواب ہو گئی۔ مسز شیرازی نے نرمی سے اس کی طرف دیکھا۔ دھیرے سے مسکرائیں۔

''جو لوگ بہت زیادہ حساس ہوتے ہیں، اور جنہوں نے بہت دکھ سہا ہوتا ہے وہ اپنے گرد ایسی ہی ایک دیوار کھڑی کر لیتے ہیں بیٹا۔ اور تہیہ کر لیتے ہیں کہ اب جب بھی کسی نے یہ دیوار پھلانگنے کی کوشش کی تو وہ اسے توڑ دیں گے مگر اپنی حدود میں ہرگز نہیں آنے دیں گے۔''

انہوں نے محل کی اونچی مضبوط فصیلوں کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

''خود کو کسی بھی ممکنہ اذیت سے محفوظ رکھنے کے لیے وہ یہ حفاظتی اقدامات کرتے ہیں۔ اور ان جانے میں ان لوگوں کو بھی ہرٹ کر دیتے ہیں جن کا واحد مقصد اس دیوار کو پھلانگ کر ان کے دامن سے سارے کانٹے چننا ہوتا ہے۔'' بات گہری تھی۔ اس کے دل کو لگی۔

''جب احساس ہوتا ہے تو اس وقت کافی دیر ہو چکی ہوتی ہے۔'' رک کر گہری سانس لی، پھر اس کی جانب دیکھا۔

''جادوگر شاہزادے جیسے لوگ برے نہیں ہوتے بیٹا۔ وہ اتنی بار ٹوٹ چکے ہوتے ہیں کہ انہیں جڑنے سے خوف آتا ہے۔ وہ بس کسی پر اعتبار نہیں کر پاتے۔'' بات مکمل ہو کر ختم ہوئی۔

اتری ہوئی شکل کے ساتھ اس نے رخ موڑ کر پینٹنگ کو دیکھا۔

گہرا سمندر۔ بلندیوں میں کھڑا ایک شان دار سیاہ محل۔ مضبوط دیواریں اور کھڑکی۔ جادوگر شاہزادہ کھڑکی میں تھا۔ دوسرا دروازے میں کھڑا رہا تھا۔

☆☆☆

لائم جوس گلاس لبوں سے لگائے اس نے دوسرے ہاتھ سے اپنا سیل فون کاؤنٹر ٹیبل سے اٹھا لیا تھا۔ اوپن کچن سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے وہ چونک کر رک گئی تھی۔ نگاہیں موبائل اسکرین پر ابھرتے اس ایک جملے پر گڑ کر رہ گئیں جو پہلے اسے ایک مذاق کے سوا کچھ نہ لگا تھا۔ لیکن اگلے ہی پل ثبوت کے طور پر ارسال کی گئی اسنیپس پر نظر پڑتے ہی وہ اپنی جگہ پتھر ہو گئی۔ گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرتے ہی چھناکے سے ٹوٹا تھا۔ پہلے اس کا دل رکا تھا، پھر سانسیں بھی تھم سی گئی تھیں۔

عسریسرا۔ حسنیٰ حسین

حیرت، صدمہ، بے یقینی۔ اس نے بے اختیار دیوار کا سہارا لیا۔ ووڈن فلور نے یکا یک آگ پکڑی تھی۔ گردونواح کی ہر ایک شے اندھیر ہوئی تھی۔

اس کا تنفس پھول گیا تھا۔ آنکھوں میں وحشت اتر آئی تھی۔ اگلے ہی لمحے اس نے ہانپتے ہوئے شدید غصے کے عالم میں اپنا سیل فون سامنے دیوار پر دے مارا تھا۔ فرش پر بکھرے کانچ کے ٹکڑوں کی پروا کیے بنا دھپ دھپ قدم اٹھاتی اپنے لگژری بیڈ روم میں بند ہوگئی۔

پیشانی مسلتے، نچلا لب کاٹتے، بالوں کو نوچتے وہ کمرے میں متوحش سی ٹہل رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ یقین آ بھی نہیں سکتا تھا۔

اس نے پردے ہٹا کر کھڑکیاں کھول دیں۔ اس سے کوئی افاقہ نہ ہوا تو دروازہ سلائڈ کر کے بالکنی میں آگئی۔ مگر اندر کی آگ ہنوز جلتی بھڑکتی، لپکتی رہی۔

تنفس بھاری رہا۔ وحشت انگ انگ میں سما گئی۔ ریلنگ پر ہاتھ جمائے اب وہ گہری سانسیں لے رہی تھی۔

کمرے سے باہر، راہداری سے آگے، لاؤنج کے سامنے فرش پر گرا اس کا سیل فون ایک بار پھر جگمگا رہا تھا۔ کانچ کے ٹکڑے یہاں وہاں بکھرے تھے۔ جوس لکیروں میں پھیلتا ہوا دو انچ کے فرش سے نیچے دور تک پھیل چکا تھا۔ اور وہ باہر دیکھ رہی تھی۔ اندھیروں میں وہاں۔ جہاں سب ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔

☆☆☆

وہ آفس روم میں اپنا کچھ کام نبٹا کر پانی پینے کی غرض سے کچن میں آیا تو مسز شیرازی لاؤنج سے سیدھا وہیں آگئی تھیں۔

''کام ہوگیا؟'' پیار سے پوچھا۔

''ابھی باقی ہے، آپ پانی پئیں گی؟'' وہ فریج سے پانی کی بوتل نکالے کاونٹر ٹیبل کی طرف آگیا۔ انہوں نے منع کردیا۔

''جلدی سوجایا کرو بیٹا! اس طرح رات گئے تک جاگنا صحت کے لیے ٹھیک نہیں۔'' سنجیدگی سے تاکید کی۔

''پہلے کام زیادہ تھا لیکن اب کوشش کروں گا جلدی سوجاؤں۔'' کہہ کر پانی کا گلاس لبوں سے لگایا۔

''جنت تمہارے ساتھ اب کیسی ہے؟'' آنکھوں میں مسکراہٹ لیے مدھم آواز میں پوچھا۔

''ٹھیک ہے، کل سے ایک شاہزادے کو گدھا کہہ رہی ہے۔'' وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ خالی گلاس میز پر رکھ کر ان کے پاس آگیا۔

''آپ میری کوئی بات بھولتی نہیں ہیں۔'' مسز شیرازی وہیل چیئر پر تھیں، وہ ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

''مائیں بھلا اپنے بچوں کی چھوٹی چھوٹی باتیں، ان کی چھوٹی چھوٹی خواہشات بھی بھولتی ہیں؟'' اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں بھر کر بولیں۔

''تب میں بچہ نہیں تھا۔''

''میرے لیے تو تم آج بھی بچے ہی ہو۔'' وہ ان کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت دیکھ سکتا تھا۔

''جب آپ مجھے چھوڑ کر گئی تھیں۔ میں تب ہی بڑا ہوگیا تھا ممی۔''

ان کے اندر ایک دم سے سناٹا پھیلا۔ آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ فارس ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے رہا۔ پھر نرمی سے اپنے لبوں سے لگایا۔ وہ کچھ دکھ، کچھ اذیت سے اسے دیکھتی رہیں۔

''تم لندن میں اپنے گھر گئے تھے؟'' وہ پوچھ نہیں رہی تھیں۔ نہ ہی بتا رہی تھیں۔ وہ بس اس کے اندر کی بے سکونی تک پہنچنا چاہ رہی تھیں۔ وہ سر جھکائے بالکل خاموش رہا۔

قبرستان گھر نہیں ہوا کرتے۔ وہ اپنی مردہ خواب اور خواہشات کا پیچھے رہ جانے والا سامان اٹھا لایا تھا۔ اس کی خاموشی انہیں اذیت سے دوچار کرنے لگی۔

''مجھے معاف کردو۔'' ان کی آواز بے اختیار بھیگی۔ فارس نے تڑپ کر سر اٹھایا تھا۔

''ایسے مت کہا کریں ممی پلیز۔'' ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اور لب کپکپا رہے تھے۔

''ممی پلیز۔'' وہ ایک دم سے بے چین ہوا تھا۔ ان کے ہاتھ مضبوطی سے تھامے ان کے قدموں میں ہی بیٹھ گیا۔

''میں نے آپ کو کبھی بھی۔ کسی معاملے میں قصوروار نہیں ٹھہرایا۔''

''لیکن میں تو ٹھہراتی ہوں۔ میرے سینے پر بوجھ ہے۔ جانے والے تو چلے گئے۔ جو پیچھے رہ گئے ہیں، میں انہیں ایک نہیں کر پائی۔ میں تمہیں اور ریان کو ابھی تک ایک نہیں کر پائی۔'' وہ سسک پڑیں۔

ان کے ہاتھوں پر فارس کی گرفت ایک دم سے ڈھیلی پڑی تھی۔ وہ فرش پر تھا۔ وہ زمین میں اتر گیا۔ اذیت انگ انگ میں سما گئی۔

''وہ چھوٹا سا معصوم بچہ ہے۔ اس کا ان سب معاملات میں کوئی قصور نہیں۔ اسے خود سے دور نہ کرو۔ پلیز بیٹا اسے سزا مت دو۔''

وہ پیچھے ہوا تھا۔ سر جھکائے۔ خاموش۔ ساکت۔ بس اس مقام پر آکر اس کی ساری ہمت برداشت ختم ہوجاتی تھی۔ مزید کچھ سننے کی تاب نہیں رہتی تھی۔

قدموں کی آہٹ کے ساتھ ہی جنت راہداری سے نمودار ہوئی تھی۔

''آنٹی! آپ یہاں ہیں اور میں آپ کو اسٹوڈیو میں ڈھونڈ رہی تھی۔''

ساکت فضا میں ارتعاش پیدا ہوا۔ مسز شیرازی نے فوراً سے آنسو صاف کیے۔ فارس اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ سر جھکا ہوا تھا تو وہ دیکھ نہیں سکی۔ مگر اس کی آنکھیں۔ اس نے گردن موڑ کر اسے سیڑھیوں کی طرف جاتا دیکھا۔ پھر مسز شیرازی کے پاس آئی۔ ان کا رخ دوسری طرف تھا تو وہ تب تک خود کو کمپوز کر چکی تھیں مگر ان کی آنکھیں ابھی بھی لال ہو رہی تھیں۔

''جی بیٹا۔'' وہ بظاہر مسکرا رہی تھیں مگر ان کے چہرے سے اداسی جھلک رہی تھی۔ وہ نچلا لب کاٹ کر رہ گئی۔ جانے فارس کے ساتھ ان کی کیا بات ہوئی تھی؟ وہ بھی تو چپ چاپ اوپر چلا گیا تھا۔

''میں نے سوچا، سونے سے پہلے آپ سے باتیں کر لوں مگر آپ کمرے میں نہیں تھیں۔''

''ہاں بس۔ فارس کے پاس آئی تھی۔ چلو کمرے میں چلتے ہیں۔'' لہجے کو حتی الامکان نارمل کرتے ہوئے بولیں۔ ان کے ہمراہ راہداری کی طرف جاتے ہوئے اس نے سیڑھیوں کی طرف اوپر دیکھا تھا۔

اوپری منزل کی تمام بتیاں گل تھیں۔ ہر طرف اندھیرا سا پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا۔

☆☆☆

کچھ وقت مسز شیرازی کے ساتھ گزارنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گئی اور دروازہ بند کر کے سیدھا کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔

سامنے ہی وسیع و عریض لان کا گوشہ اور بائیں طرف گلاس والز کے احاطے میں سوئمنگ پول نظر آ رہا تھا۔ نیلگوں بلب روشن تھے، شیڈ تلے مخصوص کرسیوں اور ایک کاؤچ کے اطراف میں زرکار روشنی سی پھیلی تھی۔ اپنے کمرے کی کھڑکی سے نظر آتا یہ منظر اسے بہت بھلا لگتا تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں گم کھڑی تھی کہ اسے ٹراؤزر پر سفید شرٹ زیب تن کیے فارس وجدان گلاس ڈور دھکیل کر اسی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ وہ یکا یک پردے کی اوٹ میں ہو گئی۔ پھر سر نکال کر جھانکا۔ ٹرے میں سبز چائے، اور چند ایک لوازمات رکھے ملازمہ اس کے پیچھے تھی۔

وہ کاؤچ پر بیٹھ گیا۔ موبائل ہاتھ میں تھا۔ لیپ ٹاپ اور کچھ ضروری فائلز شیشے کی میز پر پہلے سے دھری تھیں۔

وہ اب اسے دیکھ رہی تھی۔ اور بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ سبز چائے کا کپ ہاتھ میں لیے وہ بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ نگاہیں سوئمنگ پول پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک ہی مقام، ایک ہی نقطے پر ساکت سی۔ ٹھہری ہوئی۔

وہ چند لمحوں تک اپنی جگہ کھڑی رہی پھر اس نے موبائل پر میسج ٹائپ کیا۔

''کیا تمہیں انویٹیشن ملا؟'' نگاہیں اس پر جا ٹھہری تھیں۔ اور توقع کے عین مطابق اس نے نوٹیفکیشن ملتے ہی اپنا موبائل اٹھا لیا تھا۔ صوفے کے ساتھ کمر ٹکائے اب وہ اسے ٹائپنگ کرتا ہوا دیکھ سکتی تھی۔

''کیسا انویٹیشن؟''

''میری اور زید کی منگنی کا۔'' لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں روشنی لیے جواب لکھا۔ اور پھر سر اٹھا کر اس کے تاثرات دیکھنا چاہے۔ وہ جبڑے بھینچ کر اسکرین کو تک رہا تھا۔ اسے بڑی خوشی ہوئی۔

''منگنی؟ آر یو سیریس؟''

''ہاں بھلا میں کیوں مذاق کروں گی؟'' ساتھ ہی وہ انویٹیشن کارڈ فارورڈ کر دیا جو زید کی ممی نے اسے بھیجا تھا۔ چار دن بعد اس ٹڈے کی سالگرہ تھی اور ساتھ ہی انگوٹھی پہنانے کی رسم بھی سرانجام پانا تھی۔

وہ منتظر رہی، اب وہ کیا کہتا ہے مگر وہ پیشانی پر بل ڈالے موبائل پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔

''کیا تم آؤ گے؟''

''کیا مجھے آنا چاہیے؟''

''بالکل۔''

''اچھا کس حیثیت سے؟''

''میرے شوہر کی حیثیت سے۔'' لکھتے لکھتے رک گئی۔ میسج مٹا دیا۔ دوبارہ لکھا۔

''تمہارے ان کے ساتھ فیملی ٹرمز ہیں۔''

دوسری طرف خاموشی۔

''میں انتظار کروں؟''

''نہیں۔''

اس کے انکار سے حظ اٹھاتے ہوئے فوراً لکھا۔ ''حالانکہ آنا چاہیے۔''

''اچھا تو وہ کس لیے؟''

''کیونکہ میں کہہ رہی ہوں۔'' دھڑکتے دل کے ساتھ ٹائپ کر دیا۔ اس کے جواب نے جیسے ایک لمحے کے لیے فارس کو بھی حیران کیا تھا۔ نچلا لب کاٹتے ہوئے فوراً سے میسج ڈیلیٹ کر دیا۔ کھڑکی سے پیچھے ہٹ گئی۔ اب وہ نہیں جانتی تھی فارس کیا کر رہا تھا۔ مگر دوبارہ اس کی طرف سے بھی کوئی میسج نہیں آیا تھا۔ کچھ دیر تک کمرے میں بائیں سے دائیں۔ اور دائیں سے بائیں چکر کاٹتے

کے بعد وہ پھر سے کھڑکی کے پاس آ گئی۔

وہ لیپ ٹاپ گود میں رکھے اپنا کام کر رہا تھا۔لیکن ہر چند لمحوں کے بعد اس کی نگاہیں اسکرین سے ہٹ کر سوئمنگ پول۔اور پھر وہاں سے بیلوں سے گھری دیوار تک اٹھ جاتی تھیں۔وہ کھڑکی میں کھڑی رہی۔اور اسے دیکھتی رہی۔

یکا یک اسے موبائل پر میسیج موصول ہوا۔سر جھکا کر اسکرین پر نگاہ دوڑائی۔

''اگر تم اسی طرح کھڑکی سے مجھے تاڑتی رہو گی تو میں کام نہیں کر سکوں گا۔''

''اللہ!'' وہ پردہ چھوڑ کر جھٹکے سے پیچھے ہٹی۔نچلا لب دانتوں میں دبا۔حالانکہ وہ چھپ کر کھڑی تھی۔

''خوش فہمی دیکھو جناب کی۔'' گھبراہٹ پر قابو پا کر تیزی سے ٹائپ کیا۔''میں بھلا تمہیں کیوں تاڑنے لگی؟ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا تم کہاں ہو۔'' رک کر مزید لکھا۔

''میں تو اپنا کام کر رہی ہوں۔''

آگے سے شیطانی مسکراہٹ موصول ہوئی۔وہ تپ گئی۔

''پورے گھر میں تمہیں بس میرے کمرے کی کھڑکی کے سامنے آ کر بیٹھنا تھا؟'' بھنا کر لکھ دیا۔

''ابھی تم کہہ رہی تھیں تم مجھے دیکھ نہیں رہیں۔'' قہقہہ۔

وہ فق سی ہو گئی۔اپنا موبائل آف کر کے خود سے بہت پرے رکھ دیا۔کھڑکیوں سے دور ہو کر شرافت سے بیڈ پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔

مجھے اسے میسیج ہی نہیں کرنا چاہیے تھا۔بھنویں سکیڑ کر خود کو کوسا۔اور نہ ہی اس کی خیریت معلوم کرنے کے لیے کمرے میں جانا چاہیے تھا۔ذرا سی توجہ کیا دی۔موصوف تو ساتویں آسمان پر پہنچ گئے ہیں۔کچھ دیر تک بیٹھی رہی پھر موبائل اٹھا لیا۔یوٹیوب پر چند ایک ویڈیوز دیکھیں۔بچوں کے نام سرچ کیے۔ہاتھوں پر لوشن لگاتے ہوئے کھڑکیوں کی طرف اور پھر وارڈروب کی طرف دیکھنے لگی۔ذہن کچھ نہ کچھ ترتیب دینے میں لگا ہوا تھا۔کپڑے یہاں رکھے جا سکتے ہیں اور بے بی کاٹ اس مقام پر۔ڈریسنگ یہاں سے ہٹا کر وہاں رکھ دے گی۔ذہن میں ہر طرح کی ترتیب دے کر تکیہ درست کرتی لیٹ گئی۔موبائل ہاتھ میں تھا۔وہ سدرہ سے بات کر رہی تھی۔

ہلکی سی دستک کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔کہنی کے بل اوپر ہوئی تو دروازے میں فارس تھا۔

''اندر آ سکتا ہوں؟'' وہ پورا کا پورا اندر تھا اور اجازت مانگ رہا تھا۔اس کا میسیج یاد آیا تو آنکھوں میں خفگی ابھر آئی۔

''تم سوئے نہیں ابھی تک؟'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''نیند نہیں آ رہی تھی تو......''

''تو......؟'' اس نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔

''میں نے سوچا تم سے باتیں کر لوں۔تم بھی تو جاگ رہی ہو۔''

موبائل سائڈ ٹیبل پر رکھ کر، برابر میں آ بیٹھا۔

''حالانکہ میں نے اجازت نہیں دی تھی۔'' گھور کر کہا۔

''انکار بھی تو نہیں کیا۔'' وہ مسکرایا۔

جنت بڑبڑا کر رخ بدل گئی۔موبائل ہاتھوں میں لیے عجلت میں ٹائپنگ کرنے لگی۔سدرہ سے بات کر رہی تھی تو گفتگو سمیٹنے لگی۔

فارس اسے ہی دیکھ رہا تھا۔اس کے سفید کاٹن نائٹ ڈریس کی آدھی آستین سے جھانکتے بازو پر مندمل زخم کی لکیر واضح تھی۔

''تمہیں یہ زخم کیسے آیا تھا؟''

''کون سا زخم۔'' اس نے سر اٹھا کر پوچھا۔اگلے ہی پل اپنے بازو کے اسی مقام پر اسے لمس کا احساس ہوا۔

''اب پوچھ رہے ہو؟ اب تو زخم بھی بھر گیا۔''

منظر، وقت، لمحے یاد آئے تو کہے بنا نہ رہ سکی۔

''نشان تو ابھی بھی ہے۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''دو اسٹچز لگے تھے۔'' اسے یاد تھا۔

''بوا کے گھر بلب فکس کر کے نیچے اتر رہی تھی تب کیل لگ گئی تھی۔'' بہت عام سے لہجے میں جواب دے کر بادام منہ میں ڈالا۔

پارکنگ ایریا کا منظر، برہان واصف کا تھپڑ۔سخت پتھریلی زمین پر گرتے ہی ہتھیلیوں پر پڑنے والی رگڑ۔بے اعتنائی کی اذیت، وہ خوف، وہ دہشت۔اس نے وہ تمام کے تمام خیالات جھٹک دیے۔

وہ چند لمحوں تک منتظر رہا کہ وہ مزید کچھ کہے گی مگر وہ خاموش ہو چکی تھی۔

''ایسا ہی ایک زخم مجھے بھی لگا تھا، تب میں پانچ سال کا تھا۔''

''کیسے؟'' کشن کو سینے سے لگائے اس کی طرف رخ موڑا۔

''میں الماری میں چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''کس لیے؟'' وہ ذرا سا حیران ہوئی تھی۔

''تم گیس کرو کس لیے؟'' وہ پوری طرح سے اس کی طرف متوجہ تھا۔

''کسی بچے کا سر پھاڑا ہو گا۔کوئی نقصان کیا ہو گا۔یا پھر......''

فارس کی پیشانی پر بل آ گئے۔

''خود ہی تو کہا ہے گیس کرو۔''جنت نے بھنویں سکیڑیں۔

''گیس کرو۔ یہ نہیں کہا الزام لگاؤ۔''وہ اچھا خاصا برا مان گیا۔

''میں تو یہی گیس کر سکتی ہوں۔''اس نے گھورا۔''اب کوئی بچہ اچھا کام سرانجام دے کر تو چھپنے کی کوشش نہیں کر سکتا۔''

''ہاں۔مگر میں اس لیے نہیں چھپ رہا تھا کہ میں نے کوئی نقصان کیا تھا۔''

''تو پھر؟''

فارس نے کچھ بتانے کے لیے منہ کھولا پھر رک گیا۔''فارگیٹ اباؤٹ اٹ۔''سر جھٹک کر موبائل اٹھا لیا۔

''کیا مطلب فارگیٹ اباؤٹ اٹ؟''اسے غصہ چڑھ گیا۔''خود ہی بات شروع کرو۔سسپنس پھیلاؤ اور پھر سو جاؤ۔''

غصہ تو اسے ویسے بھی چڑھا رہتا تھا۔فارس کی اس حرکت پر سیخ پا ہو گئی۔مگر دوسری طرف تو جیسے وہ کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔موبائل پر یوں نگاہیں مرکوز تھیں جیسے کوئی ضروری کام درپیش ہو۔

''اصل میں میرا ہی دماغ خراب ہے جو میں تم سے باتیں کرنے لگ گئی۔''کمفرٹر ایک طرف کر کے اٹھ گئی۔

''کہاں جا رہی ہو؟''

''کہیں بھی جاؤں۔تمہیں اس سے کیا؟''

دروازہ کھول کر اور پوری قوت سے بند کر کے باہر تھی۔

وہ گہری سانس لے کر تیزی سے اٹھ کر اس کے پیچھے آیا۔راہداری سے سیدھا کچن میں گیا۔سامنے ہی وہ کرسی پر بیٹھی تھی۔سر جھکا ہوا تھا۔گندھے ہوئے بال پشت پر تھے۔بڑبڑاہٹ جاری تھی۔

''جب دل چاہے گا باتیں کرے گا۔اور جب دل چاہے گا خاموش ہو جائے گا۔میں کوئی مذاق ہوں؟''

اسے نہیں پتا تھا وہ عین اس کے پیچھے کھڑا تھا۔مسکراہٹ دبائے اس کے برابر میں کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''اچھا کرو کیا باتیں کرنی ہیں؟''

''میں نے کب کہا مجھے تم سے کوئی بات کرنی ہے؟''اسے پتنگے لگ گئے۔''یہ تو تم ہو جو خواہ مخواہ فری ہونے کی کوشش کرتے ہو۔''

''فری ہونے کی کوشش؟''وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے بند مٹھی پر ٹھوڑی ٹکائے اسے نرمی سے دیکھے گیا۔

''آئندہ میں تم سے کوئی بات نہیں کروں گی۔کوئی جواب نہیں دوں گی۔''صاف کہہ دیا۔''جیسے تم کرتے ہو۔میں بھی بالکل

ویسے ہی کروں گی۔''

''میں خوف زدہ تھا اس لیے چھپ گیا تھا۔''اس نے اچانک کہا۔اور وہ جو شدید غصے میں مزید کچھ کہنے کا ارادہ رکھتی تھی یک دم چپ ہو گئی۔

''بس یا اور کچھ؟''اس نے بظاہر دوستانہ لہجے میں پوچھا۔وہ چند لمحوں تک اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔جانے کتنی حکایتیں تھیں جو ان آنکھوں میں چھپی ہوئی تھیں۔

''یعنی میں کوئی اور سوال بھی پوچھ سکتی ہوں؟''تصدیق چاہی۔

''ہاں۔''

وہ حیران ہوئی کہ توقع کے برعکس جواب مثبت ملا تھا۔

''فائدہ؟ جب تم جواب ہی نہیں دیتے۔''تنفر سے سر جھٹکا۔''خود سارے سوال پوچھ لیتے ہو۔سارے جواب سن لیتے ہو۔لیکن جب میں کچھ پوچھوں۔تو خاموشی۔''

وہ ابھی بھی غصے میں لگ رہی تھی۔بندھے ہوئے بال آگے کی طرف داہنے کندھے پر تھے۔کچھ لٹیں ڈھیلی ہو کر گال پر پھسل رہی تھیں۔

''چائے پیو گی؟''اس نے اٹھ کر کیبنٹ سے جار نکالا۔وہ لب بھینچے ایک سخت نظر اس پر ڈالے اپنی انگوٹھی کو آگے پیچھے کرتی رہی۔

چائے بناتے ہوئے وہ خود سے ہلکی پھلکی گفتگو کرتا رہا مگر اس نے لب سیے رکھے جیسے اب کوئی بات ہی نہیں کرے گی۔

چائے تیار ہو گئی تو بھاپ اڑاتا ایک مگ اس کے آگے رکھا،اور دوسرا مگ ہاتھ میں لیے سامنے کھڑا رہا۔

''تمہیں غلط لگا تھا۔''گھونٹ بھر کر کہا۔

''کیا؟''اس نے اپنا مگ قریب کر لیا۔

''یہی کہ میں کسی عورت کو اپنی زندگی میں واپس لانا چاہ رہا ہوں۔''

جنت کی دھڑکن لمحے بھر کے لیے تھمی۔سانس رک گیا مگ پر اس کی گرفت مضبوط ہو چکی تھی۔اس رات کے بعد عدینہ زبیر کا ذکر جیسے آج ہوا تھا۔وہ اس کا نام نہیں لے رہا تھا۔نہ ہی اسے کسی سابقہ رشتے سے جوڑ رہا تھا۔اس کے لیے وہ ایک ''عورت'' تھی۔

''اور تم چاہتے ہو،میں یقین کر لوں؟''اس کا لہجہ مضبوط تھا مگر دل شدت سے دھڑکے جا رہا تھا۔فارس کی سابقہ بیوی کا خوف جیسے اس کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا۔خصوصاً یہ انکشاف زیادہ تکلیف دہ تھا کہ عدینہ اس کی محبت تھی اور وہ اسے ہر صورت اپنی زندگی

میں واپس لانا چاہتا تھا۔

''کرنا تو چاہیے۔'' وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''تم مجھے۔طلاق دینا چاہتے تھے۔'' آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یاد دلایا۔

''دینا چاہتا تھا۔یہ تم نے خود کہہ دیا تھا۔پاسٹ ٹینس مائی ڈیئر وائف۔فعل ماضی۔میری اب ایسی کوئی خواہش نہیں رہی۔''

جنت ہکا بکا سی اسے دیکھ کر رہ گئی۔ذرا دیکھو تو کھڑوس کو ساری باتیں یاد تھیں اس کی۔اور ظاہر ایسے کرتا تھا جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا۔

''میری زندگی میں تمہارے سوا کوئی عورت نہیں ہے۔'' اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہہ دیا۔بات سادہ مختصر اور واضح تھی۔جنت کی دھڑکنیں تھمی رہیں۔سانسیں رکیں۔اگلے کئی لمحوں تک وہ اسے خاموش نگاہوں سے تکتی رہی۔کیا وہ دانستہ عدینہ زبیر کا ذکر نہیں کر رہا؟ اور اگر کسی عورت کا مسئلہ نہیں تھا تو وہ اسے طلاق کیوں دینا چاہتا تھا؟ کچھ تو تھا جو چھپا ہوا تھا یا پھر وہ جان بوجھ کر اس سے چھپا رہا تھا۔

''تم مجھ سے نفرت کرتے تھے اور مجھے طلاق دینا چاہتے تھے اور پھر اچانک تم آ کر کہو کہ میں تمہیں طلاق نہیں دینا چاہتا تو میں اس بات کو کیا سمجھوں، ہاں؟ ایسا تو صرف کہانیوں میں ہوتا ہے، کسی کو اچانک ایک سیکنڈ میں محبت ہو جائے۔

''اور میں نے کب کہا، مجھے تم سے محبت ہو گئی؟''

میز پر کہنیاں جما کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔وہ جو اپنی دھن میں بول رہی تھی، ساکت ہو گئی۔سوال ٹھا کر کے دل کو لگا۔صاف صاف بے عزتی۔چہرہ خفت سے سرخ پڑا۔اب نہ وہ اٹھ سکتی تھی۔نہ رخ بدل سکتی تھی، نہ غائب ہو سکتی تھی۔ہاں فارس نے کب کہا، اسے محبت ہو گئی؟

''میرا مطلب ہے۔میں کہہ رہی تھی......اصل میں وہ......''

''ہاں ہاں! بولو۔میں سن رہا ہوں۔'' چہرہ متبسم ہو گیا۔آنکھوں میں شرارت اتر آئی۔

''اصل میں میرا دماغ خراب ہے جو میں تم سے باتیں کر رہی ہوں۔'' اس کی چال سمجھتے ہی کرسی دھکیل کر اٹھ گئی۔

''چائے تو پی لو۔''

''زہر دے دو تم مجھے۔'' مڑ کر چلائی۔پھر بیڈروم میں جا کر دروازہ زور سے بند کر دیا۔وہ میز پر بیٹھا مزے سے چائے پیتا رہا۔

''سمجھتا کیا ہے یہ خود کو؟'' بگڑے تیوروں کے ساتھ لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی۔آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔پھر جھنجھلا کر کروٹ بدلی، دوبارہ بدلی، کشن اپنے کان پر رکھا۔

''فارس بھائی نے کبھی تم سے محبت کا اعتراف کیا!؟'' دوسرے کان میں آواز گونجی۔

''محبت اعمال سے جھلکتی ہو تو اعتراف کی ضرورت نہیں پڑتی۔''

تخیل کی دھار پر بڑا بڑا لکھا ہوا نظر آیا۔اس کے الفاظ، اس کا جملہ۔اس کا جواب۔

اس نے تکیے میں سر دیتے ہوئے آنکھیں میچ لیں۔اندر ہی اندر بہت سارا چیخی۔کیسا انسان تھا وہ۔محبت کا اعتراف ہوا نہیں تھا اور وہ اپنی زبان سے تسلیم کر بیٹھی تھی۔اللہ......اللہ......اللہ......وہ تقریباً رو دینے والی تھی۔

فارس نے دروازہ کھولا۔کھنکھار کر گلا صاف کیا۔اس نے کشن اٹھا کر اسے دے مارا۔

''خبردار جو تم نے مجھ سے کچھ کہا تو۔'' وہ تقریباً رو دینے والی تھی۔وہ مسکراہٹ ضبط کیے صوفے پر جا بیٹھا۔

''ہاں ٹھیک ہے، میں نے تم سے یہ نہیں کہا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔لیکن یہ بھی تو نہیں کہا کہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔ان فیکٹ میں نے تو محبت پر کوئی بات ہی نہیں کی۔''

ٹانگ پر ٹانگ جمائے، داہنے پاؤں کو جنبش دیتے، صوفے کے ہتھوں پر بازو ٹکائے وہ جیسے کسی سلطنت کا شاہزادہ بنا بیٹھا تھا۔

وہ کمفرٹر میں دبکی پڑی رہی۔اب کوئی جواب دیتی تو پھنس جاتی۔نہ جواب دے کر پھنسنا زیادہ مناسب لگا۔

''میرا ایسا بھی کوئی مشکل سوال نہیں ہے!۔'' اس نے کہا۔

''جنت کمال؟'' پھر پکارا۔

وہ تو ایسی ہو گئی جیسے اپنے کان کہیں گروی رکھ آئی ہو۔وہ زیر لب مسکراتے ہوئے اٹھ کر چلا گیا۔دروازہ بند ہوا تو جنت نے دھیرے سے آنکھیں کھول دیں۔

''آئندہ میں اس سے کوئی بات نہیں کروں گی۔'' مصمم ارادہ کر لیا۔کسی بھی سوال کا کوئی جواب نہیں دوں گی۔کمزور نہیں پڑوں گی۔کوئی شکوہ بھی نہیں کروں گی۔سمجھتا ہے مجھے پھنسا لے گا۔ہونہہ!''

تکیے میں سر دے کر طرح سے جھنجھلائی۔تسلی تشفی سے، ہمت بندھانے اور ارادے باندھنے سے کچھ نہیں ہو رہا تھا۔فارس کا لہجہ، اس کی مسکراتی نگاہیں، اس کا استحقاق سے سوال پوچھنا۔وہ اپنی دھڑکنوں کو سن رہی تھی اور احساسات میں الجھ رہی تھی۔

اور باہر لان پولز کی روشنیوں میں فارس وجدان رات گئے تک ٹہلتا رہا تھا۔

☆☆☆

نیند سے بیدار ہوتے ہی اس نے کمرے کی تمام کھڑکیاں کھول دی تھیں۔باہر کا نظارہ کرتے ہوئے انگڑائی لی۔پھر کپڑے

نکال کرواش روم میں گھس گئی۔شاور لیا، کپڑے بدلے۔بال خشک کر کے پونی بنائی۔دوپٹہ لیا اور نکھری سی باہر آ گئی۔

کچن میں معمول کی طرح ناشتے کا انتظام ہو رہا تھا۔مسز شیرازی کیئر ٹیکر کے ہمراہ لاؤنج میں بیٹھی قرآن پڑھ رہی تھیں۔وہ پہلے ان کے پاس گئی۔ان سے ملنے کے بعد کچن میں جا کر ناشتے کے انتظامات کا جائزہ لیا۔نگاہیں پھر بھٹکتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف گئیں۔کلائی موڑ کر وقت دیکھا۔ساڑھے سات بج رہے تھے اور وہ ابھی تک نیچے نہیں آیا تھا۔کہیں اس کی وہ دعا قبول تو نہیں ہو گئی کہ صبح سات بجے سے پہلے پہلے اسے آفس جانا پڑ جائے؟ نچلا لب دانتوں تلے دبایا۔

اور پھر خود کو ہر لحاظ سے کمپوز کرتی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

''کہہ دوں گی، آنٹی نے بھیجا ہے، جاؤ دیکھو۔میرا بیٹا ابھی تک نیچے کیوں نہیں آیا۔''

آہستگی سے دستک دے کر بیڈ روم کا دروازہ کھولا مگر اندر کوئی نہ تھا۔ بیڈ پر کوئی شکن نہ تھی، تکیے بھی ترتیب سے رکھے تھے، کمفرٹر بھی استعمال نہیں کیا گیا تھا۔

رک کر راہداری میں نگاہ دوڑائی۔سٹنگ ایریا میں بھی کوئی نہیں تھا۔اس کے قدم بے اختیار اسٹڈی روم کی طرف اٹھے، ادھ کھلے دروازے کو آہستگی سے اندر دھکیلا تو وہ اسے سامنے ہی کاؤچ پر سویا ہوا دکھائی دیا۔لمحے بھر کے لیے تو جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔دروازے کے ہینڈل پر گرفت جمائے کتنی ہی دیر تک کھڑی رہ گئی۔

لیپ ٹاپ، موبائل، کچھ فائلز اور کاغذات قالین اور شیشے کی میز پر دھرے تھے۔پانی کا گلاس بھی رکھا تھا۔کافی کا خالی مگ بھی۔

''کیا وہ ساری رات اسٹڈی میں سویا رہا؟'' وہ کچھ دیر تک اپنی جگہ کھڑی رہی۔قریب آ کر اسے دیکھا۔پھر آواز دیتے ہوئے کندھا ہلایا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔کھڑکیوں سے دھوپ سیدھا چہرے پر پڑ رہی تھی تو مندی مندی آنکھوں کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گیا۔حواس بیدار ہوئے تو اسٹڈی میں اپنی موجودگی کا احساس کر کے سیدھا ہوا۔تاثرات ایک دم سے بدلے۔غالباً اسے توقع نہیں تھی، وہ اوپر آئے گی۔

''تم......''اس کی آنکھیں رت جگے کی گواہی دے رہی تھیں۔

''ہاں وہ۔تم نیچے نہیں آئے تو آنٹی نے بھیجا۔''

وہ ہتھیلیوں پر سر گرائے کچھ دیر تک بیٹھا رہا۔

''تم یہیں سوئے رہے۔''

''کام کرتے آنکھ لگ گئی۔'' وہ داہنے ہاتھ سے پیشانی مسل رہا تھا۔آنکھیں ہنوز بند تھیں۔دو دن پہلے جب وہ آفس میں سو

گیا تھا تو اس نے تب بھی مسز شیرازی کو یہی جواب دیا تھا۔

وہ نچلا لب دانتوں میں دبائے کھڑی رہی۔پھر گلاس میں پانی ڈال کر اسے دیا۔

''تم چلو، میں فریش ہو کر آتا ہوں۔''اس نے کہا۔

وہ سر ہلا کر اسٹڈی سے چلی گئی۔ناشتے کے دوران اس کا رویہ ٹھیک رہا۔ورک آؤٹ کرواتے ہوئے بھی۔بس فرق یہ تھا، وہ آج اسے کم ڈانٹ رہا تھا۔زیادہ بات بھی نہیں کر رہا تھا۔ذہن کچھ الجھا ہوا سا لگا کہ جب وہ بات کر لیتی تو وہ چونک کر پوچھتا وہ کیا کہہ رہی تھی۔آفس کے لیے روانہ ہوا تو وہ گلاس والز کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔اور کافی دیر تک کھڑی ہی رہی۔

☆☆☆

آفس سے واپسی پر اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے غیر معمولی پن کا احساس ہوا حالانکہ کچھ بھی تو نہ بدلا تھا۔ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے اس نے صوفے پر بیٹھ کر جوتے اتارے، کف لنکس ، اور گھڑی ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی تو ادراک ہوا، اس کے پرفیومز اور لوشنز وغیرہ غائب تھے۔سوچ میں الجھتے وارڈ روب سلائڈ کی تو خالی ملی۔اس کے کپڑے، جوتے، ٹائیاں۔کچھ بھی موجود نہیں تھا۔وہ ایک دم سے حیران ہوا۔ذہن میں ایک ممکنہ خیال نے سر اٹھایا تو اس کا سر نفی میں ہلا۔مگر اگلے ہی پل وہ جوتے پہن کر سیڑھیاں اترتا نیچے آ گیا تھا۔کچن میں دوپہر کے کھانے کا انتظام ہو رہا تھا۔مسز شیرازی لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔ملازمہ ان کے لیے کپ میں چائے ڈال رہی تھی۔ جنت کی تلاش میں نگاہ دوڑاتے ہوئے اس نے راہداری کا رخ کیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ دروازے پر دستک دیتا اس کے کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔

اس کا سارا کا سارا سامان کارپٹ پر دھرا تھا۔اور وہ بالکل سامنے نیچے بیٹھی اس کے جوتے ترتیب سے رکھ رہی تھی۔اور اتنا مگن ہو کر کام کر رہی تھی کہ نہ دستک سنائی دی تھی۔نہ اس کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔

سینے پر بازو باندھے وہ خوش گوار حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔پھر اس کے عقب میں بے حد قریب پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔

''میں ابھی عدیل کو کال کرنے والا تھا، میرے کمرے سے کچھ سامان چوری ہو گیا ہے۔''

اتنے قریب سے، اتنے اچانک آواز آنے پر وہ ایک دم سے بوکھلائی۔اسنیکرز چھوٹ کر نیچے گرے۔

''تم......تم کب آئے؟'' گھبرا کر پوچھا۔

''کافی دیر ہو چکی ہے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔''تم اتنی بزی تھیں۔تمہیں پتا ہی نہیں چلا۔'' جنت حواس باختہ سی اسے دیکھ کر رہ گئی۔

ایک طائرانہ نگاہ کمرے میں دوڑائی۔پھر فرصت سے اسے دیکھا۔آنکھوں میں شرارت اور لبوں پر جو مسکراہٹ تھی، وہ اسے

لب بھینچ کر دبا رہا تھا۔

''کیا آپ بتانا پسند کریں گی، میرے جوتے، کپڑے، ٹائیاں خود چل کر نیچے آئی ہیں یا آپ انہیں لائی ہیں؟''

جنت کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ ساری پلاننگ کا بیڑا غرق ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا تھا، وہ اپنے بیڈروم میں اس کا سامان سیٹ کرنے کے بعد میسیج کر کے بتا دے گی کہ اب وہ کمرہ شیئر کر سکتا ہے۔ لیکن شومئی قسمت کہ وہ آفس سے جلدی گھر آ گیا تھا اور اب اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ کوئی جرم کرتی رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہو۔

''اگر آپ لائی ہیں۔ تو پھر کیوں لائی ہیں؟'' لہجے میں کس قدر معصومیت تھی۔ جیسے وہ نہ جانتا ہو، وہ کیوں لائی تھی۔

''وہ...... میں......'' ذہن خالی ہو گیا۔ نہ لفظ رہے۔ نہ جملے بنے۔ اور وہ اس کی کیفیت سے حظ اٹھاتا اس کے برابر میں ہی بیٹھ گیا۔ کہ جواب دینے کے لیے جتنا وقت درکار ہے لے لو۔ مجھے بھی یہاں سے جانے کی کوئی جلدی نہیں۔ جنت کو جی بھر کر رونا آیا۔ خود کو جس سچویشن میں پھنسا لیا تھا، اس کا آسان ترین حل بھی اسے بے انتہا مشکل لگ رہا تھا۔

''وہ میں......'' وہ اس کی نگاہوں کے تاثر سے کنفیوژ ہو رہی تھی۔

''ہاں وہ تم...... کیا......؟''

''وہ میں اپنا روم شیئر کرنے کی اجازت دے رہی ہوں تمہیں۔''

فارس نے بھنویں اچکائیں۔ ''لیکن میں نے تم سے اجازت کب مانگی؟''

اور جنت کو لگا جیسے آس پاس بہت سے دھماکے ہوئے ہوں۔ اور آنکھوں کے سامنے اس عزت افزائی پر تارے سے چمک اٹھے ہوں۔

''اس دن تو بڑا کہہ رہے تھے، کمرے میں دل نہیں لگ رہا۔'' ساری مروت، لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ اس پر پھٹ پڑی۔

''میں نے یہ کب کہا؟'' وہ قدرے حیرت سے سیدھا ہوا۔

''دل میں جگہ نہیں دے سکتیں تو کمرے میں دے دو'' سلگ کر یاد دلایا۔ چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔

''میں ایسی کوئی بات کر ہی نہیں سکتا'' بے یقینی کی انتہا۔ جھوٹا۔

جنت نے گود میں جو کوٹ رکھا تھا اسے اٹھا کر قالین پر پٹخا۔

''ضوفشاں......!'' اٹھ کر ملازمہ کو آواز دی۔ ملازمہ فوراً ہی حاضر ہوئی۔

''یہ سارا سامان ابھی کے ابھی صاحب کے کمرے میں پہنچاؤ۔''

جھٹ سے حکم صادر کیا۔ مگر ملازمہ فارس کی تھی۔ اس کے ایک ہی اشارے پر جنت کے حکم کو مکمل نظر انداز کرتی کمرے سے چلی گئی۔ جنت کا پارہ مزید چڑھ گیا۔ مڑ کر اسے دیکھا۔

''اب تم جاؤ یہاں سے۔'' سخت لہجے میں اسے حکم صادر کیا۔ آنکھوں میں ہلکی سی نمی بھنویں سکڑی ہوئی۔ لب بھینچے ہوئے۔

وہ چند لمحوں تک کھڑا رہا۔ اگلے ہی پل اپنے اور اس کے مابین فاصلے کو ختم کرتے ہوئے خود سے لگا لیا۔ وہ اس کی اس حرکت پر اپنی جگہ تھم گئی۔

''تھینک یو سوچ۔ مجھے اجازت دینے کے لیے۔'' آواز مدھم اور گہری تھی۔

جنت کا غصہ یکا یک ٹھنڈا ہوا۔ تاثرات میں نرمی اتر آئی۔ الگ ہو کر اس نے دونوں ہاتھوں سے بالوں کو پیچھے کیا۔

''اگر مجھے پتا ہوتا، آج مجھے سرپرائز ملنے والا ہے تو میں شاید بہت دیر سے گھر آتا۔'' اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے کہہ رہا تھا۔

''ہاں لیکن...... اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں کورٹ نہیں جاؤں گی۔'' اپنی خفت چھپانے کو دھڑلے سے کہہ دیا۔ وہ ہنس دیا۔

''آف کورس میں ایسا کچھ سوچ ہی نہیں رہا۔''

وہ اسے نظر انداز کرتی کہیں اور دیکھنے لگی۔

''مجھے چینج کرنا ہے۔'' فارس نے کہا۔

اس نے وارڈروب سے کپڑے نکال کر اسے دیے اور وہ اٹیچڈ باتھ روم میں چلا گیا۔

جنت کچھ دیر تک اپنی جگہ کھڑی رہی پھر لبوں پر مسکراہٹ لیے اپنا بقیہ کام سمیٹنے لگی۔

☆☆☆

اگلے دن وہ آفس سے جلد ہی واپس آ گیا تھا۔ گھر پہنچ کر ملازموں سے پتا چلا اس کی زوجہ محترمہ اپنی ساس کے ساتھ زید کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ وہ سیدھا آفاق ہاؤس چلا گیا۔ واچ مین نے اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔

جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ بڑے ہی لیے دیے سے انداز میں اندر داخل ہوا۔

سرسبز لان کے وسط میں ایک جگہ اسٹیج تیار کیا گیا تھا۔ نیلگوں تھیم میں کرسیاں میزیں سجائی گئی تھیں۔ مہمان خواتین، اور ان کے ڈھیر سارے بچے، اور ہر طرف شور شرابا۔

بچے لان میں بھاگتے کھیل رہے تھے۔ سوزی مہمان خصوصی تھی۔ اتنی لاڈلی کہ تقریباً ہر بچہ اسے گود میں لیے پھرتا تھا۔ کیک کاٹا جا چکا تھا۔ تحفے وصول ہو چکے تھے۔ اب یقیناً مہمانوں کو کھانا کھلایا جا رہا تھا۔ اس کی نظر مسز شیرازی پر پڑی۔ وہ زید کی دادی

کے ساتھ محو گفتگو تھیں۔ وہ آنکھوں میں ذرا سی برہمی لیے اپنی بیوی کو کھوجنے لگا۔ اور تب ہی وہ اسے نظر آ گئی۔

آسمانی رنگ کے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں ملبوس، بالوں کی پونی بنائے وہ گلاس ڈور سے نکل کر مسز شیرازی کی طرف جا رہی تھی۔ زویا اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ اقصیٰ مسز شیرازی کے پاس کھڑی بڑے مزے سے اپنی سی سی ٹی وی آنکھوں سے یہاں وہاں دیکھ رہی تھی کہ یکا یک نظر فارس وجدان پر پڑی۔

''آپی!'' اس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ جنت، زویا کے جوتوں کے تسمے باندھ رہی تھی ڈر سی گئی۔ ''کیا ہوا بھوت دیکھ لیا کیا؟''

''سمجھیں بھوت ہی دیکھ لیا نہیں۔ میرا مطلب ہے وہ......وہاں......'' اپنا بازو سیدھا کر کے اشارہ کیا۔ ''فارس صاحب۔''

جنت چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ مڑ کر بیرونی گیٹ کی جانب دیکھا اور اگلے ہی لمحے فارس وجدان پر نظر پڑتے ہی اسے خوش گوار حیرت نے گھیر لیا۔

''میں آتی ہوں۔'' کہہ کر وہاں سے نکل آئی۔ فارس وجدان کے قریب پہنچنے تک آنکھوں کی چمک، مسکراہٹ، اور مسرت بھرے تمام رنگ چھپا لیے۔

''ارے تم یہاں۔'' گردن اونچی کیے جی بھر کر حیران ہوئی۔

''ہاں میں یہاں۔''

''حیرت ہے، تم نے تو کہا تھا، تم نہیں آؤ گے۔''

''دیکھ لو۔'' اس نے جتایا۔ پھر ہاتھ سے اسے دور رہنے کا اشارہ کیا۔ ''اگر سوزی کے ساتھ وقت گزار کر آ رہی ہو تو......''

مگر وہ اس کے بالکل پاس آ کھڑی ہوئی۔ داہنے ہاتھ کو سامنے کیا۔ درمیان والی انگلی میں گلابی رنگ کی پلاسٹک کھلونا انگوٹھی سجی ہوئی تھی۔

''کیسی ہے؟'' آنکھوں میں بچوں جیسا اشتیاق لیے پوچھا۔ ''بٹن دباؤ تو لائٹ بھی جلتی ہے۔''

فارس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''مجھ سے کہا ہوتا۔ میں ایسی ہزار لا دیتا۔''

''مجھے ایک ہی چاہیے تھی۔ اور وہ زید نے مجھے دے دی۔'' اترا کر کہا۔

''تمہیں اب اپنے فیانسی کی سکیورٹی کا انتظام کرنا چاہیے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

اور وہ ہنس دی۔ آنکھوں میں زندگی کی رمق تھی۔ چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ اور یہ خوشی کس لیے تھی؟ اس کی آمد کی وجہ یا پھر؟

''ویل آف یو ایکسکیوز می! میرے فیانسی کو پسند نہیں، میں اس کے علاوہ کسی سے بات کروں۔'' ایک ادا سے کہہ کر جانے کو مڑی مگر فارس نے اسے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔

''تمہارے فیانسی سے تو میں بعد میں نمٹ لوں گا۔ لیکن اگر آپ کو یاد ہو، آج آپ کا اپائنٹمنٹ ہے۔''

''ہاں جی یاد ہے مجھے۔''

مسز شیرازی نے ان کی جانب دیکھا تو فارس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ انہوں نے اشارے سے اسے جانے کی اجازت دی۔

''اور میں نے یہ بھی کہا تھا، ڈنر باہر کریں گے۔'' وہ اسے بازو کے حصار میں لیے دائیں طرف پلر کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔

''تمہاری وجہ سے میں ٹھیک سے کچھ کھا نہیں سکی۔'' وہ دیوار کے ساتھ پشت ٹکائے کھڑی ہو گئی۔ سر اٹھا ہوا تھا۔ آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''ابھی اقصیٰ کو بلا کر پوچھوں تو پتا چلے، تم نے کیا کچھ کھا لیا ہے۔''

''نہیں، پکی بات ہے، صرف زید کے ساتھ تھوڑا سا کیک کھایا ہے۔''

اور اس ٹڈے کو جانے کیسے بھنک پڑی کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ وہاں آ گیا۔

''جنت جی!'' فارس اور اس کے درمیان زبردستی گھس کر کھڑا ہو گیا۔

''تمہارا فیانسی اپنی فٹنس کا بالکل خیال نہیں رکھتا۔'' اس نے برہمی کا اظہار کر کے تبصرہ کیا۔ جنت نے اسے کہنی دے ماری۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں گھوری دی کہ بچے کے احساسات کا خیال کر لو۔

''انہوں نے کیا کہا ہے ابھی؟'' زید کی شکی گھوریاں۔

''کہہ رہے ہیں، آپ بہت اچھے لگ رہے ہو۔''

''میں نے یہ کب کہا؟'' وہ بھنا گیا۔ جنت نے چہرہ موڑ کر اسے گھورا۔

''تم بچوں کے ساتھ بالکل بچے ہی بن جاتے ہو۔''

''تم مجھے الزام دے رہی ہو؟ اس پانڈا کو دیکھا ہے۔'' ہاتھ سے زید کی جانب اشارہ کیا۔ اور زید جو اپنی سالگرہ کی مناسبت سے سچ مچ میں ایک پانڈا کے گیٹ اپ میں تھا، کھڑا رہ گیا۔ پھر لڑنے مرنے کو آگے بڑھا مگر جنت نے اسے بیچ راستے میں روک لیا۔

''چھوڑو انہیں، یہ تو ہیں ہی ایسے۔ آپ تو اتنے کیوٹ، اتنے پیارے لگ رہے ہو۔ اور پانڈا تو ہے ہی میرا فیورٹ۔''

زید کے ننھے سے دل کو ذرا تسلی ہوئی، ناک سکیڑ کر فارس کو جلتی سلگتی نگاہوں سے دیکھا۔اس کے بابا بھی وہیں آ گئے۔

''مبارک ہو آپ کو۔'' فارس نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

جنت کے ممکنہ سسر قہقہہ لگا کر ہنسے۔''سچ میں تم نے سب مس کر دیا! بہت انجوائے کیا ہم نے۔''

''جنت جی یہاں سے چلیں نا۔'' زید اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچے جا رہا تھا۔

''آپ کو اپنے بیٹے کی سکیورٹی اب دگنی کر دینی چاہیے۔'' اس نے مشورہ دیا۔وہ زور سے ہنسے۔

''دل بڑا کرو یار۔'' پشت تھپتھپا کر تسلی دی۔''اب بچوں کی خوشی تھی۔کیا کر سکتے ہیں۔'' وہ بڑے موڈ میں تھے۔''آؤ بیٹھو۔''

''نہیں، اب چلتے ہیں، ہاسپٹل جانا ہے، چار بجے کا اپائنٹمنٹ ہے پھر کبھی وقت نکال کر آؤں گا۔'' وہ ان سے بات کرتے ہوئے باہر چلا گیا تھا۔

جنت مسز شیرازی کے پاس آ گئی۔اپنا پرس اٹھایا۔مسز آفاق سے اجازت لی۔زویا کو پیار کیا اور زید سے چھپ چھپا کر بڑی مشکل سے باہر آئی تو فارس گاڑی میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔

زید اس کے پیچھے پیچھے باہر آ گیا۔پہلے تو اس نے اس بات پر شور مچایا کہ وہ اتنی جلدی کیوں جا رہی ہے اور جب جنت نے ہاسپٹل جانے کا بتایا تو کچھ نرم پڑا۔

''میں کل اسکول کے بعد آپ سے ملنے آؤں گا، پھول بھی لاؤں گا۔''

اسٹیرنگ وہیل پر گرفت جمائے فارس نے تپ کر اسے دیکھا۔جنت پسنجر سیٹ پر بیٹھی تھی اور وہ دروازہ بند نہیں کرنے دے رہا تھا۔

''ہاں ٹھیک ہے، ضرور آنا۔میں آپ کا انتظار کروں گی۔کارز سے کھیلیں گے۔ڈرائنگ بنائیں گے۔اور اسٹوریز بھی پڑھیں گے۔'' وہ اسے بہت پیار سے بہلا رہی تھی۔

''اور آپ اپنی رنگ کا بہت خیال رکھنا۔ان کو بالکل مت دینا۔'' اشارہ فارس کی طرف تھا۔ہاں اس کا تو جیسے اب یہی کام رہ گیا ہے، پلاسٹک کی انگوٹھیاں چوری کرنا۔وہ جبڑے بھینچ کر بیٹھ گیا۔

''ہاں ہاں ضرور۔کسی کو نہیں دوں گی۔سنبھال کر رکھوں گی۔''

''سنبھال کر مت رکھیے گا۔آپ پہنی رہیں۔اگر سیل ختم ہو جائیں تو میں نئے لا دوں گا۔اور اگر انہوں نے (چھوٹے سے ہاتھ سے فارس کی طرف اشارہ کیا) کچھ کہا تو مجھے بتایئے گا۔''

اقصیٰ جانے کہاں سے گزر رہی تھی کہ نظر گیٹ پر پڑی اور بھاگی بھاگی چلی آئی۔زید کو پکڑ کر پیچھے ہٹایا۔''آپ کو آپ کی مما بلا

رہی ہیں۔جلدی سے جائیں۔زویا نے گفٹ کھول لیا ہے۔''

''اللہ حافظ جنت جی۔'' وہ بڑے سوبر طریقے سے ہاتھ ہلا کر پیچھے ہٹا۔اقصیٰ نے فوراً سے آگے بڑھ کر دروازہ بند کیا۔اور اسے اپنے ساتھ لے گئی۔

جنت بڑی فرصت سے اس کی طرف مڑی۔وہ پیشانی پر بل ڈالے بیٹھا تھا۔

''تو......'' اس نے کہا۔

''تو یہ کہ منگنی توڑ دو۔'' سیدھا سیدھا حکم صادر ہوا۔

وہ ہنسنے لگی۔''تم جیلس ہو رہے ہو؟''

''میں بھلا کیوں جیلس ہونے لگا؟'' وہ چڑ گیا۔

''وہی تو میں پوچھ رہی ہوں۔تم ایک بچے سے کیوں جیلس ہو رہے ہو؟'' اس کے تاثرات سے حظ اٹھایا۔

''بچہ......؟ حرکتیں دیکھی ہیں اس کی؟ اس عمر میں منگنی کا خواب دیکھ رہا ہے۔''

''دیکھیے مسٹر فارس! میں برداشت نہیں کر سکتی کوئی میرے فیانسی کے بارے میں ایسی بات کرے۔''

''ہاں ہاں، جانتا ہوں۔تمہارا دل، گردہ، جان سب کچھ ہے وہ......'' فارس نے سلگ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔وہ آنکھوں میں شرارت اور لبوں پر مسکراہٹ لیے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔جانے دل میں سرور کی کیفیت کیوں تھی؟ اس لیے کہ فارس اس کے کہنے پر وہاں آ گیا تھا؟ یا پھر اس لیے کہ اس کے تاثرات بھی زید سے مختلف نہ تھے؟'' وہ سوچ کر مسکراتی رہی۔

ہاسپٹل میں چیک اپ کے بعد وہ اسے ریسٹوران لے آیا تھا۔مینو کارڈ ہاتھ میں لیے جنت نے اپنی من پسند ڈشز آرڈر کیں۔

اور جب وہ کھانا کھا رہی تھی تو وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ہلکی پھلکی سی گفتگو جاری تھی۔مسز شیرازی کی باتیں تھیں، سالگرہ پارٹی کے انتظامات پر تبصرہ تھا۔آئمہ کے یونیورسٹی کے چند ایک قصے تھے۔وہ سوال کرتا جا رہا تھا اور وہ بولتی جا رہی تھی۔معمول کے برعکس وہ اسے بہت خوش گوار موڈ میں لگی۔

کھانے کے بعد چائے منگوائی گئی۔اور اب وہ اپنا کپ ہاتھوں میں لیے بیٹھی تھی جب فارس نے جیب سے مخملیں باکس نکال کر اس کے آگے رکھا۔

چائے کا گھونٹ لیتے وہ یکا یک رک گئی تھی۔کپ اس نے میز پر رکھ دیا۔

''یہ میں نے لندن میں تمہارے لیے لیا تھا۔'' فارس نے کہا۔اسے اندازہ نہیں تھا، وہ اس گفٹ کا اب کیا کرنے والی تھی۔

شاید وہ گزری ہوئی چند ایک باتوں کا حوالہ دے کر غصہ اتارتی۔ یا شاید انکار کر دیتی۔ مگر اس نے کچھ بھی کہے بغیر مخملیں ڈبیہ کھولی۔

اندر سونے کا خوب صورت اور نفیس سا بریسلٹ رکھی تھی۔

ایک پھول۔ جس میں ننھا سا دل اور ٹرائینگل بنا تھا۔ پھول کے دونوں سروں پر گول نگینے تھے جو ایک باریک زنجیر سے جڑے ہوئے تھے۔

آنکھوں میں ہلکی سی ستائش لیے اس نے بریسلٹ اٹھالیا۔ اس کے تاثرات اور رویے سے اپنے اندر سکون کی سی کیفیت محسوس کرتے ہوئے فارس نے ہاتھ بڑھایا۔

''مے آئی؟'' اس نے جیسے اجازت چاہی۔

جنت نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بریسلٹ اس کے حوالے کر کے اپنا بایاں ہاتھ آگے کر دیا۔ ایک نظر اسے دیکھتے ہوئے بریسلٹ پہنایا۔ اس کی نازک کلائی پر وہ زنجیر سج گئی۔

''تھینکس۔'' اس نے کہا۔

''تمہیں پسند آیا؟''

''بہت......لیکن میرے فیانسی کی انگوٹھی زیادہ پیاری ہے۔'' وہ اسے چڑانے کو بولی۔

''لیکن میرا گفٹ زیادہ پائیدار ہے۔''

''زید نے مجھے یہ رنگ بہت دل سے دی ہے۔''

''زید کا دل بہت چھوٹا ہے۔ میرا دل بہت بڑا ہے۔''

اب وہ اسے یہ نہیں کہہ سکتی تھی اس کا دل بڑا نہیں تھا۔

''کتنا بڑا ہے؟''

وہ مسکرا کر رہ گیا۔

اسے خوشی تھی کہ جنت کمال نے اس کی طرف سے دیا جانے والا وہ پہلا تحفہ حق کی طرح وصول کیا تھا۔

☆☆☆

معمول کی طرح وہ فارس وجدان کے ساتھ جم میں موجود تھی۔ روزمرہ کے تمام ورک آؤٹ کرنے کے بعد تھکی ہاری سی ٹریڈمل پر کھڑی تھی اور عجلت میں قدم اٹھاتی بار بار ٹائم دیکھ رہی تھی۔ مڑ کر پیچھے دیکھا تو فارس موبائل فون سے لگائے بات کرتا ہوا نظر آیا۔ پشت اس کی طرف تھی۔ نچلا لب دانتوں تلے دبائے وہ بٹن آف کر کے اتر گئی۔ خیال تھا اسے پتا نہیں چلے گا مگر اسی وقت کال سے

فارغ ہوتے ہی وہ اچانک مڑا۔ پھر واچ بینڈ پر ٹائم دیکھتا اس کے پاس آ گیا۔

''تین منٹ باقی تھے۔''

''نہ۔نہیں تو......''

''دوبارہ کرو اور پورے پندرہ منٹ تک۔'' لہجے میں ذرا سی سختی تھی۔

''کیا؟'' وہ ایک دم سے چیخی۔

''یہ پہلے دن سے طے تھا کہ تم جب بھی کوئی ورک آؤٹ بیچ میں چھوڑ دو گی تو تمہیں سزا ملے گی۔''

''صرف تین منٹ باقی تھے۔'' وہ احتجاجاً چلائی مگر فارس نے سنی ان سنی کیے اسے دوبارہ ٹریڈمل پر کھڑا کر دیا۔

پندرہ منٹ تو جیسے اس کے لیے پندرہ گھنٹے ہو گئے۔ سزا ختم ہو گئی مگر غصہ ختم نہ ہوا۔ ناراضی ختم نہ ہوئی۔ وہ آفس چلا گیا تو سیدھا مسز شیرازی کے پاس پہنچ گئی۔

''صرف تین منٹ پہلے اتر گئی تھی میں آنٹی! صرف تین منٹ اور اس نے پندرہ منٹ بڑھا دیے۔'' مسز شیرازی کو خوب شکایت لگائی۔ بتاتے ہوئے رونا بھی آ رہا تھا۔ انہوں نے اس کے سامنے فون کر کے فارس کی کلاس لی۔

''ممی! وہ ورک آؤٹ کرتے ہوئے بالکل سیریس نہیں ہوتی۔''

اسپیکر آن تھا تو آواز اس نے بھی سنی۔ صدمے سے منہ کھلا۔

''جھوٹ کہہ رہا ہے یہ۔'' تڑپ کر دفاع کیا۔ ''میں اتنی محنت کرتی ہوں۔'' آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''یہ چاہتی ہے سب ہی ورک آؤٹ ایک منٹ میں کر کے فارغ ہو جائے۔ ممی کیا یہ پاسیبل ہے؟'' وہ کہہ رہا تھا۔

''اگر اس سے تین منٹ مس ہوئے تو تمہیں صرف تین منٹ ہی زیادہ لینے چاہیے تھے۔ تم نے میری بہو کو پورے تیس منٹ ٹریڈمل پر کھڑے رکھا۔ دس از ناٹ فیئر فارس!''

اب وہ موٹے موٹے آنسو آنکھوں میں بھر لائی تھی تو وہ فوراً ہی اس کی حمایت میں اتریں۔

''ممی! یہ اس کی پنیشمنٹ تھی! اب کیا میں اس سے یہ کہتا، دس دفعہ الف بے لکھ کر دکھاؤ؟'' وہ ان کی ڈانٹ سن کر نرمی سے بات کر رہا تھا۔ وہ لاجواب ہوئیں۔ پھر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ سر جھکائے وہ آنسوؤں کو پرے دھکیل رہی تھی۔ انہیں اس پر ترس آیا۔

''تم درگزر کر دیتے بیٹا۔''

''روز کرتا ہوں ممی۔ آپ اس سے پوچھیں۔ کل اس نے دس بار بائیسپس ورک آؤٹ کرنا تھا اور اس نے صرف چھ بار کیا۔ دو منٹ کی بریک ہوتی ہے یہ پورے پانچ منٹ لے لیتی ہے۔ روز مجھے اسے گھر کے کسی کونے سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر جم لے جانا پڑتا

ہے۔ پندرہ منٹ تو ایسے ضائع ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ اچھی طرح سے جانتی ہے، میرا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔''

اتنی ساری شکایتیں۔ جنت کو صدمہ ہوا۔ دکھ ہوا۔ سر جھکتا گیا۔ مسز شیرازی اسپیکر آن کرنے پر پچھتائیں۔

''خیر جو بھی ہے۔'' انہوں نے لہجہ سخت کیا۔ ''تمہیں میری بہو کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

دوسری طرف وہ خاموش ہوا۔

''فارس؟''

''ٹھیک ہے۔ میری بات کروائیں اس سے۔ آئندہ الف بے لکھوا لیا کروں گا۔ پھر نہ کہے سو دفعہ کیوں لکھوا رہا ہوں۔''

''آنٹی! اس کو دیکھیں۔'' چڑ کر سر اٹھایا۔ مسز شیرازی کے لیے مسکراہٹ دبانا مشکل ہو گیا۔

''فارس۔'' مصنوعی خفگی سے اس کا نام لیا۔

''اس سے کہیں مجھ سے بات نہ کرے اب کبھی۔'' وہ رونی صورت لیے اٹھ کر باہر نکل گئی۔ مسز شیرازی اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

اپنے کمرے میں جا کر اس نے آنکھیں رگڑ کر صاف کیں۔ پھر کپڑے بدل کر باہر آئی اور مسز شیرازی سے اجازت لے کر اقصیٰ کے ہمراہ پارک چلی گئی۔

فارس سے ناراض تھی تو نہ اس سے بات کر رہی تھی نہ اس کی کال ریسیو کر رہی تھی۔ کچھ وقت کھلی فضا میں بتانے کے بعد گھر کی طرف روانہ ہوئی تو سڑک کے عین کنارے اس کی گاڑی آ رکی۔

''تمہارا تو ایک ایک لمحہ قیمتی ہے نا۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' سلگ کر پوچھا۔ اقصیٰ پیچھے تھی۔ جنگلا عبور کر کے باہر آئی تو فارس کو دیکھ کر حیران ہوئی۔ اس کے صاحب۔ اس وقت یہاں؟

''بیٹھو۔'' فارس نے اس کے لیے پسنجر سیٹ کا دروازہ کھولا۔ اقصیٰ ساتھ تھی تو وہ ضبط کر کے بہت خاموشی سے بیٹھ گئی۔ موڈ بری طرح سے آف تھا۔

''اپنا خیال رکھیے گا آپی۔'' دروازہ بند کر کے اقصیٰ نے کہا۔ ہاتھ بھی ہلائے۔ گڈ لک اور تھمبز اپ بھی دکھائے۔

''کیوں تمہاری مالکن کے ٹو سر کرنے جا رہی ہے؟'' کھڑکی کا شیشہ نیچے کر کے فارس نے جھاڑا۔ اقصیٰ بے طرح سے گڑبڑائی۔

''نہیں...... وہ...... میں......''

''یہاں سے سیدھا گھر جاؤ۔'' تحکم سے کہا۔ وہ مؤدب سی شریف بچوں کی طرح ناک کی سیدھ میں روبوٹ کی طرح چلتی گئی۔ بھولے سے بھی مڑ کر نہ دیکھا۔

فارس نے گاڑی ریورس کی۔ جنت کھڑکی کی طرف رخ کیے چپ بیٹھی رہی۔ وہ بھی خاموش رہا۔

''ابھی تک ناراض ہو؟'' مین روڈ پر گاڑی ڈالتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

''بات مت کرو مجھ سے۔''

''مگر کیوں؟'' وہ دھیرے سے مسکرایا۔

''تم نے آنٹی کو میری اتنی شکایتیں لگائیں۔'' اصل غم یہ تھا۔

''تم بھی تو لگاتی ہو۔''

گڑبڑا کر اسے دیکھا۔ ''میری بات الگ ہے۔''

''تمہاری بات کیوں الگ ہے؟''

اپنا منہ بند کر کے اس نے اپنا رخ کھڑکی کی طرف کر لیا۔

''اچھا آئم سوری! آئندہ ان سے کچھ نہیں کہوں گا۔''

''تمہیں لگتا ہے، میں صرف اس بات پر ناراض ہوں کہ تم نے میری شکایتیں لگائیں؟''

''تو اور کس بات پر ناراض ہو؟''

''کیا تم نہیں جانتے؟'' صدمے سے، دکھ سے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''تم نے مجھے پچیس منٹ ٹریڈمل پر واک کروائی۔ تم نے......''

فارس نے گہری سانس لی۔ ''اب میں اس کے لیے سوری نہیں کر سکتا۔''

صاف کہہ دیا۔ چند لمحوں تک اسے سخت نظروں سے گھورتی رہی پھر اپنا رخ بدل گئی۔

''کیا بہت تھک گئی تھیں؟''

خاموشی......

''ٹھیک ہے۔ اس کے لیے بھی سوری۔ لیکن وعدہ کرو، آئندہ کوئی بھی منٹ مس نہیں کرو گی۔''

مکمل خاموشی......

''پیزا ہٹ چلیں؟'' مڑ کر پوچھا۔ لیکن وہ تو جیسے وہاں تھی ہی نہیں۔

''لونگ ڈرائیو کے بارے میں کیا خیال ہے؟ خوب باتیں کریں گے؟''

اس کا سر کھڑکی کی طرف ہی رہا۔ وہ اسے رج کے نظر انداز کر رہی تھی۔

"آئس کریم کھاؤ گی؟"

خاموشی۔وہ مین روڈ پر گاڑی ڈالے ہوئے تھا۔گہری سانس کھینچ کر موڑ کاٹنے لگا تو آواز آئی۔

"کھلا دو۔" ویسی ہی روٹھی ہوئی سی آواز۔اکھڑا ہوا سا انداز۔وہ مسکراہٹ ضبط کر گیا۔

"جو آپ کا حکم۔"

"لیکن گاڑی میں ہی کھائیں گے۔" اس نے کہہ دیا۔فارس نے سر ہلایا۔

گاڑی پارک کر کے وہ آئس کریم لینے چلا گیا۔کھڑکی کی طرف رخ کیا وہ اسے آئس کریم پارلر میں داخل ہوتا دیکھ سکتی تھی۔ایسے ہی خیالوں میں گم اس کی باتیں سوچ رہی تھی جب سامنے ایک سفید گاڑی آ رکی۔دروازہ کھول کر سفید ٹراؤزر پر سرخ رنگ کی شرٹ زیب تن کیے عدینہ زبیر باہر نکلی۔گلاسز اپنے بالوں میں اٹکاتے ہوئے پرس کندھے پر ڈالا اور موبائل کان سے لگائے ہنستے ہوئے عجلت میں قدم اٹھاتی اندر داخل ہو گئی۔

جنت کی سانسیں تھم گئیں۔دل رک گیا۔ایک دم سے خود پر طاری اس جمود کو توڑتے ہوئے وہ دروازہ کھول کر باہر نکلی۔حرکت غیر ارادی تھی۔اس کا رخ گلاس ڈور کی طرف تھا۔وہ جیسے عدینہ زبیر سے پہلے فارس وجدان تک پہنچ جانا چاہتی تھی۔

شیشے کی دیواروں سے اندر کا منظر نمایاں تھا۔اس کے قدم زمین پر جم گئے۔نگاہیں ایک ہی مقام پر ٹھہر گئیں۔

فارس وجدان کے ساتھ عدینہ زبیر موجود تھی۔اس کی نفیس انگلیوں کی گرفت فارس کے بازو پر۔اس کی دلفریب نگاہیں فارس کے چہرے پر تھیں۔منظر واضح ہو کر اگلے ہی پل دھندلا گیا۔وہ ایک دم سے پیچھے ہٹی۔خود پر قابو پاتی واپس پلٹی۔دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔مٹھیاں سختی سے بھنچ گئیں۔

ماہین اور برہان۔ذہن کے پردے پر کئی منظر لہرائے۔کئی باتیں یاد آئیں۔کئی خدشے۔کئی وسوسے۔کئی خوف سے لپٹے واہمے اس کے اندر سما گئے۔وہ اندر تک ہل گئی تھی۔

"میری زندگی میں کوئی عورت نہیں ہے۔"

اس نے گہری سانس لے کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔تین سے پانچ منٹ کا دورانیہ جو کہ بڑھتا گیا۔سات منٹ۔نو منٹ۔پندرہ منٹ۔عدینہ زبیر کی گاڑی سامنے ہی کھڑی رہی۔فارس وجدان باہر نہ آیا۔اس کا دم گھٹنے لگا۔اسے وحشت سی ہونے لگی۔

یکا یک شیشے پر دستک ہوئی۔اس نے چونک کر سر اٹھایا۔فارس نے شیشہ کھولنے کا اشارہ کیا تھا۔اس نے کپکپاتی انگلیوں سے دروازہ کھول دیا۔

"سوری، تھوڑا لیٹ ہو گیا۔" کہہ کر دونوں کپ اس کی طرف بڑھائے جو بغیر کسی تردد کے اس نے لے لیے۔لمحے بھر کے لیے اس کا چہرہ دیکھ کر وہ چونکا تھا۔پھر گھوم کر سیٹ پر آ بیٹھا۔

"تمہیں کیا ہوا؟" پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"کچھ نہیں۔" کور اتار کر اس نے چمچ نکال لیا۔

"طبیعت ٹھیک ہے؟"

"ہاں۔" وہ کہہ کر آئس کریم کھانے لگی۔اس نے چند لمحوں تک اسے دیکھا پھر اپنی آئس کریم گلاس اسٹینڈ پر رکھ دی۔گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے وہ چھوٹے چھوٹے چمچ خود بھی لے رہا تھا۔

گاڑی میں پہلے صرف خاموشی تھی۔مگر اب تو جیسے سناٹا سا اتر آیا تھا۔

"گھر چلیں۔" وہ کہہ رہی تھی۔فارس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔آج کے دن کے لیے اس کے پاس بہت سے پلانز تھے۔مگر......

"میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔" وہ اب کہہ رہی تھی۔

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گاڑی کا رخ گھر کی طرف موڑ دیا تھا۔

☆☆☆

"بات سن رشیداں۔"

شام میں فرصت ملتے ہی روبی اس کے گھر پہنچ گئی تھی۔دو بار خط لکھ کر اس کے ذریعے بھجوا چکی تھی اور ان دو ماہ میں تا حال کوئی رسپانس نہیں آیا تھا۔فون نمبر کمپنی کا تھا سو ڈائرکٹ بچے کے چچا سے بات نہیں ہو سکتی تھی۔اب اس نے تیسری بار خط لکھا تھا۔کافی ساری سورتیں، دعائیں پڑھ کر پھونکا کہ یہ خط کسی طرح بچے کے چچا کو مل جائے۔مگر رشیداں نے اب کے صاف منع کر دیا۔

"نا بھئی نا" اس نے ہاتھ اٹھایا۔"اپنے گھر والے سے کٹ نہیں کھانی مجھے۔دوبارہ وہ تیرا خط دے آیا ہے۔اب کہوں گی تو چٹیا سے پکڑ لے گا۔"

"بس یہ آخری بار۔دیکھ تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔"

رشیداں نے زچ ہو کر اسے دیکھا۔

"تو یہ کیا پرائے پھڈوں میں ٹانگ اڑائے جا رہی ہے۔عقل مانتی ہے کہ اس کے چچا کو بالکل اس کی خبر نہیں ہو گی؟"

روبی لاجواب ہو گئی۔

''ہوسکتا ہے، اسے تیرے خط مل رہے ہوں اور وہ پھر بھی نہ آنا چاہتا ہو؟''

''میں مان ہی نہیں سکتی، میرا خط پڑھ کر کسی کو احساس نہیں ہوگا۔'' وہ روہانسی ہوئی۔

''دیکھ۔'' رشیداں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''یہ جن کے گھر میں یہ بچہ رہ رہا ہے، یہ اس کے رشتہ دار ہیں۔ یہ جو پیسے کھا رہا ہے، یہ اس کا سگا ماموں ہے۔ جس نے یہاں اسے چھوڑ رکھا ہے وہ اس کی سگی ماں ہے۔ اور جو پیسے بھیج کر سمجھ رہا ہے ذمہ داری پوری کر دی۔ وہ اس کا سگا چچا ہے۔ اب تو بتا مجھے۔ کس کس سے لڑے گی؟ کس کس میں احساس جگائے گی؟ جب ماں ہی بے حس ہے تو اور کون احساس کرے گا۔''

''میں کر رہی ہوں نا احساس۔''

اور یہاں رشیداں لاجواب ہوگئی۔

''وہ اتنا چھوٹا سا ہے رشیداں، میرا تو اسے دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اس کو تو کچھ پتا بھی نہیں ہے اس کے ساتھ کتنا ظلم ہو رہا ہے، نوکروں سے بھی بدتر زندگی ہے اس کی۔''

رشیداں ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئی۔ اس لڑکی کو سمجھانا فضول تھا۔ خط دے کر وہ گھر آ گئی۔ ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ تین خط تین کوششیں۔ اب کے اس نے سوچ لیا جواب نہ ملا تو وہ بچے کو اٹھائے خود اسلام آباد اس کے چچا کے پاس چلی جائے گی۔ مگر یہ منصوبہ زیادہ خطرناک تھا۔ ناکامی کے چانسز زیادہ تھے۔ بچے کے ساتھ اس گھر سے غائب ہونے پر زیادہ مشکلات پیش آ سکتی تھیں۔ اغوا اور چوری کا الزام لگ سکتا تھا۔ اس کی ماں کے لیے مسئلہ ہو سکتا تھا۔

اور پھر اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہ تھی کہ چچا بچے کو قبول کرلے گا۔ عین ممکن ہے وہ اسے واپس یہیں بھجوا دے؟ کیا خبر رشیداں سچ ہی کہتی ہو؟ چچا نے جان بوجھ کر اس معصوم بچے کو یہاں چھوڑ رکھا ہو۔

جوش سے سوچتے سوچتے وہ ہوش میں آ گئی۔

''اللہ سوہنا کوئی تو حل ہو! بس کسی طرح یہ خط مل جائے۔ اس گھر کے مالک کو مل جائے۔ مالکن کو مل جائے۔ کسی کو تو مل جائے۔ کوئی تو اس کے لیے آجائے۔''

اس نے صدق دل سے دعا کی تھی۔ اور اس کی یہ دعا قبول کر لی گئی تھی۔

☆☆☆

سرد ہوا کا جھونکا سرسرا کر گزرا تھا۔ وہ درختوں کی چھاؤں میں بنچ پر بیٹھی تھی۔ سامنے ہی ٹریک پر اسے ہر عمر کے لوگ نظر آ رہے تھے۔ اقصیٰ بھی یہیں کہیں ٹہل رہی تھی۔ گہری سانس لے کر اس نے سر اٹھایا۔ موبائل پر نوٹیفیکیشن موصول ہوا تو اس نے کھول کر

دیکھا۔

اپنی آفس چیئر پر براجمان ہو کر فارس نے اپنی تصویر بھیجی تھی۔ چہرہ متبسم تھا۔ جنت کے لبوں پر بھی مسکراہٹ آگئی۔

''اب طبیعت کیسی ہے تمہاری؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''کچھ بہتر ہوں۔ اقصیٰ کے ساتھ پارک میں ہوں۔'' اس نے جواب لکھا۔

''تمہیں آرام کرنا چاہیے تھا۔'' فوراً ہی جواب آیا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ لکھتی۔ اس کے اور دھوپ کے درمیان جیسے ایک سایہ سا آ گیا۔ اس نے بے ساختہ سر اٹھایا اور اگلے ہی پل اپنی جگہ تھم گئی۔ موبائل سکرین پر فارس کے میسج ابھی بھی آ رہے تھے۔ وہ اسکرین پر نہیں دیکھ رہی تھی۔ مگر میسج دیکھے جا چکے تھے۔ آس پاس دور دور تک ہر ایک شے پر جیسے ایک جمود سا طاری ہوا تھا۔

عدینہ زبیر اس کے سامنے کھڑی تھی۔

برانڈڈ ٹریک سوٹ میں ملبوس، اونچی پونی ٹیل بنائے، متناسب سراپے میں ہر ایک کی مرکز نگاہ بنتی عدینہ زبیر اس کے سامنے تھی۔ پانی کی بوتل سے چند گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے چھوٹے رومال سے اپنا پسینہ صاف کیا اور پھر ایک دل فریب مسکراہٹ لبوں پر سجائے اس کے پاس آ گئی۔

سرتاپیر ایک جائزے ہی میں وہ اس کے وجود میں پنپتی ایک نئی زندگی کا اندازہ لگا چکی تھی۔ مگر اس کی آنکھوں کی وہ الوہی اور فاتحانہ سی چمک ایک لمحے کے لیے بھی ماند نہیں پڑی تھی۔ ایک تضحیک آمیز نظر اس پر ڈالتے ہوئے اس نے رومال سے اپنی گردن کو تھپتھپایا تھا۔

''سو یو آر ایکسپیکٹنگ آ بے بی! میں بھی کہوں فارس ہماری شادی کو ڈیلے کیوں کر رہا ہے۔''

قرب و جوار میں دھماکا کیسے ہوتا ہے۔ اور پھر اس دھماکے سے وجود کے پرخچے کیسے اڑتے ہیں یہ جنت کمال نے اس لمحے جانا تھا۔

''اس نے مجھ سے کہا، کچھ مہینے انتظار کرلو۔ مگر وجہ نہیں بتائی۔ تو وجہ یہ ہے۔'' ہاتھ سے اشارہ کیا۔ پھر استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

''کیا تمہیں لگتا ہے اس کے بچے کی ماں بن کر تم اس کے دل تک رسائی حاصل کر سکو گی؟ یا پھر ہم دونوں کے درمیان آ سکو گی؟''

جنت کا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔ سانسیں بھاری ہونے لگیں۔ وہ آگ تھی جو لفظوں کی صورت وجود میں اتری تھی اور اسے راکھ کرنے لگی تھی۔

''یونو واٹ!''اس کی طرف جھک کر اس نے جنت کے دوپٹے پر لگی بیل کو انگلیوں سے چھوا۔''تمہارے خوابوں کا محل تمہاری اوقات سے بہت اونچا ہے۔صرف میرے ایک قدم اٹھانے کی دیر ہے۔اور سب چکنا چور ہو جائے گا۔''فاتحانہ مسکراہٹ لبوں پر سجائے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر بولی۔

''فارس بھی میرا ہے۔گھر بھی میرا ہے۔اور جگہ بھی میری ہے۔''لہجے میں سختی،آنکھوں میں عداوت لیے خطرناک تیوروں کے ساتھ اپنی پوزیشن اپنے ارادے،اس نے جنت کمال پر واضح کر دیے۔

سر جھٹک کر جاگنگ ٹریک کی طرف جانے لگی تو پتھر کا مجسمہ ہوتی جنت کمال خود کو توڑ کر اٹھی۔اس نے عدینہ زبیر کا بازو سختی سے پکڑ کر اسے جھٹکے سے روکا تھا۔

''ہاؤ ڈیئر یو!''اپنا بازو چھڑا کر اس نے انتہائی غصے کے عالم میں کہا۔

جنت کی آنکھوں میں خون اترا تھا۔تاثرات پتھریلے ہو رہے تھے۔

''آئندہ میرے شوہر کا نام اس طرح سے لیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

عدینہ زبیر لمحے بھر کے لیے صدمے سے گنگ ہوئی۔وجود شعلوں کی زد میں آ گیا۔اندر باہر ہر طرف آگ جلنے لگی۔اس آگ کی زد میں جنت بھی آنے لگی۔

''تمہارا شوہر؟ کسے بے وقوف بنا رہی ہو تم؟''لہجے میں آگ کی چنگاری لیے انتہائی حقارت سے پوچھا۔''جانتی ہو میں کون ہوں؟عدینہ زبیر ہوں میں۔فارس وجدان کی پہلی اور آخری محبت۔اس نے میری جگہ کبھی کسی کو نہیں دی۔صرف اس بچے کی وجہ سے وہ تمہیں اپنے ساتھ رکھے ہوئے ہے ورنہ تمہیں تو وہ کب کا گھر سے نکال چکا ہوتا۔''اس کی زبان زہر اگل رہی تھی۔

''چند دن لندن میں کیا گزار لیے،تمہارا تو دماغ ہی ساتویں آسمان پر پہنچ گیا ہے۔سمجھ رہی ہو تم نے اسے پا لیا؟''

جنت کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔قدم بے جان ہونے لگے۔

''پریگننٹ ہو،اس لیے ابھی تک اس گھر میں ہو۔ورنہ اب تک وہ تم سے اپنی جان چھڑا چکا ہوتا۔''سختی سے کہہ کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔پھر انتہائی غصے سے اسے جھٹکا۔''حد میں رہو۔''انگلی اٹھا کر وارن کیا۔''جو میرا ہے۔وہ میرا ہی ہے۔تم ہمارے درمیان آئی ہو۔تم ہی ہمارے درمیان سے جاؤ گی۔خطرناک تیوروں کے ساتھ کہہ کر وہ جانے کے لیے مڑ گئی۔

جنت لڑکھڑا کر پیچھے ہوئی۔بنچ کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔پلکیں جھپکا کر سامنے دیکھا۔عدینہ زبیر نے اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔وہ بھاگتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔مگر اسے وہ اپنے آس پاس،اپنی زندگی میں،اپنے گھر میں۔حتیٰ کہ بیڈروم میں بھی نظر آ رہی تھی۔

''یہ لیں آپ کا جوس۔''اقصیٰ نے اس کی طرف اسٹرابری جوس کا گلاس بڑھایا اور اگلے ہی پل اس کے تاثرات دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

''آپی!آپ ٹھیک ہیں؟''

اس نے پوچھا۔مگر جنت نے نہیں سنا۔وہ سر اٹھائے گہری سانسیں لے رہی تھی۔موبائل پہلو میں پڑا تھا۔میسجز ابھی بھی آ رہے تھے۔اس نے موبائل اٹھا لیا۔

''میں بس ابھی آفس سے نکلنے لگا ہوں۔گھر چلی جاؤ تو بتا دینا ورنہ میں تمہیں پارک سے پک کر لیتا ہوں۔کہیں جانا ہے۔''

اسے سنبھلنے میں کچھ وقت لگا۔''پارک میں ہوں۔''اس نے کپکپاتی انگلیوں سے میسج ٹائپ کیا۔اقصیٰ نیچے بیٹھ گئی۔

''گھر چلیں آپی!مجھے لگتا ہے آپ کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔''

مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں اٹھی۔پندرہ منٹ بعد فارس نے اسے پارک سے ہی پک کر لیا تھا۔اپنے تاثرات پر قابو پائے وہ خود کو کسی حد تک سنبھالے ہوئے تھی۔اپنی آنکھوں میں ابھرتی نمی کو پیچھے دھکیلتی سامنے دیکھ رہی تھی۔

وہ اب اس سے باتیں کر رہا تھا۔وہ اسے سن رہی تھی مگر سمجھ نہیں رہی تھی۔کچھ کہہ بھی نہیں رہی تھی۔وہ اس کی خاموشی کو طبیعت خرابی پہ محمول کر رہا تھا۔کل سے اس کی طبیعت نڈھال تھی۔وہ ابھی بھی یہی سمجھ رہا تھا۔

دس منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ ایک بنگلہ نما گھر کے پورچ میں گاڑی روک چکا تھا۔وہ اس کے ساتھ ہی باہر نکلی۔ذہن کہیں اور تھا،سوچ کہیں اور تھی۔شاید وہ اسے کسی سے ملوانے لایا تھا۔اس نے خالی الذہنی کے عالم میں سوچا۔لان سے گزر کر صدر دروازے تک بالکل خاموشی تھی۔اندر داخل ہوتے ہی اس نے ایک کھوئی کھوئی سی نگاہ اطراف میں دوڑائی۔

''کیسا ہے؟''اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے وہ پوچھ رہا تھا۔

''کیا؟''اس کی آواز مدھم تھی۔

''یہ گھر۔''

''ٹھیک ہے۔''اس کا انداز،اس کا لہجہ،اس کی آنکھیں۔فارس کو لگا،وہ اس کے ساتھ یہاں کہیں نہیں ہے۔

''صرف ٹھیک ہے؟''

''اور کیا کہوں؟''سر اٹھا کر پوچھا۔

''تمہیں مجھے بتانا چاہیے،پسند آیا یا نہیں۔''

''اس سے کیا ہوگا؟''

''میں اپنے لائیر سے بات کروں گا۔ملکیت کے ڈاکومنٹس تیار ہوں گے۔ یہ گھر تمہارے نام ہوجائے گا۔''

صدمے سے گنگ اس نے فارس کو دیکھا۔سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔فارس یہ کیا کہہ رہا تھا؟ کیوں کہہ رہا تھا؟ قدم جکڑے گئے۔اندر تک سب ہل گیا۔

''تمہارے لیے ڈرائیور میڈ، کا بھی انتظام ہوجائے گا۔ ہر مہینے تمہارے اکاؤنٹ میں رقم بھی ٹرانسفر کردیا کروں گا۔''

وہ جیسے انگلی پر سب گن کر واضح کررہا تھا۔اور جنت صدمے سے پتھر ہوئی کھڑی تھی۔کیفیت ایسی تھی جیسے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی گئی ہو۔اس کے حواس شل، ذہن ماؤف، قدم بے جان ہونے لگے۔کیا عدینہ زبیر درست کہہ رہی تھی؟ فارس وجدان اسے بے وقوف بنارہا تھا؟ اس کے جذبات سے کھیل رہا تھا؟

''فارس بھی میرا ہے۔گھر بھی میرا ہے۔اور جگہ بھی میری ہے۔''

فارس اب کچھ کہہ رہا تھا مگر وہ اسے سن نہیں رہی تھی۔وہ جیسے اپنے آپ میں، اپنے طوفانوں میں گم ہورہی تھی۔اس کی آنکھوں کے کنارے نم ہوچکے تھے،اس کے تاثرات میں ایک دم سے ویرانی اتر آئی تھی۔اس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ رہی تھیں۔

''مجھے گھر جانا ہے۔''اس کی آواز کپکپائی۔چہرہ مکمل سفید پڑچکا تھا۔

''جنت۔''

''پلیز، مجھے گھر جانا ہے۔''اس نے روتے ہوئے کہا۔سر بری طرح سے چکرا رہا تھا۔''مجھے آنٹی کے پاس جانا ہے۔''

''کیا ہوگیا ہے؟ میری طرف دیکھو۔'' کندھوں سے تھام کر اس کا رخ اپنی طرف کیا۔اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا بڑھ گیا۔ٹانگیں بے جان ہوگئیں۔

گاڑی میں بیٹھنے تک، اور پھر ہاسپٹل پہنچنے تک اسے سب یاد تھا۔اس کے بعد جیسے سب مبہم، سب دھندلا ہوگیا تھا۔

اسے جب ٹریٹمنٹ دی جارہی تھی تب بھی وہ روتے ہوئے مسز شیرازی کے پاس جانے کا کہہ رہی تھی۔اور پھر جیسے ایک دم سے سب ساکن ہوگیا تھا۔درد بھی، اذیت بھی۔وحشت بھی اور خوف بھی۔

وہ کتنی دیر تک دواؤں کے زیراثر رہی اسے اندازہ نہیں تھا مگر جب ہوش آیا تو سر تب بھی بری طرح سے دکھ رہا تھا۔کمرے کی مدھم سی روشنی بھی آنکھوں کو تکلیف پہنچارہی تھی۔اور جسم میں تو جیسے جان ہی نہیں تھی۔

اس نے اٹھنا چاہا تو فارس نے فوراً سے ہاتھ پکڑ کر روک دیا۔اسے سہارا دے کر سر کے نیچے تکیے رکھے تاکہ وہ نیم دراز پوزیشن میں آسکے۔خود اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

مدھم سی زرد کار روشنی میں وہ اس کی آنکھوں میں تشویش دیکھ سکتی تھی۔اسے پورا واقعہ یاد آیا تو آنکھیں پھر سے نم ہونے لگیں۔نہ

چاہتے ہوئے بھی وہ اذیت میں گھر گئی۔پھر سے رو پڑی۔

''صبح تک تم بالکل ٹھیک تھیں۔پھر اچانک کیا ہوا؟'' وہ از حد پریشان اور فکرمند لگ رہا تھا۔مگر اب وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔اس کی بات کا جواب بھی نہیں دے رہی تھی۔

اعصاب منتشر تھے، چہرہ آنسوؤں سے تر۔اذیت انگ انگ سے عیاں ہورہی تھی۔

''کیا ہوا ہے؟ کس بات کا اتنا اسٹریس لے رہی ہو؟'' نرمی سے گال پر ہاتھ رکھا تو اس نے سر اٹھایا۔چہرہ سفید، آنسوؤں سے لبریز آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔

''عدینہ۔''اس کے لب ہلے۔''اس نے کہا۔تم اس کے ساتھ اپنی شادی کو اس لیے ڈیلے کررہے ہو۔کیونکہ میں پریگننٹ ہوں۔جبکہ تم مجھے کہہ رہے تھے۔تمہاری زندگی میں کوئی عورت نہیں۔تم نے جھوٹ کہا......تم......''اس کی آواز کپکپارہی تھی۔آنسو بہتے جارہے تھے۔

فارس وجدان لمحے بھر کے لیے جیسے سکتے میں آگیا تھا۔

''میں نے تمہیں اجازت دی تھی۔کیا نہیں دی تھی؟'' روتے ہوئے پوچھا۔''میں نے کہا تھا جب چاہو۔جسے چاہو، اپنی زندگی میں شامل کرلو میں کبھی رکاوٹ نہیں بنوں گی۔کیا نہیں کہا تھا؟ پھر تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟ مجھے خواب کیوں دکھائے؟ مجھ سے یہ کیوں کہا، تمہاری زندگی میں میرے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔''

وہ شدت سے روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

☆☆

فارس کچھ صدمے اور بے یقینی سے جنت کمال کو دیکھ کر رہ گیا تھا۔جنت یہ کیا کہہ رہی تھی؟ شک اور بدگمانیوں میں وہ پہلے بھی الجھتی تھی مگر ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔

''تم سے کوئی کچھ بھی کہتا ہے اور تم......تم یقین کرلیتی ہو؟'' وہ تاسف بھری نگاہوں اسے دیکھ کر رہ گیا۔جنت کی آنکھیں پھر سے نم ہونے لگیں۔

''اس نے کہا۔''

وہ بات ادھوری چھوڑ کر سسک پڑی۔جیسے لفظوں کو دہرانا بھی کسی گہرے صدمے، کسی گہری اذیت سے کم نہیں تھا۔مگر وہ بتاتی گئی۔اس کی ایک ایک بات، اپنا ایک ایک درد، ایک ایک غم۔ایک ایک خوف۔

فارس خاموشی سے سنتے ہوئے اندر ہی اندر شدید اشتعال کی لپیٹ میں آتا گیا۔تاہم وہ متحمل رہا۔اس وقت جنت کو سنبھالنا

اوراس کیفیت سے نکالنا ازحد ضروری تھا۔

وہ خاموش ہوئی تو اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا

''تم نے خود کہہ دیا، اجازت دے چکی ہو کہ میں جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ کسی سے بھی دوسری تیسری شادی رچا سکتا ہوں۔'' وہ بولا تو آواز گمبھیر اور لہجہ دھیما تھا۔ ''لیکن میں نہیں کر رہا۔ کیوں؟ کیا میں مجبور ہوں؟ کیا مجھے ممی کا خوف ہے؟ کیا اپنے بچے کے حوالے سے تمہاری صحت کی فکر ہے؟ کیا میں انتظار کر رہا ہوں کہ بچے کی پیدائش کے بعد ہی کسی کو زندگی میں شامل کروں گا؟ اگر میں اتنا ہی بے حس ہوں تو مجھے تو انتظار بھی نہیں کرنا چاہیے۔ کیا غلط کہہ رہا ہوں؟''

اس نے رک پوچھا۔ جنت لب کاٹ کر رہ گئی۔ آنسو ہنوز بہتے جا رہے تھے۔

''عدینہ نے کہا۔ تم اسے واپس لانا چاہتے ہو۔'' وہ سسک پڑی۔

''کیا یہ بات میں نے تم سے کہی ہے؟'' فارس نے نرمی سے اس کی بات کاٹی۔ اس کا سر نفی میں ہلا۔

''تو پھر کسی دوسرے تیسرے انسان کی بات میرے دعوے سے زیادہ قابل اعتبار کیسے ہو سکتی ہے تمہارے لیے؟''

''کیونکہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔''

فارس اپنی جگہ تھم گیا۔

''تم اس کی وجہ سے مجھے طلاق دینا چاہتے تھے۔ تم نفرت کرتے تھے مجھ سے۔ تم نے کہا تھا تمہیں اگر لائف پارٹنر چاہیے ہوتا تو وہ میں نہ ہوتی۔ تم نے مجھے ریجیکٹ کیا تھا۔'' اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ ''یہ سب عدینہ کی وجہ سے تھا۔''

فارس کے زخم تازہ ہوئے، درد پھر سے جاگ اٹھا۔ اس نے آنکھوں میں کرب لیے جنت کمال کو دیکھا۔ وہ بے اعتباری کی اسی گھاٹی میں جا کھڑی ہوئی تھی جس سے وہ اسے کس قدر کوشش سے نکال لایا تھا۔ وہ پھر سے ٹوٹ رہی تھی۔ پھر سے فنا ہو رہی تھی۔

لب بھینچ کر اس نے اپنے اندر کے اضطراب پر قابو پانے کی کوشش کی۔ شور بہت اچانک سے اٹھا تھا۔ چہرے گڈمڈ ہونے لگے تھے۔ جنت کی آواز کہیں پیچھے رہ گئی تھی۔

اس نے پلکیں جھپکا کر ان مناظر کو جھٹکا جو آنکھوں میں اتر آئے تھے۔ ایک بار پھر سر اٹھا کر جنت کو دیکھا تھا۔ وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ روتے ہوئے بس اپنی کہے جا رہی تھی۔

''تم......تم عدینہ سے شادی کر لو گے۔ ہمارے بچے کو مجھ سے لے کر طلاق دے دو گے۔ تم ہر کام پلاننگ کے ساتھ کرتے ہو۔ سوچ سمجھ کر۔ اپنا فائدہ نقصان دیکھتے ہو ہر معاملے میں۔'' اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا، آواز کپکپا رہی تھی۔ ''اب بھی اگر......'' اس نے سر اٹھا کر متوحش نگاہوں سے فارس کو دیکھا۔ ''اب بھی اگر کچھ ایسا سوچ رہے ہو۔ اگر اب بھی۔ فارس میں تو مر جاؤں گی۔''

وہ ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ''میں واقعی مر جاؤں گی۔''

فارس کچھ صدمے سے اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔ یہ خوف کی کون سی کیفیت تھی جو جنت کمال پر طاری ہوئی تھی۔ یہ وحشت کا کون سا احساس تھا جو اس کے وجود پر حاوی ہوا تھا؟ اس کے حواس مختل کیوں ہو رہے تھے؟ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کیوں ہو رہی تھی؟

اس کے اندر کچھ کھو دینے کا احساس ایک دم سے بیدار ہوا۔ بے اختیار جنت کمال کو بازوؤں کے حصار میں لے کر خود سے لگا لیا۔

''ہے، ریلیکس۔ کیا ہو گیا ہے؟'' لہجے میں فکر تھی۔ درد تھا۔ محبت تھی مگر وہ چپ نہیں ہوئی۔

خود سے الگ کر کے، اسے کندھوں سے تھام کر فارس نے اس کی روتی ویران آنکھوں میں دیکھا۔ کتنا درد، صدمہ اور بے اعتباری تھی ان میں۔

''میری طرف دیکھو۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ اس نے ذرا سی نظر اٹھائی تھی۔ شہد آنکھوں میں سرخی اتری ہوئی تھی۔ لب کپکپا رہے تھے۔ گال آنسوؤں سے تر تھے۔

''تمہارے ساتھ شادی، ریلیشن۔ ہمارا بچہ۔ یہ زندگی میری پلاننگ کا حصہ کبھی نہیں تھی۔'' اس نے کہا۔

جنت روتے ہوئے لمحے بھر کے لیے سکتے میں آئی تھی۔ منجمد ہوتے احساسات ایک دم سے پگھلے تھے۔ اندر کا شور سناٹے میں بدلا تھا۔

فارس اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔

''تم گھر چھوڑ کر گئیں تو میں نے تمہیں ڈھونڈا۔ تمہیں لگتا ہے میں نے ایسا کسی مجبوری یا دباؤ میں آ کر کیا ہو گا؟ ایسا کون سا مفاد تھا جو میں تم سے اٹھا سکتا تھا۔ یا اس معاملے میں میری کون سی پلاننگ ہو سکتی تھی؟ طلاق تو ایسے بھی دی جا سکتی تھی۔ میں سائرہ خالہ کو پیپرز بھجوا دیتا۔ کیا یہ مشکل تھا؟''

جنت کی آنکھوں میں آنسو ٹھہرے تھے۔ اس کے لبوں پر سکتہ طاری تھا۔

''اور یاد ہے، تم نے مجھے ایک مہینے کا وقت دیا تھا۔ کیا وہ مدت اس رشتے کو ختم کرنے کے لیے کافی نہیں تھی؟'' اس نے پوچھا۔ اور وہ چپ تھی۔

''اور فرض کرو میں واقعی کسی سے شادی کرنا چاہتا ہوں، تو کیا تمہارے جانے کے بعد یہ کام سرانجام دینا زیادہ مناسب نہیں تھا؟ اس وقت تو میں یہ بھی نہیں جانتا تھا تم ایکسپیکٹ کر رہی ہو۔ کیا غلط کہہ رہا ہوں؟''

جنت کا نچلا لب دانتوں تلے آیا تھا۔ روتی کرلاتی آنکھیں ایک دم سے جھک گئی تھیں۔ پلکوں کی باڑ پھلانگتے کچھ بے رنگ آنسو فارس کے ہاتھوں پر گرے۔

''میری زندگی میں تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ اگر کوئی ہوتی تو وہ تم سے پہلے وجدان ہاؤس میں آ چکی ہوتی۔'' اس نے حتمی اور واضح لفظوں میں کہہ دیا۔ ویسے ہی جیسے ایک بار پہلے کہا تھا۔ بہت ہی سادہ۔ بہت ہی مختصر جملے میں۔

ہاسپٹل کے وی آئی پی روم میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ نہ سسکیوں کی آواز تھی اب۔ نہ ہچکیوں کا شور تھا۔ اس بے نام سی خاموشی کو جنت کی آواز نے توڑا تھا۔

''میں کیسے یقین کروں۔ یہ سب سچ ہے؟ جھوٹ یا دھوکا نہیں ہے؟'' اس نے فارس وجدان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ دیا۔ برہان واصف کا ہر وعدہ جھوٹا تھا۔ ہر قسم ادھوری تھی۔ اس کی دلائی ہوئی ہر آس تنکے جیسی۔ اس کی دکھائی ہوئی ہر راہ اندھیرا تھی۔

فارس اس کی آنکھوں میں درد دیکھ رہا تھا۔ کرب دیکھ رہا تھا۔ گزشتہ پانچ سالوں کی اذیت ان میں ٹھہری ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ حال میں ہوتے ہوئے ایک بار پھر ماضی میں کھو رہی تھی۔

''کیونکہ میں برہان نہیں ہوں۔'' اس کی بھاری گمبھیر آواز ابھری اور جنت کمال کے اندر باہر ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ آنکھیں ایک ہی مقام پر منجمد۔ دھڑکنیں ایک ہی خیال پر ساکت ہو گئیں۔

فارس نے نرمی سے اس کی انگلیوں پر گرفت بڑھائی تھی۔ سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

''میں اپنا وعدہ پورا کرتا ہوں۔ جو کہتا ہوں کر کے دکھاتا ہوں۔ تمہاری تسلی کے لیے میں کل ہی اپنے لائیر سے بات کر کے بچے کی کسٹڈی کے پیپرز تیار کروالوں گا۔ پھر تو تمہیں یقین آ جائے گا میں جھوٹ نہیں بول رہا؟''

لہجہ ہنوز نرم اور پرشفقت تھا۔ کہیں غصے اور عداوت کی جھلک نہ تھی۔ نہ انا کا مسئلہ۔ نہ برہمی کا رنگ۔

جنت کی آنکھوں میں نمی ٹھہری رہی۔ لب بھنچے رہے، اذیت چہرے کے تاثرات میں مدغم رہی۔

''میں تمہیں طلاق نہیں دینا چاہتا'' اس نے کہا۔ ''اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تم پر کوئی دباؤ ڈالوں گا یا اپنے ساتھ رہنے پر فورس کروں گا۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا'' ایک لمحے کو رکا۔ ''میرے ساتھ رہنے یا نہ رہنے کا مکمل اختیار تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اور یہ اختیار میں تم سے کبھی نہیں چھینوں گا، کبھی بھی نہیں۔''

اس کا لہجہ مضبوط تھا۔

وہ بہت تحمل سے بات کر رہا تھا۔ غصہ، ناراضی، برہمی کا اظہار کیے بنا۔ کسی بھی بات کو انا مسئلہ بنائے بغیر۔ وہ اسے بہت نرمی سے سمجھا رہا تھا۔ اس کے جذبات کی صداقت آنکھوں سے عیاں ہو رہی تھی۔

جنت نے لب بھینچ کر بہت سے آنسو اپنے اندر اتار لیے۔ اندر باہر سب ساکن ہو گیا تھا۔ ایک خاموشی سی تھی جو ہر طرف چھا گئی تھی۔ ذہن تھک گیا تھا۔

دستک دے کر نرس اندر داخل ہوئی تو فارس اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اس کے سیل فون پر کافی دیر سے کال آ رہی تھی جسے ریسیو کرتے ہوئے وہ کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اب وہ مدھم آواز میں بات کر رہا تھا۔ بستر پر نیم دراز وہ اب اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اور اسے لگا، وہ اسے پہلی بار دیکھ رہی ہے۔

وہ فون پر کچھ سنتے ہوئے باہر چلا گیا تھا اور جب دوبارہ اندر آیا تو نرس انجکشن کا محلول آئی وی ڈرپ میں انڈیل کر جا چکی تھی۔

جنت تکیے پر سر رکھے لیٹی ہوئی تھی۔ ڈرپ والا ہاتھ پہلو میں دھرا تھا۔ آنکھوں میں تھکان کے ساتھ نیند اتری ہوئی تھی۔ غالباً دواؤں کے اثر میں تھی۔ وہ کرسی کھینچ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

اس کا نازک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا تو اس نے بھی کس قدر کوشش سے گرفت بڑھالی۔

''میں ڈر گئی تھی۔'' آواز بھیگی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں نمی، حزن اور درد۔ سب ٹھہرا تھا۔

''تم صرف آرام کرو۔''

''مجھے نہیں پتا، مجھے کیا ہوا فارس۔''

''کچھ مت سوچو، جسٹ ریلیکس۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

اس نے لب بھینچ کر رونے پر قابو پایا۔ پھر گہری سانس لیتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ ہی دیر بعد اس کی مضبوط گرفت نرم پڑ گئی۔ اس کی سانسیں ہموار ہوئیں اور تاثرات سے اذیت ہٹنے لگی۔ کمزوری اور خوف سے پھیکا پڑتا چہرہ پرسکون ہونے لگا۔ فارس اس چہرے کو دیکھتا رہا۔ اور کافی دیر تک دیکھتا رہا۔

اس کے اندر ایک وبال اٹھنے کی سی کیفیت تھی جسے وہ کس قدر تحمل اور برداشت سے دبائے ہوئے تھا۔ پورا وجود آگ کی لپیٹ میں تھا۔ سائڈ ٹیبل پر موبائل کی اسکرین روشن ہوئی تو اس نے ہاتھ بڑھا کر سیل فون اٹھا لیا۔ اب وہ آنکھوں میں خون لیے میسج ٹائپ کر رہا تھا۔

کمرے کی نیلگوں روشنی میں جہاں وہ بے خبر سو رہی تھی۔ وہاں وہ کسی کو بہت تحمل سے ہدایت نامے جاری کر رہا تھا۔

اور ٹھیک پندرہ منٹ بعد اسے کال موصول ہوئی تھی۔ عدینہ زبیر شام پانچ بجے کی فلائٹ سے لندن جا چکی تھی۔ وہ داہنے ہاتھ کی مٹھی بھینچ کر رہ گیا تھا۔

''آپ فکر نہیں کریں سر۔'' موبائل سے بھاری، بے تاثر اور مؤدب سی آواز ابھری۔ ''میں نے ان کے لیے اس بار کافی کچھ

اریج کر دیا ہے۔''

اس نے کال کاٹ دی تھی۔

☆☆☆

تاریکی کا اپنا ایک رنگ تھا۔ اثر تھا۔ اور دہشت تھی۔ وہ اپنے اندر بہت سی ویرانیاں لیے ہاسپٹل کے کاریڈور میں بنچ پر ساکت وصامت بیٹھا تھا۔

کوٹ گھٹنے پر رکھا تھا۔ ناٹ ڈھیلی تھی۔ بٹن کھلے ہوئے۔ آستین مڑی ہوئیں۔

''کیا ہوا اسے؟ اس طرح اچانک؟'' مسز شیرازی سے بات ہوئی تو انہوں نے پوچھا۔

''بی پی ہائی ہو گیا تھا۔''

وہ فون کان سے لگائے پریشانی کے عالم میں بیٹھی رہ گئیں۔

''اب بہتر ہے وہ۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ اس کا لہجہ۔ آواز۔ وہ ایک دم سے فکر مند ہوئیں

''کسی بات کا اسٹریس لیا اس نے؟'' وہ اس سے پوچھ رہی تھیں۔

وہ بالکل خاموش بیٹھا اب سفید فرش کو دیکھ رہا تھا۔ سرخی مائل آنکھوں میں ایک کرب سا ٹھہرا تھا۔

کندھے جھکے ہوئے تھے۔

راہداری کی نیلگوں روشنی۔ روح پر پڑے نیل سے مشابہ تھی۔

''فارس؟ کیا ہوا ہے بیٹا؟''

''جو نقصان اس نے میرا پہلے کیا تھا۔ وہی نقصان اب وہ دوبارہ کرنا چاہ رہی ہے۔'' اس نے کہا۔

''کس کی بات کر رہے ہو تم؟''

''میں کس کی بات کر سکتا ہوں ممی؟''

مسز شیرازی ایک لمحے کو رکیں اور اگلے ہی پل ان کے اندر سناٹا چھا گیا۔ فارس کی بات جیسے وہ اب سمجھی تھیں۔ پہلے ایک ''زندگی'' تھی۔ اب دو زندگیاں تھیں۔ لرزہ روح پر طاری تھا۔ کپکپاہٹ انگلیوں میں اتر آئی تھی۔ وہ ایک ہی منظر تھا جو ان کی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ ان کا سکون منتشر ہوا۔ ان کی بے قراری بڑھ گئی۔

''اگر جنت کو واقعی میں کچھ ہو جاتا تو......''

''فارس بیٹا! شی از فائن ناؤ''

''وہ بہت زیادہ اسٹریس میں آ گئی تھی ممی!'' وہ اپنی پیشانی مسلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''الحمدللہ۔ کچھ ہوا تو نہیں نا! ٹیک آ ڈیپ بریتھ اینڈ جسٹ ریلیکس۔''

گہری سانس لے کر وہ سیدھا ہو بیٹھا تھا۔ سیل فون کان سے لگائے مکمل خاموشی کی زد میں وہ اب اپنی بے ترتیب دھڑکنوں کو سن رہا تھا۔ مسز شیرازی کو اپنا دل مٹھی میں جکڑتا محسوس ہوا۔ چوٹ ایک لگتی تھی اور اس کا ہر غم، اور ہر درد جاگ اٹھتا تھا۔

''ٹائمنگ کتنی پرفیکٹ ہے اس کی......'' اس نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ یہ جانے بنا کہ اس ایک جملے نے ان کے دل پر کیسا وار کیا تھا۔ وہ اپنی جگہ ساکت، خاموش اور ویران سی بیٹھی رہ گئی تھیں۔

اگلے کئی لمحے اسی طرح گزر گئے۔

''کمرے میں ڈبل بیڈ ہو گا۔ کچھ دیر آرام کر لو۔'' پھر انہوں نے کہا۔

''نیند نہیں آئے گی۔''

''کوشش کرو گے تو آ جائے گی۔''

''آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں۔ مگر ابھی اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔''

وہ اذیت میں گھر گئیں۔ کاش یہ معذوری نہ ہوتی تو وہ خود اس کے پاس جاتیں۔

''عدیل کو بھیج دو۔ میں آ جاتی ہوں۔''

''نہیں! آپ آرام کریں۔ سو جائیں۔ میں ٹھیک ہوں اب۔'' کہہ کر اس نے بینچ کے ساتھ پشت ٹکا لی۔ کچھ دیر تک مسز شیرازی سے بات کرنے کے بعد وہ اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔

جنت سفید بستر پر بے خبر گہری نیند میں تھی۔ اس نے سر اٹھا کر آئی وی ڈرپ کو دیکھا جو تقریباً ختم ہونے کو تھی۔ گہری سانس لے کر وہ کاؤچ پر جا بیٹھا تھا۔

کھڑکی سے چاند نظر آ رہا تھا۔

باہر تاریکی بڑھ گئی تھی۔ سکون کا متلاشی اس وقت بے سکونی کی حدوں کو چھو رہا تھا۔

☆☆☆

صبح اس کی آنکھ کھلی تو تقریباً چھ بجے کا وقت تھا۔ فارس کے سہارا دینے پر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ ڈاکٹر اور نرس بھی کمرے میں موجود تھیں۔ وہ گلاس ہاتھ میں لیے وقفے وقفے سے پانی پی رہی تھی اور فارس سینے پر بازو باندھے خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

رونے کے باعث آنکھیں سوجی ہوئی تھیں مگر ان میں کہیں بھی غصہ، خوف، پریشانی نظر نہیں آ رہی تھی۔ چہرے کے تاثرات

بھی کچھ حد تک نارمل تھے۔ طبیعت خرابی کے باعث رنگت ہنوز زرد اور چہرہ مرجھایا ہوا سا لگ رہا تھا مگر گزشتہ شب کے واقعے کی کوئی جھلک نظر نہیں آ رہی تھی۔

چیک اپ کے بعد نرس نے کینولا ہٹا کر سنی پلاسٹ لگایا۔ ڈاکٹر نے کچھ ضروری ہدایات سے نوازا۔ کچھ تنبیہات فارس کے لیے بھی تھیں۔ وہ اسے اسٹریس اور ہر طرح کے ذہنی دباؤ سے بچا کر رکھنے کا کہہ رہی تھیں۔ شاید معاملہ اس بار کچھ سیریس ہوا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے وہ بہت آسانی سے مسئلوں کو ٹال دیتی تھی۔ زیادہ اثر نہیں لیتی تھی۔ وہ سنتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ نظر جھکاتے ہوئے چہرے کا رخ بدل گئی تھی۔

سات بجے ڈسچارج کر دیا گیا تو وہ اسے گھر لے آیا۔ مسز شیرازی ان کے انتظار میں لاؤنج میں ہی بیٹھی تھیں۔ وہ سیدھا ان کے پاس گئی تھی۔ ان کے گلے لگی تھی، پھر ان سے بات کر رہی تھی۔ وہ اس کے گال پر ہاتھ رکھے خفگی سے کچھ کہہ رہی تھیں اور اس نے ایک دم سے شرمندہ ہوتے ہوئے سر جھکایا تھا۔

فارس جیبوں میں ہاتھ ڈالے قدرے فاصلے پر کھڑا تھا۔ بے خوابی کا شکار آنکھوں میں سرخی سی ٹھہری تھی۔ چہرہ بے تاثر سا لگ رہا تھا مگر اس کے اندر جو کچھ ہو رہا تھا اس سے صرف وہی واقف تھا۔

چونکہ ڈاکٹر نے مکمل آرام کی تاکید کی تھی تو جنت ناشتے کے بعد اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ جبکہ وہ کچھ دیر تک مسز شیرازی کے پاس ان کے کمرے میں بیٹھا رہا تھا۔

''جنت کی باتوں سے پریشان ہو رہے ہو؟'' انہوں نے نرمی سے پوچھا تو اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ صوفے کے ہتھے پر اس کی انگلیاں آہستگی سے متحرک ہوئیں۔

''نہیں۔'' کہہ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ دھوپ سیدھا اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ آنکھوں کا ہر رنگ نمایاں ہو رہا تھا۔

''لگ تو رہے ہو۔'' ماں تھیں وہ۔ اسے اندر تک جان گئی تھیں۔ مبہم سی مسکراہٹ لیے وہ ان کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر سیدھا ہو بیٹھا۔

''میں اس کی باتوں سے پریشان نہیں ہوں ممی! ان فیکٹ مجھے اچھا لگا اس نے اپنے خوف کا اظہار کر دیا۔'' وہ نارمل لہجے میں آہستگی سے گویا ہوا۔

''پچھلی بار اس نے پریشانی میں گھر چھوڑ دیا تھا۔ اس بار اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے مجھ سے بات کی۔ جو مسئلہ تھا وہ بتا دیا۔ کوئی الٹی سیدھی حرکت نہیں کی۔ آپ کا خیال ہے، میں اس پر اپ سیٹ ہو سکتا ہوں؟'' مسز شیرازی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ پھر نم آنکھوں کے ساتھ اس کے گال پر ہاتھ رکھا۔

''اس نے کافی سے زیادہ اسٹریس لیا۔ تو بس اس کا سوچ کر۔'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''اگر تم کہو تو میں جنت سے بات کروں؟''

وہ چند لحظوں تک انہیں دیکھتا رہا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ ''اگر ضرورت پڑی تو آپ سے کہوں گا۔'' وہ آہستگی سے بولا۔ انہوں نے اس کے ہاتھ پر اپنی گرفت بڑھائی۔

''کچھ مت سوچو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''ان شاءاللہ۔''

وہ اپنے کمرے میں آیا تو جنت بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

''اب کیسی طبیعت ہے؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' وہ اسے آفس کے لیے تیار ہوتا دیکھ کر ایک دم سے پریشان ہوئی تھی۔ بیمار وہ تھی تو ہاسپٹل میں بے آرام وہ بھی تو ہوا تھا۔ آنکھیں تو رتجگے کی واضح گواہی دے رہی تھیں۔

''تم آفس کیوں جا رہے ہو؟''

''کچھ ضروری کام ہے۔'' وہ نارمل لہجے میں جواب دیتے ہوئے ٹائی کی ناٹ باندھنے لگا۔

''تم رات بھر نہیں سوئے۔ تمہیں آرام کرنا چاہیے۔'' خفیف سا ہو کر کہہ دیا۔

لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ لیے وہ مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ بھنویں سکیڑے بیٹھی تھی، چہرے پر ہلکا ہلکا اضطراب نمایاں ہو رہا تھا۔ انگلیاں آپس میں الجھ رہی تھیں۔

''اپنا خیال رکھنا۔'' مکمل تیاری کے بعد موبائل اٹھائے باہر نکلا تو وہ بھی اپنے اندر ایک عجیب سی بے سکونی لیے پیچھے آئی تھی۔ مگر وہ باہر نہیں گئی تھی۔ اس نے گلاس والز سے ہی اسے گاڑی کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

دل عجیب سی لے پر دھڑک اٹھا۔ جو تاثرات اس نے فارس کے سامنے چھپا کر رکھے تھے، وہ چہرے سے عیاں ہونے لگے۔ آنکھوں میں ان جانا سا خوف اتر آیا تھا۔ کیا وہ اس سے ناراض ہو چکا ہے؟ اسے ایک دم سے فکر ہوئی۔ اسے پہلی بار اس طرح اس کی ناراضی کی فکر ہوئی تھی۔

☆☆☆

وہ سارا دن اپنے کمرے میں ہی رہی۔ مسز شیرازی وقفے وقفے سے اسے دیکھنے آتی رہیں۔ سائڈ ٹیبل پر رکھا اس کا موبائل آج بہت خاموش تھا۔ کروٹ پر کروٹ بدلتے۔ نیم تاریکی میں پنکھے کو گھورتے۔ خود سے لڑتے۔ اور خود سے الجھتے وہ کافی سے زیادہ

بےقرار رہی۔ فارس ضروری کام کے سلسلے میں شہر سے باہر تھا۔ اس کی واپسی رات تاخیر سے متوقع تھی۔ مسز شیرازی نے اسے آگاہ کردیا تھا۔

وہ سوچکیں تو اسے گھر میں ایک دم سے خاموشی کا احساس ہوا۔

دل اداس تھا۔ دل پریشان بھی بہت ہو رہا تھا۔ طبیعت کا بوجھل پن الگ۔ نفسیاتی حالت بھی عجیب ہو رہی تھی۔ اس نے موبائل اٹھا کر فارس کو کال کی تو موبائل آف ملا۔ کتنی ہی دیر تک وہ آنکھوں کو مسل مسل کر نمی دباتی رہی۔

اسے اپنی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اپنا لہجہ اور رویہ یاد آ رہا تھا۔ وہ سارے الزام جو اس نے لگائے۔ وہ تمام شک جو اس نے دکھائے۔

پتا نہیں اسے کیا ہوا تھا۔ حالانکہ وہ ہر تکلیف، ہر بات دبا لیتی تھی۔ برداشت کر کے نظر انداز کر جاتی تھی خصوصاً عدینہ زبیر کے معاملے کو اس نے کبھی بھی اس حد تک اپنے سر پر سوار نہیں کیا تھا۔ مگر پریگنسی کے بعد سے وہ ایسا نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کے مزاج میں خاطر خواہ تبدیلی آئی تھی۔ چھوٹی سی بات اسے پہاڑ جتنی لگتی تھی۔ ایک ذرا سا وہم ہولا دیتا تھا۔ ایک ذرا سا شک دہلا دیتا تھا۔

گھڑی رات کے بارہ بجا رہی تھی۔ فارس ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ گھر کے عقبی لان میں سوئمنگ پول کے عین سامنے آہستگی سے ٹہل رہی تھی۔ سر اور کندھے جھکے ہوئے تھے۔

یونہی ایک چکر کاٹ کر سر اٹھایا تو فارس وجدان پر نظر پڑتے ہی اس کی دھڑکنیں تھم گئیں۔ وہ راہداری سے گزر کر اسی طرف آ رہا تھا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر بل تھے، جبڑے بھی کچھ سختی سے بھنچے ہوئے۔ وہ اسے غصے میں لگا تھا۔

’’تم یہاں کیا کر رہی ہو؟‘‘

اس کے قریب پہنچ کر اور پھر کچھ سخت نظروں سے دیکھتے ہوئے جھکا تو وہ ایک دم سے گھبرا گئی تھی۔

’’آرام کرنے کا کہا تھا میں نے تمہیں۔ حد ہے۔‘‘

لب بھینچ کر اس نے جنت کا ہاتھ پکڑا اور واپس کمرے میں لے آیا تھا۔

’’سو ہاؤ آر یو فیلنگ؟‘‘ وہ بیڈ پر بیٹھی تھی۔ اور فارس سامنے کھڑا رسٹ واچ، کف لنکس وغیرہ اتارتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ چہرے پر گزشتہ شب کا کوئی اثر نہ تھا۔ نہ خفگی۔ غصہ یا برہمی۔ کچھ بھی نہ تھا۔ ہاسپٹل سے واپسی کے بعد وہ اسے اب نظر آیا تھا۔ اب بات ہوئی تھی۔ اب دیکھ رہا تھا۔

’’آئم گڈ!‘‘ نظریں چرا کر یہاں وہاں دیکھنے لگی۔ پورا سین، باتیں، اپنا رویہ یاد آ رہا تھا تو شرمندگی الگ ہو رہی تھی۔ صرف ایک قتل کا الزام باقی رہ گیا تھا۔ اس کے علاوہ تو وہ اسے ہر طرح کا مجرم بنا چکی تھی۔

اب وہ سامنے وارڈ روب کھولے کھڑا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ کپڑے نکال کر واش روم میں چلا گیا۔

وہ شاور کی آواز سنتی سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اسے فارس سے بات کرنی چاہیے؟ کیا بات کرنی چاہیے؟ ذہن بے طرح سے الجھا ہوا تھا۔ کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

شاور لینے کے بعد وہ ہلکے سرمئی رنگ کے ٹراؤزر پر بغیر بازوؤں والی سیاہ بنیان میں باہر آیا تھا۔ بالوں کو اچھی طرح سے رگڑ کر خشک کرتے اس پر نظر پڑی تو رک گیا۔

’’تم پھر سے رو رہی ہو۔‘‘

جنت نے رخ موڑ کر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھا تو اس کے دل کو کچھ ہوا۔

’’اب کیا ہو گیا۔‘‘ وہ ایک دم سے نرم پڑا تھا۔ برابر میں بیٹھتے ہوئے اس کا رخ اپنی طرف کیا۔

’’میں نے تمہیں کتنی بار کالز کیں۔ تم نے مجھ سے بات نہیں کی۔ تم نے میرے میسج بھی نہیں دیکھے۔ اور اب تم۔‘‘

’’اب میں کیا؟‘‘ وہ ذرا حیران ہوا تھا۔

اس کا ذہن منتشر تھا۔ پہلے کچھ اور کہہ رہی تھی۔ اب کچھ اور کہنے لگی تھی۔

’’میں کل ڈر گئی تھی فارس۔ مجھے لگا۔ تم مجھے وجدان ہاؤس سے نکال کر وہاں شفٹ کر رہے ہو۔ تم عدینہ کو واپس لا رہے ہو۔ تو بس اس وجہ سے میں نے......‘‘

وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔ جس طرح کے حالات سے وہ گزری تھی۔ اس کا یہ خوف فطری تھا۔ وہ اس کے کسی بھی ردعمل پر ناراض نہیں ہو سکتا تھا۔ کسی بھی بات پر پریشان نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر اس کی یہ وضاحت۔

’’ہماری بات تو کل ختم ہو گئی تھی۔‘‘ اس نے بہت ہلکے پھلکے سے لہجے میں کہا۔ مگر وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ سر جھکائے رہی۔ جیسے اس کے لیے تو کچھ بھی ختم نہیں ہوا تھا۔

’’ویسے تمہیں نہیں لگتا ہمارا ریلیشن دن بدن اسٹرونگ ہوتا جا رہا ہے؟‘‘ متبسم لہجے میں پوچھا تو جنت نے چونک کر ناسمجھی کے عالم میں سر اٹھایا۔

’’اب یہی دیکھ لو۔ کیا پہلے کبھی ایسا ہوا کہ میں کال نہ کروں اور تم اتنا پریشان ہو جاؤ۔‘‘

وہ ایک دم سے بوکھلا گئی۔

’’ایسا تو نہیں ہوا۔ میں اس وجہ سے پریشان نہیں تھی۔‘‘

آنکھیں رگڑ کر صاف کرتی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ لمحوں میں اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے اپنے تاثرات کو بدلا

تھا۔اپنے خوف کو چھپایا تھا۔اپنی پریشانی کو رفع کیا تھا۔وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے مسکرا دیا۔

''گڈ نائٹ۔'' کمفرٹر تان کر وہ سوتی بن گئی۔جیسے مزید کچھ کہنے کو۔اور کچھ سننے کو رہا ہی نہ تھا۔اندر کا شور بھی کچھ حد تک تھم گیا تھا۔کسی بات کو سوچ کر اسے اب وحشت بھی نہیں ہو رہی تھی۔

تولیہ صوفے پر اچھالتے ہوئے وہ اپنی سائڈ پر آ گیا تھا۔سونے سے پہلے وہ کچھ دیر تک موبائل اٹھائے بیٹھا رہا تھا۔کچھ میسجز اور ای میلز تھیں جنہیں دیکھنا ضروری تھا۔جنت اس کی جانب کروٹ بدلے گہری نیند میں اتر چکی تھی۔

موبائل رکھ کر وہ اسے دیکھنے لگا تھا۔رنگت ہنوز زرد تھی۔آنکھوں کے حلقے بھی کچھ نمایاں ہو رہے تھے۔وہ پہلے سے کچھ بہتر تھی مگر اسے پھر بھی کمزور لگی۔جھٹکا کم تو نہیں تھا جو اسے لگا تھا۔نہ وہ اسٹریس کم تھی جو اس نے گزشتہ شب لی تھی۔

اس نے کمفرٹر کھینچ کر درست کرتے ہوئے لیمپ آف کر دیا تھا۔مگر باوجود کوشش کے وہ سو نہیں سکا تھا۔شور ایسا ہی تھا دہلا دینے والا۔بند آنکھوں پر ٹھہرے مناظر بھی۔کسی اذیت سے کم نہ تھے۔

کانچ وہ جو قدموں کو چھو رہا تھا۔آگ وہ جو سینے میں جل رہی تھی۔اس کے وجود میں جیسے دھواں بھر گیا تھا۔مٹھیاں بھینچ کر اس نے اپنا سر تکیے میں دے دیا تھا۔وہ سونا چاہتا تھا۔بہت گہری نیند سونا چاہتا تھا۔

مگر گزشتہ رات کی طرح آج رات بھی اسے نیند نہیں آنے والی تھی۔اور اگلی کئی راتوں تک بھی شاید وہ اسی بے خوابی کا شکار رہنے والا تھا۔

☆☆☆

ناشتے کی میز پر وہ بہت زیادہ خاموش تھی۔مسز شیرازی اور فارس تو روزمرہ کی طرح بات کر رہے تھے مگر اسے تو جیسے کسی بھی بات کا جواب دیتے ہوئے عجیب دقت سی ہو رہی تھی۔بار بار نظر اٹھا کر فارس کو دیکھتی تھی تو اس کے چہرے کے تاثرات اور لہجے میں کسی قسم کا فرق یا تبدیلی نظر نہیں آ رہی تھی۔

اپنے ٹیبلٹ پر ہیڈ لائنز دیکھتے ہوئے وہ گاہے بگاہے اس سے بھی مخاطب ہو رہا تھا۔کچھ دیر پہلے ٹوسٹ پر جیم لگانے کو کہا تھا۔پھر اورنج جوس کا گلاس مانگا تھا۔اور اب کپ میں چائے ڈالنے کو کہہ رہا تھا۔

پتا نہیں اسے کیا ہو گیا تھا؟ اندر ہی اندر خود سے الجھتے ہوئے اس نے چائے کا کپ اس کے سامنے رکھا۔سب نارمل تھے تو وہ کیوں ابنارمل ہو رہی تھی؟

ناشتے کے بعد اس نے ورک آؤٹ کیا اور اپنے منتشر خیالات اور پیچیدہ سوچوں کو آرگنائز کرتی وہ لان میں آ گئی۔کھلی فضا میں گہری سانس لیتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔پھر شیشے کی دیوار کی طرف جہاں فارس وجدان اسے سیل فون کان سے لگائے

بات کرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔مسز شیرازی اپنے اسٹوڈیو میں تھیں۔وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔عموماً وہ دوپہر میں واک کے لیے پارک جاتی تھی مگر آج دس بجے ہی میڈ کو ساتھ لیے چلی گئی۔اقصیٰ اپنے کالج گئی ہوئی تھی ورنہ وہ اس کے ساتھ ہی جاتی۔

سر پر دوپٹہ اور شال اچھی طرح سے لیے، وہ سینے پر بازو باندھے جاگنگ ٹریک سے قدرے فاصلے پر سرسبز کیاری کے قریب آہستگی سے قدم اٹھا رہی تھی جب اسے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔بے اختیار مڑ کر پیچھے دیکھا تو اسے فارس دکھائی دیا۔

یہ آفس نہیں گیا؟ وہ اسے دیکھ کر ایک دم سے حیران ہوئی۔لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ اب اس کے برابر میں اس کی ہی رفتار سے قدم اٹھانے لگا تھا۔

''تم...... یہاں......''

''ہاں۔''اس کا لہجہ ویسا ہی متوازن تھا۔

اللہ کرے خیر ہو، وہ بہت اندر تک ڈر گئی۔

''چونکہ میں کچھ معاملات میں ردوبدل کرنے والا ہوں سو۔مجھے لگا تم سے بات کر لینی چاہیے۔'' جنت کا دل زوروں سے دھڑکا۔آخر ایسی کون سی بات تھی جو گھر میں نہیں ہو سکتی تھی۔اور جس کے لیے اسے اپنے آفس سے بھی چھٹی کرنی پڑی تھی۔

وہ رک گئی۔دونوں آمنے سامنے ہوئے۔چند لمحوں تک سسپنس کی انتہا کرتے ہوئے وہ چپ کھڑا رہا۔اور وہ بھی مضطرب سی یہاں وہاں دیکھتی رہی۔بالآخر اس نے سنسنی خیز خاموشی کا قفل توڑا۔

''آج سے تم واک پر میرے ساتھ آؤ گی۔شاپنگ کے لیے۔ڈنر کے لیے بھی۔آئمہ کے ساتھ اپنے پلانز کینسل کر دو۔بلکہ میں اسے خود منع کر دوں گا۔اسے جب بھی ملنا ہو گا وہ ہمارے گھر آئے گی۔دیکھتا ہوں، میرے ہوتے ہوئے کون تمہارے اس چھوٹے سے دماغ میں خناس بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔''اس نے جھک کر انگشت شہادت سے جنت کی پیشانی پر ٹھونکی۔

اس نے بوکھلا کر سر اٹھایا۔فارس وجدان کی پہلی تمام باتیں ایک طرف۔اور آخری ایک بات دوسری طرف۔

''تم میرے دماغ کو چھوٹا کہہ رہے ہو؟'' آواز صدمے سے پھٹ گئی تھی۔

''کیا نہیں کہنا چاہیے؟''اس نے اپنے ہاتھ ٹریک سوٹ کی جیبوں میں ڈال لیے۔''میں تمہیں ایک گھر دینا چاہ رہا تھا اور اس کے لیے مجھے وضاحتیں دینی پڑیں۔تم رائٹر کیوں نہیں بن جاتیں؟ اتنا سنسنی خیز سنیاریو ہوتا ہے تمہارے دماغ میں۔میں خود حیران رہ جاتا ہوں۔''

اور وہ جو اپنے ضمیر کی ملامتیں سہتی اپنے آپ میں چھپتی پھر رہی تھی، ایک دم سے چڑ گئی۔

''ابھی رات تم کہہ رہے تھے یہ بات ختم ہو چکی ہے۔''

''کیا میں نے واقعی ایسا کہا تھا؟'' وہ حیران ہوا۔ آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

جنت نے تپ کر اسے دیکھا۔

''تمہاری یادداشت کمزور نہیں ہوتی جا رہی؟''

''تمہاری صحبت کا اثر ہے، کیا کر سکتا ہوں۔''

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، فارس جاگنگ ٹریک پر بھاگتے ہوئے دور نکل گیا تھا۔ وہ بھنویں سکیڑے اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

کھانے کے بعد وہ اپنے لیے سبز چائے بنا رہی تھی جب ملازم اسے ایک خاکی لفافہ دے کر گیا تھا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے لفافہ چاک کر کے کاغذات نکالے اور اپنی جگہ تھم گئی۔

وہ بچے کی کسٹڈی کے پیپرز تھے۔ اس کا اعتبار بحال کرنے کی کوشش۔ اس کا اعتماد جیتنے کی جستجو۔ جو کہا تھا اس نے وہ کر دکھایا تھا۔ اور جنت کو تو ایسی کوئی بات یاد ہی نہ رہی تھی۔

اسی لمحے موبائل بج اٹھا۔ برفیلے پہاڑوں کے ساتھ آنٹی کا بیٹا لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اسے اپنے ہاتھ منجمد ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ نچلا لب کاٹتے ہوئے اس نے کال ریسیو کر لی تھی۔

''تمہیں پیپرز مل گئے؟''

کس قدر کوشش سے اس کے لب ہلے۔

''ہاں۔''

''گڈ۔'' دوسری طرف اطمینان بھری آواز آئی۔ ''اور کوئی حکم؟'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں بہت سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

''میں نے ایسا کوئی حکم تو نہیں دیا تھا'' اس کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے تھے۔ سر جھک گیا تھا۔

''حکم نہیں دیا تھا۔ مگر یقین بھی تو نہیں کر رہی تھیں۔ اب جو تمہاری اسٹوری کا ولن ہے۔ اسے ہیرو بننے کے لیے کچھ تو کرنا تھا۔''

اس نے بے اختیار نچلا لب دانتوں میں دبایا۔ آنکھیں مکمل نم ہو چکی تھیں۔

''ہاں تو کیا میں نے کہا تھا میرے ساتھ اتنا برا کرو۔'' بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے آنکھوں کو مسلتے ہوئے آواز کو حتی الامکان مضبوط کیے رکھا۔

''جو اچھا کر رہا ہوں، اسے بھی تو دیکھو۔''

وہ چپ رہی۔ کہنے کو کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ اس نے خاکی لفافہ کاؤنٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔

''اب کیا کر رہی ہو؟'' وہ موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

''سبز چائے بنا رہی تھی۔'' اس نے داہنے ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کیے۔ مڑ کر آنچ ہلکی کر دی۔

''اس کے بعد کیا کرو گی؟''

''آنٹی کے ساتھ لان میں جاؤں گی۔ وہ ابھی نماز پڑھ رہی ہیں۔''

''اس کے بعد۔''

''اس کے بعد.....'' ایک لمحے کو رکی۔ ''پتا نہیں۔''

''موسم اچھا ہو رہا ہے۔ کیا خیال ہے، کہیں باہر چلیں؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔ جنت چپ رہی۔

''ممی سے بھی کہو۔ آج ہم تینوں چلیں گے۔'' کہہ کر کال کاٹنا چاہی۔

''سنو۔'' جنت نے ایک دم سے کہا تو وہ سیل فون کان سے ہٹاتے ہٹاتے رک گیا تھا۔

''سناؤ۔''

وہ نچلا لب دانتوں تلے دبائے چند لمحوں تک کھڑی رہی۔ پھر ہمت مجتمع کر کے بولی۔

''تمہارا شکریہ۔''

فارس کے لبوں پر تبسم بکھرا۔

''اچھا تو وہ کس لیے؟'' وہ انجان بنتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''اب وجہ تم خود ہی ڈھونڈ لو۔'' اس نے تپ کر کال کاٹ دی۔ وہ مسکرا کر رہ گیا۔

جنت کمال نم آنکھوں کے ساتھ خاکی لفافے کو دیکھتی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

مسز شیرازی کے اسٹوڈیو میں وہ اس وقت اکیلی موجود تھی۔ ترتیب سے رکھی پینٹنگز اور دیگر اشیاء کو دیکھتے اس نے پردے کھینچ کر ہٹا دیے تھے۔ کھڑکیوں کو بھی کھول دیا تھا۔ کھلی فضا میں گہری سانسیں لیتی کتابوں کے ریک کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔ آرٹس اور شاعری کی بہت سی کتابیں تھیں جنہیں وہ ہاتھوں میں لے کر، چند ایک صفحے پلٹ کر اور کچھ عبارتیں پڑھ کر رکھتی جا رہی تھی۔ کتابوں کے ساتھ ہی بالکل کونے میں ایک رجسٹر کے سائز کا پکچر فریم رکھا تھا۔ اس نے وہ فریم اٹھا لیا تھا۔ اس پر چڑھا کاغذی

کور ہٹا دیا۔

ایک شان اور تمکنت سے شاہی کرسی پر براجمان اعظم شیرازی۔ سمارٹ اور کسرتی جسم کے مالک۔ بھورے بال۔ بھورے رنگ کی تراشیدہ داڑھی۔ زیرک نگاہیں۔ بارعب سی شخصیت۔ پیشانی تو بالکل فارس جیسی لگ رہی تھی۔ عقب میں مسز شیرازی اپنے شوہر کے ہمراہ سیاہ ساڑھی میں ملبوس کھڑی تھیں۔ وہ اس قدر ڈیسنٹ اور پرکشش لگ رہی تھیں کہ جنت کتنی ہی دیر تک ان کے چہرے پر سے نگاہ نہیں ہٹا سکی۔ بے ساختہ ان کے چہرے کو چھوا۔ ان کی سیاہ آنکھوں میں زندگی کی رمق نمایاں تھی۔ اور ان کی مسکراہٹ تو آج بھی اسے بہت خوب صورت لگتی تھی۔

تھری پیس سوٹ میں ملبوس ہارون شیرازی کے لبوں پر مبہم مسکراہٹ رقصاں تھی۔ اعظم شیرازی کے پہلو میں سات آٹھ سال کا پیارا سا بچہ کھڑا تھا۔ یہ بچہ فارس وجدان نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں ہیزل نہیں تھیں۔ نہ ہی سیاہی مائل بالوں میں شہد رنگ کی آمیزش تھی۔ یہ لڑکا حماد شیرازی تھا۔ ایک مکمل خاندان کی ایک مکمل تصویر۔ جس میں فارس وجدان کہیں نہیں تھا۔

اس نے ایک بار پھر اپنی نگاہیں اعظم شیرازی کے باوقار چہرے پر جمالی تھیں۔ اسے لگا وہ اسے دیکھ رہے ہیں۔

''وہ مجھے مار دیں گے۔'' اذیت میں ڈوبی۔ خوف سے لرزتی فارس کی آواز۔

''کون؟''

''اعظم شیرازی!''

اس کے دل کو ایک دم سے کچھ ہوا۔ خشک لبوں کو تر کرتے ہوئے اس نے فریم واپس رکھنا چاہا تھا جب اقصیٰ نے پیچھے سے گردن نکالی تھی۔

''السلام علیکم آپی۔''

''اف اللہ! اقصیٰ ڈرا دیا تم نے مجھے۔'' سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے جھڑک دیا۔ اقصی نے دانت نکالے۔ پھر فریم کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں پھیلیں۔

''ارے یہ بڑے صاحب ہیں؟ اعظم صاحب؟'' اس نے تصدیق کے لیے جنت سے پوچھا تھا۔

''ہاں۔''

''اللہ بخشے انہیں۔ ویسے کہنا تو نہیں چاہیے۔ پر ابا بتاتے ہیں۔ بہت سخت آدمی تھے۔'' اس نے اعظم شیرازی کو ذرا سی گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ان کی شخصیت تھی ہی ایسی۔ تصویر میں بھی ایک رعب سا جھلک رہا تھا۔

''تمہارے بابا جانتے ہیں انہیں؟'' جنت نے کچھ حیرت سے مڑ کر پوچھا تھا۔

''جی، ابا نے کوئی دس سال بڑے صاحب کے گھر میں کام کیا ہے۔''

''اچھا۔''

''تو اور کیا۔'' اس کے لیے جیسے یہ بڑے اعزاز کی بات تھی۔

''پھر تو تمہارے ابا سب کو جانتے ہوں گے۔ فارس، حماد بھائی اور ہارون انکل کو بھی۔''

''ارے کہاں۔'' اقصیٰ نے ایک دم سے ہاتھ ہلایا۔

''ابا تو صرف حماد صاحب اور ہارون صاحب کو جانتے تھے۔ فارس صاحب سے تو کبھی ملے ہی نہیں تھے۔ آپ کو پتا ہے جب ابا کو فارس صاحب نے اسلام آباد بلوایا تھا تو انہیں تب پتا چلا یہ بھی ان کے بیٹے ہیں، ہاہا۔'' وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کے ہنسی۔ اور جنت ہونق بنی اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''ابا بہت بھولے ہیں آپی۔ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ ادھر ادھر کوئی توجہ ہی نہیں دیتے۔ آپ کو پتا ہے، ایک بار نگی خالہ لاہور سے آئی ہوئی تھیں تو ابا اماں سے پوچھنے لگے یہ کون ہے۔ اور اماں نے انہیں وہ گھورا کہ بس کہ لو بتاؤ۔ بیوی کی بہن نہیں پہچانی گئی۔ ابا ہنستے رہے کہ بھئی چھوٹی سی بچی ہوا کرتی تھی۔ اب تو تم سے بھی بڑی لگ رہی ہے۔ اور ایک بار جیدے کو اپنے ساتھ ملا عبدالحکیم کی شادی پر لے گئے تھے۔ واپسی پر اسے وہیں بھول آئے۔''

''ایک سیکنڈ۔'' جنت نے اسے بروقت بریک لگایا۔

''تمہارے کہنے کا مقصد ہے۔ جب تمہارے ابا فارس کے دادا کے گھر کام کرتے تھے۔ تو وہاں فارس نہیں رہتا تھا؟''

''رہتے ہوں گے جی۔ پکا رہتے ہوں گے۔ میں نے آپ کو بتایا نا۔ میرے ابا نے نہیں دیکھا ہوگا۔'' اسے پورا یقین تھا۔

''کیا ایسا ممکن ہے کہ کوئی کسی گھر میں دس سال کام کرے اور اسے اس کے مکینوں کا نہ پتا ہو؟''

جنت نے الجھ کر پوچھا۔

اقصیٰ نے ایک دم سے چونک کر جنت کو دیکھا۔ اس کے ابا بہت بھولے ہیں، یہ بات وہ بھول گئی۔ آنکھیں پھیلائے جنت کو دیکھے گئی۔ پھر سوچ میں پڑ گئی۔ بات تو اس کی آپی کی ٹھیک تھی۔ ذہن کو یہاں وہاں دوڑا کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کی کہ ابا نے اور کیا بتایا تھا۔

''ارے ہاں، آپی یہ سب تو زیادہ تر امریکا رہتے تھے۔'' اسے ایک دم سے یاد آیا تو خوش ہو کر بولی۔ ''کبھی کبھار چھٹیوں میں آتے تھے۔''

''اچھا!'' اس کی نگاہیں ایک بار پھر تصویر پر جم گئی تھیں۔

عسریسرا۔ حسنیٰ حسین

''ارے میں تو بھول گئی۔'' اقصیٰ کو ایک دم سے کام کی بات یاد آئی تو پیشانی پر ہاتھ مارا۔ ''فارس صاحب۔ وہ بلا رہے ہیں آپ کو۔''

''اب بتا رہی ہو۔'' پکچر فریم رکھ کر جنت کچھ عجلت میں قدم اٹھاتی اسٹوڈیو سے چلی گئی تھی۔ اقصیٰ نے رک کر ایک بار پھر اس تصویر کو دیکھا تھا۔

کیسے دیکھ رہے تھے اعظم شیرازی۔ بالکل فارس صاحب کی طرح۔

جھرجھری سی لے کر اس نے سوچا تھا۔ پھر سر جھٹک کر باہر چلی گئی تھی۔

☆☆☆

شام کا کھانا جنت نے فارس اور مسز شیرازی کے ساتھ لان میں کھایا تھا۔ کچھ کام کا بوجھ تھا اور کچھ اس لیے کہ فارس پچھلی کچھ راتوں سے بے آرام تھا تو سونے کی غرض سے وہ جلد ہی کمرے میں چلا گیا تھا۔ جبکہ جنت کچھ دیر تک مسز شیرازی کے پاس ہی بیٹھی رہی تھی۔

دس بجے کمرے میں گئی تو اسے پانی کا خالی گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھتے دیکھ کر چونک گئی۔ اس کا تو خیال تھا وہ اب تک سو چکا ہو گا۔

''تم ابھی تک جاگ رہے ہو۔'' ذرا سا حیران ہوئی۔

''ہاں وہ نیند نہیں آئی۔'' کہہ کر دوبارہ لیٹا۔ کمفرٹر سینے تک کھینچا۔ لیمپ آن رہنے دیا۔ جنت بائیں طرف سے اپنی جگہ پر آ گئی۔

''ایک بات پوچھوں؟''

''ہوں!'' وہ آنکھیں بند کیے ہوئے تھا۔

وہ کچھ لمحوں تک خاموش رہی۔

''تم مجھے گھر کیوں دینا چاہ رہے تھے؟'' جو سوال دل میں تھا، وہ لبوں پر آ گیا۔ وہ برابر میں بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

فارس نے دھیرے سے آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحوں تک خاموش رہا۔

''اس لیے کہ اگر تم علیحدگی کا فیصلہ کرتی ہو تو تمہارے پاس ایک مستقل ٹھکانا ہونا چاہیے۔ میں نہیں چاہتا تمہیں کسی بھی طرح کی کوئی پریشانی ہو۔''

جنت کمال اگلے کئی لمحوں تک کچھ کہہ نہ سکی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو ٹھہرے تھے۔ وہ ہمیشہ اس کے بارے میں غلط سوچتی تھی۔ غلط اندازے لگاتی تھی۔

وہ کروٹ کے بل بازو سر کے نیچے رکھے اسے دیکھنے لگا۔

''اور اگر میں نے علیحدگی کا فیصلہ نہ کیا تو؟'' کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ فارس کے لبوں پر مسکراہٹ سی پھیلی جسے دبا کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''پھر بھی تمہیں ایسا گھر چاہیے جہاں تم مجھ سے ناراض ہو کر جا سکو۔ میں تمہیں منانے آ سکوں۔''

جنت آنکھوں میں نمی اور درد لیے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ اس جواب کے لیے تیار نہیں تھی۔ بالکل بھی نہیں تھی۔ اسے ایک دم سے رونا آیا مگر ضبط کیے رہی۔

''تمہیں گھر کیسا لگا؟'' چند ثانیوں کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

''میں ٹھیک سے دیکھ نہیں سکی۔ تمہیں کیسا لگا؟'' آہستگی سے پوچھا۔

''بہترین۔ میرے خیال سے تو لوکیشن بھی پرفیکٹ ہے۔ یعنی اگر تم مجھ سے لڑ کر وجدان ہاؤس سے پیدل وہاں جانا چاہو گی تو صرف دس منٹ ہی لگیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب تمہارا اپنا ذاتی ڈرائیور ہو گا تو پھر پانچ منٹ۔ اور اگر ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھالی ہو گی۔ تو پھر پورا ایک گھنٹہ لگے گا۔''

اور وہ نم آنکھوں کے ساتھ ایک دم سے ہنس پڑی۔ فارس کے لیے اس لمحے اس کی ہنسی سے زیادہ قیمتی شے اور کچھ نہ تھی۔

''یعنی تم ابھی بھی اپنا فائدہ اور آسانی دیکھ رہے ہو۔''

''بالکل میرا حق ہے ایسا کرنا۔''

''ڈن کر دوں؟'' پھر تصدیق چاہی۔

اس نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا۔

''ویسے میں اتنی بھی کنگلی نہیں ہوں جتنا تم مجھے سمجھ رہے ہو۔'' چند لمحوں کے بعد اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ آنکھوں میں چمک ٹھہری تھی۔ لہجہ خوش گوار ہو رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے تک جو اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا وہ اب کسی پھول کی طرح کھل اٹھا تھا۔

''میرے نانا نے اپنا گھر میرے نام کیا تھا۔ بہت بڑا گھر ہے، بہت پیارا بھی ہے۔''

''ہاں لیکن اتنا دور۔ اب تمہیں کوئٹہ منانے کون جائے؟''

وہ ایک دم سے ہنسی اور اگلے ہی لمحے ٹھٹھک گئی۔

''تمہیں کیسے پتا، میرے نانا کا گھر کوئٹہ میں ہے؟''

فارس کی نیند بھک سے اڑی۔ آنکھوں پر سے بازو ہٹا کر اسے دیکھا۔ وہ کچھ دیر پہلے تک لیٹی ہوئی تھی اور اب بیڈ پر آلتی پالتی مارے انتہائی مشکوک نگاہوں سے اسے گھور رہی تھی۔

''تم نے بتایا تھا مجھے۔'' فوراً ہی سنبھل کر کہا۔

''میں نے تمہیں یہ بات کبھی نہیں بتائی۔'' وہ پورے وثوق سے بولی۔ فارس نے اندر ہی اندر خود کو کوسا۔ بھلا کیا ضرورت تھی اس طرح بات کرنے کی۔

''بتائی تھی، تم بھول گئی ہو۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ یقیناً کچھ چھپا رہے ہو مجھ سے۔''

''بالکل نہیں۔ تم ایسا کیوں سوچ رہی ہو۔''

جنت کے تیور کافی حد تک خطرناک ہو چکے تھے،

وہ لب بھینچ کر اس پر جھکی۔ ''تم نے میری جاسوسی کی؟''

فارس کا منہ کچھ صدمے اور حیرت سے کھلا۔

''میں ایسا کیوں کروں گا؟''

''یہ تو تم ہی مجھے بہتر بتا سکتے ہو۔''

''گاڈ سیک جنت!''

''پھر تمہیں یہ کیسے پتا چلا میرے نانا کا گھر کوئٹہ میں ہے؟ ہاں؟''

وہ لاجواب ہوا۔

''اور یاد ہے ایک بار تم نے مجھ سے کہا تھا۔'' کھنکھار کر گلا صاف کیا، تاثرات میں ایک دم سے مصنوعی سنجیدگی لے آئی۔

''تم میں، میں اتنی سی دلچسپی بھی نہیں رکھتا کہ اپنے آدمیوں کو تمہارے حوالے سے آرڈر دیتا پھروں۔ یاد آیا؟''

فارس کو سب اچھی طرح سے یاد آ گیا۔

''سو جاؤ جنت!'' کمفرٹر سر تک لیتے ہوئے اپنی شکل گم کرنا چاہی۔ جنت نے فوراً ہی کھینچ کر ہٹا دیا۔ ''میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔''

وہ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اب اس مسئلے سے جان کیسے چھڑائے۔ ''مجھے صبح آفس بھی جانا ہے۔''

''ہاں تو میں نے کب کہا، مت جانا۔'' لب بھینچ کر اسے گھورتی رہی۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''آخر تم مان کیوں نہیں رہے کہ تم نے میری ساری معلومات نکلوائی ہے؟''

وہ خاموش ہو گیا۔ وہ جھک کر اس کی آنکھوں کو پڑھتی رہی۔

''دیکھا۔'' پھر فوراً سیدھی ہو بیٹھی۔ ''مجھے پتا تھا، تم جھوٹ بول رہے ہو۔ میں نے اپنے کوئٹہ والے گھر کے بارے میں تمہیں کبھی کچھ نہیں بتایا۔''

وہ کہنی کے بل ذرا سا اوپر ہوا۔

''اب پن اور پیپر اٹھاؤ اور بیٹھ کر ناول لکھو۔ میں نے تمہیں تمہارے اس کوئٹہ والے گھر کی وجہ سے اپنایا ہے۔ کیونکہ وہ گھر ایک ایسے خطے پر ہے جس کی قیمت کروڑوں میں ہے۔ زمین کے نیچے خزانہ چھپا ہوا ہے۔ وہیں کہیں میری کوئی محبوبہ بھی رہتی ہے۔ جنات کے ساتھ بھی میرا رابطہ ہے۔ اور میں تمہیں بہلا پھسلا کر وہاں لے جانا چاہتا ہوں تا کہ وہاں کسی کنویں میں پھسل کر تم ہلاک ہو سکو اور میں وہ زمین ہتھیا سکوں......''

جنت اس افتاد پر ایک دم سے بوکھلائی اور پھر چڑ کر اس نے ہاتھ میں دبا ہوا کشن اٹھا کر اسے دے مارا۔ فارس کی ہنسی بے ساختہ تھی۔ ناراض ہو کر فوراً سے اٹھ گئی۔

''میں تو تمہاری مشکل آسان کر رہا تھا۔ تم ساری رات سوچتی ہی رہتیں۔ اور تمہیں نیند ہی نہ آتی۔ میں نے سوچا ممکنہ سینیریو خود ہی تیار کر دوں۔'' آنکھوں میں شرارت لیے سنجیدگی سے کہا۔ لہجہ متبسم تھا۔

سلیپرز پہنتے ہوئے جنت نے تلملا کر اسے دیکھا۔

''بات مت کرو مجھ سے تم۔'' کہہ کر باہر نکل گئی۔ دروازہ بند کر کے دروازے کو ہی چند ایک سخت گھوریاں دیں۔

''میری ساری معلومات نکلوائی ہے اور ظاہر ایسے کرتا ہے جیسے کچھ جانتا ہی نہیں۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔

پورا گھر خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے پانی پیا، ایک بوتل ساتھ لیے کمرے میں واپس آ گئی۔ آہستگی سے دروازہ بند کر کے کچھ دیر اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ اور جب تسلی ہو چکی کہ وہ سو چکا ہو گا تو اٹھ کر اس کی بیڈ سائڈ ٹیبل کی طرف آ گئی۔ موبائل کی فلیش لائٹ آن کیے آہستگی سے دراز کھولی۔ اندر پڑی اشیاء کو ادھر ادھر کیا۔ اس کی الرجی ٹیبلیٹس، کچھ ضروری کاغذات، والٹ اور گھڑی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اس نے پھر صوفے پر رکھی اس کی جیکٹ کی تلاشی لی۔ داہنی جیب سے سلیپنگ پلز اور چند ایک ادویات برآمد ہو گئیں۔

اپنے اندر ایک عجیب سی بے سکونی، وحشت بھرا خوف لیے وہ اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔

لندن جانے سے پہلے اسے یہ مسئلہ نہیں تھا۔ اتنا وہ جانتی تھی۔ یا شاید تب بھی وہ لیتا ہو۔ اسے اندازہ نہیں تھا یہ کب سے شروع

عسریسرا۔ حسنیٰ حسین

ہوا تھا۔مگر اب کچھ ادویات کا فارس کے ساتھ مستقل طور پر جڑ جانا اسے شدید پریشانی میں مبتلا کر گیا تھا۔

☆☆☆

ہفتے کا دن تھا۔اپنی نگرانی میں وہ گراؤنڈ فلور کے بیشتر کمروں کی صفائی کروا رہی تھی۔ایک نئی ترتیب سے چیزوں کو آرگنائز کرتی، غیر ضروری سامان کو اسٹور روم میں رکھواتی وہ خود بھی ملازمین کے ساتھ جتی ہوئی تھی۔لکڑی کے باکس میں دھری کچھ آرائشی اشیاء کا جائزہ لیتی وہ سجاوٹ کے لیے کچھ نئی اشیاء کا انتخاب کر چکی تھی۔

مسز شیرازی کے کہنے پر اس نے لاؤنج کی دیوار گیر کھڑکیوں کے پردے بھی بدلوا دیے تھے۔راہداری کی دیواروں پر کچھ پینٹنگز کا بھی اضافہ کر دیا تھا۔ان ڈور پلانٹس کی بھی جگہ بدلی تھی۔

اور اب وہ اسٹور روم میں مزید کچھ ایسے بیش قیمت ڈیکوریشن پیسز کا جائزہ لے رہی تھی جو اٹلی فرانس اور جانے کہاں کہاں سے خریدے گئے تھے۔

اس کے حکم پر اقصیٰ سٹول پر چڑھی، اوپری خانوں کا جائزہ لے رہی تھی۔فائلز کا ایک ڈھیر تھا جو گرد سے اٹا پڑا تھا۔کاغذات۔لفافے۔میگزین۔اخبارات۔مگر اس کی تمام تر توجہ اس آرائشی باکس کی طرف تھی جو ڈبے میں پیک کونے میں پڑا تھا اور جسے جنت نے نکالنے کا کہا تھا۔اسے وہاں سے اٹھانے کی جستجو میں ہاتھ لمبا کیے وہ ایڑیوں کے بل کچھ اوپر ہوئی تھی۔اگلے ہی لمحے اس کا توازن بگڑا تھا۔

''اقصیٰ!''اسٹول پر گرفت جمائے جنت چلائی۔اقصیٰ نے بے اختیاری کے عالم میں ایڑیاں ٹکاتے ہوئے الماری پر گرفت جمائی۔مگر وہ باوجود کوشش کے بھی ان فائلز کو نہ سنبھال سکی جو دھڑ دھڑ لڑھکتی سیدھا فرش پر آن پڑی تھیں۔

''تم ٹھیک ہو؟''جنت نے سر اٹھا کر پوچھا تھا۔

''ج......جی جی......میں فائن، بالکل فائن۔''وہ الماری سے چپکی کھڑی رہی تھی۔جنت نے بے اختیار سکھ بھرا سانس لیا۔

اقصیٰ نے آرائشی باکس اس کے حوالے کیا اور خود بے حد احتیاط سے نیچے اتر آئی۔

''اف۔ایک کام سمٹتا نہیں۔دوسرا بکھر جاتا ہے۔''فرش پر بکھرے کاغذات کا ڈھیر دیکھ کر جنت جھنجلائی تھی۔

''میں انہیں سمیٹ لیتی ہوں آپی۔''اقصیٰ کہہ کر پنجوں کے بل بیٹھ گئی تھی۔اب ایک ایک کر کے سارے کاغذات فائلز میں رکھتی جا رہی تھی۔

احتیاط سے قدم اٹھاتے ہوئے وہ جانے کے لیے مڑ ہی رہی تھی کہ نگاہ فرش پر گرے اخبار کے فرنٹ پیج پر پڑی اور وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔جھک کر اخبار اٹھا لیا۔اگلے ہی لمحے خبر پڑھتے ہی وہ صدمے سے گنگ اپنی جگہ ساکت کھڑی رہ گئی۔

اس کے سامنے حادثاتی موت کی ایک خبر تھی۔ملک کے ایک نامور بزنس ٹائیکون اعظم شیرازی کے اکلوتے بیٹے ہارون شیرازی اور پوتے حماد شیرازی کی موت کی خبر۔جو کار ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہوئے تھے۔

کپکپاتے ہاتھوں میں اخبار لیے وہ دم بخود کھڑی تھی۔

مسز شیرازی نے اپنے جوان بیٹے اور شوہر کو۔ایک ہی دن میں کھویا تھا؟

اس کی پلکیں لرز اٹھیں، وجود پر کپکپی سی طاری ہوئی۔اخبار ہاتھ میں لیے وہ راہداری میں آ گئی تھی اور وہیں سے بیک ڈور کھول کر اس نے عقبی لان کا رخ کیا تھا۔

جوان بیٹے اور شوہر کی جدائی کا صدمہ ایک ساتھ جھیلا تھا؟

وہ زینے پر رک گئی تھی۔سوئمنگ پول کے عین سامنے لان چیئرز پر مسز شیرازی فارس کے ہمراہ بیٹھی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

وہ فارس سے کچھ کہہ رہی تھیں۔پھر اس کا جواب سن کر وہ ایک دم سے مسکرانے لگی تھیں۔پھر کسی بات پر ہنس پڑیں۔

محبت کا، رحم کا، ہمدردی کا۔جانے وہ کون سا احساس تھا کہ انہیں یوں، ہنستے مسکراتے دیکھ کر اس کا دل پھٹنے لگا۔آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔

اس نے ہمیشہ انہیں بہت مضبوط دیکھا تھا۔اپنی زندگی، وقت اور حالات پر صابر اور شاکر ہی نظر آتی تھیں۔مطمئن۔پرسکون۔پرامید۔ان کی آنکھوں میں یقین کی ایک گہری چمک نظر آتی تھی۔ان کا چہرہ حسن ظن سے منور رہتا تھا۔

اس کی نظر فارس تک گئی۔وہ لان چیئر پر گردن پیچھے کی طرف گرائے آرام دہ حالت میں بیٹھا تھا۔دھوپ میں آنکھیں بند تھیں۔تاثرات نرم تھے۔

مسز شیرازی کی نظر جنت پر نہیں پڑی تھی۔مگر جنت انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔اخبار پر گرفت بڑھائے وہ واپس پلٹ آئی تھی۔اسٹور روم کا دروازہ بند کر کے وہ کتنی ہی دیر تک غیر ضروری سامان میں گھری گہری گہری سانسیں لیتی رہی تھی۔

ایک عجیب سی بے سکونی تھی جو اس کے اندر پھیل گئی تھی۔ایک اذیت بھرا احساس تھا جو اس کی رگ رگ میں سما گیا تھا۔اسے ایک دم سے مسز شیرازی کے دکھ پر، ان کے نقصان پر، ان کی اذیت پر رونا آیا۔صدمہ ایک تو نہ تھا۔وہ کس قدر مشکل حالات سے گزری تھیں۔گہری سانس لے کر اس نے اقصیٰ کو دیکھا۔

وہ اپنی دھن میں تمام بکھرے ہوئے کاغذات سمیٹنے میں لگی ہوئی تھی۔ساتھ ہی کچھ گنگنایا بھی جا رہا تھا۔ملازمہ کاغذات اور فائلز کا بھرا ہوا ایک کارٹن لیے اندر آئی۔آج صبح ہی فارس نے اپنی اسٹڈی کی صفائی کا حکم جاری کیا تھا۔سو غیر ضروری فائلز اور ڈاکومنٹس معمول کی طرح اسٹور روم میں جگہ پانے والے تھے۔ملازمہ نے وہ کارٹن بقیہ کارٹنز کے برابر میں میز پر رکھ دیا تھا۔

''فارس صاحب نے تو مانو گھر کو ہی آفس بنا دیا ہے۔'' اقصیٰ صفحے اکٹھے کر کر کے تھک گئی تھی۔ جنت نے اخبار لپیٹ کر دراز میں رکھ دیا۔ کھڑکی کی سلائڈ کھول دی۔

''اور کیا رکھنا ہے آپی؟''

''اوپر جو پردے رکھے ہیں۔ وہ لے آؤ'' اسے حکم دے کر باہر دیکھا۔ کچھ دیر تک گہری سانسیں لیتی رہی۔ اس کی دائیں طرف آج ہی فارس کی اسٹڈی سے آنے والا کارٹن ادھ کھلا سا رکھا تھا۔ خاکی رنگ کا ایک تڑا مڑا ہوا سا لفافہ کونے میں پھنسا تھا۔ اس پر کہیں روبی اکرام کا نام لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔

☆☆☆

''تم آج چپ چپ سی کیوں ہو؟''

فارس کے پوچھنے پر اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

''نہیں تو۔'' بدقت مسکرائی۔ کتاب ہاتھ میں تھی۔ اس نے ابھی تک اس کا ایک صفحہ بھی نہیں پلٹا تھا۔ گال پر پھسلتی لٹ کو کان کے پیچھے کرتے ہوئے اس نے فارس کو دیکھا۔

وہ صوفے پر تھی اور فارس بیڈ کی پائنتی کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ لیپ ٹاپ کھلا ہوا تھا۔

اس کی فریم گلاسز پر لیپ ٹاپ اسکرین سبزی مائل عکس منعکس ہو رہا تھا۔ بال ماتھے پر بکھرے تھے۔

وہ کچھ دیر تک اسے دیکھتی رہی۔

''تمہیں حماد بھائی یاد تو آتے ہوں گے۔''

اس کا سوال اتنا اچانک اور فارس کے لیے اس قدر غیر متوقع تھا کہ ٹچ پیڈ پر اس کی انگلی ایک دم سے ساکت ہوئی تھی۔ اس نے بے ساختہ نظر اٹھا کر جنت کو دیکھا تھا۔ لب باہم پیوست رہے۔ جنت کی نگاہیں اس پر جمی تھیں۔ شاید وہ منتظر تھی کہ وہ اپنے بھائی کے ذکر پر اس سے کچھ تو کہے گا۔ مگر فارس کا چہرہ سپاٹ اور زبان بالکل خاموش تھی۔

''اچانک یہ سوال کیوں؟'' خود کو مصروف ظاہر کرتے ہوئے وہ ایک بار پھر لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

''ایسے ہی خیال آ گیا'' اس نے کہا۔ ''آنٹی بھی ان کے بارے میں زیادہ بات نہیں کرتیں۔''

فارس وجدان کی آنکھیں فریملس گلاسز کے پیچھے مکمل چھپ گئی تھیں۔ اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ چہرہ مزید سپاٹ اور سنجیدہ سا لگنے لگا تھا۔

شاید گزر جانے والوں کا ذکر کچھ قریبی رشتوں کے لیے بہت تکلیف دہ ہوتا ہوگا۔ اس نے گہری سانس لے کر سوچا۔ لیکن وہ تو

آج بھی اپنے نانا کو یاد کرتی تھی اور ان کے بارے میں ڈھیروں باتیں بھی کرنا چاہتی تھی۔ جانے کیا وجہ تھی کہ اس گھر میں ان لوگوں کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا جو اسی گھر کا ایک مضبوط حصہ رہ چکے تھے۔

گہری سانس لے کر اس نے کتاب بند کر کے رکھ دی۔ پھر اٹھ کر باہر آ گئی۔

مسز شیرازی کے بیڈروم کے سامنے رک کر اس نے بند دروازے پر آہستگی سے دستک دی تھی۔

''کم ان''

اجازت ملتے ہی وہ دروازہ کھول کر اندر آ گئی تھی۔ مسز شیرازی بیڈ کراؤن کے ساتھ ٹیک لگائے، کوئی کتاب ہاتھ میں لیے بیٹھی تھیں۔ اسے دیکھ کر کچھ حیران ہوئیں۔ کہ ابھی کچھ دیر پہلے وہ فارس کے ہمراہ انہیں شب بخیر کہہ کر گئی تھی۔

''میں آپ کے پاس آ جاؤں؟'' معصومیت سے پوچھا۔

''بھلا یہ کیسا سوال ہوا؟'' کتاب رکھ کر، گلاسز ہٹاتے ہوئے انہوں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور وہ بہت سے آنسو اپنے اندر اتارتی ان کے پہلو میں لیٹتے ہوئے ان کی بانہوں میں سما گئی تھی۔

''کیا ہوا میری بیٹی کو؟''

ان کے سینے پر سر رکھے وہ نم آنکھوں کے ساتھ مسکرائی۔ ان کی آغوش میں ایک دم سے بہت سکون سا ملا تھا اسے۔

''کچھ بھی نہیں ہوا مجھے۔'' کہہ کر کچھ دیر چپ چاپ لیٹی رہی۔

وہ ان کے سامنے ان کے شوہر اور بیٹے کا ذکر کرنا چاہتی تھی۔ وہ انہیں اسٹور روم سے ملنے والے ایک اخبار کے فرنٹ پیج پر نظر آنے والی ایک خبر کا حوالہ دینا چاہتی تھی۔ غم ان کا تھا۔ درد اسے ہو رہا تھا۔ اسے اس عرصے میں پہلی بار ادراک ہوا، وہ اندر سے کس قدر ٹوٹی ہوئی تھیں۔ پہاڑ جتنی آزمائشیں جھیل کر ان کے لبوں پر آج بھی کلمہ شکر جاری رہتا تھا۔

اسے ان کے پوتے کا خیال آیا۔ وہ معصوم اور یتیم بچہ جسے وجدان ہاؤس میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اور جسے فارس وجدان قبولنے کو تیار نہیں تھا۔ اسے فارس کے ساتھ ان کی گفتگو، ان کی باتیں، التجائیہ لہجہ اور آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں یاد آئیں۔

''آپ نے فارس سے دوبارہ بات کی؟'' اس نے آہستگی سے پوچھا۔

''کون سی بات؟'' مسز شیرازی کے داہنے ہاتھ کی انگلیاں اس کے بالوں میں متحرک تھیں۔

''اپنے پوتے کے بارے میں۔'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ مسز شیرازی کا ہاتھ رک گیا۔

''پہلے میں نے سوچا تھا۔ جب میں عسریسرا کا راز پا لوں گی تو آپ مجھے ایڈریس دے دیں گی اور میں آپ کے پوتے سے ملنے جاؤں گی اور اسے یہاں لے آؤں گی۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے اپنی کمزور پڑتی آواز کو مضبوط کیا۔ ''اور اب مجھے لگ رہا

ہے کہ مجھے اس سے جلد ملنا چاہیے۔''

مسز شیرازی کے تاثرات بدل گئے۔ سیاہی مائل آنکھوں میں ایک غیر مفہوم سا تاثر ٹھہر گیا۔ جنت اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ چہرے پر پریشانی لیے اسے دیکھ رہی تھیں اور وہ انہیں۔

''میں فارس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ میں اسے سمجھانا چاہتی ہوں کہ وہ ظلم کر رہا ہے۔''

''جنت!'' انہوں نے کچھ صدمے سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے مزید کچھ کہنے سے روکا تھا۔ ایک اضطراری سی کیفیت ان کے وجود پر طاری ہو چکی تھی۔

''نہیں۔'' نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس کے ہاتھ پر گرفت بڑھائی۔ ''ہرگز نہیں۔'' ایک بار پھر زور دے کر کہا تھا۔ ''تم فارس سے اس بارے میں۔ کبھی بھی۔ کوئی بات نہیں کرو گی۔'' لہجہ تادیبی۔ انداز تاکیدی تھا۔

''آنٹی۔''

''یہ میرا اور فارس کا معاملہ ہے بیٹا! تم خود کو انوالو مت کرو۔'' انہوں نے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''تو کیا میں اس فیملی کا حصہ نہیں ہوں؟'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''ایسی بات نہیں ہے بچے۔'' پیار سے کہا۔

''تو پھر کیوں۔ آپ پھر کیوں مجھے اپنے پوتے سے ملنے نہیں دے رہیں۔''

''میری طرف دیکھو۔'' گیلی آنکھوں سے اب وہ ان کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ تاثرات یوں ہو رہے تھے جیسے ابھی کسی وقت رو دے گی۔ ماں اور بیٹے کی یہ کیسی محبت تھی کہ ماں صبر پر صبر کیے جا رہی تھی۔ اور بیٹا جبر پر جبر۔ اتنے غم انہوں نے سہے تھے اور اب پوتے کی جدائی بھی جھیل رہی تھیں۔

''تم فارس کے بارے میں کچھ الٹا سیدھا نہیں سوچو گی۔'' انہوں نے جیسے اس کے تاثرات اور آنکھوں سے اس کی سوچ ایک بار پھر پڑھ لی تھی۔ ''وہ میرا بہت پیارا بیٹا ہے۔ اس نے مجھے کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچائی۔'' وہ کہہ رہی تھیں۔

''ریان میرا پوتا ہے۔ میں جانتی ہوں، مجھے اس معاملے کو کیسے ہینڈل کرنا ہے۔'' انہوں نے غم اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات کو چھپاتے ہوئے متوازن لہجے میں سنجیدگی سے کہا تھا۔

''مگر تم۔ تم اس معاملے میں کبھی نہیں پڑو گی۔ کبھی بھی نہیں۔''

وہ کچھ فکرمندی سے انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔ اس کا تو خیال تھا وہ اس کی مدد کریں گی مگر انہوں نے تو صاف انکار کر دیا تھا۔

''میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا آنٹی۔'' اس نے یاد دلایا۔

''تم نے یہ بات کہہ دی۔ میں سمجھوں گی تمہارا وعدہ پورا ہو چکا۔''

جنت انہیں بے بسی سے دیکھ کر رہ گئی۔

''وعدہ کرو۔ تم کبھی بھی فارس سے کوئی بات نہیں کرو گی۔ ریان کا نام بھی نہیں لو گی۔''

اس کا سر جھک گیا۔

''کب تک۔ آخر کب تک۔ آپ یہ سہیں گی؟'' اس نے نظر اٹھائی تو آنسو گال پر پھسل گئے۔ ''میں ماں بننے والی ہوں۔ میں نے ابھی اپنے بچے کو اپنے ہاتھوں میں نہیں لیا ہے۔ لیکن ابھی سے۔ آنٹی ابھی سے سوچ آ جائے تو میرا دل پھٹنے لگتا ہے اور آپ۔''

''جنت!'' انہوں نے تڑپ کر اسے دیکھا تھا۔ اور اگلے ہی پل اسے سینے سے لگا لیا تھا۔ ''کیا ہو گیا ہے بچے؟ یہ کیا سوچ رہی ہو تم؟ میں پریشان نہیں ہوں۔ تو تم کیوں ہو رہی ہو؟'' وہ روتی جا رہی تھی اور جس کا درد تھا وہ اس کی پشت سہلا رہی تھیں۔

''مجھے اللہ پر پورا یقین ہے۔ وہ میرے لیے آسانی کرے گا۔ تم پریشان مت ہو۔'' وہ کہہ رہی تھیں۔ پھر اسے خود سے الگ کر کے اس کے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھا۔ ''میں فارس سے خود بات کروں گی جنت۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ اس سے زیادہ جیسے خود کو تسلی دے رہی تھیں۔ ''تم بس دعا کرو میرے پوتے کے لیے۔ صرف دعا۔'' پھر مسکرائیں۔

''اب جاؤ! آرام کرو۔ اور کچھ نہیں سوچنا!'' پیار سے گال پر ہاتھ رکھا۔ وہ آنسو صاف کرتی اٹھ کر چلی گئی۔ دروازہ بند ہوا تو مسز شیرازی نے ایک گہری سانس لے کر اپنی پشت بیڈ کراؤن کے ساتھ ٹکائی تھی۔ ان کی آنکھوں میں اضطراب نمایاں تھا۔ ہاتھوں میں کپکپاہٹ نظر آ رہی تھی۔ اور دل تو جیسے غم سے پھٹنے کو تھا۔

انہوں نے گہری سانس لے کر آنکھیں موند لی تھیں۔ لبوں پر ورد جاری تھا۔ ذکر جاری تھا۔ دعا جاری تھی۔

اپنے ہر دکھ، ہر درد۔ اور ہر اذیت پر انہیں ہر صورت صبر کرنا تھا۔

☆☆☆

لاؤنج میں وہ صوفے پر لیٹی تھی۔ فارس سامنے ہی بیٹھ کر کسی غیر ملکی چینل پر کچھ خبریں اور کاروباری پروگرامز دیکھ رہا تھا۔

کال ریسیو کرتے ہوئے وہ اٹھ کر مسز شیرازی کے پاس چلا گیا تو صوفے پر لیٹے لیٹے وہ پاپ کارن کھاتے ہوئے موبائل پر لگی رہی۔ غیر ملکی چینل اسکرین پر ایڈ چل رہے تھے۔ آواز قدرے مدھم تھی۔ ایک پروگرام ختم ہوا تو دوسرا شروع ہوا۔ منظر ایک اسٹیج کا تھا۔ مختلف اینگل سے کیمرہ گھماتے ہوئے آڈئینس دکھائی گئی۔ بیک گراؤنڈ میں پروگرام کا نام لکھا نظر آ رہا تھا۔ ہوسٹ پروگرام کا آغاز کر چکی تھی۔ ایک شاندار سی ڈاکومنٹری ویڈیو چلا دی گئی۔

ریمپ پر مختلف ملبوسات میں واک کرتی ایک حسین خاتون، مختلف زاویے اور اینگل سے، مختلف ایونٹ میں لی جانی والی

تصاویر جن میں سرخ کارپٹ کی تصاویر سب سے نمایاں تھیں۔کہیں انٹرویو دیتی ہوئی۔کہیں مسکراتے ہوئے کیمرے کی طرف ہاتھ ہلا کر دیکھتی ہوئی۔کچھ ایکٹنگ کے سین تھے۔کہیں وہ وائس اوور کرتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔کہیں وہ اپنی پراڈکٹ لانچ کے دوران مرکز نگاہ بنی ہوئی تھیں۔کہیں چیریٹی ورک کرتے۔کہیں مہاجر کیمپ کا دورہ کرتے۔شامی پناہ گزینوں میں راشن بانٹتے۔کہیں کسی آرگنائزیشن سے منسلک ہو کر کسی کے لیے آواز اٹھاتے ہوئے۔

تعارف کے ساتھ بھرپور تالیوں کے بیچ وہ اسٹیج کی طرف جاتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔

موبائل پر جھک کر ٹائپنگ کرتی جنت نے گہری سانس لے کر سر اٹھایا۔وہ ریموٹ سے آواز کم کرنا چاہ رہی تھی مگر اگلے ہی پل۔ایک امریکن ہوسٹ کے سامنے براجمان اس پرکشش سی خاتون پر نظر پڑتے ہی رک گئی۔آنکھوں میں ایک دم سے حیرانی اتری۔

اسمارٹ سا سراپا، کریم رنگ کا میکسی نما سادہ سا لباس، سنہری بال ہلکا سا کرل لیے شانوں پر بکھرے تھے، نفیس سا ڈائمنڈ جیولری سیٹ، انگلیوں میں بھی ڈائمنڈ رنگ تھی۔نازک پنسل ہیل جس میں پاؤں نمایاں ہو رہے تھے۔سفید دودھیا رنگت نیچرل لک دیتے میک اپ سے کچھ اور کھل رہی تھی۔عمر یہی کوئی چالیس برس ہوگی۔اس نے خود سے اندازہ لگایا۔یا شاید وہ اپنی اصل سے بہت کم نظر آتی تھیں۔

وہ اگلے کئی لمحوں تک شناسا نظر آتے اس چہرے پر سے نظر نہ ہٹا سکی۔کیا مشابہت تھی اس چہرے میں۔اجنبی ہو کر ایک دم سے شناسا سا نظر آنے لگا تھا۔

خوش گوار حیرت کے ساتھ والیوم بڑھا دیا۔

ہوسٹ مختلف سوال کرتی جا رہی تھی اور وہ بہت ہی دھیمے لہجے میں بہت نزاکت سے جواب دے رہی تھیں۔

وہ ایک امریکی نژاد پاکستانی ماڈل اور کامیاب بزنس وومن تھیں۔جو بیس نوجوان آنٹراپرونورز (entrepreneur) کو اسٹارٹ اپ فنڈ دینے والی تھیں۔یہ پروگرام اسی حوالے سے تھا۔ساتھ ہی ان کی کامیابی کا راز۔اور اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں بھی سوال کیے جا رہے تھے۔وہ سر اٹھائے، گردن سیدھی کیے ہر سوال کا جواب بہت سنجیدگی، متانت اور خوش اخلاقی سے دے رہی تھیں۔آنکھوں میں ایک فاتحانہ چمک۔اور مسکراہٹ تو ویسے ہی زندہ دلی کا ثبوت دے رہی تھی۔جنت ان کی شخصیت سے ایک دم سے مرعوب ہوئی۔وہ اسے بقیہ سیلیبریٹیز کی طرح نہیں لگ رہی تھیں۔اسے ان کی باتیں، بولنے کا طریقہ اچھا لگا۔مسکراہٹ پر تو ویسے ہی دل آیا ہوا تھا۔

ایڈ کا سلسلہ شروع ہوا تو اس نے والیوم کم کر دیا۔

راہداری سے نکل کر فارس موبائل پر کچھ ٹائپ کرتا اوپن کچن میں چلا گیا۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟''

''تمہارا فیمیل ورژن۔''ہنس کر بولی۔''عمر میں تم سے بڑی ہیں۔لیکن کمال کی ہیں۔کہیں تمہاری کوئی بچھڑی ہوئی آپا تو نہیں ہیں؟''

''یہ کوئی اور مذاق ہوگا تمہارا۔''وہ ناسمجھی کے عالم میں مسکرا دیا۔

''اور مسکراتی بھی بالکل تمہاری طرح ہیں۔''جھٹ سے کہا۔

''کس کو دیکھ لیا ہے تم نے۔''

''ایک بزنس وومن ہیں۔''صوفے کی بیک سائڈ پر بازو ٹکاتے ہوئے مڑ کر جواب دیا۔کچن کاؤنٹر کے اس پار وہ اس کی جانب پشت کیے اورنج جوس کے لیے مالٹے کاٹ رہا تھا۔

''کوئی سات برانڈز تو اب تک لانچ کر چکی ہیں۔مجھے تو بہت خوشی ہو رہی ہے کہ وہ پاکستانی ہیں۔''

فارس کی حرکت لمحے بھر کے لیے تھمی۔صرف ایک لمحے کے لیے۔

''اچھا!''سر جھٹک کر اپنا کام کرنے لگا

''اب شاید ان کا پاکستان کے لیے بھی کوئی بزنس پلان ہے۔کچھ نوجوانوں کو اسٹارٹ اپ فنڈنگ دیں گی۔کچھ ایسا ہی کہہ رہی تھیں۔''آدھا انٹرویو سن کے جو باتیں سمجھ میں آئی تھیں۔اپنی دھن میں بتا رہی تھی۔

فارس چپ رہا تو اسے لگا شاید اسے اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی ہے۔

''مطلب جو پاکستان کے نئے آنٹراپرونورز ہیں۔جو اپنا وینچر سیٹ کرنا چاہتے ہیں۔ان کے ساتھ پارٹنرشپ کر کے انہیں اسٹارٹ اپ فنڈز دیں گی۔لیکن اس سے پہلے ان کی ٹیم پارٹیسپیٹ کرنے والوں کا بزنس پلان دیکھے گی۔ان کی قابلیت جانچے گی پھر سلیکٹ کرے گی......اور مزے کی بات یہ ہے کہ بہت سی غیر ملکی کمپنیز بھی ان کے ساتھ حصہ لے رہی ہیں۔''

''ہونہہ!''اس کا دھیان کہیں اور تھا۔

''جیوری کی ٹیم میں کیا تم بھی شامل ہوگے؟''فارس اپنی جگہ رک گیا۔مڑ کر اسے دیکھا۔''میرا کیا دخل؟''

''آئی مین باہر سے ٹیم آئے گی۔اور تمہارا بھی تو ایک نام ہے بزنس کی دنیا میں۔پاکستانی ہو کر اس ٹیم میں شامل نہیں ہو گے تو کیا فائدہ؟''

''میرے بزنس مین ہونے کا؟''

عسریسرا۔ حسنیٰ حسین

''پاکستانی ہونے کا۔'' لفظوں پر زور دے کر بولی۔ ''تمہیں لازمی انویسٹ کرنا چاہیے۔'' اسے مشورہ دے کر پاپ کارن منہ میں ڈالے۔

فارس کو ایک غیر ملکی ٹی وی چینل کو اس کے سامنے کھلا چھوڑ دینے پر پچھتاوا ہوا۔ گہری سانس لے کر پھر سے مالٹے کاٹنے لگا۔

ایڈ ختم ہوا تو انٹرویو کا سلسلہ نئے سرے سے جوڑا گیا۔ پہلا حصہ کاروباری سوالات پر مشتمل تھا تو اب ان کی ذاتی زندگی سے متعلق سوال ہونے تھے۔

''تو کیا یہ اڑتی ہوئی افواہیں سچ ہیں کہ آپ دادی بننے والی ہیں۔''

ہوسٹ کے بالکل سامنے صوفے پر بیٹھی وہ کامیاب خاتون ایک دم سے ہنس پڑیں۔ ''اس طرح کی خبریں آپ لوگوں تک کیسے پہنچ جاتی ہیں۔''

وہ آواز۔ وہ شیریں اور دلفریب آواز۔ فارس کے ہاتھ ساکت۔ وجود پتھر کا ہو گیا۔

''بس ہمارے ذرائع آپ سے متعلق ہر چھوٹی بڑی خبر ہم تک پہنچا دیتے ہیں۔''

آڈیئنس میں ایک شور سا مچ گیا تھا۔

''جی بالکل۔ میں جلد ہی دادی بننے والی ہوں۔''

وجود پر ایک لرزہ سا طاری ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے کاؤنٹر تھاما تھا۔ وہ آواز۔ ہنسی کی جھنکار۔

پاپ کارن کھاتے ہوئے جنت نے آواز اونچی کی۔ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

''ایک نوجوان سی دادی۔ ذرا دیکھیے تو...... میں آپ سے صرف تین سال بڑی ہوں اور مجھے آپ کے سامنے اپنا آپ بوڑھا لگ رہا ہے۔''

وہ اپنے مخصوص انداز میں بالکل ویسے ہی ہنس پڑیں۔

''ذرا بتایئے، آپ کی اس جوانی اور خوب صورتی کا کیا راز ہے؟''

''اوہ پلیز یہ سوال نہیں۔ تقریباً ہر انٹرویو میں مجھ سے یہی سوال پوچھا جاتا ہے۔''

جنت اٹھ کر بیٹھی اب بغور دیکھ رہی تھی۔

''سو آپ کے بیٹے کے حوالے سے۔'' اس سے پہلے کہ بات مکمل ہوتی، فارس نے اس کے ہاتھ سے ریموٹ جھپٹ کر ٹی وی آف کر دیا۔

اس طرح بہت اچانک ٹی بند ہو جانے پر وہ ایک دم سے چونکی۔ ''ارے۔ بند کیوں کر دیا۔'' ہاتھ بڑھا کر ریموٹ لینا چاہا تو

اپنی جگہ رک گئی۔

فارس کی نگاہیں سیاہ تاریک اسکرین پر ٹھہری تھیں۔ خالی۔ ویران۔ سفید۔ کوئی عکس نہیں۔ کوئی احساس۔ کوئی رنگ۔ کوئی اثر نہیں۔ چہرہ مکمل تاریک۔ پیشانی کی رگیں ایک دم سے نمایاں ہوئی تھیں۔ جبڑے سختی سے بھینچ گئے تھے۔

''فارس؟'' اس کے لب ہلے۔

ایک دم سے اپنے آپ میں واپس آتے ہوئے اس نے جنت کو دیکھا تھا۔ شور تھم گیا۔ آوازیں ختم ہو گئیں۔

''میں مالٹے کاٹ کاٹ کے تھک گیا ہوں۔ اب باقی کا کام تم سنبھالو۔ اٹھو۔'' وہ جو ایک دم سے اس کے تاثرات سے پریشان ہوئی تھی۔ تپ گئی۔

''خود کرو جو کرنا ہے۔'' ریموٹ واپس لینا چاہا تو اس نے سیل نکال کر جیب میں ڈال لیے۔ بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کچن کاؤنٹر کی طرف لے آیا۔

''یہ اتنے سے مالٹے کاٹ کاٹ کے تھک گئے ہو تم؟''

وہ اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ گلاس میں پانی ڈال کر غٹا غٹ چڑھا گیا۔ جنت نے بگڑے تیوروں کے ساتھ چھری اٹھالی۔ اور اس کے پیچھے وہ کاؤنٹر پر ہتھیلیاں جمائے آگے کو جھک کر گہری سانسیں لے رہا تھا۔ اعصاب مشتعل ہو رہے تھے۔ اندر باہر ایک آگ سی جل اٹھی تھی۔

سامنے لاؤنج میں اسکرین تاریک تھی مگر منظر آنکھوں میں چل رہا تھا۔ آواز بند ہو چکی تھی مگر ہنسی جیسے پورے گھر میں گونج رہی تھی۔ وہ بے طرح مضطرب ہو رہا تھا۔

جنت مالٹوں کا جوس تیار کر کے انہیں گلاس میں ڈال کر فارغ ہوئی تو فارس اسے کہیں نظر نہ آیا۔ ٹرے اٹھائے مسز شیرازی کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ بھی وہیں بیٹھا تھا۔

سب کو ایک ایک گلاس پیش کر کے، اپنا گلاس ہاتھوں میں لے کر ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اب وہ ان سے باتیں کر رہی تھی۔ شاید کسی پروگرام کا بتا رہی تھی۔ یا شاید مہمانوں کے لیے کل کا مینو ترتیب دے رہی تھی۔ وہ خالی الذہنی کے عالم میں اپنے آس پاس گہرے سناٹے لیے بیٹھا رہا۔

پھر مسز شیرازی سے اجازت چاہتے ہوئے اٹھ کر چلا گیا۔

جنت کمرے میں آئی تو وہ لیٹا ہوا تھا۔

''سنو۔'' ذرا سا جھک کر مخاطب کیا۔

"ہوں۔" وہ تکیے میں سر دیے آڑا ترچھا پڑا تھا۔منہ آنکھیں سب بازو میں چھپا تھا۔

"تم سو رہے ہو؟"

"ہونہہ۔"

"ابھی تو نو بھی نہیں بجے۔" مایوس ہوئی۔عموماً وہ آدھا گھنٹہ شام میں اس کے ساتھ لان میں روز واک کرتی تھی۔آج پتا نہیں اسے کیا ہوا تھا۔اتنی جلدی سو رہا تھا۔

"طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟"

خاموشی۔

لائٹس آف کر کے وہ دوسری طرف آ بیٹھی۔ہاتھوں پر لوشن لگاتے ہوئے چند لمحوں تک ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھتی رہی پھر وہ خود بھی سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔

☆☆☆

روزمرہ کی روٹین کے مطابق ورک آؤٹ کروانے کے بعد وہ آفس کے لیے روانہ ہو چکا تو وہ گھر میں گھومتی پھرتی انتظامات کا جائزہ لینے لگی۔آفس روم کی صفائی تقریباً روز ہوتی تھی۔آج بھی ہو رہی تھی تو وہ دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔

ایک طائرانہ نگاہ اطراف میں دوڑانے کے بعد آفس چیئر پر بیٹھ کر دائیں بائیں گھومتے ہوئے دیوار گیر کھڑکیوں سے باہر دیکھنے لگی۔لان میں دھوپ اتری ہوئی تھی۔آسمان اجلا لگ رہا تھا۔وہ مالی عبدالغفور کو پودوں پر جھکا ہوا دیکھ سکتی تھی۔اقصیٰ کبھی دائیں اور کبھی گھوم کر بائیں طرف آ کر ہاتھ ہلاتے ہوئے اپنے باپ سے جانے کیا کہہ رہی تھی۔کئی بار اس نے رونی شکل بنائی تھی۔اور جب وہ سر جھکائے کھڑی ہوئی تو واضح لگ رہا تھا،اب اسے اپنے باپ سے ڈانٹ پڑ رہی ہے۔

اس نے ملازمہ کو لان سے تازہ پھول توڑ کر لانے کا حکم دیا۔اور پھر میز پر کہنیاں ٹکائے میز پر دھری اشیاء کو دیکھنے لگی۔درازوں میں فائلز۔کچھ پیپرز وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔

دوسری میڈ شیشے کی میز صاف کر رہی تھی۔چھوٹے کارپٹ پر ویکیوم پھیرا گیا۔کاؤچ کے کشن ترتیب سے رکھے گئے۔کام تمام کر کے آفس ٹیبل کے پاس رکھی ڈسٹ بن خالی کرنا چاہی۔تب ہی شاپر ہاتھ سے چھوٹا تھا۔لکڑی کی ٹائلز پر خاکی لفافہ، پھٹے ہوئے کاغذات،تڑوڑ مروڑ کا شکار کچھ صفحے بکھر گئے تھے۔معذرت چاہتے ہوئے میڈ دوبارہ سے سب سمیٹنے لگی تھی۔

"کوئی بات نہیں۔" اس نے سر ہلایا۔یکایک اس کی نظر خاکی لفافے پر پڑی۔سیاہ مارکر سے بڑا بڑا کر کے "روبی اکرام" لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔کسی خاتون کا خط تھا۔

"یہ دکھانا مجھے۔" اس نے کہا تو میڈ نے فوراً سے لفافہ اس کے حوالے کر دیا۔اس نے لفافہ موڑ کر دیکھا۔جس پتے سے بھیجا گیا تھا وہ پتا اور ساتھ ہی فون نمبر بھی درج تھا۔

"حیرت ہے،فارس نے پڑھے بغیر ہی پھینک دیا۔" ایک تجسس سا لیے اس نے لفافہ چاک کر کے فولڈ کیا ہوا صفحہ نکالا۔

روبی اکرام کا وہ خط فارس شیرازی کے نام تھا۔جنت ناسمجھی کے عالم میں چند لمحوں تک کھڑی رہی پھر ملازمہ کے ذمے چند ایک کام لگاتے ہوئے وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔اس نے لفافہ چاک کر دیا۔بھورے رنگ کا بے طرح فولڈ کیا ہوا کاغذ نکال کر کھولا۔وہ ایک طویل سا خط بہت سے حوالہ جات پر مشتمل تھا۔پہلے پہل وہ سمجھ نہ پائی وہ کیا پڑھ رہی ہے مگر جب سلام دعا اور خیر خیریت کے بعد ایک معقول اسلوب سے کسی ریان شیرازی کا حوالہ شروع ہوا تو وہ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

ریان شیرازی ساڑھے پندرہ ماہ کا بچہ جو اوصاف منزل میں اپنے ماموں کے یہاں رہ رہا تھا۔روبی اکرام اس گھر کی ملازمہ تھی۔بچہ اس کے ساتھ رہتا تھا۔اور وہ اپنی سادہ سی تحریر کے ذریعے بتاتی جا رہی تھی کہ اوصاف منزل میں وہ بچہ کس حال میں تھا اور کس طرح سے رہ رہا تھا۔جنت جیسے جیسے پڑھتی جا رہی تھی،اس کی سانسیں رکتی جا رہی تھیں۔

"مجھے رشیداں سے پتا چلا،آپ ڈھیر سارا پیسہ دیتے ہیں۔لیکن طارق صاحب اس میں سے ایک روپیہ بھی ریان پر خرچ نہیں کرتے۔میں تو دودھ میں بھی پانی ملا کر دیتی ہوں۔جو روٹی بچ جاتی ہے اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے کھلاتی ہوں۔

بیگم صاحبہ ہر چیز پر نظر رکھتی ہیں۔رمشہ باجی اپنے بیٹے کے کپڑے دے دیتی ہیں تو وہی اسے پہناتی ہوں۔وہ بہت کمزور ہے۔اور بیمار بھی ہے۔میں نے طارق صاحب کو بتایا تو انہوں نے تھوڑے سے پیسے دے کر کہا کہ دوائیاں منگوا لو۔اب میں اتنے سے بچے کو ڈاکٹر کو دکھائے بغیر کیسے دوائیاں منگوا سکتی تھی؟"

جنت کا داہنا ہاتھ بے ساختہ لبوں پر آ ٹھہرا۔مسز شیرازی کا پوتا۔فارس کا بھتیجا۔اس حال میں؟

مسز شیرازی تو قطعی لاعلم تھیں اس سب سے۔تو کیا۔کیا فارس بھی؟ یا پھر وہ سب جانتے بوجھتے ہوئے بھی ریان کو وہاں چھوڑے ہوئے ہے؟

اس کا سر بے اختیار نفی میں ہلا۔فارس اتنا بے حس نہیں ہو سکتا۔وہ ایک یتیم بچے کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا۔مگر خط کی تحریر۔اس کے ذہن میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔

"آپ پیسے بھیجتے ہو لیکن کبھی ریان کو دیکھنے نہیں آئے۔ریان کی ماں بھی نہیں آتی۔ثمرین کی شادی پر بھی نہیں آئی تھی ورنہ میں اس سے بات کرتی۔

ریان بیمار رہتا ہے۔اس کا ہاتھ دروازے میں آ گیا تھا۔اور تب سے ٹھیک نہیں ہوا۔اور وہ اپنی مٹھی بند رکھتا ہے۔میں ذرا سا

عسریسرا۔ حسنیٰ حسین

ہاتھ لگاؤں تو چیختا ہے۔اسے درد ہوتا ہوگا نا۔‘‘

جنت کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔آنکھیں تر ہونے لگیں۔

’’یہ میرا چوتھا خط ہے۔میں چار مہینوں سے انتظار کر رہی ہوں۔ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا۔صاحب میں آپ سے گزارش کرتی ہوں آپ ریان کو یہاں سے لے جاؤ۔

یہ میرا فون نمبر ہے۔مجھ سے اس پر رابطہ کر سکتے ہیں۔‘‘

اور نیچے فون نمبر درج تھا۔

بات ختم ہوگئی۔خط ختم ہوگیا۔درد ختم نہ ہوا۔وحشت ختم نہ ہوئی۔اس نے بے اختیار میز کا سہارا لیا تھا۔اور پھر گرنے کے سے انداز میں کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

آنکھوں میں بے یقینی سی اتری ہوئی تھی۔اپنے حواس مختل ہوتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔وہ جانتی تھی فارس کا بھتیجا اپنے ننھیال میں رہ رہا ہے۔ایسے رہ رہا ہے۔اور اس طرح سے رہ رہا ہے اس کا تو اس نے گمان بھی نہیں کیا تھا۔

مسز شیرازی اور فارس وجدان کے مابین اس نے ریان کا ذکر صرف ایک بار سنا تھا۔صرف ایک بار۔جب وہ اسے گھر لانے کی بات کر رہی تھیں۔تب دروازے کی درز سے اندر دیکھتے اور چھپ کر ان کی بات سنتے اس نے فارس وجدان کو ایک دم سے اشتعال میں آتے دیکھا تھا۔

اس نے چند ایک بار مسز شیرازی سے ان کے پوتے کے بارے میں بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ ہمیشہ اس بات کو ٹال دیتی تھیں۔انہوں نے حال ہی میں اسے فارس سے کوئی بھی بات کرنے سے منع کر دیا تھا۔وہ اسے اس معاملے سے قطعی دور رکھنا چاہتی تھیں۔

انہوں نے کبھی بھی کسی اختلاف کی نشان دہی نہیں کی تھی اور نہ ہی کبھی کسی مسئلے کا ذکر کیا تھا۔وہ ہمیشہ ایسے ہی ظاہر کرتی تھیں جیسے یہ کوئی سنجیدہ معاملہ نہیں تھا۔مگر وہ جانتی تھی وہ اپنے یتیم پوتے کی وجہ سے کس قدر اذیت میں رہتی تھیں۔کتنا غم سہتی تھی اور کتنے درد میں روتی تھیں۔تب ہی اس نے ہمت بندھائی تھی اور وعدہ کیا تھا۔

وہ وعدہ جو وہ ابھی تک ایفا نہیں کر سکی تھی۔بات عسر یسرا کی تھی تو اس نے خود ہی شرط رکھ دی تھی۔مگر اب اسے ادراک ہوا تھا مسز شیرازی اسے ریان سے ملوانا ہی نہیں چاہتی تھیں۔ورنہ ایک ایڈریس دینا کون سا مشکل کام تھا؟ آخر انہیں کیا خوف اور پریشانی لاحق تھی کہ انہیں خود پر یہ جبر کرنا پڑ رہا تھا؟

کیا فارس اور حماد کے درمیان کوئی اختلاف تھا؟ کیا وہ اسی اختلاف کی بنا پر اپنے بھتیجے کو قبول لنے کو تیار نہیں ہے؟ خط پر اپنی لرزتی

انگلیوں کی گرفت بڑھاتے ہوئے اس نے شدت سے دھڑکتے دل کے ساتھ کچھ پریشانی سے سوچا تھا۔

کیا وہ اختلاف، وہ جھگڑا، وہ نفرت اتنی شدید تھی کہ بھائی کے موت کے بعد بھی۔

اسے ایک دم سے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔اس کی نگاہیں فارس وجدان کے وسیع آفس روم میں یہاں وہاں بھٹک رہی تھیں۔ان میں ہراس سا پھیلا تھا۔ان میں وحشت سی اتری ہوئی تھی۔

’’کوئی اتنا سنگدل کیسے ہو سکتا ہے؟‘‘ وہ سوچنے لگی تھی۔وہ پھر سے سوچنے لگی تھی۔اور ایک دم سے سوچ جامد ہوئی تھی۔وجود میں سناٹا پھیلا تھا۔آفس روم تنگ و تاریک ہوگیا۔آس پاس خاموشی چھا گئی تھی۔

شدید محبت اور اس قدر مضبوط رشتے کے باوجود آخر کیا وجہ تھی کہ مسز شیرازی ابھی تک فارس وجدان کو ریان کے لیے قائل نہیں کر سکی تھیں؟

ملازمہ سامنے ہی ریک پر ترتیب سے رکھی فائلز کو صاف کر رہی تھی۔پھر اس نے گلدان سے مرجھائے ہوئے پھول نکال کر تازہ پھول ڈالنا شروع کر دطے۔اس کے آس پاس ایک دم سے خوشبو پھیلی۔

’’اسے الزام مت دو جنت! میں بھی نہیں دیتی۔‘‘ انہوں نے کہا تھا۔

اس تمام عرصے میں وہ ان کے لیے فارس کی محبت دیکھ چکی تھی۔وہ ان کی تکلیف پر کس قدر بے چین ہو جاتا تھا۔ان کا کوئی بھی حکم کسی صورت نہیں ٹالتا تھا۔اسے ان کی فکر رہتی تھی۔اس کے باوجود یہ رویہ۔

وہ بے انتہا الجھنوں کے ساتھ اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی تھی۔

روبی کا خط ہاتھوں میں تھا۔روبی کا نمبر بھی۔اس کی خواہش اس طرح پوری ہوگی۔ریان تک پہنچنے کا راستہ ایسے نکلے گا اس کے بارے میں تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔

اس نے مطلوبہ نمبر ڈائل کر کے سیل فون کان سے لگا لیا۔کچھ دیر تک اپنی دھڑکنوں کے ساتھ ساتھ گھنٹی کی آواز سنتی رہی۔کچھ تاخیر سے ہی سہی لیکن کال اٹھا لی گئی۔

’’ہیلو۔‘‘ وہ سمجھ رہی تھی کوئی خاتون ہوں گی مگر آواز کسی لڑکی کی تھی۔

’’روبی اکرام بات کر رہی ہیں؟‘‘

’’جی کون؟‘‘ دوسری طرف سے وہ الرٹ ہوئی تھی۔

’’میں......‘‘ اس نے رک کر اپنے اس رشتے کو سوچا تھا جو ریان سے تھا۔’’میں ریان کی چچی بات کر رہی ہوں۔‘‘

دوسری طرف روبی اکرام ایک جھٹکے سے اپنی چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''آپ......آپ واقعی ریان کی چچی ہیں؟'' اس کی آواز ایک دم سے بھرا گئی تھی۔ ''میں نے اتنے خط لکھے۔ اتنی دعائیں مانگیں۔''

خوشی کی انتہا نہ تھی۔ مڑ کر سوئے ہوئے بچے کو دیکھا پھر منہ پر ہاتھ رکھے کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اسے تو جیسے ابھی بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ ریان کے ددھیال سے رابطہ ہو گیا تھا۔

''جی۔ مجھے آپ کا خط ملا تھا روبی!'' اس نے خشک لبوں کو تر کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''ریان کیسا ہے؟''

''ٹھیک ہے جی۔'' مڑ کر نہال ہوتی نگاہوں سے معصوم چہرے کو دیکھا۔ آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ ''سو رہا ہے۔''

''ہاتھ کیسا ہے اب اس کا؟''

''ویسا ہی ہے۔ میں نے رشیداں سے بولا تھا۔ کہہ رہی تھی، ڈاکٹر کو دکھانے لے جائے گی۔ ڈاکٹر فیس بھی تو بھاری لے گا۔ رشیداں اس لیے نہیں لے جاتی۔ اس کا گھر والا ہے بھی بڑے غصے والا۔''

پلکیں جھپکا کر نمی اپنے اتارتے ہوئے جنت نے سر اٹھایا۔

''آپ......آپ مجھے بتاؤ۔ آپ کب آؤ گی لینے؟''

وہ منتظر سی پوچھ رہی تھی کہ اور کتنے دن ریان شیرازی اس حال میں اوصاف منزل میں رہے گا۔ اس کا بس چلتا تو وہ خود بچے کو چھوڑنے آ جاتی۔

''میں جلد آؤں گی روبی!! تم بس ریان کا اچھے سے خیال رکھو۔''

''جلد......یعنی کب......کل......؟''

نچلا لب دانتوں تلے دبیے۔ جھلملاتی آنکھوں سے وہ سر جھکائے رہی۔

''کیا ریان کی مما سے رابطہ نہیں ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

روبی کے کندھے جھک گئے۔ چہرے پر مایوسی در آئی۔ ''میں نے آپ کو سب بتایا ہے۔ آپ پھر بھی ریان کو لینے نہیں آؤ گی؟'' وہ اس کے سوال کا جواب دیے بغیر اپنی کہہ رہی تھی۔

''ایسا نہیں ہے روبی۔ ورنہ میں تم سے رابطہ کیوں کرتی؟'' اس نے سنبھل کر کہا۔ روبی کو کچھ حوصلہ ہوا۔ ''تم مجھے اوصاف منزل کا ایڈریس میسج کر دو۔ میں ان شاءاللہ جلد ریان سے ملنے آؤں گی۔''

''ملنے نہیں۔'' روبی کی آواز میں عجیب سا احساس تھا۔ ''لینے آنا آپ اسے۔''

''لینے ہی آؤں گی۔'' حتمی لہجے میں کہہ کر اس نے کال کاٹ دی تھی۔

☆☆☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب خوف کے عالم میں اس کی اچانک آنکھ کھل گئی تھی۔

پیشانی پسینے سے تر بتر۔ اور سانسیں بھی چڑھی ہوئی تھیں۔ کہنی کے بل ذرا سا اوپر ہوئی کہ پانی کی بوتل اٹھا سکے مگر سائڈ ٹیبل پر کچھ نہیں رکھا تھا۔ روہانسا ہو کر سر تکیے پر گرا لیا۔

''فارس۔'' اس نے بند آنکھوں کے ساتھ اسے ہلایا۔ حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔

فارس نے اس کی آواز پر بیدار ہوتے ہی کروٹ بدلی تھی۔

''پانی......پانی چاہیے۔''

وہ اسی وقت اٹھ کر روم فریج سے بوتل نکال لایا تھا۔ بازو کے سہارے اسے اٹھا کر بٹھاتے ہوئے گلاس دیا۔ اس نے پانی یوں پیا جیسے صدیوں کی پیاسی ہو۔

''ٹھیک ہو؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

اس نے سر کو جنبش دی۔ سر تکیے پر واپس رکھا۔ آنکھیں بند کر لیں، بار بار روبی کا خط اور باتیں ذہن میں آ رہی تھیں۔ وہ پچھلے تین دنوں سے ریان کے حوالے سے الجھن اور پریشانی میں مبتلا تھی۔ ہر رات اسی ٹینشن میں آنکھ کھل جاتی تھی۔ کبھی خوابوں سے الجھ کر۔ کبھی کسی خوف میں پھنس کر۔ نیند ٹھیک سے نہیں آتی تھی۔ طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی۔

جھنجلاہٹ کے عالم میں اس کی شکل یوں ہوئی جیسے ابھی رو دے گی۔

''اب کیا ہوا؟'' وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''بھوک لگ رہی ہے۔'' لیٹے لیٹے بھیگی آنکھوں اور روتی آواز میں بولی۔

''اس میں رونے کی کیا بات ہے؟'' وہ جو اپنی سائڈ پر آ کر بیٹھا تھا تعجب کا شکار ہوا۔

''ابھی سونے سے پہلے ہی تو کھانا کھایا تھا۔'' وہ روہانسا ہو کر بول رہی تھی۔ اس کا دکھ کسی اور بات کا تھا۔ اظہار کسی اور بات پر کر رہی تھی۔

''تمہارا کوئی علاج نہیں۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے چلا گیا۔ جنت نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ ذہن الجھا ہوا تھا۔ ریان کے حوالے سے وہ کسی بھی نتیجے پر پہنچ نہیں پا رہی تھی۔ اسے کیا کرنا چاہیے؟ اور کیا نہیں کرنا چاہیے؟ وہ پچھلے کئی دنوں سے تذبذب کا شکار تھی۔ ابھی بھی سوچوں کا طوفان ذہن میں امڈتا چلا آ رہا تھا۔ مسز شیرازی سے وہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی کہ مبادا انہیں پریشان نہ کر دے۔ اور فارس سے بات کرنے کی ہمت وہ خود میں پیدا نہیں کر پا رہی تھی۔

فارس اس کے لیے پھل کاٹ کر لے آیا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تمہیں بخار ہو رہا ہے۔" پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"نہیں۔ بس ایسے ہی۔" کہہ کر اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔ اب وہ فروٹ کھا رہی تھی تو وہ گھوم کر اپنی جگہ پر آ گیا تھا۔

ٹیبل کلاک رات کے ڈھائی بجا رہی تھی۔ ایک بار پھر سونے کی کوشش کی لیکن جنت کی فکر آڑے آ گئی۔ کروٹ بدل کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ خالی پلیٹ سائڈ ٹیبل پر رکھنے کے بعد اپنی جگہ پر ویسے ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ متفکر نگاہیں نیم تاریکی میں یہاں وہاں بھٹک رہی تھیں۔

"پھر سے کوئی ٹینشن لے رہی ہو؟"

"ن......نہیں تو......"

"پھر کیا سوچ رہی ہو؟"

اس نے گردن موڑ کر فارس کو دیکھا۔ پھر سیدھا ہوتے ہوئے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائی۔ کمفرٹر انگلیوں میں دبائے۔ اضطراب چھپانے کی کوشش میں ہلکان۔ وہ اب اسے دیکھ رہی تھی۔

"اگر مجھے کوئی بات ڈسٹرب کرے تو...... یا اگر کوئی ایسی بات ہو۔ جس کے بارے میں مجھے یہ لگے کہ......" وہ رک گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ بات کیسے شروع کرے۔

"کہ کیا......"

"اگر کوئی ایسی بات ہو۔ جس کے بارے میں مجھے یہ لگے کہ وہ میں تم سے کروں گی تو شاید تمہیں غصہ آ جائے۔"

لحاف کی زد میں ہونٹ چھپے ہوئے تھے تو جنت اس کی مسکراہٹ دیکھنے سے قاصر تھی۔ "تو......؟"

"تو یہ کہ میں تم سے وہ بات کیسے کروں؟" بڑی فکرمندی سے پوچھا۔

"تم میرے غصے کی پرواہ کب سے کرنے لگیں؟" اس نے آہستگی سے پوچھا اور جنت کمال اپنی جگہ تھم گئی۔ سوال درست تھا۔ حق سچ بات کہتے ہوئے اس نے کب فارس وجدان کے غصے کی پرواہ کی تھی؟ خوف کی دھند چھٹ گئی۔ سوچ کے در وا ہوئے۔ کوئی احساس خیال بن کر ابھرا۔

فارس منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا مگر وہ اسے گڈ نائٹ کہہ کر کروٹ بدل گئی۔

فارس چند لمحوں تک اپنی سوچ کے گھوڑے دوڑاتے ہوئے سوچتا رہا کہ آیا ایسی کون سی بات ہو سکتی تھی جس کے حوالے سے وہ اس کے ممکنہ ردعمل سے اس قدر پریشان نظر آ رہی تھی۔

مگر اس کے ذہن میں کوئی بات نہیں آئی تھی۔ اس کا ذہن خالی رہا تھا۔

وہ آفس روم میں اپنا کام کر رہا تھا جب وہ دستک دے کر اندر داخل ہوئی تھی۔ آفس ٹیبل کے قریب آ کر اس نے لیپ ٹاپ کی اسکرین بند کر دی۔ فارس نے نظر اٹھائی۔ تو اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے گلاسز بھی اتار دیئے۔ اس نے گہری سانس لے کر جنت کو دیکھا۔

"میرے ساتھ باہر چلو۔ لان میں۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔" بازو پکڑ کر اٹھانا چاہا تو وہ اٹھ گیا۔ وہ اس کے بازو پر دونوں ہاتھوں کی گرفت مضبوط کیے لان میں لے آئی تھی۔ لان لائٹس کی روشنی اور بے انتہا تاریکی میں وہ کچھ دیر اس کے ساتھ کھلی فضا میں ٹہلتی رہی تھی۔

پھر وہ شیڈ تلے آن کھڑی ہوئی۔ چند لمحوں تک خود میں ہمت پیدا کرتی رہی۔ فارس پرسوچ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔

"تو۔ کیا بات کرنی ہے تمہیں مجھ سے؟"

جنت نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"ریان! تمہارا بھتیجا۔ میں چاہتی ہوں، تم اسے گھر لے آؤ۔"

فارس وجدان صدمے سے گنگ اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا۔ وہ رات کے اس پہر اسے لان میں لا کر اس سے ایسی کوئی بات کرنے والی ہے۔

"فارس۔"

اس نے ہاتھ کھڑا کر کے جنت کو مزید کچھ کہنے سے روکنا چاہا تھا۔ وجود میں لاوا سا بھر گیا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم تمہارے اور حماد بھائی کے درمیان کیا اختلاف رہے ہیں لیکن وہ یتیم بچہ ہے۔ تم اب اس کے چچا ہو۔ اس کے باپ کی جگہ ہو۔"

"جنت پلیز۔" اس نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے اسے تحمل سے روکا تھا کہ وہ بات وہیں ختم کر دے۔ مزید ایک لفظ نہ کہے۔

"میں نے آنٹی کو روتے دیکھا ہے۔ وہ بیمار رہتی ہیں۔ وہ ریان کے لیے ہر وقت پریشان رہتی ہیں۔ وہ تم سے اتنی محبت کرتی ہیں اور تم۔ فارس تم انہیں اس طرح تکلیف کیسے پہنچا سکتے ہو۔" وہ منت بھرے لہجے میں بات کرتے ہوئے بولی تھی اور وہ ایک دم

سے پیچھے ہوا۔

رات کی تاریکی اس کے وجود میں اتری۔ اندر باہر آگ پھیل گئی۔

''پیسے بھیج کر تمہیں لگتا ہے، فرض ادا کر دیا۔ صرف اتنا کافی نہیں ہے۔ تم نے اس کی حالت نہیں دیکھی ہے! وہ وہاں کیسے رہ رہا ہے۔ تم یہ بھی نہیں جانتے۔ تم کبھی اس سے ملنے نہیں گئے۔''

وہ درشتی سے اپنا بازو چھڑا کر پیچھے ہٹا تھا۔

''ٹھیک ہے اگر تم نہیں ملنا چاہتے تو کم از کم مجھے یا آنٹی کو تو ملنے دے سکتے ہو۔''

''فارس! تم خود باپ بننے والے ہو۔ یہ ظلم ہے۔''

''جنت...... اینف......'' اس نے شدید غصے کے عالم میں دھاڑ کر کہا تھا اور وہ ایک دم سے سکتے میں آ گئی تھی۔ فارس کے اعصاب مشتعل تھے، اس کی آنکھوں میں سرخی اتری تھی۔ اس کے تاثرات سخت پتھریلے ہو رہے تھے۔ وہ متوحش نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''ف...... فارس......'' اس کے لبوں سے بے آواز نکلا۔

''آئندہ......'' اس کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ جبڑے بھینچے ہوئے اور پیشانی کی رگیں ابھر آئی تھیں۔ ''آئندہ تم اس کا نام نہیں لوگی میرے سامنے۔ اور نہ ہی ملنے کی کوشش کرو گی۔''

جنت کمال کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے خون جما دینے والے لہجے میں کہا تھا۔ جنت کمال صدمے میں آئی تھی۔ کتنی بے گانگی تھی فارس وجدان کی آنکھوں میں۔ کتنا اجنبی سا لہجہ تھا اس کا۔

''اگر تم چاہتی ہو۔ ہمارے درمیان سب ٹھیک رہے تو......'' اس نے ایک ثانیے کا توقف کرتے ہوئے کھینچ کر سانس لی۔

''تو تم۔ اس معاملے میں نہیں پڑو گی۔'' کہہ کر وہ مزید ایک لمحے کے لیے وہاں نہیں رکا تھا اور جنت کمال پتھرائی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھتے اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔ اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ اس کے انداز، لہجے اور اس قدر سخت رویے پر وہ دہشت میں آ گئی تھی۔

''تم فارس سے اس سلسلے میں کبھی بھی کوئی بات نہیں کرو گی۔'' اس سے مسز شیرازی نے کہا تھا۔ اسے اب سمجھ میں آیا تھا مسز شیرازی نے ایسا کیوں کہا تھا۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا، وہ اتنی سی بات پر اس طرح ری ایکٹ کرے گا۔ ایک ذرا سے مطالبے پر اس طرح ہائپر ہو جائے گا۔

وہ کچھ دیر تک اپنی جگہ منجمد کھڑی رہی۔

''اسے الزام مت دو جنت! میں بھی نہیں دیتی۔''

فوٹو البم سے جھانکتی کسی تنہا خاموش بچے کی تصویریں۔ اسرار میں ڈوبی ایک ویران زندگی۔ نہ سمجھ میں آنے والا دھوپ چھاؤں سا رویہ۔

خود پر طاری اس جمود کو توڑتے اس نے قدم اٹھائے۔ رخ اپنے بیڈروم کی طرف تھا۔ دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔

اب وہ واش روم کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے کچھ پریشانی کے عالم میں دروازہ بجایا تھا۔ اندر وہ کپڑوں سمیت شاور کے نیچے کھڑا تھا۔ مگر وجود کی آگ تھی کہ بجھنے میں نہیں آ رہی تھی۔ نہ ہی پانی کے شور میں کوئی آواز گم ہو رہی تھی۔

''دروازہ کھولو فارس!'' وہ اسے آوازیں دیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ جسم پر ایک کپکپی سی طاری تھی۔

وہ شاور کے نیچے سر تھامے بیٹھ گیا تھا۔ آنکھیں موندے۔ سانسیں لیتے۔ وہ اپنے اندر ابھرتی چیخوں کو بآسانی سن سکتا تھا۔ وہ خود کو اس کیفیت سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ سے بہتا ہوا خون پانی کے ساتھ اپنا راستہ بنا رہا تھا۔

یہ جانتے ہوئے کہ دروازہ اندر سے لاکڈ تھا۔ وہ ہینڈل گھمائے جا رہی تھی۔ اور یہ جانتے ہوئے کہ وہ اسے نہیں سن رہا تھا وہ اسے آوازیں دیے جا رہی تھی۔ کئی خوف اور واہمے سر اٹھا رہے تھے۔ کئی خدشات کی لے پر وہ بہتی جا رہی تھی۔ کتنی ہی دیر تک وہ دروازہ بجاتے ہوئے اسے پکارتی رہی اور پھر۔ اسے پتا نہیں کیا ہوا وہ رو دی۔ وہ سچ مچ میں رو دی۔

''پلیز فارس......! دروازہ کھولو......''

ایسا پہلے بھی ہوا تھا۔ اس نے آوازیں دی تھیں۔ اس نے منت کی تھی۔ اور روئی بھی تھی۔ مگر تب دروازہ نہیں کھلا تھا۔ اب بھی دروازہ نہیں کھل رہا تھا۔ اسے اپنے آس پاس اندھیرے نظر آ رہے تھے۔ وحشت نظر آ رہی تھی۔

''فارس۔ پلیز......''

اس کا ہاتھ دروازے پر ٹھہر گیا تھا۔ اس کی سسکیاں بلند ہونے لگی تھیں۔

شاور بند ہو گیا۔ شور ختم ہو گیا۔

پہلے لاک کی آواز گونجی۔ پھر دروازہ بھی کھل گیا۔ فارس وجدان اس کے سامنے مکمل طور پر بھیگا ہوا سا کھڑا تھا۔ بالوں سے، کپڑوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ وہ آنکھوں میں نمی لیے اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ اس کی خالی ویران آنکھوں میں ابھی بھی کوئی تاثر نہیں تھا۔ ایک مکمل خاموشی۔ ایک مکمل سناٹا لیے وہ کسی مجسمے کی طرح اس کے سامنے موجود تھا۔

☆☆

وہ بیڈ پر اس کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے۔ جھک کر اس کے پرسکون چہرے کو دیکھتے

عسریسرا۔ حسنیٰ حسین

ہوئے......سانسوں کو گنتے ہوئے۔ کچھ دیر پہلے ہی وہ کپڑے بدلنے کے بعد نیند کی گولی لے کر سو گیا تھا اور وہ تب سے اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ انگ انگ میں فکر اور ان جانا سا خوف سمایا ہوا تھا۔ نیند اڑ چکی تھی۔ سکون غارت ہو چکا تھا۔ اسے اس طرح اچانک۔ اس روپ میں دیکھ کر اس کا دل بہت سے اندیشوں میں گھر گیا تھا۔ وہ بے طرح پریشان ہو رہی تھی۔

قہر برساتا لہجہ اور شعلہ چھلکاتی آنکھیں تو جیسے ذہن میں سما گئی تھیں۔ اسے اس قدر اذیت میں دیکھنے کے بعد اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہونے لگا۔

مسز شیرازی نے روکا تھا تو اسے رک جانا چاہیے تھا۔ شاید اسے کسی اور طریقے سے بات کرنی چاہیے تھی۔ ایک یتیم بچے کے لیے پتھر ہوتے دل کو کسی اور طرح سے موم کرنا چاہیے تھا۔ اس نے سوچا۔ مگر وہ ایسا کیسے کرتی؟

مسز شیرازی اسے کچھ بھی بتانے کو تیار نہیں تھیں اور فارس۔ اس نے تو دروازہ کھلنے سے پہلے ہی بند کر دیا تھا۔ ایک حتمی جملہ۔ پتھر پر لکیر جیسا۔ ریان کا ذکر۔ اور اس کی لہورنگ آنکھوں سے جھلکتی واضح تنبیہہ۔

’’اگر تم چاہتی ہو، ہمارے درمیان سب ٹھیک رہے تو۔ آئندہ تم نام نہیں لوگی اس کا میرے سامنے۔‘‘

اسے یقین نہیں آ رہا تھا، یہ بات اس سے فارس وجدان نے کہی تھی۔ وہ جو اس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔ وہ اس طرح سخت لفظوں میں ایک حد نمایاں کرے گا۔ ایک راستہ۔ اور اس راستے سے جڑی خطرناک منزل کا اشارہ دے گا۔ وہ ایسا کیسے کر سکتا ہے؟ وہ کسی اور کی وجہ سے اپنے اور اس کے درمیان ایک خط کیسے کھینچ سکتا ہے؟

کیا اس یتیم کا معاملہ اتنا ہی سنگین۔ اتنا ہی پر اذیت۔ اور اتنا ہی گراں ہے اس کے لیے؟ اس نے گہری سانس لے کر اذیت سے آنکھیں موند لیں۔

مسز شیرازی کا غم ایک طرف، ریان کی فکر دوسری طرف اور فارس کا اشتعال آمیز رویہ تیسری طرف تھا۔ ایک ذرا سی امید کہ بات کر کے مسئلہ حل کر لے گی تو یہ امید خاک ہو گئی تھی۔

خشک لبوں کو تر کرتے اس نے ہتھیلی کا زخم صاف کر کے پٹی باندھ دی۔

فارس کی طرف سے کچھ اطمینان کر کے سونے کی کوشش کی تو بار بار اس کا چہرہ آنکھوں میں آنے لگا۔

وہ کتنا غصے میں لگ رہا تھا اور کس قدر اجنبی سا ہو گیا تھا۔ ایسے جیسے وہ اسے جانتا تک نہ ہو۔ اسے بہت اندر تک دکھ ہوا۔

رات کروٹیں بدلتے، خود سے الجھتے، اور سچویشن کو سوچتے گزر گئی۔

بار بار اس کی آنکھ کھلتی رہی۔ اس کا خیال آتا رہا۔ اس کی فکر ہوتی رہی۔

☆☆☆

نماز کی ادائیگی کے بعد وہ اس کی تلاش میں تیز تیز قدم اٹھاتی کمرے سے باہر آئی تھی۔ راہداری میں نیم تاریکی تھی۔ دیوار گیر کھڑکیوں سے صبح کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ سورج کی روشنی ابھی زمین پر نہیں اتری تھی۔ مگر اجالے ہر سو پھیل چکے تھے۔

اس نے فارس کو کچن میں کھڑے دیکھا۔ فجر کی نماز کے بعد وہ یقیناً اپنے لیے قہوہ بنا رہا تھا۔

آہٹ پر ذرا سا رخ بدل کر اسے دیکھنے لگا۔ نظروں سے نظر ٹکرائی۔ اس کی سرخ و متورم آنکھیں ایک دم سے خالی اور ویران سی لگ رہی تھیں۔ جنت کا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔

کیبنٹ بند کرتے اس نے جار رکھ دیا۔ آنچ دھیمی کر دی۔

’’قہوہ بنا رہا ہوں؟ تم پیو گی۔‘‘ اس کا لہجہ نرم تھا۔ تاثرات میں کوئی سختی نہ تھی۔ نہ ہی انداز اور رویے سے کسی تلخی کا شائبہ ہو رہا تھا۔

وہ فارس وجدان کو دیکھ کر رہ گئی۔ اس نے فکر اور پریشانی میں ساری رات سوتے جاگتے آنکھوں میں بتا دی تھی اور وہ صبح سویرے یوں مخاطب ہو رہا تھا جیسے گزشتہ شب ان کے مابین کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ جیسے اس نے سخت ردعمل نہیں دیا تھا نہ ہی کسی بات پر مشتعل ہوا تھا۔

آنکھوں میں فکر اور دل میں اضطراب لیے اس نے کسی قدر کوشش سے اثبات میں سر ہلاتے اسے اجازت دے دی۔

فارس کی پشت اب اس کی طرف تھی۔ وہ سر جھکائے خاموشی سے قہوہ بنا رہا تھا۔ آگ کے نیلگوں شعلوں پر رکھا ابلتا ہوا صاف پانی اپنا رنگ بدل چکا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ انگلیوں میں انگلیاں پھنسائے۔ اندر کے اضطراب کو چھپانے کی سعی کرتی ہوئی۔

فارس نے کپ میں قہوہ ڈال کر اس کے سامنے رکھا اور دوسرا کپ ہاتھ میں لیے کرسی کھینچ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

کچھ دیر تک اس کی نگاہیں بھاپ اڑاتے کپ پر جمی رہیں۔ پھر اس نے سر اٹھا کر فارس کو دیکھا۔

خیال تھا شاید اب وہ کچھ کہے گا۔ وضاحت دے گا یا کوئی بات کرے گا، ممکن ہے، وہ نرمی سے کچھ سمجھا دے۔ یا اپنے رویے کی وجہ بتا دے۔ مگر دوسری طرف گہری خاموشی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

چند لمحوں کے بعد اس نے بے حد نارمل لہجے میں جنت سے طبیعت کا پوچھا۔ بالکل ویسے ہی جیسے روز پوچھا کرتا تھا۔ پھر اپنے مصروف شیڈول کا حوالہ دیا۔ گیارہ بجے میٹنگ تھی۔ اسے نو بجے نکلنا تھا۔ بارہ بجے تک واپسی متوقع تھی۔ اسے مسز شیرازی کو ویکلی چیک اپ کے لیے ہاسپٹل لے کر جانا تھا۔ چند ایک سوالات کا مختصر جواب دیتی وہ ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

فارس کا رویہ سمجھ سے قطعی باہر تھا۔ وہ ایسے ظاہر کر رہا تھا جیسے گزشتہ رات ان کے مابین کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اختلاف نہیں ہوا تھا۔ نہ اس نے غصہ دکھایا تھا۔ نہ اشتعال میں آیا تھا۔

باوجود کوشش کے وہ کوئی سوال، استفسار نہ کرسکی۔ نہ یہ پوچھ سکی اس نے ایسا کیوں کیا۔ نہ رویے کی وجہ جان سکی۔ یہ حق اس کے پاس نہیں تھا۔ فارس وجدان کے معاملات میں وہ مداخلت نہیں کرسکتی تھی۔ گزشتہ شب اس پر یہ حد واضح ہوئی تھی۔ اور وہ حد اب اسے بے حد غم زدہ کررہی تھی۔

آنکھوں میں نمی لیے وہ خود پر قابو پاتی سر جھکا گئی۔ فارس نے اس کے داہنے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو۔ مگر دوسرے ہی پل اپنی شخصیت کے گہرے رنگوں میں مبہم ہوتا وہ اس کا ہاتھ تھپتھپا کر اٹھ گیا۔

اپنے اندر ڈھیر سارے سوال اور شکوے لیے جنت کمال اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی تھی۔

ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ وہ اس سے کوئی گلا شکوہ نہیں کرسکی تھی۔ ناراضی اور غصہ نہیں دکھا سکی تھی۔ اسے ایک دم سے اپنے اور فارس کے درمیان خلا کا احساس ہوا۔ جس کا بوجھ دل پر بھاری پڑا۔ اور وہ کچھ دکھ اور اذیت سے ایک بار پھر کھڑکیوں کی جانب دیکھنے لگی تھی۔

سورج طلوع ہوچکا تھا۔ کرنیں کھڑکی سے اندر آرہی تھیں۔ رات ختم ہوچکی تھی۔ مگر اس کا اندھیرا تھا کہ جنت کے اندر ہی ٹھہرا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

اس رات کے بعد فارس وجدان کے روزمرہ معمولات میں کافی حد تک تبدیلی آچکی تھی۔ وہ ناشتے کی میز سے جلدی اٹھ جاتا تھا۔ شام میں تاخیر سے گھر آتا۔ ڈنر باہر ہی کرلیتا۔ بات ہوتی تو بہت مختصر۔ زیادہ تر تو سر ہلانے پر ہی اکتفا کرتا۔ اپنی سوچ اور خیالات میں اس قدر گم رہنے لگا تھا کہ وہ بات شروع کرکے ختم بھی کرچکی ہوتی اور اسے معلوم نہ ہوتا، وہ کیا کہہ رہی تھی۔ کیا پوچھ رہی تھی۔ کیا سنا رہی تھی۔

خالی الذہنی کے عالم میں ایک ہی مقام کو تکتے، فائل کے کسی صفحے پر بے ترتیب سی لکیریں کھینچتے، لان میں بے مقصد ٹہلتے، چینل گھماتے، بریفنگ سنتے، میسج لکھتے۔ وہ کسی طور بھی اسے اپنے آپ میں نہیں لگتا تھا۔ اس کا ہر کام ادھورا، ہر بات مبہم۔ ہر تاثر دھندلا ہونے لگا تھا۔ وہ اب اسے پڑھ نہیں پاتی تھی۔ سمجھ نہیں پاتی تھی۔

کبھی اسے حیرت ہوتی، غم ہوتا، پریشانی ہوتی اور غصہ آجاتا۔ ایک پندرہ ماہ کے بچے سے ایسی دشمنی؟ ایسا موقف، اور ایسا رویہ؟ مرے ہوئے بھائی سے اختلاف اپنی جگہ۔ ایک زندہ وجود کو لاش کردینا کہاں کا انصاف، کہاں کا بدلہ۔ کہاں کا انتقام تھا؟

اپنے اندر کے سوالات سے الجھتی وہ بے بسی سے سر پکڑ کر رہ جاتی۔ تاثرات کچھ نارمل کرکے فارس کے پاس جاتی اور باوجود کوشش کے بھی اس کے سامنے ریان کا نام نہ لے پاتی۔ دماغ کی بحث اپنی جگہ مگر دل چاہتا تھا اسے کوئی غم نہ ہو، دکھ نہ ہو، غصہ نہ

آئے۔

وہ فارس وجدان کی آنکھوں میں دیکھتی اور ساری الجھن وہیں دھری رہ جاتی۔ کچھ پوچھنے کا، اسے کریدنے کا یارا نہ رہتا۔

مسئلہ ''بات'' سے حل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے جان لیا۔ اسے اب کوئی راستہ دیکھنا تھا۔ کوئی اور حل تلاشنا تھا۔

گزشتہ کئی راتوں کی طرح اس رات بھی وہ کافی سے زیادہ بے چین رہی۔ نیند آنکھوں سے دور تھی تو اٹھ کر وضو کیا، نوافل ادا کیے، دعا کی۔ بہت دل سے دعا کی۔ اور صبح ناشتے کے بعد ورک آؤٹ سے فارغ ہوتے ہی مسز شیرازی کے پاس پہنچ گئی۔ وہ سٹنگ ایریا میں کتاب لیے بیٹھی تھیں۔ لیپ ٹاپ کھلا پڑا تھا۔ کچھ فائلز بھی تھیں۔ اور رجسٹرز بھی۔

''میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں آنٹی!''

''ہاں پوچھو!'' انہوں نے گلاسز ہٹا کر اسے دیکھا۔ وہ کھلے ڈھلے سے میکسی ڈریس میں ملبوس تھی، بالوں کی فرنچ چٹیا بنا رکھی تھی، بھرے بھرے سے چہرے پر کچھ فکرمندی کے آثار نمایاں تھے، آنکھوں میں سوچ تھی، سوال تھا اور الجھن تھی۔ بے نام سی الجھن جو اکثر تب ہی نظر آتی جب وہ کسی مسئلے میں پھنسی ہوتی۔

''ایک مسئلہ ہے۔'' ہمت مجتمع کرکے لفظ جوڑ کر ادا کرنے میں کچھ دقت ہوئی۔ ''مجھے لگا۔ میرے پاس اس کا حل ہے۔ میں نے وہ حل آزمایا۔'' رک کر خشک لبوں کو تر کیا۔ ''اس سے وہ مسئلہ مزید بگڑ گیا۔ یہ میرا خیال ہے۔'' رک کر مسز شیرازی کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں تشویش نمایاں ہوئی۔

''وہ کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔'' فوراً سے سنبھل کر وضاحت دی۔ ''یہ میرا معاملہ ہے۔ میری فیملی کا۔ بہنوں کا۔'' نظریں چراتے کہہ دیا۔

مسز شیرازی نے بے اختیار سکھ بھری سانس لی کہ مسئلے کا تعلق فارس سے نہیں۔ اندر ہی اندر ان سے جھوٹ بولنے پر جنت از حد شرمندہ ہوئی مگر وہ انہیں کسی دکھ اور صدمے سے دوچار نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''اچھا!'' کچھ فکرمند ہوئیں کہ جانے کیا معاملہ ہے کہ وہ اس قدر مضطرب ہے۔

''اگر ممکنہ حل ہی کسی مسئلے کو مزید بگاڑ رہا ہو تو......'' دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس کی بات سمجھنے کو مسز شیرازی نے چند لمحوں کا توقف لیا۔

''اس کا مطلب تو پھر یہی ہوا کہ۔ جسے تم حل سمجھ رہی ہو، وہ حل نہیں ہے۔''

وہ لمحے بھر کے لیے تھم گئی۔

''اگر اسی ایک ممکنہ حل کے سوا اور کوئی راستہ نہ ہو تو؟'' مسز شیرازی اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ جانے وہ اپنی بہنوں کے کس مسئلے کو

لے کر پریشان تھی۔ انہیں فکر ہوئی۔

”جگہ بدل کر دیکھو! ہوسکتا ہے کسی اور زاویے سے پورے مسئلے کو دیکھنے پر تمہیں صحیح حل نظر آجائے۔“

جنت نے چونک کر انہیں دیکھا۔ انہوں نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے لیپ ٹاپ پر ہاتھ بڑھا کر کچھ ٹائپ کیا۔ پھر دوبارہ اس کی طرف دیکھا۔

”یا پھر اس وجہ کو ڈھونڈو جس کے سبب مسئلہ پیدا ہو رہا ہے۔“ انہوں نے مزید کہا۔

وہ نچلا لب کاٹتی خود سے الجھ کر رہ گئی۔

”وجہ تو ہے، اور کوئی بہت بڑی وجہ ہے! لیکن میں اس تک نہیں پہنچ سکتی۔“

”پھر حل تک کیسے پہنچ گئیں؟“ انہوں نے سوال کیا اور وہ لاجواب ہوگئی۔ چند لمحوں تک کچھ کہہ ہی نہ سکی۔

”تم جس جگہ پر کھڑے ہو کر پورے مسئلے کو دیکھ رہی ہو، وہ جگہ غلط ہے۔ وہاں سے جو منظر تمہیں نظر آرہا ہے۔ وہ منظر ادھورا ہے۔ تم مسئلے کی تہہ تک جب تک نہیں پہنچو گی حل نہیں ڈھونڈ سکتیں۔ سو اس لحاظ سے جسے تم حل سمجھ رہی ہو۔ وہ حل نہیں ہے جنت!“ انہوں نے اپنے فہم کے مطابق بے حد سنجیدگی سے اس کی مشکل حل کرنے کی کوشش کی۔

وہ چند لمحوں تک انہیں دیکھتی رہی۔ مسز شیرازی وجہ جانتے ہوئے بھی اس مسئلے کو حل نہ کرسکیں۔ معاملہ وہیں اٹکا ہوا تھا۔ دوریاں ہنوز قائم تھیں۔ وہ بے بس تھیں۔ ان کے ہاتھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ اور اس نے سوچا تھا وہ سب ٹھیک کرلے گی۔ بات کر کے فارس کو منا لے گی۔ جب مسز شیرازی کچھ نہ کرسکیں تو وہ کیسے کچھ کرسکتی تھی؟

”ہوسکتا ہے میں اس مسئلے کے تہہ تک پہنچوں اور مجھ پر انکشاف ہو کہ اس کا تو کوئی حل ہے ہی نہیں۔“ اس کے لہجے میں مایوسی در آئی تھی۔

مسز شیرازی مصحف اٹھا چکی تھیں۔ کھولتے کھولتے رک گئیں۔ سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”حل ہر مسئلے کا ہوتا ہے۔ کچھ حل ہمارے ہاتھوں میں دے دیے جاتے ہیں۔ کچھ حل اللہ اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔“ ایک لمحے کو رک کر گلاسز لگا لیے۔ ”وسعت کے مطابق ہر ممکن کوشش کرو اور باقی اللہ پر چھوڑ دو۔“

بات ختم ہوگئی۔ وہ پھر سے اپنا کام کرنے لگیں۔ جنت چند لمحوں تک انہیں دیکھتی رہی پھر ایک گہری سانس بھر کر وہاں سے اٹھ گئی۔

کچھ مسئلے ہر زاویے سے ایک ہی نظر آتے ہیں۔ اس نے سوچا۔ عقبی دروازہ کھول کر لان میں آگئی۔ کھلی فضا میں سانس لیتے فارس کو سوچتی رہی۔

”اگر تم چاہتی ہو ہمارے درمیان سب ٹھیک رہے تو۔ آئندہ تم نام نہیں لوگی اس کا میرے سامنے۔“ قہر برساتا لہجہ تھا۔ شعلہ دہکاتی ہوئی آنکھیں تھیں۔ اجنبیت اور بے گانگی تھی۔ غصہ تھا اور نفرت تھی۔ اس ایک معصوم بچے سے جو اس کا بھتیجا تھا۔

اس کی شہد رنگ آنکھوں میں پھر سے نمی ابھری۔ چہرہ سرخ ہونے لگا۔

”اگر تم چاہتی ہو۔ ہمارے درمیان سب ٹھیک رہے تو تم اس معاملے میں نہیں پڑوگی۔“ واضح دھمکی تھی، اشارہ تھا، تنبیہہ تھی۔

لب بھینچ کر اس نے اپنی آنکھوں کو مسل ڈالا۔ اس کے ہاتھ خالی تھے۔ نہ مسئلہ سمجھ میں آرہا تھا۔ نہ حل نظر آرہا تھا۔ بے بسی کا یہ احساس دل پر بھاری تھا۔ اور بے حد بھاری تھا۔

☆☆☆

جنت کی آنکھ کھلی تو اس وقت بارہ بجے کا وقت تھا۔ صوفے پر نیم دراز پوزیشن میں تھی۔ ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اطراف میں نگاہ دوڑائی تو آس پاس کوئی نظر نہ آیا۔ ٹی وی آن تھا۔ والیوم بند۔ اسے یاد آیا، فارس میچ دیکھ رہا تھا جب وہ اس کے پاس آکر بیٹھی تھی۔ کمر میں درد تھا، طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہ تھی اور کچھ گزشتہ شب کی بے آرامی کہ صوفے پر لیٹے لیٹے ہی سوگئی تھی۔

گہری سانس لے کر اس نے بے ترتیب بالوں کو پھر سے پونی میں جکڑا اور اٹھ کر کچن میں چلی آئی۔

کرسی پر بیٹھ کر پانی پی رہی تھی جب دیوار گیر کھڑکی کے اس پار اسے ہلچل کا احساس ہوا۔ آوازیں بھی آرہی تھیں۔ لکڑی کے اونچے لمبے اسٹول پر تختے رکھے تھے۔ عدیل احمد بھی تھا شاید۔ فارس بھی۔ دوپٹے کو پھیلا کر لیتے ہوئے وہ اسی وقت باہر آگئی تھی۔ آوازوں کے تعاقب میں مشرقی سمت قدم اٹھاتی آگے بڑھی اور اگلے ہی پل حیرت سے رک گئی۔

سامنے والی دیوار پر پینٹ ہو رہا تھا۔ نیچے پینٹ کی بالٹیاں، برش اور رولر وغیرہ رکھے تھے۔ ملازم نے سیڑھی پکڑ رکھی تھی۔ فارس اوپر چڑھا ہوا تھا۔ اپنی سفید شرٹ کی آستینیں کہنیوں تک موڑے۔ اور سیاہ پینٹ کو گھٹنوں تک فولڈ کر کے اپنی ٹائی سے الجھتا عدیل احمد اس سے بھی اوپر کہیں تختے پر کھڑا تھا۔ دونوں کے مابین آفس کے معاملات پر گفتگو بھی ہو رہی تھی۔ عدیل مؤدب سا فارس کے ہر سوال کا جواب دیتا بلندی سے کچھ کچھ خائف اور گھبرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ اس کے صحیح معنوں میں چودہ طبق روشن ہوئے تھے۔

”پینٹ ہو رہا ہے آپی!“ اقصیٰ برابر میں ہی کتاب پکڑے کھڑی تھی۔

”وہ تو مجھے بھی نظر آرہا ہے مگر یہ سب...... اور تم...... تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“

”فارس صاحب نے سزا دی ہے۔“ ایسے خوش ہو کر بولی جیسے سزا نہیں کوئی انعام دیا گیا ہو۔

”اور وہ جو عدیل ہے نا۔ اسے بھی۔ ہاہاہا“ اس نے آج سے قبل اقصیٰ کو اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جنت نا سمجھی کے عالم

عسریسرا۔ حسنیٰ حسین

میں اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''اصل میں، میں نا۔ وہاں بیٹھ کر پڑھ رہی تھی۔ فارس صاحب میرے پاس آئے۔ بائیو کی بک اٹھائی۔ سوال پوچھا۔ مجھے جواب نہیں آیا۔ اب مجھے کیا پتا، میرا سرپرائز ٹسٹ لیں گے وہ، ورنہ میں تیاری کر کے بیٹھتی نا۔ پھر انہوں نے مجھے وہ باتیں سنائیں۔ وہ باتیں سنائیں۔ اللہ کی قسم مس بائیو نے بھی کبھی نہیں سنائیں۔

اور یہ جو عدیل ہے آپی۔ یہ فارس صاحب کے پیچھے کھڑا ہنس رہا تھا۔ میں نے دیکھا۔ دل کیا گچی مروڑ دوں اس کی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر فارس صاحب نے بھی دیکھ لیا۔ تو بس۔'' اس کی مسکراہٹ کانوں تک پہنچ گئی۔

''تو بس کیا؟'' جنت ایک دم سے متفکر ہوئی۔

''پہلے انہوں نے کہا، وائے آر یو اسمائلنگ؟ پھر انہوں نے کہا از دس آ جوک ٹو یو؟'' اقصیٰ فارس کی اداکاری کرتی خوشی کی انتہا پر تھی۔

''کہتا سوری سر! بڑا آیا۔ ہونہہ۔'' ایک دم سے اترائی۔ ''مگر فارس صاحب نے سوری قبول نہیں کی۔ اپنے ساتھ یہاں لے آئے۔ حالانکہ یہ تو فائلز دے کر واپس جا رہا تھا۔ تو مجھے پتا ہے۔'' آواز مزید سرگوشی میں ڈھلی۔ ''فارس صاحب نے اسے سزا دی ہے۔ اسے اونچائی سے ڈر لگتا ہے۔ اتنی دیر سے دیکھ رہی ہوں۔ ایک بار بھی نیچے نہیں دیکھا۔'' پھر سے ہنسی۔ ''اوپر والی دیوار عدیل کر رہا ہے۔ یہ والا حصہ فارس صاحب کریں گے۔ اور یہاں نیچے والی دیوار شام کو میں پینٹ کروں گی۔۔ فارس صاحب نے کہا کہ......''

''اقصیٰ!'' فارس کی بھاری آواز پر فوراً ہی کسی فوجی کی طرح اٹینشن ہوئی اور اسی سرعت سے نگاہیں کتاب پر گاڑ دیں۔

جنت نے سر اٹھا کر اب کے فارس کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر اتنی تشویش اور فکر تھی کہ وہ پینٹ برش ہاتھ میں لیے رک گیا۔ آنکھوں میں لمحے بھر کے لیے غیر مفہوم سا تاثر ابھرا پھر وہ برش رکھتا سیڑھی اتر کر نیچے آ گیا۔ کرسی سے پانی کی بوتل اٹھالی۔

''کیا تم......تم ٹھیک ہو؟'' جنت نے پاس آ کر پوچھا۔ آنکھوں سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ فارس نے پانی کی بوتل سے چند گھونٹ لیتے رک کر اسے دیکھا۔

''کیا تمہیں میری دماغی حالت پر شبہ ہو رہا ہے؟''

اس کے اس طرح اچانک پوچھنے پر وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔

''نہیں تو۔ میں نے ایسا تو نہیں کہا۔''

''سوچا تو ہے۔''

''میں نے ایسا سوچا بھی نہیں ہے۔''

''پھر حیران کیوں ہو رہی ہو؟''

''حیران نہیں ہوں۔'' رک گئی، نچلا لب کاٹا، کہنا چاہتی تھی پریشانی ہو رہی ہے مگر۔ سر اٹھا کر اسے پھر سے دیکھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ اور آنکھیں بے تاثر تھیں۔

''اگر تم صبح سویرے اٹھ کر وال پینٹ کرنا شروع کر دو گے تو میں اس بات کو نارمل کیسے سمجھ سکتی ہوں؟'' ہمت مجتمع کر کے کہہ دیا۔

''اور وہ جو تم صبح سویرے اٹھ کر لائبریری کی سیٹنگ بدلا کرتی تھیں تو وہ نارمل تھا؟''

جنت صدمے سے گنگ اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔ اسے کیسے پتا وہ صبح سویرے اٹھ کر یہ ''کام'' کیا کرتی تھی؟ ایک نظر اٹھا کر دیکھنے تک کی فرصت نہیں ہوتی تھی موصوف کو اور روٹین کا تو ایسے علم تھا جیسے اس کے آس پاس سائے کی طرح رہتا ہو۔ ایک تو یہ اس کے ملازم۔ پکے جاسوس۔ پل پل کی خبر دیتے رہے۔ تپ کر رہ گئی۔

شدید ڈپریشن میں بس ایک دو بار ہی لائبریری کا رخ کیا ہوگا اس نے۔ گھبرا کر یادداشت دوڑائی تو پتا چلا وہ صبح و شام کسی بھی وقت کتابوں کی ترتیب بدلنے لگ جاتی تھی۔ اور یہ کام اس نے کئی بار کیا تھا۔ مگر سوال یہ تھا۔ اسے یہ بات فارس نے کیوں یاد دلا دی تھی؟

''وہ تو میں۔ اس لیے کرتی تھی کیونکہ آنٹی ایسا کرنے کو کہتی تھیں۔'' جھٹ سے کہہ دیا۔ سیڑھی چڑھتے ہوئے وہ رک گیا۔

''صبح سویرے۔ شدید ٹھنڈ میں؟ ممی ایسا کرنے کو کہتی تھیں؟'' وہ صحیح معنوں میں حیران ہوا۔ ''ممی سے پوچھتا ہوں۔'' دوبارہ سے اترنے لگا تو وہ ایک دم سے گھبرا کر آگے آئی۔ سیڑھی کو پکڑنا اس طرح تھا کہ وہ نیچے نہ اتر سکے مگر اس کا تو توازن بگڑ گیا۔ گرتے گرتے بمشکل بچا۔

''واٹ دا ہیل۔'' گرفت مضبوط کرتے ہوئے جھڑک دیا۔

''اپنا کام کرو۔ نیچے کیوں آ رہے ہو؟ پینٹ کرو۔ بلکہ ساری دیواروں کو پینٹ کرو۔ تمہیں کس نے روکا ہے؟ بلکہ اچھی بات ہے انسان کو اپنے گھر کا کام خود کرنا چاہیے۔''

وہ اس کے پینترا بدلنے پر جبڑے بھینچ کر رہ گیا۔ دھوپ میں وہ ہاتھ کا چھجا بنائے، سر اٹھائے اسے دیکھ رہی تھی۔ چہرہ تمتما رہا تھا۔ شہد بالوں نے جیسے آگ پکڑی ہوئی تھی۔

''ایک کام تم بھی ہمارا کر دو۔'' دانت پیس کر جھکا۔

''ہاں بولو۔'' اپنے تاثرات پر قابو پاتی وہ بہت مستعد نظر آئی۔

''جس دروازے سے باہر آئی ہو، اسی دروازے سے اندر چلی جاؤ۔ بہت مہربانی ہو گی۔''

وہ جو سچ مچ میں کسی کام کی متمنی تھی، سلگ کر رہ گئی۔ فکروں میں گھرا دل غصے سے بھر گیا۔ بڑبڑاتی ہوئی دور شیڈ تلے جا بیٹھی۔ ''ذرا سی پریشانی دکھا دوں تو خود کو پتا نہیں کیا سمجھنے لگ جاتا ہے۔ ایک تو اتنی ٹینشن دے رکھی ہے مجھے۔ رات بھر سو نہیں سکتی۔ اور اسے دیکھو!! پینٹ ہو رہا ہے۔'' بڑبڑاتے ہوئے کہیں اور دیکھنے لگی۔

کچھ دیر تک اسے مکمل نظر انداز کرتی رہی۔ پھر عادت سے مجبور دوبارہ دیکھنے لگی۔

وہ عدیل احمد سے بات کرتا اپنے کام میں مکمل فوکسڈ اور مطمئن لگ رہا تھا۔ کتنے دنوں بعد اس نے فارس کو اس طرح دیکھا تھا۔ دل میں سکون سا اترتا محسوس ہوا۔ یوں لگا جیسے سینے پر سے ایک بوجھ سرک گیا ہو۔ موبائل پر وائبریشن ہوئی تو اس نے اسکرین پر نگاہ دوڑائی۔ روبی کی کال تھی۔

اس کا نچلا لب دانتوں تلے آ گیا۔ حلق میں جیسے کوئی شے اٹک گئی۔ سر اٹھا کر ایک نظر فارس پر ڈالی پھر کال ریسیو کرتی درخت کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔

رولر ہاتھ میں لیے فارس نے مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ بات کر رہی تھی تو چہرے پر فکرمندی کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ سر جھٹک کر وہ دیوار پر رولر گھمانے لگا۔ دیوار کا رنگ مکمل سفید ہو چکا تھا۔ مگر اس کے اندر کی سیاہی تھی کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

☆☆☆

ویکلی چیک اپ کے لیے مسز شیرازی فارس کے ساتھ ہاسپٹل گئی ہوئی تھیں۔ وہ گھر میں اکیلی تھی۔ یہاں وہاں ٹہلتے ہوئے، اس نے فارس اور ریان کے مسئلے کو بہت بار سوچا اور کسی طور پر کسی حل تک نہ پہنچ پائی۔ روبی سے رابطے کے بعد ریان کے حوالے سے ملنے والی خبروں نے اسے بہت بے چین کر رکھا تھا۔ دل چاہتا تھا بس اڑ کر وہاں پہنچ جائے اور فارس کی تمام تر مخالفت کے باوجود اسے لے آئے۔

یہ بات تو طے تھی، فارس اسے جانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اور وہ خود سے وہاں جا نہیں سکتی تھی۔ گارڈز کی موجودگی میں تو بالکل بھی نہیں۔

کیا اسے فارس سے دوبارہ بات کرنا چاہیے؟ اس کا ردعمل یاد آیا تو جھرجھری لے کر رہ گئی۔ کتنے دن لگ گئے تھے اسے سنبھل کر واپس معمول میں آنے میں۔ دوبارہ ذکر چھیڑ کر وہ مزید کوئی بدمزگی نہیں چاہتی تھی۔ فارس کے لیے یہ معمولی بات نہیں تھی۔ اتنا تو اندازہ اسے بھی ہو گیا تھا۔ تو پھر کیا کرے وہ؟ ریان کو یہاں کیسے لائے؟

وہ ذہن میں ایک بے نام سی الجھن اور ڈھیر سارے سوال لیے ٹہل رہی تھی جب ملازمہ نے سیڑھیاں اتر کر کسی کی آمد کی اطلاع پہنچائی۔

''کون ہے؟''

''اپنا نام جویریہ حبیب بتایا ہے۔''

''جویریہ حبیب؟'' اس نے رک کر زیر لب نام دہرایا۔ ابھی چند دن قبل مسز شیرازی اپنی کسی دوست کی بیٹی کے بارے میں بتا رہی تھیں جو پاکستان آنے والی تھی۔ کہیں یہ وہ تو نہیں؟ نچلا لب کاٹتے وہ سوچ میں پڑ گئی۔ کہ مسز شیرازی کا حلقہ احباب زیادہ تھا اور وہ بہت سے لوگوں کو نہیں جانتی تھی۔

''ٹھیک ہے، انہیں اندر بلا لو'' کہہ کر خود کو آئینے میں دیکھا۔ صبح سے سیاہ پاجامے پر سفید کرتا زیب تن کیے گھوم رہی تھی۔ جھنجھلا کر وارڈ روب کھولا۔ کپڑے نکال کر بدلے، جلدی جلدی اپنا حلیہ قدرے بہتر کر کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو سامنے ہی ایک ماڈرن سی نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی نظر آئی۔

سیاہ پینٹ کوٹ میں ملبوس تھی، بالوں کا فرنچ بن بنا رکھا تھا۔ گہرے سرخ رنگ کی لپ اسٹک ہونٹوں کو نمایاں کر رہی تھی۔ سرخ رنگ کا چھوٹا سا کلچ نما پرس جو ہاتھ میں تھا۔

جنت پر نظر پڑتے ہی اپنی جگہ چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ سرخ گلاب کا بوکے اس کے ہاتھوں میں دیا۔

''غالباً آپ مسز شیرازی سے ملنے آئی ہیں لیکن وہ اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔'' ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے بوکے لے کر پر اخلاق لہجے میں کہا۔ وہ اس کی بات سن کر مبہم سا مسکرائی۔ پھر جنت کے اشارہ کرنے پر صوفے پر بیٹھ گئی۔ گلاس ٹیبل کی دوسری طرف کا صوفہ جنت نے سنبھال لیا۔ بوکے اس نے میز پر رکھ دیا۔

''میں جانتی ہوں، وہ گھر پر نہیں ہیں۔ اور میں ان سے نہیں۔ آپ سے ملنے آئی ہوں۔''

جنت کے تاثرات یکا یک بدل گئے۔ مسکراہٹ سمٹ گئی، مگر دوسرے ہی پل اس نے خود کو سنبھال لیا۔

''اوہ اچھا، تو کس سلسلے میں ملنے آئی ہیں آپ مجھ سے؟''

اسے یکا یک احساس ہوا، ایک ان جان لڑکی کو اندر آنے کی اجازت دے کر اس نے بہت بڑی غلطی کر لی ہے۔

''میں آرزو جہانگیر کی منیجر جویریہ حبیب ہوں۔'' اپنا تعارف کروانے کے بعد وہ رک کر جنت کو دیکھنے لگی تھی۔ شہد رنگ آنکھوں میں شناسائی کی رمق ابھری تھی نہ یہ نام سن کر تاثرات میں تبدیلی آئی تھی۔ فارس وجدان کی بیوی کسی ''آرزو جہانگیر'' کو نہیں جانتی تھی۔

''جی کہیے۔'' ملازمہ مشروب کا گلاس پیش کر کے گئی تو اس نے مروتاً مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کس سلسلے میں ملنا چاہتی ہیں آپ مجھ سے؟'' لہجے کو حتی الامکان سنجیدہ کر کے پوچھا۔ وہ اپنے کسی بھی انداز سے اندرونی اضطراب یا خوف کا پتا نہیں دینا چاہتی تھی۔

جویریہ حبیب نے اپنے چھوٹے سے پرس سے ایک کارڈ نکال کر اس کے سامنے میز پر رکھا۔ جامنی رنگ کا وی آئی پی انویٹیشن کارڈ جو اس کے نام تھا۔

''یہ میم آرزو جہانگیر کی میک اپ پراڈکٹ لانچ ایونٹ کے لیے آپ کا انویٹیشن ہے۔''

جنت نا سمجھی کے عالم میں اسے دیکھ کر رہ گئی۔ فارس سے شادی کے بعد ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ کسی کمپنی یا برانڈ نے اس کی شوہر کی پوزیشن اور حیثیت کی وجہ سے اسے اپروچ کیا ہو۔

اس نے کارڈ کھول کر دیکھا۔ صرف اس کا نام لکھا تھا۔ فارس وجدان کا نام نہ ہونا اسے اچنبھے میں مبتلا کر گیا۔ چند لمحوں تک وہ ایسے ہی کارڈ کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔

''سوری ٹو سے۔ لیکن میں یہ ایونٹ اٹینڈ نہیں کر سکوں گی۔'' اس نے منع کر دیا۔

''وائے ناٹ؟'' جویریہ حبیب نے حیرت کا اظہار کیا تھا۔

''میں آرزو جہانگیر کو نہیں جانتی۔'' کارڈ بھی واپس میز پر رکھ دیا۔ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''یہ حیرت تو مجھے بھی ہے کہ آپ میم کو نہیں جانتیں۔'' اس نے کہا۔ ''حالانکہ خاصا گہرا رشتہ ہے آپ کا ان سے۔''

جنت نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔ ''اچھا، کیسا رشتہ؟'' صوفے کے ساتھ پشت ٹکاتے ہوئے اس نے اپنا گلاس اٹھا لیا۔ چند گھونٹ لے کر پورے اعتماد کے ساتھ اسے دیکھا۔ جویریہ حبیب کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

''ویسے لوگ آپ کے ہزبینڈ کے بارے میں بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔''

جس انداز اور لہجے میں اس نے فارس کا ذکر کیا، جنت اندر تک تپ گئی مگر اوپر سے کچھ بھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔

''اچھا! کیا کہتے ہیں لوگ میرے ہزبینڈ کے بارے میں جو آپ کو اتنا صحیح لگتا ہے؟'' گردن اونچی کیے اس نے سوال کیا۔

جویریہ حبیب کو اس لمحے احساس ہوا وہ لڑکی اتنی آسان نہیں تھی جتنا آسان اس نے سمجھ لیا تھا۔

''یہی کہ اپنے دادا کی طرح وہ دوسروں کو اندھیرے میں رکھنے کا فن جانتے ہیں۔'' طنزاً مسکرائی۔ جنت کے اندر ایک دم سے سناٹا پھیلا تھا۔ اگلے ہی پل زبردستی کی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر اس کی طرف دیکھا۔

''وہ کیا ہے کہ میرے ہزبینڈ کو 'غیر ضروری' لوگوں کو ٹینشن دینے کی عادت نہیں ہے۔''

جویریہ حبیب کے لبوں سے مسکراہٹ لمحے بھر کے لیے اڑنچھو ہوئی۔

''آئی سی۔'' پرسوچ نگاہوں سے اسے دیکھتے پھر سے مسکرا کر چپ ہو گئی۔

''کیا آپ کو مجھ سے کچھ اور بھی کہنا ہے؟'' وہ جیسے جلد از جلد اس ملاقات کو ختم کر دینا چاہتی تھی۔

''میم اپنی پراڈکٹ لانچ کے لیے صرف ایک ہفتے کے لیے پاکستان آئی ہیں۔ اور وہ آپ سے ضروری ملنا چاہتی ہیں۔'' اس نے سیدھا سیدھا بات کرنے کی ٹھانی۔

''جب میں آپ کی میم کو جانتی ہی نہیں ہوں تو پھر ان سے کیسے مل سکتی ہوں؟''

''انہیں جاننے کے لیے صرف ان کا نام ہی کافی ہے۔'' جتا کر کہا۔

جنت دھیرے سے مسکرائی۔ ''میرے لیے نام بھی کافی نہیں ہے۔ آپ کا بہت شکریہ کہ آپ یہاں آئیں۔ میرا نہیں خیال میں یہ ایونٹ اٹینڈ کر پاؤں گی۔'' اس نے کہہ کر کارڈ اس کی طرف کھسکا دیا۔ ''اب آپ جا سکتی ہیں۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جویریہ حبیب کو بھی اپنی جگہ سے اٹھنا پڑا۔

''آپ نے وقت دیا اس کے لیے شکریہ۔ یہ کارڈ رکھ لیجیے۔ مجھے یقین ہے جب آپ کو میم کے بارے میں علم ہو گا تو آپ ان سے ضرور ملنا چاہیں گی۔''

اس نے آرزو جہانگیر کا بزنس کارڈ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ اپنا پرس کندھے پر ڈالتے ہوئے دروازے کی طرف قدم اٹھائے۔ پھر کچھ سوچ کر رک گئی۔ مڑ کر جنت کی طرف دیکھا۔

''کیا میں آپ سے ریکویسٹ کر سکتی ہوں کہ آپ ہماری اس ملاقات کا ذکر اپنے شوہر سے نہ کریں؟''

''جی؟'' جنت نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

''نیور مائنڈ!'' وہ اس کے اندر بہت سے واہموں کو جگاتی صدر دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

بزنس کارڈ اور وی آئی پی انویٹیشن گلاس ٹیبل پر رکھا تھا۔

اور جنت کمال اس عجیب و غریب ملاقات کا تجزیہ کرتی اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔۔

☆☆☆

''اقصیٰ!''

''جی آپی!'' بائیو کی کتاب میں ناول چھپا کر پڑھتی ہوئی اقصیٰ کی آواز آئی۔ دوپہر کے بعد سے یہ جنت کا کوئی تیسرا چکر تھا۔ ہر بار وہ کچھ کہتے کہتے رک جاتی تھی۔ مگر اب کی بار ایسا نہیں ہوا تھا

''ایسا ہوتا ہے نا اکثر فلموں ڈراموں میں اور کہانیوں میں۔ کوئی ایک کردار کو کوئی منع کرتا ہے کہ تم نے فلاں بات فلاں بندے

کونہیں بتانی؟“

اقصیٰ جو کتابوں سمیت بیچ پر چڑھی بیٹھی تھی، ایک دم سے اٹھ کر اس کے پاس آ گئی۔

”جی جی آپی۔ اکثر ہوتا ہے ایسے۔“ وہ بہت زیادہ متجسس تھی۔

”اور وہ جو کردار ہوتا ہے، وہ یہ بات نہیں بتاتا اور بری طرح سے پھنس جاتا ہے...... ہے نا۔“

”جی جی بالکل!“ اقصیٰ نے زور وشور سے سر ہلایا۔ ”یہی ہوتا ہے۔“

”اور ہم دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اور ہمیں غصہ آ رہا ہوتا ہے کہ یہ بات کیوں نہیں بتائی جاتی۔“ جنت نے مزید کہا۔

”ہاں نا، اتنا غصہ آتا ہے۔ دل کرتا ہے بس ہیروئن سامنے ہو اور اسے تھپڑ لگا دیں۔ آدھے سے زیادہ مسئلے تو وہیں حل ہو جائیں اگر ہیروئن ہیرو سے کوئی بات نہ چھپائے۔“

”وہی تو۔“ جنت نے بھی تائید میں سر ہلایا۔ جس مسئلے میں الجھی تھی، اس مسئلے کا ہوائی، فضائی خیالی حل مل گیا۔

”تھینک یو سو مچ اقصیٰ!“ خود سے لگا کر کہا۔ اقصیٰ ہونق بنی اسے دیکھ کر رہ گئی۔ کہ ایسا کچھ کیا تو ہے نہیں پھر یہ ”تھینک یو“ کس لیے؟ اب اس کی آپی شکریہ ادا کر رہی تھیں تو اس نے کوئی مدد کر ہی دی ہوگی۔ مطمئن ہو کر پھر سے بیچ پر بیٹھ گئی۔

جنت نے گہری سانس لے کر سر اٹھایا۔ پہلے اس کے اندر کچھ خوف تھا مگر اقصیٰ کی ”جی آپی!! بالکل آپی! یہی ہوتا ہے آپی“ سے کچھ ہمت پیدا ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ فارس کو اپنے گارڈ یا واچ مین سے یہ بات پتا چلے اسے خود ہی بتا دینی چاہیے۔ فیصلہ کر کے موبائل اٹھا لیا اور تیزی سے ٹائپ کر کے میسج لکھا۔

”مجھے تمہیں ایک بہت ضروری بات بتانی ہے۔“

”اچھا“ حیرت لیے تاثر۔ ”میں گھر آ رہا ہوں، تب بتا دینا۔“ مختصر سا جواب آیا۔ ”ٹھیک ہے کوئی جلدی نہیں۔“ مطمئن ہو کر اندر چلی گئی۔

شام کے کھانے کے بعد وہ کچھ وقت مسز شیرازی کے ساتھ ان کے اسٹوڈیو میں گزار کر باہر آئی تو فارس اسے کچن میں جاتا دکھائی دیا۔ وہ اس کے پیچھے وہیں آ گئی۔ جانتی تھی، اب وہ اپنے لیے کافی بنائے گا اور آفس روم میں بند ہو جائے گا۔

”تم نے پوچھا نہیں، میں نے تم سے کیا بات کرنی ہے؟“ اس کے پیچھے جا کر کہا۔ وہ نیلی جینز پر سیاہ ڈینم شرٹ میں ملبوس تھا جس کے تمام بٹن کھلے ہوئے تھے، سفید ٹی شرٹ پر حرف آر لکھا نظر آ رہا تھا۔

”اوہ ہاں۔“ اسے یاد آیا تو فوراً ہی جنت کی طرف مڑا۔ پھر فریزر سے پانی کی بوتل نکال کر کاؤنٹر ٹیبل پر رکھی۔

”مجھے بھی کرنی ہے۔ واچ مین بتا رہا تھا کوئی خاتون آئی تھیں تم سے ملنے۔ کون آئی تھیں؟“

جنت کا سانس رکا۔ غالباً فارس سمجھ رہا تھا اس کی کوئی رشتہ دار یا کوئی دوست یا پھر کوئی جان پہچان کی خاتون ہوں گی۔ مگر وہ تو جویریہ حبیب کو جانتی تک نہیں تھی۔

”ہاں وہ...... کوئی جویریہ حبیب آئی تھیں۔“ اس نے گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہہ دیا۔ ایک تو اس لڑکی کی باتیں پراسرار اور عجیب سی تھیں، دوسرا اسے فارس کے رویے سے زیادہ پریشانی ہو رہی تھی۔ کہیں ڈانٹ ہی نہ پڑ جائے کہ گھر میں کیوں آنے دیا۔

”جویریہ حبیب؟“ گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس نام کی کسی خاتون کو نہیں جانتا تھا۔ بزنس اور انویٹیشن کارڈ پر جنت کی گرفت یکا یک مضبوط ہوئی۔

”ہاں۔“ اس کا حلق خشک ہوا۔ ”اصل میں وہ مجھے انویٹیشن کارڈ دینے آئی تھیں۔ کوئی آرزو جہانگیر ہیں۔ انہوں نے مجھے اپنی میک اپ پروڈکٹ کے لانچنگ ایونٹ پر انوائٹ کیا ہے اور......“

کانچ کا گلاس فارس وجدان کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گرا تھا اور جھماکے سے ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ وہ ٹکڑوں سے بچتی ایک دم سے بوکھلا کر پیچھے ہوئی تھی۔

خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ کہیں کچھ غلط ہو گیا تھا یقیناً۔ شدت سے دھڑکتے دل کے ساتھ سر اٹھا کر فارس کو دیکھا۔

آن کی آن میں فارس وجدان کے تیور بدلے تھے، تاثرات بدلے تھے، مزاج بدلا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سختی اتری تھی۔ غصہ ٹھہرا تھا۔ لہجے میں ہر طرح کی تلخی گھل گئی تھی۔

”وہ اندر کیسے آئی؟“ اس کے قریب پہنچ کر اس قدر سختی سے پوچھا کہ وہ گھبرا سی گئی۔

”میں...... وہ...... میں سمجھی کہ آنٹی کی اسٹوڈنٹ......“

”ممی کی اسٹوڈنٹ؟ تم نے ایک ایسی عورت کو اندر آنے دیا جسے تم جانتی تک نہیں تھیں؟“ فارس کے لہجے میں وہی اجنبیت، بیگانگی ایک ہی پل میں لوٹ آئی تھی۔

”وہ...... مجھے لگا کہ......“

”تمہیں لگا؟“ وہ پھٹ پڑا۔ جنت اپنی جگہ ساکت کھڑی رہ گئی۔ اسے فارس وجدان اس لمحے کسی طور اپنے حواسوں میں نہ لگا۔ شدید غصے کے عالم میں اس کے ہاتھ سے کارڈ جھپٹ لیا۔ برنر جلا کر آگ میں جھونک دیا۔

وہ اس کے پیچھے سانس روکے کھڑی تھی۔ متوحش سی۔ پریشان اور ساکت۔

”کوئی چور ڈاکو آ کر کہے میں فارس وجدان کا دوست ہوں۔ جمیلہ داؤد کا اسٹوڈنٹ ہوں تو تم اسے بھی اندر آنے دو گی؟“

جنت کا سر جھک گیا۔ لب بھنچ گئے۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ”میں نے کہا نا۔ غلطی سے۔“

''یہ غلطی نہیں ہے۔'' اس کی آواز یکا یک بلند ہوئی تھا۔ لہجہ پہلے سے زیادہ سخت۔ زیادہ کرخت ہوا تھا۔

''آخر ہو کیا گیا ہے تمہیں؟'' سر اٹھا کر سسک پڑی۔ ''ایک ذراسی بات پر اس طرح ہائپر کیوں ہو رہے ہو؟ ایکسکیوز کر تو رہی ہوں......تم پھر بھی......'' ضبط کر کے سسکی دبالی۔ ''اگر نہ بتاتی جھوٹ بولتی یا۔ چھپا لیتی......پھر کیا کر لیتے تم......؟''

''ایک ذراسی بات؟'' فارس کے لب ہلے۔ آنکھوں میں غم وغصے کی لہر اٹھی مگر وہ ضبط کیے رہا۔ آگ دل میں تھی۔ اسے دل تک رکھنا ضروری تھا۔ ''میرے لیے یہ ذراسی بات نہیں ہے۔''

''آئم سوری!'' وہ لب بھینچ کر رونے پر قابو پائے آہستگی سے بولی۔

فارس چند لمحوں تک مٹھیاں بھینچ کر اسے سرخ پڑتی آنکھوں سے دیکھتا رہا پھر ہر ایک شے کو تہس نہس کر دینے کی خواہش لیے سیڑھیاں چڑھتا کمرے میں بند ہو گیا۔

سوچوں میں غلطاں وہ کانچ کے ٹکڑوں کے درمیان پریشان سی کھڑی رہ گئی۔

صرف اس لیے کہ اس کی اجازت کے بغیر کسی کو اندر آنے دیا۔ اس نے اذیت سے پلکیں جھپکیں۔ فرش پر بکھرے کانچ کو دیکھا۔ پھر اس راکھ کو جو برنر پر تھی۔

کئی لمحے اس کے رویے کو سمجھتے، اپنی غلطی کو پرکھتے گزر گئے۔ بات چھوٹی تھی۔ ردعمل پہاڑ جیسا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ اتنا تلخ کیوں ہو گیا تھا۔

وہ اسی وقت مسز شیرازی کے اسٹوڈیو میں آگئی۔

وہیل چیئر پر براجمان وہ سامنے دیوار پر لگی پینٹنگ کی جانب متوجہ تھیں۔ اسے دیکھ کر کچھ حیران ہوئیں۔ کہ غم وغصے کی عکاسی کرتے تاثرات ہی ایسے تھے۔ یوں لگتا تھا ابھی رو دے گی مگر ضبط کیے ہوئے تھی۔ ساری بات من وعن سنادی۔ مسز شیرازی حیران وششدر بیٹھی رہ گئیں۔ سماعت پر کچھ لمحوں تک یقین نہ آیا۔

''میں تو انہیں جانتی تک نہیں ہوں۔ مجھے واقعی میں لگا آپ کی کوئی اسٹوڈنٹ آئی ہو گی۔ یہ میری غلطی ہے۔ میں مانتی ہوں۔ وہ صرف انویٹیشن کارڈ دینے آئی تھی۔ میں نے منع کر دیا۔ مگر فارس میری کسی بات پر یقین ہی نہیں کر رہا۔ اسے غصہ ہے، میں نے اندر کیوں آنے دیا۔ غلط فہمی ہو گئی۔ ایکسکیوز بھی کیا مگر وہ......'' دکھ سے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''اتنی چھوٹی سی بات پر وہ اس طرح ری ایکٹ کر رہا ہے جیسے پتا نہیں میں نے کیا کر دیا۔''

مسز شیرازی اسے دیکھ رہی تھیں۔ اسے سن رہی تھیں۔ دم سادھے۔ منجمد۔ ساکت۔ ویران اور خاموش ہو کر۔

جنت کا دل کچھ ہلکا ہوا تو اس کی توجہ مسز شیرازی کے تاثرات کی طرف گئی۔ صحیح معنوں میں پریشان تو اب ہوئی۔ انہوں نے رنگوں سے توجہ ہٹالی۔ برش رکھ دیا۔ وہیل چیئر کا رخ مکمل طور پر اس کی جانب کر لیا۔

''بیٹھو!''

انہوں نے سنجیدگی سے کہا تو وہ مضطرب ہوئی۔ کیا کچھ غلط ہو گیا ہے؟ خشک لبوں کو تر کرتی ان کے پاس بیٹھ گئی۔

چند لمحوں تک زرکار روشنیوں کے دامن میں خاموشی چھائی رہی۔ جیسے کچھ کہنے سننے کو نہ رہا ہو۔ پھر انہوں نے اپنا موبائل اٹھایا۔ کچھ ٹائپ کر کے اس کی طرف بڑھا دیا۔ ناسمجھی کے عالم میں انہیں کچھ پریشانی سے دیکھتے اس نے موبائل لے لیا۔ اللہ کرے سب خیر ہو! اس کا دل شدت سے دھڑکے جا رہا تھا۔ موبائل پر گرفت بڑھائے اسکرین پر نظر ڈالی۔

سرچ بار پر آرزو جہانگیر لکھا ہوا نظر آرہا تھا۔ نیچے مختلف تصاویر تھیں۔ اسے چہرہ جانا پہچانا سا لگا۔ جیسے پہلے دیکھ چکی ہو۔ اگلے ہی پل ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ ایک غیر ملکی چینل پر لیڈی ایسپرانزا کے نام سے جس خاتون کا اس نے انٹرویو دیکھا تھا وہ یہی تھیں۔

آرزو جہانگیر۔ ایک کامیاب بزنس وومن۔ ایک کامیاب ماڈل۔ سوشل میڈیا کے ہر پلیٹ فارم پر ان کے لاکھوں مداح تھے۔ گوگل کا سرچ انجن ان کی ہر طرح کی تصاویر سے بھرا ہوا تھا۔ ان کے انٹرویو، ٹوئیٹس، اسٹوریز۔ ویڈیوز۔ آرٹیکلز ہر ایک شے کھل کر سامنے آگئی۔ ایک سرسری سی نگاہ دوڑاتے آہستگی سے اسکرول کیا اور اگلے ہی پل اپنی جگہ صدمے سے گنگ بیٹھی رہ گئی۔ آنکھوں پر کسی طور یقین نہ آیا۔

''ناممکن!'' یہ پہلا تاثر تھا۔ تاثر ہی رہا۔ حقیقت نہ بن سکا۔ اس کا سر گھوم کر رہ گیا۔

''یہ حیرت تو مجھے بھی ہے کہ آپ میم کو نہیں جانتیں۔'' حیرانی لیے آنکھوں کا تیکھا سا تاثر۔ کچھ جتاتی ہوئی مسکراہٹ۔

''حالانکہ۔ خاصا گہرا رشتہ ہے آپ کا ان سے۔'' اس کے آس پاس جیسے دھماکے ہوئے۔ سر بے اختیار نفی میں ہلا۔ آنکھوں میں صدمہ اترا۔ لب ساکت ہوئے۔

آرزو جہانگیر کے فارمر سپاوسز میں پہلا نام ہارون اعظم شیرازی کا تھا۔ چلڈرن میں فارس ہارون شیرازی کا نام لکھا ہوا آرہا تھا۔

''ایسا کیسے؟'' سر اٹھا کر مسز شیرازی کو دیکھا۔ پتھرائی ہوئی نگاہیں دوبارہ اسکرین پر جمائیں۔ کہ شاید آنکھوں کو دھوکا ہوا ہے۔ مگر جو دیکھا وہی حقیقت تھی جس سے نظریں چرانا ممکن نہ تھا۔

''پانچ سال کا تھا جب آرزو اسے چھوڑ کر گئی تھی۔'' وہ بولیں تو لہجہ نرم مگر کسی پوشیدہ درد کی عکاسی کر رہا تھا۔ آنکھوں میں ایک سوچ ٹھہری تھی۔ انہیں جیسے کچھ بتانے کے لیے بہت کچھ یاد کرنا پڑ رہا تھا۔

جنت گہرے صدمے میں تھی۔ اسے تو جیسے ابھی بھی یقین نہیں آرہا تھا۔ مسز شیرازی کے ساتھ فارس کی جو محبت تھی اور جس

طرح سے وہ فارس کو چاہتی تھیں۔ اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا وہ ان کا سگی اولاد نہیں تھا۔ اس کا سر پھر سے نفی میں ہلا۔ حقیقت کو تسلیم کرنے میں دقت ہوئی۔ ایسا مضبوط رشتہ۔ خلوص اور محبت سے بندھا ہوا۔ خون سے زیادہ گہرا۔

''تو آپ نے......آپ نے فارس کی پرورش کی۔'' کافی دیر بعد کچھ کہنے کے قابل ہوئی تو اس نے پوچھا۔

مسز شیرازی خاموش رہیں۔ نہ نفی میں سر ہلایا۔ نہ اثبات میں۔ جواب کہیں درمیان میں رہ گیا۔ اب وہ گردن موڑے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھیں۔ گو کہ وہاں اندھیرا تھا اور لائٹ پولز کی روشنی بھی ناکافی تھی مگر وہاں کچھ تھا۔ کچھ ایسا جو صرف تاریکی میں ہی نظر آ سکتا تھا۔

''ان کے ساتھ فارس کا ریلیشن کیسا ہے؟'' اس نے محتاط ہو کر پوچھا۔ آرزو جہانگیر فارس وجدان کی بائیولوجیکل ماں تھی۔ اسے اتنی آسانی سے وہ اپنی زندگی سے بے دخل تو نہیں کر سکتا تھا۔

''فارس کا رویہ دیکھنے کے بعد تمہیں کیا لگتا ہے کیسا ہو سکتا ہے؟'' انہوں نے گردن موڑ کر اس سے پوچھا۔ آنکھوں کی نمی گہری تھی۔ چہرے پر کرب سا نظر آ رہا تھا۔ جنت کے اندر عجیب سی بے چینی اور دکھ پھیل گیا۔ جس بات کو وہ چھوٹا سمجھ رہی تھی فارس وجدان کے لیے وہ چھوٹی نہیں تھی۔ ماں اور بیٹے کے درمیان اختلاف معمولی نوعیت کا نہیں تھا۔

''آرزو چاہتی ہے فارس کے ساتھ سب ٹھیک ہو جائے مگر فارس، ایسا نہیں چاہتا۔''

ان کی نظریں اب جھکی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی ہتھیلیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ جنت کو ایک دم سے احساس ہوا آرزو جہانگیر کا ذکر مسز شیرازی کے لیے بھی خوش گوار نہیں تھا۔

''کیا وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اسے چھوڑ کر گئیں؟''

''کیا یہ وجہ ناکافی ہے بیٹا؟'' انہوں نے سر اٹھا کر پوچھا۔ جنت کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ سر بھی جھک گیا۔ اس کی ماں نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ ان سے کبھی نفرت نہیں کر سکی تھی۔

اس کی ہمت نہ ہوئی، وہ ان سے مزید کوئی سوال کرتی یا کچھ جان سکتی۔ سوال غم دیتے تھے۔ اذیت سے دوچار کرتے تھے۔ اسے اپنے دکھ، اپنے کرب، اپنی محرومیاں یاد آئیں۔ ایک وقت اس پر بھی گزرا تھا جب وہ اپنی حکایتوں سے چھپتی پھرتی تھی۔ خاموشی مانگتی تھی۔ خاموشی چاہا کرتی تھی۔

''آپ دونوں کی محبت دیکھ کر ایک لمحے کے لیے بھی میرے ذہن میں یہ گمان نہیں گزرا کہ آپ اس کی بائیولوجیکل مدر نہیں ہیں۔ اب بھی اگر آپ نہ بتاتیں تو شاید۔ میں کبھی یقین نہ کرتی۔''

''وہ میرا بیٹا ہے۔'' انہوں نے جس مان، استحقاق اور محبت سے کہا۔ جنت کی آنکھیں بھر آئیں۔ دل میں ان کی عزت اور

مقام مزید بڑھ گیا۔

''میں چاہتی ہوں تم فارس سے اس بارے میں دوبارہ کوئی بات مت کرو۔ وہ بہت ڈسٹرب ہو جاتا ہے۔''

جنت نے ان کے ہاتھ اپنے گرفت میں لے لیے۔

مسز شیرازی نے سر اٹھایا اور اگلے ہی پل اپنی جگہ رک گئیں۔

آنکھوں میں غم اور غصہ لیے فارس وجدان دروازے میں کھڑا تھا۔ مٹھّیاں بند تھیں، جبڑے بھنچے ہوئے تھے۔ وہ گفتگو سن چکا تھا۔ تبھی مدھم ہونے کے بجائے مزید اشتعال میں آ گیا تھا۔

دکھ۔ کرب۔ غصہ۔ اور بے بسی کا احساس لیے وہ کچھ کہتے کہتے رکا اور پھر جھٹکے سے پلٹ گیا۔

''فارس!'' انہوں نے ایک دم سے پریشان ہو کر اسے پکارا تھا۔ جنت ایک دم سے ہوش میں آئی۔ فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں دیکھتی ہوں۔''

عجلت میں قدم اٹھاتی وہ فارس کے پیچھے باہر آ گئی تھی۔

کی بٹن سے وہ اپنی گاڑی ان لاک کر چکا تھا۔ دروازہ کھولا ہی تھا کہ جنت اس کے سامنے آ گئی۔

''اس وقت کہاں جا رہے ہو؟''

''جہنم میں۔ چلو گی ساتھ؟'' غصے سے پھٹ پڑا۔

وہ لمحے بھر کے لیے رکی۔ ''ہاں! بس مجھے پانچ منٹ دو، میں کپڑے بدل کر آتی ہوں۔''

وہ جبڑے بھینچ کر رہ گیا۔ ''ہٹو آگے سے۔''

''یہاں سے تو میں کہیں نہیں جاؤں گی۔'' ڈرائیونگ سیٹ کے ادھ کھلے دروازے کو زور سے بند کرتی جم کر کھڑی ہو گئی۔

''ساتھ لے کر جاؤ ورنہ کہیں مت جاؤ۔''

''ہاں تاکہ اینڈ آف دی روڈ تم مجھ سے کہو میں کتنا بے حس ظالم، اور سنگ دل انسان ہوں۔ جسے اس عورت سے بے تحاشا نفرت ہے۔ جس نے اسے نو ماہ تک پیٹ میں رکھا۔''

وہ دل میں ایک درد سا محسوس کرتی اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔

''اوہ!! شاید تمہیں اس بات سے بھی مسئلہ ہو کہ میں اسے ''عورت'' کیوں کہہ رہا ہوں۔ اور مجھ جیسی ایک نافرمان اولاد کی دنیا و آخرت تو یہیں تباہ ہو گئی۔ اور تم کتنی بدقسمت ہو کہ تمہیں میرا ساتھ ملا۔'' داہنے ہاتھ سے اپنی طرف اشارہ کیا۔ تکلیف میں وہ تھا اور درد اسے محسوس ہونے لگا۔ غم اس کا تھا اور دل اس کا پھٹنے لگا۔

''اب ہٹو میرے راستے سے۔ میں کچھ وقت اکیلے.....'' اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ جنت نے آگے بڑھ کر اسے خود سے لگا لیا تھا۔ اپنے تمام تر غصے اور اشتعال سمیت فارس وجدان اپنی جگہ منجمد کھڑا رہ گیا۔

''میں نے کہا نا۔ اگر باہر جا رہے ہو تو ''ہمیں'' ساتھ لے کر جاؤ گے۔ ورنہ نہیں جاؤ گے۔'' وہ اپنی گرفت مضبوط کیے کھڑی تھی۔

اس نے پلکیں جھپکیں، چند لمحوں تک کھڑا رہا۔ ساکت۔ صامت۔ مکمل خاموشی اور ویرانیوں کی زد میں۔

مسز شیرازی آنکھوں میں پریشانی لیے گلاس والز سے انہیں ہی دیکھ رہی تھیں۔

جنت نے الگ ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانکا پھر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''بولو، کیا کرنا ہے اب؟'' گرفت اتنی مضبوط کہ اسے لگا وہ اپنا ہاتھ چھڑانا بھی چاہے گا تو نہیں چھڑا سکے گا۔

اگلے کئی لمحوں وہ آنکھوں میں حزن کی نمی لیے تاریکی کا حصہ بنا رہا۔

''صرف دو منٹ ہیں تمہارے پاس۔'' لہجہ ویسا ہی روکھا سا۔ جنت کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''بس ہم ابھی گئے اور ابھی آئے۔''

وہ اسی وقت اندر چلی گئی۔ سیدھا مسز شیرازی کے پاس گئی۔ ''میں سنبھال لوں گی سب۔ آپ فکر نہ کریں۔'' ہاتھ تھام کر تسلی دی۔ کپڑے بدلے اور باہر آ گئی۔ وہ گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔ پسنجر سیٹ پر بیٹھتے ہی کشن رکھتے سیٹ بیلٹ باندھتے جب تک فارغ ہوئی گاڑی مرکزی شاہراہ پر پہنچ چکی تھی۔

کتنی ہی دیر تک گاڑی میں خاموشی چھائی رہی۔ وہ ڈرائیونگ کرتا رہا۔ اور جنت باہر دیکھتی رہی۔ سفر لمبا تھا۔ سڑکیں کہیں سنسان اور کہیں آباد ہو جاتی تھیں۔ آسمان، شہر کی روشنیاں۔ آبادی۔ اور ان کا سفر۔ خاموش سفر۔ اداس سفر۔

''تمہیں پتا ہے، تمہارے بابا کتنے عجیب انسان ہیں۔ گھنٹہ ہو گیا ہے، ہم سڑکوں پر گھوم رہے ہیں اور ان سے یہ نہیں ہوا کہ آئس کریم ہی کھلا دیں۔'' وہ اپنے بچے سے مخاطب تھی۔

اسٹیئرنگ وہیل پر گرفت جمائے فارس نے اسے سخت نظروں سے دیکھا۔ ''میں نے کہا مجھے خاموشی چاہیے۔''

''ہاں تو میں کون سا تم سے بات کر رہی ہوں؟'' کندھے اچکا کر رخ بدل گئی۔

جبڑے بھینچ کر اس نے کسی قریبی آئس کریم پارلر کے سامنے گاڑی روک دی۔

''انسان مروتاً پوچھ ہی لیتا ہے کہ گاڑی میں کھانا چاہو گی یا باہر۔'' وہ دروازہ کھولنے ہی لگا تو بول پڑی۔

''فرمائیے، کیا خواہش ہے؟'' تپ کر پوچھا۔

''اب تم پوچھ ہی رہے ہو تو۔ کیوں نا پہلے پیزا کھا لیا جائے؟'' ضبط کر کے وہ اس کی طرف مڑا۔

''شام کا کھانا کھائے ابھی دو گھنٹے ہوئے ہیں۔''

''تین گھنٹے۔'' فوراً ہی تصحیح کی۔ ''یہ جو ایک گھنٹہ ہم سڑکوں پر خوار ہو رہے ہیں اسے بھی تو کاؤنٹ کرو۔ بلکہ.....'' رک کر اپنی انگلیوں پر حساب کتاب شروع کیا۔ ''ہماری جب کچن میں لڑائی ہوئی تو اس وقت آٹھ بج رہے تھے۔ پھر جب باہر نکلے تو اس وقت نو بجے کا وقت تھا۔ اب دس بجنے والے ہیں۔ کچھ دیر بعد تین گھنٹے پورے ہو جائیں گے۔''

''میں تمہیں اپنے ساتھ کیوں لایا ہوں؟'' جھلا اٹھا۔

''ہم خود آئے ہیں۔'' جتا کر بولی۔

اسٹیئرنگ وہیل گھماتے گاڑی کو سڑک پر ڈال دیا۔ کچھ دیر بعد وہ پیزا ہٹ میں موجود تھے۔ اس کے لیے آرڈر دے کر وہ خود اجنبیوں کی طرح سینے پر بازو باندھے بیٹھ گیا تھا۔ اس وقت اس کا نہ کچھ کھانے کا موڈ تھا نہ کوئی بات کرنے کا۔ کافی سے زیادہ جھلایا تھا۔ اسے تو جیسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

پیزا سے فارغ ہو کر پھر آئس کریم پارلر کا رخ کیا گیا۔

کھلے آسمان تلے۔ بلندی سے ریلنگ کے اس پار شہر کی روشنیوں کو دیکھتے جنت کمال اپنی آئس کریم سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ فارس اپنا کپ ہاتھ میں لیے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اس کے تاثرات پہلے سے کچھ بہتر تھے۔ آنکھوں کی سختی کم ہو چکی تھی۔ پیشانی پر اب کوئی بل نہ تھا۔ وہ اس کے کندھے سے سر ٹکائے اوپر کہیں آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی اور مسلسل بولتی جا رہی تھی۔ اس کی تمام باتوں میں کہیں بھی آرزو جہانگیر کا ذکر نہیں تھا۔ تجسس نہیں تھا۔ غصہ۔ نفرت یا اس کے رویے کو لے کر حقارت نہیں تھی۔ اسے اس بات سے فرق نہیں پڑا تھا وہ اپنی ''ماں'' سے نہیں ملتا۔ اس بات سے بھی نہیں کہ وہ ان سے ''نفرت'' کرتا ہے۔

''آئم سوری۔'' وہ چپ ہوئی تو اس نے کہا۔ بہت اچانک اور بغیر کوئی حوالہ دیے۔

''کس لیے۔'' وہ حیران ہوئی تھی۔ فارس خاموش رہا۔ غالباً وہ اپنے رویے کی معذرت کر رہا تھا۔

''میری طرف سے بھی سوری۔'' کچھ سوچ کر اس نے بھی کہہ دیا۔

''کس لیے؟''

''میں بھی تو کافی الٹا سیدھا بول گئی۔''

''وہ تو تم ہمیشہ بولتی ہو۔''

بھنویں سکیڑ کر اس نے فارس کو گھورا۔ ''مطلب کہ۔ حد ہے؟'' جھنجھلا گئی۔ میں نے اپنا سوری واپس لیا۔'' کہہ دیا۔

وہ ایک مسکراتی نظر اس پر ڈالے کہیں دور دیکھنے لگا۔

''اگر میں تمہارے ساتھ نہ آتی تو کہاں جاتے؟'' آسمان کی بلندیوں میں روشن ستاروں کو کھوجتے پوچھا۔

''یہیں آتا جہاں ہم ہیں۔''

اس نے متعجب ہو کر اطراف میں نگاہ دوڑائی۔

''یعنی یہ تمہارے لیے کوئی خاص جگہ ہے۔''

''تم دیکھ سکتی ہو۔ یہاں سے پورا شہر نظر آتا ہے۔''

''آخری بار تم یہاں کس کے ساتھ آئے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں یہاں اکیلا ہی آتا ہوں۔''

اس نے دیکھا، پہاڑی کے نیچے گھومتی ہوئی سڑک کے اس پار سرسبز خطے کے وسط میں ایک قصر نما گھر نظر آ رہا تھا۔ اس کی تمام بتیاں رات کے اس پہر اس طرح سے روشن تھیں کہ دن کے اجالے کا گمان ہو رہا تھا۔ منظر انتہائی خوب صورت تھا۔

''تم وہ دیکھ رہی ہو؟'' فارس نے ہاتھ بڑھا کر اشارہ کیا۔

''ہاں۔''

''یہ شیرازی ہاؤس ہے۔''

جنت نے چونک کر سر اٹھایا۔

''میرے دادا یہیں رہتے تھے۔ اس قصر میں۔''

''اوہ! تو اس لیے یہ جگہ تمہارے دل کے بہت قریب ہے۔'' اپنے بھول پن میں بول گئی۔ فارس کی نگاہیں ٹھہری رہیں۔ چہرہ بے تاثر رہا۔

وہ اب گردن اونچی کیے دور تک دیکھ رہی تھی۔

''گھر میں کون رہتا ہے؟''

''کوئی نہیں۔''

''تو لائٹس کیوں آن ہیں؟''

خاموشی......

رخ موڑ کر فارس کو دیکھا۔ اس نے جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال لیے۔ وہ اپنے بھائی، باپ اور دادا کے بارے میں کوئی

بات نہیں کرتا تھا۔ جنت محسوس کر کے خاموش ہو گئی۔ کہ اس کا دل بہلانے آئی تھی۔ مزید ٹینشن سے دوچار کرنے تو نہیں۔ بیگ سے موبائل نکال کر چند ایک میسیج ٹائپ کیے۔ وہ مسز شیرازی کو تسلی دے رہی تھی کہ سب ٹھیک ہے آپ سو جائیں۔ پھر فرصت سے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ کین ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔

''ویسے ایک سوال ہے میرے ذہن میں۔ اور کافی عرصے سے ہے۔ مگر میں نے تم سے کبھی پوچھا نہیں۔'' اس نے کہا۔

''کیسا سوال؟'' گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ اتنی دیر تک خاموش رہنے کے بعد اب وہ گفتگو میں حصہ لے رہا تھا۔ آنکھوں میں سرخی ٹھہری تھی مگر تاثرات کافی حد تک نارمل ہو چکے تھے۔ وہ بہت ریلیکسڈ لگ رہا تھا۔

''میں اس پر کبھی بات تو نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن......'' کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ ''تم جانتے ہو مجھے پہلی ڈی وورس کس لیے ہوئی تھی۔''

فارس بنچ پر بازو پھیلائے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر رہ گیا۔ اسے توقع نہیں تھی وہ اپنے ماضی سے جڑے کسی اذیت بھرے وقت کا حوالہ دے سکتی ہے۔ وہ بھی اس مضبوطی کے ساتھ۔

''تمہیں برا نہیں لگتا؟ مطلب......تمہیں پہلے بہت نفرت ہو گئی تھی مجھ سے کہ...... میں ایسی ہوں اور یہ کہ میں نے ایک بچے کی جان لینے کی کوشش کی۔ پھر ایسا کیا ہوا کہ۔ تم نے اس بات کو ہمارے درمیان سے نکال دیا؟''

فارس اس کے عجیب و غریب سوال پر متحیر سا بیٹھا رہ گیا۔ کیا وہ اپنا معاملہ چھیڑ کر اس کا ذہن بھٹکانے کی کوشش کر رہی ہے؟ یا پھر وہ واقعی میں اس کا موقف جاننا چاہ رہی ہے؟

''مجھے ایک نے چھوڑ دیا کہ میں ''ایسی'' ہوں۔ مجھے دوسرا یہ جان کر کیسے اپنا سکتا ہے کہ میں ''ویسی ہی ہوں۔'' اس کی آواز کمزور تھی، نہ آنکھیں نم تھیں نہ تاثرات میں کسی دکھ کا شائبہ تھا۔ وہ جیسے اپنی نہیں کسی دوسرے۔ تیسرے یا کسی چوتھے انسان کی بات کر رہی تھی۔

ایسے جیسے اس کے اندر ایک الجھن ہو۔ کوئی گرہ جو کھلنے کا نام نہ لیتی ہو۔

''تم پھر سے کچھ الٹا سیدھا سوچ رہی ہو؟''

''نہیں تو...... یہ تو بس ایک سوال ہے۔''

وہ چپ ہو گیا۔ کچھ دیر تک چپ ہی رہا۔

''میں بہت پہلے جان گیا تھا تم کسی کی جان نہیں لے سکتیں۔''

کین لبوں سے لگا کر اس نے سپ لیا۔ جنت دم سادھے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"یہ الگ بات ہے کہ تسلیم نہیں کرنا چاہتا تھا۔" کہہ کر دور تک دیکھا۔اشارہ ان تلخ باتوں کا تھا،طنز اور طعنوں کا تھا۔اس ذہنی اذیت کا جس سے وہ اسے دوچار کرتا رہا تھا۔

"کیا مطلب......کیسے جان گئے تھے؟" جنت کی آنکھوں میں حیرت اتری۔اس کی حقیقت تو صرف اس کے پاس ہی تھی۔اگر کہیں سے معلومات لیتا بھی تو اسے مثبت جواب تو کبھی نہ ملتا۔خاندان بھر میں سب ہی اسے مجرم گردانتے تھے۔سو اس کی حمایت میں کوئی کچھ بولتا تو ہرگز نہیں ہوگا تو پھر......

اس کی آئس کریم تقریباً ختم ہو چکی تھی۔

"جب مجھے اینافالیکٹک شاک ہوا تھا تب۔" اس نے کہا۔کین سے مزید چند گھونٹ لیے۔"یو سیوڈ مائی لائف !ری ممبر؟"

"اس سے یہ کیسے ثابت ہوا کہ میں۔بے گناہ ہوں؟"

وہ چند لمحوں تک پرسوچ نگاہوں سے سامنے جھاڑیوں کو دیکھتا رہا۔

"تم نے مجھے سی پی آر دیا تھا۔"

"ہاں تو......؟" اس کے لیے یہ اتنی بڑی بات نہ تھی کہ اس کا یوں ذکر کیا جاتا۔

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس رشتے کو نبھانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔"

وہ رک گئی۔آنکھوں میں نافہمی کا تاثر لیے اسے دوبارہ دیکھا۔

فارس نے گردن موڑ کر جنت کو دیکھا۔کیا وہ ابھی بھی نہیں سمجھی؟

"کیا مطلب؟"

"اگر تمہارے لیے کسی کی زندگی سے زیادہ اپنا مفاد اہم ہوتا تو تم مجھے سی پی آر نہ دیتیں ،سمپل۔" وضاحت دے کر اس کی مشکل آسان کرنا چاہی۔

جنت ہونق سی اسے دیکھ کر رہ گئی۔کیسا مفاد؟ کون سا مفاد؟

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟"

"فارس وجدان کی بیوہ ہونا زیادہ فائدہ مند ثابت ہوتا یا دوسری بار طلاق یافتہ ہونا؟" اس نے جھلا کر کہا تو جنت کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔منہ حیرت اور صدمہ سے کھل گیا۔

"اللہ!" دونوں ہاتھ گال پر اور پھر اپنے منہ پر رکھ لیے۔"یہ تو میرے ذہن میں آیا ہی نہیں۔" حیرت۔شاک۔صدمہ۔جیسے دماغ کی چولیں ہل کر رہ گئی ہوں۔فارس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"افسوس ہو رہا ہے اب؟" جبڑے بھینچ کر پوچھا۔

"بہت زیادہ۔"

وہ تاسف سے سر ہلا کر اٹھ گیا۔

"رکو۔" جھٹ سے اپنا پرس اٹھایا اور تیزی سے اس کے پیچھے آئی۔"اف میں کتنی بے وقوف ہوں،کتنی بے وقوف ہوں۔" اپنا سوال،فارس کا جواب،اس کا موقف۔اپنی ذات پر اس کی ایسی نگاہ۔ردعمل پر ایسا تجزیہ۔لب بھینچ کر مسکراہٹ دباتی اس کے قریب ہوئی۔

"اگر ذرا سا بھی۔" انگوٹھے کی پور کو انگلی سے جوڑ کر کہا۔"ذرا سا بھی میرا کرمنل دماغ ہوتا تو تمہاری ساری پراپرٹی مجھے مل جاتی......شیرازی انٹرپرائزز کی نئی سی ای او میں ہوتی؟"

وہ اس کی روشن آنکھوں میں شرارت کا رنگ دیکھ سکتا تھا۔

"میں تمہیں اپنے ساتھ کیوں لے آیا۔" بڑبڑا کر رہ گیا۔

اس کے برابر میں چلتے ہوئے وہ دل کھول کر ہنسی۔اور اس طرح ہنستے ہوئے بہت پیاری لگی۔ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ ماضی کی کسی تکلیف دہ بات پر اس کے چہرے پر دکھ بھرے تاثرات نہیں تھے۔وہ ہنس کر اس کا موقف انجوائے کر رہی تھی۔

"اتنی سی بات سے میری پوری شخصیت کا اندازہ لگا لیا۔"

"دیکھ لو،تم کتنی آسان ہو۔" وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے کہہ رہا تھا۔اور وہ اس کے آگے الٹے قدم پیچھے ہو رہی تھی۔

"تم مجھے انڈر اسٹیمیٹ کر رہے ہو،میں تمہاری سوچ سے زیادہ خطرناک ہوں۔میں کچھ ایسا کر سکتی ہوں جو تم بھی نہیں کر سکتے۔"

فارس کے لبوں کو مسکراہٹ چھو کر گزری۔ہاں وہ ایسی ہی تھی۔صدق دل۔سچے جذبات اور معصومیت سے۔اپنی دعا اور امید سے ناممکن کو ممکن کر دکھانے والی۔

"مثلاً؟"

"میں تمہاری جان لے سکتی ہوں۔" آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"وہ تو تم لے چکیں۔"

"اوہ واؤ،کیا تم نے ابھی تسلیم کیا تم ایک ذومبی ہو؟" آنکھیں چمک اٹھیں۔چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

وہ مسکرا کر رہ گیا۔

''میں ایک ذومی کے ساتھ پھر رہی ہوں۔'' آواز کچھ بلند تھی۔

قریب سے گزرتے ایک انکل اور آنٹی صاحبہ نے مڑ کر اچھنبے سے اسے دیکھا پھر اس کے ذومی کو۔

''سوری! میری وائف کو دورے پڑتے ہیں۔'' اسے بازو کے گھیرے میں لیتے معذرت خواہانہ لہجے میں گویا ہوا۔ جنت کے سر پر لگی تلوؤں میں بجھی۔

''کیا کہا؟'' وہ اس کی گرفت میں مچل کر چیخی تھی۔ وہ اسے ساتھ لیے سیڑھیوں کا رخ کر گیا۔ اترتے وقت اس نے ایک دو مکے تو جنت سے کھا ہی لیے تھے۔

''تم سے میری خوشی ذرا برداشت نہیں ہوتی۔''

اس کا موڈ ٹھیک کرنے اس کے ساتھ گئی تھی۔ واپسی پر اپنا موڈ خراب کر کے آگئی۔

''میری وائف کو دورے پڑتے ہیں۔'' پسنجر سیٹ پر بیٹھی تھی جم کر نقل اتاری۔ غصہ اتارا۔ بڑبڑاتی رہی۔

لب بھینچ کر مسکراہٹ دبائے وہ سنی ان سنی کیے یکسوئی سے ڈرائیونگ کرتا رہا۔

☆☆☆

گھر پہنچتے ہی وہ مسز شیرازی کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ بیڈ پر نیم دراز ان کے انتظار میں جاگ رہی تھیں۔ حالانکہ جنت نے میسج کر کے ان سے کہا تھا سب ٹھیک ہے۔ وہ سو جائیں مگر فارس کو دیکھے بغیر انہیں نیند نہیں آسکتی تھی۔ جاتے وقت برہم تھا۔ مگر اب اس کے تاثرات بہتر تھے تاہم آنکھوں میں ابھی بھی حزن کی نمی تھی۔

ان کے پاس بیٹھا تو انہوں نے گال پر ہاتھ رکھا۔ پھر اپنی گرفت میں لے کر اسے خود سے لگا لیا۔

کچھ دیر بعد جنت انہیں دیکھنے آئی تو ادھ کھلے دروازے میں ہی رک گئی۔ فارس ان کے پاس ہی سو گیا تھا۔ مسز شیرازی اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے دعائیں پڑھ کر پھونک رہی تھیں۔ سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''لائٹس آف کر دوں؟''

اس نے سرگوشی میں پوچھا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کمفرٹر فارس پر پھیلاتے ہوئے اس نے سائڈ ٹیبل کا لیمپ بند کر دیا۔ پانی مسز شیرازی کی میز پر رکھا اور لائٹس آف کر کے آہستہ سے دروازہ بند کرتی اپنے کمرے میں آگئی۔

بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس نے ایک گہری سانس لی۔ پورے دن کے واقعات ذہن میں دوڑ گئے۔ اس انکشاف کو سوچا جو آج اس پر ہوا تھا۔ آرزو جہانگیر کی اس تک پہنچنے کی کوشش سمجھ سے باہر ہو گئی۔ وہ بھی اس صورت میں جب کہ وہ اپنے بیٹے کی نفرت سے واقف تھیں۔

اس نے لیپ ٹاپ اٹھا لیا۔ ان کا نام سرچ کر کے ان سے متعلق آرٹیکلز پڑھتی گئی۔ وہ انٹرویوز جو انہوں نے دے رکھے تھے، وہ کلپس جو آن کی آن میں وائرل ہو جاتی تھیں۔ ان کی ادائیں، میک اپ، ڈریسنگ سینس کمال کی تھی۔ مغربی لباس ہو یا مشرقی۔ ہر روپ میں ڈھل کر قیامت ڈھا رہی تھیں۔

دو سال پہلے تک کے جو انٹرویوز تھے ان میں ان کی ذاتی زندگی زیادہ ڈسکس نہیں ہوتی تھی مگر اب جو انٹرویوز تھے ان میں وہ بہت دھڑلے سے اپنے ''بیٹے'' کا ذکر کرتی تھیں۔ اور بہت فخر سے اپنے ساتھ اس کا نام جوڑتی تھیں۔

حالیہ انٹرویو اس نے پھر سے دیکھا۔ اسے آج سمجھ میں آیا فارس نے ٹی وی کیوں بند کر دیا تھا۔ وہ آرزو جہانگیر کو دیکھنا تو درکنار ان کی آواز تک نہیں سننا چاہتا تھا۔

اتنے قریبی رشتے کے لیے اتنی نفرت اور تلخی اسے اندر تک اذیت میں مبتلا کر گئی۔ مائیں چھوڑ دیتی ہیں، مائیں توڑ دیتی ہیں۔ مگر جانے کیا بات تھی کہ اپنی ماں کی تمام تر نفرت سہتے ہوئے بھی وہ ان سے کبھی بھی نفرت نہیں کر سکی تھی۔ آخری وقت تک اس کی خواہش رہی تھی وہ اسے اپنا لیں۔ آخری وقت تک اس نے چاہا تھا وہ ان کی ہو جائے۔ مرنے کے بعد بھی ان کی ناراضی اور نفرت کسی طور اسے چین نہیں لینے دیتی تھی۔ دل آج بھی غم سے بھر جاتا تھا۔ اپنے نقصان پر رو پڑتا تھا۔

''سنا ہے آپ دادی بننے والی ہیں۔'' انٹرویو کو اس مقام تک لے آئی جہاں سے اس نے نہیں دیکھا تھا۔ اینکر سوال کر رہی تھی۔ آرزو جہانگیر کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ وہ جواب دیتے ہوئے بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ اینکر ان کے بیٹے کا پوچھ رہی تھی۔ بیٹے کی چند ایک تصاویر بیک گراؤنڈ اسکرین پر دکھائی جا رہی تھیں۔ اور وہ بتا رہی تھیں کہ ان کا بیٹا اپنی لائف کو پرائیوٹ رکھنا پسند کرتا ہے۔ اور وہ خود بھی ایسا ہی چاہتی ہیں۔

کچھ پرانی پوسٹس اور آرٹیکلز بھی تھے۔ ایک ایسی پوسٹ بھی تھی جب انہوں نے اپنے سوشل میڈیا اکاؤنٹس پر بہت اچانک فارس وجدان کی تصویر شیئر کر کے اس کے ساتھ اپنے رشتے کو سب پر ظاہر کر دیا تھا۔ اس بات کو غالباً دو سال ہو چکے تھے۔ کتنے عرصے تک یہی خبریں ہر طرف گردش کرتی رہی تھیں اور وہ کچھ حیرت سے وہ کامنٹس پڑھتی جا رہی تھی جو اس تصویر کے نیچے دیئے گئے تھے۔ کچھ فینز کے تاثرات تھے۔ اور کچھ مخالفین کے حاسدانہ تبصرے اور تجزیئے۔

''یہ جانتی ہے اسے سوشل میڈیا میں کیسے ان رہنا ہے۔''

''اب یہ اچانک بیٹا کہاں سے آگیا؟''

''بیٹا تو قبول کرنا ہی تھا۔ آئی مین لوک ایٹ ہم، ہی از تھی سی ای او آف شیرازی انٹرپرائزز۔''

''ایک قاتل کو اپنے ساتھ جوڑ کر ریپوٹیشن خراب کر لے گی۔''

جنت کا دل رک گیا۔

''ڈڈ ہی رئیلی کلڈ ہز فادر اینڈ برادر؟''

اور وہ آخری کمنٹ۔ وہ آخری سوال۔ جنت کی سانسیں تھم گئیں۔ دل رک گیا۔ آس پاس سناٹے پھیل گئے۔ ساکت منجمد۔ پتھرائی ہوئی نگاہوں سے فارس کی تصویر کو دیکھا۔

''ویسے ان کی یہ بات تو ٹھیک ہے، تم مجھے نہیں جانتیں۔''

ایک ہی لمحے میں کئی منظر ابھرے، اور اسی ایک ہی لمحے میں اسے کئی باتیں یاد آ گئیں۔ مشتعل اعصاب کے ساتھ لیپ ٹاپ بند کر کے پرے دھکیل دیا۔ لوگ بھی اتنی خطرناک باتیں کرتے اللہ سے نہیں ڈرتے۔ اس نے اپنی سوچ کو بھٹکنے نہیں دیا۔ ذہن کو الجھنے نہیں دیا۔ خود پر قابو پاتے ہوئے اٹھ کر کھڑکیاں کھول دیں۔ کتنی ہی دیر تک آنکھیں موندے گہری سانسیں لیتی رہی۔

جھوٹ، غلط بیانی، حسد میں کیے گئے تبصرے، سوال، اس نے سوچا۔ بار بار سوچا۔ اور پھر اپنے ذہن سے ان خیالات کو نکال دیا۔

ریان شیرازی حماد شیرازی کا بیٹا تھا۔ اور حماد شیرازی فارس وجدان کا سگا بھائی نہیں تھا۔ کیا رشتے کے اختلاف اس دراڑ کا سبب بنا ہے۔ یا پھر اس نفرت کے پیچھے کوئی اور وجہ ہے؟

وہ گہری سوچ میں ڈوبی اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

سیاہ رنگ کی لانگ اسکرٹ پر سیاہ چمکتی ہوئی شرٹ زیب تن کیے۔ سرخ رنگ کی لپ اسٹک، اسی رنگ کا بیگ، پنسل ہیلز اور نفیس جیولری۔ لیئرز میں کٹے، رنگے ہوئے بال جن میں مخروطی انگلیوں کو حرکت دیتی وہ گاڑی سے نکل کر سیدھا عمارت میں داخل ہو گئی تھی۔ پانچویں منزل پر اس کا لگژری اپارٹمنٹ تھا۔ لفٹ کام نہیں کر رہی تھی تو اس نے سیڑھیوں کا رخ کر لیا تھا۔ وہ پورے ایک ماہ بعد پاکستان واپس آئی تھی۔ اپنی اس واپسی پر اور ملنے والی کامیابی پر اس کا چہرہ روشن اور پرسکون نظر آ رہا تھا۔ آہستہ سے قدم اٹھاتے ہوئے وہ موبائل اسکرین پر اسکرولنگ کرتی جا رہی تھی۔

بہت سے میسجز تھے، تصویریں تھیں، کچھ چٹ پٹی سی خبریں۔ کچھ انکشاف اور کارنامے۔ لیکن اسے سب سے زیادہ خوشی موصول ہوتے صرف ایک پیغام پر ہوئی تھی۔ وہ ایک پیغام جیسے اس کی ریاضت کا ثمر تھا۔ ایک مبہم سی پراسرار مسکراہٹ اس کے لبوں کا احاطہ کر گئی۔ دل کی اتھاہ گہرائیوں میں سکون اتر گیا۔

''یہ سب کر کے تمہیں کیا مل جائے گا؟'' میسج موصول ہوا تو وہ ریلنگ پر ہاتھ جمائے رک گئی۔ کافی دیر تک رکی رہی۔ اس نے

ٹائپنگ شروع کی۔

''کچھ ایسا جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔'' لکھ کر پھر سے قدم اٹھانا شروع کیے۔ مطلوبہ فلور پر مطلوبہ دروازہ کھولتے ہوئے وہ اندر داخل ہوئی۔

اپنے نازک قدموں کو ہیل کی گرفت سے آزاد کرنے کے بعد سلیپرز پہنے۔ پھر ہاتھ بڑھا کر لائٹس آن کرنا چاہیں تو ادراک ہوا سوئچ بورڈ کام نہیں کر رہا تھا۔ نگاہیں بھٹکتی ہوئی لاؤنج اور پھر اوپن کچن کی طرف چلی گئیں۔ اگلے ہی پل وہ اپنی جگہ تھم گئی۔ حیران و ششدر۔ ساکت۔ بدحواس۔

مدھم سی زرکار روشنی میں اس کے اپارٹمنٹ کا منظر کسی حد تک نمایاں ہو رہا تھا۔

گلدان، پینٹنگز، گلاس، ٹیبلز، کراکری غرض کے ہر ایک شے توڑ پھوڑ کا شکار تھی۔ صوفے کے کشن بکھرے ہوئے، ٹی وی اسکرین فرش پر گری تھی۔ کچن کا تو اس سے بھی برا حال تھا۔ منہ پر ہاتھ رکھے وہ کچھ متوحش سی قدم اٹھاتی بیڈ روم کی طرف بھاگی۔ ہاتھ بڑھا کر لائٹس آن کر دیں۔ بیڈ روم کی حالت بھی ابتر تھی۔ اس کی قیمتی نفیس جیولری، سونے کے زیورات ہر جگہ بکھرے تھے۔

وہ جھٹکے سے پلٹی اور اپنی جگہ ساکت ہوئی۔ بیرونی دروازہ آہستہ سے بند ہوا تھا۔ اس کے اپارٹمنٹ کی تمام بتیاں روشن ہو گئیں۔ دو سوٹڈ بوٹڈ مردوں کے درمیان کھڑے شخص پر نظر پڑتے ہی وہ منجمد ہو گئی۔ وقت اتنا نہیں گزرا تھا کہ وہ اسے پہچان نہ پاتی۔ وہ گندمی چہرہ۔ تاریک آنکھیں۔ اور اسرار لیے تاثرات اس کے لیے ہرگز نئے نہیں تھے۔

''ت......تم......'' صدمے سے لب ہلے۔

سیاہ پینٹ کوٹ میں ملبوس وہ اسی تمکنت سے سر اٹھائے کھڑا تھا۔ بھورے بال جیل کی مدد سے پیچھے کو جمے ہوئے تھے، داہنے ہاتھ میں وہی مخصوص زنجیر جسے وہ اکثر انگلیوں میں لپیٹے رکھتا تھا۔ آنکھیں کسی بھی تاثر سے عاری۔ اور چہرہ مکمل سپاٹ تھا۔

''مجھے خوشی ہے کہ میں آپ کو یاد ہوں۔'' اس کا انداز ویسا ہی روبوٹک سا۔ لہجہ آج بھی سادہ سا تھا۔ نہ غصہ، نہ سختی، نہ نرمی۔ نہ ہی کوئی اور اثر جھلکتا تھا۔

وہ دم سادھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''گھبرائیے نہیں۔ میں صرف آپ سے بات کرنے آیا ہوں۔''

وہ ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ آہستہ سے قدم اٹھاتا آگے بڑھا۔ کانچ کے ٹکڑے اور بہت سی توڑ پھوڑ کا شکار چیزیں اس کے بھاری قدموں تلے چرمرا گئی تھیں۔

''بات۔'' وہ آنکھوں میں صدمے کی سرخی لیے شدید غصے کے عالم میں پھٹ پڑی۔ ''اسے بات کرنا کہتے ہیں؟ ہاؤ ڈیئر یو۔''

''پلیز وہیں رکیے۔'' کہہ کر اپنا ہاتھ اٹھایا۔''توڑ پھوڑ گھر تک ہے۔تو پلیز اسے گھر تک محدود رہنے دیجیے۔'' واضح دھمکی تھی۔ وہ ایک دم سے مشتعل اعصاب کے ساتھ رک گئی تھی۔

''تمہاری یہ ہمت کیسے ہوئی۔میری مرضی کے بغیر میرے گھر میں داخل ہو کر یہ سب کرنے کی۔''

اس نے جیب سے سگریٹ اور لائٹر نکال کر جلایا۔کش لے کر دھواں اڑایا۔پھر اس دھویں کی زد میں نظر آتے عدینہ زبیر کے لال بھبھوکا چہرے کو دیکھا۔

''اتنا غصہ کیوں آرہا ہے؟ حالانکہ ایسی ہی توڑ پھوڑ آپ میرے صاحب کی زندگی میں کتنی بار کر چکی ہیں۔'' رک کر ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔''میں نے تو بس آپ کو آپ کے طریقے سے جواب دیا ہے میڈم!''

عدینہ کے وجود میں ایک دم سے سناٹا پھیلا تھا۔اسی سناٹے میں ایک چنگاری سی اٹھی تھی۔وجود سلگ اٹھا تھا۔

''اب آپ سمجھ تو گئی ہوں گی میں یہاں کیوں آیا ہوں۔'' کہہ کر ایک سوالیہ نگاہ اس پر ڈالی۔عدینہ کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔اپنی کسی بھی حرکت پر ملنے والا فارس وجدان کا یہ پہلا ری ایکشن تھا۔پہلا ردعمل۔غیر ممکنہ جواب۔جیسا اس نے سوچا تھا ویسا نہیں ہوا تھا۔اور جیسا وہ چاہتی تھی ویسا اب ہو نہیں سکتا تھا۔

''آپ ایک سمجھ دار اور مصلحت پسند خاتون ہیں۔امید ہے آئندہ آپ میرے صاحب کی پرائیوٹ لائف میں مداخلت نہیں کریں گی۔''

''تمہیں لگتا ہے میں ان اوچھے ہتھکنڈوں سے ڈر جاؤں گی؟'' آگ اگلتا ہوا لہجہ۔قہر برساتی آنکھیں تھیں۔''تمہارے باس کو ابھی بھی لگتا ہے اس طرح مجھے ڈرا دھمکا کر دبا لے گا؟ کیا نہیں جانتا اس سوسائٹی میں میری ایک پہچان ہے۔میرے تعلقات بہت اونچے لوگوں سے ہیں۔''

''خیر یہ تو میں بھی اچھی طرح سے جانتا ہوں آپ کے کتنے اونچے لوگوں کے ساتھ ''تعلقات'' ہیں۔اور یہ بھی کہ آپ اس سوسائٹی کی کتنی عزت دار اور کامیاب ممبر ہیں۔لیکن میں ان سب کے لیے نہیں آیا۔مجھے اپنی بات دہرانے کی عادت نہیں ہے لیکن آپ کو ایک بار پھر بتاتا چلوں کہ میں یہاں اپنے صاحب کی بیوی کے لیے آیا ہوں۔ان سے دور رہیے۔یہ میری آپ کے لیے آخری وارننگ ہے۔''

''اور اگر نہ ہٹی تو......؟'' لہجہ مستحکم۔انداز چیلنجنگ۔

وہ مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔اسے جیسے کسی بات اور حرکت سے،خوف اور دھمکی سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔وہ ہٹ دھرمی کی انتہا پر تھی۔

''ایسا کر کے آپ کیا حاصل کر لیں گی؟۔فارس؟ کیا آپ کو ابھی بھی لگتا ہے آپ دونوں کا پیچ اپ ہو سکتا ہے؟''

''تمہیں لگتا ہے میں اب پیچ اپ چاہتی ہوں؟'' آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔''مجھے میرا حق چاہیے۔''

''آپ آل ریڈی لے چکی ہیں۔''

''اس طرح کچھ لاکھ میرے منہ پر مار دینے کا مطلب ہے مجھے میرا حق مل چکا؟'' وہ غرائی۔

''قانوناً آپ کا حق نہیں بنتا تھا اس کے باوجود فارس صاحب نے آپ کو رقم ادا کر دی تھی۔'' اس نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

''یہ کام میں نے کیا تھا۔میں پیسوں کا ایک بیگ آپ کے حوالے کر کے گیا تھا۔اور وہ چند لاکھ نہیں تھے جیسا آپ کہہ رہی ہیں۔اور وہ ''حق'' بھی نہیں تھا جیسا آپ سوچ رہی ہیں۔''

عدینہ زبیر کی مٹھیاں سختی سے بھنچ گئی تھیں۔آنکھوں میں سرخی۔اور وحشت مزید نمایاں ہو رہی تھی۔

''اس نے۔اپنے انتقام کی خاطر میری زندگی برباد کر دی۔اور تم چاہتے ہو میں خاموش رہوں؟ اس طرح توڑ پھوڑ کر کے مجھے دھمکانے آئے ہو۔''

''دھمکانے نہیں آیا۔صرف بتانے آیا ہوں'' سنجیدگی سے کہہ کر جانے کے لیے مڑ گیا۔

''میں ابھی تک چپ ہوں تو وہ سمجھ رہا ہے بات ختم ہو گئی۔جب بولنے پر آئی تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا وہ۔'' وہ غصے سے چلا اٹھی۔

''عدینہ میڈم!'' بھاری آواز اب کے قدرے بلند ہوئی تھی۔''کچھ بھی کرنے سے پہلے consequences کا خیال رکھیے گا۔میرے صاحب آج تک آپ کی ہر حرکت پر خاموش رہے ہیں لیکن آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔یہ تو محض ایک چھوٹی سی وارننگ ہے۔''

''ہاں چھوٹی سی وارننگ۔'' وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔''اپنے سگے باپ اور بھائی کو مار ڈالنے والے کی چھوٹی سی وارننگ ایسی ہی ہو سکتی ہے۔''

نوارد نے مڑ کر اسے دیکھا۔''حیرت ہے۔آپ پھر بھی ان سے خوف زدہ نہیں ہیں۔'' مسکراہٹ داہنے گال کی جانب اٹھ گئی۔پراسراریت مزید بڑھ گئی۔

عدینہ لب بھینچ کر کھڑی رہی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ فلیٹ سے نکل گیا۔دروازہ بند ہوا تو ٹوٹی ہوئی ایک ایک چیز سے ہوتی ہوئی اس کی نگاہ دیوار گیر آئینے پر جا ٹھہری۔

وہ پہلے صدمے میں تھی۔اب صدمہ اشتعال میں بدلنے لگا تھا۔تباہ کاریوں کا شکار اس کا اپارٹمنٹ اس کی اندرونی توڑ پھوڑ کا غماز ہونے لگا۔وہ پاگل ہونے لگی۔

’’میں تمہیں برباد کردوں گی فارس! جینے کے قابل نہیں چھوڑوں گی میں تمہیں۔‘‘ایک دم سے چیختے ہوئے اس نے اسٹینڈ زمین پردے مارا تھا۔

سر تھامے وہ نیچے بیٹھ گئی۔چہرہ غم وغصے سے سرخ ہونے لگا تھا۔مٹھیاں سختی سے بھنچ گئی تھیں۔اس نے اپنے ہاتھ میں آنے والی شے اٹھا کر دیوار پردے ماری تھی۔ٹوٹے ہوئے گلدان کے مزید ٹکڑے ہوئے تھے۔

’’تمہیں اس کی بھاری قیمت چکانی پڑے گی۔ بہت بھاری۔‘‘اندر باہر ایک آگ سی جل رہی تھی۔

آئینے کے ٹکڑوں میں اس کا خوب صورت چہرہ کئی حصوں میں بٹ چکا تھا۔اور ہر حصے میں اس کی شکل نامکمل اور غیر واضح نظر آ رہی تھی۔

☆☆☆

نیند گہری تھی۔مگر سکون بھری نہ تھی۔کچھ دیر بعد اس کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ایسے جیسے کسی نے جھنجھوڑ کر جگا دیا ہو۔یا بلندی سے گرادیا ہو۔کئی بار اس نے کروٹ بدلی۔تکیہ کبھی سر کے نیچے رکھا۔کبھی گرادیا۔کبھی کمفرٹر چہرے تک لیا۔اور کبھی پورا کا پورا ہٹا دیا۔اس الجھن اور بے چینی میں اسے مسز شیرازی کا لمس یاد رہا۔وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے جانے کیا کچھ پڑھ کر پھونکتی رہیں۔اب کے جب آنکھ لگی تو آس پاس کا کوئی ہوش نہیں رہا۔مکمل خاموشی اور سناٹے کی زد میں وہ کتنی دیر تک سویا رہا کچھ پتا نہ چلا۔

اس کے سکون میں خلل ایک دم سے اٹھنے والے شور نے ڈالا تھا۔بند دروازے کے اس پار ٹھک ٹھک کی آواز ابھری تھی۔کوئی چیز نیچے گری تھی۔کچھ ٹوٹا بھی تھا شاید۔

اس نے کہنی کے بل اوپر ہوکر کمرے میں نگاہ دوڑائی۔دروازہ بند تھا۔بیڈروم میں اس کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ٹیبل کلاک پر وقت دیکھا تو دس بج رہے تھے۔آوازیں تیز تھیں پہلے۔اب اچانک مدھم ہوگئی تھیں۔

اٹھ کر بیٹھتے ہوئے سلیپرز پہنے،موبائل اٹھا کر اسکرین پر کچھ دیکھا پھر اسے جیب میں ڈالتے ہوئے باہر آ گیا۔

راہداری کی دوسری طرف لاؤنج کے عین سامنے جو چہرہ نظر آیا وہ زید کا تھا۔ساتھ ایک جیسی شکل والے دو چشما ٹو بچے بھی تھے۔لاؤنج کے صوفوں کے گرد چیختے ہوئے بھاگ رہے تھے۔اس پر نظر پڑی تو رک گئے۔وہ ان کے سر پر آ گیا۔

’’پکنک پر آئے ہو؟‘‘جس طرح سے انہوں نے اودھم مچا رکھا تھا تو اسے غصہ چڑھ گیا۔

’’آئے ہیں۔‘‘زید سر اٹھائے فارس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا ہوگیا۔غصے سے گال پھولے ہوئے۔اس کے

چشما ٹو کزن بھی اس کے پیچھے تھے تو ہمت اور جرات دیکھنے لائق تھی۔کچھ پسٹل بھی تھے جو جیبوں میں اڑسے ہوئے تھے اور جن سے چھوٹی چھوٹی گیندیں فائر ہوتی تھی۔سب سے چھوٹے والے کے پاس جادوئی تلوار بھی تھی۔اور تیر کمان بھی۔(پلاسٹک کے)

’’ہوازہی؟‘‘اتنے بڑے گھر میں انہیں نیا چہرہ نظر آیا تو پوچھے بنا نہ رہ سکے۔

’’نو ون۔‘‘زید نے ان سے کہا۔ایک تو وہ ان کے شور سے بیدار ہوا تھا دوسرا زید کا جواب اسے اندر تک سلگا گیا۔

نو ون؟ آگ کے شعلوں میں لپٹا فارس گھٹنوں پر ہاتھ رکھے جھکا۔تاکہ آمنے سامنے برابری پر بات ہوسکے۔بات کیا ہونی تھی،زید کے اس طرح سینہ تان کے گھورنے پر ضبط کرکے ہاتھ اٹھائے اور اس کے گال پکڑ کر کھینچ ڈالے۔

وہ ایک دم سے چیخ اٹھا۔’’آہ! جنہ جانی! ہیلپ۔‘‘

جنت جو اپنے چھوٹے چھوٹے مہمانوں کے کھانے کا انتظام سنبھالے ہوئے تھی اوپن کچن سے یہ منظر دیکھتے ہی ہوش اڑے۔فوراً آ گئی۔

’’فارس!‘‘زید کے گال چھڑوائے،فارس کو پیچھے ہٹایا۔

’’کیا کر رہے ہو تم؟‘‘

’’پیار کر رہا ہوں۔‘‘دانت پر دانت جمائے۔آواز نیند سے متاثر لگ رہی تھی۔بھاری۔مدھم۔گہری۔

’’ایسے کرتے ہیں پیار؟ گال لال کر دیے بے چارے کے۔‘‘زید کو خود سے لگاتے ہوئے فارس کو گھورا۔جینز پر سفید ٹی شرٹ پہنے وہ بھنویں سکیڑے کھڑا تھا۔پیشانی پر بال بے ترتیب ہو رہے تھے۔آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔یقیناً وہ بچوں کی آواز اور شور سے ہی بیدار ہوا تھا۔ورنہ اس نے تو سوچا تھا وہ دوپہر سے پہلے اسے نہیں جگائے گی کہ اتنی مشکل سے اور اس قدر سکون سے سویا ہوا تھا جیسے کافی عرصے بعد نیند آئی ہو۔پتا نہیں بچے مسز شیرازی کے بیڈروم تک کیسے پہنچ گئے تھے۔الجھ کر راہداری میں نظر دوڑائی۔

چونکہ کارپٹ نہیں بچھا ہوا تھا تو انہیں اپنی گاڑیوں کے لیے ایک لمبی سڑک مل گئی تھی۔اس نے بچوں کو باہر بھیج دیا۔

’’یہ یہاں کیا کر رہے ہیں؟‘‘وہ کچھ برہمی سے پوچھ رہا تھا۔

’’مسز فاروق اپنی نند کے ساتھ ہاسپٹل گئی ہوئی ہیں۔ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔تو اس لیے بچوں کو یہاں چھوڑ دیا۔‘‘

’’کیا گھر میں کوئی آیا نہیں تھی جو ان کی دیکھ بھال کرتی؟‘‘وہ آس پاس ہر طرف کھلونوں کا بکھیڑا دیکھ کر بہت اریٹیٹ لگ رہا تھا۔نہ اس شور کی عادت تھی۔اور نہ موڈ ایسا کہ کوئی بھی بدلاؤ قبول کر پاتا۔اس کے ماتھے پر شکن۔اور اعصاب تناؤ کا شکار لگ رہے تھے۔

جنت نے گہری سانس لے کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔’’تم آرام کرو۔میں خیال رکھوں گی اب کوئی آواز نہ آئے۔‘‘

"کوئی ضرورت نہیں۔" بگڑے تیوروں کے ساتھ کہہ کر باہر آ گیا۔ دس بجے کا وقت تھا مگر باہر بے دھوپ سے موسم میں غروب آفتاب کا گمان ہو رہا تھا۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اب ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی ہونے لگی تھی۔

اس نے موبائل نکال کر کچھ دیکھا پھر سیڑھیوں پر بیٹھتے ہوئے پلر کے ساتھ سر ٹکا لیا۔

وسیع و عریض لان میں اب فٹ بال کھیلا جا رہا تھا۔ اور گیندیں بھی فائر ہو رہی تھیں۔ زویا اقصیٰ سے نیل پالش لگوا رہی تھی۔ کھلی فضا میں گہری سانس لیتے اس نے آنکھیں موند لیں۔ چند لمحوں کے بعد کھولیں تو زویا بالکل اس کے پاس کھڑی تھی۔ اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں کچھ حیرت سمو کر اسے بغور دیکھتی ہوئی۔ ننھے ننھے سرخ ناخن۔ آنکھوں پر ہلکا سا گلابی میک اپ۔ لائنر بھی لگا تھا۔ ایک آنکھ پر کچھ موٹا۔ دوسری پر کچھ باریک۔ لپ اسٹک بھی تھی جو اس کے باریک سے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ گلابی ڈریس تھا تو میچنگ آئی شیڈو۔ ایک آنکھ زیادہ پنک۔ ایک آنکھ زیادہ جامنی۔ اقصیٰ کے کارنامے۔

اپنی بہن کو اس کے پاس کھڑا دیکھ کر زید فوراً الرٹ ہو کر بھاگا چلا آیا۔

"زویا سویٹی!" اسے بازو سے پکڑ کر پیچھے ہٹایا۔ "ڈونٹ ٹاک ٹو ہم۔"

ہاں! وہ تو جیسے اس کی بہن کو کھا ہی جاتا۔ تپ کر رہ گیا۔

زویا کچھ دیر تک اپنے بھائی اور کزنز کے ساتھ فٹ بال کھیلتی رہی اور جب وہ چپس کھانے بیٹھے تو ایک بار پھر اس کے پاس آ گئی۔

"جاؤ یہاں سے۔" اس نے ہاتھ ہلا کر زویا کو جانے کو کہا۔ مگر وہ بھی زید کی بہن تھی۔ کہیں نہیں گئی۔

فارس کو اس لمحے نہ موسم اچھا لگ رہا تھا، نہ بارش، نہ ماحول، نہ بچے اور نہ شور۔

کافی کا مگ ہاتھ میں لیے جنت باہر آئی۔ زویا کو اس کے پاس کھڑا دیکھا تو گہری سانس لے کر مگ اسے تھما دیا اور خود اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔

"کب سے کھڑی ہے وہ۔ ذرا سا پیار کر لیتے تو کیا ہو جاتا؟" اس نے خفگی سے کہا۔ فارس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"پتا نہیں اپنے بچے کے وقت کیا کرو گے۔" بڑبڑا کر زویا کی طرف اپنے بازو پھیلائے۔ "یہاں آؤ میرا بے بی!" وہ خوشی خوشی اس کے سینے سے آ لگی، برابر میں بیٹھ کر اپنے ناخن دکھائے، میک اپ دکھایا۔ ابھی تو وہ مہندی بھی لگوائے گی۔ ننھی ننھی ہتھیلیاں پھیلا کر کہا۔ اس سے باتیں کرتے جنت نے گدگدایا تو کھلکھلاتے ہوئے بھاگ گئی۔

گہری سانس لے کر فارس کی طرف مڑی تو وہ اسی پوزیشن میں گھونٹ گھونٹ کافی پیتا کسی گہری سوچ میں گم سرسبز گھاس کو دیکھ رہا تھا۔ شرٹ کی ہوڈی اب سر پر تھی۔

"آنٹی تمہارا پوچھ رہی ہیں۔"

وہ چپ رہا۔

"اسٹوڈیو میں ہیں۔" مزید بتایا۔

خاموشی۔ جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ ایک بار پھر جنت کا دل خوف کے شکنجے میں آیا تھا۔ فکر میں دھڑکا تھا۔ بیٹھے بیٹھے بہت اچانک جانے اسے کیا ہو جاتا تھا۔ ایک پہر اگر وہ ٹھیک ہوتا تھا تو دوسرے پہر اس کا مزاج بالکل سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ جتنا وقت وہ اس کے ساتھ گزار چکی تھی، اس حساب سے اتنا تو جان گئی تھی کہ وہ پہلے ایسا نہیں تھا۔ اس کے مزاج مستقل۔ اس کے اعصاب متحمل رہتے تھے۔ لیکن اب تو جیسے ایک چھوٹی سی بات بھی اس کا اچھا خاصا پارہ چڑھا دیتی تھی۔

"یہاں کیا ہوا؟" داہنے ہاتھ کی انگلیوں پر نیل کا نشان تھا۔ اس نے چھو کر دیکھنا چاہا تو فارس نے ہاتھ جھٹک دیا اور پھر اٹھ کر اندر چلا گیا۔

جنت کچھ پریشانی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ شام تک سب ٹھیک تھا۔ جہاں تک اس کا خیال تھا۔ لونگ ڈرائیو سے واپسی کے بعد وہ کافی حد تک نارمل تھا۔ لیکن اب وہ ایک بار پھر اسے عجیب برتاؤ کرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ جنت کی پریشانی میں ایک دم سے اضافہ ہوا تھا۔

☆☆☆

بچے چار بجے تک چلے گئے تھے۔ موسم کچھ ایسا تھا کہ بارش شروع ہوئی تو رات دیر تک ہوتی رہی۔ کچھ وقت وہ مسز شیرازی کے پاس بیٹھا رہا پھر اپنے آفس میں بند ہو گیا۔ عدیل کے ساتھ فائنانس مینیجر بھی آئے ہوئے تھے۔ ملازمہ کے ہاتھ اس کے آفس میں کافی بھجوانے کے بعد وہ خود کمرے میں کھڑکیوں کے سامنے کھڑے ہو کر شیشے پر پھسلتی بارش کو دیکھنے لگی۔ آج صبح اس کی روبی سے بات ہوئی تھی۔ اور کچھ دیر پہلے دوسری بار بھی ہوئی تھی۔

روبی جاننا چاہتی تھی وہ ریان کو کب لینے آ رہی تھی۔ گھر میں طارق صاحب کی دوسری بیٹی کی شادی کے انتظامات ہو رہے تھے۔ اور ریان کی طبیعت ابھی بھی ٹھیک نہیں تھی۔ وہ ڈاکٹر کو دکھانے بھی نہیں لے جا سکی تھی۔ رشیداں اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔ اور اس پر بھی کام کا بوجھ بڑھا ہوا تھا۔ وہ سن رہی تھی تو دل وحشتوں میں گھر گیا تھا۔ بے چینی مزید بڑھ گئی تھی۔ مسئلہ بات سے حل ہونے والا نہیں تھا۔ وہ فارس سے بات کر کے دیکھ چکی تھی۔ دوبارہ بات کر کے مزید بدمزگی وہ نہیں چاہتی تھی۔ خصوصاً اس کے ردعمل کے بعد وہ پہلے سے زیادہ محتاط ہو گئی تھی۔ وہ اس کی مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اب جیسے سب ہی آپشن ختم ہو گئے تھے۔ کسی معاملے کی گہرائی میں اترنے کا فی الحال اس کے پاس وقت نہ تھا۔ اسے بس جلد از جلد ریان کے لیے کچھ کرنا تھا۔ اس

کی چچی ہونے کے ناتے وہ اس سے ملنے جاسکتی تھی۔ وہ بیمار تھا تو اسے ڈاکٹر کو بھی دکھا سکتی تھی۔ فارس اگر اسے اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا تھا تب بھی وہ ایک یتیم بچے کے لیے اوصاف منزل کے مکینوں کو خوف خدا اور شرم تو دلا ہی سکتی تھی۔ خبر گیری کرنے والا ہوتا تو شاید وہ بچے کے ساتھ اچھا سلوک کرتے مگر اب تو جیسے بے حسی کی انتہا ہو گئی تھی۔ فارس کی طرف سے بھی۔ اور اوصاف منزل کے مکینوں کی طرف سے بھی۔

ایک ملاقات سے کیا ہوگا؟ اس نے سوچا۔ اپنے ضمیر سے پوچھا۔ حق کو دیکھا۔ سچ کو پرکھا۔ اس وقت کیا اہم ہے؟ وہ خود سے الجھتے ہوئے بارش کی سنگت میں اس مسئلے کا حل ڈھونڈتی رہی۔ اور درمیانہ حل کوئی نہ تھا۔ آر یا پار۔ ریان سے ملاقات۔

ساری رات اس نے اسی شش و پنج میں گزار دی۔ صبح جب فارس آفس کے لیے جا چکا تو اس نے خاصی سوچ و بچار کے بعد آئمہ کو کال کر کے گھر بلایا۔ وہ کچھ مصروف تھی مگر شام تک وقت نکال کر اس سے ملنے آگئی تھی۔ گھر میں رونق سی لگ گئی۔ باتوں باتوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ ڈائننگ ہال میں کھانا کھاتے ہوئے دنیا جہاں کی باتیں تھیں جو آئمہ گوش گزار کرتی رہی۔ زیادہ تر اس کے شکوے فارس سے تھے جو سنی ان سنی کیے کھانا کھاتا رہا۔ مسز شیرازی نے بھرپور ساتھ دیا۔ جنت بھی مسکراتی رہی۔

چائے پینے کے بعد جنت مسز شیرازی کے ساتھ ان کے بیڈ روم میں آگئی۔ انہیں میڈیسن دی۔ بیڈ پر تکیے درست کیے اور کمفرٹر اچھے سے ڈالتے ہوئے ملازمہ کو کچھ ضروری ہدایت دے کر انہیں شب بخیر کہتی ڈرائنگ روم میں آگئی جہاں آئمہ پہلے سے ہی کتاب ہاتھ میں لیے اس کے انتظار میں ٹہل رہی تھی۔

''سوری! اس طرح تمہیں ڈسٹرب کرنے کے لیے۔'' اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کچھ نروس ہو کر کہا۔ آئمہ نے گہری سانس لے کر آنکھیں گھمائیں۔ ''فار گاڈ سیک جنت! کتنی بار سوری کرو گی تم؟'' کتاب شیلف میں رکھتی اس کے پاس آ بیٹھی۔ اب وہ پوری طرح سے جنت کی طرف متوجہ تھی۔

خشک لبوں کو تر کرتے ہوئے جنت ہمت مجتمع کر لی۔ ہر طرح کے خوف اور واہموں کو سلا دیا۔ بات ایک معصوم بچے کی تھی۔ اس کے لیے اب زندگی اور موت کا معاملہ ہو گیا تھا۔

''مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا تو سوچا تم سے بات کرنی چاہیے۔'' وہ صوفے کی بیک سائڈ پر بازو رکھے آہستگی سے بولی۔

''کہو میں سن رہی ہوں۔''

''پہلے وعدہ کرو یہ بات صرف ہم دونوں کے درمیان رہے گی۔''

''وعدہ رہا۔''

''مجھے تمہاری ہیلپ چاہیے۔'' ایک سرسری سی نگاہ ڈرائنگ روم کے بند دروازے پر ڈالتے ہوئے اس نے مدھم آواز میں

کہا۔ عقب میں کھڑکیاں بند تھیں۔ پردے ڈوریوں میں بندھے ہوئے تھے۔ رات تاریک۔ اور چاند مکمل روشن تھا۔

''کس سلسلے میں ہیلپ چاہیے؟؟'' آئمہ نے گود میں کشن رکھ لیا تھا۔

''میں تمہارے ساتھ کہیں جانا چاہتی ہوں۔''

''کہاں؟''

''کسی سے ملنے جانا ہے۔ اور میں یہ بات فارس کو نہیں بتا سکتی۔''

''مطلب فارس سے چھپ کر کسی سے ملنا ہے۔'' آئمہ کی آنکھیں پھیلیں۔ آواز یکایک سرگوشی میں ڈھل گئی۔ ''واٹ آر یو ٹرائنگ ٹو ڈو؟''

''آئم جسٹ ٹرائنگ ٹو ہیلپ سم ون۔''

آئمہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ جنت کی آنکھوں میں ایک خوف سا ٹھہرا تھا۔ چہرے سے پریشانی نظر آ رہی تھی۔

''میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی۔''

جنت چند لمحوں تک سر جھکائے چپ رہی۔

''میں تمہیں ہر بات نہیں بتا سکتی لیکن......'' کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ ''سمجھو یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ مجھے ایک بچے سے ملنے جانا ہے۔''

''تو یہ بات تم فارس بھائی سے کیوں چھپا رہی ہو؟ وہ تمہیں منع تو نہیں کریں گے۔''

''وہ منع کر چکا ہے۔'' اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ لہجہ درد کی عکاسی کر رہا تھا۔ ''فارس نہیں چاہتا میں وہاں جاؤں۔ لیکن اس بچے کے لیے میرا وہاں جانا ضروری ہے۔''

''اس لیے تم چھپ کر وہاں جانا چاہتی ہو؟''

جنت نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔

''اگر فارس بھائی کو پتا چل گیا تو؟'' اس نے خدشے کا اظہار کر دیا۔ جس طرح سے وہ وہ گھبرائی ہوئی تھی تو اس سے صاف ظاہر تھا فارس کے لیے یہ بات معمولی نہیں ہو گی۔

''اسی لیے مجھے تمہاری مدد چاہیے۔ میں نہیں چاہتی فارس کو کچھ بھی پتا چلے۔ تب تک نہیں جب تک میں اسے یہاں لے نہیں آتی۔''

''تمہیں لگتا ہے یہ بات فارس بھائی سے چھپی رہ سکتی ہے؟ پھر مجھے کہنے دو۔ یو رئیلی ڈونٹ نو ہم۔''

عسریسرا۔ حسنیٰ حسین

"میرا اس وقت اس بچے کے پاس جانا بہت ضروری ہے۔ باقی تمام معاملات سمجھو میرے لیے ثانوی ہو گئے ہیں۔" اس نے کہہ دیا۔ بھاری دل کے ساتھ۔ اور مضطرب ہو کر کہہ دیا۔

"فارس بھائی بھی؟"

وہ چپ رہی۔ سر جھکا رہا۔

"میں نہیں جانتی اصل معاملہ کیا ہے۔ لیکن میرا یقین کرو جنت مجھے یہ سب۔ یہ ٹھیک نہیں لگ رہا۔ اگر انہوں نے منع کیا ہے تو تمہیں۔"

"تم میری مدد کرو گی یا نہیں؟" اس نے سر اٹھا کر دو ٹوک لہجے میں جس طرح سے پوچھا، آئمہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی۔ تاثرات سنجیدہ ہو رہے تھے۔

"اگر تم مدد نہیں کرنا چاہتیں تو اٹس او کے۔ میں خود مینیج کر لوں گی۔" کہہ کر اٹھنا چاہا تو آئمہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بتاؤ! کیا کرنا ہے۔" اس نے گہری سانس لے کر جس طرح سے پوچھا جنت کی آنکھیں خوشی سے نم ہو گئیں۔ "تھینک یو سو مچ آئمہ! تھینک یو سو مچ۔" اس کے دونوں ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیے۔

"شکریہ بعد میں ادا کرنا پہلے یہ بتاؤ کرنا کیا ہے؟"

جنت نے گہری سانس لے کر اسے دیکھا پھر مدھم آواز میں اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کرنے لگی۔ خاموشی سے جنت کی بات سنتے آئمہ کے تاثرات کئی بار بدلے تھے، کئی بار اس نے کچھ حیرت اور پھر کچھ تشویش سے جنت کو دیکھا تھا۔ چند ایک آئیڈیاز اس کے بھی تھے۔ جانتی تھی فارس اسے اب اکیلے میں کہیں آنے جانے نہیں دیتا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے گھر بھی نہیں۔ فیملی گیدرنگ اور فنکشن اٹینڈ کرنا تو دور کی بات تھی۔ سو اب پہلا مشن ہی یہی تھا کہ وہ کسی طرح جنت کو اپنے گھر بلائے۔ یہ کام فارس کی مرضی اور اجازت کے بغیر قطعی ناممکن تھا اور اسے ممکن بنانے کے لیے جنت کمال نے پوری کہانی ترتیب دے ڈالی تھی۔

"ایک بار پھر سوچ لو۔" آئمہ کو پتا نہیں کس بات کی فکر تھی۔ بار بار کہہ رہی تھی۔

"بہت سوچا ہے۔ مزید سوچنے میں وقت ضائع کیا تو کچھ برا ہو سکتا ہے۔"

"اس نے کہا۔ آئمہ خاموش ہو گئی۔ تمام معاملات طے کر کے وہ چلی گئی۔ دو دن کا انتظار کر کے تیسرے دن اس نے صبح سویرے پلان کے مطابق فارس کو آئمہ کی کال کے بارے میں بتایا اور اس کی طبیعت خرابی کے بارے میں آگاہی دی۔ "گھر میں اکیلی ہے تو زیادہ پریشان ہو رہی ہے۔ بھائی اور بھابھی کو نہیں بتایا کہ وہ پریشان نہ ہو جائیں۔"

"ہوا کیا ہے اسے؟" فارس نے پوچھا تھا۔

"فوڈ پوائزننگ۔" جنت کا حلق خشک ہوا۔ وہ جھوٹ بول رہی تھی تو دھڑکن مزید تیز ہو چکی تھی۔ "رات ہاسپٹل گزار کر آئی ہے۔" اس نے مزید کہا۔

بات مسز شیرازی کے سامنے ہو رہی تھی تو وہ انکار نہ کر سکا۔

"ٹھیک ہے۔ چلی جاؤ۔ کب تک واپس آ ؤ گی؟"

اس نے اجازت دی تو جنت نے بے اختیار سکھ بھری سانس لی۔

"اگر ٹھیک ہوئی تو جلد آ جاؤں گی ورنہ ہو سکتا ہے اس کے پاس آج رات رک جاؤں؟ کیا خیال ہے؟"

وہ چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہا۔ اور اس کے اس طرح دیکھنے پر جنت کے اندر ہلچل سی ہوئی۔

"تم جانتے ہو۔ مجھے جھوٹ اور دھوکا پسند نہیں۔ جب کہہ دیا ہے اسے فائر کر دو۔ سو فائر کر دو۔ نو سیکنڈ چانس۔" فارس کے آفس روم سے ایک بار اس نے یہ لفظ سنے تھے۔ وہ نظریں چرا گئی۔

"ٹھیک ہے جیسے مناسب لگے۔" کوٹ پہنتے ہوئے اجازت دے دی۔

"میں ڈراپ کر دوں یا؟" رک کر پوچھا۔ اسے آج ضروری میٹنگ اٹینڈ کرنی تھی۔ شہر سے باہر بھی جانا تھا۔

"تمہیں آفس کے لیے دیر ہو جائے گی۔ مجھے تو ابھی تیاری بھی کرنی ہے۔" سنبھل کر کہا۔

"او کے! خیال رکھنا اپنا۔" وہ اپنا والٹ، چابیاں اور موبائل اٹھائے باہر چلا گیا۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد وہ ڈرائیور کے ساتھ ظہیر ہاؤس پہنچ گئی تھی۔

ڈرائیور تو اسے چھوڑ کر چلا گیا مگر گارڈ وہیں کھڑا رہ گیا۔ جنت کچھ پریشانی سے اندر آ گئی۔

"آخر تم نے ایسا کیا کیا کہ فارس بھائی کو تمہارے پیچھے جنات جیسے گارڈ لگانے پڑے۔ کیا میری غیر موجودگی میں تم اغوا ہوئی ہو؟" آئمہ نے مشکوک ہو کر پوچھا۔

"اللہ نہ کرے۔ یہ کیا بک رہی ہو؟"

جنت خفیف سی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"آخر اتنی سخت سکیورٹی کی وجہ کیا ہے؟" آئمہ بہت حیران ہوئی تھی۔ دل ہی دل میں عدینہ زبیر کو کوستے ہوئے جنت رخ بدل کر رہ گئی۔ نہ وہ ایک چھوٹی سی بات پر اتنی ٹینشن لیتی اور نہ فارس اس طرح روک ٹوک اور پابندی عائد کرتا۔

"اب کیا ہو گا؟" پریشان ہو کر پوچھا۔

"مجھے اندازہ تھا ایسا ہو سکتا ہے۔" کہہ کر اپنا بیگ کندھے سے لگایا۔ پھر رسٹ واچ پر ٹائم دیکھا۔ "ہم پچھلے دروازے سے

عسریسرا۔ حسنیٰ حسین

باہر نکلیں گے۔گاڑی تیار کھڑی ہے۔''

جنت کی اٹکی ہوئی سانسیں یک دم بحال ہوئیں۔

''لو یو آئمہ!''متشکرانہ نگاہوں سے اسے دیکھتے کہا۔آئمہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔کچھ ہی دیر بعد وہ آئمہ کے ہمراہ عقبی دروازے سے باہر نکل گئی۔گاڑی سامنے ہی کھڑی تھی۔آئمہ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تو دل ہی دل میں دعا کرتے ہوئے وہ بھی گاڑی میں سوار ہوگئی۔اس بات سے قطعی بے خبر کہ ریان کے لیے اٹھایا جانے والا یہ قدم اس کے راستے میں کتنی بڑی مشکل لانے والا تھا۔

☆☆☆

راولپنڈی شہر کی حدود میں داخل ہونے کے بعد مطلوبہ ایڈریس تک پہنچتے پہنچتے انہیں کوئی آدھا گھنٹہ لگ گیا تھا۔آئمہ قدرے فاصلے پر گاڑی روک دی تھی۔

راستہ تنگ تھا۔گلی کے اندر مطلوبہ گھر تک اسے اب خود جانا تھا۔روبی کو کال کرتے ہوئے وہ گاڑی سے اتر گئی۔

''میں آؤں تمہارے ساتھ؟''اس نے پوچھا۔

''نہیں یہیں رکو!!میں بس ریان کو لے کر ابھی آرہی ہوں۔''اس نے کہا تو آئمہ نے اسٹیرنگ وہیل چھوڑ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی آگے بڑھتی گئی۔بالکل سامنے ہی جس صحن سے جامن کا درخت جھانک رہا تھا وہی دو منزلہ مکان ہی اوصاف منزل تھا۔جس کی بیرونی دیواروں پر لائٹنگ کا اہتمام ہو رہا تھا۔

آس پاس لائٹس کا انتظام سنبھالتے لڑکے کھڑے تھے۔روبی فون نہیں اٹھا رہی تھی تو اس نے اپنے طور سے لڑکوں سے اوصاف منزل کی بابت پوچھ کر کنفرم بھی کر لیا کہ وہ صحیح جگہ پہنچ گئی ہے۔ادھ کھلے مین گیٹ کے سامنے رک کر گہری سانس لی پھر خود کو سنبھالتی اندر داخل ہوگئی۔

گاڑی کی کھڑکی سے آئمہ نے اسے اندر جاتا دیکھا پھر سیٹ کے ساتھ پشت ٹکا کر ایزی ہوگئی۔دونوں ہاتھ ہنوز اسٹیرنگ وہیل پر تھے۔انگشت شہادت متحرک تھی۔گلاسز بالوں پر اٹکا کر موبائل اٹھا لیا۔

جنت اسے پانچ منٹ کا کہہ کر گئی تھی مگر جب پورے پندرہ منٹ گزر جانے کے بعد بھی اس کی آمد کے کوئی آثار نظر نہ آئے تو اس نے جنت کو کال کی۔بیل جا رہی تھیں مگر دوسری جانب کوئی رسپانس نہیں آرہا تھا۔

جامن کے درخت پر چڑھا ایک لڑکا بے ہنگم انداز میں پھیلی ہوئی ان شاخوں کو کاٹ رہا تھا جو دروازے پر نیچے تک جھکی ہوئی تھیں۔۔

وہ کھڑکی سے باہر نگاہ دوڑاتی رہی۔کلائی موڑ کر وقت دیکھا۔ابھی تک آئی کیوں نہیں؟؟

اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھول کر باہر آتی،اس نے جنت کو بیرونی گیٹ سے باہر نکلتے اور عجلت میں قدم اٹھاتے گاڑی کی جانب آتے دیکھا۔بچہ اس کے ساتھ نہیں تھا۔

اسے کیا ہوا؟جنت کے تاثرات دیکھ کر وہ ایک دم سے سیدھی ہوئی۔

اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے دروازہ بند کر دیا۔

''تم ٹھیک ہو؟''آئمہ نے پریشان ہو کر پوچھا تھا۔آنکھوں میں وحشت لیے اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

''گاڑی اسٹارٹ کرو۔''سانسیں بھاری۔

''کیا ہوا؟ازایوری تھنگ آل رائٹ؟''وہ پریشان ہو کر پوچھ رہی تھی۔''اور تم......تم بچے کو نہیں لائیں؟''

''آئمہ پلیز چلو یہاں سے۔''ایک دم سے بھیگی آواز میں کہا تو اس نے اوصاف منزل کے بیرونی گیٹ پر ایک نظر ڈالتے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔کچھ ہی دیر میں وہ گاڑی مرکزی شاہراہ پر ڈال چکی تھی۔

جنت اپنا سر تھامے بیٹھی تھی۔آنکھوں میں صدمہ نظر آرہا تھا۔وحشت نظر آرہی تھی۔اذیت بھرا صدمہ تھا۔حیرت تھی اور بے یقینی کا تاثر تھا۔اسے آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔

''آپ مجھ سے میری جان کیوں نہیں مانگ لیتیں ممی؟''

متحرک گاڑی میں وہ بالکل ساکت،بالکل خاموش اور ویران سی بیٹھی تھی۔

''آپ نے کہا واپس آجاؤ میں آگیا۔آپ نے کہا شادی کر لو میں نے کر لی۔مگر یہ نہیں......خدا کے لیے یہ نہیں۔''

اس کا دل بھاری ہوا۔سینے پر بوجھ بڑھ گیا۔سانس لینے میں دشواری ہونے لگی۔

''بہت حساس تھا وہ۔جب بے رحم ہوا تو سب کے لیے ہوا۔بے حس ہوا تو پوری طرح سے ہوا۔اسے الزام مت دو جنت!! میں بھی نہیں دیتی۔''

بے اختیار ہونٹوں پر ہاتھ رکھا۔اپنا رخ شیشے کی طرف کر لیا۔

''تم ٹھیک ہو جنت؟''آئمہ نے پوچھا تھا۔اس کی طبیعت بالکل بھی ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔

''یہ میں نے کیا کر دیا۔''اس کے لب ہلے۔اس کا دل لرزا۔

''جنت۔کچھ تو کہو یار۔کیا ہوا ہے؟''آئمہ کی آواز کہیں دور رہ گئی۔آس پاس کے تمام منظر دھندلا گئے،لبوں پر کپکپاہٹ تھی،

آنکھوں میں تحیر تھا۔اس نے اپنی کلائی پر گرفت جمالی۔

''فارس کو اچھا نہیں لگے گا اس کی بیوی حماد کے بیٹے سے ملے۔تمہیں اپنے شوہر کے احساسات کا خیال ہونا چاہیے۔''

اس نے اذیت سے آنکھیں میچ لیں۔

''آئندہ نام نہیں لوگی تم اس کا میرے سامنے۔اور نہ ہی ملنے کی کوشش کرو گی۔''

دل شدت سے دھڑکا تھا۔وجود خوف کے آہنی شکنجے میں جکڑا گیا۔

آئمہ نے آدھے گھنٹے تک مسلسل ڈرائیو کرنے کے بعد پٹرول پمپ پر گاڑی روک دی تھی۔گردن موڑ کر اسے دیکھا تو وہ سیٹ کے ساتھ پشت ٹکائے، آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔چہرے پر درد بھرے تاثرات ٹھہرے تھے۔بائیں ہاتھ میں داہنا ہاتھ تھا۔اور گرفت بے انتہا مضبوط۔

''کیا ہوگیا ہے؟'' آئمہ کے لہجے میں تشویش نمایاں تھی۔اس نے جواب نہیں دیا۔وہ جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

''میم فارس صاحب آئے تھے۔''

وہ گھر پہنچے تو ملازمہ نے آئمہ کو اطلاع پہنچائی۔

''ف......فارس آیا تھا؟'' جنت کا دل کسی گہرے پاتال میں جا گرا۔آنکھوں میں وحشت بھر گئی۔وجود کانپ اٹھا۔

آئمہ نے صدمے سے جنت کو دیکھا۔''تم تو کہہ رہی تھیں انہیں شہر سے باہر جانا ہے؟''

''یہ کیا ہوگیا؟'' جنت کا دل سوکھے پتے کی طرح لرزنے لگا۔''اسے پتا چل گیا ہوگا۔آئمہ اسے پتا چل گیا ہوگا میں وہاں گئی تھی۔'' جنت کی رنگت سفید پڑ گئی۔آنکھوں میں ہراس پھیل گیا۔صرف نام لینے اور ذکر کرنے پر وہ اس کا ری ایکشن دیکھ چکی تھی۔

اب جب پتا چلے گا وہ وہاں سے ہو کر آئی ہے تو وہ کیا کرے گا؟

''ہے ریلیکس۔'' آئمہ نے فوراً اسے بازو سے پکڑ کر اسے صوفے پر بٹھایا۔اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے۔

''میں فارس بھائی سے کہہ دوں گی میں نے جھوٹ بولا تھا۔میں خود تمہیں اپنے ساتھ لے کر گئی تھی۔یہ میرا آئیڈیا تھا۔ہم باہر گھوم پھر کر واپس آ گئے۔ہم راولپنڈی گئے تھے، یہ بات ہم انہیں کبھی نہیں بتائیں گے۔''

وہ کہہ رہی تھی۔سمجھا رہی تھی۔تسلی اور دلاسے دے رہی تھی۔مگر اس کی تشفی نہیں ہو رہی تھی۔آنکھوں ہنوز پھیلی ہوئیں۔رنگ ہنوز اڑا ہوا تھا۔مٹھیاں بھینچ کر اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی تھی۔مگر ٹینشن کسی صورت کم نہیں ہوئی تھی

''اگر اتنا ہی کوئی رسکی کام تھا تو پھر تم گئی ہی کیوں؟''

''مجھے لگا'' اس کے لب ہلے۔بات ادھوری رہ گئی۔''میں کچھ اور سمجھ رہی تھی۔مجھے نہیں پتا تھا۔وہ بچہ۔'' وہ رک گئی۔سانسیں پھر سے پھول گئیں۔

اس کی حالت کے پیش نظر آئمہ ایک دم سے متفکر ہوئی۔

''کوئی بات مت کرو۔ریلیکس رہو،تمہیں کچھ ہوگیا تو فارس بھائی مجھے تو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

جنت کے آنسو آنکھوں میں ٹھہر گئے۔خوف سے آئمہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔''مجھ سے غلطی ہوگئی ہے، مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی ہے۔یہ معاملہ میرا نہیں تھا۔میں اس میں کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔اسی لیے آنٹی نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔انہوں نے مجھے دور رہنے کا کہا آئمہ۔انہوں نے مجھے منع کیا تھا۔'' لرزتے کانپتے سسک پڑی۔

''خود کو کمپوز کرو، اس طرح تو فارس بھائی کو پکا شک ہو جائے گا کہ ہم وہاں گئے تھے۔'' آئمہ نے سمجھایا۔''اب انہیں کال کرو اور بالکل نارمل ہو کر بات کرو۔''

اس نے گہری سانس لے کر اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کی پھر کپکپاتی انگلیوں سے فارس کا کال کی۔بلز جاتی رہیں مگر دوسری جانب سے کال ریسیو نہ ہوئی۔اس کا حلق خشک پڑ گیا۔سنبھل کر دوسری۔پھر تیسری کوشش کی۔

''وہ فون نہیں اٹھا رہا۔''

''بزی ہوں گے۔''

وہ بزی تھا یا نہیں۔مگر اس نے کال ریسیو نہیں کی نہ ہی اس کے کسی میسج کا ریپلائے دیا۔

وہ اب گھر جانا چاہتی تھی۔ڈرائیور کو کال کی مگر کوئی جواب نہ آیا۔گارڈ بھی گھر کی بیرونی گیٹ پر موجود نہ تھا۔اس کا پورا وجود اندیشوں میں گھر گیا۔وسوسوں میں دب گیا۔

''آئمہ مجھے تم گھر ڈراپ کر دو پلیز۔'' مزید وہاں بیٹھنا اس کے لیے دشوار ہو گیا۔آئمہ نے اس کا ٹھنڈا پڑتا ہاتھ اپنی گرفت میں لیتے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ گھر پہنچی تو اس وقت شام کے چھ بج رہے تھے۔آئمہ اس کے ساتھ اندر آنا چاہتی تھی۔مگر جنت نے اسے منع کر دیا۔''میں سب سنبھال لوں گی۔'' لہجہ مضبوط کر کے کہا اور قدم بڑھا دیئے۔

پورچ میں فارس کی گاڑی کھڑی تھی۔اسے ایک بار پھر اپنی سانسیں اٹکتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔آواز ایک بار پھر گونجی۔خوف نے پھر سے سر اٹھایا۔خدشات نے پھر سے گھیر لیا۔

مین گیٹ کے سامنے وہ کچھ دیر تک کھڑی رہی پھر ہمت مجتمع کرتی اندر داخل ہوئی۔ روشنیوں کا گھر مکمل خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔

''مسز شیرازی کہاں ہیں؟'' اپنے اندر کے اضطراب پر قابو پاتے ہوئے ملازمہ سے پوچھا۔

''ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی، اس لیے آرام کر رہی ہیں۔'' ملازمہ نے فوری جواب دیا۔

''اور......اور فارس......'' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔ اس سے قبل کہ ملازمہ کوئی جواب دیتی، اس کے عقب میں آفس روم کا دروازہ کھل گیا تھا۔

جنت کی دھڑکنیں تھم گئیں۔ سانس رک گیا۔ دیکھے بغیر ہی وہ جان گئی تھی اس کے پیچھے اس وقت کون موجود تھا۔ وہ نہ پلٹ سکی۔ نہ اپنی جگہ سے ایک انچ ہل سکی۔

ملازمہ ادب سے سرخم کرتی وہاں سے چلی گئی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے آہستہ سے رخ بدلا۔

تاثرات سے عاری سپاٹ چہرہ اور خون سے سرخ پڑتی آنکھیں لیے فارس وجدان اس کے سامنے کھڑا تھا۔

جنت کمال کو ایک دم سے اپنی ٹانگیں بے جان ہوتی محسوس ہوئیں، تاہم وہ متحمل رہی، مٹھیاں بھینچ کر اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ پر قابو پانے کی سعی کی۔ تاثرات سے واضح تھا وہ جان چکا ہے۔ اس نے ڈرائیور نہیں بھیجا۔ اس نے گارڈ کو بلوا لیا۔ کالز ریسیو نہیں کیں۔ میسیج کا جواب نہیں دیا۔ ہاں وہ جان چکا ہے۔ وہ سب جان چکا ہے۔

وہ لاعلم تھی۔ اس سے یہ غلطی، یہ بھول، لاعلمی میں ہوئی تھی، اس نے سوچا۔ اس نے سوچ کر خود کو خود ہی سنبھالا۔

پھر کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ کچھ کہنے کے لیے ہمت مجتمع کی۔ پلکیں جھپکا کر نمی کو روکا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، فارس نے ایک ہی جست میں اسے بازو سے جکڑ کر دیوار کے ساتھ لگا دیا تھا۔

جنت ایک دم سے بوکھلا گئی۔ آنکھوں میں ہراس پھیل گیا۔ رگ و پے میں سرد لہر دوڑ گئی۔

''واٹ ڈو یو ٹیک می فار؟'' اس کی آنکھوں کو اپنی آنکھوں کے فوکس میں لیتے غرایا۔

''آئم سوری۔ آئم رئیلی۔ سوری۔ مجھے نہیں پتا تھا۔''

''تمہیں نہیں پتا تھا؟'' اس کی آواز غم و غصے سے پھٹ گئی تھی۔

جنت کا دل خوف اور دہشت سے بھر گیا۔ ٹانگیں سن ہونے لگیں۔

''منع کیا تھا میں نے تمہیں۔'' بازوؤں پر آہنی گرفت مزید سخت ہوئی۔

''میں وہاں صرف۔ میں ریان کے لیے گئی تھی۔'' روتے ہوئے کہا۔ ''میں صرف اس کے لیے۔ آنٹی کے لیے......میں

میں نہیں جانتی تھی۔''

''میں نے تمہیں ان سب سے دور رہنے کو کہا تھا۔ میں نے تمہیں منع کیا تھا۔'' وہ چیخا۔

''فارس آئم۔ آئم رئیلی سوری۔''

راہداری کے دوسرے سرے پر مسز شیرازی وہیل چیئر پر براجمان دروازہ کھول کر باہر آئی تھیں۔ ملازمہ ان کے پیچھے، ان کے ساتھ تھی۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھ کر رہ گئیں۔

ان کی موجودگی سے قطعی بے خبر فارس ایک جھٹکے سے جنت کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ وہ روتے ہوئے اب کچھ کہہ رہی تھی۔ وضاحت دے رہی تھی اور معافی چاہ رہی تھی۔ پھر اس نے فارس کے پاس آنے کی کوشش کی تھی۔

''اسٹے آوے فرام می!'' اسے خود سے دور کرتے ہوئے مشتعل ہو کر دھاڑا۔

دکھ، صدمہ۔ خوف اور پریشانی لیے مسز شیرازی اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ جنت رو رہی تھی۔ فارس چیخ رہا تھا۔ معاملہ ریان کا تھا۔ ان کی ننھی جان کا تھا۔

''میں نے کہا تھا۔'' مضبوط، مستحکم مگر بے طرح سے ٹوٹا ہوا سا لہجہ۔ ''میں نے کہا اگر تم چاہتی ہو ہمارے درمیان سب ٹھیک رہے۔ تو تم اس میں نہیں پڑو گی۔ مگر تم......'' اس پر جنون کی سی کیفیت طاری تھی۔ اپنے حواسوں میں وہ بالکل نہیں لگ رہا تھا۔

''تمہیں میری فیلنگز کا خیال نہیں ہے، میں کس بات سے روک رہا ہوں، اس سے تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' وہ چیخ اٹھا۔ آواز دور تک گونجی تھی۔

مسز شیرازی کے لب ہلے۔ مگر آواز نہ نکلی۔ ہاتھ اٹھانا چاہا مگر ہمت نہ رہی۔ وہ اب سانس لینے کی کوشش کر رہی تھیں اور انہیں سانس نہیں آ رہا تھا۔ درد بازو میں اٹھا تھا۔ پھر سینے تک پہنچ گیا تھا۔ دل میں ایک برقی لہری دوڑی۔

''بیگم صاحبہ!'' ملازمہ ایک دم سے چیخی تھی۔ جنت کمال متوحش ہو کر پلٹی۔ مگر تب تک دیر ہو چکی تھی۔

ان کی آنکھوں کے سامنے دھند چھا گئی۔ گردن ڈھلک گئی۔ وجود بے جان ہونے لگا۔

''ممی......! ممی! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ ممی پلیز آنکھیں کھولیں......ممی......!'' آخری آواز جو انہوں نے سنی وہ فارس وجدان کی تھی۔ اس کے بعد انہیں کوئی ہوش نہیں رہا تھا۔

☆☆

ہاسپٹل کے ٹھنڈے سرد کوریڈورز میں بے نام سی خاموشی چھائی تھی۔ کافور میں لپٹا احساس وحشتوں میں دھکیلے جا رہا تھا۔ غم کا اندھیرا تھا۔ وحشت کی تاریکی تھی۔ کچھ کھو دینے کا خوف تھا۔

وہ قدرے خاموش حصے میں آئی سی یو کے سامنے بنچ پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ چہرہ آنسوؤں سے تر تھا، سسکیاں بندھی ہوئی تھیں۔لب خاموش تھے۔اندر جیسے ایک محشر سا بپا تھا۔۔

بند دروازہ کھلا تو فارس نے آگے بڑھ کر ڈاکٹر کو گھیرا تھا۔ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔اب وہ دھندلی نگاہوں سے اسے بات کرتا دیکھ سکتی تھی۔

ہاسپٹل کی سرد سفید راہداریاں ایک دم سے سنسان ہوئیں۔قدموں کی آہٹ تھم گئی۔ڈاکٹرز کا عملہ، اسٹاف ممبرز، نرسز کی آمدورفت، فون کی گھنٹی، سب ختم ہو گیا۔وہ ریلنگ پر گرفت جمائے، سناٹوں میں گھری رہ گئی۔

فارس کے ہاتھ سر کی پشت سے کندھوں تک اور بے جان ہو کر پہلو میں آ گرے۔

مسز شیرازی کی حالت بہت نازک تھی۔اگلے اڑتالیس گھنٹے انتہائی اہم تھے۔ڈاکٹر پرامید نہیں تھے۔وہ انہیں دعا کا کہہ رہے تھے۔اور دعا کا سن کر اس کے اندر سب اندھیرا ہوا تھا۔

دعا یعنی اب ان کا کیس صرف ڈاکٹرز کے ہاتھ میں نہیں رہا۔

دعاء یعنی اب کوئی معجزہ ہی انہیں بچائے تو بچائے۔!

پے در پے صدموں سے لڑتا، الجھتا دل سہم گیا۔ہمت، سکت، حوصلہ ختم ہو گیا۔

''لیٹس ہوپ فار دی بیسٹ!'' ڈاکٹر نے فارس کا کندھا تھپتھپاتے تسلی دینا چاہی۔وہ دیوار سے لگ کر کچھ دیر تک کھڑا رہا پھر وہ فرش پر پنجوں کے بل بیٹھ گیا. دونوں ہاتھ گردن پر پیچھے کی طرف تھے۔سر آگے کو جھک گیا......

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز۔اس کے چہرے پر کرب ٹھہرا تھا۔۔

منہ پر ہاتھ رکھے وہ گرنے کے سے انداز میں بنچ پر بیٹھ گئی۔''پلیز اللہ! یہ نہیں! یہ غم نہیں! یہ دکھ نہیں!

اس طرح کمزور، بے بس، نڈھال۔اور اس قدر اذیت میں اس نے فارس وجدان کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔دل چاہا۔وہ اس کے پاس جائے۔اس کا ہاتھ پکڑے، اسے تسلی دے۔اس کی امید بندھائے۔یقین کی بات کرے۔دعاء کی بات کرے۔مگر ہمت نہ ہوئی۔۔بالکل ہمت نہ ہوئی۔۔اسے اپنا آپ مجرم سا محسوس ہونے لگا۔نہ وہ ریان سے ملنے جاتی۔نہ یہ سب ہوتا۔غلطی اس کی تھی۔اسے سمجھنا چاہیے تھا۔اسے فارس کو سمجھنا چاہیے تھا۔اسے مسز شیرازی کی بات ماننی چاہیے تھی۔

بہت کوشش سے، کچھ ہمت پکڑ کر وہ اس کے پاس گئی۔مٹھیاں بھینچ کر، اور پھر کھول کر اپنا لرزتا ہاتھ فارس کے بازو پر رکھا۔اس کا نام لیا۔اسے متوجہ کرنا چاہا۔

مگر اس نے ہاتھ ہٹا دیا۔اس نے جنت کمال کا ہاتھ ہٹا دیا۔اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔اپنے بالوں کو مٹھیوں میں بھینچ کر رخ بدلا۔اور قدم اٹھاتا گیا۔

اڑتالیس گھنٹے۔! وہ کیفیت کیسی تھی جیسے موت لمحہ بہ لمحہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بڑھ رہی ہو۔

موت! اس نے سر اٹھایا۔

موت! اس کا دل یک دم ہی بھاری ہوا۔

مر کون رہا تھا!؟

اور اب مرنے کون لگا تھا!؟

اڑتالیس گھنٹے۔۔

یہ اس کی زندگی کی مدت تھی۔

اڑتالیس گھنٹے۔یہ سانسوں کا تسلسل تھا۔۔

اڑتالیس گھنٹے۔۔

ہاسپٹل سے باہر کھلی فضا میں بھی اس کا سانس بند ہونے لگا۔اندھیرے سے وحشت ہونے لگی۔ٹریفک کا شور، لوگوں کی آمدورفت، زندگی کا بہاؤ اس کے حواسوں پر سوار ہونے لگا۔

"صرف ایک خواہش۔میری آخری خواہش۔اس کے بعد کبھی کچھ نہیں مانگوں گی!"

"آپ مجھ سے میری جان کیوں نہیں مانگ لیتیں ممی!" ہاتھ تھام کر، کچھ مشتعل ہو کر، کچھ اذیت کے عالم میں جواب دیتا، انکار کرتا، اپنا ہاتھ چھڑاتا، خود کو تنہا کرتا وہ۔

"جو زندہ ہے اس کے ساتھ جینا نہیں چاہتیں۔جو مر چکا ہے اس کے ساتھ مرنا چاہتی ہیں!"

اپنی گاڑی میں وہ کچھ دیر تک بیٹھا رہا۔منجمد احساسات آگ کی لپیٹ میں آتے رہے۔سوال اٹھتے رہے، جواب ملتے رہے، بوجھ بڑھتا گیا۔دل پھٹنے لگا۔خشک لبوں کو تر کرتے اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔کسی نامعلوم سی منزل کی جانب رواں ہو گیا۔ڈیڑھ گھنٹہ تک گاڑی اسلام آباد کی سڑکوں پر اس کی زندگی کی طرح بے مقصد بھٹکتی رہی۔پھر اس نے گاڑی کا رخ مین روڈ کی جانب موڑ دیا۔رفتار بڑھا لی۔

اس کے ہاتھوں پر لرزہ طاری تھا۔اس کی نگاہیں روشنیوں میں بھٹک رہی تھیں۔

حماد شیرازی کی ماں۔ریان شیرازی کی دادی تھیں۔وہ ان دو رشتوں سے تھیں، ان دو رشتوں میں تھیں۔وہ تو دکھ کا سبب۔ایک اذیت کی وجہ تھا۔ایک کرب کی نشانی۔ایک غم کا رمز تھا۔

تاریک رات کا سفر اس کی زندگی سے مشابہ ہو گیا۔ جہاں کبھی پہنچنا نہ چاہتا تھا وہاں پہنچ گیا۔ جس دروازے پر دستک نہ دینا چاہتا تھا، وہاں دستک دے ڈالی۔

☆☆☆

شادی کا گھر تھا۔ خوشیوں کا گھر تھا۔ وہ اس گھر سے اپنے سکون کا جنازہ لینے آیا تھا۔

اوصاف منزل کے مکینوں کو تو پہلے پہل یقین ہی نہ آیا اور جب یقین آیا تو اس کی خاطر مدارت میں دوڑے۔ اور وہ سپاٹ، سخت اور سنجیدہ تاثرات کے ساتھ وسط میں کہیں خاموش کھڑا رہا۔ اسے ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں، ان کی مسکراہٹیں، ان کا پر اخلاق رویہ، ان کی خاطر مدارت۔ کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

وہ اندر سے ایک دم سے خالی ہو گیا۔ دکھ، غم، خوف، گھبراہٹ، وحشت جیسے احساسات مردہ ہو گئے۔ وہ زندہ لاش۔ اور بھٹکتی روح ہو گیا۔ منجمد۔ ساکت مجسمہ ہو گیا۔

اوصاف منزل کے مکینوں کو اصل جھٹکا تو تب لگا جب انہیں علم ہوا، اس بچے کے لیے آیا تھا۔

طارق صاحب کی ہوائیاں اڑ گئیں۔ بوکھلا کر فارس کو دیکھا۔ اپنے مستقبل کی فکر لگ گئی۔ ان پیسوں کی جو انہیں ماہانہ بنیادوں پر ملتے تھے۔ ممکن ہے صرف ملنے آیا ہو۔ خود کو تسلی دی۔ فوراً کسی خاتون کو اندر بھیجا۔ روبی نے کچھ حیرت اور بے یقینی سے بچے کے چچا کو کمرے کی کھڑکی سے دیکھا تھا۔

یہ کیا ہوا تھا؟ یہ کیسے ہوا تھا؟؟

دروازہ کھول کر ثمرین اندر آئی۔

''جلدی کپڑے بدلو اس کے۔'' ہاتھ میں بڑی بھابھی کے بیٹے کے نئے کپڑے تھے۔ روبی نے کپڑے لے لیے، بچہ اس حالت میں اس کے سامنے لایا جاتا تو کیا منہ دکھاتے۔ عزت کی پروا تھی۔ ایک دم سے بدل گئے۔

اس نے سوئے ہوئے ریان کے کپڑے بدلے تو وہ جاگ گیا، چھوٹے سے بیگ میں فیڈر، ڈائپر اور ضرورت کی چند اشیاء رکھیں جو ثمرین اسے دے کر گئی تھی۔ بچے کے بال سیٹ کیے۔ اسے پوری طرح سے اور اچھے سے تیار کیا تا کہ اس کے چچا کو ادراک ہو، یہاں سب اس کا کتنا خیال رکھتے تھے۔

"وہ صبح ریان کی مما کہہ کر گئی تھیں کہ کل تک وہ ریان کو لے جائیں گی!"

روبی نے ڈرتے ڈرتے ثمرین کو بتایا۔ یہ وہ حکم تھا جو ریان کی ماں اسے دے کر گئی تھی۔ چچا سے پہلے ماں نے ارادہ بنا لیا تھا۔ پورے ایک سال بعد دونوں ہی اسے لینے آ گئے تھے۔ کیا دعائیں ایسے بھی قبول ہوتی ہیں؟ روبی کو خوش ہونا چاہیے تھا مگر وہ خوش

نہیں ہو پا رہی تھی۔ اسے ایک دم سے بچے کے چچا کو دیکھنے کے بعد ریان کی فکر ہونے لگی تھی۔

" پھپھو بھی عجیب ہیں!" ثمرین بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ روبی اس کے پیچھے دروازے تک آئی تھی۔

ثمرین مسکراتی ہوئی فارس کے پاس گئی۔ وہ جو مردوں کے گھیرے میں بالکل خاموش کھڑا تھا۔

" یہ رہا ہمارا ریان!" دکھاوے کو بچے کے گال کو چوما۔ پھر اس کی طرف بڑھایا۔ وہ چند لمحوں کے لیے رکا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ بچہ لے لیا۔ اس کا چھوٹا بیگ بھی لے لیا۔ مزید کچھ بھی کہے سنے بغیر وہ باہر نکل گیا۔

" پھپھو کتنا تماشا کریں گی جب انہیں پتا چلے گا!" ثمرین نے اب کے اپنے والد سے کہا تھا۔

"اب ہم اس کی وجہ سے اپنے پیروں پر کلہاڑی تو نہیں مار سکتے!" بیگم صاحبہ نے نخوت سے کہا پھر اپنے شوہر کی طرف مڑیں۔

" کیا کہہ کر گیا ہے، کب تک چھوڑ کر جائے گا بچے کو؟"

"میں یہ سوال پوچھتا اچھا لگتا؟" طارق صاحب پہلے سے ٹینشن میں تھے، چڑ کر بولے۔ ارادہ تھا، اگلے دو تین ماہ کے خرچے سے ایک گاڑی اور لے لیں گے۔ اسٹور میں سامان بھی ڈلوانا تھا۔ بیٹی کی شادی پر تو اچھا خاصا خرچا ہو گیا تھا۔ انہیں زیادہ فکر ہو رہی تھی۔ بچہ واپس آئے۔ ان کی بھی یہی خواہش تھی۔ وہ بھی یہی چاہتے تھے۔

روبی انہیں دیکھ رہی تھی۔ انہیں سن رہی تھی۔ پھر رخ بدل کر اندر چلی گئی۔ عقبی کمرے کی ایک کھڑکی سے تنگ گلی کے اس سرے پر دیکھا۔ وہاں جہاں سیاہ رنگ کی گاڑی کھڑی تھی۔ جس کی ہیڈ لائٹس اندھیرے میں دور تک روشنی کیے ہوئی تھیں۔

ریان کا ہاتھ اپنے چچا کے کندھے پر تھا۔ دوسرا ہاتھ بند اپنے سینے پر۔ جیسا کہ وہ رکھا کرتا تھا۔ دروازہ کھل گیا۔ اس نے پسنجر سیٹ پر اسے بٹھا دیا۔ جھک کر بیلٹ باندھی۔ دیکھے بغیر محسوس کیے بنا۔ وہ گھوم کر اپنی سیٹ سنبھال چکا تھا۔ دروازے لاکڈ ہوئے۔ گاڑی میں دو نفوس رہ گئے۔

ایک پہلے سے عدم تھا۔ دوسرا اب ہو رہا تھا۔

اپنے اندر کسی کو مردہ کر دینے کی خواہش لیے اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

جمود پتھر جیسا تھا۔ اس کے اندر لاوے جیسی آگ تھی۔ اس آگ میں تلاطم سا برپا ہوا۔ خول میں دراڑ سی پڑی۔ اس دراڑ نے رگ و پے میں ایک محشر سا بپا کر دیا۔ بہت سے پردے اٹھا دیے، بہت سی باتیں سنا دیں۔ ضبط کر کے، اس نے ان دیکھا کر دیا۔ دراڑ کو، وجود کو۔ زخموں کو۔ اور زخموں سے اٹھتی ٹیسوں کو بھی۔

گاڑی میں اس کے ساتھ کوئی نہیں ہے! اس نے سوچا۔ اس سوچ پر یقین بڑھایا۔ اسلام آباد پہنچنے تک اسے یہی کرنا تھا۔ وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے، گہری سانس لیتا اپنی نگاہوں کو، ذہن، سوچ اور خیالات کو بھٹکنے نہیں دے رہا تھا۔ اس کے پہلو میں حماد

عسریسرا۔ حسنیٰ حسین

شیرازی نہیں تھا، اس کا بیٹا نہیں تھا۔ وہ اکیلا ہے! بالکل اکیلا!

اسلام آباد پہنچنے تک اب اسے یہی کرنا تھا۔ یہی سوچنا تھا۔

☆☆☆

گاڑی اسٹارٹ ہوئی تو ریان شیرازی کی سوئی ہوئی سی معصوم آنکھوں میں حیرت سی ابھر آئی۔ جانے پہچانے سے چہرے کہیں گم ہو گئے تھے، حرکت کرتی کسی شے میں سواری کا پہلا تجربہ تھا، اس کا ننھا سا دل اور شدت سے دھڑکنے لگا تھا۔ پہلے پہل تو وہ نہیں رویا۔ اوپری لب نچلے لب میں دے کر قابو پانے کی کوشش کی۔ مگر پھر وہ ڈر گیا۔ بہت بری طرح سے ڈر گیا۔ بڑی بڑی سی معصوم آنکھیں بھر آئیں۔ اس کی عمر جتنا ضبط بالکل ختم ہو گیا اور اس نے ایک دم سے رونا شروع کر دیا۔

حماد شیرازی کا بیٹا!

قلب کے جوار بھاٹے سے آگ کے شرر نکلے اور فارس کے وجود پر پھسل گئے۔ اس نے طویل سانس لیتے شیشہ کھول دیا، بٹن کھول دیا۔ اپنا رخ شیشے کی طرف کیا۔ اس کے اندر کا شور ایک دم سے بڑھ گیا۔ رونے کی ایک آواز پہلو سے تھی۔ اور دوسری آواز ماضی سے آ رہی تھی۔

ایک لمحے کے لیے اس کا وجود شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ وہ ایک لحظہ۔ اندھیرا بن کر اس کے دل و دماغ، کی مثبت روشنیوں کو نگل کر وحشت اور بے سکونی کی دلدل میں اتار گیا۔ ایک لمحے میں سب بگڑ گیا۔ سب بدل گیا۔

"شٹ اپ! جسٹ شٹ اپ!" اسٹیرنگ وہیل پر گرفت جمائے وہ پلٹ کر ریان شیرازی پر دھاڑا۔

وہ اس کے اس طرح چیخنے پر اور زیادہ رونے لگا۔ اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا، یہ کیا ہو رہا ہے، کیسے ہو رہا ہے، کیوں ہو رہا ہے۔ اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش کی، ایک ہی ہاتھ سے اس بیلٹ کو کھینچنا چاہا۔ پھر وہ اس شدت سے رویا کہ آس پاس کا ہر شور ختم ہو گیا، ٹریفک کی آواز بھی معدوم ہو گئی۔ صرف ریان کی آواز بچی جو رہ گئی۔ صرف ریان کا شور تھا جو ٹھہر گیا۔

دراڑ پھٹ چکی تھی، خول چٹخ گیا تھا۔ آگ۔ اندر باہر۔ ہر طرف آگ جیسی کیفیت تھی۔ اسٹیرنگ وہیل پر اس کی گرفت بڑھ گئی۔ اس کی حالت پر کسی نے قہقہہ لگایا۔ اس کے درد پر کوئی ہنستے ہوئے اس کی گردن تک آ گیا۔

"جسے مار دینا چاہیے۔ اسے ساتھ لے جا رہے ہو؟؟"

ماضی کا ہر زخم ہرا ہوا، روح اور آنکھوں میں درد نے بسیرے کر لیے۔ حال ختم ہو گیا۔ زندگی ختم ہو گئی۔

اشتعال میں آ کر اس نے ایک جھٹکے سے گاڑی روک دی۔ اسی سرعت سے باہر نکلا۔ پسنجر سیٹ کا دروازہ کھولا۔ ریان کو اٹھائے گاڑی کی دوسری جانب بلند و بالا درختوں اور سبزے کے جھنڈ تک لایا۔

ٹریفک میں بڑے بڑے ٹرک اور ٹرالر گزرنے لگے تھے، ان کا شور بھیانک تھا، اس نے ریان شیرازی کو وہیں چھوڑ دیا۔ جھٹک دیا۔ نفرت سے۔ غصے سے۔ بے انتہا اذیت میں آ کر۔ آگ میں سلگتے ہوئے۔ اس نے اس بچے کو وہیں چھوڑ دیا۔

ریان پہلے خوف زدہ تھا۔ اب کے متوحش سا بوکھلا کر روتے ہوئے زور زور سے چیخنے لگا۔

فارس شیرازی نے گاڑی کی جانب قدم بڑھا لیے تھے۔ ریان شیرازی پیچھے رہ گیا تھا۔

☆☆☆

مجھے سنو،
جیسے کوئی بارش کو سنتا ہے
نہ توجہ سے اور نہ بے خیالی سے
دھیمے قدموں کی خاموش آہٹ میں
ابر برساتی اس رم جھم کے درمیاں
اور ہوا میں گرتے اس پانی کے جیسے
ہوا لہرائے ایسے کہ وقت گزرتا ہو جیسے
یہ دن ہے کہ اب گزرا چاہتا ہے
وہ رات ہے کہ آیا چاہتی ہے
اُس موڑ پہ موجود دھند لکے کی رنگینی میں
اُس موڑ پہ موجود وقت کی بے چینی میں
مُجھے سنو،
جیسے کوئی بارش کو سنتا ہے
مجھے سنے بغیر،
سنو میں کیا کہتا ہوں
کھلی آنکھوں کے ساتھ جیتے جاگتے
پانچوں حسوں کو تمام، بیدار رکھتے ہوئے
ابر برس رہا ہے، دھیمے قدموں جیسے

عسریسرا۔ حسنیٰ حسین

الفاظ کی دھیمی سرسراہٹ کے جیسے
ہوا، پانی اور لفظ بنا کوئی آواز لیے
یہ جو ہم ہیں اور یہ ماہ و سال و لمحے
نارساں وقت کی گراں بار اداسی لیے
مجھے سُنو،
جیسے کوئی بارش کو سُنتا ہے
(اکتایو پاز)

☆☆☆

اور گرمیوں کی وہ چھٹیاں کبھی نہیں آئی تھیں۔ وہ وعدہ کبھی ایفا نہیں ہو سکا تھا۔ وہ خوشیوں بھرے پل، معصومیت بھری مسکراہٹیں، وہ آنکھوں کی روشنی اور زندگی کا احساس کبھی لوٹ کر نہیں آیا تھا۔

اپنے آنے والے کل سے قطعی بے خبر چودہ سالہ فارس وجدان پہلی بار اپنے حالات کو نہیں دیکھ رہا تھا، نہ غموں کو سہہ رہا تھا، نہ زخموں کو جھیل رہا تھا۔ اس کے اندر سکون کی سی کیفیت تھی۔ ایک لمبے سفر کے بعد کہیں پڑاو جیسی کیفیت۔

یکے بعد دیگرے دو گاڑیاں شیرازی مینشن کے احاطے سے باہر نکلی تھیں۔ دونوں کا راستہ مختلف۔ منزل بھی مختلف تھی۔

اس کی گاڑی اپنے سفر میں گامزن ہوئی تو وہ گردن موڑ کر باہر دیکھنے لگا۔ ہاسٹل تک کا سفر تین گھنٹوں پر مشتمل تھا۔ گاڑی سرسبز درختوں سے گھری ایک طویل شاہراہ پر تھی۔ بلندی سے وہ نیچے اور قدرے دور سے نظر آتی دوسری سڑک کو دیکھ سکتا تھا۔ تا حد نگاہ پھیلی ہوئی وادیاں، سبزہ، اور باغات کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں نوٹ پیڈ تھا، وہ اس پر کچھ لکھنے لگا تھا۔ چند ایک لفظ تھے، وقت تھا، مہینوں کی مدت تھی اور تاریخ تھی۔ شیرازی ہاؤس میں واپسی کی تاریخ۔

وہ گرمی کی چھٹیوں میں ضرور آنے والا تھا۔ اس نے جنت کے خوابوں میں حقیقت کا رنگ بھرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے پہاڑیوں تک، اور دریاؤں تک، اور ہر ایک گھاٹی اور وادی تک جانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ زندگی کا وہ احساس خوبصورت تھا۔ اسی خوبصورت احساس کو جیتے اس نے سر اٹھا کر کھڑکی سے باہر دیکھا تھا۔ دور بہت دور اور قدرے نیچائی میں ایک اور سڑک تھی۔ اور اسی سڑک پر اسے آغا علی کی جیپ دوڑتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ پہلے پہل اسے وہ منظر ایک دھوکا، ایک سراب جیسا لگا تھا۔ مگر اس نے جو دیکھا وہ حقیقت تھی۔ اس کے تاثرات یکایک بدل گئے تھے، آنکھوں میں غیر مفہوم سا تاثر ٹھہر گیا تھا۔

گاڑی تو خراب تھی۔ اور ریپئرنگ کے لیے ورک شاپ میں موجود تھی تو یہ۔ بے اختیار مڑ کر پیچھے تک دیکھا۔ گھنے درختوں کا

سلسلہ شروع ہوا تو گاڑی اوجھل ہو گئی۔ بلندی سے ڈھلوان کا رخ کرتی، گھنے درختوں میں چھپ کر گزرتی ہوئی وہ گاڑی اسے الجھن میں مبتلا کر گئی۔

وہ اعظم شیرازی کے زیر استعمال رہنے والی مخصوص گاڑیوں میں پہلے کبھی سوار نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی ایسا کوئی حکم ملازموں کو کبھی دیا گیا تھا۔ اسے چھوڑنے اور لے جانے کی ذمہ داری صرف آغا علی پر عائد تھی۔ صرف وہی اس کے شیڈول اور معاملات سے باخبر رہتا تھا۔ اس کے متعلق جو بھی حکم ہوتا، اسے ہی ملا کرتا تھا۔

مگر اب آغا علی نہیں تھا۔ دو گارڈ تھے اور ان کے انداز سے واضح تھا، وہ بھی کسی سخت حکم کے تابع تھے۔

وہ ذرا سا مشکوک اور کچھ مضطرب ہو کر دونوں گارڈز کو دیکھنے لگا تھا۔

ایک گارڈ ڈرائیو کر رہا تھا تو دوسرا چوکنا ہو کر بیٹھا تھا۔ جانے کیا وجہ تھی کہ اس کے احساسات عجیب ہونے لگے۔ چھٹی حس نے خبر کر دی، کچھ غلط ہونے کو ہے۔

گہری سانس لے کر ہر طرح کے منفی خیالات کو جھٹکتے وہ نوٹ پیڈ پر جھک گیا۔ مزید چند ہی لفظ گھسیٹے تھے جب فائرنگ کی آواز کے ساتھ گاڑی ایک جھٹکے سے بے قابو ہوئی تھی۔ شیشے چھناکے سے ٹوٹ کر بکھرے تھے۔ اس کے ہاتھ سے قلم چھوٹا تھا، نوٹ پیڈ بھی، پانی کی بوتل بھی۔ گولی ڈرائیور کا سینہ چیر گئی تھی۔ ایک زبردست جھٹکے سے وہ اگلی نشست سے، پیچھے کی طرف اور پھر دروازے سے ٹکرایا تھا، اس شدت سے کہ شیشے کے ٹکڑے پشت اور سینے پر کھبے چلے گئے۔ چوٹ سر کے پچھلے حصے پر لگی۔ گاڑی گھومتی ہوئی درختوں سے ٹکرا کر کہیں کھائی میں الٹ گئی۔

اس کی آنکھیں کھلی تھیں مگر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، نہ ہی سماعت کام کر رہی تھی۔ وہ سیٹ بیلٹ میں پھنسا ہوا تھا، اس کے ہاتھ بے جان سے لٹک رہے تھے۔ پیشانی سے پھوٹتی خون کی دھار قطرہ قطرہ گرنے لگی، شیشے کے ٹکڑوں کو رنگنے لگی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کی تھی۔

گاڑی کا اگلا حصہ چھناکے سے آگ کی لپیٹ میں آیا تھا۔ دھواں بڑھ گیا، دھواں پھیل گیا۔ اندر اور باہر۔ ایک جیسی کیفیت ہوئی۔

بمشکل سانس لیتے اس نے پلکیں جھپکائیں۔ فائرنگ کی آواز پھر سے گونجی۔ دوسرا گارڈ بھی مارا گیا۔ اس نے کسی قدر کوشش سے اپنے ہاتھ کو جنبش دی۔ بمشکل کھینچ کر بیلٹ تک لایا۔

کھلتی بند ہوتی آنکھیں ان قدموں کو دیکھ سکتی تھیں جو اس کی کھڑکی کے پاس آ رکے تھے۔

سڑک پر تیزی سے فراٹے بھرتی آغا علی کی جیپ آنکھوں میں لہرائی۔ ذہن میں کوئی خیال درد بن کر ابھرا۔ تلخ حقیقت نے

اسے گردن سے پکڑ لیا۔ آنکھ کنارے آنسو خون میں شامل ہوا، صفحے پر گرا، تاریخ پر ثبت ہوا۔

"ملازموں کے بچے ان گاڑیوں میں سفر کر سکتے ہیں؟"

"جی صاحب نے اجازت دی ہے۔"

شاک سے گزرتے، کرب اور اذیت کا ادراک کرتے، بمشکل سانس لیتے۔ ہمت پیدا کر کے بیلٹ کو کھولنا چاہا۔ پوری قوت سے۔ پوری شدت سے۔ مگر انگلیوں میں طاقت نہ رہی۔

آہنی دروازہ ایک جھٹکے سے کھینچا گیا تھا، غالباً کھولنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ گاڑی میں دھواں بھرتا جا رہا تھا۔ شعلے تیز ہو رہے تھے۔

"ہر حال میں لڑکا چاہیے، اور زندہ چاہیے!" جانے کس نے چنگھاڑ کر کہا تھا۔ دروازہ کھینچنے میں شدت آ گئی تھی۔ گاڑی کے باقی ماندہ شیشوں کو بھاری بوٹ سے توڑا گیا۔

اس نے بند ہوتی آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہا۔ اس سے اگلی نشست پر دو لاشیں تھیں۔ اور تیسری لاش وہ ہو رہا تھا۔

سیٹ بیلٹ کھول دیا گیا۔ دو مضبوط ہاتھوں نے اسے پکڑ کر کھینچا۔ شیشے کی رگڑ سے پشت چھل گئی۔ درد کی لہر داہنے بازو سے، اور کندھوں سے اٹھتی ہوئی اسے پسلیوں تک محسوس ہوئی۔ وہ بے جان ہوتا ایک دم سے چیخا تھا۔ اور اگلے ہی پل وہ گاڑی سے باہر تھا۔ اسے کھینچتے ہوئے شعلوں کی زد میں آتی اس گاڑی سے دور کر دیا گیا۔

اس نے دھندلی نگاہوں سے آگ کی لپیٹ میں آتی اس گاڑی کو دیکھا۔ آواز دھماکے کی تھی۔ اس کا وجود اندر تک لرز اٹھا تھا۔ وہ آخری منزل۔ وہ آگ۔ وہ شعلوں کا منظر۔ موت کا منظر۔

"میں گرمیوں کی چھٹیوں میں ضرور آؤں گا!"

سبزہ، ہریالی، اور باغ اور دور تک پھیلا ہوا سبزہ آن کی آن میں راکھ ہوا۔ روشنیاں گل ہوئیں۔ درخت مرجھا گئے۔

''وعدہ؟؟'' آسمان تاریک اور ایک دم سے سیاہ ہو گیا۔

''پکا وعدہ!''

وہ کسی جنت سے کہہ رہا تھا۔

اس کی سوچ، خیالات، درد کا احساس، خوف کا ادراک سب جامد ہوا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ تاریکی نے جیسے اسے مکمل طور پر نگل لیا تھا۔

☆☆☆

مجھے سنو،

جیسے کوئی بارش کو سنتا ہے

گیلے تار کول کے اوپر چمک دار برستا ابر

دھواں سا اٹھائے اور غائب ہو جائے

رات اتر کر مجھے دکھانا شروع کر جائے

تم ہی تم ہو اور تمہارا دمکتا ہوا جسم

تم ہی تم ہو اور رات جیسا تمھارا چہرہ

تم ہی تم ہو اور یہ صبر آزما گرج چمک

گلی پار کر کے مرے دل و دماغ میں بس گئی

قدموں کے نشاں مری آنکھوں کے روبرو ہیں

مجھے سنو،

جیسے کوئی بارش کو سنتا ہے!

☆☆☆

جمیلہ داؤد کا امریکا میں یہ دوسرا ہفتہ تھا۔ اور اس دوران ایک بار بھی ان کا رابطہ فارس وجدان سے نہیں ہو سکا تھا۔ وہ کئی بار شیرازی مینشن میں کال کر چکی تھیں۔ ہر بار ملازم فارس کا نام سنتے ہی ان سے معذرت کر لیتے تھے۔ اعظم شیرازی کا حکم تھا۔ وہ اپنے مالک کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے اعظم شیرازی کو بارہا فون کیا تھا۔ ان کی منت کی تھی۔ وہ صرف فون پر رابطہ کروا دیں مگر انہوں نے انکار کر دیا تھا۔

"پہلے ہی تم نے اس لڑکے کو سر پر چڑھا کر اچھا خاصا بگاڑ دیا ہے۔ اب جبکہ وہ بورڈنگ اسکول میں سیٹ ہو چکا ہے۔ تو میں مزید کوئی غلطی برداشت نہیں کر سکتا!"

وہ مین ہیٹن بیچ پر اپنے عالی شان گھر کی دیوار گیر کھڑکیوں کے سامنے بے قراری سے ٹہل رہی تھیں۔ جھٹکے سے رک گئیں۔

"آپ نے۔ آپ نے فارس کو بورڈنگ اسکول بھیج دیا ہے؟؟" دماغ صدمے سے ماؤف ہوا تھا۔

انہیں وہ تمام وعدے یاد آ گئے جو اس نے فارس سے کیے تھے۔ وہ خوشیوں بھرے لمحے، امید بھری باتیں۔ وہ محبت، یقین اور اعتبار کی ساعتیں۔۔ وہ سب جیسے شیشے کا محل تھا۔ چھماکے سے ٹوٹ کر انہیں لہولہان کر گیا۔

"بابا! یہ آپ نے کیا کیا ہے؟" وہ تقریباً رودینے والی ہوگئیں۔ "آپ نہیں جانتے۔ میں جانتی ہوں اسے۔ بہت حساس ہے وہ۔ نئے ماحول میں اس طرح سے ایڈجسٹ نہیں کر پائے گا۔ آپ پلیز اسے واپس بلالیں۔"

"جمیلہ!" ان کی کاٹ دار آواز نے ان کا نام لیا تھا۔ نچلا لب کاٹتے، آنکھوں میں نمی لیے وہ چپ ہوئیں۔

''مجھے اس کے ساتھ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔ یہ میں بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ تمہیں وہاں میں نے اسی لیے بھیجا ہے تاکہ تم اپنے شوہر اور بیٹے پر فوکس کرسکو! فارس میری ذمہ داری ہے۔ یو سٹے آؤٹ آف اٹ!''

"آپ کو اس پر ترس نہیں آتا!؟" ان کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔ پیشانی پر ہاتھ رکھے وہ بے بسی کی انتہا پر تھیں۔ "وہ آپ کا خون ہے۔ آپ کے اس طرح اسے رد کردینے سے اس کی یہ حقیقت تو کبھی نہیں بدل سکتی!"

"ہاں! یہ حقیقت کہ وہ اس بدنام زمانہ لڑکی کا بیٹا ہے، کبھی نہیں بدل سکتی۔" انہوں نے جبڑے بھینچ کر کہا۔

"وہ ہارون کا بیٹا ہے بابا!"

"ہارون کی غلطی۔ ہارون کا گناہ ہے وہ۔" اس قدر اشتعال میں آکر بات کی کہ وہ اپنی جگہ رک گئیں۔'' میں اس نکاح کو مانتا ہوں، نہ ہی اس کے رشتے کو تسلیم کرتا ہوں۔ وہ لڑکا ابھی تک زندہ ہے تو صرف اس لیے۔ کہ میں ہارون کو ان معاملات سے دور رکھنے کے لیے ایسا کرنا چاہ رہا ہوں۔ مجھے مجبور مت کرو جمیلہ! کہ میں کوئی انتہائی قدم اٹھاؤں جس پر تمہیں پچھتانا پڑے!" سخت لہجے میں انہوں نے متنبہ کیا تھا۔ "اس کی ماں کی جو اوقات ہے۔ میں اسے بھی اسی میں رکھوں گا۔''

"آپ آرزو کا غصہ فارس پر کیوں نکال رہے ہیں؟"

"میں کسی کا غصہ کسی پر نہیں نکال رہا۔ جو ہونا چاہیے وہی کر رہا ہوں! وہ لڑکا ہمارے خاندان کا حصہ کبھی نہیں بن سکتا۔ کبھی نہیں! "ان کی بھاری رعب دار آواز ان کے حتمی فیصلے کی غماز تھی۔

انہوں نے غصے میں کال کاٹ دی۔ جمیلہ ہاتھوں میں فون لیے بیٹھی رہ گئی تھیں۔ حلق میں آنسوؤں کا پھندا اٹک گیا تھا۔

اس رات وہ باوجود کوشش کے سو نہیں سکی تھیں۔ رہ رہ کر فارس کا خیال آتا رہا۔ گزشتہ چھ سال ثانیوں میں سمٹ کر ذہن میں گھومتے رہے۔ انہیں اپنی بے بسی پر غصہ۔ ان حالات پر۔ ایسے رشتوں پر۔ ان کی سوچ پر غصہ آتا رہا۔ رونا آتا رہا۔ وہ اتنی مجبور کیوں تھیں۔ ان کے بس میں کچھ کیوں نہیں آتا تھا؟ اٹھ کر گھر میں ٹہلتی رہیں۔

"تم جاگ رہی ہو ابھی تک۔" ہارون کی آنکھ کھلی تو انہیں کھڑکی کے سامنے دیکھ کر پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ وہ مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

وہ اس کی سگی ماں نہیں تھی۔ پھر بھی اس کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ اور وہ اس کا سگا باپ ہو کر سکون کی نیند سویا رہا تھا۔

"کچھ نہیں۔ ایسے ہی نیند نہیں آرہی تھی!" پلکیں جھپکا کر آنسوؤں کا اثر زائل کرتی وہ رخ بدل گئی تھی۔ بات کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ دونوں باپ بیٹوں کے پاس اپنے اپنے موقف کی ٹھوس دلیلیں تھیں۔ اور وہ چاہ کر بھی ان دلیلوں کو رد نہیں کر پاتی تھیں۔

"کیا تم جانتے ہو، بابا نے فارس کا ایڈمیشن بورڈنگ اسکول میں کروادیا ہے!" اگلے دن جیسے ہی حماد اسکول کے لیے روانہ ہوا، انہوں نے ناشتے کی ٹیبل پر ہارون سے کہا۔

کپ پر اس کی گرفت بس ایک لمحے کے لیے مضبوط ہوئی تھی۔ تاثرات بھی ایک لمحے کے لیے بدلے تھے۔ نظروں کا ارتکاز بھی اسی مدت کے لیے بھٹکا تھا۔ چند لمحوں کا کھیل۔ چند ثانیوں کا قصہ تھا۔ اور ہارون شیرازی نے گزشتہ سات سالوں کی طرح اب بھی خود کو سخت پتھر کرلیا تھا۔

"بابا جیسا مناسب سمجھیں، کرسکتے ہیں!" اس نے دوسرے ہاتھ سے اخبار کھول کر پھیلا لیا۔ وہ نیوی بلیو تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا، جیل سے بال پیچھے کی طرف جمے ہوئے تھے، تراشیدہ داڑھی چہرے کی جاذبیت میں اضافے کا باعث بن رہی تھی۔ تاثرات سنجیدگی میں ڈھل گئے تھے۔

"وہ فارس کو جان سے ماردیں تو کیا آپ تب بھی یہی کہیں گے؟"

"جمیلہ!" ڈائننگ ہال میں ہارون شیرازی کی آواز سخت ہو کر گونجی تھی۔ آنکھوں کا تاثر پتھریلا ہو گیا تھا۔

"کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟ آپ کو غصہ آگیا ہے؟ جو کچھ وہ سہہ رہا ہے۔ آپ اسے زندگی کہتے ہیں؟"

ہارون نے مٹھیاں سختی سے بھینچ لی تھیں۔ کپ میز پر پٹخ دیا تھا۔

"بابا اس کا بہت خیال رکھ رہے ہیں۔ اسے کسی چیز کی کمی نہیں ہے!"

"چیزوں کی کمی نہیں ہے۔ انسانوں کی تو ہے۔ رشتوں کی تو ہے۔ اس کے پاس آپ نہیں ہیں۔ میں نہیں ہوں۔ اس کی ماں نہیں ہے۔"

"آرزو سے شادی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ کیا اس بات کا احساس دلانا چاہتی ہو تم؟" وہ بھڑک اٹھا۔

"آپ غلط کیوں سوچ رہے ہیں!"

"بالکل ٹھیک سوچ رہا ہوں میں!" اس کی آنکھوں کی سرخی بڑھ گئی تھی۔

"میں آپ سے آپ کے بیٹے کی بات کر رہی ہوں ہارون!۔"

وہ اپنی جگہ رک گیا۔ چند ثانیوں کے لیے ایک سکوت سا طاری رہا۔ جیسے کچھ کہنے کو باقی نہ رہا ہو۔ لڑنے کو کوئی دلیل۔ وضاحت کے لیے کوئی لفظ۔ برات کے لیے کوئی حجت نہ رہی ہو۔

"بابا نے کہا ہے، میں اسے بھول جاؤں۔۔" وہ کرسی دھکیل کر اٹھ گیا تھا۔ "اور میں اسے بھولنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کیوں تم بار بار۔"

"وائے ڈو یو ہیو ٹو فارگیٹ یور اون چائلڈ؟" وہ روتے ہوئے اس پر چیخ پڑیں۔ ہارون منجمد سا اپنی جگہ رک گیا۔ مڑ کر اسے دیکھا۔ "کیوں ضروری ہے آپ کے لیے اسے ڈس اون کرنا......؟ اس خوف سے کہ کہیں بابا آپ کو اپنی تمام جائیداد سے عاق نہ کر دیں؟" اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔ "آپ کو لگتا ہے، بابا واقعی میں ایسا کر سکتے ہیں؟ ایک بار بات تو کریں۔ اپنے بچے کے لیے کوئی اسٹینڈ تو لیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔ آپ کا پورا ساتھ دوں گی۔" وہ اٹھ کر اس کے پاس آئیں۔ نرمی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ کاجل سے لبریز آنکھوں میں حزن ٹھہرا تھا۔ "ہم اسے یہاں لے آئیں گے۔ وہ ہمارے ساتھ رہے گا!"

"بابا کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں۔ یہ مجھ سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا!" اس نے جمیلہ کا ہاتھ اپنے بازو پر سے ہٹا دیا۔ کچھ دیر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے کھڑا رہا۔ "یہ پہلے میرا اور فارس کا معاملہ تھا۔ یہ اب بابا کا اور فارس کا معاملہ ہے۔ تم بھول رہی ہو مگر مجھے یاد ہے۔ وہ وعدہ جو میں نے بابا سے کیا تھا!"

جمیلہ نے صدمے سے اسے دیکھتے، نفی میں سر ہلاتے، اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"جمیلہ!"

اس نے الٹے قدم پیچھے ہوتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر انہیں مزید کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔ "میں بھی کس میں احساس جگانے کی کوشش کر رہی ہوں؟" نم آنکھوں کے ساتھ کچھ اذیت سے ہنس پڑیں۔ "آپ نے تو خود اپنے بچے کو ڈس اون کیا ہے۔ آپ نے تو اس کی ایک ملازم کی حیثیت کو سب سے پہلے قبول کیا ہے! اور میں۔ میں آپ سے بات کر رہی ہوں۔!"

تاسف اور دکھ سے سر ہلاتی وہ ڈائننگ ہال چھوڑ کر چلی گئیں۔ ہارون شیرازی اپنی جگہ کھڑا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

پاکستان میں رابطے کی ہر کوشش تقریباً ناکام رہی تھی۔ شیرازی مینشن سے تو اعظم شیرازی نے ان کا رابطہ مکمل طور پر منقطع کروا دیا تھا۔ فارس سے متعلق کوئی بھی بات یا خبر ان تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ وہ پاکستان میں کیسا تھا، کس حال میں تھا۔ اپنے ہاسٹل میں ایڈجسٹ ہو پایا تھا یا نہیں۔ فکر اور پروا کی لے پر اٹھتے کسی بھی سوال کا کوئی جواب نہیں مل سکتا تھا۔

انہیں اپنی زندگی ایک دم سے بہت ادھوری سی لگنے لگی۔ رحم بھرا دل ایک ماں کا دل تھا۔ تڑپ بھی ویسی ہی رکھتا تھا۔ بچے کی جدائی میں بے قراری ان کے انگ انگ سے جھلکتی تھی۔

حالات کو بدلا نہیں جا سکتا تھا۔ نہ ہی زندگی کو روکا جا سکتا تھا۔ انہیں اپنی ذات سے جڑے دوسرے رشتوں کا بھی خیال رکھنا

تھا۔ اپنا بھی خیال رکھنا تھا۔ اس غم اور پریشانی سے نکالنے کے لیے انہوں نے خود کو زندگی میں مصروف رکھنے کی سعی کی۔ اپنا اسٹوڈیو ترتیب دیا۔

اپنے تخیل کی دھار پر بکھرے رنگوں کو چنا اور اپنے پہلے سولو ایگزیبیشن کی تیاری شروع کر دی۔

وہ اپنے ذہن کو بھٹکانا چاہتی تھیں۔ تمام تر فکر اور اندیشوں کو سلانا چاہتی تھیں۔ فارس پاکستان میں اکیلا ہے، اس خیال سے جو تکلیف پہنچتی تھی اس تکلیف کو دبانا چاہتی تھیں۔

وہ ایک لینڈ اسکیپ آرٹسٹ تھی۔ رنگوں سے قدرتی مناظر تخلیق کرتی تھیں۔ قدرتی مناظر میں زندگی کا رنگ دکھاتی تھیں۔ سبزہ، بہار، اونچے لمبے پہاڑ، وادیاں، پوری رات کا خوبصورت چاند اور پھولوں کے دل فریب نظارے۔ انہیں رنگ بھلے لگتے تھے۔ مگر اب تو جیسے ان کی ہر پینٹنگ گہرے۔ بھورے۔ سیاہ۔ اور مبہم رنگوں کا امتزاج ہو گئی تھی۔

توجہ کا مرکز اب حماد تھا۔ وہ انہیں اپنی طرف سے پورا وقت دیتی تھیں۔ اس کی ہر بات سنتی تھیں۔ اس کا ہر لحاظ سے خیال رکھتی تھی۔ مگر پھر بھی حماد کو لگتا تھا ممی کہیں کھو گئی ہیں۔ اسے سن نہیں رہیں۔ اسے دیکھ نہیں رہیں۔

شاپنگ کے لیے جاتیں تو بے دھیانی میں کچھ نہ کچھ فارس کے لیے بھی دیکھنے لگ جاتیں۔، مارکرز، ڈائریز، چھوٹے سائز کی آرائشی کاریں جو وہ اکثر اپنی رائٹنگ ٹیبل پر سجائے رکھتا تھا، کتابیں، رجسٹرز۔ ریموٹ کنٹرول کارز، انہیں جہاں بھی۔ جو چیز بھی پسند آتی وہ اس کے لیے لے لیتیں۔ گھر آ کر وہ کتنی ہی دیر تک ان چیزوں کو ہاتھوں میں لیے بیٹھی رہتیں۔ وہ بڑا ہو جائے گا اور یہ چیزیں اس کے لیے چھوٹی ہو جائیں گی۔ غیر اہم۔ غیر ضروری اور اس کی پسند کے ہر دائرے سے باہر نکل جائیں گی۔ انہیں افسوس ہوتا۔ گزرتے وقت سے خوف آتا۔ کچھ بھی خریدتے وقت جو ایکسائٹمنٹ ہوتی، وہ گھر آ کر غم میں بدل جاتی۔ وہ چیزیں ان کے ہاتھوں سے پھر آغوش میں ہوتیں۔ سینے سے لگ جاتیں۔ جیسے وہ فارس کو خود میں سمیٹا کرتی تھیں۔ اس کی مسکراہٹ۔ یاد آتی۔ اس کی آنکھوں کا رنگ یاد آتا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کا اپنی ہتھیلیوں پر ٹھہرنا یاد آتا۔ وہ وقت، لمحے، اور خوبصورت یادیں ماضی ہو کر انہیں زیادہ تکلیف پہنچانے لگی تھیں۔

☆☆☆

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے\
کسی فرحت کے موقع پر\
جہاں ہجوم برپا ہو\
کسی تقریب کے دوران

اچانک لب ٹھہر جائیں
زباں خاموش ہو جائے
وہاں سے پھر دبے پاؤں
اچانک لوٹ آنا ہو
کھلی آنکھوں سے بستر پر محض لیٹے ہی رہنا ہو
دل نادان ایسے ہو کہ جیسے درد جاگا ہے
جو سینے سے اٹھے اور دل کے اندر تک چلا جائے
مسرت، قہقہے اور آرزوئیں یوں مچلتی ہوں
کسی دھویں کی مانند آسمانوں میں بکھرتی ہوں
اسی ساعت میں دانستہ مسلسل رونے لگ جاؤ!
تمہیں معلوم ہی ہوگا
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
(ہرمن ہیسے

☆☆☆

مہینے کے آخر میں وہ حماد کے ساتھ مال گئی تھیں۔ اس کے دوست کی پارٹی تھی اور وہ اپنے لیے نئے کپڑے خریدنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے لیے سفید رنگ کی ایک ہوڈی پسند کی۔ جو انہیں بھی بہت اچھی لگی۔ انہوں نے باقاعدہ شاپ اسسٹنٹ سے اس کے سائز کا پوچھا۔

بارہ سال کے لڑکے کے لیے۔ انہوں نے قریب کھڑے ایک لڑکے کی جانب اشارہ کیا۔ ''اس سے ذرا چھوٹا۔'' شاپ اسسٹنٹ کسی اور رنگ میں وہی شرٹ ان کے لیے خاص طور پر مطلوبہ سائز میں نکال لیا۔ اور اس تمام عرصے میں خاموشی سے اپنی بے خبر ماں کو دیکھتے پندرہ سالہ حماد نے وہ ہوڈی کاؤنٹر پر پٹخ دی۔

" مجھے نہیں چاہیے!" کہہ کر غصے سے نکل گیا۔ وہ پریشانی کے عالم میں۔ عجلت میں قدم اٹھاتی تیزی سے اس کے پیچھے آئیں۔

" کیا ہو گیا حامی؟" بیچ راستے میں اسے روک کر کچھ فکرمندی سے پوچھا تھا۔

" آپ کیوں اس سرونٹ بوائے کے لیے میرے جیسی چیزیں لیتی ہیں!"

جمیلہ داؤد آنکھوں میں شاک لیے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ " جب بھی آپ کے ساتھ شاپنگ کے لیے آتا ہوں آپ یہی کرتی ہیں۔ آپ میرے لیے کچھ لیتی ہیں تو سیم وہی چیز اس کے لیے بھی لیتی ہیں۔ آپ کیوں کرتی ہیں ایسا؟"

وہ ساکت وصامت حماد کو دیکھ کر رہ گئیں۔ حماد یہ کیا سوچ رہا تھا؟ کیا کہہ رہا تھا؟

انہوں نے کبھی بھی حماد کی کوئی چیز فارس کو نہیں دی تھی۔ استعمال شدہ بھی نہیں۔ انہوں نے کبھی بھی حماد کے سامنے کھل کر فارس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ گھر میں اس کا نام بھی نہیں لیتی تھیں۔ لیکن حماد جانتا تھا فارس ان کے لیے کتنا اہم تھا۔ شیرازی مینشن میں وہ ان کی توجہ، اہتمام اور محبت دیکھ چکا تھا۔ وہ تب بھی غصے میں آ جاتا تھا، اب بھی آ گیا تھا۔ جس طرح وہ اپنی چیزیں شیئر نہیں کرتا تھا، اس طرح رشتوں میں شیئرنگ بھی اسے پسند نہیں تھی۔ دادا اس کا تھا، باپ بھی صرف اس کا تھا۔ ماں بھی صرف اس کی ہونی چاہیے۔

اسے اندازہ ہی نہ ہوا۔ کب کس طرح وہ بے ضرر سا بچہ حماد کے حواسوں پر سوار ہونے لگا۔ وہ تو ہمیشہ محتاط ہو کر رہتی تھیں۔ اپنی ذمہ داریوں میں انہوں نے کبھی کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔ حماد کے پاس سب کچھ تھا۔ اسے محبتوں کی، رشتوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اس کے باوجود اس کا یہ ردعمل اسے حیران کر رہا تھا۔

" الگ سے لیتی ہوں بیٹا! تمہارا حصہ تو نہیں دیتی کسی کو!" صدمے سے نکل کر پیار سے سمجھانا چاہا۔

" پر کیوں؟؟ آپ میری ماں ہیں۔ آپ اس لڑکے کے لیے۔ آپ اس طرح کیوں کرتی ہیں؟ مجھے اس طرح کچھ بھی شیئر کرنا اچھا نہیں لگتا۔!"

" او کے فائن! میں نہیں خرید رہی۔ واپس چلو اور اپنی ہوڈی اٹھاؤ۔" اسے کندھوں سے تھام کر مسکراتے اس کا موڈ بحال کرنا چاہا۔ بگڑے تیوروں کے ساتھ اس نے ہوڈی تو خرید لی مگر واپسی پر بھی اپنا موڈ خراب رکھا۔

جمیلہ داؤد کے لیے اس کا ردعمل سمجھ سے باہر رہا۔ وہ اس کے رویے اور اشتعال کو سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہی تھیں۔

☆☆☆

انہوں نے ہارون شیرازی سے ذکر کرنا چھوڑ دیا تھا مگر اعظم شیرازی سے وہ اب بھی فارس کے معاملے میں الجھ پڑتی تھیں۔ کسی خوف یا دباؤ میں آئے بغیر وہ اب بھی انہیں احساس دلاتی رہتی تھی۔ اس دن بھی انہوں نے یہی کیا تھا۔ وہ اسٹڈی روم میں تھے جب وہ اندر داخل ہوتے ہی شروع ہو گئی تھیں۔ وہ ایک بار پھر فارس کو اپنے اور ان کے درمیان لے آئی تھیں۔

" تمہیں اندازہ بھی ہے تم کس کے لیے اسٹینڈ لینے کی کوشش کر رہی ہو؟؟" پتھر دل موم نہیں ہوتا تھا مگر وہ ان پر حیران ہوتے

تھے۔ صحیح حیران ہوتے تھے۔ بھلا جو سوتیلی ہوں، وہ سگوں جیسا برتاؤ کیسے کرسکتی ہیں؟

"میں تمہیں بہت ذہین سمجھتا تھا۔ مگر غلط تھا۔"

"بے حسی ذہانت ہوتی ہے؟"

"ایک ماں اپنی اولاد کی خاطر بے حس ہی اچھی لگتی ہے!"

انہوں نے اعظم شیرازی کو تاسف سے دیکھا۔

"جس بچے کی تمہیں اتنی فکر ہورہی ہے۔ ذرا سوچا ہے، کل وہ حماد کے لیے۔ تمہارے لیے کتنے پرابلم کھڑے کرسکتا ہے؟"

"اور یہ جو ظلم۔ ہم سب مل کر اس پر کر رہے ہیں۔ آپ کا خیال ہے یہ ظلم ہماری زندگیوں میں آسانیاں لائے گا؟؟"

اعظم شیرازی نے لب بھینچ کر اپنی بہو کو دیکھا۔

"تمہیں سمجھانا ناممکن ہے!" انہوں نے تسلیم کیا۔

"آپ اس پر بہت ظلم کر رہے ہیں!"

اعظم شیرازی نے رخ موڑ کر انہیں دیکھا، کتاب رکھ کر ان کے پاس آگئے۔

"تمہیں لگتا ہے میں اس پر ظلم کر رہا ہوں؟" سوالیہ ابرو اٹھائے کچھ سنجیدگی مگر تحیر سے بولے۔ وہ خاموش رہی۔

"میں اسے adoption کسی کو گود لینے کے لیے دے سکتا تھا۔ کسی بھی ملک میں اسے بھیج دیتا۔ کسی ایسی جگہ جو پاکستان سے بہت دور ہوتی۔"

ان کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ اور لہجہ برفیلا ہورہا تھا۔ "یا پھر میں اسے کسی حادثے کا شکار کر دیتا۔ اتنی پلاننگ کے ساتھ کہ کسی کو شک بھی نہ ہوتا کہ کیا ہوا ہے۔ ایک پانچ چھ سال کا بچہ سوئمنگ پول میں ڈوب کر مر گیا۔ اسے سوئمنگ نہیں آتی تھی اس لیے۔" انہوں نے بے رحمی سے اپنا جملہ مکمل کیا۔ رک کر اپنے ہاتھ اٹھائے۔ ذرا سا مسکرائے بھی۔ جمیلہ کا حلق خشک تھا۔ آنکھیں تر ہوگئیں۔ وہ دوپٹے کو سختی سے بھینچے ان کی آنکھوں میں کچھ بے یقینی سے دیکھ رہی تھیں۔

اعظم شیرازی اتنی سختی اور برودت کے ساتھ اپنے پوتے کی بات کر رہے تھے۔ وہ پوتا جس کی ماں خاندانی نہیں تھی۔ وہ نکاح جس میں وہ شامل نہیں تھے۔ وہ رشتہ جو ان کے معیار کا نہیں تھا۔

"لیکن میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ یوسٹل تھنک۔ کہ میں۔ اعظم شیرازی۔ اس پر ظلم کر رہا ہوں؟" وہ جھوٹ نہیں کہہ رہے تھے۔ وہ ایسے ہی تھے۔ ہر بات واضح کر دیتے تھے۔ کہہ رہے تھے تو ایسا کر بھی سکتے تھے۔

ان کا ایک ایک لفظ ان کے سخت ارادوں کی طرح ان کی شخصیت کے ہر پہلو کو ان پر عیاں کر رہا تھا۔

"حماد کے علاوہ تم کسی اور کے لیے فکر کرتی ہو تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔" انہوں نے بہت نرمی اور پیار سے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ’’ہماری فیملی مکمل ہے جمیلہ۔ تم اسے ادھورا کرنے پر کیوں تلی ہوئی ہو؟‘‘

وہ آنکھوں میں نمی لیے سر جھکائے رہیں۔

بازو تھپتھپا کر وہ آرم چیئر پر براجمان ہوگئے۔

"ابھی تو آپ اسے ایک تھریٹ کے طور پر دیکھ رہے ہیں بابا۔ لیکن۔" آنکھوں میں نمی لیے دانستہ رک گئیں۔ انہوں نے یونہی سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"لیکن جب کبھی آپ کا دل اس کے لیے نرم پڑا۔ تو آپ پر آپ کے رویے اور ان فیصلوں کا پچھتاوا کتنا بھاری پڑ جائے گا۔
"

وہ فائل کھولتے ہوئے مسکرا دیے۔ "میں اپنے فیصلوں پر کبھی نہیں پچھتایا۔ اچھی طرح سے جانتا ہوں، میں کیا کر رہا ہوں۔ اور کس لیے کر رہا ہوں۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے!"

وہ چند لمحوں تک انہیں دیکھتی رہیں پھر بوجھل دل کے ساتھ جانے کے لیے مڑ گئیں۔

ہاں! وہ کیوں پچھتائیں گے؟ جب اسے اپنا خون تسلیم ہی نہیں کیا تو یہ احساسات کیونکر پیدا ہو سکتے تھے؟ رحم کیسے جاگ سکتا تھا؟ محبت کیسے ہو سکتی تھی؟

"کیا میں چاہوں گا، اس گھٹیا عورت کی نشانی میرے بیٹے کی زندگی میں موجود رہے؟"

فارس کی پہچان ان کے نزدیک صرف اور صرف اس کی ماں تھی۔ وہ آرزو جہانگیر کا خون۔ آرزو جہانگیر کا بیٹا تھا۔

اس دن کے بعد سے انہوں نے دوبارہ کبھی اعظم شیرازی سے فارس سے متعلق کوئی بات نہیں کی تھی۔

☆☆☆

اعظم شیرازی امریکا آتے تو دو تین ماہ گزار کر ہی جاتے۔ فیملی گیدرنگ، آؤٹنگز، کچھ آفیشلز کے ساتھ ڈنر، کچھ تقاریب میں شرکت کرتے، میٹنگز اٹینڈ کرتے اور چلے جاتے۔ حماد شیرازی میں ان کی جان اٹکی تھی۔ وہ خاص طور پر اس کے لیے آتے تھے۔

شیرازی انٹرپرائز کا ہیڈکوارٹر پاکستان میں تھا تو وہ زیادہ تر پاکستان میں ہی رہنا پسند کرتے۔ مگر جب بھی آتے ان کی ایک مخصوص سی روٹین ہمیشہ انہیں الجھا دیتی۔ وہ ویک اینڈ پر خصوصاً پاکستان کال کرتے، ہر ایک رپورٹ لیتے مختصر اور جامع بریفنگ مگر آغا علی سے ہمیشہ ان کی تفصیلی بات ہوتی۔ وہ فون کان سے لگائے خاموشی سے سنتے جاتے۔ اور آخر میں چند ایک حکم ہوتے۔ اور کچھ ضروری باتیں۔

وہ اچھی طرح سے جانتی تھیں فارس کی تمام تر ذمہ داریاں انہوں نے آغا علی کو سونپی تھیں۔اور یہ طویل کالز بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھیں۔

انہیں ہرگز علم نہیں تھا کہ وہ فارس کے معاملات اس طرح سے دیکھتے ہیں،اس پر ایسے۔اور اس طرح نظر رکھتے ہیں۔

کیا ایک تیرہ سال کے لڑکے سے انہیں واقعی میں کوئی خطرہ پیش آسکتا ہے!؟ وہ سوچتیں اور حیران ہوتیں۔

یہ ان کا رویہ ہی تو تھا جو فارس کو شیرازی خاندان سے متنفر کر رہا تھا۔نفرت کی جڑ ان کی وجہ سے مضبوط ہو رہی تھی۔عناد کی یہ دیوار ان کی ہی وجہ سے قائم ہو رہی تھی۔اور انہیں یہ لگتا تھا کہ خطرہ فارس کی طرف سے ہوگا!؟ پہل تو وہ خود کر رہے تھے۔وہ اس معصوم دل میں عداوت کو خود اپنے رویے اور فیصلوں سے پروان چڑھا رہے تھے۔انہیں یہ بات سمجھ میں کیوں نہیں آتی تھی؟؟

" کسی کو آپ نفرت دیں تو بدلے میں وہ آپ کو محبت تو نہیں دے گا بابا!" اس نے بغیر کوئی حوالہ دیے یونہی کہہ دیا۔

وہ میں ہیٹن بیچ پر ٹہل رہے تھے۔جب حماد کے ان سے قدرے دور ہونے پر جمیلہ داؤد نے کہا۔انہوں نے گردن موڑ کر اپنی بہو کو دیکھا۔

" تمہیں کیوں لگتا ہے۔مجھے اس تھرڈ کلاس عورت کے بیٹے سے کوئی محبت چاہیے!" ان کا لہجہ ایک دم سے استہزائیہ ہوا تھا۔

" آپ بہت غلط کر رہے ہیں!" نا چاہتے ہوئے بھی وہ کہہ گئیں۔سر جھکا کر۔نظریں گرا کر۔

" یہ تو وقت ثابت کرے گا میں کتنا صحیح۔اور کتنا غلط ہوں!"

جیبوں میں ہاتھ ڈالتے وہ دھوپ میں بالکل سامنے دیکھنے لگے۔" ایک دن تم بھی تسلیم کرو گی کہ میرا ہر فیصلہ درست تھا!"

آہستگی سے قدم اٹھاتے آگے بڑھ گئے اور جمیلہ داؤد ہمیشہ کی طرح اپنے ہی خول، اپنے ہی دائرے میں، اپنی ہی فکروں سمٹی کھڑی رہ گئیں۔

☆☆☆

مسز درانی نے شیرازی ہاؤس میں منعقد ہونے والی اس دعوت میں اعظم شیرازی کا بھرپور جائزہ لیا تھا۔ان کا سینہ چوڑا تھا، کمر بالکل سیدھی، پیٹ اندر کو تھا۔رعب دار اور گریس فل سی شخصیت تھی۔بے تحاشا بھورے اور سفید بال جن میں کہیں کہیں سیاہی بھی جھلکتی تھی۔سیاہ اور سفید کا یہ امتزاج ان کی شخصیت کی جاذبیت میں اضافے کا باعث بنتا تھا۔وہ خود کو بہت فٹ رکھتے تھے۔اپنی خوراک اور صحت کا بہت خیال رکھتے تھے۔انہیں دیکھ کر آج بھی کئی خواتین کے دل دھڑک اٹھتے تھے۔

ان کا خیال تھا کہ آج بھی اگر وہ ان کے رشتے کی بات کریں گی تو انہیں بہترین سے بہترین رشتہ مل سکتا ہے۔

کھانے کی میز پر انہوں نے ایسے ہی ذکر چھیڑا تو وہ ہنس پڑے۔جمیلہ انہیں دیکھ کر رہ گئیں۔گو کہ ان سے ناراض تھیں۔اور

بہت کم بات کرتی تھی۔مگر مسز درانی کی بات پر جس طرح وہ ہنسے۔وہ انہیں نظر انداز نہیں کر سکیں۔وہ انہیں اپنی شخصیت سے کچھ مختلف سے لگے۔وہ بہت کم ہی ہنسا کرتے تھے۔زیادہ تر ان کے تاثرات صرف حماد کی موجودگی میں ہی خوش گوار ہوا کرتے۔

" کیا میں آپ سے کوئی غلط بات کہہ رہی ہوں جو آپ اس طرح ہنس رہے ہیں۔بھئی، آپ کو کوئی خاتون انکار نہیں کرے گی۔لکھوا لیں مجھ سے۔۔"

" اس اسٹیٹس اور جائیداد کے ہوتے ہوئے واقعی میں کوئی " خاتون " انکار نہیں کرے گی۔"

ہارون کی ایک لمحہ کے لیے ساکت ہوا تھا۔ چمچ ہاتھ میں لیے،اس نے ذرا سی نظر اٹھا کر باپ کو دیکھا۔

" کوئی ایسی خاتون آپ کو مل جائے جسے آپ یہ بتائیں کہ میں خالی ہاتھ ہوں، میرے پاس کچھ نہیں ہے۔اور وہ پھر بھی میرے ساتھ رہنے پر آمادہ ہو جائے۔اس لیے کہ میں اپنے اصولوں کا پابند اور اپنی بات پر قائم رہنے والا انسان ہوں۔تو پھر کچھ سوچا جا سکتا ہے!" معمول کے برعکس وہ کچھ خوش گوار موڈ میں لگ رہے تھے۔

" تو آپ یہ کہتے نا کہ آپ شادی ہی نہیں کرنا چاہتے!" مسز درانی برا مان گئیں۔

سب ہی ہنس پڑے۔ماسوائے ہارون شیرازی کے۔

اعظم شیرازی مبہم سا مسکراتے اپنی پلیٹ پر جھک گئے۔جمیلہ نے بھی نظر ہٹا لی۔کہ جانتی تھیں اشارہ کس طرف تھا۔وہ ابھی تک ہارون شیرازی کی اس غلطی کو معاف نہیں کر پائے تھے۔آج بھی آرزو جہانگیر کا وجود ان کے درمیان آ جاتا تھا۔

فارس کی صورت۔ماضی کی صورت۔اور شاید یہی وجہ تھی کہ ہارون کو دن بدن شدت سے اپنی اس غلطی کا احساس ہو رہا تھا جو اس نے محبت میں مجبور ہو کر کر ڈالی تھی۔وہ نکاح جو اس کا آرزو جہانگیر سے ہوا تھا۔وہ رشتہ جو آٹھ سال تک قائم رہا تھا۔وہ محبت جو پیسوں کے عوض اسے چھوڑ کر گئی تھی۔وہ پیسے جو اعظم شیرازی نے اسے آفر کیے تھے۔حقیقت دیر سے ہی سہی مگر ہارون شیرازی پر کھل گئی تھی۔پہلے صرف اس بات کا غصہ تھا کہ آرزو نے طلاق لے لی تھی۔اب اس بات کی نفرت تھی کہ اس کے باپ سے معاہدہ کر کے لی تھی۔اس دن ہارون شیرازی کا غصہ اور اشتعال دیکھنے لائق تھا۔

" یہ تو ایک سمپل سا ٹیسٹ تھا۔میں دیکھنا چاہ رہا تھا، وہ عورت تمہارے ساتھ کتنی مخلص ہے!" اعظم شیرازی ایک مختصر سا جملہ کہہ کر بری الذمہ ہو گئے۔اور وہ چاہ کر بھی نہ اختلاف کر سکا تھا نہ ہی کوئی احتجاج۔

محبت نے اسے توڑا تھا۔

اور بہت بری طرح سے توڑا تھا۔

☆☆☆

اعظم شیرازی پاکستان جا رہے تھے۔ روانگی کے وقت جمیلہ داؤد نے ایک بیگ الگ سے تیار کر کے انہیں دے دیا۔

"یہ فارس کے لیے ہے!" انہوں نے سوالیہ ابرو اٹھائی تو جواب دیا۔

کچھ دیر تک وہ اپنی جگہ کھڑے رہے۔

"اس کا کیا کروں؟؟"

"اس تک پہنچا دیں۔" حماد اپنے دوستوں کے ساتھ آؤٹنگ کے لیے گیا ہوا تھا۔ اندر داخل ہوا اور اپنی جگہ رک گیا۔ وہ اس کی موجودگی سے قطعی بے خبر اعظم شیرازی کی طرف متوجہ تھیں۔

"تمہیں اتنا یقین کیوں ہے کہ میں یہ سامان اس تک پہنچا دوں گا؟"

"چیزوں سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ان کا انتظام تو آپ نے بھی خوب کر رکھا ہے۔"

وہ نوٹ کر رہے تھے کہ وہ پہلے کی طرح کھل کر ان سے بات نہیں کرتی تھیں۔ انہوں اس نے تو فارس کا ذکر کرنا بھی تقریباً چھوڑ دیا تھا۔

"ضروری نہیں کہ میرا نام لیں۔ بس پہنچا دیں!"

اعظم کی نظر ان کے عقب میں حماد پر پڑی تو سنجیدہ سے تاثرات ایک دم سے نرمی میں ڈھلے۔ بیگ سے نظر ہٹاتے اس کے پاس چلے گئے۔

''آپ جا رہے ہیں بابا!'' وہ ان کی بانہوں میں سما گیا۔

"ہوں!" اس کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ اس کے بالوں کو بھی بکھیر دیا۔

"میں بھی آپ کے ساتھ پاکستان جانا چاہتا ہوں پر ڈیڈ۔ وہ کچھ مانیں تب نا!"

"تمھارے ڈیڈ کو بھی میں ہی منع کرتا ہوں!"

جمیلہ نے وہ بیگ ان کے سوٹ کیس پر رکھ دیا۔

"حالات کچھ بہتر ہو جائیں تو پھر ہی پاکستان آنا!"

"اگلے سال کا وعدہ کر کے جائیں۔ کہ آپ یہاں نہیں آئیں گے۔ بلکہ میں آپ کے پاس آؤں گا!"

"وعدہ!" انہوں نے کہا۔ جمیلہ داؤد اور حماد شیرازی سے مل کر وہ باہر چلے گئے۔

ملازم مستعد تھے، باہر ان کی گاڑی بھی تیار کھڑی تھی۔

سیاہ بیگ ان کے سوٹ کیس ہینڈل کے ساتھ اٹکا رہ گیا تھا۔ جمیلہ داؤد بھاری دل کے ساتھ بیرونی دروازے کے اسٹیپس پر

کھڑی تھیں۔ البتہ دادا کے جاتے ہی حماد کے تاثرات پل بھر میں بدلے تھے، آنکھوں میں خفگی سی آ گئی تھی۔ وہ جانتا تھا سیاہ بیگ میں کیا تھا، اور کس کے لیے تھا۔

☆☆☆

امریکا میں یہ ان کا تیسرا سال تھا، اعظم شیرازی کے بزنس پارٹنر فواد خاکوانی کے بیٹے کی شادی تھی۔ انہیں بھی خصوصاً مدعو کیا گیا تھا۔ اعظم شیرازی نے فون پر رابطہ کر کے ٹکٹ کی بات کی تو کچھ دیر تک تو انہیں اپنی سماعت پر یقین ہی نہیں آیا۔ خوشی سے آنکھیں نم ہو گئیں۔ حماد ایک ماہ پہلے ہی اپنے دادا سے ملنے پاکستان گیا ہوا تھا۔ پندرہ دن بعد انہیں بھی ہارون کے ساتھ پاکستان جانا تھا۔ سب معاملات طے ہو چکے تو انہوں نے فارس کے لیے شاپنگ کی۔ اس کے لیے شرٹس، ہوڈیز اور ٹراوزرز خریدے۔ بیگ خریدا۔ کچھ کتابیں منتخب کیں۔ وہ اتنی خوش تھیں کہ پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ سینے سے بوجھ سرکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

ہاں وہ ان سے شدید ناراض ہوگا۔ لڑے گا۔ روئے گا۔ بات نہیں کرے گا مگر وہ اسے منا لیں گی۔ وہ ہمیشہ اسے منا لیتی تھیں۔ جب بھی اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیتی تھیں۔ اس کا نام لیتی تھیں۔ اس کا ہاتھ پکڑتی تھیں تو وہ اپنی تمام تر خفگی کے باوجود نرم پڑ جاتا تھا۔ وہ ان سے زیادہ دیر ناراض نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ خیالوں میں سب ترتیب دیتی جا رہی تھیں۔ سب اچھا اور پہلے جیسا کرنے کا سوچ جا رہی تھیں۔ مگر ہمیشہ ویسا تو نہیں ہوتا۔ جیسا آپ سوچتے ہیں۔ جیسا آپ چاہتے ہیں۔

جمیلہ داؤد کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آنے والا تھا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ پاکستان پہنچنے تک اسے کتنی بری خبر ملنے والی ہے۔

☆☆☆

مجھے سنو،

جیسے کوئی بارش کو سنتا ہے

سال گزر جاتے ہیں

اور لمحے پلٹ آتے ہیں

کیا اگلے کمرے میں قدموں کی چاپ سنتی ہو؟

وہ جو یہاں نہیں اور وہاں بھی نہیں ہیں

سنو،

تم انہیں کسی اور زمانے میں سنتی ہو

جو ہے نہ گزرے کل کا

نہ آنے والے کا،

جو ہے تو صرف ابھی،

ہاں ابھی کا

مجھے سنو،

جیسے کوئی بارش کو سنتا ہے

☆☆☆

اس کے حواس کچھ بیدار ہوئے تو درد کا احساس ہوا۔خون سے آدھا چہرہ تر ہو رہا تھا۔آنکھیں نہیں کھل رہی تھیں۔

قدموں کی آہٹ کے ساتھ ہی مخصوص دھن کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔لبوں کو گول کر کے وہ جانے کب سے گنگنا رہا تھا۔

بالوں سے پکڑ کر سر اٹھایا۔اب وہ اس کا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔کپڑا ہٹا دیا۔چندھیا دینے والی روشنی آنکھوں کو چیرتی ہوئی محسوس ہوئی۔کمرہ تاریک تھا،سر گھوما ہوا۔چوٹ گہری۔اس نے کس قدر کوشش سے سر اٹھانے کی سعی کی۔ہاتھ بندھے ہوئے تھے،فرش ٹھنڈا تھا۔ٹانگیں بے جان معلوم ہوتی تھیں۔بمشکل سانس لیتے اس نے اس درد کو سہا جو سر کے پچھلے حصے سے اٹھ رہا تھا۔

"یہ حماد تو نہیں ہے!" کرخت۔بھاری آواز۔

"گاڑی میں یہی لڑکا تھا صاحب!"

کسی کو گھونسا پڑا تھا۔

"مجھے معاف کر دیں صاحب!غلطی ہو گئی!بہت بڑی غلطی ہو گئی!"

تاریک کوٹھری میں کوئی اور بھی تھا۔گھٹنوں کے بل گرتا،کچھ روتا،گڑگڑاتا ہوا۔آواز پہچانی ہوئی سی لگی۔اس نے ایک بار پھر پلکیں جھپکائیں۔ایک بار پھر دیکھنے کی سعی کی۔منظر دھندلا تھا۔

سانس لیتے کروٹ بدلی۔ہاتھوں کو جنبش دی۔داہنے کندھے اور گردن سے سینے تک کا حصہ درد کی لپیٹ میں آ گیا۔اسے گاڑی کا ٹکراؤ یاد آیا۔فائرنگ کی آواز پھر سے سنائی دی،شیشے ایک بار پھر ٹوٹے تھے۔وجود میں کھبتے محسوس ہوئے تھے۔

"صاحب!حماد شیرازی اسی گاڑی میں تھا،میں یقین سے کہہ رہا ہوں۔میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔" آواز گھٹ گئی۔گردن کسی آہنی شکنجے میں آ گئی تھی۔

"تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے،تمہاری اس غلطی نے میرے لیے کتنا بڑا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے؟"

"صاحب۔معاف کر دیجیے!" یہ دوسری آواز تھی۔

لب بھینچ کر اس نے ایک بار پھر سر اٹھایا۔دھند لمحے بھر کے لیے چھٹ گئی تھی۔نڈھال آنکھوں نے وہ چہرہ دیکھا۔آغا علی کا دست راست۔اعظم شیرازی کے خاص ترین آدمیوں میں سے ایک تھا وہ۔روتا گڑگڑاتا،اپنی زندگی کی بھیک مانگتا ہوا،پستول کی نوک اس کی کنپٹی کے ساتھ لگی تھی۔

دھندلی سی یادداشت میں کوئی بھولا بسرا منظر تمام تر اذیتوں کے ساتھ واضح ہوا۔

"آپ کی جیپ کہاں ہے؟" اس نے پوچھا تھا۔

"خراب ہے۔مکینک کو ٹھیک کرنے کے لیے دی ہے۔کچھ دن لگ جائیں گے۔" آغا علی کہہ رہا تھا۔

کار ایکسیڈنٹ سے پہلے،روانگی کے وقت دوسری شاہراہ پر اس نے جیپ دیکھی تھی۔جیپ میں حماد تھا۔اس کی گاڑی بدلی گئی تھی۔اسے بحفاظت کہیں پہنچانے کے لیے اس کی زندگی داؤ پر لگائی گئی تھی۔اسے صدمہ ہوا۔مگر غلط صدمہ ہوا۔اس کی زندگی اہم نہیں تھی۔اس کے ساتھ ایسا کیا جا سکتا تھا۔

اس نے ایک بار پھر درد کی لہر کو دباتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی اور ایک بار پھر منہ کے بل گرا۔سر کا درد ایک دم سے بڑھ گیا۔حلق سے کراہ نکل گئی۔

اس شخص نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔وہ فارس وجدان کے عین سامنے پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔آنکھوں میں غصہ تھا،نقاب میں،لپٹا چہرہ اور تاثرات متحمل سے تھے۔

بالوں سے پکڑ کر اس کا سر اٹھایا۔

"یہ کون ہے؟؟" وہ اب اسے بغور دیکھ رہا تھا۔فارس کی پیشانی سے خون کی دھار کان اور پھر گردن سے اس کی سفید شرٹ کو مزید رنگنے لگی۔

"صاحب!اعظم صاحب کے ملازم کا بیٹا ہے۔" عقب میں عبدل نے جھکے سر کے ساتھ کانپتی آواز میں کہا تھا۔

"ملازم کا بیٹا؟" استفہامیہ نگاہوں سے اس نے فارس کا چہرہ،پھر شرٹ کا کالر،سویٹر،جینز اور جوتے دیکھے۔

"ملازموں کے بیٹے کیا اس طرح برانڈڈ کپڑے پہنتے ہیں؟" استہزائیہ انداز میں کہتے اب کے اس نے عبدل کو دیکھا۔

داہنے ہاتھ سے اپنے پسٹل کی نوک سے سر کھجایا۔

عبدل نے گھبرا کر فارس کو دیکھا پھر گرتا پڑتا نقاب پوش کے سامنے جھک گیا۔اب وہ اپنی سوچ اور فہم کے مطابق جو کچھ اس کے بارے میں جانتا تھا،بتاتا جا رہا تھا۔

"انٹرسٹنگ۔" پوری بات سن لینے کے بعد وہ اسے چھوڑ کر اٹھ گیا۔عبدل سر جھکاتا مؤدب سا پیچھے ہو کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔

"تو تم مجھے یہ بتانا چاہتے ہو کہ یہ کسی وجدان کا بیٹا ہے جو کہ اعظم شیرازی کا آدمی تھا؟"

"جی صاحب!"

"کبھی ملے ہو اس سے؟"

"جی؟" چونک کر سر اٹھایا۔

"وجدان سے ملے ہو کبھی؟ تم کافی عرصے سے کام کر رہے ہو۔اعظم شیرازی کے ہر آدمی کو تم سے بہتر اور کون جان سکتا ہے؟"

عبدل نے کچھ ہکلا کر اسے دیکھا۔وہ کسی "وجدان" سے کبھی نہیں ملا تھا۔خشک لبوں کو تر کرتے اس کی نگاہ فارس پہ گئی۔جس کی بوجھل آنکھوں میں شاک اور صدمہ اترا ہوا تھا۔خوف اور وحشت ٹھہری ہوئی تھی۔

جانے ان آنکھوں میں کیا تھا کہ وہ لمحے بھر کے لیے اپنی جگہ ٹھہر سا گیا۔وہ اس کے سب سے چھوٹے بیٹے کا ہم عمر تھا۔جسے بچانے کے لیے اسے مجبوراً یہ سب کرنا پڑا تھا۔

"جی۔جی صاحب! جانتا ہوں اسے۔"

"ٹھیک ہے۔کافی ہے اتنا۔" ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔عبدل ایک سہمی ہوئی سی نگاہ فارس پر ڈالتا کچھ پریشانی سے چپ ہو گیا۔

نقاب پوش پنجوں کے بل بیٹھا اب اسے دیکھ رہا تھا۔اس کی کھوجتی پرکھتی آنکھوں میں عجیب سا تاثر نظر آ رہا تھا۔وہ اسے جانچتے ہوئے جیسے اس کی اہمیت کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔وہ اس کی ذات میں اعظم شیرازی کی کوئی کمزوری ڈھونڈنا چاہ رہا تھا۔ایک مردہ ملازم کا بیٹا بھلا ان کے کس کام آ سکتا تھا؟ وہ اس کے ذریعے کیا پا سکتے تھے؟ ایسا کون سا دباؤ تھا جو وہ اعظم شیرازی پر ڈال سکتے تھے؟؟ خونی رشتہ ہوتا تو الگ بات تھی۔مگر وہ تو کچھ بھی نہ تھا۔

"تو تمھارے مالک نے۔تمہیں ہمارے آگے ڈال دیا تا کہ وہ اپنے پوتے کو بچا سکے!" وہ کافی دیر تک ہنستا رہا۔اس کے غم پر، دکھ پر، صدمے پر بے خبر ہو کر ہنستا رہا" وہ مجھے ہمیشہ حیران کرتا ہے۔مگر اس بار۔۔ناقابلِ یقین!............"

بمشکل سانس لیتے فارس نے لب بھینچ لیے تھے۔

"تو اب۔تمھارا کیا کریں؟" چمکتی سلگتی آنکھیں اس کے چہرے پر جم گئیں۔"تم ہی بتا دو لڑکے۔اب ہم کیا کریں؟" اس کا

انداز استہزائیہ تھا۔"اب تو تمھارا باپ بھی زندہ نہیں ہے۔جو تمھارے بڑے صاحب کے پاؤں پکڑ کر منت کرے کہ میرے بیٹے کو بچالو۔"

کوئی شے اس کے دل کے آر پار ہوئی تھی۔کوئی زخم پھر سے ہرا ہوا تھا۔

"بھئی،ایسا کچھ ہو جاتا تو ہمارے وارے نیارے ہو جاتے۔یہ جو ہم نے اتنی محنت کی ہے۔اس کے بدلے بھاری تاوان وصول کرتے۔کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں؟" گردن موڑ کر اپنے آدمیوں سے تصدیق چاہی۔انہوں نے کچھ خفیف ہو کر شرمندگی سے سر جھکا لیے تھے۔جانتے تھے کہ ان کے "مالک" کو پیسوں کی تو سرے سے کوئی کمی ہی نہیں تھی۔

اپنے کپکپاتے ہاتھوں کو بھینچ کر فارس نے خشک پڑتے لبوں کو دبایا۔اس کی آنکھیں مکمل بھر گئی تھیں۔اس کے نیم کھلے لب کپکپا رہے تھے۔وجود بے جان اور ٹھنڈا پڑ رہا تھا۔مگر وہ پورے ہوش و حواس میں اسے دیکھ رہا تھا۔اسے سن رہا تھا۔

"بھئی......ایسے نہیں دیکھو مجھے۔ترس آ جائے گا تو میں ایک گولی سے ہی تمہارا کام تمام کر دوں گا"

اس کی سسکیاں سینے میں تھیں۔اور وہ باوجود کوشش کے بھی انہیں دبا نہیں سکا۔

"ارے تم تو۔رو رہے ہو؟؟" وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔" تمہیں لگ رہا تھا،تمہارا صاحب اگر تمہیں اتنے مہنگے اسکول میں پڑھنے بھیجتا ہے، یا تمھیں یہ مہنگے کپڑے پہننے کو دیتا ہے تو اس کا مطلب ہے تمھاری پرواہ کرتا ہو گا۔!"

وہ اس کے سامنے جم کر بیٹھ گیا۔چہرے سے نقاب بھی ہٹا دیا۔نیک تاریکی میں اس کے خدوخال کچھ مبہم،کچھ دھندلے سے تھے۔

اسے اس معصوم لڑکے کی بے وقوفانہ سوچ پر ہنسی آ رہی تھی۔کتنا بڑا صدمہ تھا ایک نوکر کے لیے۔کہ مالک نے اسے چارے کے طور پر کسی کے آگے ڈال دیا تا کہ وہ خود سے جڑے رشتوں کو محفوظ رکھ سکے۔

”تمہیں ایک پتے کی بات بتاتا ہوں۔ہم لوگ۔اکثر ایسا کرتے ہیں۔خوب پیسہ لگاتے ہیں،اہمیت دیتے ہیں،اعتماد جیتتے ہیں۔اور پھر جب وقت آ جائے تو۔۔" ہاتھ پھیلا کر،ابرو اٹھاتے چٹکی بجائی۔"اپنے فائدے کے لیے قربان کر دیتے ہیں جیسے کہ تم۔کافی انویسٹ کیا ہو گا انہوں نے تم پر۔کیونکہ اگر گاڑی میں تم نہ ہوتے۔تو حماد کی جلی ہوئی لاش ملتی اسے۔"

آخری جملے میں اس کا لہجہ کافی سے زیادہ سرد ہو چکا تھا۔اس کے اندر،بہت غصہ اور بے انتہا نفرت بھری ہوئی تھی۔کوئی پرانی مخاصمت تھی۔کوئی عداوت۔یا انتقام۔اس کا رویہ،اس کے ارادے،اس کی تمام پلاننگز یہی بتلاتی تھیں۔وہ اپنی ناکامی پر مشتعل ہو رہا تھا۔بس نہیں چل رہا تھا وہ اعظم شیرازی کے اس ملازم لڑکے کو ابھی کے ابھی جان سے مار ڈالے۔

اس نے اپنی پسٹل کی نالی فارس پیشانی سے ٹکا دی۔

خیال تھا وہ جس خوف میں ہے تو اپنی زندگی کی بھیک مانگتے ہوئے روئے گا، گڑگڑائے گا، مگر اس نے لب بھینچ کر آنکھیں بند کر کے، اپنا سر جھکا کر اسے حیران کر دیا۔ وہ لڑکا مرنے کے لیے مکمل تیار بیٹھا تھا۔

"جیسا مالک ہے، ملازم بھی ویسے ہیں!" گردن سے دبوچ کر اس نے ٹریگر پر ذرا سا دباؤ بڑھایا۔ عبدل نے کچھ بے قراری سے پہلو بدل لیا۔

گن کچھ دیر تک اس کی کنپٹی سے لگی رہی۔ پھر اس نے ہٹا لی۔

"ایسے نہیں۔ اور اتنی آسانی سے بھی نہیں۔" بڑبڑاتے ہوئے اٹھ گیا۔ پھر اپنے آدمی کی طرف مڑا۔ "شیر دل سے کہو، اس لڑکے کو لے جائے!"

عبدل کے پیشانی پسینے سے تر ہوئی تھی۔ وہ پشت پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ مگر ہاتھوں میں کپکپاہٹ واضح ہو رہی تھی۔ شیر دل کون تھا اور کیا کام کرتا تھا۔ یہ حقیقت اس سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔

"اور ہاں!" رک کر مڑا۔ "اس سے کہنا لاش ہم اعظم شیرازی کو ہی بھیجیں گے! اسے پتا چلنا چاہیے اگر حماد ہمارے ہاتھ آ جاتا تو ہم اس کا کیا حشر کرتے۔" کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ باہر نکل گیا۔ کوٹھری کا دروازہ بند ہوا تو تاریکی ہر سو پھیل گئی۔ فرش سے، دیواروں سے فارس وجدان کے اندر تک آ گئی۔

نم ساکت آنکھوں میں ویرانی لیے وہ متوحش سا اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا تھا۔

باہر تالا لگنے کی آواز کے ساتھ قدموں کی چاپ ابھری۔ دو لوگ آپس میں مخاطب تھے۔ مخصوص دھن کی وہ آواز اب دور ہوتی جا رہی تھی۔ یکا یک فائر کی آواز گونجی۔ سیڑھیوں کے اوپر سے کوئی لڑھکتا ہوا نیچے آ گرا تھا۔ نقاب پوش نے گہری سانس لے کر اپنی پسٹل کی نالی سے ایک بار پھر سر کو چھوا۔ "کتنی بار کہا ہے غلطی نہیں ہونی چاہیے! نہیں ہونی چاہیے۔ نہیں ہونی چاہیے! مگر یہ سمجھتے نہیں!" آہنی گیٹ زور سے بند کرتا وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

☆☆☆

صبح صبح ناشتے سے فارغ ہو کر جنت بھاگتی ہوئی شیرازی مینشن پہنچ گئی۔ مدحت سے معلوم ہوا فارس تو صبح دس بجے جا چکا ہے۔ اس کے ننھے سے دل کو صدمہ سا پہنچا۔ رونی صورت بنائے ڈاکٹر مصطفیٰ کے پاس گئی اور سسکیاں لے لے کر بتایا کہ اس پر کتنا ظلم ہو گیا تھا۔

"جنہ! وہ آپ سے کل شام کو مل کر تو گیا تھا!" انہوں نے اس کے آنسو پونچھتے، پیار کرتے یاد دلایا۔ وہ اس کے اس طرح ایموشنل ہونے پر حیران تھے۔

"کل شام ملا تھا۔ صبح بھی تو ملنا چاہیے تھا۔"

اس کا سرخ چہرہ اور بھری ہوئی آنکھیں دیکھ کر وہ مسکراہٹ ضبط کرتے نرم پڑے۔

"ہاں واقعی! بہت غلط کیا ہے اس نے۔ مل کر جانا چاہیے تھا اسے۔"

"اللہ حافظ بھی بولنا چاہیے تھا اس کو! ہاتھ بھی ہلانا چاہیے تھا۔"

"بالکل!" تائید میں سر ہلایا۔

"آپ اس کو ڈانٹیں گے نا؟"

"ضرور ڈانٹوں گا اسے۔ بھئی ایسے کیسے کر سکتا ہے وہ؟"

سلیم نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ اگر ان کی جنہ کو چیونٹی کے گھر سے بھی کوئی مسئلہ ملے گا تو وہ نکال لائے گی۔

وہ آنکھیں رگڑتی اپنے دوستوں کے پاس باہر چلی گئی۔ ان کو پوری بات بتائی۔

اس کے تمام کے تمام بیسٹ فرینڈز۔ مونی، کاکا، ٹیپو اور شاکا۔ سب کا خیال تھا، فارس نے بہت غلط کیا تھا۔ صبح سویرے ملے بغیر چلا گیا۔ دوست بھلا ایسے کرتے ہیں؟

"اب جب وہ آئے گا تو ہم اس سے بات نہیں کریں گے!" ٹیپو نے سب کو بڑی سمجھداری سے تلقین کی۔

وہ اب اس بڑی گھنی مونچھوں والے ڈراؤنے انکل کے پاس کھڑے اپنی خفیہ میٹنگ کر رہے تھے جو باغ والے دروازے کی رکھوالی کرتا تھا۔

"اس کے ساتھ باغ میں بھی نہیں جائیں گے اور اس کو مچھلیاں بھی نہیں دکھائیں گے!" کاکا نے ننھا سا مکا بنا کر فضا میں لہرایا۔

جنت لب بھینچے، آنکھیں رگڑ رگڑ کر صاف کر رہی تھی۔ ڈراؤنے انکل نے جیب سے رومال نکال کر دیا تو بڑی نزاکت سے لے لیا۔ ڈراؤنے انکل نے کچھ دیر پہلے انہیں اندر بھی جانے دیا تھا۔ ڈراؤنے انکل بہت اچھے تھے!

گن کو کندھے سے لگائے وہ چوکیدار اکتایا ہوا سا کھڑا تھا۔

صبر کا امتحان تھے یہ بچے۔ اتنی باتیں اور اتنے سوال کرتے تھے۔ اللہ کی پناہ!

فارس کب گیا تھا؟ کیسے گیا تھا؟ کس گاڑی میں گیا تھا؟ اور اتنی صبح کیوں گیا تھا؟! ان سے ملنے کیوں نہیں آیا تھا۔؟؟

اور اس گھنگھریالے سرخ بالوں والے ٹیپو نے تو حد کر دی۔ "آپ اس کو روک لیتے کہ تمھارے فرینڈز آئیں گے، ان سے مل کر جانا! آپ نے اس کو کیوں نہیں روکا۔"

ڈراؤنے انکل کا دل چاہا۔ وہ اپنا سر پیٹ لے۔

پتا نہیں اس کے بڑے صاحب نے اس دروازے پر اس کی ڈیوٹی کیوں لگا دی تھی؟ نہ یہاں کوئی خطرہ تھا۔نہ یہاں کوئی آتا جاتا تھا۔ماسوائے ان بچوں کے۔

کتنا شوق تھا اسے کہ وہ شیرازی مینشن کے بیرونی گیٹ پر رکھوالی کرے۔!

سرد آہ بھر کر پھر اس ٹولے کو دیکھا۔جو اپنی دوست کو دلاسا دیتے اب وہاں سے جا رہے تھے۔سکھ بھری سانس لے کر رہ گیا۔

کاش اس کے صاحب دروازہ پورا بند کر دیں تو ٹینشن ہی باقی نہ رہے۔

اسے نہیں پتا تھا ایسا ہونے والا تھا۔

ایسا سچ مچ میں ہونے والا تھا۔

☆☆☆

آغا علی کو اسلام آباد گئے ہوئے دو دن ہو چکے تھے اور وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔

مدحت کے لیے آغا علی کا شیرازی مینشن سے دور رہنا پریشانی اور اچھنبے کا باعث تھا۔ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اس طرح غیر حاضر رہے ہوں یا فون پر اپنی خیریت کی اطلاع نہ پہنچائی ہو۔ان کی روٹین ٹف تھی۔

وہ جانتی تھی۔اس بات کا بھی علم تھا کہ حماد شیرازی کی آمد کے بعد سے حفاظتی اقدام میں اضافہ ہوا تھا اور خطرات کے پیش نظر اعظم شیرازی نے انہیں نئی ذمہ داریاں سونپ دی تھیں۔ایسا پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا۔مگر اب کی بار جب ان کی طرف سے کوئی خبر موصول نہ ہوئی تو اسے فکر ہونے لگی۔

اس نے صادق خان سے آغا علی کے بارے میں پوچھا۔خبر ملی وہ اسلام آباد میں تھا۔خبر یہ بھی ملی کہ اعظم شیرازی آج شام کی فلائٹ سے واپس آ رہے تھے۔وہ ایک دم سے حیران ہوئی۔اعظم شیرازی چار دن پہلے ہی جرمنی روانہ ہوئے تھے اور اب اس طرح ان کی اچانک واپسی نے اسے اچھنبے میں مبتلا کر دیا تھا۔جانے کیا معاملہ تھا۔اسے ایک دم سے کسی انہونی کا احساس ہوا۔

"سب خیریت ہے؟" وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔صادق خان نے مڑ کر اسے دیکھا۔گاڑی میں کچھ ضروری سامان رکھا جا چکا تھا۔اپنی بندوق سنبھالتے اس نے سر ہلایا۔

"ہاں سب خیر ہے!ہم آغا علی سے رابطہ ہونے پر تم کو بتا دے گا!"

کہہ کر گاڑی میں سوار ہو گیا۔اس نے جیپ کو بیرونی دروازے سے باہر نکلتے دیکھا۔پھر گہری سانس لے کر پلٹ گئی۔

☆☆☆

وہ دیوار کے سہارے بے حس وحرکت پڑا تھا۔لب باہم پیوست،اور آنکھیں ساکت تھیں،چہرے پر تکلیف دہ تاثرات

نمایاں ہو رہے تھے،سانس لینے میں دشواری آ رہی تھی۔

پلکیں جھپکاتے وہ کس قدر کوشش سے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔تاریکی میں اپنے آس پاس زندگی کو کھوجنے لگا تھا۔موت کی سرگوشی میں،وحشت کے سناٹے تھے۔اندھیرے تھے اور بے انتہا اندھیرے تھے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔وہ ساکت بیٹھا تھا۔فقط سانسوں کا زیر و بم تھا اور دل کی دھڑکن تھی جو زندگی کا احساس دلاتی تھی۔دماغ ماؤف۔سوچ جامد۔درد ساکت۔اذیت مجسمہ کر رہی تھی۔

وہ ساڑھے چودہ سال کا تھا۔اس سے پہلے بھی اس نے بہت سی وحشت بھری راتیں کاٹی تھیں۔اس وقت جب ہارون اسے چھوڑ کر گیا تھا۔اور اس وقت بھی جب اسے ہاسٹل میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ہاں۔ایسی ہی خوف بھری،وحشت ناک راتیں کئی بار زندگی میں آئی تھیں۔مگر تب وہ آنکھیں کھولتا تھا تو ہر ایک شئے کو ہیئت ملتی تھی،چاند نظر آتا تھا۔آوازیں سنائی دیتی تھیں۔مگر اب ایسا کچھ نہ تھا۔اسے گمان ہوا اس کی سماعت کام نہیں کر رہی۔اس کی بینائی ختم ہو چکی ہے۔متوحش ہو کر اٹھنے کی کوشش کی مگر اٹھ نہ سکا۔لبوں کو جنبش دی تو آواز حلق سے نہ نکلی۔نیم کھلی آنکھیں بھیگ گئیں۔

ہر زخم کی ایک ٹیس تھی۔ہر درد کا ایک مصدر تھا۔اسے ہارون شیرازی اور آرزو جہانگیر کا خیال آیا۔

اس کی ماں اس وقت کسی مشہور برانڈ کے خوبصورت کپڑوں میں ملبوس ریمپ پر جلوہ افروز ہو رہی ہو گی۔یا کسی مشہور باثر فیشن میگزین کے لیے اس کا فوٹو شوٹ ہو رہا ہو گا۔وہ اس کی حالت سے قطعی بے خبر اس وقت کسی انٹرویو میں ہنستے مسکراتے اپنی کامیابیوں کے گن گا رہی ہو گی۔

اس کا باپ امریکا میں شیرازی انٹرپرائزز کی کسی برانچ میں بورڈ آف ڈائریکٹرز کے ساتھ میٹنگ اٹینڈ کر رہا ہو گا۔یا کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں کچھ کاروباری شخصیات کے ساتھ اس کی ڈیل ہو رہی ہو گی۔بے تحاشا پیسہ،کامیابی اور اپنی مضبوط پہچان اس کا مقصد ہو چکی تھی۔

اور جمیلہ داؤ دا اپنے بیٹے حماد کے ساتھ خوشیوں بھری ساعتوں میں مگن ہوں گی۔

اس وقت اپنی زندگیوں میں مصروف اس کے خونی رشتوں میں سے کسی کو بھی اس کا خیال نہیں آ رہا ہو گا۔انہیں تو اب تک وہ یاد بھی نہیں رہا ہو گا۔

ہر منظر خود سے بنتا تھا اور تاریک آنکھوں میں سما جاتا تھا۔ہر رشتے کی اپنی ایک کہانی تھی۔اور اس کہانی میں اس کا نام ونشان تک نہ تھا۔ایک غیر ضروری کردار۔ایک اضافی بوجھ۔جسے وہ بہت پہلے ہی مار چکے تھے۔

نہ ہارون شیرازی کی زندگی رکی تھی۔نہ آرزو جہانگیر نے پلٹ کر خبر لی تھی۔وہ ان کے لیے تو "زندہ" تھا ہی نہیں۔تو پھر انہیں

خیال آتا بھی تو کس لیے؟ احساس ہوتا بھی تو کیوں؟ یاد آتی بھی تو کس وجہ سے؟ صرف پانچ سال ہی تو گزارے تھے اس نے۔ صرف پانچ سال ہی تو زندہ رہا تھا وہ ان کے لیے۔۔

سکون، خوشیوں بھرے پل، امید بھری باتیں، ہنسی اور مسکراہٹ بھرے لمحے مٹنے لگے۔ تاریکی اندر تک چھانے لگی۔

اسے جمیلہ داؤد یاد آئیں، ڈاکٹر مصطفیٰ یاد آئے۔ ان بچوں کا خیال آیا جو اس کے آگے پیچھے پھرتے تھے، شور کرتے تھے، بہت زیادہ ہنستے تھے۔ بولتے تھے، مسکراتے تھے۔ اسے جنت سے کیا ہوا اپنا وعدہ یاد آیا۔

"پھر ہم پارک جائیں گے۔ اور پہاڑیوں پر بھی چڑھیں گے۔ اور وہاں دور تک جائیں گے۔"

اس کا چہرہ جذبات کی حدت سے سرخ پڑنے لگا۔ اس کے ساکت لبوں پر لرزہ طاری ہوا۔

وہ سسک پڑا۔ پھر رونے لگا۔ روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔

اس نے وہ تمام منظر دیکھے، تمام رنگ، اور پھول، سبزہ اور ہریالی، اونچے پہاڑ، اور ندیاں بھی دیکھیں۔ اس نے تصور ہی تصور میں ہر وادی چھان لی۔ ہر پھول چن لیا۔

"بہت سارا گھومیں پھریں گے۔ مونی، کاکا، میں، اور ٹیپو۔ اور تم۔ اور......اور سلیم۔ ہم سلیم کو نہیں لے کر جائیں گے۔ وہ بابا سے میری شکایتیں لگاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے!" اس کے لب ہلے۔ "ہم سلیم کو لے کر نہیں جائیں گے!" اس نے کہا۔ اور کہتے ہوئے سر جھکا گیا۔ وہ ان چار دنوں میں ایک بار بھی نہیں رویا تھا۔ اب رو رہا تھا۔ شدت سے رو رہا تھا۔ آواز لرز کر، دیواروں سے ٹکرا کر واپس اس کی طرف پلٹ رہی تھی۔

اسے بچوں کے ساتھ دوستی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اسے جنت کے ساتھ وقت نہیں گزارنا چاہیے تھا۔ وہ جب بھی خوش ہوتا ہے۔ کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے۔ خواب دیکھتا ہے تو خواب ٹوٹتا ہے۔ امید سوچتا ہے تو امید کاٹتی ہے۔ یقیناً یہ سزا تھی۔ بہت بڑی سزا تھی۔ ہنسنے کی۔ مسکرانے کی سزا تھی۔

اس کی ہمت، سکت اور حوصلہ ختم ہو رہا تھا۔ وہ اعتماد جو گزشتہ تین سالوں میں بحال ہوا تھا وہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر رہا تھا۔ بھروسا، یقین، زندگی، مسکراہٹ، خوشیاں۔۔ وہ ہر ایک احساس سے ماورا ہونے لگا۔ صرف غم تھے جو رہ گئے، صرف دکھ تھے جو ٹھہر گئے۔

اسے ایک دم سے ہر شے سے، ہر ایک رشتے، ہر ایک یاد سے خوف آنے لگا۔ ہر اس آواز سے جو اس سناٹے میں اس کے آس پاس گونجنے لگی تھی۔ ہر وہ بات جواب اسے یاد آنے لگی تھی۔

"تم آرزو کے بیٹے ہو۔ تمھاری اوقات یہی تھی کہ تمہیں کچرے کے ڈھیر پر پھینک دیا جاتا۔"

اور اسے پھینک دیا گیا تھا۔

وہ کم عمر تھا، اعصاب کی مضبوطی بھی بس ایک حد تک تھی۔ اتنا مضبوط نہیں تھا کہ بہادری دکھا سکتا۔ یا کوئی امید جگا سکتا۔

بار بار کچھ چہرے آنکھوں میں آ رہے تھے، چنگھاڑ سی آواز تھی۔ موت کا پیغام تھا۔

اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑی تھی۔ جسم کا روم روم کانپ اٹھا تھا۔ اندھیرا۔ اور موت۔ موت اندھیرے میں ڈھل گئی تھی۔ کوٹھری قبر ہو گئی تھی۔

دماغ سن ہونے لگا۔ رگ و پے میں خوف سرایت کر چکا تھا۔

"مجھے۔ مجھے نکالو یہاں سے۔۔" وہ ایک دم سے متوحش ہو کر چیخا۔ اور کافی دیر تک چیختا رہا، آواز راہداریوں سے ہو کر واپس پلٹ آئی تھی۔ اسے کسے پکارنا چاہیے۔ کسے آواز دینی چاہیے۔ کس کی منت کرنی چاہیے۔ کون تھا جو اسے بچا سکتا تھا؟ یہاں سے زندہ سلامت نکال سکتا تھا؟

اسی اذیت میں اس کا دماغ ایک بار پھر غنودگی میں چلا گیا تھا۔

☆☆☆

"فارس کا فون نمبر ہے؟؟"

وہ صبح سویرے! اسکول جانے سے پہلے اپنے دوستوں کے ساتھ اس سے یہ پوچھنے آئی تھی۔ مدحت مسکرا کر رہ گئی۔ اسکول یونیفارم اور دو پونیوں کے ساتھ۔ نکھرا نکھرا سا چہرہ، بیگ اور دوسرے ہاتھ میں پانی کی بوتل تھی۔ آنکھوں میں اشتیاق ٹھہرا تھا۔

"نہیں اس کا کوئی فون نمبر نہیں ہے!" پنجوں کے بل بیٹھ کر اس کی پونیوں کو درست کیا۔ ماتھے پر برابر کٹے بالوں کو ترتیب سے بکھیرا۔ قمیض کا اوپر والا بٹن نیچے والے بٹن میں پھنسا ہوا تھا۔ انداز سے ظاہر تھا جلد بازی میں تیار شیار ہو کر وہ یہاں آئی تھی تاکہ سلیم کی نظروں سے بھی بچ سکے اور وین بھی نہ چھوٹے۔ اس کے سپاہی دوست بھی اس کے ساتھ ہی تھے۔ ٹیپو نے اسکول سے چھٹی کی تھی۔ اس کے چچا دوسرے شہر سے آئے تھے۔ کاکا بیمار تھا۔ اور ایسا بیمار تھا کہ فریش فریش سا ہنستا مسکراتا بھاگم بھاگ اس کے کہنے پر چلا آیا تھا۔ مونی البتہ اسکول کے لیے تیار ہو کر آئی تھی۔ جنت کی مدد کر کے اس نے پھر اپنے اسکول جانا تھا۔

''پھر آپ اس سے بات کیسے کرتی ہیں؟''

مدحت کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

''میرے بابا کہتے ہیں ویک اینڈ پر اس سے ملنے جائیں گے۔ اتنے سارے دن بعد ویک اینڈ آئے گا۔''

''مدحت کو احساس ہوا وہ بچی فارس کو مس کر رہی تھی۔ پچھلے دو دنوں میں یہ اس کا تیسرا چکر تھا۔ پہلے دن وہ دوپہر میں اپنا غصہ

ٹھنڈا ہو جانے کے بعد یہ کنفرم کرنے آئی تھی آیا وہ واقعی میں جا چکا ہے یا نہیں۔ اسے جانے کیوں یہ لگ رہا تھا کہ وہ کمرے میں کہیں چھپا ہوا ہے اور اس سے ملنا نہیں چاہتا۔ مدحت نے فارس کے کمرے کا دروازہ کھول کر اسے دکھایا کہ وہ یہاں نہیں ہے۔

"وہاں ہوگا!" وہ شیرازی مینشن کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ گو کہ ملازمین کو وہاں بلا ضرورت جانے کی اجازت نہیں تھی نہ ہی بغیر اجازت کوئی صدر دروازہ عبور کر سکتا تھا۔ مگر چونکہ وہ سرونٹس کی ہیڈ مدحت آغا تھی۔ اس کا ہاتھ تھامے اپنے ساتھ لے کر گئی۔ گھما پھرا کر پورا گھر دکھایا کہ تمھارا دوست فارس یہاں بھی نہیں ہے۔ اسے مدحت پر یقین نہیں تھا۔ آوازیں دے کر اسے بلاتے ہوئے اپنی تسلی کرتی رہی۔ "مجھے پتا ہے، تم یہیں ہو۔ باہر آؤ!"

مگر وہ باہر نہیں آیا تھا۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ واپس چلی گئی۔ تیسرے دن وہ اس کا حال احوال پوچھنے آئی تھی اور مدحت گم صم اسے دیکھ کر رہ گئی۔ جانے کیا بات تھی اس بچی کا فارس کے لیے ایسا رویہ، ایسی فکر، ایسا انتظار اسے دکھی کر گیا۔

اور آج وہ اس سے فون نمبر مانگنے آئی تھی۔ فارس ہاسٹل میں رہتا ہے، روزمرہ کی بنیاد پر اس سے کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ یہ باتیں ننھی جنہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

☆☆☆

فارس اسے بتا کر گیا تھا وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں ضرور آئے گا۔ اب اتنے سارے دنوں کے بعد گرمیوں کی چھٹیاں آنی تھیں۔ "اتنا سارا" انتظار کون کرے؟؟

ان چند دنوں میں جتنی ڈرائنگز اس نے بنائی تھیں وہ اسے دکھانا چاہتی تھی۔ جو ٹیسٹ اچھے نمبروں سے پاس کیے تھے وہ ٹیسٹ بھی۔ اس کی کلاس ٹیچر نے گال پر اسٹار بنایا تھا۔ وہ اسٹار بھی دکھانا ضروری تھا۔ اور وہ اسٹیکر جو ہاتھ کی پشت پر لگے ہوئے تھے، وہ اسٹیکرز بھی۔ مگر وہ کیا کرتی؟؟

اس نے اسکول کی کینٹین سے دو چاکلیٹس خریدیں۔ ایک کھالی تھی۔ دوسری فارس کے لیے رکھ لی۔ شام تک اداس ہو کر وہ بھی کھالی۔ پھر اس بات کا غم کہ اسے فارس کے لیے رکھ لینا چاہیے تھا۔ پھر تسلی کہ کل دوسری لے لینا تھی۔ اپنا ہوم ورک کر کے پھر اپنے نانا کے پاس پہنچ گئی۔

ویک اینڈ میں پورے چار دن باقی تھے۔

"کیا ہم واقعی جائیں گے......"

"بالکل جائیں گے۔" مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ بھی مسکرائی۔

"کیوں نہ آپ اس کے لیے گفٹ پیک کریں۔ کچھ ڈرائنگز بنائیں۔"

"وہ تو میں نے بنائی ہیں۔ ابھی دکھاتی ہوں۔" بھاگ کر گئی اور سارے صفحے سمیٹ لائی۔

"یہ گھر فارس کا ہے۔ یہ میرا ہے۔ اور یہ والا آپ کا ہے بابا!"

اسے گود میں بٹھائے وہ اس کے بنائے گئے نمونے دیکھنے لگے۔ اس نے ڈرائنگ پیپر پر فارس اور اپنے نانا کے گھر ان کے قد کے حساب سے بڑے بڑے، اونچے لمبے بنا رکھے تھے۔ اپنا گھر قدرے چھوٹے رکھا تھا۔ وہ خود بھی تو چھوٹی تھی۔

"ارے الگ الگ گھر۔ ہم تینوں کو تو ایک ہی گھر کافی تھا!"

اس نے رک کر لمحے بھر کو کچھ سوچا۔ "نہیں بابا! الگ الگ ٹھیک ہیں۔ اتنے بڑے بڑے۔ ہمارا سامان بھی تو زیادہ ہے۔ اور فارس کی اتنی ساری کتابیں ہیں۔ ایک ہی گھر میں ہوں گی تو جگہ تنگ ہو جائے گی۔" اپنی سوچ و فہم سے وضاحت دی

"لیکن مجھے تو الگ گھر نہیں چاہیے۔" بانہوں میں سمیٹ کر اس کا گال چوما۔ "مجھے تو اپنی جنہ کے ساتھ اس کے گھر میں رہنا ہے!"

اور ان کی جنہ کو نئی فکر لگ گئی۔

"آپ میرے گھر میں پورے نہیں آؤ گے!"

وہ ہنس دیے۔ پھر ہنستے ہی رہے۔

"میں یہ فارس کو دوں گی!" گود سے اتر کر گوند سے جڑے صفحے دیے۔

"یہ کیا ہے!"

کاغذ کھول کر دیکھا۔ وہ بھی گھر تھا۔ ہر تصویر میں گھر تھا۔ پھول تھے۔ درخت تھے۔ اور پہاڑ تھا۔ پرندے تھے۔ اور ندی تھی۔ نیلے رنگ کی۔ جس کا پانی پہاڑ سے سیدھا گھر کے آگے سے گزرتا تھا۔ اور نہر میں چند ایک مچھلیاں تھیں۔ ان کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ آنکھوں میں حزن آ گیا۔ سر اٹھا کر اپنی جنت کو دیکھا۔ وہ دوسرے صفحے الٹ رہی تھی۔ کچھ اور ڈھونڈ رہی تھی۔ آج اس نے اسکول سے بلیوں کے اسٹیکرز خریدے تھے۔ اگر فارس اصلی بلیوں سے دور بھاگتا ہے تو اسٹیکرز والی بلیاں اسے اچھی لگیں گی۔ وہ اپنی دھن میں جانے اور کیا کہہ رہی تھی۔ کیا بتا رہی تھی۔ مگر وہ چپ چاپ گھر ہاتھ میں لیے اسے بس دیکھے جا رہے تھے۔

"آپ فارس کو مس کر رہی ہیں؟" انہوں نے بہت نرمی سے پوچھا

"وہ میرا دوست ہے، دوستوں کو مس کرتے ہیں بابا!" سمجھایا۔ وہ لاجواب ہوئے۔

"ہم روز ملنے نہیں جا سکتے؟؟" سارے صفحے سمیٹ کر ٹیبل پر رکھے، اپنی گردن تک کٹے اور ہیئر بینڈ سے نکلتے بالوں کو کان کے پیچھے کر کے پوچھا۔ ایک ماہ پچیس دن فارس یہاں گزار کر گیا تھا۔ وہ ہر روز اسے دیکھتی تھی، ہر روز اس سے ملنے جاتی تھی۔ اس

کی غیر موجودگی میں اس پر اثر پڑا تھا۔ وہ بہت اداس ہو رہی تھی۔

" نہیں، ہم صرف ایک بار جا سکتے ہیں! بس یہ چار دن تو رہ گئے ہیں! "انہوں نے سر پر ہاتھ پھیرتے نرمی سے سمجھایا۔

اس کے لیے وہ چار دن " بس چار دن " نہیں تھے۔ مگر نانا یہ بات نہیں سمجھ سکتے تھے۔ وہ گود میں چڑھ کر اپنا ٹیسٹ دکھانے لگی۔ اس کی کلاس کے قصے، اور دوستوں کی باتیں تھیں۔ اور وہ سنتے ہوئے، اس کا پورا ساتھ دے رہے تھے۔ حیران کن بات پر حیران ہو رہے تھے، جو بات جنت کے لیے مزاحیہ تھی اس پر ہنس رہے تھے۔

لمحوں میں سارے دن کی تھکن اتر گئی۔ جنت ان کا سکون تھی۔ وہ اس کی موجودگی میں ہر پریشانی سے مبرا ہو جاتے تھے۔

☆☆☆

نیم غنودگی کے عالم میں کسی نے سہارا دے کر اس کے لبوں سے پانی کا گلاس لگایا تھا۔ وہ عبدل تھا، اس کی آنکھوں میں وحشت ٹھہری تھی، اس کے ہاتھ بھی کپکپا رہے تھے، وہ اپنے لبوں کو جنبش دیتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کرتا تھا مگر لفظ ادا نہ ہوتے تھے۔

" مجھے معاف کر دو، میں مجبور تھا۔ بات نہ مانتا تو میرا بیٹا مارا جاتا۔ مجھے نہیں پتا تھا۔ گاڑی میں تم ہو...... میں سمجھا۔ وہ...... حماد بابو...... " کہتے کہتے رک گیا۔ فارس وجدان کی نیم کھلی آنکھوں میں ابھرتا وہ بے جان سا تاثر تھا ہی ایسا۔

عبدل ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا اور اٹھ کر چلا گیا۔ کوٹھڑی ایک بار پھر اندھیر کا ہو گئی۔ اس نے اپنے گھٹنوں پر سر رکھ لیا۔ آنکھیں بوجھل تھیں۔ وجود زخموں سے چور اور نڈھال تھا۔ جو تھوڑی بہت سکت تھی وہ چیخنے چلانے میں ختم ہو چکی تھی۔

جانے مزید کتنا وقت گزرا اسے کچھ اندازہ نہ تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا دن کا وقت تھا۔ یا رات کا سماں تھا مگر کوٹھری کا دروازہ ایک بار پھر کھل گیا تھا۔ فلیش لائٹ ایک بار پھر چمکی تھی۔ عبدل ہاتھ میں پانی کا گلاس لیے داخل ہوا تھا۔ مڑ کر باہر دیکھتے اس نے اپنی طرف سے جیسے کسی بات کی تسلی کی تھی۔

انداز سے واضح تھا، وہ پانی کے بہانے محض اس سے بات کرنے ہی آیا ہے۔

اس نے گلاس نیچے رکھ دیا۔

اس کے پیچھے کی جانب بندھے ہوئے ہاتھوں کی رسی اس نے ڈھیلی کر دی۔

" یہ لوگ۔ یہ لوگ کل شام تک تمہیں مار دیں گے!" کندھوں سے تھام کر اسے آگاہی دی تھی۔

" یہ تمہاری لاش اعظم شیرازی کو بھیجیں گے۔ سن رہے ہو، میں کیا کہہ رہا ہوں!؟"

اس نے سر اٹھا کر خالی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ پہچاننے کی کوشش کی تھی۔ وہ کیا کہہ رہا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''میں دس منٹ تک پچھلی طرف کا دروازہ کھول دوں گا، پہرے دار کھانا کھانے جائے گا، تو میں اسے اوپر ہی روک لوں گا۔ تم پچھلے دروازے سے باہر بھاگ جانا...... باغ سے آگے سڑک ہے...... کسی طرح سڑک تک پہنچ جانا! سن رہے ہو۔'' میں، کیا کہہ رہا ہوں!

اسے کندھوں سے تھام کر جھنجھوڑ ڈالا کہ وہ بس کسی طرح کوئی تو جواب دے۔ مگر وہ کوئی بھی جواب نہیں دے رہا تھا۔ اس میں خود سے فرار ہونے کی کوئی سکت نہیں رہی تھی۔ سکت تھی بھی تو ہمت نہیں رہی تھی۔ وہ بے جان سا لگ رہا تھا۔ عبدل نے فیصلہ کرنے میں محض ایک لمحہ لیا۔ دوسرے ہی پل اس کے ہاتھ کھول دیے۔ اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور کھینچتے ہوئے راہداری میں لے آیا۔ اسے ساتھ لیے کچھ عجلت میں اندازاً قدم اٹھاتا آگے بڑھتا گیا۔

آگے سیڑھیاں تھیں، جس کی دوسری طرف آہنی دروازہ تھا۔ یہ دروازہ عبدل نے چابی سے کھولا تھا اور اسے کھلی فضا میں باہر دھکیلا تھا۔

" جاؤ لڑکے۔ بھاگو یہاں سے۔"

عقب میں نیچے کہیں آہٹ ہوئی تھی۔ گیٹ کھل گیا تھا۔ عبدل نے دروازہ کھینچ کر بند کر دیا۔

فارس ساکت اور متوحش سا اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اسے سوچنے سمجھنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اسے کیا کرنا تھا۔ کہاں جانا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

آسمان مکمل طور پر بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ چاند اور ستارے چھپ گئے تھے۔ دھرتی کی تاریکی ان کی غیر موجودگی میں کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ اسی تاریکی میں تیز ہواؤں اور بارش کی سنگت میں سنسان سی وادی میں سر اٹھائے اونچے لمبے درخت خوف کا سماں پیدا کر رہے تھے۔

عین اسی لمحے گن شاٹ کی آواز گونجی۔

''عبدل!'' بند دروازے کو دیکھتے وہ الٹے قدم پیچھے ہٹا۔ اور اگلے ہی لمحے وہ گرتا پڑتا مخالف سمت، باغ کی طرف اندھا دھند بھاگتا چلا گیا۔

درختوں سے ٹکراتے، جھاڑیوں سے الجھتے، بارش میں بھیگتے، کہیں ٹھوکر کھا کر گرتے، کہیں ہمت پکڑ کر اٹھتے وہ سڑک تک پہنچ گیا۔ دوسری طرف جلتی بجھتی مبہم ہوتی نقطہ نقطہ روشنیاں تھیں۔ اطراف میں مکان تھے۔ آبادی تھی۔

بالکل سامنے ہی ایک دکان تھی۔ تمام تاریکیوں میں، گھروں کے دامن میں صرف وہی ایک دکان لوڈ شیڈنگ سے بچی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ دکان کے شٹر اٹھا ہوا تھا۔ فلیش لائٹس روشن تھیں۔ اندر کوئی شخص کھڑا تھا۔

وہ اس تک پہنچا تو دکاندار نے مڑ کر کچھ حیرت سے اس زخمی اور حال سے بے حال ہوتے لڑکے کو دیکھا۔

فارس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس سے کیا کہے اور کیسے کہے۔ دماغ بالکل خالی تھا۔ آنکھوں میں وحشت سی ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ لوگ اس جگہ سے زیادہ دوری پر نہیں تھے۔ بعید نہیں تھا کہ وہ اسے ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آ جاتے۔

"مجھے۔ مجھے فون کرنا ہے۔۔" اس کی آواز لرز رہی تھی۔

دکاندار اس کی حالت دیکھ کر ایک دم سے گھبراہٹ کا شکار ہوا تھا پھر اسے اندر آنے دیا۔ اپنا موبائل نکال کر اسے دیا۔ وہ بارش میں مکمل طور پر بھیگا ہوا کچھ دیر تک کھڑا رہا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ دماغ بالکل ماؤف تھا۔ کال کسے کرے؟؟ اس کی سانسیں بھاری تھیں۔ رک کر سوچا۔ ذہن پر زور دیا۔ پھر نمبر ملانا شروع کیا......تو نمبر بھولنے لگا۔

دکاندار منجمد سا اسے دیکھے جا رہا تھا۔

اس نے دوسری بار نمبر ملایا۔ پھر تیسری بار۔ رک رک کر۔ ذہن پر زور دے کر۔ یاد کر کے۔

بیل جانے لگی تو اس نے ہانپتے ہوئے مڑ کر سڑک کی طرف دیکھا تھا۔ اکا دکا گاڑیاں گزر جاتی تھیں ورنہ سڑک سنسان سی نظر آتی۔

چوتھی سے پانچویں بیل پر فون اٹھا لیا گیا۔

"ہیلو!" آواز جنت کی تھی۔ وہ کرسی پر چڑھ کر فون کان سے لگائے کھڑی تھی۔

"ہیلو!" اس کے لب ہلے۔

"جنت!"

"آپ کون؟"

"میں......میں فارس......نانا کو فون دو......مجھے ان سے بات کرنی ہے۔" اس کا ایک ایک لفظ بمشکل ادا ہوا تھا۔ گن شاٹ کی آواز جیسے سماعت میں ٹھہری ہوئی تھی۔

"فارس!" وہ ایک دم سے چیخی۔ پھر کرسی پر کھڑے کھڑے کچن کی طرف منہ کیا۔ "سلیم! فارس کا فون ہے! میں نے کہا تھا نا۔ وہ فون کرے گا!" خوشی سے چہرہ چمک اٹھا تھا۔

برتن دھوتے ہوئے سلیم نے ایک لمبی سی سانس لی۔ یہ کوئی تیسری کال تھی جسے ریسیو کرتے اس ننھی افلاطون کا خیال تھا کہ فارس کا ہوگا۔ وہ ہاسٹل سے یہ بتانے کے لیے فون کرے گا وہ بالکل ٹھیک ہے۔ کیونکہ اس نے مدحت کو خط دیا تھا۔ اور خط اب تک پہنچ بھی گیا ہوگا۔

"میں نے تمہیں بہت مس کیا۔ تمہیں پتا ہے ٹیپو کی سائیکل چوری ہوگئی؟" وہ فون کورڈ کو اپنے بازو میں گھماتی وہیں بیٹھ گئی۔

"اور بابا نے کہا۔"

"جنت!" اس نے فوراً سے اس کی بات کاٹی۔ "جنت میری بات سنو۔" آواز بھیگ ہوئی تھی۔ لہجہ گلوگیر ہو رہا تھا۔ "نانا سے بات کراؤ میری۔"

"بابا تو بزی ہیں۔ تم مجھ سے بات کر لو!"

وہ دیوار پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا، اپنی پیشانی بھی ٹکا لی۔ "پلیز میری۔ میری ان سے بات کروا دو۔"

وہ کتنی مشکل سے ضبط کیے کھڑا تھا، رو دیا۔ "ان سے کہو، میں اس وقت۔" گردن موڑ کر سڑک کی طرف دیکھا۔ سنسان راستے اور تاریکی کو دیکھا۔ "میں۔ پتا نہیں اس وقت کہاں۔ ہوں!" لبوں میں جنبش ہوئی۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

"فارس رو رہا ہے؟" جنت اب کے حیران۔ پھر صحیح معنوں میں پریشان ہوئی۔ "بابا تو گھر پر نہیں ہیں۔ تمہیں کیا ہوا؟ تم کیوں رو رہے ہو؟ تمہیں چوٹ لگی ہے؟؟"

"ہاں!......مجھے......چوٹ لگی ہے......"

"سلیم!" وہ کرسی سے اتر کر کچن کی طرف بھاگی۔

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا، سڑک پر گاڑی کے ٹائر چرچرائے تھے۔ جھٹکے سے بریک لگائی گئی تھی۔ فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ حواس باختگی کے عالم میں مڑا۔ اس نے بارش میں کسی کو گاڑی سے نکلتے دیکھا تھا۔ تیز روشنی سے آنکھیں چندھیاں گئی تھیں۔ اس کا وجود مکمل عیاں ہو گیا تھا۔ وہ اسے دیکھ سکتے تھے۔ اس تک پہنچ سکتے تھے۔

اس نے کسی کو اپنی جانب عجلت میں قدم اٹھاتے دیکھا تھا۔ حواس باختگی کے عالم میں وہ دکان سے نکل کر مخالف سمت بھاگا تھا۔

سامنے ہی بائیں طرف سے آتی گاڑی کی ہیڈ لائٹس روشن ہوئی تھیں۔ وہ ایک جھٹکے سے رک گیا تھا۔

"فارس!" کوئی چیخا تھا۔ فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ اس کے وجود کو یکے بعد دیگرے دو جھٹکے لگے۔ تیسری گولی اس وجود نے کھائی جو ایک دم سے اس کے آگے آ گیا تھا۔

وہ بے جان ہو کر نیچے آ گرا۔ دور کہیں پولیس سائرن کی آواز گونجی تھی۔ شور ایک دم سے تیز ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ مگر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ زندہ تھا مگر وجود بے جان پتھر ہو رہا تھا۔ ہاتھ بھاری۔ انگلیوں کو حرکت دینا بھی مشکل تھا۔ اس کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔ اس کا ذہن تاریک ہونے لگا۔

آس پاس کا شور، آوازیں، تھم گئیں، بارش رک گئی، ہر ایک شے حرکات وسکنات سے عاری منجمد پتھر ہو گئی۔

"گاڑی لاؤ......جلدی سے لاؤ......" کوئی چیخا تھا۔

اس کے سینے کے نیچے داہنے حصے پر دباؤ ڈالتے ہاتھ جم گئے۔ وہاں جہاں گولی لگی تھی۔ وہاں جہاں سے خون بہہ رہا تھا۔ ضائع ہو رہا تھا۔ ہاتھ خون سے لتھڑے گئے تھے۔

اس کا خون۔ ان کا خون۔ بارش میں ایک ہو رہا تھا۔

☆☆☆

اسے ایمرجنسی روم میں لے جایا گیا۔ ڈاکٹرز کا عملہ فوری طور پر متحرک ہوا تھا۔ انیستھیالوجسٹ نے اپنی جگہ سنبھالتے (windpipe) میں بریتھنگ ٹیوب ڈالی۔ اسی سرعت سے دوسری نرس نے بقیہ ماندہ خون سے لتھڑے کپڑے کاٹ کر جسم سے الگ کر دیے۔ اس کی قلبی حرکات وسکنات کا جائزہ لینے کے لیے الیکٹروکارڈیوگرام سنسرز سینے سے چسپاں کر دیئے گئے۔ لڑکے کے سروواٹول چانسز بہت کم تھے، کافی سے زیادہ خون بہہ چکا تھا۔

چیسٹ کمپریشن شروع کیا گیا۔ کچھ سیمپلز لیے گئے، ایکس رے مشین کھینچ کر قریب کر لی گئی۔ آئی وی لائن کو اس کے بازو سے منسلک کیا گیا تاکہ خون دیا جا سکے۔

اور تب ہی اچانک اس کا دل رک گیا۔ دھڑکن ختم ہو گئی۔ خون کی کمی کے باعث اسے کارڈیک ارسٹ ہوا تھا۔

سرجن فاریہ محض ایک ثانیے کے لیے منجمد ہوئی تھیں، اگلے ہی پل انہوں نے سرجیکل ٹرے سے اس کا پل اٹھا لیا۔

انہوں نے thoracotomy پرفارم کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

دل ایکسپوز کر کے انہوں نے aorta کو اس طرح سے کلیمپ کیا تاکہ وہ خون کی سرکولیشن جسم کے نچلے حصے سے منقطع کر کے اسے دماغ تک پہنچا سکیں۔ اس دوران وہ اوپن ہارٹ مساج کے ذریعے اسے revive کرنے کی کوشش کرتی رہیں جو کہ کامیاب رہی۔

ان کے اطراف میں نرس اور ریزیڈنٹس اپنے کام میں جتے رہے۔ گولی نکالتے، زخم کا معائنہ کرتے، خون روکتے، اسٹچز لگاتے، ڈرگز ایڈمنسٹریٹ کرتے رہے۔ ایلکٹروکارڈیوگرام پر ڈوبتی ابھرتی لکیریں متحرک رہیں۔

☆☆☆

آسمان پر کہیں بادل گرج تھے۔ بجلی چمک کر اندھیرے میں دراڑ ڈالتی ختم ہو گئی تھی۔ بارش تیز ہو رہی تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھے تھے۔ چہرہ سپاٹ، آنکھوں میں سختی ٹھہری تھی۔ ان کے ہاتھ اور کپڑوں پر خون کے نشان تھے، گاڑی کی عقبی نشست پر بھی۔۔ڈرائیور

اور گارڈ کے علاوہ۔ انکے برابر میں آغا علی بیٹھا تھا۔

"میری غلطی ہے۔ میں نے آپ سے رابطے کی کوشش کی تھی۔ مگر آپ سے بات نہیں ہو سکی۔ اور حماد بابو۔ وہ بہت زیادہ مجبور کر رہے تھے۔"

وہ رک گیا۔ "میں نے اس دن آپ سے بات کی تھی۔ آپ نے کہا تھا۔ میں حماد کو جب بھی اسلام آباد لاؤں تو اپنی جیپ میں لاؤں۔ کوئی سکیورٹی نہیں۔"

اس کی آواز کمزور ہو رہی تھی۔ توجیہات اور دلیلیں سب دھندلی ہو رہی تھیں۔ یہ سچ تھا کہ اسے یہ قدم حماد کی وجہ سے اٹھانا پڑا تھا۔ اس میں اعظم شیرازی کی اجازت شامل نہیں تھی کہ ان سے رابطہ ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔

شیرازی مینشن میں حماد محض تین دن تک رہا تھا۔ چوتھے دن اس کی واپسی تھی۔ اس دن جب وہ آغا علی کو فون پر شیڈول سے آگاہ کر رہے تھے تو اس نے فارس کی بابت پوچھا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے رک گئے تھے۔ انہیں فارس کے معاملے میں سرے سے کوئی خطرہ نظر نہیں آیا تھا۔

''سنڈے تک گاڑی واپس آجائے گی۔ تب اسے ہاسٹل ڈراپ کر دینا۔''

وہ حکم دے کر چلے گئے۔ مگر شام تک انہوں نے منع کر دیا تھا۔ حماد شیرازی ایک ہفتے کے بعد ہی اسلام آباد جا سکتا تھا۔ خود انہیں ضروری میٹنگ کے لیے جرمنی جانا پڑا تھا۔

مگر حماد نے تو جیسے واپسی کی ضد باندھ لی تھی۔ اسے ہر صورت اسلام آباد جانا تھا اور کل ہی جانا تھا۔ مجبوراً اسے حماد کی بات ماننی پڑی تھی۔ اس سے بہت بڑی غلطی۔ بہت بڑی بھول ہوئی تھی۔ اسے اعظم شیرازی کا حکم ماننا چاہیے تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو فارس وجدان کی زندگی اس طرح خطرے میں نہ آتی۔

"مجھے معاف کر دیں صاحب۔ یہ۔ یہ میری غلطی ہے!" آغا علی بہت ہی دکھ اور شرمندگی سے ایک بار پھر اعتراف کیا تھا۔

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رخ موڑ کر کھڑکی سے باہر ہسپتال کی عمارت کو دیکھنے لگے۔ پھر کلائی موڑ کر وقت دیکھا۔ حیدر نے گاڑی کے شیشے پر دستک دی تو انہوں نے شیشہ نیچے کر دیا۔

فارس کو آئی سی یو میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ thoracotomy کامیاب رہی تھی۔ گو کہ اس کے بچنے کے چانسز بہت کم تھے۔ اور وہ ابھی بھی خطرے سے باہر نہیں تھا۔ اس نے سرجن فاریہ کے الفاظ من وعن اعظم شیرازی کو سنا دیے تھے۔

"۔تم جانتے ہو، اب تمہیں کیا کرنا ہے!" انہوں نے کہا۔ اور پھر کہہ کر اپنا حکم دہرایا۔

آغا علی نے سر اٹھا کر کچھ صدمے سے اعظم شیرازی کو دیکھا۔ حیدر کے تاثرات بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ اگلے ہی پل وہ سر ہلا کر

چلا گیا تھا۔انہوں نے گاڑی کا شیشہ بند کر دیا۔

بارش ہنوز برستی رہی۔ان کی نگاہیں باہر۔لائٹ پولز کے عکس پر جمی رہیں جو بارش کے جمع شدہ پانیوں میں جگہ جگہ منعکس ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

مجھے سنو
جیسے کوئی بارش کو سنتا ہے
زمانے کے اُن بھٹکتے،
لڑکھڑاتے قدموں کی چاپ سنو
جہاں مکاں کے تخلیق کار کا
کہیں کوئی وجود ہی نہیں،
اِس بارش کو بھی تو سنو
جو چھت پہ گرے جاتی ہے
گھنے جنگل میں یہ رات
کچھ اور رات ہوئی جاتی ہے
گرجتی بجلی نے پتوں کے درمیاں
اک گھروندا بنا لیا ہے
اور ایک بے قرار اجڑے باغ میں
آوارگی کی تصویر لیے
تمھارا سایہ اس صفحے پہ
اپنی پرچھائی کو پھیلاتا جا رہا ہے۔

☆☆☆

اور اگلے دن ٹھیک ڈھائی بجے ایک شخص ریسپشن پر کسی لڑکے کے بارے میں دریافت کرنے آیا تھا۔ جسے گولی لگی تھی اور جسے کل شام ہی ہاسپٹل لایا گیا تھا۔اسے بتایا گیا،لڑکا مر چکا تھا اور اس کے ورثا اس کی ڈیڈ باڈی لے جا چکے تھے۔اس نے مزید تحقیق

کرتے ہوئے گہرائی میں جانا چاہا تو ڈاکومنٹس بھی دکھا دیے گئے۔موت کی وجہ۔ٹائمنگ۔عمر۔نام۔تمام تر تفصیلات درج تھیں۔

اس کا چہرہ سپاٹ مگر آنکھوں میں ایک چمک سی اتری تھی۔وہ ایک صحافی کے روپ میں تمام تر تفصیلات لینے آیا تھا۔واپسی پر کافی مطمئن تھا۔

"اس مصیبت سے تو جان چھوٹی!"فون پر اپنے صاحب سے بات کی تو اس نے کہا۔"لڑکے نے میرا چہرہ دیکھا تھا۔وہ مجھے پہچان ہی لیتا......"

"ویسے حیرت کی بات ہے صاحب......اعظم شیرازی خود اس کے لیے آئے تھے۔"

اور یہ بات تو اس کے صاحب کو بھی حیران کر رہی تھی۔

سارا معاملہ عبدل کی وجہ سے گڑبڑ ہوا تھا۔اسی نے مخبری کی تھی۔جگہ کا پتا دیا تھا۔آن کی آن میں نہ صرف پولیس کی بھاری نفری وہاں موجود تھی بلکہ اعظم شیرازی کے آدمی بھی وہاں آن پہنچے تھے۔فائرنگ میں ان کے دو آدمی بھی ہلاک ہوئے تھے۔عبدل کو تو اسی وقت ہی مار دیا گیا تھا جب اس نے فارس کی مدد کی تھی۔وہ شیرازی خاندان کا ملازم تھا۔ذرا دیر کو بیٹے کی جان بچانے کے لیے بدلا تھا......تمام تر اخلاص تو پھر بھی ان کے ساتھ جڑا رہ گیا تھا۔آخری وقت تک۔

" کڑی نظر رکھنا ان پر۔کچھ بھی پتا چلے تو مجھے فوری آگاہ کرنا!"

"جیسا آپ کا حکم باس!"

اس کے باس نے کال کاٹ دی تھی۔

☆☆☆

وہ اپنے کمرے میں تھا جب ملازم نے دروازے پر دستک دے کر اسے اعظم شیرازی سے متعلق آگاہ کیا۔انہوں نے اسے اپنے آفس روم میں بلایا تھا۔

"بابا یہیں ہیں؟"حماد شدید حیران ہوا تھا۔وہ کب آئے تھے؟ابھی کچھ دن پہلے ہی تو وہ بزنس کے سلسلے میں جرمنی گئے تھے۔وہ ایک لمحے کو رکا پھر خوشگوار تاثرات کے ساتھ سیڑھیاں اترتا نیچے آگیا۔

آفس روم کا دروازہ کھولتا وہ اندر داخل ہوا۔اعظم شیرازی آفس ٹیبل کے اس پار گلاس والز کے سامنے کھڑے تھے۔دیوار گیر کھڑکیوں سے مارگلہ کی پہاڑیاں نظر آرہی تھیں۔

"بابا!"اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا انہوں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"آغا علی کو آرڈر کس نے دیے تھے؟"ان کی آنکھوں میں سختی تھی۔اور چہرے سے سرد مہری نظر رہی تھی۔

ان کے سرد لہجے میں پوچھنے پر وہ اپنی جگہ رک گیا تھا۔ دادا کے تاثرات پتھریلے تھے۔ مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ رگیں اُبھری ہوئی۔ وہ شدید غصے میں تھے۔ مگر خود پر ضبط کر کے بات کر رہے تھے۔

پہلے پہل تو وہ ان کی بات سمجھ ہی نہ پایا کہ آیا وہ کس آرڈر کی بات کر رہے تھے مگر جب سمجھ میں آیا تو ایک شریر سی مسکراہٹ اس کے لبوں کا احاطہ کر گئی۔ "تو آپ اس لیے ناراض ہیں؟"

اعظم شیرازی کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اسے یکا یک ادراک ہوا انہوں نے اپنے داہنے ہاتھ کی مٹھی سختی سے بھینچ لی تھی۔

" کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا ایک ہفتے کے بعد ہی اسلام آباد آؤ گے؟" متحمل اعصاب کے ساتھ انہوں نے لب بھینچ کر کچھ برہمی سے یاد دلایا۔ حماد کے لیے اپنے دادا کا یہ رویہ حیران کن تھا۔ آج سے قبل انہوں نے سختی سے دیکھنا تو درکنار۔ کبھی اس لہجے میں بات بھی نہیں کی تھی۔۔

"ہاں لیکن۔۔"

"لیکن؟" ان کا لہجہ کاٹ دار ہوا۔ حماد شیرازی منجمد ہوا۔ ایک بار پھر اپنے دادا کو دیکھا۔ وہ اس سے بے انتہا محبت کرتے تھے، کبھی آواز بلند نہیں کی تھی، کبھی لہجہ سخت نہیں کیا تھا۔

وہ اس قدر شدید محبت کرتے تھے کہ وہ کبھی بھی ان کے رعب میں نہیں آیا تھا مگر آج پہلی بار اسے ان کے رویے اور لہجے سے پریشانی ہوئی تھی۔ اپنا آپ عجیب خوف اور مخمصے کا شکار لگا تھا۔

" آئی نو آپ سکیورٹی ایشوز کی وجہ سے ایسا کہہ رہے تھے۔" وہ سنبھل کر اپنے صدمے سے باہر آیا۔ "بٹ بلیو می بابا۔ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ سفر میں بھی کوئی پرابلم نہیں ہوئی۔''

مگر اس کی وضاحت اور جوابی بیانیے سے نہ آنکھوں میں نرمی اتری تھی۔ نہ تاثرات سے سرد مہری مفقود ہوئی تھی۔ وہ اس کے دادا تھے۔ وہ اسی غصے اور اشتعال میں متحمل سے کھڑے رہے۔

"سب ٹھیک رہا''، انہوں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ وہ اپنے اعصاب پر قابو پائے برداشت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

"بابا! آئم فائن!"

" آئم ناٹ ٹاکنگ اباوٹ یو!"

حماد کی آنکھوں میں حیرت سی اتری۔ بات کیا تھی آخر۔ ماجرا کیا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں الجھن کا شکار ہوا تھا۔

"فارس نے ہاسٹل جانا تھا!" انہوں نے کہا

"ہواز فارس؟" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں حماد کو یاد آ گیا تھا، وہ کس فارس کی بات کر رہے تھے۔ اس کے لب بھینچ گئے۔ اس لڑکے کے تصور سے ہی اس کا موڈ غارت ہو چکا تھا۔

"میں نے آغا سے کہا تھا، وہ اسے آپ کی گاڑی میں پہنچا سکتا ہے!" ضبط کر کے کہا۔ یہ احساس کہ یہ تمام غصہ وہ ایک ملازم لڑکے کے لیے دکھا رہے تھے، اسے اندر تک اشتعال دلا گیا۔

"یو آر ناٹ ان آ پوزیشن ٹو میک سچ آرڈرز!"

میز پر ہاتھ مارتے انہوں نے شدید غصے کے عالم میں کہا تھا۔

حماد اپنی جگہ تھم گیا تھا۔

"ڈو یو ہیو اینی آئیڈیا (تمہیں اندازہ ہے) کہ تم نے کیا کیا ہے؟"

"بابا۔"

"یو شڈ ہیو فالوڈ مائی آرڈرز!" متحمل اعصاب کے ساتھ انہوں نے کہا۔ "یہ پاکستان ہے۔ امریکا نہیں ہے کہ تم اپنی مرضی سے باہر آ جا سکو۔ تم اچھی طرح سے جانتے ہو ہیو سکیورٹی ایشوز ہیئر! اسی لیے میں نے تمہیں ایک ہفتے تک وہاں رکنے کا کہا تھا! آئی میڈ اٹ کلیئر ٹو یو کہ خطرہ ہے!"

حماد لب بھینچے خاموش کھڑا رہا۔

"اس کے باوجود تم نے رسک لیا۔"

اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئی تھیں۔ آنکھوں میں خفگی کا تاثر تھا۔

"بابا! سب ٹھیک تو ہے۔! میں کسی خطرے میں نہیں آیا۔"

"دیٹ بوائے از ان ڈینجر بکاز آف یو!" (تمہاری وجہ سے وہ لڑکا خطرہ میں ہے)

انہوں نے جس لہجے میں کہا، حماد اپنی جگہ ٹھہر گیا۔

"وہ اس گاڑی میں تھا جس گاڑی میں ان کا خیال تھا تم ہو سکتے تھے!"

"میں میں۔۔ یہ بات نہیں جانتا تھا!"

"یو مے لیو ناؤ!" اپنی بات ختم کر کے۔ انہوں نے اشارہ کر دیا تھا۔ ان کا غصہ، ناراضی وہ بھی کسی ملازم کے بچے کے لیے۔ حماد کو ایک دم سے اشتعال دلا گئی تھی۔ تاہم وہ خود پر قابو پائے رہا۔

عسریسرا۔ حسنیٰ حسین

"بابا! آئم سوری۔" اس کے لب ہلے۔

"تم جاسکتے ہو!" اپنی بات دہرا کرانہوں نے اپنا رخ دیوار گیر کھڑکیوں کی طرف کرلیا۔اسے ان کا آفس چھوڑ کر باہر آنا پڑا۔ بند دروازے کے اس طرف وہ کچھ دیر تک مٹھیاں سختی سے بھینچے کھڑا رہا۔ چہرے پر سرخی آ گئی تھی۔آنکھوں میں غصہ نظر آ رہا تھا۔

زندگی میں پہلی بار اعظم شیرازی نے اس پر آواز بلند کی تھی اور وہ بھی کس کے لیے؟؟ ایک ملازم لڑکے کے لیے؟۔اس نے صدر دروازے سے کسی کو آتے اور پھر دستک دے کر اسٹڈی روم میں داخل ہوتے دیکھا۔

"ٹوہیل ود فارس!" بڑبڑاتے ہوئے سیڑھیاں چڑھتا کمرے میں بند ہو گیا۔علیزے نے صوفے سے گردن موڑ کر اسے دیکھا پھر ببل کا غبارہ پھوڑتی دوبارہ میگزین کے صفحے پر جھک گئی۔قینچی سے کتر کتر وہ پھر سے تصویریں کاٹنے لگی تھی۔

☆☆☆

ڈاکٹر مصطفیٰ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مدحت کو دیکھ رہے تھے۔سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔شاک اور صدمے کی کیفیت میں انہوں نے بے اختیار دیوار کا سہارا لیا تھا۔دو روز پہلے وہ فارس کی کال کی بابت استفسار کرنے آئے تھے مگر مدحت کو اس حوالے سے کچھ علم نہ تھا۔پھر وہ اس کے ہاسٹل گئے تھے، واپسی پر آغا علی سے رابطے کی بھی کوشش کی تھی۔اعظم شیرازی سے بھی بات کرنا چاہی تھی مگر وہ کامیاب نہیں ہو سکے تھے اور اب پورے تین دن بعد مدحت انہیں ایک اندوہناک خبر سے آگاہ کر رہی تھی۔وہ انہیں فارس وجدان کی وفات کے بارے میں بتا رہی تھی۔حادثہ چند روز پہلے پیش آیا تھا۔فارس کو دو گولیاں لگی تھیں۔ہاسپٹل پہنچنے تک وہ دم توڑ گیا تھا۔

وہ گنگ ہو گئے تھے۔کچھ دیر تک کچھ کہہ بھی نہ سکے تھے۔ایسا کیسے ہو سکتا تھا؟

بے اختیار دیوار کا سہارا لیتے آگے بڑھے تھے، ٹانگیں وزن اٹھانے سے قاصر ہوئیں تو سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ان کی نم آنکھوں میں صدمہ اور بے یقینی تھی۔ یہ کیا ہو گیا تھا؟ کیسے ہو گیا تھا؟ ابھی ہفتہ پہلے وہ ان سے مل کر گیا تھا۔ویک اینڈ پر ملنے کا پروگرام طے کیا گیا تھا۔وہ بہت خوش تھا۔وہ ان سے جنت کی بات کر رہا تھا۔وہ چھٹیوں میں شیرازی مینشن بھی آنے والا تھا۔ اب اچانک یہ کیا ہوا تھا؟ وہ اتنے صبر اور ہمت والا بچہ۔ پے در پے کئی مصیبتیں کئی آزمائشوں سے الجھتا ہوا۔ ان کا پیارا دوست۔ان کا پیارا ساتھی۔یہ اس کے ساتھ کیا ہو گیا تھا؟؟ انہوں نے اپنا سر ہتھیلیوں میں گرا لیا۔کئی لمحے، باتیں، اور وعدے انہیں یاد آ گئے تھے۔

"دیکھنا ایک دن سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔" انہوں نے خود کو کہتے سنا تھا۔"زندگی ٹھیک ہو جائے گی۔حالات ٹھیک ہو جائیں گے!" وہ کہہ رہے تھے۔وہ خود کو سن رہے تھے۔مدحت سامنے کھڑی تھی۔وہ کچھ اور کہہ رہی تھی۔کچھ اور بتا رہی تھی۔ان کا

دل غم سے پھٹنے لگا۔ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہونے لگا۔ان کی ٹانگیں بے جان تھیں۔ان کا وجود سن ہو رہا تھا۔

"کیسے ٹھیک ہو گا سب؟" وہ ان کے سامنے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا۔جانتے تھے اشارہ کس طرف تھا۔اس کے دادا، والد اور ماں۔ وہ ان رشتوں سے محروم تھا، اپنی شناخت سے محروم تھا۔اپنے حق سے، اپنی پہچان سے محروم تھا۔وہ لاجواب تھے۔لاجواب رہے۔

ہوا پتوں سے سرسرا کر گزری۔آسمان کی تاریکی میں کچھ اور اضافہ ہوا...... بادلوں کی اوٹ میں چاند مدھم ہو گیا۔

انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔"تم بس اپنی پڑھائی پر فوکس کرو......خوب محنت کرو......آگے بڑھ جاؤ...... میں چاہتا ہوں تم اپنی زندگی میں بہت کامیاب رہو......جیسے......"

"جیسے اعظم شیرازی ہیں؟" اس نے ان کی بات کاٹی تھی۔وہ چپ ہو گئے تھے۔اب فارس وجدان کو دیکھ رہے تھے۔وہ ساڑھے تیرہ سالہ لڑکا پلے گراؤنڈ میں، نشست پر ان کے پاس بیٹھا تھا۔اور اس کی آنکھوں کی سختی ان کے اندر بہت سے اندیشے جگا رہی تھی۔

"تمہیں کسی کے جیسا نہیں ہونا۔ تمہیں صرف وہی ہونا ہے جو تم ہو....."

"میں ان کے ساتھ بہت برا کروں گا، میں ان سے سب چھین لوں گا۔ بالکل اکیلے رہ جائیں گے وہ۔ آپ دیکھنا!"

"فارس!" ایک دم سے اسے کندھوں سے پکڑ کر اسے پکارا تھا۔کچھ غصے سے۔ سختی سے۔ خوف اور دہشت سے۔ انہیں نہیں پتا تھا وہ ایسی باتیں کیوں کرتا تھا۔وہ اعظم شیرازی کے خلاف ان کے سامنے اتنا کیوں بولتا تھا۔وہ نہیں جانتے تھے اعظم شیرازی اس سے ملنے آتے تھے اور ان کی ہر ملاقات کے بعد وہ ایسے ہو جایا کرتا تھا۔

"صبر اور برداشت کے لیے صرف میں ہی رہ گیا ہوں!"

مدحت آنسو پونچھتے بھرائی ہوئی آواز میں حادثے کی تمام تفصیلات ان کے گوش گزار کر رہی تھی۔کار ایکسیڈنٹ کے بعد وہ اغوا ہوا تھا۔پانچ دن تک اغوا رہا تھا۔پھر اس نے فرار کی کوشش کی تھی اور۔

آغا علی قدرے فاصلے پر سر جھکائے رخ بدل گیا تھا۔

وہ اٹھ گئے تھے۔شکست خوردہ سے قدم اٹھاتے عقبی دروازے سے باغ کا رخ کر چکے تھے۔مدحت نے انہیں روکنا چاہا تھا مگر آغا علی نے منع کر دیا تھا۔وہ نیم اندھیرے میں چلتے چلتے اچانک رک گئے تھے۔وہ اس درخت کے سامنے تھے جس پر وہ غصے سے لکیریں کھینچا کرتا تھا۔پھول توڑ کر نوچ کھسوٹ کر پھینکا کرتا تھا۔وہ گھٹنوں کے بل جھک گئے۔ضبط مکمل ختم ہو گیا اور وہ سسک پڑے۔

"ایک وعدہ مجھ سے بھی کرو!"

" آپ کے وعدے بہت مشکل ہوتے ہیں!!" وہ بگڑے تیوروں کے ساتھ کھڑکی میں ایک ٹانگ باہر اور ایک اندر کیے کافی غصے میں بیٹھا تھا۔اپنے سے بڑی عمر کے لڑکوں سے الجھ بیٹھا تھا جس کے نشان گال اور ہونٹوں پر نظر آ رہے تھے۔

"وعدہ کرو کہ نہ خود کو نقصان پہنچاؤ گے۔ اور نہ ہی کسی اور کو!!"

"بھلے سے اگلا انسان مجھے جان سے مار ڈالے؟؟"غصے سے پوچھا تھا۔

اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے۔انہیں نہیں پتا تھا گزشتہ پانچ دن اس نے کس اذیت میں گزارے تھے۔تنہا، اکیلے، جانے اس پر کیا بیتی ہوگی۔

وہ پہلے سے بہت دکھی تھا، ناامید اور مایوس تھا، پریشان تھا، اپنی زندگی سے ناخوش تھا۔ان سب سے گزرنے کے بعد....وہ کیسے رہا ہوگا۔

انہیں اس کی آخری کال یاد آئی۔مدد کے لیے اس نے انہیں ہی پکارا تھا۔اور وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکے تھے۔ کچھ بھی نہیں....

"فارس کو چوٹ لگی ہے بابا!!وہ بہت رو رہا تھا" جنت گزشتہ تین دنوں سے ان کا سر کھا رہی تھی۔بار بار ایک ہی بات۔

انہوں نے مٹی ہاتھوں میں بھر لی تھی۔

"اسے دو گولیاں لگیں۔ اس کا خون بہہ گیا۔ ہاسپٹل پہنچنے تک......اس کی ڈیتھ ہوگئی۔" مدحت کے الفاظ ان کا دل چیر کر رہے تھے۔

" دیکھنا سب ٹھیک ہو جائے گا" وہ کہا کرتے تھے۔بار بار کہا کرتے تھے۔" تمہیں بہت خوشیاں ملیں گی۔انعام ملے گا، کامیابی ملے گی۔ اور جنہوں نے تمہیں چھوڑ دیا ہے وہ ایک دن تمھارے پاس آئیں گے۔ تمہیں ڈھونڈتے ہوئے۔ تمہیں چاہتے ہوئے "......

ان کا سر جھک گیا تھا۔ان کی اذیت بڑھ گئی تھی۔

وہ ساری باتیں، امیدیں، خواب، دلاسے اور تسلیاں یہیں رہ گئے تھے، اور وہ کچھ بھی لیے بغیر چلا گیا تھا۔اس نے وقت کا انتظار نہیں کیا تھا۔زندگی نے ایسی کوئی مہلت بھی نہیں دی تھی۔

اس رات انہیں گھر پہنچتے کافی وقت لگ گیا تھا۔جنت ان کے انتظار میں زبردستی جاگتی پھر رہی تھی۔بوا نے سلانے کی کتنی کوشش کی تھی مگر وہ سو نہیں رہی تھی۔اسے تو یہ جاننا تھا کہ فارس کو جو چوٹ لگی تھی۔اور جس کی وجہ سے وہ فون پر رو رہا تھا' وہ چوٹ

ٹھیک ہوئی یا نہیں؟اس کا درد ختم ہوا یا نہیں؟

اپنے بابا کو گھر میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ سرپٹ بھاگی تھی۔خیال تھا اس کا دوست فارس بھی ساتھ ہوگا۔مگر وہ اکیلے تھے۔ نڈھال سے صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔ان کا چہرہ اور آنکھیں سرخ تھیں۔وہ ایک دم سے بہت کمزور اور دکھی نظر آ رہے تھے۔

وہ ان کے پاس آ گئی تھی۔کچھ پریشان ہو کر انہیں پکارنے لگی تھی۔اور جیسے اس کی عادت تھی۔اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے، گردن موڑ کر جھکاتے ہوئے انہیں دیکھنے لگی تھی۔ کہ بابا کو کیا ہوا؟؟

"فارس ٹھیک ہے نا بابا؟"

وہ آنکھوں میں آنسو لیے، سسکیاں دبائے، لب بھینچے اسے دیکھتے رہے۔پھر کس قدر کوشش سے اثبات میں سر ہلایا۔

"وہ اب رو تو نہیں رہا تھا؟"اس نے پوچھا۔فکرمندی سے۔پریشانی سے۔ بڑوں کے سے انداز اور سمجھداری سے۔ وہ اپنی جنہ کو دیکھ کر رہ گئے۔ وہ اتنا اس کے ساتھ اٹیچ کیسے ہوگئی تھی؟وہ جب سے شیرازی مینشن سے گیا تھا وہ تب سے اس کے لیے بے چین اور فکرمند ہو رہی تھی۔وہ اسے تلاش کرتی رہی تھی۔ہاسٹل جانے پر اکساتی رہی تھی۔ شیرازی مینشن میں خط پہنچاتی رہی تھی۔ایسا برتاؤ اس نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ایسی فکر اس نے پہلی کبھی کسی کے لیے نہیں دکھائی تھی۔

انہوں نے نفی میں سر کو جنبش دی کہ ہاں!!اس کا دوست فارس اب رو نہیں رہا تھا۔پھر سلیم کو اشارہ کیا وہ اسے لے جائے۔ مزید کوئی بھی سوال سننے کی ان میں ہمت نہیں تھی۔

"ڈاکٹر صاب۔ سب ٹھیک ہے؟؟ خیر تو ہے؟؟"بوا پوچھنے لگی تھیں۔سلیم پریشان ہو کر دیکھ رہا تھا۔جنت ان کا گھٹنا ہلا رہی تھی۔وہ اپنی بات کر رہی تھی۔

"ہم اسے گھر لے آئیں بابا؟اس کو چوٹ لگی ہے۔وہ ٹھیک ہو جائے گا تو پھر ہم اسے سکول چھوڑ آئیں گے؟"

"سلیم!!"ان کی آواز بھرائی تو وہ جنت کا بازو پکڑے کھینچتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف لے جانے لگا۔ڈاکٹر مصطفیٰ نے اپنا سر ہتھیلیوں پر گرا لیا تھا۔بوا کا داہنا ہاتھ بے ساختہ دل پر آن ٹھہرا۔فارس وجدان کی موت کی خبر ان کے لیے بھی کسی صدمے سے کم نہ تھی۔

☆☆☆

پورے تین سال بعد جمیلہ داؤد امریکا سے واپس پاکستان آ گئی تھیں۔شادی اٹینڈ کرنے کے بعد کچھ عزیز و اقارب کی دعوتوں سے فارغ ہو کر انہوں نے کوئٹہ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔اس کے لیے انہیں صرف اور صرف اعظم شیرازی کی اجازت درکار تھی۔مگر وہ دیکھ رہی تھیں کہ اعظم شیرازی پہلے کی طرح بات نہیں کر رہے تھے۔وہ اپنے کاروباری معاملات میں اس قدر مصروف تھے کہ گھر بھی

تاخیر سے آنے لگے تھے۔انہیں ان کے رویے اور روٹین کا یہ بدلاؤ عجیب لگا تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی فیملی کو فوقیت دیتے تھے۔خصوصاً حماد جب بھی چھٹیوں میں پاکستان آتا تھا تو وہ زیادہ سے زیادہ وقت اس کے ساتھ گزارتے تھے۔

شیرازی ہاؤس میں گزارے گئے ان چند دنوں میں انہوں نے حماد اور اعظم شیرازی کے رویے میں خاطر خواہ تبدیلی محسوس کی تھی۔دونوں دادا پوتا کے درمیان کھانے کی میز پر اب کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔جیسی دونوں کی مثالی دوستی اور محبت تھی، اس لحاظ سے یہ پراسراری خاموشی انہیں بے طرح سے کھٹکی تھی۔

حماد بہت خاموش، کچھ حد تک اکھڑا ہوا سا، اور بات بے بات ملازموں پر مشتعل ہونے لگا تھا۔کمرے سے کم نکلتا تھا اور اعظم شیرازی کو تو جیسے اپنے مصروف شیڈول سے فرصت نہیں تھی۔وہ حیران ہوئی تھیں کہ ایسا خلاء ان کے مابین کیسے آ گیا تھا؟

انہوں نے علیزے سے پوچھا تو وہ محض کندھے اچکا کر رہ گئی۔لیکن اس نے یہ ضرور بتا دیا کہ اعظم شیرازی نے ایک بار حماد کو اسٹڈی میں بلا کر ڈانٹا تھا۔آواز باہر تک آ رہی تھی۔تاہم مسئلہ کیا تھا، وہ یہ نہیں سمجھ پائی تھی۔

کچھ تو ہوا تھا یقیناً.... جمیلہ کھٹک گئیں۔ان کی چھٹی حس بتا رہی تھی کوئی مسئلہ تھا۔اس رات کھانے کے بعد وہ حماد کے کمرے میں گئیں اور پاس بیٹھ کر اس کے رویے کے بارے میں استفسار کیا۔وہ جاننا چاہتی تھیں اس کے بیٹے سے ایسی کونسی غلطی ہوئی تھی جس کے باعث اس کے بے انتہا محبت کرنے والا دادا اسے اوائیڈ کر رہے تھے؟؟؟

حماد جو گزشتہ دو ہفتوں سے اپنے دادا کی سختی اور بے پروائی کو جھیل رہا تھا، جذبات پر قابو نہ پا سکا۔غصے سے من وعن سب سنا دیا۔

پہلے پہل تو وہ کچھ سمجھ ہی نہ پائیں کہ حماد کس شیڈول، حفاظتی اقدام اور خطرے کی بات کر رہا تھا۔اعظم شیرازی کی مخصوص گاڑیوں میں سفر کرنے کے بجائے وہ کیوں ایک عام سی جیپ میں اسلام آباد آ رہا تھا؟

ایسا کون سا خطرہ تھا جو درپیش تھا؟ ایسی کون سی پلاننگ تھی جو ترتیب دی گئی تھی۔وہ آنکھوں میں ناسمجھی کا فکرمندی کا تاثر لیے اپنے سترہ برس کے بیٹے کو دیکھے جا رہی تھیں۔جسے غم تھا اور بے تحاشا غصہ تھا۔اس کے دادا ایک چھوٹی سی غلطی پر برہم ہو گئے تھے۔ایک ملازم لڑکے کی وجہ سے بات نہیں کر رہے تھے۔اس کی معذرت قبول نہیں کر رہے تھے۔انہیں لگتا تھا اس کی وجہ سے اس لڑکے کی زندگی خطرے میں آ گئی تھی۔حالانکہ اس نے تو جان بوجھ کر کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

وہ اس لڑکے کے لیے حماد کی آنکھوں میں غیض کی چنگاریاں اور لہجے سے نفرت جھلکتی ہوئی دیکھ سکتی تھیں۔

"میں نے آغا علی سے صرف اتنا کہا کہ وہ اسے بابا کی گاڑی میں ہاسٹل ڈراپ کر دے۔ اینڈ بلیو می ممی.... آئی ڈونٹ نو کہ یہ سب ہو گا...."

جمیلہ داؤد کے سر پر جیسے پہاڑ ٹوٹ کر گرا۔شیرازی مینشن سے ہاسٹل میں صرف ایک ہی لڑکا تھا۔شیرازی خاندان کی کفالت میں صرف ایک ہی لڑکا پلتا تھا۔وہ ایک دم سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔تاثرات بدل گئے تھے۔رنگ اڑ گیا تھا۔انہیں اب سمجھ میں آیا تھا وہ کس لڑکے کی بات کر رہا تھا۔

حماد نے کچھ حیرت سے اپنی ممی کو دیکھا تھا۔اسے بھی جیسے اب احساس ہوا تھا وہ لڑکا اس کی ممی کے لیے کتنا اہم رہا تھا۔بہت سی باتیں اشتعال اور غصے میں نظرانداز ہو جاتی تھیں۔اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

وہ ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ حماد کے کمرے سے باہر آ گئیں۔

وہ ہر طرح کے واہموں اور خیالات کو جھٹکتی عجلت میں قدم اٹھاتی دروازہ دھکیل کر اعظم شیرازی کی اسٹڈی میں داخل ہوئی تھیں۔آنکھوں میں ہراس ٹھہرا تھا۔چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے۔حماد کے لیے وہ چھوٹی بات تھی۔ایک شکوہ تھا جو اس نے بے تحاشا محبت کرتے دادا کے رویے پر کیا تھا۔ان جانے میں وہ اس واقعے کا تذکرہ کر گیا تھا۔کچھ غصے اور برہمی سے انہیں سب بتا گیا تھا۔حملہ اس پر ہونا تھا۔کسی اور پر ہو گیا تھا۔ٹارگٹ وہ تھا اور قبضے میں کوئی اور آ گیا تھا۔اور اعظم شیرازی نے اس بات پر اسے بہت بری طرح سے ڈانٹا تھا۔

اعظم شیرازی ان کے تاثرات دیکھ کر اپنی جگہ رک گئے تھے۔

"فارس کہاں ہے بابا!؟؟ کیسا ہے وہ؟؟ کیا ہوا ہے اس کے ساتھ؟؟؟" ایک ہی سانس میں کچھ فکرمندی اور وحشت سے انہوں نے سوال کر ڈالے۔اعظم شیرازی اپنی جگہ کھڑے رہ گئے تھے،

جس بات کو وہ پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے وہ پوشیدہ نہیں رہی تھی۔توقع نہ تھی کہ حماد اپنی غلطی کا ذکر اس طرح اپنی ماں سے کر ڈالے گا۔کہ ایسی بہت سی باتیں اور بہت سے معاملات تھے جو وہ دونوں اپنی ذات تک محدود رکھا کرتے تھے۔وہ حماد کے ساتھ دوستوں کی طرح رہتے تھے۔اس کی بہت سی غلطیوں پر پردہ رکھتے تھے۔بہت سی کوتاہیوں پر پردہ ڈالتے تھے۔

"بابا۔ فارس۔ فارس کہاں ہے۔ مجھے بتائیں کہاں ہے وہ۔ "وہ ایک دم سے چیخی تھی۔اس کا سکون مٹ چکا تھا۔فارس اغوا ہوا تھا اس خیال سے ان کی جان نکل رہی تھی۔وہ زندہ تھا یا نہیں....اس سوال سے حواس مختل ہو رہے تھے۔

"جمیلہ!"انہوں نے سختی سے نام لیتے اسے بازو سے پکڑ کر روکا تھا۔ وہ آنکھوں میں درد کی نمی لیے کھڑی رہ گئی تھیں۔

"بابا پلیز بتائیں فارس کہاں ہے؟ کیا ہوا ہے اس کے ساتھ!!؟"انہوں نے روتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ہی از فائن!"وہ محض اتنا ہی کہہ سکے تھے۔بات مختصر کر کے ختم کرنا چاہتے تھے۔جو کچھ ہوا تھا حماد کی غلطی سے ہوا تھا۔بہت اچانک اور بغیر کسی مقصد کے ہوا تھا۔وہ جمیلہ داؤد کو ایک بار پھر فارس وجدان کے ہر معاملے سے دور رکھنا چاہتے تھے مگر جمیلہ داؤد

نے انہیں ایسا کرنے نہیں دیا تھا۔

"مجھے فارس کے پاس جانا ہے۔ ابھی کے ابھی۔ اسی وقت"....روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر منت کی۔"پلیز بابا۔''

ان کی بے قراری اور بے تابی۔ ان کی تڑپ۔ اس کا خوف اور دہشت....

وہ اپنا لہجہ اس پل سخت نہیں کر سکے تھے۔کوئی حکم نہیں جما سکے تھے۔ان کا مطالبہ بھی رد نہیں کر سکے تھے۔اعظم شیرازی پہلی بار جمیلہ داؤد کو انکار نہیں کر سکے تھے۔

☆☆☆

ننھی جنت سمجھنے سے قاصر تھی۔نانا چپ چپ سے کیوں تھے،کھانا کیوں نہیں کھا رہے تھے،بات کیوں نہیں کر رہے تھے،کلینک پر کیوں نہیں جاتے تھے۔اب تو وہ اس کا ہوم ورک بھی نہیں دیکھتے تھے،اسکول کے قصے بھی نہیں سن رہے تھے اور اسے فارس کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتا رہے تھے۔وہ بہت اداس ہو رہی تھی۔اسی اداسی میں وہ کتنی ہی دیر تک کرسی رکھے فون کے پاس بیٹھی رہی تھی۔اسے لگ رہا تھا فارس دوبارہ فون کرے گا۔وہ روز اس کے فون کا انتظار کرتی تھی۔سلیم گہری سانس لیتا تاسف سے اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔زبردستی وہاں سے ہٹا دیا۔

"اگر وہ فون کرے گا تو میں تمہیں بتا دوں گا"

"تم فون اٹھاؤ گے تو فارس تم سے بات نہیں کرے گا۔اسے تم بالکل بھی اچھے نہیں لگتے۔"اس نے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا۔

سلیم نے ایک گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔

اسے بازو سے پکڑ کر اس کے کمرے میں لے گیا۔کھلونوں کا ڈھیر اس کے سامنے رکھتا گیا۔کہ وہ کہیں مصروف ہو۔اس کا ذہن بھٹکے۔اور کوئی کام نہیں تھا جو وہ اس کے ذمے لگاتا۔چالاک اتنی تھی کہ اپنا ہوم ورک بھی سکول میں کر کے آجاتی تھی۔تاکہ گھر میں آسانی سے اچھل کود کی جا سکے۔

"میں فارس کے لیے ڈرائنگ بناتی ہوں۔جب ہم اسے ملنے جائیں گے نا۔تو دوں گی۔"وہ کہہ رہی تھی۔

سلیم نے سر پکڑ لیا۔اس کی ہر بات فارس سے شروع ہو کر فارس پر ہی ختم ہو رہی تھی۔وہ اپنی ڈرائنگ بک اٹھا لائی۔کچھ رنگ اپنے پاس رکھے۔کچھ سلیم کو دیے۔تاکہ وہ بور نہ ہو۔ مزے سے رنگوں سے کھیلتے وہ اسے بھی گائیڈ کرتی جا رہی تھی۔اور بتاتی جا رہی تھی کہ اسنے درخت کی شاخیں کتنی چھوٹی بنائی ہیں۔رنگ کتنا برا کیا ہے۔ اور اس سے زیادہ اچھی ڈرائنگ تو کاکا کا چھوٹا بھائی بناتا تھا۔کاکا کا چھوٹا بھائی تقریباً تین سال کا تھا۔

سلیم چپ رہا۔وہ اس کا ساتھ تو دے رہا تھا مگر اندر سے بہت دکھی ہو رہا تھا۔جس کے لیے وہ یہ ساری چیزیں تیار کر رہی تھی، اس تک ان میں سے کچھ بھی پہنچنے والا نہیں تھا۔ڈاکٹر صاحب آخر اسے بتا کیوں نہیں دیتے؟اس نے سوچا اور سوچ کر خود کو کوسا۔پے در پے کئی صدموں سے گزرنے والی اپنی اس معصوم سی نواسی کو وہ ایسی کوئی بات کیسے بتا سکتے تھے؟

ایک پریشان سی نظر اس نے جنت پر ڈالی اور سر جھکا گیا۔

جنت نے خوبصورت رنگوں کے ملاپ سے منظر کشی کی اور اس پر بڑا سا گیٹ ویل سون لکھا۔کچھ پھول لان سے توڑے اور کچھ باغ سے اور دوپہر میں شیرازی مینشن چلی گئی۔

"یہ فارس کے لیے ہے۔آپ نے اسے میرا خط دیا تھا نا۔ آپ اسے اب یہ بھی دے دینا۔ بابا ابھی بہت بزی ہیں تو ہم اس سے بعد میں ملنے جائیں گے۔"

آنکھوں میں نمی لیے مدحت اسے دیکھ کر رہ گئی۔پھر اس نے وہ صفحہ لے لیا۔ساتھ میں پھول بھی تھے۔

یہ سب فارس کے لیے تھا۔اسے پتا نہیں کیوں یقین سا تھا کہ وہ چیزیں فارس تک پہنچا دیں گی۔اس کا خط بھی۔چاکلیٹ بھی۔

"فارس نے مجھے کال کی تھی۔وہ دوبارہ بھی کرے گا نا؟؟"

مدحت نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔اس کے نانا نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا تو وہ بھی نہیں بتا سکی تھی۔

وہاں سے پھر وہ اپنے دوستوں کے پاس گئی۔گھر کے عین سامنے باغ کے وسط میں کہیں ان کے ساتھ کھیلتی رہی۔کاکا نے نئی سائیکل لی تھی۔پرانی والی جو چوری ہو گئی تھی۔اب سب باری باری اس پر طبع آزمائی کر رہے تھے۔جنت کی اپنی سائیکل تھی۔وہ زور زور سے پیڈل پر پاؤں مارتی دائیں سے بائیں گھومتی جا رہی تھی۔مونی اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ان کی ہنسی کی قلقاریاں چہار سو گونج رہی تھی۔سلیم نے یہ منظر دور سے،اور سکھ بھری سانس لے کر دیکھا تھا۔کہ چلو شکر جنت کا ذہن بٹکا۔ شام میں کچھ سامان لے کر گھر میں آیا تو جھٹکے سے رک گیا۔وہ فون کے پاس کرسی پر چڑھی بیٹھی تھی۔

وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔خفگی سے منہ موڑ گئی۔بوا سے ڈانٹ پڑی تھی۔فون کے پاس سے جو نہیں ہٹ رہی تھی۔وہ ایک بار پھر اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"دیکھ نہیں رہے۔بیٹھی ہوئی ہوں۔"بھنویں سکیڑ کر جواب دیا۔

"میری تو یہ بالکل نہیں سن رہی!"بوا نے الگ شکایت لگائی۔

کھانے کی میز پر بھی وہ اپنے نانا سے یہی پوچھتی رہی کہ وہ فارس سے کب ملنے جانے والے تھے۔اس کے نانا چپ تھے۔

عسریسرا۔ حسنیٰ حسین

ذرا سا مسکرا کر کوئی اور سوال کرتے، اسے کسی اور بات میں الجھانے لگے تھے۔

☆☆☆

وہ ہاسپٹل سے گیارہ بجے گھر پہنچی تھیں اور تب سے اپنے کمرے میں بند تھیں۔ خاموش اور ویران...... آنکھیں سرخ و متورم۔ چہرہ ستا ہوا تھا۔ انگ انگ میں کرب ٹھہرا تھا۔ منظر ایک ہی تھا اور وہ آنکھوں میں تھا۔

انہوں نے فارس کا بے جان سا ہاتھ پکڑا تھا، اس کے زخموں کو دیکھا تھا، اس کی بند آنکھوں کو چھوا تھا۔ بالوں میں ہاتھ پھیرا تھا۔ اسے لرزتی کپکپاتی آواز میں پکارا بھی تھا۔ وہ تو یہ توقع کیے ہوئے تھیں کہ وہ اس سے ناراض ہوگا۔ مگر اس کی ناراضگی کچھ ایسی ہوگی اس کا تو انہوں نے گمان بھی نہ کیا تھا۔ حالات ایسے ہو جائیں گے۔ زندگی ایسا کر جائے گی۔ سانسیں یوں تنگ ہوں گی۔ درد ایسے بھی ملے گا.....

ان کا دل غم سے پھٹ رہا تھا۔ بے بسی پر رو رہا تھا۔ لب دعا گو تھے۔ اس کی زندگی کے لیے۔ صحت یابی کے لیے۔ آسانیوں کے لیے دعا گو تھے۔

دروازہ کھول کر ہارون اندر داخل ہوا تو ان کا ارتکاز خالی دیوار پر ہی ٹھہرا رہا۔ ہمیشہ کی طرح وہ اٹھ کر ان کے پاس نہیں گئی تھیں۔ کوٹ نہیں لیا تھا۔ کپڑے نہیں نکالے تھے۔

وہ دوستوں سے ملنے گیا تھا، تبھی تاخیر سے واپسی ہوئی تھی۔ ڈریسنگ روم سے کپڑے بدل کر باہر آیا تو اس کی جانب سے اپنی کسی بھی بات کا کوئی جواب نہ پا کر رک گیا۔

"خیریت ہے؟" برابر میں بیٹھتے، کمفرٹر لیتے، تکیے کو درست کرتے بالکل نارمل لہجے میں پوچھا تھا۔

ان کی بھیگی ہوئی آنکھیں اپنے شوہر کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔ تاثرات بتلاتے تھے اس کا اپنے دوستوں کے ساتھ اچھا وقت گزرا تھا۔

وہ لاابالی سا ہارون شیرازی اب اپنی زندگی میں مکمل سنجیدہ تھا۔ بزنس سوسائٹی میں اب اس کی ایک پوزیشن تھی۔ اثر تھا، نام تھا۔ پہچان تھی۔ اس کے بارے میں آرٹیکلز چھپتے تھے۔ اس کے انٹرویوز لیے جاتے تھے۔ وہ اپنے خاندانی بزنس کو مزید وسعت دینے والا تھا۔ مزید آگے بڑھنے والا تھا۔

" کیا ہوا؟؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

اس کی آواز پر ذہن بھٹکا تھا۔ سوچ منتشر ہوئی تھی۔ وہ ابھی بھی اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

ہارون شیرازی اپنے بیٹے کے معاملات سے گزشتہ نو سالوں سے لاعلم تھا۔ گزشتہ نو سالوں سے وہ اس کی روزمرہ کی روٹین،

اس کے مسائل، اس کی پریشانیوں اور اس کی اذیتوں سے بے خبر تھا۔ اس حادثے سے بھی جس نے اسے موت کے منہ میں لا کھڑا کیا تھا۔ ان زخموں سے بھی جو روح سے اب جسم پر آ گئے تھے۔

غالباً وہ یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ اس کا بیٹا نئے ماحول میں ایڈجسٹ ہو گیا ہوگا۔ نئی زندگی کا عادی ہو چکا ہوگا۔ وہ اپنی ترجیحات سے اپنی اولاد کو کب کا خارج کر چکا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں کب کا آگے بڑھ چکا تھا۔ حوالہ دینے، ذکر کرنے، احساس دلانے کا نہ پہلے کوئی فائدہ تھا۔ نہ اب کوئی فائدہ ہونے والا تھا۔ اس کی ہر دلیل بودی، اس کا ہر جواز ادھورا تھا۔ اس کا ہر خیال ناقص، اس کی ہر وضاحت مصنوعی تھی۔ مگر پھر بھی۔ اس حادثے کے بعد وہ خاموش نہیں رہ سکتی تھیں۔ ہمت مجتمع کرتے سیدھی ہو بیٹھی تھیں۔

"آپ نے ایک بار مجھے کہا تھا کہ۔ آپ یہ سب فارس کے لیے کر رہے ہیں!"

ہارون چونک کر انہیں دیکھنے لگا تھا۔ گزشتہ دو سالوں میں اس نے ایک بار بھی فارس سے متعلق اس سے کوئی بات نہیں کی تھی مگر اب اچانک وہ کر رہی تھیں۔ وہ ایک بار پھر فارس وجدان کو اپنے اور ہارون کے بیچ لے آئی تھیں۔

"نو سال پہلے تک آپ بابا پر ڈیپنڈڈ تھے۔ آپ کے اپنے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا۔ لیکن اب "..... آنسوؤں کا پھندا حلق میں اٹک گیا۔ انہوں نے خشک لبوں کو تر کرتے اپنی آواز کو مضبوط کر لیا۔

"اب آپ کی ایک حیثیت ہے، نام ہے، آپ شیرازی انٹرپرائزز کی امریکا برانچ کے سی ای او ہیں۔ کامیاب ہیں۔ پہلے کی طرح نہ کمزور ہیں۔ اور نہ ہی بے بس...... اب تو آپ۔" اس کی آواز لمحے بھر کے لیے بھیگی۔ " آپ اپنے بیٹے کو قبول کر سکتے ہیں۔"

ہارون شیرازی پر لمحے بھر کے لیے سکتہ سا طاری ہوا تھا۔ آنکھیں منجمد سی ہو گئی تھیں۔ ان میں ایک بینام سا تاثر ٹھہر گیا تھا۔ وہ تاثر جمیلہ شیرازی کی سمجھ سے باہر ہو گیا تھا۔ اسے سنبھلنے میں چند ثانیے لگے، تاثرات بدل کر بے ساختہ مسکرا دیا۔

"یہ تم اچانک کیا باتیں لے کر بیٹھ گئی ہو!" ہلکے پھلکے سے انداز میں کہا۔

"میں آپ کو آپ کی بات یاد دلا رہی ہوں۔ آپ نے کہا تھا آپ فارس کے لیے "..... اس نے کہنا چاہا۔

"وہ سب میرا ماضی ہے جمیلہ۔" ہارون نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں اپنے ماضی کا اب کوئی بھی اثر اپنے مستقبل پر نہیں چاہتا" لہجہ حتمی تھا۔ آواز مضبوط ارادوں کی عکاسی کر رہی تھی

جمیلہ ساکت ہو گئیں۔ فارس کے ذکر پر ہارون ہمیشہ خاموش اور لاجواب ہو جایا کرتا تھا۔ ہر بات پر اپنے باپ کا حوالہ دیا کرتا تھا۔ ہر سچویشن میں اپنی کمزوری کا اظہار کیا کرتا تھا۔ پشیمانی اور دکھ آنکھوں سے نظر آتے تھے۔ اب کے جب وہ مضبوط تھا تو اس کا انداز، اس کے الفاظ یکسر بدل چکے تھے

عسریسرا۔ حسنیٰ حسین

"مجھے اب اندازہ ہوتا ہے کہ بابا نے جو کیا ٹھیک کیا۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ جمیلہ داؤد اذیت کی گہرائیوں میں اترتی جا رہی تھیں۔ "ان کا فیصلہ درست تھا۔ آرزو سے میری شادی ایک غلطی تھی۔ میں محبت میں اندھا ہو گیا تھا۔ آئی ریئلی ڈونٹ واٹ ٹو ٹاک اباؤٹ دِس بٹ لٹ می ٹیل یو ون تھنگ .... آئی ڈو کیئر اباؤٹ مائی ریپوٹیشن ناؤ۔!!"

جمیلہ داؤد نے صدمے سے نکل گال پر بہتے آنسو صاف کیے۔ چاروں شانے چت ہو کر ایک بار پھر ہمت پکڑی۔ ایک بار پھر سر اٹھایا۔

"آپ نے آرزو سے نکاح کیا تھا۔ یہ ایک جائز رشتہ تھا۔ آپ کا اس سے ایک بچہ ہے۔ آپ نے اس بچے کو سوالیہ نشان بنا دیا ہے۔ صرف اتنا قبول کر لینے میں کہ وہ آپ کی اولاد ہے۔ اسے اس کا جائز حق دلانے میں۔ کیا ہو جائے گا؟ لوگ چار دن باتیں کریں گے اور سب بھول جائیں گے۔"

"کوئی کچھ نہیں بھولتا کم از کم میں اپنی کامیابی کی پیک پر ایسا کوئی اسکینڈل افورڈ نہیں کر سکتا جسے لوگ ہمیشہ یاد رکھیں۔"

وہ اندر تک تھم گئی تھیں.

"اینڈ آئی نو ہر ویری ویل! وہ اس سچویشن کا فائدہ اٹھائے گی۔"

جمیلہ داؤد پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ آج شام اعظم شیرازی کے منع کرنے کے باوجود ہارون کو فارس کے حادثے کے بارے میں بتانے والی تھی۔ اس کا بیٹا پانچ دن تک اغواء رہا ہے۔ اسے گولیاں لگی ہیں، اس کی سرجری ہوئی ہے۔ وہ شدید تکلیف میں، زندگی اور موت کے درمیان ہے۔ ہاں وہ اسے سب کچھ بتانے والی تھیں۔

تاہم اب لب سلے گئے تھے۔ آواز گم ہو گئی تھی۔

ہارون شیرازی نے خود کو اپنے باپ کے رنگ اور فیصلوں میں ڈھال لیا تھا۔ وہ ویسا ہو گیا تھا جیسا اعظم شیرازی چاہتے تھے۔ وہ اسے نہیں بدل سکتی تھیں۔ وہ کسی کو نہیں بدل سکتی تھیں

ہارون ان سے مخاطب تھا۔ اس کے تاثرات سے کچھ پریشان ہو رہا تھا۔ انہیں کیا ہوا تھا وہ جاننا چاہتا تھا۔ مگر وہ دم سادھے چپ چاپ نم آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ایک بار پھر اس میں فارس کا باپ ڈھونڈ رہی تھی اور وہ اسے مل نہیں رہا تھا۔ فارس کا باپ اب انہیں کبھی مل نہیں سکتا تھا۔

"کیا سب ٹھیک ہے؟"

وہ چپ رہیں۔ ایک لفظ بھی ادا نہ کیا۔ طبیعت خرابی کا بہانہ کر دیا....

حقیقتِ چھپانے کو اب صرف بہانے ہی رہ گئے تھے۔ ورنہ آنکھیں جو راز عیاں کرتی تھیں۔ انہیں سمجھنے کی نظر کہیں کھو گئی

تھی۔

☆☆☆

وہ پچھلے دو ہفتوں سے ایک ہی جیسے اور انجان چہرے دیکھتا آ رہا تھا۔ جتنی دیر ہوش میں رہتا تھا تو وہی چہرے ہی نظر آتے تھے۔ ایسی آوازیں جنہیں وہ مفہوم پہنانے سے قاصر رہتا تھا۔ باتیں وہ جو سمجھ نہیں آتی تھیں۔ ذہن وہی جو دھند میں لپٹا ہر خیال کو تاریک سا کرتا رہتا تھا۔ درد کا احساس انگ انگ سے اٹھتا ہوا محسوس ہوتا تھا اور پھر وہی تاریکی اور عدم کا احساس ہی اسے چہار سو اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔ کئی بار وہ بند تاریک کوٹھری میں ڈوبتی ابھرتی سانسوں کے تصور سے چیختا تھا۔ کئی بار اس نے گھبرا کر اور کچھ بوکھلا کر وجود کو حرکت دینے کی سعی کی تھی۔ اٹھنے کی کوشش کی تھی۔ اور پھر اپنے زخموں سے اٹھتی درد کی ٹیسوں کو بھی سہا تھا۔ وہ متوحش ہو جایا کرتا تھا۔ دہشت اور خوف سے کپکپانے لگتا تھا۔ اجنبی چہرے۔ اجنبی لوگ۔ سفید جگہ۔ سفید احساس۔ منجمد۔ برف کا سا۔ مگر اب کی بار جو چہرہ اس نے دیکھا وہ جانا پہچانا تھا۔ مبہم دھندلا۔ مگر روشن۔ پہچان کی منازل طے ہوئیں تو اندر تک سب درہم برہم ہو گیا۔ وہ دواؤں کے زیر اثر ابھرنے والا وقتی سکون۔ وہ درد کو دباتا ہوا محلول.... سب بے اثر ہو گیا۔

اس کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھا۔ ان کا ہاتھ اس کے گال پر تھا۔ ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ وہ رو رہی تھیں۔ جمیلہ داؤد رو رہی تھیں۔

اس نے ایک دم سے لبوں کو جنبش دیتے، آنکھیں میچ کر کھولتے، اپنے ہاتھ کو حرکت دی تھی۔ ہاتھ بھاری تھا۔ جانے وہ کیا کہہ رہی تھیں وہ سن نہیں پا رہا تھا۔ اس نے کس قدر کوشش سے اپنا ہاتھ ان کی گرفت سے نکالنے کی کوشش کی تھی۔ کیوں کی تھی وہ نہیں جانتا تھا۔

"چھوڑیں۔" وہ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہیں پا رہا تھا۔ آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ "چھوڑیں مجھے ......"

اس نے کہا تھا۔ اس نے ایک دم سے بھرائی ہوئی آواز میں زور لگا کر کہا تھا۔

جمیلہ داؤد کی گرفت ایک دم سے ڈھیلی پڑی تھی۔

"جائیں۔" اپنا رخ دوسری طرف کرتے۔ وہ روتے ہوئے چیخا تھا۔ وہ چہرہ۔ وہ اسے یہاں کیوں نظر آیا تھا؟ اب کیوں نظر آیا تھا؟ وہ آواز کیوں سنائی دے رہی تھی۔

نرس نے جمیلہ کو وہاں سے ہٹا دیا تھا۔ وہ ان کی منت، اور اصرار کے باوجود انہیں روم سے باہر لے گئی تھی۔ انہیں یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ انہیں یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔

وہ آنکھیں موندے روئے جا رہا تھا۔ ذہن پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ اسے درد ہو رہا تھا۔ اسے سینے میں، بازو پر، سر کے پچھلے

عسریسرا۔ حسنیٰ حسین

حصے سے اور پیٹ کی بائیں طرف درد ہو رہا تھا۔

اس نے گزشتہ رات بھی اٹھنے کی، یہاں سے فرار کی کوشش کی تھی۔ یہی کوشش وہ ایک بار پھر کر رہا تھا۔ اپنے مختل ہوتے حواسوں کے ساتھ.... وہ اپنے زخموں کی پرواہ کیے بغیر پھر سے اٹھنے لگا تھا۔

پہلے اعظم شیرازی تھے۔ اب سیاہی مائل ہیولا تھا۔ بند کوٹھری تھی۔ اور اندھیرا تھا۔ بارش کی آواز تھی اور عبدل کا چہرہ تھا۔ گاڑی کے شیشے بار بار ٹوٹ رہے تھے۔ ہر بار وہ گھومتی ہوئی گاڑی کے اندر فنا ہو رہا تھا۔ وہ بار بار لہولہان ہو رہا تھا۔ نرس اسے زبردستی پکڑ کر بیڈ پر لٹا چکی تھی۔ وہ اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ اپنے ہاتھ کھینچ رہا تھا۔ وہ شدت سے رو رہا تھا۔

وہ نارمل نہیں تھا۔ وہ اس حادثے کے بعد نارمل ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اتنا درد، اذیت، اپنوں کی بے رخی سہنے کے بعد، بے خبری میں رہنے کے بعد، خوف میں اترنے کے بعد وہ کسی طور نارمل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے ڈاکٹرز، نرسز کے قابو میں بھی نہیں آ رہا تھا۔ اسے یقین سا تھا زندگی کے جھانسے میں وہ ایک بار پھر مرنے والا تھا۔ بار بار مرنے والا تھا.... اس کا اعتماد بھروسا ختم ہو چکا تھا۔ اسے ہر چہرہ اپنا دشمن نظر آ رہا تھا۔

بند دروازے کے اس پار اس کی آواز سنتی جمیلہ داود منہ پر ہاتھ رکھے اپنی سسکیاں دبائے کھڑی رہ گئی تھیں....

☆☆☆

دوپہر میں گھر آئی تھیں اور کسی طور اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہی تھیں۔ کھانا انہوں نے نہیں کھایا تھا۔ کمرے میں بند ہو کر آرام کرنے کی کوشش کی تھی مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ کتنی ہی دیر تک وہ کچھ بے قراری سے پورے گھر میں ٹہلتی رہیں۔ بڑبڑاتی رہیں۔ سر تھام کر اپنے آنسو دباتی رہیں۔ گھر کے افراد کے سامنے اسے ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ آنا تھا۔ دعوت کا انتظام دیکھنا تھا۔ نبیلہ شیرازی کے ساتھ شاپنگ پر جانا تھا۔ آج کے دن اور آنے والے مختلف دنوں کے لیے مختلف پروگرام تھے۔ ان کا دماغ ماؤف تھا۔ وہ علیزے کو سن رہی تھیں مگر کوئی بھی جواب نہیں دے رہی تھیں۔ شام تک انہوں نے سارے پلانز کینسل کر دیئے۔ جو دعوت ہفتے کو رکھی گئی تھی، اسے ملتوی کر دیا۔ فیملی گیدرنگ کے لیے معذرت کر لی۔ ان سے کوئی بھی کام ٹھیک سے نہیں ہو رہا تھا۔ ہارون ان کے لیے کچھ پریشان ہوا تھا مگر انہوں نے طبیعت خرابی کا بہانہ کر دیا تھا۔ گھر میں صرف اعظم شیرازی جانتے تھے اس کی یہ حالت کس وجہ سے تھی۔ حیرت انگیز طور پر انہوں ان پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ نہ ہی انہیں ہاسپٹل جانے سے روکا تھا۔ وہ جیسے اسے وقت دے رہے تھے۔ سنبھلنے کا وقت۔ پلٹنے کا وقت۔

"ڈاکٹرز کہہ چکے ہیں وہ اب خطرے سے باہر ہے، اس پر اتنا اسٹریس لینے کی کیا ضرورت ہے؟"

وہ اعظم شیرازی کو دیکھ کر رہ گئی تھیں۔ کم از کم اس حادثے کے بعد ایسے رویے کی توقع نہیں تھی انہیں۔ کچھ اور نہ سہی۔ فارس کی

اذیت پر انسانی ہمدردی کے ناطے وہ ذرا سی نرمی دکھا سکتے تھے۔ تسلی کے چند بول۔ دعاء...... بہتری کی امید۔ کچھ تو کہہ سکتے تھے۔ ان کے لیے بس یہ اہم تھا کہ لڑکا "زندہ" تھا۔ ان کے لیے سانسوں کا چلنا "زندگی" تھی۔

ان کی سوچ شخصیت اور ارادوں میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ انہیں اپنے کسی فیصلے پر دکھ تھا، نہ ہی پشیمانی ہو رہی تھی۔ جو بھی ہوا تھا حماد کی غلطی اور من مانی سے ہوا تھا۔ لڑکا زندہ تھا۔ اس کی سانسیں چل رہی تھیں۔ صرف یہی ایک بات زندگی کی دوڑ میں واپس لانے کے لیے کافی تھی۔

اگر فارس کی جگہ حماد ہوتا تو کیا وہ تب بھی یہ بات کہہ سکتے؟؟ انہوں نے سوچتے ہوئے کیے آنسو اپنے اندر اتار لیے۔ بے رحمی ان کی تھی۔ دل ان کا کتنا تھا۔ رویہ ان کا تھا۔ تکلیف انہیں ہوتی تھی۔

انہوں نے کچھ نہ کہا۔ کوئی بحث نہ کی۔ کوئی سوال نہ رکھا، کوئی احساس نہ جگایا۔ ان باتوں کا اب کوئی فائدہ نہ تھا۔ وہ ان سے اجازت لے کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی تھیں۔

اعظم شیرازی کوٹ کے جیبوں میں ہاتھ ڈالے اسے دیکھتے رہے تھے۔

☆☆☆

دروازے پر دستک دے کر حماد اجازت ملتے ہی اندر آ گیا تھا۔

اعظم شیرازی نائٹ گاؤن میں ملبوس ایک فائلز ہاتھ میں لیے بیڈ پر بیٹھے تھے۔ ملازم چائے کا کپ اور پانی کا گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھ رہا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی انہوں نے فائل رکھ دی۔ گلاسز اتار دیئے۔ ملازم اشارہ ملتے ہی جا چکا تو فرصت سے اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"میں آپ سے سوری کہنے آیا ہوں۔"

اعظم شیرازی چند لمحوں تک اسے دیکھتے رہے۔

"میں نے بہت غلط کیا ہے مجھے آپ کی بات ماننی چاہیے تھی!" وہ شرمندہ لگ رہا تھا۔

وہ پچھلے ایک ماہ مسلسل اسے نظر انداز کر رہے تھے۔ دونوں کے مابین کھانے کی میز پر کوئی بات نہیں ہوتے تھے۔ آؤٹنگ کا پروگرام نہیں بنتا تھا۔ ایک دوسرے کو وقت دینے کی روٹین ختم ہو چکی تھی۔ وہ اس سے اس قدر ناراض ہوئے تھے کہ خود سے مخاطب بھی نہیں کرتے تھے۔ اس کے لیے یہ سب ناقابل برداشت تھا۔ اس طرح کے غصے اور ناراضگی کا سامنا وہ پہلی بار کر رہا تھا۔ کتنی بار اس نے معذرت کی کوشش کی تھی مگر وہ موقع نہیں دے رہے تھے۔ اپنے کاروباری معاملات میں اس قدر مصروف رہنے لگے تھے کہ اب گھر بھی دیر سے آتے تھے۔

اعظم شیرازی کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہے۔ پھر اسے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا مگر سر ہنوز جھکا ہوا تھا۔

"اپنی پوزیشن اور اسٹیٹس کے لحاظ سے تمہیں اندازہ ہونا چاہیے کہ تمہارا ایک غلط فیصلہ۔ ایک غلط مطالبہ صرف تمہارے لیے ہی نہیں بلکہ ہم سب کے لیے کتنے بڑے مسائل کھڑے کر سکتا ہے۔"

حماد کا سر جھکا رہا۔

"تمہیں میرا حکم ماننا چاہیے تھا۔" وہ اب اسے سمجھا رہے تھے۔ ان کا لہجہ معمول کی طرح اب نرم تھا۔ تاثرات میں سختی نا تھی۔ خفگی کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ وہ انہیں خاموشی سے سن رہا تھا۔ اسے اندازہ تھا اس سے کتنی بڑی غلطی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے دادا کا حکم نہیں مانا تھا۔ ان کا اعتماد توڑا تھا۔ مگر یہاں کوئی اور بات تھی جو اسے دکھی کر رہی تھی۔ اس کے اندر کے اطمینان کو سلب کر رہی تھی۔

وہ اسے سمجھا کر خاموش ہوئے تھے تو اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ لمحے بھر کے لیے کچھ سوچا۔

"از ہی امپورٹنٹ ٹو یو (کیا وہ آپ کے لیے اہم ہے)؟؟" اندر کہیں سلگتے انگاروں کی سی تپش تھی۔

"ہو؟؟ (کون)"

"فارس!!"

اعظم شیرازی نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ آنکھوں میں لمحے بھر کے لیے حیرت اتری تھی۔ حماد کا سوال ہی ایسا تھا۔ کیا وہ فارس کی حقیقت جان گیا ہے؟؟

"تم سے زیادہ اہم میرے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔"

"لیکن آپ نے یہ نہیں کہا کہ وہ امپورٹنٹ نہیں ہے!"

اعظم شیرازی لمحے بھر کے لیے تھمے تھے۔ نظر اٹھا کر اپنے سترہ برس کے پوتے کو دیکھا۔ اس کا سوال، انداز اور لہجہ ...... اس کی آنکھیں کسی گہری سوچ کی غماز لگ رہی تھیں۔ وہ اندرونی خلفشار کا شکار لگ رہا تھا۔

"وائے آر یو کمپیئرنگ یور سیلف ود ہم؟؟" انہوں نے متحمل ہو کر پوچھا تھا۔ ان کے پوتے کے ذہن میں فارس وجدان کیسے آ گیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ اپنا موازنہ کیونکر کر رہا تھا؟؟

"کیونکہ آپ۔" حماد کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ وہ اس دن کا حوالہ دینا چاہتا تھا جب اسے ڈانٹ پڑی تھی۔ جب اعظم شیرازی نے اس پر آواز بلند کی تھی۔ جب اس پر غصہ دکھایا تھا۔ اور پھر پورے ایک ماہ تک۔ وہ ناراض ہی رہے تھے۔ اس نے ہمت مجتمع کر کے ان سے کہہ دیا۔ وہ سب جو اس عرصے میں اس کے ذہن میں چل رہا تھا۔

"یہ سب اس لڑکے کی وجہ سے نہیں تھا۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔ چہرے کے تاثرات ہمیشہ کی طرح سپاٹ۔ آواز

مضبوط تھی۔ "تمہاری یہ غلطی معمولی نہیں تھی۔ تم نے اپنے لیے خطرہ مول لیا تھا۔ اور میں اس پر ایسے ہی ری ایکٹ کر سکتا تھا۔"

وہ اپنے دادا کو دیکھ رہا تھا۔

"ان لوگوں کا ٹارگٹ تم تھے۔ اگر انہیں ذرا سی بھنک پڑتی کہ تم کس گاڑی میں سفر کر رہے ہو تو آج۔" انہوں نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔ حماد کو شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اسے اپنے دادا کا غصہ، ناراضگی جیسے اب بہتر طور پر سمجھ آ رہی تھی۔ اس نے فارس سے پہلے خود اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالا تھا۔ اسے خوشی تھی کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور کے لیے فکر مند نہیں تھے۔

وہ جانتا تھا فارس نامی لڑکا ان کی ہی کفالت میں تھا۔ ان کی ہی وجہ سے شیرازی مینشن میں رہتا تھا۔ وہ لڑکا اس کی ممی کے لیے بھی اہم تھا۔ وہ کبھی سمجھ نہیں پایا تھا وہ اسے اتنی اہمیت کیوں دیتی تھیں۔ دوسرے ملازموں کی نسبت ان کی تمام تر توجہ صرف اس ایک لڑکے پر کیوں رہتی تھی۔ وہ اس کے معاملے میں کلاس کا فرق تک بھول جاتی تھیں۔ مہنگی سے مہنگی چیز اس لڑکے کی دسترس میں ہوتی تھی۔ ہر وہ چیز جس پر اس کا حق تھا۔ ہر وہ چیز جو اس کے اسٹیٹس کے حساب سے صرف اس پر جچتی تھی وہی چیز فارس وجدان کے پاس ہوا کرتی تھی۔

تین سال پہلے تک وہ یہ فرق اپنی آنکھوں سے دیکھتا آیا تھا۔ تین سال بعد وہ یہی فرق ایک بار پھر دیکھ رہا تھا۔ اور اسے یہ سب بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ ممی کی فکر.... اور دادا کی ناراضگی۔

یہی وجہ تھی کہ اس کے احساسات آگ جیسے ہوتے رہے تھے۔

مگر اب اس نے دیکھا تھا کہ دادا کے انداز اور لہجے میں اس لڑکے کے لیے کوئی فکر نہیں تھی۔ انہوں نے اب کے تو اس کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ نہ پہلی سی تفصیل سے آگاہی دی تھی نہ اب دے رہے تھے۔ دادا فارس نامی اس لڑکے کو اس بحث سے مکمل طور پر خارج کر چکے تھے۔

حماد کو ایک دم سے تسلی کا احساس ہوا۔ دادا جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ ان کی فکر صرف اس کے لیے تھی۔ خوف صرف اس کے لیے تھا۔ محبت صرف اس کے لیے تھی۔ بھلا ایک ملازم لڑکے کے ساتھ اس کا کیا موازنہ؟؟ وہ کتنا بیوقوف تھا۔ کتنا غلط سوچ رہا تھا۔ اس کے تاثرات ایک دم سے بہتر ہو گئے۔ آنکھوں سے الجھن مفقود ہو گئی۔ دل میں غصہ نہ رہا۔

وہ مطمئن ہو کر چلا گیا تھا۔ گلاسز آنکھوں پر لگاتے اعظم شیرازی نے اپنی فائلز دوبارہ اٹھا لی تھی۔ ذہن لمحے بھر کے لیے بھٹکا تھا۔ سوچ کسی اور طرف چلی گئی تھی۔ سائن کرتے کرتے وہ رک گئے تھے۔ سر جھٹک کر وہ پھر سے فائل اسٹڈی کرنے لگے تھے۔

☆☆☆

اسے وہ تاریکی یاد تھی مگر اغوا کار کے چہرے یاد نہیں تھے۔ ان کی باتیں ذہن میں گونجتی تھیں لیکن اب سمجھ نہیں آتی تھیں۔ منظر

جھلکیوں میں ابھرتے تھے، کبھی کھلی آنکھوں میں۔ اور خواب کا روپ دھار لیتے۔ ہر بار وہ کہیں قید ہوتا۔ چیختے چلاتے ہوئے کسی کو بلا رہا ہوتا.... قید۔ اندھیرا۔ اور بندھے ہوئے ہاتھ۔ گولیوں کی آوازیں۔ اور پھر سناٹا.... اسے باتیں یاد نہیں آرہی تھیں۔ اسے چہرے بھولتے جارہے تھے

یہ ادویات کا اثر نہیں تھا، نہ ہی سائڈ ایفکٹس کا کوئی دخل تھا۔ اس کا دماغ حفاظتی دیواریں سی بناتا جارہا تھا۔ کچھ وقت، حالات اور واقعات کو مٹاتا جارہا تھا۔ مناظر دھندلے ہورہے تھے۔ باتیں مدھم ہورہی تھیں۔ سب یاد ہوتے ہوئے بھی وہ بہت کچھ بھولتا جارہا تھا۔

وہ ایک ماہ ہاسپٹل میں رہا اور اس دوران یہی سب ہوتا رہا۔ اب وہ گھر میں تھا اور یہ سب پھر سے ہورہا تھا۔ وہ پھر سے نا سمجھ آنے والی اس کیفیت پر رورہا تھا۔ وہ خوف جو اس کی روح کھینچ رہا تھا۔ وہ درد جو انگ انگ سے اٹھتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔

دروازہ کھل گیا، دبے قدموں کے ساتھ کوئی چلتے ہوئے اندر آگیا۔ اوپری منزل کی تمام بتیاں روشن ہوچکی تھیں۔ آغا علی دروازے میں رک گیا تھا۔ جمیلہ داؤد اس کے پاس آگئی تھیں۔ اس کا کمرہ ہر وقت روشن رہتا تھا۔ مگر وہ پھر بھی اندھیروں میں گھر جاتا تھا۔ گزشتہ ایک ماہ سے وہ جنہیں مسلسل نظرانداز کررہا تھا۔ جن سے کوئی بات نہیں کررہا تھا۔ جنہیں اپنے قریب آنے نہیں دے رہا تھا تو اس لمحے۔ باوجود ہمت اور کوشش کے وہ انہیں خود سے دور نہیں کرسکا۔ ان کی آغوش میں ایک سکون تھا۔ ان کے حصار میں آرام تھا۔ ان کا لمس زخموں پر مرہم تھا۔ وہ ہاسپٹل میں تھا تب بھی وہ اس سے ملنے آتی رہی تھیں۔ گھر پر تھا تو یہاں بھی۔ اکثر اوقات رات میں بھی ٹھہر جاتی تھیں۔ وہ اپنا وقت اور روٹین کیسے مینج کر پارہی تھیں وہ نہیں جانتا تھا۔ اعظم شیرازی کے سخت قوانین کے باوجود اس کے پاس کیسے آجاتی تھیں۔ یہ بھی نہیں جانتا تھا۔ علم تھا تو صرف ایک بات کا۔ کہ وہ وہاں تھیں۔ جہاں وہ تنہا تھا۔

" کوئی نہیں ہے یہاں۔ کچھ بھی نہیں ہے۔ تم خواب میں ڈر گئے تھے۔ ریلیکس...." خود سے لگائے وہ کہہ رہی تھیں۔

دروازے پر کوئی کھڑا تھا۔ وہ ایک نیا چہرہ تھا۔ وہ جمیلہ داؤد سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ اور وہ اس سے پوچھ رہی تھیں۔ کیا وہ سینے میں کہیں درد محسوس کررہا ہے؟ کیا اسے تکلیف کا احساس ہورہا ہے؟؟ اس کے لب خاموش تھے۔ وجود لرز رہا تھا۔ مگر چہرہ تر تھا۔

آواز ابھی بھی تھی۔

گولیوں کی۔

بارش کی۔

تاریک کوٹھری میں۔

مبہم قہقہے کی......

☆☆☆

رات کے آخری پہر اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ نظر بالکل سامنے کاوچ کے آگے سجدہ ریز وجود پر پڑی۔ اور پھر ٹھہری رہ گئی۔ نیم تاریکی میں منظر بدلنے لگا تھا۔ اندھیرا احساسات سے الجھنے لگا تھا۔ خوف کو جگانے لگا تھا۔

تاریک کوٹھری۔ مدھم سا قہقہہ۔ سوالیہ لہجہ اور انداز۔ اور گولیوں کی آواز۔

اس کی پیشانی پسینے سے تر ہوئی تھی۔ رنگت سفید ہورہی تھی۔ سانسیں بھاری۔ وجود پر ایک کپکپی سی طاری تھی۔

اس نے سفید چادر کو مٹھیوں میں بھینچ لیا تھا۔

وہ سجدے سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ پھر وہ سلام پھیرنے لگی تھیں۔ کسی احساس کے تحت مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

مدھم سی نیلگوں روشنی اس کے تاثرات نمایاں کررہی تھی۔ لب باہم پیوست کیے۔ وہ بھاری سانسیں لیتا انہیں ہی دیکھ رہا تھا.... وہ خشک لبوں کو تر کرتی آہستگی سے قدم اٹھاتی اس کے پاس آگئی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے تاثر سے دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ وہ خوفزدہ لگ رہا تھا۔

محتاط ہو کر وہ اس کے پاس بیٹھ گئی تھیں۔ اس کا سختی سے بھینچا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ ہاتھ کپکپا رہا تھا۔ پھر اس نے اٹھنے کی کوشش کی تھی مگر اٹھ نہیں پارہا تھا۔

" لیٹے رہو۔" وہ ایک دم سے پریشان ہوئی تھیں۔

"لائٹ۔ آن کر۔ دیں"..

وہ خوفزدہ تھا۔ اسکا وجود کپکپا رہا تھا۔ اسے سانس لینے میں دشواری ہورہی تھی۔ اس کے گال آنسوؤں سے تر ہورہے تھے۔

جمیلہ نے کمرے کی لائٹس آن کردیں۔ جھک کر اسے اپنے حصار میں لے لیا۔

"شیش۔ میں تمھارے پاس ہوں۔ سب ٹھیک ہے۔ " اس کے گرد اپنی گرفت مضبوط کیے۔ اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے۔ اسے خود میں سمولیا۔

"وہ مجھے۔ وہ مجھے ماردیں گے "....اس کی سانسیں چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ بری طرح سے کپکپا رہا تھا۔

دروازہ آہستگی سے کھلا تھا اور کھلا ہی رہ گیا تھا۔ قدموں کی حرکت وہیں تھم گئی تھی۔ ہاتھ ہینڈل پر ٹھہر گیا تھا۔

" کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ میں ہوں نا تمھارے پاس جسٹ ریلکس۔ " وہ آنکھوں میں نمی لیے اس سے کہہ رہی تھیں۔ اسے سمجھا رہی تھیں۔ اسے کوئی خوف اور خطرہ نہیں ہے۔ وہ اب محفوظ ہے۔ مگر وہ محفوظ نہیں تھا۔ وہ اب کبھی بھی خود کو محفوظ تصور نہیں

کر سکتا تھا۔ یہ حادثہ چھوٹا نہیں تھا۔ یہ واقعی معمولی نہیں تھا۔

وہ اسے خود میں چھپائے برابر میں ہی اس طرح سے نیم دراز ہوگئی تھیں تاکہ اس کا خوف کچھ کم ہو سکے۔ وہ اس دہشت بھری کیفیت سے باہر نکل سکے۔ وہ ان کی آغوش میں خود کو محفوظ تصور کر کے سو جائے۔ اور وہی ہوا تھا۔ وہ جیسے جیسے مختلف دعائیں اور آیات پڑھ کر پھونکتی رہی تھیں تو وہ سچ مچ میں پرسکون ہو کر سو گیا تھا۔

ہینڈل سے ہاتھ ہٹ گیا تھا۔ دبے قدم کوئی پیچھے ہوا تھا۔ راہداری میں قدموں کی اب کوئی چاپ بھی نہ رہی تھی۔

☆☆☆

وہ جس ایک چہرے کو جانتا تھا۔ اب اس سے منہ نہیں موڑ پا رہا تھا۔ وہ اس کے کام کرنے لگی تھیں۔ اور وہ انہیں کرنے دے رہا تھا۔ ان کے ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا۔ ان کے ساتھ لان میں واک پر جا رہا تھا۔ وہ اس کی ادویات کا علم رکھتی تھیں۔ رات دیر تک اس کے سرہانے جاگتی تھیں۔ اس کے زخموں کی بینڈیج بھی وہ کرنے لگی تھیں۔ ہر وہ کام جو نرس کے ذمے تھا، انہوں نے اپنے سر لے لیا تھا۔ وہ اسے جلد از جلد صحت مند دیکھنا چاہتی تھیں۔ وہ پہلے کی طرح ہنسے، بولے، مسکرائے۔ ان کی دوستی پھر سے پروان چڑھے۔ تعلق پھر سے بحال ہو۔ اس کی اذیت ختم ہو۔ خوف کم ہو۔ لیکن یہ سب آسان نہیں تھا۔ ہرگز آسان نہیں تھا۔ وہ ان کی اس کوشش کو ناکام بنا رہا تھا۔ وہ ٹھیک ہونا نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ اپنے خوف کا سامنا نہیں کر رہا تھا۔

اس کی خاموشی کا حصار تب ٹوٹا تھا جب شام کے آٹھ بجے اس نے کچھ آوازیں سنی تھیں۔ وہ ان آوازوں کے تعاقب میں اٹھ کر کمرے سے باہر آیا تھا۔ اور پہلی بار خود سے آیا تھا۔ دیوار کے ساتھ قدم اٹھاتے کسی مانوس آواز کے سماعت سے ٹکراتے اپنی جگہ رک گیا تھا۔ آواز بائیں جانب سے آ رہی تھی۔ لاونج میں کوئی جمیلہ داؤد کے ساتھ موجود تھا۔ وہ اس آواز کو، لہجے کو، انداز کو بہت اچھے سے پہچانتا تھا۔

جمیلہ داؤد کی واپسی کی ٹکٹ کنفرم ہو چکی تھی۔ اعظم شیرازی انہیں واپسی کا کہہ رہے تھے۔ وہ انکار کر رہی تھیں۔ اور اس انکار سے ایک بحث چھڑ گئی تھی۔

"اگر میں نے تمہیں فارس سے ملنے دیا ہے تو اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں ہے کہ تم اپنی من مانی کرو گی۔ کل تمھاری فلائٹ ہے۔ اور تم اپنی فیملی کے ساتھ واپس جا رہی ہو۔ اینڈ دیٹس اٹ!!" ان کا لہجہ محکم اور آواز رعب بھری تھی۔

"آپ ایک ماں سے کہہ رہے ہیں وہ اپنے بیمار بچے کو چھوڑ کر جائے۔"

"وہ تمھارا بچہ نہیں ہے۔"

"وہ میرا بچہ ہے۔" ایک ایک لفظ پر زور دیتے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "نو سال ہو گئے ہیں بابا۔ آپ ابھی تک یہ بات

نہیں سمجھ پائے۔"

"جمیلہ!!!" اعظم شیرازی کی مٹھیاں سختی سے بھینچ گئی تھیں۔ انہوں نے تحمل سے اسے روکا تھا۔ وہ مزید کوئی لفظ نہیں سننا چاہتے تھے۔ چاہتے تھے تو صرف یہی کہ ابھی اسی وقت ان کے ساتھ گھر چلے۔ اور وہ جانا نہیں چاہتی تھیں۔

صرف اس لیے کہ ڈاکٹرز نے سفر سے منع کیا تھا، وہ فارس کو ابھی تک لندن نہیں بھیج سکے تھے۔ ورنہ اب تک یہ معاملہ ہی ختم ہو چکا۔ جمیلہ داؤد کے پاس رکنے کا کوئی جواز نہ بچتا۔ وہ ایسے مطالبے کا حق بھی نہ رکھتیں۔

"تم ہارون کے ساتھ نہیں جاؤ گی تو سو سوال اٹھیں گے۔ تمہیں اندازہ ہونا چاہیے کہ ہمارے ہر move پر نظر رکھی جا رہی ہے خطرہ صرف حماد کو نہیں تھا۔ اس کی لپیٹ میں تم بھی آ سکتی ہو۔ ہارون بھی آ سکتا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ تم خاموشی سے چلی جاو۔"

"اور فارس۔ اسے یہاں اکیلا چھوڑ دوں؟؟"

"وہ اکیلا نہیں ہے، میرے آدمی اس کا خیال رکھ سکتے ہیں۔"

انہوں نے کہا تھا۔ اور وہ آنکھوں میں نمی لیے چند لمحوں تک کھڑی رہی تھیں۔

"میں امریکا نہیں جاؤں گی۔" لہجہ حتمی تھا۔ اعظم شیرازی کی پیشانی کی رگیں ابھر آئی تھیں۔ تاہم وہ ضبط کیے کھڑے تھے۔" تم ایسا کوئی مطالبہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔" سخت لہجے میں کہہ کر جانے کے لیے مڑے۔

"اگر آپ مجھے فورس کریں گے تو میں اپنے میکے چلی جاؤں گی۔ لیکن۔ فارس کو۔ اس حالت میں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی!"

اعظم شیرازی کے قدموں کی حرکت تھم گئی تھی۔ مڑ کر اسے دیکھا تھا۔ کچھ حیرت اور صدمے سے۔ ان کے لفظ تھے ہی ایسے۔ ان کی بات تھی ہی ایسی۔ وہ منجمد تاثرات کے ساتھ آنکھوں میں بے یقینی لیے انہیں دیکھ رہے تھے۔ پہلی بار جمیلہ داود نے ان کا کوئی حکم اس طرح سے رد کیا تھا۔ پہلی بار اس لہجے اور انداز میں بات کی تھی۔ وہ انہیں اس لمحے کسی طور اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہی تھیں۔

فارس وجدان دیوار پر ہاتھ رکھے بھاری سانسوں کے ساتھ ساکت کھڑا تھا۔ اعظم شیرازی اسے نظر نہیں آ رہے تھے مگر وہ جمیلہ داؤد کو دیکھ سکتا تھا۔ وہ رو رہی تھیں۔ وہ اعظم شیرازی کے سامنے اس کے لیے رو رہی تھیں۔ وہ اس کے لیے اسٹینڈ لے رہی تھیں۔ وہ اس کے لیے لڑ رہی تھیں۔ گزشتہ تین سال اس نے غصے میں گزار دیئے تھے۔ وہ ان سے ناراض تھا۔ بہت زیادہ ناراض تھا۔ ابھی تک ناراض تھا۔

وہ ان سے کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ جواب نہیں دیتا تھا۔ نظر اٹھا کر دیکھتا بھی نہیں تھا۔ اور اب وہ دیکھ رہا تھا۔ تین سال اس

کے لیے مشکل رہے تھے تو جمیلہ داؤد کے لیے بھی وہ وقت آسان نہیں رہا تھا۔

"یہ میری غلطی ہے کہ میں نے اس لڑکے کو شیرازی مینشن میں رکھا اور تمہیں اس سے ملنے دیا۔ یہ بھی میری غلطی ہے کہ تمہیں یہاں اس کے پاس آنے کی اجازت دی۔ "اعظم شیرازی کی آنکھیں شعلہ بار ہو رہی تھیں۔ لہجہ برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔

"آپ اپنی رحم دلی کو غلطی کہہ رہے ہیں؟؟"

وہ ایک بار پھر اپنی جگہ تھمے تھے۔

"آرزو کا بیٹا میرے رحم کا مستحق نہیں ہے!" کچھ غصے اور نفرت سے انہوں نے کہا۔ وہ لڑکا نہ ہوتا تو جمیلہ آج اس طرح نہ کر رہی ہوتی۔

جمیلہ لب بھینچے انہیں دیکھ کر رہ گئیں۔

"شاید تم بھول رہی ہو کہ یہ لڑکا میری ذمہ داری ہے۔ اور مجھے اسے زندہ رکھنا ہی ہے۔ یہی وعدہ تھا۔"

وہ اپنے فیصلے پر قائم تھے۔ بات کل بھی وعدے کی تھی۔ آج بھی وعدے کی تھی۔ جمیلہ نم آنکھوں کے ساتھ کھڑی تھیں۔

"آپ پھر سے میرا رابطہ اس سے بند کروا دیں گے؟ پھر سے مجھے دور کر دیں گے؟"

"جو ضروری ہو میں وہی کرتا ہوں۔ نکال دو اس لڑکے کو اپنے دماغ سے فار گاڈ سیک......" ان کی آواز ایک دم سے بلند ہوئی تھی۔ جمیلہ کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہونے لگا۔ نظریں جھک گئیں۔

"کون کرتا ہے ایسے جیسے تم کر رہی ہو؟؟؟؟"

وہ چپ رہیں۔

"مجھے فورس مت کرو۔ کہ میں کچھ ایسا کر دوں جس پر تمہارے پاس سوائے پچھتاوے کے اور کچھ نہ رہے۔" جمیلہ کی سسکیاں بندھ گئیں۔

"نہ وہ تمہارا بچہ ہے، نہ ہی تمہاری رسپانسیبلیٹی گھر جاؤ اور اپنی پیکنگ کرو۔ صبح کی فلائٹ ہے۔" کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر چلے گئے۔ جمیلہ کچھ دیر تک اپنی جگہ کھڑی رہیں۔ کتنی دعائیں تھیں جو انہوں نے اعظم شیرازی کے دل کی نرمی کے لیے مانگی تھی۔ ایک ذرا سا احساس۔ فارس کے لیے احساس کی چاہ کی تھی۔

اتنا بڑا حادثہ ہو گیا اور وہ پھر بھی اپنی جگہ، اسی انا کے ساتھ قائم تھے۔ کوئی فرق ہی نہیں پڑا تھا انہیں۔ فارس وجدان بے آواز قدموں کے ساتھ واپس پلٹ گیا تھا۔

☆☆☆

وہ کمرے میں آئیں تو وہ سامنے ہی بیڈ پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ان کا تو خیال تھا سو رہا ہو گا۔ لبوں پر مسکراہٹ لیے اس کے برابر میں آ بیٹھیں۔

' کیا ہوا؟ نیند نہیں آئی؟"

فارس نے گردن موڑ کر انہیں دیکھا۔ ان کی آنکھیں رونے کے باعث سوجی ہوئی سی لگ رہی تھیں مگر لبوں پر مسکراہٹ سی ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ منتظر تھا اب وہ اس سے کیا کہنے والی تھیں۔ امریکا جانے کے حوالے سے کیا جواز پیش کرنے والی تھیں۔ مگر جمیلہ خاموش تھیں۔ ان کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ کل کی فلائٹ سے واپس جانے والی تھیں۔ یہ بتانے کے لیے بھی کوئی لفظ نہیں تھا۔ ہمت نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ ہی اسے چھوڑ کر چلی جاتی تھیں جب اسے سب سے زیادہ ضرورت ہوتی تھی۔ بار بار پلکیں جھپکاتے ہوئے آنکھوں کی نمی دبا رہی تھیں۔ گلا کھنکھار کر، بدقت مسکراتے ہوئے وہ خود کو اس کیفیت سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

انہیں اندازہ تھا اب کے وہ ناراض ہو گا تو پھر کبھی نہیں مانے گا۔ اب کے وہ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھونے والی ہیں۔

انہیں علم نہ تھا جو خاموش تھا اتنے دنوں سے وہ آج حقیقتاً خاموشی توڑنے والا تھا۔ اس کے دل سے بھاری بوجھ سرکانے والا تھا۔

"میں۔ ڈاکٹر مصطفیٰ۔ سے ملنا چاہتا ہوں!" اس کے لب ہلے۔

وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ اتنے دنوں بعد فارس نے ان سے بات کی تھی۔ اب تو خوشی بھی دل کو بھاری کر دیتی تھی۔

"آپ تو ویسے بھی چلی جائیں گی... تو میں سوچ رہا تھا کہ۔ " وہ ایک ہی تسلسل میں اپنی بات مکمل نہیں کر پا رہا تھا۔ "میں سوچ رہا تھا کہ۔ میں ان کے پاس چلا جاؤں۔"

جمیلہ داؤد اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی۔ کیا اس نے اعظم شیرازی کے ساتھ ہونے والی ان کی گفتگو سن لی تھی؟ ان کے اندر غم بڑھ گیا۔ دل تڑپ گیا۔ کیا وہ ساری کی ساری سخت باتیں۔ اس نے اس حالت میں اپنے کانوں سے سن لی تھیں۔

"ڈاکٹر مصطفیٰ کے پاس "....ان کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔ آواز بھیگ رہی تھی۔

فارس کا سر جھکا ہوا تھا۔ جیسے کہ اس کی عادت تھی۔ وہ ان کے دوپٹے کا پلو اپنے ہاتھوں میں لے چکا تھا۔ جیسا کہ ہمیشہ لیا کرتا تھا۔

"انہوں نے ایک بار مجھے کہا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں! وہ ہاسٹل میں بھی۔ مجھ سے ملنے آتے تھے۔"

جمیلہ اپنے رونے پر قابو پائے چپ رہیں۔ ان کے لیے وہاں بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔ فارس کو دیکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

"ہاں میں۔ میں آغا سے بات کروں گی۔ کہ وہ ڈاکٹر مصطفیٰ سے تمہارا رابطہ کروا دے۔ "انہوں نے انگلی کی پشت سے

بائیں آنکھ کا آنسو صاف کیا۔

"آپ جانے سے پہلے مل کر تو جائیں گی!" سراٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے پوچھا۔

اپنے آپ پر جبر کرتے، آنسوؤں پر ضبط کے پہرے بٹھاتے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ وہ انہیں جانے کی اجازت دے رہا تھا۔ ظاہر کر رہا تھا جیسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جیسے اس کے لیے یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ وہ سب خود سے مینیج کر لے گا۔ وہ ان کے لیے واپسی کا سفر آسان کر رہا تھا۔ اپنے طریقے سے انہیں الوداع کہہ رہا تھا۔ جمیلہ داؤد اسے چھوڑ کر جا سکتی ہیں۔ فارس وجدان نے ہر خواہش مٹا دی تھی۔ ناراضگی ہٹا دی تھی۔

جمیلہ داؤد کو وہ اپنی عمر سے ایک دم سے بڑا لگا، زیادہ سمجھدار لگا۔ اس رات وہ بھاری دل کے ساتھ گھر واپس آ گئی تھیں۔ اس رات وہ باوجود کوشش کے بھی سو نہیں سکی تھیں۔

☆☆☆

وہ ایک بار پہلے بھی اسے چھوڑ کر گئی تھیں۔ ایک بار پھر اسے چھوڑ کر جا رہی تھیں فارس نے ملنے کا کہا تھا مگر وہ اس سے ملنے نہیں آئی تھیں۔ ایک بار پھر الوداع کی ہمت نہیں تھی۔ پچھلی بار وعدوں کا سہارا تھا، رابطے کی تسلی تھی، واپسی کا ارادہ تھا۔ اور وہ کسی ایک عمل میں بھی کامیاب نہیں ہو سکی تھیں۔ اب کے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ نہ کوئی عہد۔ نہ دینے کو کوئی امید۔ تسلی۔ اور نہ ہی ملاقات کا وعدہ۔ انہیں تو یہ بھی نہیں پتا تھا اب دوبارہ وہ پاکستان کب آنے والی تھیں۔ جانے سے پہلے انہوں نے آغا علی سے ضرور بات کی۔ وہ چاہتی تھیں آغا ڈاکٹر مصطفیٰ سے فارس کی ملاقات کروا دے۔ مگر آغا اعظم شیرازی کے فیصلوں کا پابند تھا۔ فارس کی کسی سے بھی بات نہیں کروا سکتا تھا۔

"شاید آپ کو علم نہیں ہے مگر۔ وہاں سب یہی جانتے ہیں کہ فارس مر چکا ہے!"

شیرازی ہاؤس کے لان میں جمیلہ داؤد اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھیں۔ انہیں سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔ انہیں اعظم شیرازی کے اس فیصلے کی بھی سمجھ نہیں آئی تھی۔

"مر چکا ہے؟؟" ان کے لب کپکپائے تھے۔ دل لرز اٹھا تھا۔

"سب یہی جانتے ہیں۔ سب ملازم۔ گارڈز بھی۔" آغا سر جھکائے مؤدب سا کہہ رہا تھا۔ "یہ ضروری تھا کیونکہ۔"

جمیلہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ مزید کچھ سننے کی تاب نہیں تھی۔ اعظم شیرازی اب کیا کر رہے تھے۔ جاننے کا اشتیاق نہیں تھا۔

آغا کہنا چاہتا تھا فارس کی زندگی ابھی بھی خطرے سے خالی نہیں تھی۔ جنہوں نے اسے اغوا کیا تھا وہ اس کے پیچھے دوبارہ بھی آ

سکتے تھے۔ ایک ذرا سی بھنک کہ وہ زندہ ہے بہت سے مسائل کھڑے کر سکتی ہے۔ فارس نے ان کا چہرہ دیکھا ہے۔ تبھی اسے مارنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مگر جمیلہ داؤد کو جیسے اب کوئی تفصیل نہیں چاہیے تھی۔ فارس وجدان کا وہ آخری مطالبہ۔ انہیں ہر صورت پورا کرنا تھا۔ بہتر تھا وہ اس ماحول سے نکل جائے۔ اعظم شیرازی کے قہر بھرے حصار سے نکل جائے۔ آزاد ہو جائے۔

اس نے آغا سے مدحت کا نمبر لے لیا۔ اسے کال کی۔ اس سے ڈاکٹر مصطفیٰ کے بارے میں پوچھا۔ دو ماہ پہلے تک وہ کوئٹہ میں ہی تھے مگر اب وہ وہاں نہیں تھے۔ ان کا گھر بھی بند، کلینک بھی بند تھا۔ وہ کہاں چلے گئے تھے کسی کو اس بات کا علم نہیں تھا۔

"تمھاری جب بھی ان سے بات ہو، میرا یہ نمبر انہیں دے دینا۔" ساتھ ہی اپنا نمبر لکھوا دیا۔ "اور یہ بات صرف ہم دونوں کے درمیان رہنی چاہیے۔ تم میرے لیے اتنا تو کر ہی سکتی ہو؟"

"آپ بے فکر رہیں، کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی!" مدحت نے یقین دہانی کروائی تھی۔

ان کی فلائٹ امریکا کے لیے روانہ ہوئی تو لگا دل وہیں رہ گیا ہے۔ سکون ختم۔ بے قراری انگ انگ میں سما گئی تھی۔ وہ فارس وجدان سے آخری بار ملے بغیر ہی جا رہی تھیں۔ اور یہ حقیقت ان کے وجود پر.... ان کی روح پر بہت بھاری ہو رہی تھی۔

☆☆☆

"آرزو جہانگیر کے بیٹے کے لیے میرے دل میں کوئی رحم نہیں ہے۔" وہ بیڈ سائڈ سے ٹیک لگائے نیچے کارپٹ پر گھٹنوں سے تھوڑی لگائے بیٹھا تھا۔ کمرہ روشن تھا۔ کھڑکیاں بھی کھلی ہوئی تھیں۔ ہوا سے مخملیں پردے لہرا رہے تھے۔ کھڑکیوں سے سرسبز لان کے اس پار براؤن رنگ کا بڑا گیٹ نظر آتا تھا۔ وہ گیٹ آج صبح سے بند تھا۔ کوئی گاڑی حدود میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ کوئی اسے الوداع کرنے نہیں آیا تھا۔ اس نے بیٹھے بیٹھے اپنا سر اٹھایا۔

"شاید تم بھول رہی ہو کہ یہ لڑکا میری ذمہ داری ہے۔ اور مجھے اسے زندہ رکھنا ہی ہے۔ یہی وعدہ تھا۔"

ذمہ داری۔ زندگی۔ اور وعدہ!!

ویران آنکھیں نمناک ہونے لگیں۔ خاموش لبوں پر غم ٹھہر گیا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ حیدر وہاں سے گزر رہا تھا تو چونک کر رک گیا۔ اسی وقت اندر آ گیا۔ کمرے کی کھڑکیاں اس نے بند کر دیں۔ پردے بھی پھیلا دیئے۔ اسے ایک پل میں انکشاف ہوا تھا کہ اس نے اپنی آج رات کی میڈیسن نہیں لی تھی۔ تبھی وہ رات کے اس پہر تک جاگ رہا تھا۔ اسے فارس پر اعتماد کرنے پر افسوس ہوا۔ اب سمجھ میں آیا جمیلہ داؤد اسے اپنے ہاتھ سے ہی کیوں دوا کھلاتی تھیں۔

"آپ کو اب آرام کرنا چاہیے۔" وہ اس کی حقیقت سے کچھ حد تک واقف تھا۔ تب ہی لہجے اور انداز سے ادب جھلکتا تھا۔

ایسا ادب جس کا وہ مستحق نہیں تھا۔اس نے حیدر کی طرف دیکھا۔وہ پانی کے ساتھ ادویات پیش کر رہا تھا۔

فارس کچھ دیر تک آدھے خالی۔آدھے بھرے ہوئے گلاس کو دیکھتا رہا پھر اس نے لے لیا۔جانتا تھا ایسے نیند جلد آنے والی تھی۔ایسے درد جلد مٹنے والا تھا۔جو تھکاوٹ وجود میں اتری ہوئی تھی۔وہ ایسے ختم نہیں ہو سکتی تھی۔جو اذیت اس پل محسوس ہو رہی تھی اس سے بچنے کا اور کوئی راستہ نہ تھا۔

وہ سوچ چکا تو حیدر کمرے کی لائٹس آف کرتے کرتے رک گیا۔اسے جمیلہ داؤد کی تنبیہہ یاد آئی۔باہر نکلتے ہوئے دروازہ بھی کھلا چھوڑ دیا۔شیرازی فارم ہاؤس مکمل اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔مگر وہ ایک کمرہ صبح تک۔روشن رہا تھا۔